جدید اردو ایڈیشن

تفسیرِ عزیزی

پارہ عم

تالیف: حضرت شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی قدس سرہ

مترجم قدیم مولانا محمد علی چاندپوری رحمۃ اللہ علیہ

تسہیل وتزیین از

مولانا سفیر احمد ثاقب استاذ جامعۃ الرشید

فاضل ومتخصص جامعہ دارالعلوم کراچی

مع تقریظ

شیخ الاسلام حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ادارہ اسلامیات کراچی، لاہور

جدید اردو ایڈیشن

تفسیرِ عزیزی

پارہ عم

تالیف: حضرت شاہ عبد العزیز محدّث دہلوی قدس سرہ

مترجم قدیم مولانا محمد علی چاند پوری رحمۃ اللہ علیہ

تسہیل و تزئین از

مولانا سفیر احمد ثاقب استاذ جامعۃ الرشید

فاضل و تخصص جامعہ دار العلوم کراچی

مع تقریظ

شیخ الاسلام حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ادارہ اسلامیات کراچی۔ لاہور

طبع اول رمضان المبارک ۱۴۲۳ھ نومبر ۲۰۰۲ء

ناشر ادارہ اسلامیات کراچی۔ لاہور

ملنے کے پتے

ادارہ اسلامیات موہن روڈ چوک اردو بازار کراچی

ادارہ اسلامیات ۱۹۰۔ انارکلی لاہور نمبر ۲

ادارہ اسلامیات دینا ناتھ مینشن شارع قائد اعظم لاہور

دار الاشاعت اردو بازار کراچی

ادارۃ المعارف ڈاک خانہ دار العلوم کراچی ۱۴

مکتبہ دار العلوم جامعہ دار العلوم کراچی ۱۴

بیت القرآن اردو بازار کراچی نمبر ۱

بیت الکتب گلشن اقبال کراچی

بیت العلوم نابھہ روڈ پرانی انارکلی لاہور

ادارہ تالیفات اشرفیہ چوک فوارہ ملتان شہر

فہرست مضامین تفسیر عزیزی جدید

فہرست مضامین تفسیر عزیزی جدید

فہرست مضامین تفسیر عزیزی جدید

فہرست مضامین تفسیر عزیزی جدید

فہرست مضامین تفسیر عزیزی جدید

فہرست مضامین تفسیر عزیزی جدید

فہرست مضامین تفسیر عزیزی جدید

فہرست مضامین تفسیر عزیزی جدید

فہرست مضامین تفسیر عزیزی جدید

فہرست مضامین تفسیر عزیزی جدید

فہرست مضامین تفسیر عزیزی جدید

فہرست مضامین تفسیر عزیزی جدید

فہرست مضامین تفسیر عزیزی جدید

فہرست مضامین تفسیر عزیزی جدید

فہرست مضامین تفسیر عزیزی جدید

فہرست مضامین تفسیر عزیزی جدید

فہرست مضامین تفسیر عزیزی جدید

فہرست مضامین تفسیر عزیزی جدید

فہرست مضامین تفسیر عزیزی جدید

فہرست مضامین تفسیر عزیزی جدید

فہرست مضامین تفسیر عزیزی جدید

فہرست مضامین تفسیر عزیزی جدید

فہرست مضامین تفسیر عزیزی جدید

فہرست مضامین تفسیر عزیزی جدید

فہرست مضامین تفسیر عزیزی جدید

فہرست مضامین تفسیر عزیزی جدید

انتساب

میں اپنی اس حقیری سی کاوش کا انتساب اس ہستی کے نام کرتا ہوں جن کی گود میری پہلی تربیت گاہ بنی، جن کے ذوقِ عبادت اور شوق تلاوت نے بچپن سے ہی میرے دل میں دین کا لگاؤ پیدا کیا، پھر انہی کی دیرینہ خواہش و آرزو کی بدولت اپنا ماحول یکسر منفی ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ نے دینی تعلیم کے لئے قبول فرمایا۔ وہ میری والدہ محترمہ جو پورے خاندان کی رونق وسایہ تھیں ۱۳ ربیع الثانی ۱۴۲۲ھ کو اس دنیا سے رحلت فرما گئیں۔

آہ!

ملے خاک میں اہل شاں کیسے کیسے
مکیں ہوگئے لامکاں کیسے کیسے

اک دن مرنا ہے آخر موت ہے
کر لے جو کرنا ہے آخر موت ہے

گھر میں اس کام کے دوران جب مسلسل کئی کئی گھنٹے بیٹھا رہتا تو انہیں بار بار احساس ہوتا اور مجھے آرام کرنے کے لئے فرمایا کرتی تھیں۔

اللھم اغفر لھا مغفرۃ کاملۃ واغسل خطا یا ھا بماء الثلج و البرد۔

بندہ سفیر احمد ثاقب

۱۵/۶/۱۴۲۳ھ

عکس تحریر حضرت شیخ الاسلام مدظلہم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وکفی، وسلام علی عبادہ الذین اصطفی،

أما بعد!

حضرت شاہ عبد العزیز صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر عزیزی کے بارے میں یہ بات اہلِ علم میں معروف ہے کہ وہ ایک انوکھے انداز کی تفسیر ہے، اور اسمیں قرآن کریم کے اسرار و حکم اور حقائق و معارف نرالے انداز سے بیان فرمائے گئے ہیں۔ اصل تفسیر فارسی زبان میں ہے، اور اس کا اردو ترجمہ بھی ہوا ہے، لیکن ترجمہ قدیم انداز کا ہے، اسلئے عصرِ حاضر کی طبائع اس سے کما حقہٗ استفادے کے قابل نہیں۔ برادرِ عزیز و مکرم مولانا سفیر احمد ثاقب صاحب (فاضل دار العلوم کراچی) نے زیرِ نظر کتاب میں تفسیر کا سلیس، بامحاورہ اور آسان ترجمہ کرنے کی کوشش کی ہے جس سے تفسیر کے مضامین سمجھنا نسبۃً آسان ہو جائے، انہوں نے لفظی ترجمے کے بجائے مفہوم کو اپنے الفاظ میں بیان فرمایا ہے، اور ضرورت کے مطابق قوسین میں تشریحی اضافے بھی کئے ہیں۔ نیز عنوانات اور پیراگرافوں کی ترتیب کے ذریعے اسکے مطالعے اور اس سے استفادے کو سہل بنادیا ہے۔

پارہ عم پیران کا یہ کام مکمل ہو کر شائع ہو رہا ہے۔ بندے نے کمپوز شدہ صفحات کا ایک معتد بہ حصّہ دیکھا، اور اسے نہایت سلیس اور واضح پایا۔ امید ہے کہ عزیز موصوف سلمہٗ کی یہ کاوش اس تفسیری خزانے کو عام کرنے اور سہل الحصول بنانے میں ان شاء اللہ نہایت مفید ثابت ہوگی۔ اللہ تعالیٰ اس کوشش کو قبول فرمائیں، اسے ان کیلئے ذخیرۂ آخرت بنائیں، اور انہیں اس کام کی تکمیل کی توفیق عطا فرماکر مزید علمی و دینی کاموں کیلئے موفق فرمائیں۔ آمین۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

بندہ

محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۸ رجب المرجب ۱۴۲۳ھ

نوٹ:۔ یہ کلمات حضرت نے دورانِ سفر چلتی ہوئی گاڑی میں تحریر فرمائے ہیں۔

کلمات طیبات

شیخ الاسلام مجدد فقہ المعاملات حضرت اقدس مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وکفی، وسلام علی عبادہ الذین اصطفی

أمابعد!

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر عزیزی کے بارے میں یہ بات اہلِ علم میں معروف ہے کہ وہ ایک انوکھے انداز کی تفسیر ہے، اوراس میں قرآن کریم کے اسرار وحکم اور حقائق و معارف نرالے انداز سے بیان فرمائے گئے ہیں۔ اصل تفسیر فارسی زبان میں ہے، اوراس کا اُردو ترجمہ بھی ہوا ہے، لیکن ترجمہ قدیم انداز کا ہے، اس لئے عصرِ حاضر کی طبائع اس سے کماحقہٗ استفادے کے قابل نہیں۔ برادرِ عزیز ومکرم مولانا سفیر احمد ثاقب صاحب (فاضل دارالعلوم کراچی) نے زیرِنظر کتاب تفسیر کا سلیس، بامحاورہ اور آسان ترجمہ کرنے کی کوشش کی ہے جس سے تفسیر کے مضامین سمجھنا نسبۃً آسان ہوجائے، انہوں نے لفظی ترجمے کی بجائے مفہوم کو اپنے انداز میں بیان فرمایا ہے، اور ضرورت کے مطابق قوسین میں تشریحی اضافے بھی کئے ہیں۔ نیز عنوانات اور پیراگراف کی ترتیب کے ذریعے اس کے مطالعے اوراس سے استفادے کوسہل بنادیا ہے۔

پارۂ عمّ پر اُن کا کام مکمل ہوکر شائع ہورہا ہے۔ بندے نے کمپوز شدہ صفحات کا ایک معتدبہ حصہ دیکھا، اوراسے نہایت سلیس اور واضح پایا۔ اُمید ہے کہ عزیز موصوف سلمہٗ کی یہ کاوش اس تفسیری خزانے کو عام کرنے اور سہل الحصول بنانے میں ان شاء اللہ نہایت مفید ثابت ہوگی۔ اللہ تعالیٰ اس کوشش کو قبول فرمائیں، اسے ان کے لئے ذخیرۂ آخرت بنائیں، اورانہیں اس کام کی تکمیل کی توفیق عطا فرما کر مزید علمی و دینی کاموں کے لئے موفق فرمائیں۔ آمین۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

بندہ

محمد تقی عثمانی عفی عنہ

٨/ رجب المرجب ١٤٢٣ھ

تقریظ

حضرت مولانا مفتی محمود اشرف صاحب عثمانی مدظلہ

استاذ حدیث جامعہ دارالعلوم کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم وعلی آلہ واصحابہ اجمعین۔ امابعد

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی قدس سرّہ کی تفسیر عزیزی تفاسیر قرآن میں اپنی مثال آپ ہے، کہنے والوں کا کہنا ہے کہ اگر یہ تفسیر مکمل ہو جاتی تو علوم و معارف قرآنی کا نادر شاہکار ہوتی اور تفسیر کبیر کے ہم پلّہ ہوتی مگر قضاء وقدر کے فیصلہ سے تفسیر مکمل نہ ہو سکی لیکن سورۂ بقرہ، پارہ تبارک الذی اور پارۂ عم کے جو مطبوعہ حصے ملتے ہیں وہ بھی کم حیرت انگیز نہیں ہیں اور ان سے علوم و معارف کی نئی راہ کھلتی ہے۔

اصل تفسیر تو فارسی میں تحریر کی گئی تھی مگر فی الوقت اس کا جو اُردو ترجمہ دستیاب ہے اس کی زبان بھی بہت قدیم ہے اور عام لوگوں بلکہ علماء کے لئے بھی اس اُردو ترجمے سے استفادہ کرنا مشکل ہو گیا ہے۔

احقر کی عرصہ سے خواہش تھی کہ اس کا دور حاضر کی زبان کے مطابق سلیس اُردو میں ترجمہ کیا جائے اپنی ناکارگی کی وجہ سے خود ہمت نہ کر سکا تو ایک دو احباب کو اس طرف توجہ دلائی مگر کام پھر بھی شروع نہ ہو سکا، یہاں تک کہ اس نیک کام کا قرعۂ فال عزیز مکرم مولانا سفیر احمد صاحب سلمہم اللہ تعالیٰ وزیدت مکارمہم کے نام نکلا اور انہوں نے اپنے شوق سے اس کام کا بیڑا اُٹھایا اور بحمد اللہ تعالیٰ انہوں نے کچھ ہی عرصہ میں تفسیر عزیزی پارہ عم کے اس حصہ کو جدید اُردو کے قالب میں ڈھال دیا۔

جزاہم اللہ تعالیٰ خیرا من عندہ۔ اب یہ ترجمہ طباعت کے لئے تیار ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس ترجمہ کو نافع اور مقبول بنائیں، مصنف حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس سرّہ، مترجم اوّل مولانا محمد علی چاندپوریؒ اور اب مترجم ثانی مولانا سفیر احمد صاحب زید مجدہم کے لئے ذخیرۂ آخرت بنا کر اسے علوم قرآنی کے فیضان کا ذریعۂ عام بنا دیں۔ آمین

محمود اشرف غفر اللہ لہ

۱۴۲۳/۹/۱۵ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد لله و كفى وسلام على عباده الذين اصطفى

اما بعد!

دیباچہ تفسیر عزیزی جدید

مختصر حالات مصنف تفسیر عزیزی اور کچھ حقیر کاوش کے بارے میں چند گذارشات۔

حالات حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ

امام العلماء، رأس الفضلاء، علامۂ محدث، شاہ عبدالعزیز بن شاہ ولی اللہ بن شاہ عبدالرحیم عمری، دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ، خود اپنے زمانہ کے علماء کے سردار اور گذشتہ علماء کے سرتاج کے چشم و چراغ، بعض لوگوں نے آپ کو ''سراج الہند'' اور بعض نے ''حجۃ اللہ'' کا خطاب دیا۔

آپ پنجشنبہ کی رات ۲۵ رمضان ۱۱۵۹ھ میں پیدا ہوئے، جیسا کہ آپ کے تاریخی نام ''غلام حبیب'' سے معلوم ہوتا ہے۔ آپ نے قرآن مجید کے حفظ سے فراغت پائی اور اپنے والد ماجد سے تعلیم کا سلسلہ شروع کیا، آپ نے ان سے قراءت وسماعت کے ذریعہ پوری تحقیق و درایت اور توجہ سے علم حاصل کیا، جس سے آپ کو علوم میں ملکۂ راسخہ حاصل ہو گیا۔ جب آپ ۱۶ سال کے تھے تو آپ کے والد ماجد نے انتقال کیا۔ ان کے بعد آپ نے والد گرامی قدر کے اخص وارشد تلامذہ سے استفادہ کیا، جو کچھ تشنۂ تکمیل رہ گیا تھا اس کی باحسن وجوہ تکمیل فرمائی۔

آپ طویل القامہ، نحیف البدن، گندم گوں، کشادہ چشم تھے، ڈاڑھی گھنی تھی، خط نسخ و رقاع بہت نفیس تھا، تیر اندازی، شہسواری میں مہارت تھی، آپ سے آپ کے بھائیوں، شاہ رفیع الدینؒ، شاہ عبدالقادرؒ، شاہ عبدالغنیؒ اور آپ کے داماد مولانا عبدالحی بڈھانویؒ نے درس لیا۔ مفتی الٰہی بخش کاندھلویؒ اور سید قمر الدینؒ سونی پتی بھی آپ کے بھائیوں کے ساتھ آپ سے شرف تلمذ میں شریک تھے۔ آپ کے نواسہ شاہ محمد اسحاقؒ آپ کے یہاں قاری تھے۔ جو ہر روز قرآن مجید کے ایک رکوع کی تلاوت کرتے تھے، اور شاہ صاحبؒ اس کی تفسیر فرماتے تھے، یہی آپ کے والد ماجد حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کا طریقہ بھی تھا، شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا آخری درسِ قرآن، آیت ''اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ

لِلتَّقْوٰی" تک ہوا تھا، جہاں سے شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے اپنا درس شروع کیا، آپ کا آخری درس "اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَاللّٰهِ اَتْقٰکُمْ" تک ہوا تھا، وہاں سے آپ کے نواسہ شاہ محمد اسحاق صاحبؒ نے اپنا درس شروع کیا۔

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ صاحب کا درس قرآن ہر ہفتہ سہ شنبہ اور جمعہ کے روز ہوتا تھا، جس میں خواص بطریقِ خاص اور عوام بڑے ذوق وشوق سے شریک ہوتے تھے، اس درس میں آپ کی طبیعت اپنے پورے جوش پر ہوتی تھی، اور مضامین کی آمد سیلِ رواں کی طرح، اس درس سے دارالسلطنت دہلی میں (جو علماء وفضلاء کا مرکز تھا) قرآن مجید کا ذوق عام ہوا، اصلاح عقائد کی ایک طاقتور رَو چلی، اور ترجمۂ قرآن اور تفسیر کا وہ مبارک سلسلہ شروع ہوا جو اس وقت تک اس برصغیر میں جاری ہے۔ اور جس سے لاکھوں انسانوں کی اصلاح ہوئی۔ اور ان کے دل ودماغ حلاوتِ توحید اور لذتِ قرآن سے آشنا ہوئے۔ خود مدارسِ عربیہ میں اسی درس کے فیض یافتہ اور تربیت یافتہ علماء کے اثر سے متنِ قرآن کے درس کا سلسلہ شروع ہوا۔ جس کو نصاب درس میں مختصر تفسیر کی شکل میں تبرکاً جگہ دی گئی تھی۔ اور علماءِ دنیا کا پھیلا ہوا یہ طلسم ٹوٹا کہ قرآن مجید کی اشاعت عوام میں بڑے دینی خطرات بلکہ ضلالت کا پیش خیمہ ہے۔ اس میں یہ مخفی اندیشہ کام کر رہا تھا کہ عوام ان پیشہ ور علماء کے ہاتھ سے نکل جائیں گے۔

"مقالاتِ طریقت" میں ہے، آپ اپنے علم وفضل، فہم وذکاء اور سرعت حفظ میں یگانۂ روزگار تھے، آپ نے پندرہ سال کی عمر میں درس وافادہ کا سلسلہ شروع کر دیا، آپ سے بڑے بڑے فضلاء نے استفادہ کیا، اکثر اطراف کے طلبہ آپ کی خدمت میں اس ذوق وشوق سے حاضر ہوئے جیسے پیاسا پانی پر گرتا ہے۔

پچیس (۲۵) سال کی عمر میں آپ کو متعدد اذیّت رساں امراض نے گھیر لیا، جن کے سبب آپ مراق، جذام، برص میں مبتلاء ہوئے۔ اور بصارت بھی جاتی رہی، بعض واقفانِ حال نے آپ کے چودہ تکلیف دہ امراض کا ذکر کیا ہے۔ اس وجہ سے آپ نے اپنی تدریسی ذمہ داری اپنے دونوں بھائیوں شاہ رفیع الدین صاحبؒ اور شاہ عبدالقادر صاحبؒ کے سپرد کر دی، مگر اس کے ساتھ خود بھی درس دیتے تھے۔ تصنیف وافتاء اور وعظ کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا۔ اخیر عمر میں آپ مجلس میں تھوڑی دیر بھی نہیں بیٹھ سکتے تھے، اس لئے اپنے قدیم وجدید مدرسے کے درمیان ٹہلتے رہتے اور لوگ بڑی تعداد میں اس حالت میں

بھی استفادہ کرتے۔اسی طرح عصر و مغرب کے درمیان دو آدمیوں کی مدد سے مدرسہ اور جامع مسجد کی درمیانی سڑک پر نکلتے تھے، لوگ راستہ میں آپ کے منتظر رہتے اور اپنی مشکلات حل کراتے۔انہیں امراض میں عدمِ اشتہا کا مرض اس حد تک بڑھ گیا کہ کئی کئی دن کسی چیز کے چکھنے کی نوبت نہ آتی۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ آپ ان موذی امراض کے باوجود لطیف الطبع، حاضر جواب، خوش گفتار رہے، تواضع، بشاشت اور مہر و محبت کی یہی اداء قائم رہی جو شروع سے تھی، آپ کی مجالس میں حیرت انگیز خبریں، چیدہ اشعار، دور دراز کے ملکوں، ان کے باشندوں اور وہاں کے عجائبات کا بیان اس طرح ہوتا تھا جس سے سامعین کو محسوس ہوتا تھا کہ آپ اپنے مشاہدات بیان فرما رہے ہیں۔حالانکہ آپ نے کلکتہ کے علاوہ کوئی شہر نہیں دیکھا تھا، مگر آپ غیر معمولی طور پر ذہین اور متجس فطرت کے مالک تھے، جس کے سبب آپ نے باہر سے دہلی آنے والوں اور معلومات افزاء کتابوں سے یہ معلومات اپنے دماغ میں محفوظ کر لی تھیں۔

لوگ آپ سے علمی استفادہ کے لئے حاضر ہوتے، شاعر و ادیب، ادبی استفادہ اور اپنا کلام دکھانے کیلئے اور محتاج و ضرورت مند لوگ امراء سے سفارش کرانے اور آپ کی ممکن مدد حاصل کرنے کیلئے آتے، کیونکہ آپ کے اخلاقِ کریمانہ کی شہرت عام تھی۔اسی طرح مریض دواء علاج کیلئے حاضر ہوتے، اہلِ جذب وسلوک آپ سے روحانی استفادہ کے لئے آپ کے پاس جاتے تھے۔پردیسی علماء ومشائخ کو آپ اپنے یہاں ٹھہراتے اور ان کی حاجت روائی کرتے، اگر آپ کے پاس کوئی مخالف بیٹھتا تو آپ اپنی حکیمانہ سحر بیانی سے آگ و پانی کے درمیان اتحاد پیدا کر دیتے، اور وہ آپ سے متفق و ہم خیال ہو کر جدا ہوتا۔

شیخ محسن بن یحییٰ ''الیانع الجنی'' میں آپ کے کمالات شمار کرتے ہوئے کہتے ہیں ''آپ کے ایسے ہی کمالات میں آپ کی بے مثل فراست تھی، جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے تعبیر خواب کی امتیازی صلاحیت عطا کی تھی، آپ خواب کی ایسی تعبیر دیتے جو پوری ہوتی تھی اور آپ کی چشم دید معلوم ہوتی تھی۔یہ صلاحیت بڑے پاک نفس انسانوں ہی کے حصہ میں آتی ہے۔اللہ تعالیٰ نے آپ کی ذات میں گوناگوں فضائل جمع کر دیئے تھے، اگر یہ شعر کہنے والا شاعر ان کو دیکھتا تو اس کو صاف معلوم ہوتا کہ اس کا مبالغہ بھی قاصر ہے۔

ولم أر أمثال الرجال تفاوتا

لدى المجد حتى عُدّ الف بواحد

(میں نے انسانوں کی طرح فرق مراتب نہیں دیکھا جسکے سبب ہزار انسان ایک کے برابر شمار ہوتے ہیں)

اس صورت میں آپ کے مفاخر وفضائل کا شمار کون کرسکتا ہے؟ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی تمام تصنیفات علماء کے حلقہ میں بالعموم وقعت ومقبولیت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں اور ان سے استدلال کیا جاتا ہے۔

آپ کے کلام میں تاثیر وتسخیر کی ایسی قوت ہے کہ اس سے متاثر ومتفق نہ ہونا مشکل ہے۔ آپ کوئی قابل اعتراض تحریر دیکھتے تو بڑی خوش اسلوبی سے اس کی تردید فرماتے تھے۔ کلامی مسائل میں مذہب تشیع آپ کا خاص موضوع بحث وتنقید رہا ہے۔ چنانچہ ''تحفۂ اثنا عشریہ'' اس کا شاہد ہے جس میں آپ نے ایسے عالمانہ ومتکلمانہ انداز سے بحث کی ہے کہ اس کا جوابِ شافی ابھی تک مخالف سے نہ ہوسکا۔

وفات حسرت آیات:

نماز فجر کے بعد اتوار کے دن ۷ شوال ۱۲۳۹ھ کو اسی (۸۰) سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔ آپ کی قبر دہلی میں شہر کے باہر والد ماجد کے قریب ہے۔

تصانیف:

آپ کی مشہور تصانیف میں یہ کتابیں ہیں:۔

(۱) الفتاویٰ فی المسائل المشکلة

(۲) تحفۂ اثنا عشریہ۔ مذہب شیعہ کے رد میں لکھی گئی ہے، ایک بے مثل کتاب ہے۔

(۳) بستان المحدثین۔ کتب حدیث اور محدثین کے تذکرہ میں ہے، جو نامکمل رہی

(۴) العجالة النافعه (۵) میزان البلاغة

(۶) السرا لجلیل فی مسئلة التفضیل. اس میں خلفاء راشدین کے فرق مراتب پر گفتگو ہے۔

(۷) سرّ الشهادتين (۸) تفسیر فتح العزیز

ان کے علاوہ بھی بعض رسائل اور بہت سی کتابوں پر حواشی لکھے۔ جو اپنے باب میں استناد رکھتے ہیں۔

فتح العزیز۔ المعروف تفسیر عزیزی

تفسیر فتح العزیز، حضرت شاہ صاحب کا بہت بڑا علمی کارنامہ شمار کیا گیا ہے۔ اس کو ''تفسیر عزیزی'' اور ''بستان التفاسیر'' کا نام بھی دیا گیا ہے۔ یہ آپ کی باقاعدہ املاء کرائی گئی تفسیر ہے، جسے آپ نے شدت مرض اور ضعف کی حالت میں املاء کرایا تھا، یہ کئی بڑی جلدوں میں تھی، اس کا بڑا حصہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں ضائع ہوگیا۔ اب جو دستیاب ہے وہ سورۂ فاتحہ، سورۂ بقرہ، پارہ تبارک الذی اور عمّ پارہ کی تفسیر ہے۔ سورۂ بقرہ بھی دوسرے پارے کے ربع تک طبع ہوسکی ہے۔ اور اس وقت آپ کے ہاتھ میں عمّ پارہ کی تفسیر ہے۔ یہ کتاب اصل فارسی میں تھی، فارسی میں اس کی تین جلدیں پہلے متعدد بار شائع ہوئی ہیں۔

شاہ صاحب کے شاگرد رشید علامہ حیدر علی فیض آبادیؒ نے اس کا ''تکملہ'' ستائیس جلدوں میں لکھا تھا، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ (جن کی کتاب سے یہ تذکرہ ماخوذ ہے) نے فرمایا ہے کہ اس ''تکملہ'' کے صرف ابتدائی پانچ پاروں کا حصہ کتب خانہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں موجود ہے، باقی نایاب ہے۔

حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ تعالیٰ نے ''مشکلات القرآن'' کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ فرمایا کرتے تھے کہ تفسیر قرآن کا امت پر قرض باقی ہے، اگر تفسیر عزیزی مکمل ہوجاتی تو یہ قرض اُتر جاتا۔ اس سے اس تفسیر کی اہمیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

یہ تفسیر اگرچہ مکمل نہیں ہے، لیکن جو حصہ دستیاب ہے وہ بھی علوم و معارف کا ایک خزینہ ہے۔ کوئی عالم اس سے بے نیاز نہیں ہوسکتا اور کوئی دوسری تفسیر اس کا بدل نہیں ہوسکتی۔ بندہ نے اس حصہ پر جو عمّ پارہ کا ہے کام کے دوران اکثر دیگر بڑی تفاسیر مثلاً روح المعانی، تفسیر کبیر، کشاف وغیرہ کی طرف بکثرت مراجعت کی، اندازہ ہوا کہ جو کچھ اس میں ہے وہ ان میں سے کسی میں بھی نہیں ہے۔

تفسیر عزیزی کے امتیازات

(۱) ہر سورت کی تفسیر شروع کرنے سے پہلے ایک بحث ہوتی ہے جس میں اس سورت کی آیات، کلمات اور حروف کی تعداد ذکر کرنے کے بعد، ماقبل سے ربط کی وجوہ، سورت کا شانِ نزول، اس کی وجہ تسمیہ اور مضامین کا خلاصہ درج ہوتا ہے۔ اس ضمن میں کئی دیگر فوائد بھی کہیں کہیں آجاتے ہیں، بعض

سورتوں کے شروع میں یہ بحث خاصی طویل ہے اور کہیں مختصر، بندہ نے اس بحث کا نام مقدمہ رکھا ہے۔

(۲) تفسیر کرتے ہوئے کوئی پہلو تشنہ نہیں چھوڑتے بلکہ ایسے ایسے دقیق نکتے بیان کرتے جاتے ہیں کہ کسی دوسرے کے فکر کی وہاں تک رسائی مشکل ہے۔

(۳) اسرار و حِکَم کا ایک عظیم ذخیرہ ہے جو خالص وہبی والہامی چیز ہے کسی دوسری کتاب میں ملنے کا امکان نہیں۔

(۴) کوئی سورت ایسی نہیں جس میں ایسے مباحث نہ ہوں جنہیں عجوبہ قرار نہ دیا جاسکتا ہو۔ اس لئے یہ مشکل ہے کہ مثال کے لئے کسی خاص سورت کا نام لیا جائے۔

(۵) آیات، احادیث، فقہ، اصول فقہ، بلاغت و معانی، صرف ونحو، تاریخ، فلکیات وفلسفہ، طب و رقیہ، خواصِ اشیاء اور تصوف واخلاق الغرض کوئی علم وفن ایسا نہیں جس کی کوئی بات توضیح مقام کے لئے اگر کہیں مفید یا کسی ضمنی بحث میں مناسب مقام ہوئی ہو اور اسے ذکر نہ کیا ہو۔

(۶) حل مقام میں ادنیٰ سے ادنیٰ شبہہ، اور اہل باطل کے شبہات کا جگہ جگہ مفصل رد اسکے خواص میں سے ہے۔

(۷) اس کے اوصاف کہاں تک گنوائے جائیں، اکابر نے بجا طور پر اس کو اپنے موضوع پر بے نظیر قرار دیا ہے۔ اس سے لطف اٹھانے اور ان علوم و معارف سے مستفید ہونے کے لئے بس اس کے مطالعہ کی ضرورت ہے، پڑھنے والے پر خود ہی حقیقت منکشف ہو جائے گی۔

قدیم اردو ترجمہ

اصل فارسی کا ایک قدیم اُردو ترجمہ آج کل عام ہے جو مولانا محمد علی چاند پوری رحمہ اللہ کا کیا ہوا ہے۔ وہی بکثرت شائع ہوتا ہے، جس کی چار جلدیں ہیں، لیکن اس سے استفادہ کرنے میں خاصی دشواری تھی جس کی وجوہ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) یہ تقریباً تحت اللفظ ترجمہ ہے۔ جسے کچھ دیر کے لئے پڑھنا بھی صبر آزما کام ہے۔

(۲) اُردو بہت قدیم ہے، پیراگراف وغیرہ کا لحاظ نہیں، عنوانات بہت کم اور صفحات کے اطراف میں ہیں۔

(۳) اجمال کی وجہ سے مراد سمجھنے میں بہت مشکل ہوتی ہے۔

اس لئے اس جلیل القدر کتاب سے جو استفادہ کرنا چاہئے وہ نہیں ہو رہا تھا۔ لہٰذا ضرورت تھی کہ اس

کو سلیس کیا جائے۔اس کی ایسی خدمت کی جائے جس سے استفادہ کی طرف رغبت پیدا ہو۔ بندہ کو اس کے کچھ حصے کے مطالعہ کی توفیق ہوئی تو غیر معمولی متاثر ہوا، لیکن قدیم ترجمے کی گنجلک عبارت اور عنوانات و تزیین نہ ہونے کی وجہ سے خیال پیدا ہوا کہ اگر اس کی قدرے تسہیل کردی جائے یعنی اس ترجمے کو اس طرح سلیس کردیا جائے کہ عبارت میں جہاں کہیں اجمال ہو اس کی کچھ وضاحت بھی ہوجائے تاکہ طالب علموں خاص طور پر درجۂ ثانیہ کے طلبہ (جن کے نصاب میں ''عم پارہ'' کی تفسیر شامل ہے) کے لئے استفادہ آسان ہوجائے اور ساتھ ساتھ یہ بھی غرض تھی کہ بندہ کا علمی فائدہ بھی ہوجائے گا۔اور کسی قدر خدمتِ قرآن کی سعادت بھی نصیب ہوجائے گی۔

چنانچہ بندہ نے اپنے بعض اساتذہ اور مشائخ کی اجازت اور دعاء کے سہارے اللہ کا نام لے کر اس کام کی ابتداء کردی۔ جب بندہ نے اس کام کا ارادہ کیا اس وقت قطعاً اس کا اندازہ نہیں تھا کہ بندہ جیسے کم علم و کم فہم کے لئے یہ کام آسان نہیں، لیکن جوں جوں کام آگے بڑھایا بندہ کو اپنی کم مائیگی کا بار بار احساس ہونے لگا، اور یہ خیال ہونے لگا کہ یہ کام کسی باصلاحیت آدمی کے کرنے کا تھا، لیکن اپنے بزرگوں کی دعاؤں اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اپنی حیثیت و بساط کے مطابق جیسا کچھ ہوسکتا تھا وہ الحمدللہ ''عم پارے'' پر مکمل ہوگیا، جو اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

اس کام کی ابتداء شعبان ۱۴۲۰ھ میں کی تھی جب بندہ اپنے آبائی علاقے باغ آزاد کشمیر کی معروف دینی درسگاہ دارالعلوم تعلیم القرآن میں تدریس کی خدمت پر مامور تھا، اور اس کا اکثر حصہ وہیں لکھا، اور تکمیل مورخہ ۲۲ ربیع الاول ۱۴۲۲ھ کو کراچی میں ہوئی کہ قضاء و قدر کے تحت بندہ دارالافتاء والارشاد کے فیوض سے فیضیاب ہونے کراچی پہنچادیا گیا اور اس وقت جامعۃ الرشید احسن آباد میں تدریس و افتاء کی خدمت سے متعلق ہے۔

حقیر کاوش

اس میں بندہ نے جو حقیر کاوش کی ہے اس کی تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

(۱) بندہ کے سامنے ایچ ایم سعید کمپنی کراچی کا مطبوعہ قدیم اُردو ترجمہ تھا، بندہ نے اس کے ساتھ اصل فارسی نسخہ کی نقل دارالعلوم کراچی کے کتب خانہ سے حاصل کی جو استاذ محترم حضرت مولانا محمود اشرف عثمانی صاحب مدظلہ نے اپنے مصارف سے کروا کردی۔ فجزاہ اللہ تعالیٰ خیرا

(۲) اصل فارسی کی طرف اکثر مراجعت کی ضرورت پڑتی تھی، اسلئے اصل کے ساتھ مقابلہ بھی ہوتا رہا۔

(۳) اس کے ساتھ جہاں ضرورت محسوس ہوتی عربی تفاسیر مثلاً روح المعانی، تفسیر کبیر، کشاف اور تفسیر حقانی اُردو کی طرف اور کہیں کہیں تفسیر عثمانی کی طرف بھی مراجعت کی ہے۔ تفسیر حقانی میں اس تفسیر سے بہت استفادہ کیا گیا ہے مگر حوالہ مذکور نہیں۔

(۴) قدیم ترجمے کو سلیس کرنے اور اس کی تسہیل کی کوشش کی ہے، اس طرح سے کہ جہاں اجمال تھا اس کو کھولنے کی کوشش کی ہے۔

(۵) حتی الامکان یہ کوشش رہی کہ تسہیل و تفصیل میں حضرت مصنف رحمہ اللہ کی مُراد واضح ہو، تسہیل کی بجائے تحریف نہ ہو جائے تاہم اگر اہل علم کو کہیں شبہ ہو تو اصل کی طرف مراجعت فرمائیں، اور پھر بندہ کو بھی اطلاع دے دیں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اس کو درست کیا جا سکے۔

(۶) اسکے ساتھ بین القوسین میں بھی کہیں کہیں وضاحت کی گئی ہے تاکہ مطلب جلد سمجھ میں آ جائے۔

(۷) بعض مواقع پر حواشی کی ضرورت محسوس ہوئی اس لئے کہیں کہیں حواشی بھی درج ہیں۔

(۸) تمام عنوانات بندہ نے نئے لگائے ہیں، قدیم ترجمے کے عنوانات نہیں لئے گئے۔ جو کہیں کہیں صفحے کے اطراف میں درج تھے۔

(۹) ہر آیت کے ساتھ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کے ترجمے کا اضافہ کیا گیا ہے اس کے بعد ''یعنی'' کے ساتھ تفسیر عزیزی کا ترجمہ بھی درج کیا ہے، اس لئے کہ وہ تفسیری ترجمے جو فارسی میں تھا کا اُردو ترجمہ ہے، لہٰذا اصل اُردو ترجمے کی ضرورت تھی سو اس لئے حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کا ترجمہ لکھ دیا گیا ہے۔

(۱۰) ہر سورت کے شروع میں جو بحث تھی بندہ نے اس کو مقدمہ کا عنوان دیا ہے۔

(۱۱) ہر صفحے کی پیشانی پر سورت کا نام لکھ دیا ہے۔ تفسیر والے حصے اور سورت کے مقدمے کے درمیان امتیاز رکھنے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ سورت کے مقدمے والے صفحات کی پیشانی پر سورت کے نام کے ساتھ مقدمہ کا لفظ بڑھا دیا ہے۔ مثلاً ''مقدمۂ نباء'' اور تفسیر والے حصے میں تفسیر کے لفظ کا اضافہ کیا ہے مثلاً ''تفسیر سورۂ نباء'' علی ھذا القیاس

(۱۲) یہ نقش اوّل ہے، اس لئے اس میں ابھی بہت سی باتیں قابل اصلاح یا قابلِ اضافہ ضرور ہوں گی۔ یوں بھی تمام خوبیوں کا احاطہ کر لینا اور کوئی کمی نہ چھوڑنا انسان کے بس کا کام نہیں ہے، اہلِ علم سے توقع

ہے کہ ضرور قابلِ اصلاح باتوں کی طرف راہنمائی فرمائیں گے۔قابل تسامح امور سے درگذر فرمائیں گے۔

اس کام کو کرنے کا اوّل داعیہ عوام الناس کے لئے قابلِ استفادہ بنانے کے لئے پیدا ہوا تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اب بھی اس سے صحیح معنیٰ میں استفادہ طالب علم حضرات ہی کر سکیں گے، لیکن عام لوگ بھی ان شاء اللہ اس سے بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔

(۱۳) قارئین کرام اگر قدیم اُردو ترجمے کا ایک صفحہ اس تسہیل کردہ ترجمہ کے ساتھ مقابلہ کریں تو ان شاء اللہ انہیں فرق واضح نظر آئے گا، اور اسے مفید پائیں گے۔

(۱۴) ناسپاسی ہوگی اگر حضرت الاستاذ شیخ الاسلام مدظلہم کا شکریہ ادا نہ کیا جائے جن کی دعاؤں کے سہارے یہ کام شروع کیا، پھر ذرہ نوازی فرماتے ہوئے اپنا قیمتی وقت نکال کر اس کا معتدبہ حصہ مطالعہ فرمایا، اور بندہ کی اتماس پر گراں قدر کلمات تحریر فرمائے۔اسی طرح بندہ استاد محترم حضرت مولانا محمود اشرف عثانی صاحب مدظلہم کا بھی شکر گذار ہے جن کی حوصلہ افزائی، راہنمائی اور سرپرستی میں بندہ اس کام کے لئے آمادہ ہوا۔اسی طرح بندہ کمپوزر بھائی محمد اعجاز کا بھی شکر گذار ہے جنہوں نے بہت محنت اور قرآن کی خدمت کے جذبے سے اسے کمپوز کیا، اور بار بار کمپوز شدہ حصہ میں تصحیح کے مطابق تبدیلیاں کیں، اور خود تصحیح میں بھی بندہ کی بہت معاونت فرمائی۔فجزاهم الله تعالى خير الجزاء

اس میں جہاں کہیں کوئی غلطی یا کمی نظر آئے تو وہ اس بندہ کی کوتاہ فہمی ہے، اور اس میں جو کچھ علوم و معارف اور جو طرز و اسلوب ہے وہ حضرت مصنف علاّم علیہ الرحمہ کا کمال ہے، اس کتاب سے استفادہ کرنے والے حضرات، حضرت مصنف رحمہ اللہ کیساتھ بندہ کو، اس کے اساتذہ و مشائخ اور والدین کو بھی اپنی دعواتِ صالحہ میں ضرور یاد فرمائیں۔

الحمدلله اولاو آخرا . ربنا تقبل منا انک انت السميع العليم

بندہ

سفیر احمد ثاقب

۲۶ ذی الحجہ ۱۴۲۲ھ

ناظم آباد کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدّمہ سورۂ نباء/تساؤل

اس سورت کا نام ''تساؤل'' ہے اور اسکو ''سورۂ بناء'' بھی کہتے ہیں۔ یہ مکی ہے یعنی ہجرت سے قبل نازل ہوئی ہے۔ اس میں چالیس (۴۰) آیات، ایک سو تہتر (۱۷۳) کلمات اور سات سو (۷۰۰) حروف ہیں۔

ربط کی وجوہات

اس سورت کا ربط سورۂ ''مرسلات'' کے ساتھ مختلف اعتبار سے ہے۔

(۱) ان دونوں سورتوں میں جزا اور سزا کے معاملے کو ''یوم الفصل'' کے آنے کے ساتھ وابستہ کیا ہے، اور تھوڑا سا حال ''یوم الفصل'' کا بھی بیان فرمایا ہے، اور کافروں کو قیامت کے آنے میں جو تعجب ہو رہا ہے اور یہ سمجھتے ہیں کہ قیامت یعنی جزا وسزا کا معاملہ اگر واقعی ہونا ہے تو وہ جلدی اسی دنیا میں کیوں نہیں ہو جاتا؟ ان کے اس تعجب اور شبہے کو بھی اس مقدمے سے دور کر دیا کہ قیامت کا وقوع ''یوم الفصل'' کے آئے بغیر نہیں ہو سکتا، اور ''یوم الفصل'' کا آنا موقوف ہے اس کائنات کے فنا ہونے اور نوع انسانی کے انقطاع پر، اسکے بغیر یوم الفصل ممکن نہیں اور یوم الفصل کے بغیر جزاء وسزا کا قیام ممکن نہیں ہے، لہٰذا اس سے پہلے جزاء وسزا کا مطالبہ کرنا ایسے ہی ہے جیسے گرمی کے موسم میں جبکہ سردیوں کا موسم نہیں آیا کوئی سردیوں کا پھل مانگے یا جاڑوں میں گرمیوں کا میوہ طلب کرے ظاہر ہے ایسا کرنا حماقت اور بے فائدہ محنت کے سوا کچھ نہیں۔

(۲) اسی سبب سے دونوں سورتوں کے مضمون میں بھی بہت مشابہت ہے۔

چنانچہ سورۂ ''مرسلات'' میں ہے ''اذا السماء فرجت و اذا الجبال نسفت'' اور سورۂ نباء میں ہے ''وَفُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا ۝ وَّسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا''

سورۂ ''مرسلات'' میں ہے ''الم نجعل الارض کفاتا وجعلنا فیھا رواسی شامخات و اسقینا کم ماءً فراتا'' اور سورۂ نباء میں ہے ''اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ۝ وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا ۝ وَّاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا''

اسی طرح ''مرسلات'' میں جہنم کی سوزش، اس کا بھڑکنا اور شعلے مارنا مذکور ہے، اور سورۂ ''نباء'' میں ذکر کیا گیا ہے کہ جہنم میں ٹھنڈا پانی نہیں ہوگا، اہل جہنم گرم پانی پئیں گے۔

''مرسلات'' میں ''ھذا یوم لا ینطقون'' مذکور ہے۔ اور ''نباء'' میں ''یَوْمَ یَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِکَۃُ صَفًّا لَا یَتَکَلَّمُوْنَ'' مذکور ہے۔

''مرسلات'' میں ''ان المتقین فی ظلال و عیون وفواکہ'' مذکور ہے۔ اور ''نباء'' میں متقیوں کے لئے ''حَدَآئِقَ وَاَعْنَابًا'' کا وعدہ کیا گیا ہے۔

اسی طرح ''مرسلات'' میں ارشاد فرمایا ہے کہ اگر کافروں سے دنیا میں کہا جائے کہ اللہ کے واسطے ایک مرتبہ سجدہ کرو تو وہ کبھی نہ کریں اور سورۂ ''نباء'' میں ارشاد ہوا ہے کہ قیامت کے دن کافر آرزو کریں گے کہ کاش وہ مٹی ہو جائیں اور دوزخ کے عذاب سے بچ جائیں، تو اس تکبر و غرور کو اس ذلت و رسوائی سے کیا نسبت رہی، گویا ''مرسلات'' میں ان کے جس تکبر و غرور کو بیان کیا تھا اس سورہ میں اس کا ذلت آمیز انجام بیان فرمایا ہے۔

تساؤل کی وجہ تسمیہ

تساؤل نام رکھنے کا سبب یہ ہے کہ تساؤل لغت میں کسی چیز کے بارے میں آپس میں بہت سوال کرنے کو کہتے ہیں (مشرکین بھی قیامت کے بارے میں بہت سوال کرتے تھے)

(اس سورت میں مشرکین کے تساؤل اور پھر اپنی قدرت کی نشانیوں کو جس انداز سے بیان کیا ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ) اس سورت میں یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ بعض امور دین کے بارے میں زیادہ پوچھ پاچھ، بحث و تکرار اور تحقیق پسندیدہ نہیں ہے، مثلاً آخرت کے کاموں کی حقیقت کے بارے میں پوچھنا، ذات و صفات باری تعالیٰ کے بارے میں بحث و تکرار کرنا، اسی طرح صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اختلافات بیان کرنا کہ جس سے صحابہ کا تخطئہ لازم آئے، شریعت کے احکام کی وجوہ اور حکمتوں میں غور کرنا جن کا عوام کے ذہن میں آنا ممکن نہیں، ایسی چیزوں میں بحث و تکرار نہایت قبیح ہے، اس لئے کہ نا سمجھی کی وجہ سے اکثر یہ بحث ان چیزوں کی حقیقت سے انکار کا سبب بن جاتی ہے اور اگر انکار تک نوبت نہ آئی تو بہت سوں کے دلوں میں شبہ پڑ جانے میں تو کچھ شک ہی نہیں ہے۔

حالانکہ ایمان کے لئے فقط ان چیزوں کا یقین کرلینا کافی ہے ان کی وجوہات، تفصیلات دریافت کرنے کا حکم نہیں دیا گیا کہ یہ تحقیقات ضروریات دین میں سے ہونا قرار پائیں، سو یہی کٹھن اور لاعلاج بیماری اُمت کے عقیدوں کے خراب ہونے اور گمراہ فرقوں کی حق سے جدائی کا سبب ہوئی ہے، ایک جہان کا ایمان برباد ہو گیا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں اس کی برائی بیان فرمائی ہے، تا کہ لوگ اس سے ڈرتے رہیں اور گمراہی کے بھنور میں ڈوب نہ جائیں۔

نباء کی وجہ تسمیہ اور خبر کی عظمت کی وجوہات

اس سورہ کو سورۂ نباء اس وجہ سے کہتے ہیں کہ نباء لغت میں خبر کو کہتے ہیں، اور قیامت کی خبر اتنا عظیم مرتبہ اور بڑائی رکھتی ہے کہ گویا اس کے سوا کوئی خبر ہی نہیں جس کے متعلق پوچھا جائے، اسی واسطے اس کو ''نباء عظیم'' فرمایا ہے، یہ خبر اپنی ذات میں بھی عظمت و بڑائی رکھتی ہے، اس کے وقوع میں بھی عظمت ہے اور اس کا سمجھ میں آنا بھی کوئی معمولی بات نہیں بہت بڑی بات ہے۔

ظاہر ہے کہ خبر کی عظمت یا اس کی ذات کے اعتبار سے ہوسکتی ہے کہ اس کو کوئی عظیم شخص بیان کرتا ہے، یا وہ عظمت اس خبر کے مضمون کے واقع ہونے کے اعتبار سے ہوسکتی ہے کہ کسی بڑے حادثے پر دلالت کرتی ہے، یا وہ عظمت اس خبر کے احوال و حقیقت سمجھنے کے اعتبار سے ہوسکتی ہے کہ آسانی سے ہر ایک کی سمجھ میں نہیں آتی نہایت دقّت سے سمجھی جاتی ہے۔

اور یہ تینوں صفات قیامت کی خبر میں جمع ہیں، اس لئے کہ یہ خبر اس نے دی ہے جو سب سے بڑا ہے یعنی اللہ عزوجل کہ سوائے اس کے کوئی یہ خبر دے نہیں سکتا اور یہ بھی ہے کہ ایسے بڑے حادثے کی خبر ہے کہ اس سے بڑا کوئی حادثہ نہیں ہوسکتا، اور یہ بھی ہے کہ اس کا سمجھ میں آجانا نہایت مشکل ہے، آدمی کی عقل بغیر انوار غیبی کی مدد کے اس کو سمجھ نہیں سکتی، ان وجوہات سے اس خبر میں نہایت عظمت و بزرگی پیدا ہوگئی۔

بس ایسی خبر کے بارے میں دعویٰ کرسکتے ہیں کہ خبر اسی کا نام ہے باقی سب خبریں ہیچ ہیں، اور جب آپس میں مطلق ''خبر'' کے بارے میں گفتگو ہو تو گویا یہی خبر پوچھی جارہی ہے، لہٰذا جس سورہ میں یہ خبر بیان کی جائے اس کا نام بھی خبر (نباء) رکھنا چاہئے۔

شانِ نزول

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت عطا ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت کا حال بیان فرمایا، کافروں کو یہ بات انوکھی لگی، اور تعجب کرتے ہوئے بطور استہزاء کے آپس میں اسکے متعلق کھوج شروع کی، بعض کہتے تھے "کیف یحی العظام وھی رمیم" ہڈیاں بوسیدہ ہونے کے بعد کیسے زندہ کی جائیں گی۔

بعض کہتے تھے "متی ھذا الوعد" یہ وعدہ کب پورا ہوگا؟ اور بعض کہتے تھے "وما أظن الساعۃ قائمۃ ان ھی الا حیوتنا الدنیا نموت و نحییٰ وما نحن بمبعوثین" یعنی مجھے یقین نہیں کہ قیامت قائم ہوگی ہماری صرف یہی دنیوی زندگی ہے مرتے اور جیتے ہیں اور ہم دوبارہ نہیں اٹھائے جائیں گے۔

خلاصۂ کلام! ان کو اشکال یہ تھا کہ اگر یہ بات ہونے والی ہے تو ایک مرتبہ ہمارے سامنے ہو کیوں نہیں جاتی؟ اچھے اور بروں کو ان کے کاموں کے موافق بدلہ دینے کے لئے اس دن کے انتظار کی کیا ضرورت ہے؟ اس دنیا میں ہی بدلہ کیوں نہیں دے دیتے کہ لوگوں کو عبرت بھی ہو نصیحت پکڑیں اور برے کاموں سے باز آجائیں اور نیک کام کرنے لگ جائیں۔

اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ سب باتیں رد کرکے جزا و سزا کو قیامت پر موقوف رکھنے کا سبب بیان فرمایا ہے۔ (اور یہ سورت نازل کی ہے)

تفسیر سورۂ نباء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عَمَّ يَتَسَآءَ لُوْنَ ○

کیا بات پوچھتے ہیں لوگ آپس میں

کس چیز کے بارے میں لوگ آپس میں پوچھتے ہیں (اللہ تعالیٰ باوجود اس چیز کو جانتے ہوئے جس کے بارے میں وہ پوچھتے تھے یہ اس لئے فرمارہے ہیں کہ تاکہ تنبیہ ہو کہ) کیا وہ چیز سوال کرنے کے

قابل ہے؟ کیا اس کو سمجھنے کی استعداد ان کے اندر ہے؟ کہ بہت پوچھ گچھ کرنے سے ان کی سمجھ میں آ جائے گی؟ کیا وہ ایسی چیز ہے جس کے متعلق بہت پوچھنا چاہئے؟ یا کہ ایسی ہے کہ جس کے متعلق زیادہ تحقیق و جستجو ہی نہیں کرنی چاہئے ورنہ اصل مقصد سے دوری ہوتی جائے گی۔

قرآن کریم کا یہ انداز کہ ''کس چیز کے بارے میں پوچھ رہے ہیں'' اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ عقلمند آدمی کو سوچ سمجھ کر کسی چیز کا کھوج لگانا چاہئے، پہلے یہ دیکھ لے کہ یہ بات میری سمجھ میں آ سکتی ہے کہ نہیں؟ اگر آ سکے تو ہاتھ ڈالے ورنہ ایسا نہ کرے کہ پھر محنت بھی ضائع ہو اور کوئی فائدہ بھی حاصل نہ ہو جیسے مثل مشہور ہے، محنت برباد گناہ لازم۔

تحقیق لفظ ''عَمَّ''

''عَمَّ'' کا لفظ اصل میں ''عمّا'' تھا تخفیف اور کثرت استعمال کی وجہ سے الف گرا دیا گیا۔

نحوی قاعدہ:۔ عرب کا قاعدہ ہے کہ ''ما'' موصولہ کے الف کو آٹھ حرفوں کے بعد گرا دیتے ہیں اور وہ حروف یہ ہیں: ''عن، من، با، لام، فی، علی، الی، حتٰی

عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ ○

پوچھتے ہیں اُس بڑی خبر سے

جب کلام کی بنیاد سوال و جواب پر رکھی اور جواب بالکل ظاہر اور کھلا ہوا تھا اس لئے خود ہی فرما دیا ''عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ'' کہ آپس میں ایک بڑی خبر کے متعلق سوال کرتے ہیں، اور واقعہ یہ ہے کہ وہ خبر اپنی ذات کے اعتبار سے بھی بہت بڑی ہے، کہ جو چیزیں اس میں واقع ہوں گی وہ بہت ہولناک ہیں، نہ کوئی آنکھ دیکھنے کا حوصلہ رکھتی ہے نہ کان سننے کی تاب لا سکتے ہیں، اور سمجھنے کے اعتبار سے بھی بہت بڑی ہے کہ کسی بشر کی عقل کو طاقت نہیں کہ اس کی حقیقت کو کما حقہ سمجھ سکے۔

الَّذِىْ هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ ○

جس میں وہ مختلف ہیں

یعنی وہ چیز ایسی ہے کہ اس کے بارے میں لوگ مختلف خیالات و نظریات رکھتے ہیں کسی ایک نقطۂ

نظر پر متفق نہیں ہیں۔

اگر چہ اللہ تعالیٰ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیاء ورسولوں کے ذریعہ اپنے بندوں کو مسلسل قیامت کی خبر پہنچاتا رہا ہے، اور انبیاء کرام اس خبر کو ثابت کرنے کے لئے دلیلوں اور مثالوں کے ساتھ دل وجان سے کوشش کرتے رہے، اور دلائل وعلامات بھی ایسی واضح اور کھلی ہوئی بیان کیں کہ کسی طرح کا دھوکہ باقی نہیں رہا لیکن باوجود ان سب باتوں کے بنی آدم کا شبہہ دور نہ ہوسکا۔

مرنے کے بعد جزاوسزا کے وقوع وکیفیت کے متعلق نظریات کا اختلاف

چنانچہ بعض تو بالکل سرے سے قیامت کے وجود کا انکار کرتے ہیں، اور بعض کہتے ہیں کہ جزاوسزا کا عمل عقلی صورت میں ہوگا، اور بعض کہتے ہیں کہ یہ خیالی ہے، بعض کہتے ہیں کہ حسی ہے یعنی ظاہری طور پر ہوگا (جو نظر آئے گا) اور بعض عقلی، خیالی، اور حسّی کے علاوہ کسی اور طرح پر ہونے کے قائل ہیں۔

اور بعض معاد کو تناسخ کے طریقہ کے اندر منحصر سمجھتے ہیں، یعنی ایک مرتا ہے تو وہی روح دوسرے جسم کے اندر آجاتی ہے (پہلے جسم کے اندر رہتے ہوئے اس نے جیسے اعمال کئے انہیں کے مطابق وہ دوسرے جسم میں آئے گی، اچھے اعمال تھے تو نئے جنم میں کسی اچھے انسان کے اندر وہ روح آئے گی، برے اعمال تھے تو کسی برے انسان یا جانور میں وہ روح آئے گی) اسی عالمِ دنیا کو یہ لوگ جزاوسزا کی جگہ مانتے ہیں۔ اور اس عالم کے فنا ہونے اور خراب ہونے کے متعلق چونکہ انبیاء کرام کی زبانی سنتے آئے ہیں اس لئے وہ اس بارے میں یہ تاویل کرتے ہیں کہ اس سے مراد موت کے وقت انسان کے جسم کی خرابی ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ایسے واضح بیان کے باوجود جو اختلاف اس مسئلہ کے اندر ہے وہ اور کسی چیز میں نہیں ہے، اور یہی اختلاف سبب ہے قیامت کے انکار یا شک کا جو بہت سے ذہنوں کے اندر ہے۔

جو بات عقل میں نہ آئے اس کے متعلق اسلام کا اصول

اسلام کا طریقہ اور ایمان کی نشانی یہ ہے کہ ایسی مشکل بات جو عقل میں نہ آئے، انسان اس کی کنہہ وحقیقت دریافت نہ کرسکے اور پیغمبروں کی زبان سے وہ یقینی طور پر سُن لے تو محض سننے سے ہی اس پر

ایمان لے آئے اور اسے مان لے، اسی کا نام ایمانِ اجمالی ہے۔ یہی ہمیشہ کی سعادت، اور نجات کا سبب ہے، زیادہ کھوج و تحقیق، اس کے احوال و خصوصیات کی تفتیش میں نہ پڑے، ورنہ اپنے اصل مطلب یعنی ایمان مجمل کو ہاتھ سے کھو بیٹھے گا، اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔

كَلَّا سَيَعْلَمُونَ ○

ہرگز نہیں اب جان لینگے

سابقہ کلام کے مضمون سے یہ ظاہر ہوا کہ اس مسئلے کے بارے میں لوگ بہت زیادہ پوچھ گچھ کرتے جو سب بے فائدہ و مضر ہیں اس لئے اب اس بے محل تحقیق و تفتیش پر خفگی کا اظہار فرماتے ہیں کہ ''كَلَّا'' ہرگز ایسا نہ کرنا چاہئے، ان چیزوں میں زیادہ جستجو مناسب نہیں اس لئے کہ اس طرح ایمانِ اجمالی میں خلل پڑتا ہے۔

''سَيَعْلَمُوْن'' سو قریب ہے کہ اخروی جزا و سزا کو یہ اس طرح جان لیں گے کہ کچھ شک و شبہ باقی نہ رہے گا۔

ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُونَ ○

پھر بھی ہرگز نہیں اب جان لینگے

یعنی پھر ہم کہتے ہیں کہ ایسا ہرگز نہ کرنا چاہئے قریب ہے کہ جان لیں گے۔

''سیعلمون'' کے تکرار کی وجہ

اس کلام میں تکرار صرف زجر و توبیخ کی تاکید کے واسطے ہے، گویا بار بار ایسے برے کام سے منع فرماتے ہیں اور اس کے معلوم ہو جانے کے زمانے کو قریب بتلاتے ہیں اس واسطے کہ جو چیز آنے والی ہے وہ قریب ہی ہے۔

بعض مفسرین نے پہلے ''سیعلمون'' سے عالم برزخ کے اندر جزا و سزا کا معلوم ہونا مراد لیا ہے کہ وہاں خیال کرنے کی مانند جزا و سزا واقع ہوگی، اور دوسری بار ''سیعلمون'' کو قیامت میں معلوم ہونا مراد لیا ہے کہ وہاں جزا و سزا حقیقی ہوگی۔ اس واسطے کہ وہاں روح کو بدن کے ساتھ تعلق ہو جائے گا،

اور باوجود اس تعلق کے روح پر تجرّد کے معنی غالب ہوں گے، اور باوجود تجرّد کے غلبہ کے اس دن (بدن کے ساتھ) تعلق کی کیفیت کھل جائے گی، اس واسطے کہ دنیا (میں روح کا جسم کے ساتھ) تعلق، تجرد کی مغلوبیت کا سبب ہے، اور عالم برزخ میں اس کا عکس ہے، یعنی تجرد غالب اور تعلق مغلوب ہے، پس تعلق کی جامعیت اور تجرد کے غلبہ (کی حقیقت) پر مطلع ہونا قیامت سے پہلے کسی طرح ممکن نہیں ہے۔

ایک اشکال اور اس کا جواب

اس جگہ ایک سوال جواب طلب باقی رہ گیا ہے، وہ یہ کہ سورۂ تکاثر میں "کلا سوف تعلمون" آیا ہے، اور یہاں "کلا سیعلمون" آیا ہے، یعنی وہاں "سوف" ہے اور یہاں "سین" ہے، سوف تاخیر و مہلت پر دلالت کرتا ہے، جبکہ سین نزدیکی اور جلدی پر دلالت کرتا ہے، اب اگر قیامت کے آنے کو قریب اعتبار کریں تو لفظ "سوف" کو سورۂ تکاثر میں کیوں لائے؟ اور اگر قیامت کے آنے کو دور اعتبار کریں تو اس جگہ سین کے کیا معنی ہوں گے؟

جواب اس سوال کا یہ ہے کہ سورۂ تکاثر میں کفار مخاطب ہیں اور ان کے نزدیک قیامت بہت دور ہے اس لئے ان کے گمان کے مطابق وہاں لفظ "سوف" لائے جو بُعد و دُوری پر دلالت کرتا ہے۔

اور یہاں اہل ایمان مخاطب ہیں، وہ قیامت پر ایمان لائے ہیں، اور جو چیز یقیناً آنے والی ہو وہ بہت قریب ہے اس لئے ان کے یقین کے مطابق یہاں لفظ "سین" لائے ہیں جو نزدیکی پر دلالت کرتا ہے، چنانچہ دوسری جگہ فرمایا ہے: "انهم يرونه بعيدًا ونراه قريبا"

گویا مومنوں کو ارشاد ہو رہا ہے کہ یہ کافر عنقریب قیامت کو سب احوال و واقعات کے ساتھ جان لیں گے۔

نو چیزوں کے متعلق استفہامِ تقریری میں نکتہ

جب بے فائدہ سوالات پر تنبیہ و توبیخ سے فارغ ہوئے تو استفہامِ تقریری کے طور پر ان آیات میں اُن نو (۹) چیزوں کے بارے میں پوچھ پوچھ کر اقرار کروایا جا رہا ہے جن چیزوں کے بارے میں عام طور پر لوگوں کا ذہن یہ ہے کہ انہی نو چیزوں پر دنیا کا دار و مدار ہے، اگر ان چیزوں سے کوئی محروم رہے تو گویا وہ دنیا میں نہیں ہے جو دنیا میں زندہ ہے وہ ضرور ان نو چیزوں میں شریک ہوگا۔ (یہاں یہ بات سمجھ

لی جائے کہ) سب لوگوں کی شرکت کی وجہ سے انسانوں کے درمیان کلی طور پر امتیاز، فرق اور جدائی (دنیا میں) حاصل نہیں ہوسکتی، پھر (کافروں کی طرف سے یوم قیامت پر اعتراض کی غرض سے دنیا میں ہی اللہ کے فرمانبردار اور نافرمانوں کے درمیان) جدائی اور امتیاز کا مطالبہ کرنا ان نو چیزوں کی شرکت کے ساتھ ایسا ہی ہے جیسے ایک گھر والے آدمی چاہیں کہ وہ کھانے، پینے، لباس، گھر، اوڑھنے بچھانے سب میں اس طرح شریک ہوں کہ آپس میں کوئی تعلق ولگاؤ بھی نہ ہو، یہ بات صریح لغو اور دعویٰ بلا دلیل ہے ایسا ہونا محال، اور اجتماع ضدین ہے۔

نو چیزوں کی تفصیل

(۱) اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ○

کیا ہم نے نہیں بنایا زمین کو بچھونا

یعنی کیا ہم نے زمین کو تمہارے واسطے فرش اور بچھونا نہیں بنایا، کہ اس زمین پر رہائش اختیار کرو، کھیتی باڑی کرو، تجارت کرو، اور تمہارا جینا مرنا بھی اس پر ہے، ان ساری باتوں میں نیک و بد، مسلمان و کافر سب شریک ہیں کسی میں (خاص ان باتوں میں شرکت کے لحاظ سے) کوئی فرق و امتیاز نہیں ہے، لہٰذا قیامت کے دن چاہئے کہ نیکوکار بہشت میں جائیں اور بدکار جہنم میں جائیں تاکہ امتیاز، فرق و جدائی اچھی طرح ثابت ہو جائے۔ چنانچہ ایک جگہ فرمایا ہے "ومن عمل صالحا فلانفسهم يمهدون" اور دوسری جگہ فرمایا "لهم من جهنم مِهٰدًا"

(۲) وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا ○

اور پہاڑوں کو میخیں

اور کیا ہم نے پہاڑوں کو میخوں کی مانند نہیں کیا؟ کہ اپنے بوجھ اور بھاری پن کی وجہ سے زمین کو ہوا سے ہلنے نہیں دیتے، جس طرح میخیں خیموں کو ہلنے نہیں دیتیں، سو اس منفعت میں بھی سب یکساں شریک ہیں کوئی فرق و جدائی نہیں ہے، لہٰذا قیامت کے ذریعے ہی اہل جنت کو جنت کا آرام و راحت عطا ہو اور دوزخیوں کو دوزخ کا عذاب دیا جائے (تاکہ فرق و جدائی واضح ہو سکے)

(۳) وَخَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا ○

اور تم کو بنایا ہم نے جوڑے جوڑے

ہم نے تم کو جوڑے جوڑے پیدا کیا، یعنی نر اور مادہ، تاکہ نر مادہ کا ملاپ ہو اس سے نسل جاری ہو اس کے نتیجے میں تمہارے درمیان، باپ بیٹے، داماد، سُسر کے رشتے قائم ہوں اس وجہ سے ایک دوسرے سے الفت ومحبت کرو اور تعاون کرو تاکہ دنیا کی زندگی میں رونق پیدا ہو۔

لیکن ''یوم الفصل'' کو جو کہ قیامت کا دن ہے مناسب ہے کہ یہ تعلقات بالکل نہ رہیں، اس لئے کہ رشتہ دار کا رنج رشتہ دار کے رنج کا باعث ہوتا ہے۔

پھر (یہ بھی ہے کہ دنیا میں جزا کا فرق وامتیاز صحیح طور پر نہیں ہوسکتا) اس لئے کہ دنیا میں اگر کسی نیک آدمی کے برے رشتہ دار کو تکلیف دی جائے تو اس نیک آدمی کو بھی رنج ہوگا، اس طرح گویا دونوں عذاب میں شریک ہوگئے اور اگر بدکاروں کے نیک رشتہ داروں پر (خاص) انعام واکرام کریں تو یہ نیک رشتہ داری کی وجہ سے ان بدکاروں کو بھی شریک کریں گے، اگر ایسا نہیں کرتے تو صلہ رحمی ان سے فوت ہوتی ہے اس طرح ان کے نیک اعمال میں کوتاہی کرنا لازم آئے گی اور صلہ رحمی کرنے کی ضرورت میں بدکاروں پر بھی بخشش لازم آتی ہے لہٰذا جزا وسزا کا فرق نہ ہوا، اس لئے ضروری ہوا کہ جزا وسزا کا کوئی ایسا دن ہو جس میں یہ خرابی لازم نہ آئے اور وہ ہے یوم الفصل کہ اس دن یہ رشتے ناطے ٹوٹ کر ختم ہو جائیں گے ان کا نام تک نہ رہے گا۔ چنانچہ ایک جگہ فرمایا ہے ''فاذا نفخ فی الصور فلا انساب بینھم'' دوسری جگہ فرمایا ''ولا یسئل حمیم حمیما''

(۴) وَّجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ○

اور بنایا نیند کو تمہاری تکان دفع کرنے کے لئے

ہم نے تمہاری نیند کو دنیا میں تمہارے لئے آرام وچین کا سبب بنایا ہے، تاکہ کام سے فراغت کے بعد تھکاوٹ دور ہو اور تروتازگی حاصل ہو سکے۔

اور یوم الفصل کو چاہئے کہ نیند نہ ہو اس لئے کہ اس دن نیک آدمی کو سوائے خوشی کے اور کچھ نہ ہوگا جیسا کہ فرمایا ہے ''لا یمسھم فیھا نصب وّلا یمسھم فیھا لغوب''

اس لئے نیند کی حاجت نہیں، بلکہ اگر نیند ہو تو وہاں بہت سی نعمتوں سے محرومی ہو جائے (کہ نیند کی حالت میں ان سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے) اس طرح ہمیشہ کے ثواب میں کمی واقع ہو جائے گی، اسی طرح جو بدکار ہے اس کے لئے ہمیشہ کا عذاب لازمی ہے نیند کی صورت میں یہ نہ ہو سکے گا۔

(۵) وَ جَعَلْنَا الَّیْلَ لِبَاسًا ○

اور بنایا رات کو اوڑھنا

ہم نے دنیا والوں کے لئے رات کو لباس بنایا ہے، رات لباس و پردہ ہے کہ جو چیز چھپانے کے قابل ہے، وہ رات کے وقت کر سکیں جیسے بیویوں سے صحبت، پوشیدہ مشورے، دشمنوں سے بھاگنا، اور چوری خیانت، عیش و عشرت، ناچ و رنگ کے علاوہ تہجد و مراقبہ بھی ہے، ان سب کے علاوہ اور بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کا تعلق پردہ پوشی سے ہے، اسی واسطے کسی شاعر نے کہا ہے ؎

الــلـیـل لــلـعــاشـقـیـن سـتـرا
یـــالـیـــت او قـــاتـــه تـــدوم

رات عاشقوں کے لئے پردہ پوش ہے کیا اچھا ہوتا کہ رات ہمیشہ رہتی۔

اور قیامت کے لئے مناسب ہے کہ اس کے تمام حالات و واقعات ہر خاص و عام پر ظاہر اور کھلے ہوں، کسی قسم کا پردہ اور خفا اس میں نہ ہو، تاکہ نیکو کاروں کی عظمت و بڑائی اور بدکاروں کی ذلت و رسوائی کھلے بندوں ظاہر ہو جائے۔

فائدہ:۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے کسی نے پوچھا کہ نکاح رات کو کرنا چاہئے کہ دن کو تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا رات کو اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے رات کو لباس فرمایا ہے، اور نکاح والی عورتوں کو بھی لباس فرمایا ہے، چنانچہ فرمایا "ھن لباس لکم" اور ایک لباس کو دوسرے لباس کے ساتھ پوری مناسبت ہے۔

(۶) وَّ جَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ○

اور بنایا دن کمائی کرنے کو

ہم نے دن کو انسانوں کے لئے دنیا میں روزی تلاش کرنے کا وقت بنایا ہے، قیامت کے دن روزی

کی تلاش کا مسئلہ ختم ہو جائے گا، اس لئے کہ نیکو کار جو جنت میں ہوں گے ان کو بغیر کسی فکر و کوشش کے تمام نعمتیں خود بخود مہیا ہوں گی اور جو کافر ہوں گے ان کے پاؤں میں زنجیر، گلے میں طوق ڈالے جہنم کے نگرانوں کے ہاتھ میں گرفتار ہوں گے، بھوک و پیاس کے عذاب میں مبتلا ہوں گے تاکہ کافر و مومن کے درمیان معاش کے بارے میں فرق و امتیاز اچھی طرح واضح ہو جائے، دنیا کی طرح یکساں فکر و پریشانی کا شکار نہ ہوں۔

(۷) وَبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا ۝

اور چنی ہم نے تم سے اوپر سات چنائی مضبوط

ہم نے تمہارے اوپر سات طبقے سخت اور مضبوط بنائے ہیں جو کبھی پرانے نہیں ہوتے، ان میں سات ستارے پھرنیوالے بنائے جو ایک دوسرے کے مخالف حرکت کرتے ہیں، اور نئی نئی طرح سے ظاہر ہوتے ہیں، اس طرح مختلف انداز میں ظاہر ہونے میں ان کی مختلف تاثیرات ہیں اور ان تاثیرات سے ہر نیک و بد، مسلم و کافر نفع اندوز ہونے میں شریک ہے، بخلاف قیامت کے کہ وہاں جنت کے اندر نیک لوگوں کے درجات اوپر کی جانب چھت کی طرح ہوں گے اور انبیاء و صالحین پیشواؤں کی نورانی روحیں نیچے کے درجے والے لوگوں کی مدد کریں گی، نیچے والے ان کی مدد سے ترقی حاصل کریں گے اور بدکاروں کو دوزخ کے طبقات اسافل گھیرے ہوئے ہوں گے اور ان کے پیشواؤں کی خبیث روحیں اندھیریوں کی کیفیات سے اوپر والوں کے عذاب میں اضافہ کریں گی۔

(۸) وَّجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا ۝

اور بنایا ایک چراغ چمکتا ہوا

یعنی ہم نے دنیا والوں کے نفع کے لئے ایک چمکتا ہوا تیز روشنی والا چراغ بنایا۔ یعنی سورج اس میں گرمی اور روشنی اکٹھی پائی جاتی ہے، اور ہر شخص خواہ نیک ہو یا بد اس کی روشنی و گرمی سے یکساں نفع یا نقصان میں شریک ہے بخلاف قیامت کے دن کے کہ وہاں جمالِ الٰہی کا نور بہشت میں نیک لوگوں کو منور کرے گا اور جلالِ الٰہی کی تجلی کہ جس کو حدیث میں ''قدم'' سے تعبیر کیا گیا ہے، دوزخیوں کو سخت حرارت و گرمی سے جلائے گی۔

(۹) وَّاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا ۝

اور اتارا نچڑنے والی بدلیوں سے پانی کا ریلا

یعنی ہم نے ٹپکنے والے بادلوں سے اتارا ہے بہت بہنے والا پانی۔

لِّنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّنَبَاتًا ۝

تا کہ ہم نکالیں اس سے اناج اور سبزہ

تا کہ ہم اس پانی سے تمہارے کھانے کے لئے اناج نکالیں اور بہت سا سبزہ، گھاس نکالیں، اس میں سے بعض کو تم مصالحہ بناتے ہو، بعض دانہ چارہ تمہارے جانوروں کے لئے ہو جاتا ہے، جانور وہ چارہ کھا کر تمہیں دودھ دیتے ہیں اس سے تم دہی، گھی، اور پنیر وغیرہ بنا کر کام میں لاتے ہو۔

وَّجَنّٰتٍ اَلْفَافًا ۝

اور باغ پتوں میں لپٹے ہوئے

(اور تا کہ اس پانی کے ذریعہ سے) گنجان درختوں کے باغات اُگائیں۔ تا کہ تم ان کے پھلوں سے لذت اُٹھاؤ۔ پھر ان پھلوں کو مختلف ترکیبوں سے اچار، مربہ، سرکہ وغیرہ بنا کر استعمال میں لاؤ، اس میں تم سب نیک و بد شریک ہو کسی طرح کی کوئی جدائی یا فرق نہیں ہے ایسا نہیں ہے کہ پانی ایک جگہ برسے دوسری جگہ نہ برسے، کھیتی ایک جگہ اُگے دوسری جگہ نہ اُگے، باغ ایک جگہ پیدا ہوں دوسری جگہ پیدا نہ ہوں یا پھل ایک جگہ پکیں دوسری جگہ نہ پکیں۔

بخلاف قیامت کے دن کے کہ وہاں نیک لوگوں کے اعمال، اعتقاد، احوال اور حاصل کئے ہوئے درجات بادلوں کی طرح دودھ، شہد، شراب اور صاف پانی برسائیں گے، جس سے نہریں جاری ہوں گی اور اس پانی کی قوت سے بہشت کے درخت مزیدار لذت والے پھل خود بخود دیں گے، اور جس وقت کوئی پھل کسی درخت سے توڑ کر کھایا جائے گا تو وہاں کی آب وہوا کی تروتازگی اور کمال نشو ونما کے سبب اس جگہ فوراً دوسرا پھل پیدا ہو جائے گا، اور ان پھلوں کی لذت اور درختوں کا اس طرح پھل دینے کا سلسلہ کبھی ختم ہونے والا نہ ہوگا۔

اور بدکاروں کے بُرے اعتقادات، بُرے اعمال واخلاق دھوئیں کی مانند اُٹھیں گے اور ان پر چنگاریاں برسا کر ان کے جسموں کو جلا ڈالیں گے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

''وظل من یحموم ○ انطلقوا إلی ظل ذی ثلث شعب''

اسی طرح انکے اعمال درختِ زقوم جیسے برے، بد ذائقہ اور بدشکل درخت پیدا ہونے کا سبب ہوں گے۔

اسی طرح دونوں گروہوں کے درمیان امتیاز اور جدائی اچھی طرح واضح ہو جائے گی، تو معلوم ہوا کہ ''یوم الفصل'' دنیا میں نہیں ہوسکتا اس لئے کہ جدائی اور ملاپ (فصل و وصل) آپس میں ایک دوسرے کی ضد ہیں ایک جگہ نہیں پائے جاسکتے، تو باوجود ان چیزوں کے باقی رہنے کے (جن نو چیزوں کا تفصیلاً اوپر ذکر ہوا) کہ ان میں (ہر دو فریق کی) شراکت ہے، قیامت کے دن (جزاوسزا) کا تصور نہیں کر سکتے، البتہ اس عالم کے خراب ہو جانے، اس دنیا کے انعامات اور شرکت کے اصول و ارکان (مذکورہ) کے درہم برہم ہونے کے بعد اس کی امید رکھنی چاہئے، اور قیامت کے آنے کا وقت اس عالم کی خرابی کے شروع سے سمجھنا چاہئے، جیسا کہ فرمایا:

إِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيقَاتًا ○

بیشک دن فیصلے کا ہے ایک وقت ٹھہرا ہوا

فرمایا کہ جدائی کا دن یعنی جس میں مسلمان اور کافر، نیک اور بد جدا جدا ہو جائیں گے، ہر ایک کا مرتبہ دوسرے سے الگ کر دیا جائے گا اس کا وقت متعین کیا گیا ہے اس سے آگے یا پیچھے نہیں ہوسکتا، دنیا میں ہی کافروں کے جلد مطالبے سے ہم جلدی نہیں کریں گے، کہ وہ وقت دنیا میں ہی لے آئیں، اس لئے کہ اس دن کے کچھ لوازمات ہیں جب تک وہ پورے نہ ہو جائیں گے، وہ دن نہیں آسکتا۔

قیامت برپا ہونے کے لوازم

یہ لوازمات ایسے ہیں کہ دنیا میں نہیں ہوسکتے لہٰذا دنیا میں جزاوسزا کامل طور پر قائم نہیں ہوسکتی، اور وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) روح کا تعلق جسم کے ساتھ قائم ہونا۔ جیسا کہ دنیا میں روح کا تعلق جسم کے ساتھ ہے مرنے

کے بعد پھر دوبارہ ایسا ہی تعلق قائم ہو جائے، اور اس طرح کا تعلق برزخ میں نہیں ہوتا وہاں روح کا تجرد غالب ہے اسی وجہ سے وہاں یہ جزا وسزا نہیں ہو سکتی کیونکہ اس بدن کے دنیا کے اندر کئے ہوئے اعمال کی جزا وسزا نہیں دیکھی جاسکتی جب تک روح کا تعلق اس جسم کے ساتھ قائم نہ ہو جائے۔ صرف روح پر جزا وسزا کا قیام محض تصور وخیال کا درجہ ہے، عالمِ مشاہدہ میں اس کا وجود نہیں ہوتا۔

(۲) تمام ارواح اپنے اجسام کے ساتھ اس تعلق میں ایک جگہ جمع ہو جائیں۔ اس لئے کہ اس کے بغیر فرق وامتیاز واضح نہیں ہوسکتا، مثلاً ایک گروہ کے ساتھ ایک جگہ ایک طرح کا معاملہ ہوا تو اس کو امتیاز اس وقت تک حاصل نہ ہوگا جب تک اسی جگہ پر دوسری جماعتوں کے ساتھ دوسری طرح کا معاملہ نہ کیا جائے، ورنہ یہ گمان ہوسکتا ہے کہ اس گروہ کے ساتھ جو معاملہ ہوا یہ کوئی اس کی خصوصیت نہیں بلکہ وقت کی مصلحت کا تقاضا یہی تھا، اگر دوسری جماعتیں اس وقت یہاں ہوتیں تو ان کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوتا، جیسا کہ دنیا والے عزت، ذلت، رزق کی کشادگی وتنگی کو زمانہ کی گردش کا تقاضا سمجھتے ہیں، اور دل کو سمجھاتے ہیں کہ پہلے لوگ آج ہوتے تو ان کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوتا، اگر خوشحال ملکوں کے لوگ قحط زدہ علاقے میں ہوتے تو وہ بھی اس مصیبت میں گرفتار ہوتے، لہٰذا ضروری ہوا کہ تمام نوع انسانی کی ارواح جب اپنے جسموں سے جدا ہو جائیں تب قیامت قائم ہو تا کہ ایک ہی وقت میں ایک ہی جگہ پر تمام روحوں کا اپنے اجسام کے ساتھ تعلق قائم ہو (پھر سب کے سامنے امتیاز قائم ہو)

(۳) تیسرے مشترک نعمتیں جو دنیا میں، فقیر وغنی، مومن وکافر، نیک و بد، نعمت والے اور عذاب والے، تندرست وبیمار کے درمیان برابر ہیں کچھ باقی نہ رہیں ورنہ برابری وشراکت لازم آتی ہے اور جو مقصودِ اصلی ہے یعنی دونوں فریقوں کے درمیان جدائی وامتیاز وہ کامل طور پر حاصل نہ ہوگا۔

(۴) چوتھے (قیامت یعنی جزا وسزا کے دن کے قیام کے لئے لازم ہے کہ جس جگہ جزا وسزا کو انجام دیا جائے) وہ جگہ اس موجودہ آسمان وزمین کے علاوہ ہو (اس لئے کہ پیچھے گذر چکا کہ ان میں تو نیک و بد کی شرکت ہے لہٰذا امتیاز کامل نہ ہو سکے گا) اور وہ جگہ اس عالم میں جب آسمان کے اوپر (جنت) اور زمین کے نیچے (دوزخ) چھپی ہوئی ہے تو ضروری ہے کہ پہلے اس آسمان وزمین کو فنا کر دیا جائے تا کہ نیک لوگوں کے لئے بہشت آسمان پر ظاہر ہو اور بدکاروں کے لئے دوزخ زمین کے نیچے سے بھڑکے، اسی واسطے وہ دن اس وقت تک نہیں آئے گا جب تک صور نہ پھونکا جائے گا چنانچہ فرمایا:

يَوْمَ يُنْفَخُ فِى الصُّوْرِ

جس دن پھونکی جائے صور

آیت میں نفخ سے مراد اور اس کے بعد کی تفصیلات

یہاں صور پھونکنے سے مراد دوسری مرتبہ کا صور ہے، اسی سے قیامت کی شروعات ہیں، صور کے پھونکے جانے کے سبب انسانوں کی تمام روحیں اپنے اپنے بدن سے مل کر ہر مذہب والا علیحدہ اُٹھے گا، فرشتے تمام انسانوں کے الگ الگ جتھے بنادیں گے، جیسے یہود، نصاریٰ اور ہندو، ان سب کی صفیں جُدا جُدا ہوں گی، مسلمانوں کی صف ان سے علیحدہ ہوگی، پھر ہر پیغمبر کی اُمت علیحدہ، اور ہر اُمت میں بھی ہر مذہب والا علیحدہ کھڑا ہوگا، (اسی طرح اعمال کے اعتبار سے لوگ علیحدہ علیحدہ ہوں گے) جیسے نمازی علیحدہ، روزے دار علیحدہ، چور علیحدہ، شرابی علیحدہ، اسی طرح اخلاق کے اعتبار سے لوگ علیحدہ علیحدہ ہوں گے، جیسے متکبر و بداخلاق علیحدہ، رحمدل ومحبت والے علیحدہ، اسی طرح ہر رتبے والا علیحدہ ہوگا، جیسے حمد کرنے والا علیحدہ، صبر کرنے والا علیحدہ، شکر کرنے والا علیحدہ، متول علیحدہ کھڑے کئے جائیں گے۔

یہ سب بڑے بڑے لشکروں کی طرح صف بستہ کھڑے کئے جائیں گے (جیسا کہ ان میں تعارف کا طریقہ یہ ہے کہ) ان میں سب سے پہلے امیرِ لشکر کے حوالے سے پہچان ہوتی ہے کہ یہ لشکر فلاں امیر کا ہے پھر رسالداروں کے اعتبار سے کہ یہ رسالہ فلاں رسالدار کا ہے، اور یہ لوگ فلاں جمعدار کے ساتھ ہیں، پھر فرشتے اسی انتظام کے ساتھ ان سب لوگوں کو میدانِ حشر کی طرف لے جائیں گے۔

فَتَاْتُوْنَ اَفْوَاجًا ۝

پھر تم چلے آؤ جٹ کے جٹ

یعنی پھر آؤ گے تم فوج درفوج، اس طرح کہ ہرگز ایک گروہ کے لوگ دوسرے گروہ کے لوگوں سے ملنے نہیں پائیں گے، اس حقیقت کو بہت سی آیات واحادیث میں بیان کیا گیا ہے ان میں سے ایک آیت یہ ہے: ”یوم یحشر أعداء الله إلى النار فهو یوزعون“ اور دوسری جگہ فرمایا ”یوم نحشر من كل أمة فوجا ممن يكذب بايتنا فهم يوزعون“

اس کے علاوہ اور بہت سی آیات ہیں سب کے نقل کرنے سے کلام میں طوالت ہوگی۔

میدانِ حشر میں ہر جماعت کا ایک امتیازی نشان ہوگا

بعض احادیث میں ہر جماعت کے نشان و علامت کا ذکر بھی آیا ہے جیسے دغابازوں اور عہد شکنی کرنے والوں کی مقعد پر ایک جھنڈا ہوگا، اس طرح کہ بڑے مقدمے کے دغاباز کے مقعد پر بڑا جھنڈا اور چھوٹے مقدمے کے دغاباز کے مقعد پر چھوٹا جھنڈا ہوگا، اور مال غنیمت میں جس نے چوری کی ہے وہ چیز اس کی گردن پر لدی ہوئی ہوگی، اگر اونٹ بکری وغیرہ چوری کی تھی تو وہ اس کی گردن پر سوار آواز کر رہی ہوگی، اگر کپڑا چوری کیا تھا تو جھنڈے کی طرح لہرائے گا، شہیدوں کو خون آلودہ حالت میں اٹھایا جائے گا ان کے زخموں سے مشک کی خوشبو آئے گی، نوحہ کرنے والی عورت کی قمیص گندھک کی ہوگی اور بدن خارش زدہ ہوگا، اور بغیر احتیاج کے سوال کرنے والے کا چہرہ زخمی اور چھلا ہوا ہوگا، علی ھذا القیاس، صحیح احادیث میں تلاش کرنے سے ایسی بہت سی نشانیاں مل جاتی ہیں۔

اس اُمت کے گنہگاروں کی دس جماعتیں

ثعلبی نے اپنی تفسیر میں سند کے ساتھ بیان کیا ہے اگرچہ نہ اس کی سند مضبوط ہے اور نہ ہی روایات خاص قابل اعتبار ہیں تاہم اس نے ذکر کیا ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان فوجوں کا حال دریافت کیا جن کا ذکر اس آیت میں آیا ہے تو آپ علیہ السلام نے فرمایا اس اُمت کی دس جماعتیں الگ الگ جتھے کی شکل میں لائی جائیں گی۔

(۱) ایک جماعت بندروں کی شکل میں ہوگی، یہ چغلخوروں کی جماعت ہوگی۔

(۲) دوسری جماعت کے لوگ خنزیروں کی شکل کے ہوں گے، یہ حرام خور اور رشوت لینے والے ہونگے۔

(۳) کچھ لوگ اوندھے منہ ہوں گے سر نیچے پاؤں اوپر فرشتے ان کو کھینچ کر لا رہے ہوں گے، یہ سود خور لوگ ہوں گے۔

(۴) چوتھا گروہ اندھا ہوگا، یہ وہ قاضی اور مفتی ہوں گے جو حق کے خلاف فیصلے کرتے اور جھوٹے فتوے دیا کرتے تھے۔

(۵) پانچواں گروہ گونگا ہوگا یہ وہ لوگ ہوں گے جو اپنی عبادت پر گھمنڈ کرتے تھے اور دوسروں کو اپنے برابر نہیں سمجھتے تھے۔

(۶) چھٹا گروہ ان لوگوں کا ہوگا جو اپنی زبانیں چبادیں گے، زبانیں ان کے سینوں پر پڑی ہوں گی، ان کے منہ سے زرد پانی اور پیپ بہہ رہی ہوگی سارے محشر والوں کو ان کی یہ حالت دیکھ کر ان سے گھن آئے گی، یہ وہ علماء اور مشائخ ہوں گے جن کا عمل ان کے قول کے خلاف تھا، کہتے کچھ تھے کرتے کچھ تھے۔

(۷) ساتواں گروہ ہاتھ پاؤں کٹے ہوئے ہوں گے، یہ وہ لوگ ہوں گے جو بے زبان جانوروں کو اور پڑوسیوں کو تکلیف دیا کرتے تھے۔

(۸) آٹھواں گروہ آگ کی سولیوں پر لٹکا ہوا ہوگا یہ وہ لوگ ہوں گے جو لوگوں کے خفیہ راز ظالم حکمرانوں تک پہنچا کر ایذا رسانی کیا کرتے تھے۔

(۹) نواں گروہ ایسا ہوگا کہ ان کی بدبو مردار سے بھی بدترین ہوگی کہ محشر والوں کو بھی اس سے تکلیف ہوگی یہ وہ لوگ ہوں گے جو اپنی شہوتوں اور دنیا کی لذتوں میں گرفتار ہوئے تھے، اور مال سے اللہ کا حق ادا نہیں کرتے تھے اپنی خواہشِ نفسانی پر خرچ کرتے تھے۔

(۱۰) دسواں گروہ ایسا ہوگا کہ گندھک کے کُرتے ان کے سر سے لے کر پاؤں تک ہوں گے اور ان کے بدن کے ساتھ چپکے ہوئے ہوں گے، یہ وہ لوگ ہوں گے جو تکبر و غرور کیا کرتے تھے۔ یہ سب بدبخت و گنہگار اس اُمت کے ہوں گے۔

لیکن اس اُمت کے نیک و ایمانداروں میں بعض چودہویں رات کے چاند کی مانند ہوں گے، بعض آسمان کے ستاروں کی مانند ہوں گے، بعض نور کے ممبروں پر بیٹھے ہوں گے، بعض مشک و زعفران کے ٹیلوں پر ہوں گے، علیٰ ھذا القیاس (اپنے اپنے درجات کے اعتبار سے ہوں گے)

وَّفُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا ۝

اور کھولا جائے آسمان تو ہوجائیں اس میں دروازے

جنت ساتویں آسمان کے اوپر ہے

یعنی کھولا جائے گا آسمان، تاکہ فرشتے اعمال نامے لیکر اتریں اور آسمان کے اوپر لے جانے کے بعد اعمال کی جو صورت ہوئی تھی وہ ظاہر ہو، اور جنت جس کا مقام ساتویں آسمان کے اوپر ہے وہ بھی

ظاہر ہو گویا آسمان کو (جنت کے اوپر سے) یوں اٹھا لیا جائے گا جیسے خوان سے سرپوش کو اٹھا لیا جاتا ہے۔ پھر آسمان کے دروازے ہو جائیں گے کہ اسی راستے سے بہشت میں داخلہ ہو گا اور بہشت کی نعمت دیکھیں گے۔

وَّسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا ۝

اور چلائے جائیں گے پہاڑ تو ہو جائیں گے چمکتا ریتا

یعنی چلائے جائیں گے پہاڑ جو زمین پر میخوں کی مانند تھے، وہ پہاڑ اڑتی ہوئی ریت کی مانند ہو جائیں گے، کہ وہ ریت دور سے دیکھنے میں پانی کی طرح معلوم ہوتی ہے حالانکہ حقیقت میں ریت ہوتی ہے، اسی طرح یہ پہاڑ دور سے تو پہاڑ نظر آئیں گے لیکن حقیقت میں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ریت کی مانند ہو چکے ہوں گے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا ''وکانت الجبال کثیبًا مّھیلاً'' اور ایک اور مقام پر فرمایا ''وکانت ھباءً منبثًا''

دوزخ زمین کے نیچے ہے

جب زمین کی میخوں کی یہ حالت ہو گی تو زمین بدرجۂ اولی درہم برہم ہو جائے گی، اور دوزخ جس کا ٹھکانا زمین کے نیچے تھا ظاہر ہو جائے گی تا کہ آسمان کی جگہ جنت ظاہر ہو اور زمین دوزخ کی جگہ قرار پائے (نیک جنت میں ٹھکانا پکڑیں اور بدکار جہنم میں جائیں اس طرح صحیح معنوں میں) نیکوکاروں اور بدکاروں، فرمانبرداروں اور نافرمانوں کے درمیان جدائی اور علیحدگی ثابت ہو سکے گی۔ اور جب زمین و آسمان درمیان سے ہٹا دیئے گے تو سورج اور برسات اور دیگر نعمتیں جو کافر و مسلمان کے درمیان مشترک تھیں سب فنا ہو جائیں گی، اور فرمانبرداروں اور نافرمانوں کے درمیان کسی طرح کی کوئی شرکت و برابری باقی نہیں رہے گی نیک دوسری جگہ ہوں گے اور برے ایک دوسری جگہ۔

اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا ۝

بیشک دوزخ ہے تاک میں

یعنی بیشک دوزخ تاک اور گھات کی جگہ ہے، اس کے کنارے پر فرشتے آگ کی زنجیریں، گرز اور طوق لئے کھڑے ہوں گے اور دوزخیوں کو پکڑ کر لے جائیں گے۔

لِّلطّٰغِيْنَ مَاٰبًا ۝

شریروں کا ٹھکانا

پلصراط سے گذرنے کا بیان

مسلمان اور نیکوکار لوگوں کو صرف جہنم کے اوپر سے گذارا جائے گا، اور اس کا نظارہ کرایا جائے گا اس کے علاوہ ان کو جہنم کی کوئی تکلیف نہ پہنچے گی، بعض اس پُل کے اوپر سے بجلی کی رفتار میں گذر جائیں گے، بعض آندھی کی رفتار میں گذریں گے، بعض گھوڑے کی رفتار میں گذریں گے، علی ھذا القیاس۔ یہاں تک کہ ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان جو بہت زیادہ گناہوں میں آلودہ ہوگا گرتے پڑتے سات ہزار سال کے عرصہ میں پُل پار کر جائے گا۔

حضرت فضیل بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے پلصراط کی مسافت تین ہزار سال ہے، بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے، ہزار سال چڑھائی، ہزار سال اتار اور ہزار سال کی مسافت سیدھ میں ہے، یہ سب ایمان والوں کا حال ہے، ورنہ کفار تو مقرر کردہ فرشتوں کے ہاتھوں گرفتار ہو کر جہنم واصل ہوں گے۔

لّٰبِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا ۝

رہا کریں اس میں قرنوں

یعنی وہ رہیں گے اس میں بے شمار زمانوں تک۔

حقبہ کا معنیٰ اور ایک غلط فہمی کا ازالہ

ہلال ہجری سے منقول ہے کہ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حقبہ کا معنیٰ پوچھا تو انہوں نے فرمایا ''حقبہ'' ستر ہزار برس کا ہوتا ہے، ایک برس بارہ مہینہ کا، ایک مہینہ تیس دنوں کا اور ایک دن دنیا کے ایک سال کے برابر ہے اور یہاں لامتناہی مدت مراد ہے۔

بعض نادان اپنی نافہمی سے یہ کہتے ہیں کہ اس آیت میں دوام اور ہمیشگی معلوم نہیں ہوتی (اس لئے کہ کفار کے لئے جہنم میں رہنے کی مدت ''احقاب'' بتلائی ہے یہ نہیں کہا گیا کہ وہ ہمیشہ رہیں گے) جیسا کہ

دوسری آیات سے معلوم ہوتی ہے، حالانکہ یہاں احقاب کی تعیین نہیں فرمائی گئی جس سے عذاب کا منقطع ہونا ثابت ہو بلکہ مطلق رکھا گیا ہے جس کا مطلب یہی ہے کہ احقاب لا متناہی مراد ہیں۔

ان نادانوں کو اس سے شبہہ ہوا کہ ''حقبہ'' کی مدت متعین ہے لہٰذا اُحقاب بھی متعین ہوئے حالانکہ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ ایک ''حقبہ'' کی مدت معلوم ہونے سے ''احقاب'' کی مدت معلوم نہیں ہوسکتی۔

بعض مفسرین نے کہا کہ اس آیت میں ''احقاب'' سے دوزخیوں کے دوزخ میں ٹھہرنے کی مدت بتانا مقصود نہیں ہے بلکہ بتانا مقصود یہ ہے کہ دوزخیوں کی دوزخ میں ٹھہرنے کی مدت کا اندازہ احقاب سے لگانا چاہئے نہ کہ صدیوں، برسوں، مہینوں، دنوں اور ساعتوں سے، اس لئے کہ اگر کسی چیز کی مدت کم ہوتی ہے تو اس کو ساعتوں سے شمار کرتے ہیں اور اگر اس سے زیادہ ہو تو دنوں سے، اور اس سے زیادہ ہو تو مہینوں سے اور سالوں سے شمار کرتے ہیں اور جو اس سے بھی زیادہ ہو تو صدیوں سے شمار کرتے ہیں، اور جو شمار میں ہی نہ آسکے اس کو ''حقبوں'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ جس طرح تھوڑے مال کو اکائی سے شمار کرتے ہیں روپیہ وغیرہ اور اس سے زیادہ ہو تو دہائیوں سے اس سے زیادہ ہو تو سینکڑوں سے اس سے بھی زیادہ ہو تو ہزاروں سے پھر لاکھوں سے اور کروڑوں اربوں سے بولتے ہیں۔

لَا يَذُوقُونَ فِيهَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا ۝

نہ چکھیں وہاں کچھ مزا ٹھنڈک کا اور نہ پینا ملے کچھ

کیا جہنم میں طبقۂ زمہریر ہے؟

فراء جو ایک بڑے عالم ہیں انہوں نے کہا ہے یہ آیت ''احقابا'' کی صفت ہے آیت کا معنی یہ ہے کہ ''وہ لوگ جہنم میں کچھ مزہ ٹھنڈک کا نہ چکھیں گے اور نہ ان کو پینے کو ملے گا'' باہر کی ہوا سے بدن کے ظاہری حصے کو اور ٹھنڈا پانی پینے سے بدن کے اندرونی حصہ کو جہنم کے جلانے کی تپش میں جو تھوڑی بہت تخفیف ہوسکتی وہ بھی نہ ہوگی، جیسے تپ کے بخار میں مبتلا آدمی کو برف وغیرہ لگانے سے بخار میں تخفیف ہوتی ہے، گویا یوں ارشاد ہوا کہ اتنی مدت دراز تک وہ سردی کے نام سے بھی واقف نہ ہوں گے۔

اس کے بعد وہ طبقۂ زمہریر میں لے جائے جائیں گے وہاں وہ سردی کے عذاب میں گرفتار کردیئے

جائیں گے، یہاں تک کہ ان کے پٹھے شدید سردی کی وجہ سے جم جائیں گے۔ پھر دوزخ کی آگ میں ڈالے جائیں گے، اور اتنی ہی مدت رہیں گے جس کا پہلے ذکر ہوا، اسی طرح ابدالآباد تک عذاب میں مبتلا رہیں گے کبھی گرمی میں اور کبھی سردی میں رہیں گے۔ (اعاذنا اللہ منہ)

إِلَّا حَمِيمًا وَّ غَسَّاقًا ۝

مگر گرم پانی اور بہتی پیپ

اس سے پہلی آیت میں یہ فرمایا تھا کہ وہ اس تمام عرصے میں دوزخ کے اندر پینے کی کوئی چیز نہیں چکھیں گے، جبکہ دوسری جگہ فرمایا ہے کہ وہ گرم کھولتا ہوا پانی پئیں گے، لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيمٍ اسی واسطے اس جگہ بطور استثناء کے فرمایا إِلَّا حَمِيمًا مگر گرم کھولتا ہوا پانی جو ان کی انتڑیاں کاٹ ڈالے گا اور اندر کی گرمی دوگنی چوگنی کردے گا وہاں تخفیف کا تو کیا ذکر ہے وَّ غَسَّاقًا وہ پیپ اور زرد پانی پئیں گے جو دوزخیوں کے ہی جلے ہوئے ہر ہر جوڑ سے بہہ بہہ کر گڑھوں میں جمع ہوگا، اور وہ پیاس کی شدت سے بے قرار ہو کر پانی سمجھ کر اس کو پی لیں گے، لیکن اس کا زہر ان کے سارے وجود کے اندر پھیل جائے گا اور ان کے اندر کو بری طرح خراب کردے گا۔

اہل دوزخ کا ہمیشہ دوزخ میں رہنے کی سزا پر شبہہ اور اس کا جواب

اگر کسی کو دوزخیوں کے ہمیشہ دوزخ میں رہنے کے حکم پر یہ شبہہ پیدا ہو کہ یہ سزا جرم سے زیادہ ہے کہ ان کی دنیا کی عمر جتنی تھی اتنی ہی مدت ان کو جہنم میں رکھنا چاہئے تھا لیکن اس معمولی سی عمر کے برے اعمال کے بدلے میں ہمیشہ کے عذاب میں گرفتار کرنا تو سراسر ظلم ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تمہاری غلط فہمی ہے، ان کو ہمیشہ کا عذاب دینا عین انصاف ہے چنانچہ فرمایا:

جَزَآءً وِّفَاقًا ۝

بدلا ہے پورا

یعنی پورا بدلہ ہے، ان کے اعمال کے موافق نہ کم ہے اور نہ زیادہ، جواب کا حاصل یہ ہے کہ غور و تامّل کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اعمال بھی لامتناہی تھے اس لئے سزا بھی لامتناہی ہے، ان کے اعمال کے لامتناہی ہونے کی دلیل یہ ہے وہ حساب کی توقع نہیں رکھتے تھے (ان کی نیت یہ تھی کہ اگر ان کو

لامتناہی عمر دے دی جائے تو اسی طرح زندگی گذاریں گے) موت کی وجہ سے ان کے برے اعمال کا موقوف ہو جانا ان کی ناچاری اور بے بسی کی وجہ سے ہے، اس وجہ سے نہیں کہ ان کو عذاب کا خوف تھا یا ثواب کی اُمید سے وہ برے اعمال سے رُک گئے یہ دونوں باتیں تو وہ شخص کرے جس کو حساب کی توقع ہو چنانچہ اسی بات کو فرمایا:

إِنَّهُمْ كَانُوا لَا يَرْجُونَ حِسَابًا ○

ان کو توقع نہ تھی حساب کی

یعنی ہرگز یہ لوگ حساب کی اُمید نہیں رکھتے تھے، لہٰذا موت آجانے سے برے اعمال نہ کرنے کی مثال تو یہ ہوئی عصمت بی بی از بے چادری

دائمی عذاب کے مبنی برانصاف ہونے کی دوسری وجہ

ان کے دلوں میں گناہ کی محبت اتنی کھب چکی تھی کہ ان کی روحوں کے رگ وریشے میں سماگئی تھی اور (روح کی) خاص طبیعت کے حکم میں ہوگئی تھی، اور روح ایک ابدی چیز ہے وہ ہمیشہ رہے گی، (اور شی کی طبیعت اس سے جدا نہیں ہوتی لہٰذا) جب روح باقی ہے اس کی اس خاص طبیعت کا جدا ہونا بھی محال ہے، اور یہی خاص طبیعت سبب ہے دائمی عذاب کا، لہٰذا جب سبب ہمیشہ رہا تو مسبب (عذاب) کے ہمیشہ رہنے میں کیا تعجب ہے؟

تیسری وجہ

آخرت کے حساب سے بے اعتمادی والے اعمال صرف ان کے اعضاء وجوارح سے ہی سرزد نہیں ہوئے بلکہ وہ اعمال بھی ہیں جو روح سے صادر ہوئے اعضاء کا ان کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے اور روح کے اعمال ہمیشہ روح کے ساتھ رہیں گے (لہٰذا ان کو دائمی عذاب عین انصاف ہے) اور روح کے اعمال بد جیسے کفر اور آیات کی تکذیب ہے) چنانچہ فرمایا:

وَّكَذَّبُوا بِاٰيٰتِنَا كِذَّابًا ○

اور جھٹلاتے تھے ہماری آیتوں کو مکرا کر

یعنی ہماری آیات جھٹلائیں جو سزا و جزا اور حساب پر دلالت کرتی تھیں کیونکہ ان کو ان کے سچے

ہونے کا گمان تک نہ تھا، اور یہ تکذیب روح کا عمل ہے بدن کا عمل نہیں ہے لہٰذا یہ روح کے بدن سے جُدا ہونے کے بعد برزخ میں بھی اس کے ساتھ رہا پھر دوبارہ جب روح بدن کے ساتھ مل گئی تو عالم حشر ونشر میں بھی یہ انکار روح کے ساتھ قائم رہا۔ اور جیسے سخت بدمزاجی مسلسل رنج کا سبب ہوتی ہے ایسے ہی یہ انکار بھی مسلسل عذاب کی زیادتی کا سبب ہوگا۔

دوسرا شبہہ اور اس کا جواب

اگر کسی کے دل میں یہاں یہ شبہہ گذرے کہ گناہ کی محبت، انکار اور دیگر روح کے برے اعمال تو ایک مخفی چیز ہے ایسے نہیں تھے کہ ظاہر ہوں اور جب تک کوئی گناہ ظاہری طور پر نہ ہو اس پر مواخذہ تو درست نہیں ہے، ان کے جو گناہ لوگوں کے سامنے ظاہر ہوتے تھے وہ بدن کے اعمال ہیں جو روح نکلنے کے بعد موقوف ہو گئے (لہٰذا روح کے گناہوں پر عذاب نہ ہونا چاہئے)

جواب:۔ اس شبہہ کا جواب یہ ہے کہ برائی کا حال حاکم کو معلوم ہونا چاہئے کسی اور کو معلوم ہونا ضروری نہیں ہے، اور اس کے روح کے اعمال اللہ تعالیٰ کو بخوبی معلوم ہیں، نیز اس کے خفیہ نویس یعنی کراماً کاتبین نے بھی ان کو لکھ رکھا ہے، اور خود ان کے قول وفعل بھی (ان کے اعمال باطنی پر) دلالت کرتے ہیں، چنانچہ آگے فرمایا:

وَّكُلَّ شَىْءٍ اَحْصَيْنٰهُ كِتٰبًا ۝

اور ہر چیز ہم نے گن رکھی ہے لکھ کر

"وَّكُلَّ شَىْءٍ" اور ہر چیز ان کے روح وبدن کے اعمال میں سے، اور قول وفعل جو ان پر دلالت کرتے تھے، "اَحْصَيْنٰهُ" ہم نے ان سب کو گن رکھا ہے، اور صرف اپنی گنتی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ "كِتٰبًا" لکھا ہوا ہے تا کہ قیامت تک کارکنان کو ہر وقت یاد رہے، اور جب عمل غیر متناہی ہے (جیسا کہ ثابت ہوا) تو اس کی جزا بھی غیر متناہی ہونا چاہئے، چنانچہ فرمایا:

فَذُوْقُوْا فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا ۝

اب چکھو کہ ہم نہ بڑھاتے جائیں گے تم پر مگر عذاب

مؤمن عاصی کے لئے دائمی عذاب نہ ہونے کی وجہ

ایمان والے گنہگاروں کو صرف اعضاء و جوارح کے گناہوں پر عذاب ہوگا اور وہ بھی بالآخر ختم ہوجائے گا، وجہ اس کی یہ ہے کہ ایمان کے سبب ان کی روحیں بدی کی آلائشوں سے پاک تھیں۔

جہنمیوں کے عذاب کی ایک دردناک صورت

''تنبیہ الغافلین'' میں لکھا ہے کہ جب جہنم والے بہت پیاسے ہوں گے تو پانی مانگیں گے، اس پر ایک سیاہ بادل ظاہر ہوگا جس سے بختی اونٹوں کی گردنوں جیسے سانپ اور بچھو برسیں گے، جوان کو پھاڑ پھاڑ کر کھا جائیں گے، ان کا زہر ایسا شدید ہوگا کہ ہزار سال تک ان کے جسموں سے وہ ختم نہ ہوگا، اور یہی معنی ہیں اس آیت کے ''زدنا هم عذابًا فوق العذاب'' اور فذوقوا الخ والی آیت کے بھی یہی معنی ہیں۔

ایک مشہور شبہہ اور اس کا جواب

اس جگہ (اہل جہنم کے دائمی عذاب کے متعلق) اکثر لوگوں کو ایک شبہہ ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ جب خلافِ مزاج چیز میں کوئی دوام اور ہیشگی کے ساتھ مبتلا ہوجائے تو ہیشگی کی وجہ سے اس کی تاثیر معلوم نہیں ہوتی اور اس سے کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوتی جیسے دق کے مریض کو گرمی سے کچھ تکلیف نہیں ہوتی (لہٰذا جہنم والے جب ہمیشہ جہنم میں رہیں گے تو ایک طرح سے وہ اس کے عادی ہوجائیں گے ان کو عذاب کیسے ہوگا)

جواب (۱):۔ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ دوام کی وجہ سے خلاف مزاج چیز کا احساس نہ ہونا وہاں ہوتا ہے جہاں خلافِ مزاج چیز ایک ہی ہو اور جہاں مختلف صورتیں ہوں وہاں ایسا نہیں ہوتا، تکلیف کا احساس باقی رہتا ہے اور جہنم میں ان کو ایک ہی طرح کا عذاب نہ ہوگا بلکہ طرح طرح کے عذاب ہوں گے جس کا وہ احساس کرتے رہیں گے جیسے ''فذوقوا'' سے معلوم ہوتا ہے۔

جواب (۲):۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ انسان کو کسی تکلیف کا احساس بدن کی جلد کے واسطے سے ہوتا ہے اور دوزخیوں کی جلد جل جانے کے بعد نئی پیدا کی جائے گی اور جلد چونکہ تازہ ہوگی اس لئے اس کے اندر تکلیف کے احساس کی قوت بھی بہت قوی ہوگی، جیسے جب زخم پر نئی کھال جمتی ہے تو اس میں تکلیف

کے احساس کی بہت قوت ہوتی ہے، معمولی گرمی سردی سے بھی وہ متاثر ہو جاتی ہے۔

اور دوزخیوں کے عذاب کی زیادتی کی ایک وجہ یہ بھی ہوگی کہ ان کے دشمنوں اور مخالفین (مؤمنین) کو طرح طرح کی نعمتوں سے نوازا جائے گا جیسا کہ فرمایا:

إِنَّ لِلْمُتَّقِينَ مَفَازًا ○

بیشک ڈر والوں کو ان کی مراد ملنی ہے

بیشک ڈرنے والوں کو مراد ملنی ہے یعنی ان کے مرتبے نافرمانوں کے مرتبوں سے جدا اور ممتاز ہوں گے۔

حَدَآئِقَ وَاَعْنَابًا ○

باغ ہیں اور انگور

میووں سے بھرے ہوئے باغ ہوں گے، ان کی حفاظت کے لئے چاروں طرف دیوار بندی ہوگی، لغت میں ''حدیقہ'' اسی باغ کو کہتے ہیں جس کے اردگرد دیوار ہو،

وَاَعْنَابًا اور بہت سے انگور ٹٹیوں پر سے لٹک رہے ہوں گے، یہ باغ دوزخیوں پر (جنت سے) دوسری دیوار کی مانند ہوگا، اور ٹٹیاں جن پر انگور کی بیلیں پھیلی ہوتی ہیں وہ مکان کی چھت کی طرح ہوتی ہیں ان کے سائے میں بیٹھا جاتا ہے ان کو خاص طور پر یہاں اس لئے ذکر کیا کہ وہ گویا درخت ہیں کہ مقصود ان سے میوہ کھانا ہے، ورنہ انگور بھی ایک پھل ہے جس کا ذکر حدائق کے ضمن میں ہو چکا ہے (تو علیحدہ سے ذکر کرنے کی یہی وجہ ہے جو مذکور ہوئی) تو وہاں سائبان بارہ دری یا بنگلوں کے ہونے کی بجائے انگور کی ٹٹیوں کے ہوں گے۔

وَّكَوَاعِبَ اَتْرَابًا ○

اور نوجوان عورتیں ایک عمر کی سب

(اور ان متقیوں کے لئے جنت میں) نوجوان کنواری عورتیں ہوں گی جن کی چھاتیاں اُبھری ہوئی اور سخت ہوں گی، یہ اس لئے کہ باغ و بہار کی سیر کا لطف و مزہ جبھی ہے جبکہ خوبصورت، پری پیکر محبوبائیں بھی ساتھ ہوں۔

أَتْرَابًا

وہ سب عورتیں پرہیزگاروں کے ہم عمر ہوں گی، چونکہ تمام روحوں کا بدن کے ساتھ ملنے کا وقت ایک ہی ہے اور وہ ہے جب دوسری بار صور پھونکا جائے گا، تو گویا ایک ہی وقت میں سب پیدا ہوئے ہیں۔

اُتراب کون ہوں گی

اور یہ عورتیں دنیا کی ہوں گی (یعنی دنیا کی بیویاں جو جنتی ہوں گی) ان کے ہم جنس ہونے کی وجہ سے متقیوں کو ان کی رفاقت سے بہت محبت اور خوشی ہوگی، اور ہم عمر ہونے کی وجہ سے زیادہ الفت ومحبت ہوگی، (کہ ہم عمروں کے ساتھ الفت ہونا ایک فطری بات ہے) اور یہی وجہ ہے کہ بوڑھوں کو نوجوانوں کی صحبت سے اور جوانوں کو بوڑھوں کی صحبت سے وحشت ہوتی ہے۔

اہل جنت کی عمریں

اکثر تفسیروں میں لکھا ہے کہ جنت میں مردوں، عورتوں کی عمریں تینتیس (۳۳) سال کی ہوں گی، یہ عمر چونکہ جسمانی قوتوں کے کمال کی عمر ہے اور اس عمر میں خوشی ومسرت زیادہ ہوتی ہے اس لئے اہل جنت کو یہی عمر عطا ہوگی، ورنہ پیدائش تو سب کی صور ثانی کے وقت ہو جائے گی اور اس وقت سے لے کر جنت میں داخل ہونے تک کے درمیان کی مدت بہت طویل ہے۔

''تفسیر زاہدی'' اور ''تفسیر ماجدی'' کی بعض روایات میں ہے کہ جنت کی عورتیں اٹھارہ (۱۸) برس کی عمر کی ہوں گی اور مرد تینتیس برس کی عمر کے ہوں گے، اس کا مطلب یہ ہے کہ عورتوں کی صورت اور جسمانی بناوٹ دنیا کی عورتوں کی طرح ہی ہوگی، اور دنیا میں عورتوں کی خوبصورتی کے کمال کی یہی عمر ہے اس کے بعد حُسن میں زوال شروع ہو جاتا ہے، چھاتیاں ولادت اور دودھ پلانے کی وجہ سے ڈھلک جاتی ہیں، نسوانی مزاج تر ہے لیکن اب خشکی پیدا ہو کر حدِ اعتدال میں آ جاتا ہے، اور بدن کا سڈول پن، طبیعت میں بھولا پن، غفلت، اور ناسمجھی جو محبوبوں اور معشوقوں میں مرغوب وپسندیدہ ہے اسی عمر میں ہوتا ہے اس کے بعد پختگی آتی جاتی ہے۔

(تو گویا ان صفات کے اعتبار سے وہ اٹھارہ سال کی لڑکی ہوں گی اور، تینتیس سال والی عمدہ صفات کے اعتبار سے گویا وہ ۳۳ سال کی ہوں گی)

اس کے برخلاف مردوں میں عقل کے اعتبار سے کامل ہونا اور ہر کام میں آزمودہ کار ہونا پسندیدہ ہے، گویا مرد اس میوے کی مانند ہیں جس کا پکا ہوا ہونا زیادہ بہتر ہوتا ہے، اور عورتیں اس پھل کی مانند ہیں جو کچا ہو تو زیادہ لذیذ ہوتا ہے جیسے کھیرا اور ککڑی وغیرہ

وَّكَاْسًا دِهَاقًا ۝

اور پیالے چھلکتے ہوئے

یعنی شراب کے جام چھلکتے ہوئے پے در پے دیئے جائیں گے، ''دِھاق'' کے لفظ میں لغتِ عرب کے استعمال کے مطابق دونوں معنی پائے جاتے ہیں یعنی بھرا ہونا اور پے در پے دینا۔

پرہیزگاروں کو شراب خوشی وانبساط میں اضافے کے لئے پلائی جائے گی، وہ شراب پینے سے ان کے اندر ایسا نشاط پیدا ہوگا کہ بے حجاب و بے باک ہوکر عورتوں سے لطف اندوز ہوں گے، اور سیرِ گلشن کے مزے لوٹیں گے، ان کا وقار لطف اندوزیوں کے لئے مانع نہ ہوگا۔

دنیا و جنت کی نعمتوں کے درمیان صرف ناموں کا اشتراک ہے

جس طرح دنیا میں محبتِ الٰہی کی شراب میں مست ہو کر احوال و مقامات، ابکارِ لوامع وطوامع اور واردات کے باغوں سے پھل اور لذتیں اُٹھائی تھیں ایسے ہی وہاں ہوگا، لیکن وہاں کی شراب محبت الٰہی کی صورتِ مثالی ہے، دنیا کی شراب والی کوئی برائی اس میں نہ ہوگی، اسی لئے حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جنت کی چیزوں کے نام دنیا کی چیزوں کی طرح ہی ہوں گے لیکن دونوں کی حقیقتیں جُدا ہوں گی، اس لئے کہ دنیا کی چیزوں کا خاصہ موادِ عنصریہ کثیفہ میں صورتِ نوعیہ کے آجانے سے پایا جاتا ہے اور جنت کی چیزوں کا خاصہ اسمائے الٰہیہ اور حقائق قدسیہ کی تجلیات کی تاثیر سے جو کہ لطیفۂ مثالیہ میں حاصل ہوگی پایا جائے گا، اگرچہ دنیا و آخرت میں سبب اسمائے الٰہیہ ہی ہیں اور تاثیرات کے ظہور میں ان کے سوا کوئی اور سبب نہیں ہے لیکن (جنت کی چیزوں کے لئے خصوصیت سے ان کو سبب اس لئے قرار دیا کہ) فالِ ظہور، طہارتِ نشاط اور لطافت مواد کے لحاظ سے نیز ناپاکی اور برائیوں سے دور ہونے کے اعتبار سے دونوں کے درمیان زمین آسمان کا فرق ہے، وہ آگ جس کی روشنی کوہِ طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دیکھی تھی اس سے اس آگ کو جو بھٹی میں جلتی ہے جس کا ایندھن گدھے اور گائے کی لید

ہوتی ہے کیا نسبت ہے؟ کیا خوب کسی نے کہا ہے ۔

ہر مرتبہ از وجود حکمے دارد
گر فرقِ مراتب نہ کنی زندیقی

پس جنت میں شراب کی محفل ایسی برائیوں سے پاک ہوگی، جو دنیا میں ہوتی ہیں، اسی لئے فرمایا:

لَا یَسْمَعُوْنَ فِیْهَا لَغْوًا وَّلَا كِذّٰبًا ○

نہ سنیں گے وہاں بک بک اور نہ مکرانا

اس شراب کے پینے میں نہ بیہودہ بات سنیں گے اور نہ جھوٹ، جب اس شراب کے پینے سے بیہودہ بات بھی سرزد نہ ہوگی تو لڑائی اور گالی گلوچ کا پھر کیا ذکر ہے، دنیا میں ان کی محفل جس طرح نکمی باتوں سے پاک تھی کہ جھوٹ، تمسخر اور عیب گیری کا ان کی محفل میں گذر نہ تھا اسی طرح جنت میں ہوگی۔

اور یہ جو نعمتیں اور لذتیں ان کو حاصل ہوں گی اس وجہ سے نہیں کہ یہ کوئی اس عالم کی آب و ہوا کا تقاضہ ہے کہ جیسا دنیا میں علاقوں اور ملکوں کے اختلاف سے سردی، گرمی اور قحط و ارزانی ہوا کرتی ہے بلکہ یہ چیزیں ان کو اس لئے ملیں گی کہ ان کے رب کا بدلہ ہے چنانچہ فرمایا:

جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ عَطَآءً حِسَابًا ○

بدلا ہے تیرے رب کا دیا ہوا حساب سے

تیرے رب کی طرف سے بدلہ ہے، اور ربّ کامل ذات ہے لہٰذا کامل کا بدلہ بھی کامل اور پورا ہوگا۔

ایک شبہہ اور اس کا جواب

اگر کسی کے دل پر یہ خیال گذرے کہ بدلے (جزاء) میں دو باتوں کا لحاظ ہوتا ہے ایک دینے والے کا مرتبہ دوسرے جس کام کے عوض بدلہ دیا جا رہا ہے اس کی اپنی قدر، اور یہاں پر دینے والا اگرچہ نہایت ہی اعلیٰ مرتبے کا ہے لیکن ان کے کام تو سب مل کر بھی اتنا کمال نہیں رکھتے جتنا کامل ان کو بدلہ دیا جا رہا ہے۔

جواب:۔ اس کے جواب میں کہیں گے کہ یہ نعمتیں اور لذتیں جو اہلِ جنت کو عطا ہوں گی حقیقت میں ''جزا'' نہیں ہیں بلکہ یہ تو انعام اور بخشش ہے، چنانچہ فرمایا ''عَطَاءً''

بخشش اور انعام ہیں اور یہ انعامات محض ابتداء نہیں ہیں بلکہ ان کے اعمال کے موافق ہیں (یعنی

اعمال کی وجہ سے ہیں ہاں) اعمال کے (سو فیصد برابر) اندازے پر نہیں ہیں (بلکہ اس سے بڑھ کر ہیں) چنانچہ فرمایا "حِسَابًا" ان کے اعمال کے موافق۔

اعمال عطاو بخشش کے لئے محض علامت ہیں

جیسے کوئی بادشاہ اپنے نوکروں کو انعام دینا چاہے تو وہ یوں کہے کہ جو فلاں خدمت پر مامور ہے اسے اتنا دو، جو فلاں قلعے پر متعین ہے اسے اتنا دیدو تو یہاں انعام کی تقسیم میں کام اور انعام دینے والے کی قدر کا لحاظ نہیں ہوتا یہاں کاموں کا ذکر تو محض علامت کے طور پر ہے، لیکن انعام کو جب (اللہ تعالیٰ نے) اعمال پر مقرر فرمایا تو اس کو جزا کے ساتھ مشابہت ہوگئی اسی وجہ سے اس انعام و بخشش کو جزاء سے تعبیر فرمایا ہے، نیز یہ جزاء دینے والی ذات بھی ایسی ہے جس کی صفت آگے یوں بیان کی گئی ہے:

رَّبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا

جو رب ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور جو کچھ ان کے بیچ میں ہے

یعنی آسمان و زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے ان پر انعام و بخشش ابتدائی ہے، نہ ان کو مکلف بنایا، نہ پہلے سے انعام کا کوئی وعدہ کیا اور نہ ہی ان کے اندر کچھ استحقاق ہے اس کے باوجود ان پر اعلیٰ درجے کا انعام واحسان کیا ہے تو جو لوگ تھوڑی سی بھی لیاقت رکھتے ہیں، ان سے وعدہ بھی ہوا ہے اور وہ مکلف بھی ہیں ان پر انعام و بخشش کیسے مکمل نہ کرے گا، اسی واسطے اس کا نام ہے:

الرَّحْمٰنُ

بڑی رحمت والا

"الرحمٰن" وہ ہے جو بغیر وعدہ کئے ہزاروں احسان کرتا ہے تو جس سے وعدہ کیا ہو اس سے کیسے پورا نہ کرے گا، لیکن باوجود اس کے کہ اس کی رحمت ایسی ہے کہ اپنے فرمانبردار بندوں پر ماں باپ سے زیادہ شفیق ہے اس کی عظمت وجلال بھی نہایت اعلیٰ مرتبہ پر ہے کہ:

لَا يَمْلِكُوْنَ مِنْهُ خِطَابًا ○

قدرت نہیں کہ کوئی اس سے بات کرے

یعنی باوجود اس قدر نزدیکی، توجہ، عنایت اور مرتبہ کے "اس سے بات کرنے کی قدرت نہ رکھیں

گے"، یعنی بغیر وسیلے کے نہ اپنے مقدمے میں بات کر سکیں گے اور نہ کسی سفارش کے سلسلے میں بات کر سکیں گے خواہ وہ قریب ہو یا اپنا آشنا ہو اور اگرچہ یہ عظمت وجلال اسکی ذات کو لازم ہے لیکن اس کا کامل ظہور اس دن ہوگا:

يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا ۔

جس دن کھڑی ہو روح اور فرشتے قطار باندھ کر

روح کی حقیقت اور اس کے قیام سے مراد

روح نام ہے ایک بیدار اور بہت زیادہ درک رکھنے والے لطیفہ کا جو ہر مخلوق کے اندر ہے، آسمان، زمین، درخت، ہوا اور پتھر سب کے اندر ہے، اسی کو دوسری جگہ "ملکوت کل شیٔ" سے تعبیر فرمایا ہے، اور اسی لطیفۂ درّاکہ کے سبب ہر مخلوق کو اپنے پروردگار کی تسبیح وعبادت میسر ہے،

"وإن من شئ إلا يسبح بحمده" اور فرمایا "كل قد علم صلوته و تسبيحه"

حقیقت میں وہ لطیفۂ درّاکہ ایک جوہر نورانی ہے جو اہر و اعراض سے تعلق رکھتا ہے، اسی جوہر روحانی (نورانی) کے سبب قرآن کی سورتیں، نیک اعمال، اور کعبۂ معظمہ برزخ وقیامت میں سفارش کریں گے، اور گواہی دیں گے، آسمان، زمین، دن اور رات سب گواہ ہوں گے، صحیح حدیث میں آیا ہے کہ مؤذن کے لئے جہاں تک اذان کی آواز پہنچتی ہے ہر پتھر، ڈھیلا، درخت اور لکڑی قیامت کے دن گواہ ہوں گے۔

تو اس دن یہ جواہر نورانی اپنی مناسب شکلیں اختیار کر کے میدانِ حشر میں کھڑے ہو کر گواہی دینے اور شفاعت کرنے میں مشغول ہوں گے۔

انسانوں اور دیگر مخلوقات کی روح کے تعلق میں فرق

انسانوں اور جانداروں کی روحوں کے تعلق میں اور دوسری مخلوقات کی روحوں کے تعلق میں فرق یہ ہے کہ پہلا تعلق دائمی اور حلول سُریانی سے مشابہت رکھتا ہے جس نے سب قوائے طبیعیہ، نباتیہ اور حیوانیہ کے اندر حلول کر کے ان کو اپنے حکم کے تابع کیا ہے، اور دوسرا تعلق دائمی نہیں ہے اور حلول طَریانی کے مشابہ ہے، اس واسطے دنیا میں بھی بعض اوقات اس تعلق کا اثر ظاہر ہو جاتا ہے چنانچہ بعض

پتھر، درخت وغیرہ نبیوں سے کلام کرتے، ان کے حکم پر عمل کرتے، اور سلام کرتے ہیں اور قیامت کے نزدیک یہ تعلق بھی دائمی اور سریانی کے قریب ہو جائے گا، چنانچہ بعض احادیث میں آیا ہے کہ قیامت کے قریب ایسے عجائبات کثرت سے ظاہر ہوں گے اس کا یہی سبب ہے، اور راز اس کا یہ ہے کہ اس تعلق کے اثر کا ظہور اس وقت ہوتا ہے جب روحانی آثار و احکام غالب ہوں، اور قیامت کے قریب روحانی آثار و احکام کا غلبہ ہوگا، نیز انبیاء و اولیاء کی ہمت سے بھی کبھی ان کے سامنے روحانی آثار و احکام غالب ہو جاتے ہیں۔

مفسرین نے روح کی تفسیر میں بہت سی باتیں لکھی ہیں لیکن حق وہی ہے جو یہاں مذکور ہوا ہے۔

لَا يَتَكَلَّمُوْنَ إِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا

کوئی نہیں بولتا مگر جس کو حکم دیا رحمٰن نے اور بولا بات ٹھیک

اس دن فرشتے ساتوں آسمان اور زمین کے صف باندھے کھڑے ہوں گے، تا کہ، اس دن کے کاموں کو انجام دیں، جیسے جزا و سزا دینا، اعمال کا تولنا، نامۂ اعمال دکھانا اور پل صراط سے گذرنے وغیرہ کاموں کے لئے تیار و مستعد رہیں گے اور اگر چہ یہ وقت شفاعت و شہادت کا ہوگا لیکن اس وقت بات نہیں کریں گے، بلکہ دم نہ مار سکیں گے، ہاں مگر جس کو اللہ تعالیٰ خود اجازت مرحمت فرمائیں گے اور حکم ہوگا کہ فلاں شخص کی شفاعت کرو یا گواہی دو تو صرف وہ بول سکے گا اور اس شخص کے حق میں یہ حکم رحمت کے تقاضے سے ہوگا اور وہ شخص سچی بات کہے گا، خلاف قاعدہ و ضابطہ بات نہیں کرے گا مثلاً کافر اور بد عقیدہ لوگوں کے حق میں شفاعت نہیں کرے گا بلکہ جو شخص ایمان کے سبب بخشش کے لائق ہوگا، اس کے گناہ کی بخشش طلب کرے گا اسی طرح شہادت دینے میں احتیاط کرے گا کمی زیادتی نہیں کرے گا اس لئے کہ آگے فرمایا:

ذٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ ج

وہ دن ہے برحق

یوم حق ہونے کا معنی

وہ حق کا دن ہے، اس دن جھوٹ یا نکمی بات پیش نہیں کی جا سکے گی اور نہ ہی اس میں کامیابی ہو سکے

گی، بخلاف دنیا کے دنوں کے کہ یہاں جھوٹ سچ، اچھائی برائی سب ملی ہوئی ہے کچھ فرق نہیں۔

اور یہ بھی احتمال ہوسکتا ہے کہ یہ معنی ہو کہ نیک لوگوں اور بُروں کے درمیان، کافروں اور مسلمانوں کے درمیان فرق و امتیاز کرنے کا حق اسی دن کو ہے، وہ دن اسی کام کے قابل ہے، دنیا کے دنوں کی طرح نہیں کہ یہاں دغا فریب، اچھے بُرے کی برابری سب کچھ جاری ہے۔

فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰی رَبِّهٖ مَاٰبًا ○

پھر جو کوئی چاہے بنا رکھے اپنے رب کے پاس ٹھکانا

یعنی اب جو چاہے اپنے رب کے ہاں عزت و وقار کا ٹھکانا بنالے تاکہ اس دن وہ اپنے ہمچشموں اور برابری والوں میں عزت و امتیاز سے سرفراز ہو سکے، اور ان مختلف قسم کے عذابوں سے نجات حاصل کر سکے جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنے والوں اور اس سے غافل لوگوں کے لئے تیار کئے گے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے پاس ٹھکانے بنانے یعنی رجوع الی اللہ کا فائدہ صرف یہی نہیں کہ اس سے آخرت کے عذاب سے خلاصی نصیب ہوگی بلکہ رجوع الی اللہ سے ایک قریبی عذاب سے بھی نجات نصیب ہوگی چنانچہ فرمایا:

اِنَّا اَنْذَرْنٰكُمْ عَذَابًا قَرِيْبًا ج

ہم نے خبر سنادی تم کو ایک آفت نزدیک آنے والی کی

عذاب قریب سے مراد

تم رجوع الی اللہ میں قصور کرتے ہو اور اس کے حکم کی اطاعت سے سرکشی کرتے ہو اس لئے ''ہم نے بارہا تم کو قرآن مجید میں اور پیغمبروں کی زبانی ایک نزدیک کے عذاب سے ڈرایا ہے، جو ہر شخص کو مرنے کے بعد عالم برزخ میں پیش آئے گا''

اور عذاب کو وجود میں لانے کے لئے عالم کبیر کو جو عالم ہونے میں اصل ہے خراب و فنا کرنے کی حاجت نہیں بلکہ اس کے لئے عالم صغیر یعنی عالم انسانی کو خراب کرنا کافی ہے۔

برزخ میں بُرے اعمال ڈراؤنی شکل میں ظاہر ہوں گے

اس لئے کہ اس عذاب کی حقیقت یہ ہے کہ بُرے اعمال بُری اور کالی شکلوں میں ظاہر ہوں گے، جو

برے اعمال مردے کی ذات پر غالب تھے وہ ڈراؤنی شکلوں میں اس کی قوتِ خیالیہ پر اس طرح ظاہر ہوں گے کہ وہ قوت ان کے اثر سے بھر جائے گی، اس عذاب کے لئے اس کی حاجت نہیں کہ اعمال نامے کھولے جائیں، گواہوں کو حاضر کیا جائے، اپنے اپنے حقوق کے دعویدار جمع ہو جائیں، اگلے پچھلے لوگ سب جمع ہو جائیں، مالکِ مطلق بے پردہ تجلی فرمائے، اور ایک اچھی جگہ نیک لوگوں کے لئے اور دوسری بُری جگہ بُرے لوگوں کے لئے علیحدہ مقرر کی جائے (یہ آخرت میں ہوگا) اس کو اسی واسطے عذاب قریب کہا ہے۔

يَوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ

جس دن دیکھ لے گا آدمی جو آگے بھیجا اس کے ہاتھوں نے

"قَدَّمَتْ" میں نکتہ، یدان سے مراد دو قوتیں اور برزخ کا کچھ حال

یہاں دو ہاتھوں سے مراد عمل کرنے والی دو قوتیں ہیں، ایک نیک عمل کی قوت اور دوسری برے عمل کی قوت، اور (فرمایا قَدَّمَتْ) تقدیم اس بات کی دلیل ہے کہ عمل کرنے والے کے جوہر نفس میں نیک اعمال کی ہیئتِ نورانی اور برے اعمال کی ہیئتِ ظلمانی پیدا ہو چکی ہے، اس لئے فرمایا جن اعمال کی اس نے تقدیم کی ہے ان کو دیکھے گا اور کسی عمل کی تقدیم و ترجیح اس وقت تک متصوّر نہیں جب تک اس عمل کی محبت دل میں پیوستہ نہ ہو جائے (یہی پیوستگی ہیئت کا پیدا ہونا ہے) اور عالمِ مثال میں وہ ہیئت اپنے مناسب ایک صورت رکھتی ہے، جب نفسِ انسانی اِس عالم کے ادراکات و تصرفات سے فارغ ہو کر بالکلیہ اُس عالم کے ادراکات کی طرف متوجہ ہوگا اس وقت ان صورتوں کو دیکھے گا، اور یہ عذاب اس قسم کا ہے کہ حکما و فلاسفہ بھی اس کے قائل ہیں اور عالمِ خواب پر قیاس کر کے انہوں نے اس کو واقعی جانا ہے، مگر اتنا فرق ہے کہ خواب سے بیدار ہونے کے بعد نفس اِس عالم کے ادراکات کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اس وجہ سے خواب کے عذاب سے خلاصی متصوّر ہے، لیکن برزخ کے عذاب سے اس طرح کی خلاصی متصوّر نہیں ہے، اس لئے کہ وہ خواب اپنے پیچھے بیداری نہیں رکھتا بخلاف قیامت کے عذاب کے کہ کسی کی عقل اس کو معلوم نہیں کر سکتی، تو یہ عذاب یعنی برزخ کا عذاب زمانۂ وقوع کے اعتبار سے بھی قریب ہے اور عقل کے بھی قریب ہے تصور و تصدیق کے اعتبار سے، اس لئے اس کو عذابِ قریب فرمایا ہے۔

برزخ میں نیک عمل نورانی صورت میں ظاہر ہوں گے

لیکن ایمان و اعتقاد کی درستگی کے بسبب اس عذابِ قریب سے بھی نجات مل جائے گی، اسلئے کہ اگر چہ بُرے اعمال نے اس کی ذات کے اندر تاریک شکلیں پیدا کی تھیں مگر ایمان و اعتقادِ صحیح نے بھی بڑی نورانی صورتیں اس کی ذات میں پیدا کی تھیں لہٰذا دونوں طرف کی کش مکش کے بعد بالآخر ایمان کا نور گناہ کے اندھیرے پر غالب آ جائے گا، جس طرح تہہ بتہہ بادل سورج کی شدید شعاعوں سے پھٹ جاتے ہیں۔

اور کافروں کے پاس اس تاریک شکل کے سوا کوئی دوسری چیز ایسی نہ ہوگی جس کے نور سے اس کی تاریکی کو دور کرے اس لئے وہ ناچار حسرت کرے گا۔

وَ يَقُوْلُ الْكٰفِرُ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا ۝

اور کہے گا کافر کسی طرح میں مٹی ہوتا

اور کہے گا کافر کسی طرح میں مٹی ہوتا یعنی جب وہ اپنے کفر و گناہ کی بُری بُری صورتیں دیکھے گا اور ان کے مقابلے میں ایمان کی نورانی صورت اپنے پاس نہیں پائے گا تو کہے گا کیا اچھا ہوتا کہ میں مٹی ہوتا اور کاش کہ انسان کی شکل میں پیدا نہ ہوتا کہ آج یہ بُری صورتیں میرے لئے ظاہر نہ ہوتیں۔

کافر کا مٹی کو یاد کرنے کی وجہ

اور مٹی کو خاص اس واسطے یاد کرے گا کہ آدمی کی اصل خاک ہے، کہ نطفہ غذا سے پیدا ہوتا ہے اور غذا یا تو زمین سے اُگتی ہے یا حیوانات سے حاصل کی جاتی ہے اور یہ دونوں چیزیں خاک سے پیدا ہوتی ہیں، اور خاک کے بعد کوئی اور مادہ اس کے ذہن میں نہیں ہے اس لئے مجبوراً صورتِ انسانیہ سے بھاگنے کے وقت مادے یعنی خاک کی آرزو کرتا ہے، جس طرح سفر میں کسی کو رنج پہنچتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ اچھا ہوتا کہ میں گھر سے باہر نہ نکلتا، اور یہ نہیں کہتا کہ میں راستے سے ہی لوٹ جاتا یا راستے میں ہی رہ جاتا اس لئے کہ اس طرح کہنے سے اس بلا و مصیبت سے کمال دوری معلوم نہیں ہوتی۔

اور کافر یہ بھی جان لے گا کہ یہ سب گرفتاری میرے روح کے باقی رہنے کے سبب سے ہوئی ورنہ

میں اگر صرف بدن ہوتا اور خاک ہو جاتا تو اس عذاب میں گرفتار نہ ہوتا۔

حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم سے مرفوعاً اور موقوفاً روایت ہے کہ جب قیامت کے دن جانوروں سے حساب و کتاب کے بعد جیسے جس جانور نے کسی دوسرے جانور کو سینگ یا کھر مارا ہوگا وہاں اس کا قصاص لے کر حکم ہوگا کہ سب خاک ہو جاؤ اس وقت کافر ان کے حال کو دیکھ کر رشک کرے گا اور کہے گا کاش مجھ کو بھی خاک ہونے کا حکم ہوتا اس بُری آدمیت سے دور رہتا جو میری خرابی کا سبب ہوئی۔

بعض صوفیا نے فرمایا کہ خاک سے مراد کاش خاک کی طرح عاجزی اور فروتنی اختیار کرتا دنیا میں تکبر وغرور نہ کرتا ہے۔

بعض واعظوں نے کہا کہ اس جگہ کافر سے مراد ابلیس ہے کہ کفر میں سب سے بڑھ کر وہی ہے، تو جب وہ حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد پر طرح طرح کی نوازشیں دیکھے گا تو آرزو کرے گا کہ کاش میں بھی خاک ہوتا آگ سے پیدا نہ ہوتا کہ اسی وجہ سے میں نے فخر کیا اور کہا تھا: " خلقتنی من نار و خلقته من طین"

اللّٰھم لک الحمد اوّلاً و آخرًا

مقدمہ سورۃ النزعٰت

یہ سورت مکی ہے، اس میں چھیالیس (۴۶) آیات، ایک سونواسی (۱۸۹) کلمے اور سات سو ترپن (۷۵۳) حروف ہیں۔

سورۂ مرسلات کے ساتھ ربط ومناسبت اور قرآن کی پانچ سورتیں

ظاہر نظر میں اس سورت کا سورۂ مرسلات کے ساتھ ربط قوی معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ دونوں کی ابتداء میں بہت مشابہت ہے، بلکہ پورے قرآن میں اس قسم کی ابتداء پانچ سورتوں میں ہے اور وہ یہ ہیں، (۱) صافات (۲) ذاریات (۳) مرسلات (۴) نازعات (۵) عادیات

صافات میں تین صفات شروع میں بیان کی گئی ہیں، ذاریات میں چار صفات اور باقی تینوں میں پانچ پانچ صفات بیان کی گئی ہیں، لیکن سورۂ عادیات دو سبب سے ان دونوں (مرسلات، نازعات) سے مشابہت کم رکھتی ہے، ایک یہ کہ وہ چھوٹی ہے اور یہ دونوں بڑی ہیں، دوسرے اس میں دو صفتیں فعل کے صیغے سے مذکور ہیں جیسے "فاثرن به نقعًا فوسطن به جمعًا" اوران دونوں سورتوں میں پانچوں صفات صیغہ اسم فاعل سے مذکور ہیں۔

توان دونوں سورتوں کی ابتداء کے انداز میں بہت مناسبت ہے، لیکن باریک بین اصحابِ تحقیق نے غور وفکر سے معلوم کیا ہے کہ سورۂ مرسلات کا مدار قیامت اور اس کے احکام کے بیان پر ہے، اور سورۂ تساؤل سورۂ مرسلات کی شرح اور اس کا تتمہ ہوئی اسی وجہ سے ان دونوں کو ایک جگہ پر لکھا ہے، پھر ابتداء کی مناسبت سے سورۂ تساؤل کے بعد سورۂ نازعات کو رکھا گیا ہے۔

سورۂ نازعات کا سورۂ تساؤل کے ساتھ ربط

خوب غور کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اِس سورت کے مضامین کو سورۂ تساؤل کے مضامین کے ساتھ اس قدر مناسبت ہے کہ نوبت اتحاد تک پہنچتی ہے، اس قدر مناسبت کے ہوتے ہوئے دونوں کے مطلع (ابتداء) میں مناسبت کی رعایت کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ سورۂ نباء میں کافروں کا آپس میں ایک دوسرے سے سوال کرنے کا ذکر تھا اور اِس سورت میں کافروں کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کرنا مذکور ہے، چنانچہ فرمایا:

"یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ السَّاعَةِ اَیَّانَ مُرْسٰهَا" اور اُس سورت میں تھا "اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا" اِس سورت میں ہے "وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِکَ دَحٰهَا" اُس سورت میں تھا "وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا" اِس سورت میں ہے "وَالْجِبَالَ اَرْسٰهَا" اُس سورت میں تھا "وَجَعَلْنَا الَّیْلَ لِبَاسًا ۝ وَّ جَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا" اِس سورت میں ہے "وَاَغْطَشَ لَیْلَهَا وَ اَخْرَجَ ضُحٰهَا" اُس سورت میں تھا "سَبْعًا شِدَادًا" اِس سورت میں ہے "ءَ اَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ بَنٰهَا" اُس سورت میں تھا "وَّاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا ۝ لِّنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّنَبَاتًا" اِس سورت میں ہے "اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَ هَا وَ مَرْعٰهَا" اُس سورت میں تھا "یَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ" اِس سورت میں ہے "تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ" اُس سورت میں جہنم کے بارے میں فرمایا تھا "لِّلطّٰغِیْنَ مَاٰبًا" اور اِس سورت میں ہے "فَاَمَّا مَنْ طَغٰی وَاٰثَرَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا فَاِنَّ الْجَحِیْمَ هِیَ الْمَاْوٰی" اور اُس سورت میں دوزخیوں کا جہنم میں ٹھہرنے کے بارے میں یوں ارشاد فرمایا تھا "لّٰبِثِیْنَ فِیْهَآ اَحْقَابًا" اور اِس سورت میں اہل جہنم کا دنیا اور برزخ میں کم ٹھہرنے کے متعلق اس طرح بیان فرمایا "لَمْ یَلْبَثُوْا اِلَّا عَشِیَّةً اَوْ ضُحٰهَا" اُس سورت میں جنت اور اس کی نعمتوں کے متعلق یوں فرمایا تھا "لِلْمُتَّقِیْنَ مَفَازًا" اور اِس سورت میں ہے "وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَی النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰی فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِیَ الْمَاْوٰی" اس کے علاوہ غور کرنے کے بعد اور بھی بہت سی مناسبتیں ظاہر ہوسکتی ہیں۔

نازعات کی وجہ تسمیہ

اس سورت کا نام "نازعات" رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ "نازعات" ان پانچ صفات میں سے ایک صفت ہے جو اس سورت کے شروع میں بیان ہوئیں ہیں۔ اور یہ پانچ صفات ہر کمال کے حصول کا ذریعہ ہیں، پھر ان میں سے پہلی صفت (نازعات) باقی چار کے لئے اصل کا درجہ رکھتی ہے، باقی اس کی فرع ہیں، اس کی حیثیت باقی چار کی نسبت سے وہی ہے جو "ابجد" کے قاعدہ کو تمام علوم سے نسبت ہے کہ اس قاعدہ کے سیکھے بغیر کوئی علم حاصل نہیں ہوسکتا۔

اُن پانچ درجات کا بیان جو نفسِ انسانی کی تکمیل کے لئے ضروری ہیں

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جب انسان کا نفس کسی کام میں تکمیل کی طرف متوجہ ہوتا ہے خواہ وہ کام علم ہو یا عمل، صنعت ہو یا پیشہ، نیک ہو یا بُرا، فائدے کا ہو یا نقصان کا تو ضروری ہے کہ وہ ان پانچوں درجات کو (جن کا آگے ذکر آتا ہے) طے کرے تب جا کر وہ اس فن میں رتبہٴ تکمیل کو پہنچے گا۔

(اور وہ پانچ درجات یہ ہیں)

پہلا درجہ

سب سے پہلے اپنے آپ کو ان چیزوں سے دور رکھے جو مقصود کے منافی ہیں، اور اس حال میں کوشش کرنا ہوگی کہ شاید اس کی طبیعت انہی منافات کو چاہتی ہوگی، یا شریعت ان منافات کو بجالانے کا مطالبہ کرتی ہوگی، یا عقل ان کی طرف کھینچتی ہوگی، لیکن وہ آدمی (جو اس کام میں کمال حاصل کرنا چاہتا ہے) اپنی طبیعت، شرع اور عقل کے برخلاف اس چیز کو حاصل کرنے میں مشغول ہوتا ہے، اور طبیعت، یا عقل، یا شرع کی مخالفت کی پرواہ نہیں کرتا، اسی حالت کو (اس سورت میں) زور سے کھینچنے سے تعبیر فرمایا ہے "وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا" انہی معنوں پر دلالت کرتا ہے۔

اگر یہ حالت (اپنے نفس کو زور سے کھینچ کر کام پر لگانا) شہواتِ نفسانی کے سبب پیش آتی ہے (یعنی نفس کا تقاضا شہوات کی طرف ہو رہا ہو اور اسے کھینچ کر شہوت سے ہٹایا جائے) تو اس کو اہل سلوک کی اصطلاح میں توبہ اور مجاہدہ کہتے ہیں۔

دوسرا درجہ

(زبردستی کام میں لگنے کے بعد) کثرتِ شغل سے اس کام کے ساتھ محبت ہو جاتی ہے، اس کام کے کرنے میں ایک خوشی و سرور حاصل ہوتا ہے، دل کی رغبت اسی کی طرف رہنے لگتی ہے، اگر کبھی وہ کام چھوٹ جائے تو بے اختیار دل اسی کا مشتاق رہتا ہے، اور ہر طرف سے منہ پھیر کر اسی میں آدمی مشغول رہتا ہے، اسی حالت کو (اس سورہ میں) نشاط سے تعبیر فرمایا ہے (وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا)

اس حالت کو ہندی زبان میں امنگ کہتے ہیں، اور اہلِ سلوک کی اصطلاح میں جب اللہ کی راہ میں یہ حالت پیش آئے تو اس کو ارادہ، شوق اور ذوق کہتے ہیں، راستے کی مشکلات کا حل اسی صفت کے

حصول کے اندر ہے، لیکن جب تک پہلی صفت (درجہ) حاصل نہ ہو تو اس وقت تک اس صفت کی حقیقت کا معلوم ہونا بھی ناممکن ہے اس لئے کہ یہ صفت نہایت ہی رنج و محنت کے بعد حاصل ہوتی ہے۔

تیسرا درجہ

اس کام میں بہت مہارت حاصل کرلے اور بلا مشقت وہ کام اس سے ہونے لگ جائے، اور کثرت کے بسبب اس کام میں اس کو ملکہ حاصل ہو جائے، اس حالت کو (اس سورہ میں) سباحت یعنی شناوری سے تعبیر کیا ہے (وَّالسّٰبِحٰتِ سَبۡحًا) اسلئے کہ تیرنے والا آدمی بغیر مشقت و تکلف کے پانی میں سیر کرتا ہے۔

اور اہلِ سلوک کی اصطلاح میں اس حالت کو سیرِ احوال و مقامات کہتے ہیں، یہی حالت کمال کا پہلا سِرا ہے اس سے پہلے تو صرف تلاش و جستجو ہی تھی مطلب کا حصول تو اس حالت سے شروع ہوا ہے۔

چوتھا درجہ

یہ ہے کہ اس کام میں اپنے برابر والوں سے آگے نکل جائے اور اس فن میں جو بات دوسروں سے نہ ہوسکے وہ بات یہ آدمی آسانی سے کرجائے، یہ حالت سب سے اعلیٰ ہے اسی کو سبقت کہتے ہیں (فَالسّٰبِقٰتِ سَبۡقًا) صوفیاء کی اصطلاح میں اس حالت کو "طیران" اور "عروج" کہتے ہیں۔

پانچواں درجہ

یہ ہے کہ آدمی کمال کی ساری حدود کو طے کرکے رتبۂ تکمیل تک پہنچ جائے، اور اس فن میں پیشوا اور استاذ بن جائے، اس فن میں لوگ اس سے اپنی مشکلات حل کرائیں، حتّٰی کہ اس کے مشورے اور تدبیر کے بغیر لوگ کام نہ کرسکیں، اسی حالت کو "فَالۡمُدَبِّرٰتِ اَمۡرًا" سے تعبیر فرمایا ہے، صوفیاء کی اصطلاح میں اس مرتبے کو مرتبۂ رجوع، نزول اور دعوۃ الخلق الی الحق اور مرتبۂ تکمیل و ارشاد کہتے ہیں۔

یہ پانچوں مرتبے ہر کام میں خواہ خیر ہو یا شر اور احوال میں سے ہر حال میں خواہ اچھا ہو یا بُرا آدمی کو پیش آتے ہیں، سو بعض نفوس اپنی استعداد کی کمی کی وجہ سے یا کسی مانع کے آجانے کی وجہ سے پانچوں مراتب کے حاصل کرنے سے محروم رہ جاتے ہیں، بعض ایک پر یا دو، یا تین یا چار پر قناعت کرلیتے ہیں، اور جو توفیقِ الٰہی سے پانچوں مرتبے طے کرلے تو وہ ایک عالم کا پیشوا اور مقتداء بن جاتا ہے۔

اور بعض برائی میں اسی طرح یکتا ہو کر ابلیس کے بھی استاد بن جاتے ہیں۔

ان پانچ مراتب کی قسم کھانے کی وجہ اور دیگر نکات

چونکہ سورۂ تساؤل کی آیت "فتأتون افواجًا" میں نفوس انسانی کے ان مراتب کی طرف اجمالی اشارہ فرمایا تھا اس مناسبت سے اس سورۃ کے شروع میں ان کی تفصیل ذکر فرما دی، البتہ ان مرتبے والوں کی قسم کھانے کی وجہ یہ ہے کہ ان کی عظمت و بڑائی ظاہر ہو جائے، نیز اس بات کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ ان مراتب کے آثار ظاہر ہونے کے لئے قیامت کا قائم ہونا ضروری ہے اس لئے کہ عالمِ دنیا ان آثار کے ظہور کا تحمل نہیں کر سکتا۔ جیسا کہ اس کی تفصیل سورۂ نباء میں گذر چکی۔

قسم کو ظرفِ زمان کے ساتھ مقید کرنے میں نکتہ

آگے ''یَوۡمَ تَرۡجُفُ الرَّاجِفَةُ'' میں ''یوم'' اس قسم کا ظرف زمان آ رہا ہے جو اس کی قید ہے، قسم کو ظرف زمان کے ساتھ مقید اس لئے کیا تا کہ معلوم ہو کہ ان مراتب اور مراتب والوں کی قسم کے اندر وہ وقت اور قید ملحوظ ہے، اس وقت اور قید کے لحاظ کئے بغیر وہ قسم کھانے کے قابل نہیں ہیں تو ''یوم ترجف الراجفة'' میں ''یوم'' ظرف ہے، قسم کے فعل محذوف کے ساتھ متعلق ہے، جس پر حرف قسم دال ہے۔

لہٰذا اس ترکیب کا مجموعہ (والنزعت سے لے کر فالمدبرات امرًا تک) "والقمر إذا اتسق" "والیل اذا یغشی" "والنهار إذا تجلّٰی" کے جملوں کی طرح ہے (کہ قسم میں ظرف ملحوظ ہے)

گویا اس کلام کے معنی یہ ہوئے کہ میں قسم کھاتا ہوں ان جماعتوں کی جو ان صفات سے متصف ہیں جس دن کہ قیامت ہوگی اور ان کے آثار ظاہر ہوں گے تب یہ الگ الگ جماعتیں آئیں گی، چنانچہ پہلی صفت والوں کا گروہ الگ ہوگا ان کی شان اور ان کا حکم جُدا ہوگا، دوسری صفت والوں کا گروہ الگ ہوگا ان کا حکم بھی دوسری طرح کا ہوگا، اسی طرح باقی صفات والوں کا حال سمجھنا چاہئے، اور جن میں دو صفات یا تین یا چار یا پانچ اکٹھی پائی جائیں گی ان کا گروہ علیحدہ ہوگا اور ان کے ساتھ معاملہ بھی جُداگانہ ہوگا، یہ سب اس طرح کھلے عام ہوگا کہ دیکھتے ہی محشر والوں کو ہر ایک کا مرتبہ معلوم ہو جائے گا، اور ان کے درمیان جدائی اور امتیاز واضح ہو جائے گا۔

ایک تمثیل

آسانی کے لئے اس کی مثال کو یوں سمجھنا چاہئے کہ جیسے کوئی شخص کسی امیر لشکر کی تعریف میں یوں

کہے، قسم ہے فلاں امیر لشکر کی کہ لڑائی کے دن جس وقت نقارہ ہوا، تو ہر ایک کماندان سپاہیوں کے غول کی شکل میں نمودار ہوا (یعنی قسم میں یہ سارا منظر ملحوظ ہوتا ہے اسی طرح مذکورہ مراتب والوں کے مراتب کی قسم میں قیامت کا وہ خاص منظر ملحوظ ہے اس منظر سے قطع نظر ان مراتب کی قسم کھانا مقصود نہیں ہے)

واللہ اعلم بالصواب

طبائع کی استعدادیں مختلف ہونے کی وجہ سے مذکورہ مراتب میں بھی مختلف طبقات حشر میں ہوں گے

اب یہ جاننا چاہئے کہ لوگوں کی استعدادیں مختلف ہیں، ان پانچ مرتبوں میں سے بعض کے اندر سب مراتب ہوسکتے ہیں اور بعض کے اندر کم وبیش، دوسرے یہ بات پہلے گذر چکی ہے کہ یہ پانچوں مراتب نیک کاموں میں بھی ہوسکتے ہیں اور بُرے کاموں میں بھی، اور تیسرے یہ کہ نیک اعمال بھی مختلف نوع کے ہیں مثلاً علم میں کمال حاصل کرنا، یا تقویٰ وطہارت میں کمال حاصل کرنا، یا جہاد کرنا اور اس میں ترقی وغیرہ مختلف اعمال ہیں ان میں سے ہر ایک میں استعداد کے مختلف ہونے کی وجہ سے مختلف مراتب ہوسکتے ہیں اور ان مختلف اعمال کے اعتبار سے لوگ مختلف طبقات میں ہو جائیں گے، مثلاً فقہاء کا طبقہ وغیرہ، اسی طرح بُرے اعمال بھی مختلف نوع کے ہیں مثلاً فسق وفجور، کفر وضلالت اور بدعت وغیرہ ان اعمال میں بھی استعداد کے مختلف ہونے کی وجہ سے لوگوں کے مختلف مراتب اور پھر ان مراتب میں مختلف طبقات ہوں گے، لہٰذا ضروری ہوا کہ نیک وبد اور کافر ومسلمان میں سے ہر ایک کو ان مراتب میں سے کسی مرتبے پر اُٹھایا جائے اور اسی میں اس کا شمار ہو، چنانچہ بعض صحیح احادیث بھی اختلاف مراتب و طبقات پر دلالت کرتی ہیں مثلاً ایک حدیث کے اندر یہ الفاظ آئے ہیں ''بعثه الله فقيهاً'' دوسری میں آیا ہے ''فی زمرة الشهداء'' اسی طرح جو لوگ وباء میں مرجاتے ہیں تو انکے بارے میں یہ تنازع مشہور ہے کہ شہداء ان کو اپنے گروہ کی طرف کھینچیں گے کہ یہ شہید ہیں، اور جو لوگ بستروں پر مرے تھے وہ ان کو اپنی طرف کھینچیں گے کہ یہ تو اپنے بستر پر مرے ہیں ہمارے ساتھ ہیں شہداء میں کیسے شمار ہوں گے، اسی طرح فقہاء کے اندر بھی یہ کش مکش ظاہر ہے، تو یہ احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں کہ حشر میں مختلف مراتب وطبقات کے لوگ علیحدہ علیحدہ ہوں گے۔

ایک باریک نکتہ

یہ سب اہلِ مراتب خواہ کسی بھی قسم سے ہوں یعنی اچھے ہوں یا بُرے یہ ''یوم الفصل'' کے ارکان ہیں (یوم الفصل کا وجود انہی سے ہے) اور چونکہ عدل و جزاءِ الٰہی کا ظہور انہی کے اندر ہوگا (اس لئے کہ ہر فردِ بشر انہی مراتب میں سے کسی مرتبے کے اندر ہوگا) اس لئے یہ قسم کھانے کے قابل ہوئے اگرچہ ان میں سے بعض (جو بُرے ہیں) مردود، اور شقی ہوں گے، لیکن یہاں تو صرف یہ مدنظر ہے کہ جزاء وسزا ان سے وابستہ ہے اس زاویۂ نگاہ سے ان کی قسم کھائی گئی ہے قطع نظر اس سے کہ وہ اپنی ذات کے اعتبار سے کیا ہیں، اس نکتے کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ یہ بہت باریک بات ہے، اور اس کے ماننے میں کسی قسم کا تردّد نہیں ہونا چاہئے، چنانچہ قرآن میں دوسری جگہ جو یہ الفاظ آئے ہیں ''وَلَا اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ'' اس میں خوب غور کر کے اس بات کو سمجھ لینا چاہئے تا کہ استبعاد کا خیال دور ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔ تمت المقدمة الحمدلله

تفسیر سورۃ النّٰزِعٰت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا ○

قسم ہے گھسیٹ لانے والوں کی غوطہ لگا کر

یعنی قسم اس جماعت کی کہ کھینچتے ہیں اپنے آپ کو کام میں سخت کھینچنا، ''غرق'' کا لفظ اس جگہ اِغراق کے معنی میں ہے، جس طرح مصدر مجرّد کو مزید کی جگہ پر لایا جاتا ہے، جیسے ''فانبتہ اللّٰہ نباتًا'' ''اِغراق'' لغت میں سخت کھینچنے کو کہتے ہیں، یہ لیا گیا ہے، ''کمان کھینچنے سے'' جب کمان کو خوب کھینچتے ہیں تو پیکان کمان کے اندر ہو جاتی ہے گویا غرق ہو جاتی ہے۔

وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا ○

اور بند چھڑا دینے والوں کی کھول کر

یعنی قسم ہے اس جماعت کی جو کام میں شوق وخوشی پیدا کرتے ہیں، یعنی ہنسی خوشی کام کرتے ہیں۔

وَّالسّٰبِحٰتِ سَبۡحًا ۝

اور تیرنے والوں کی تیزی سے

یعنی قسم ہے اس جماعت کی جو تیرتے ہیں کام میں تیرنا، یعنی بے رنج و مشقت کام میں مشغول ہوتے ہیں۔

فَالسّٰبِقٰتِ سَبۡقًا ۝

پھر آگے بڑھنے والوں کی دوڑ کر

یعنی قسم ان لوگوں کی جو کام میں اپنے برابر والوں سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔

فَالۡمُدَبِّرٰتِ اَمۡرًا ۝

پھر کام بنانے والوں کی حکم سے

یعنی قسم ان لوگوں کی جو کام کی تدبیر کرتے ہیں۔ ان سے پہلے جتنی جماعتوں کا ذکر ہوا وہ سب اپنے اپنے کاموں میں ان سے تدبیر پوچھتے اور مشورہ لینے کے لئے رجوع کرتے ہیں۔

آخری دو آیتوں پر فاء لانے کی وجہ

ان آخری دو قسموں پر فاء لانے کی وجہ یہ ہے کہ پہلے تینوں کی بنسبت ان کا مرتبہ بلند ہے، اس لئے کہ یہ خود بھی کامل ہیں اور دوسروں کی بھی تکمیل کرتے ہیں۔

اور پانچویں کا مرتبہ چوتھے طبقے سے بھی بلند ہے اس لئے کہ چوتھا اپنے ہم چشموں پر جو سبقت لے جانے کے قابل ہوا تو انہی کی تدبیر سے ہوا، گویا دنیا میں اس کام کو قائم رکھنے والے لوگ یہی ہیں،

اور ادنیٰ و اعلیٰ کی قسم کھانے میں فرق ہے اسی لئے فاء تعقیب کے لئے لائے تا کہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ اعلیٰ کی قسم ادنیٰ کے بعد ہے اور ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ترقی ہے۔

يَوۡمَ تَرۡجُفُ الرَّاجِفَةُ ۝

جس دن کانپے کانپنے والی

یعنی ان جماعتوں کی قسم اس دن ہے جس دن کانپنے والی کانپے گی، یعنی پہلا صور پھونکے جانے سے

زمین و پہاڑ لرزیں گے، روحیں بدنوں سے جدا ہو جائیں گی، اور تمام نظام عالم درہم برہم ہو جائے گا۔

تَتۡبَعُهَا الرَّادِفَةُ ۝

اس کے پیچھے آئے دوسری

اس سے مراد دوسری مرتبہ کا صور پھونکنا ہے، کہ اس وقت پھر روحیں اپنے قالب کے اندر لوٹ آئیں گی اور ایک دوسرے رنگ میں نظام عالم وجود میں آئے گا۔

جواب قسم

ان پانچوں قسموں کا جواب مذکور نہیں ہے اس لئے کہ قسم خود جواب قسم پر دلالت کر رہی ہے وہ یہ کہ اس دن ان اصحاب مراتب کے دلوں کا حال مختلف ہوگا یعنی جن لوگوں نے اللہ کی رضا مندی میں ان مرتبوں کو حاصل کیا ان کے دل سکون سے ہوں گے، وہ آرام وچین سے ہنستے ہوئے چہرے لیکر اُٹھیں گے، اور جن لوگوں نے اللہ کی مرضی کے خلاف ان مرتبوں کو حاصل کیا وہ حیران و پریشان ہوں گے کہ ہمارا سب کیا اکارت گیا، آج کے دن جو کچھ کام آنے والا تھا وہ ہم سے نہ ہو سکا، (چنانچہ اگلی آیت سے اس جواب قسم کی تائید ہوتی ہے)

قُلُوۡبٌ يَّوۡمَئِذٍ وَّاجِفَةٌ ۝

کتنے دل اُس دن دھڑکتے ہیں

یعنی بے قراری اور گھبراہٹ کے سبب کتنے دل اُس دن دھڑکتے ہوں گے، اور یہ گھبراہٹ ایسی ہوگی جسے وہ تھام نہ سکیں گے، گھبراہٹ ان کے چہرے سے نمایاں ہوگی، اور چہرے پر ہوائیاں اُڑتی ہوں گی۔

اَبۡصَارُهَا خَاشِعَةٌ ۝

اُن کی آنکھیں جھک رہی ہیں

یعنی ان لوگوں کی آنکھیں تاریک اور حیران ہوں گی۔

اس جگہ ان لوگوں کے دل کا حال بیان نہیں فرمایا جو چین و آرام میں ہوں گے، اس لئے کہ یہاں

قیامت کے دن کے حال سے ڈرانا مقصود ہے، جب یہ معلوم ہوا کہ بہت سے دل اس دن دہشت سے بے چین و بے قرار ہوں گے تو اب ڈرنا چاہئے، ایسا نہ ہو کہ ہم بھی انہی لوگوں میں سے ہو جائیں، اپنے دلوں کے آرام وچین کا یقین نہیں کر لینا چاہئے، اس لئے کہ یہ بات یقینی نہیں اور شک کی بنیاد پر کوئی امید و توقع نہیں رکھنی چاہئے، خوف کے لئے شک بھی کافی ہے البتہ امید کے لئے ظن غالب ہونا ضروری ہے۔

"راجفہ" اور "رادفۃ" میں دوسرے اقوال

بعض مفسرین نے راجفہ کے لفظ سے زمین اور پہاڑ مراد لئے ہیں جیسا کہ دوسری آیت میں ہے "یوم ترجف الارض والجبال" اور "رادفہ" سے آسمان وستارے مراد لئے ہیں اس لئے کہ زلزلہ کے بعد زمین پھٹ کر منتشر ہو جائے گی۔

بعض کہتے ہیں "راجفہ" پہلے زلزلے کا نام ہے کہ اس کی وجہ سے زمین کانپے گی، اور "رادفۃ" سے مراد دوسرا زلزلہ ہے جس کی وجہ سے زمین کا ہر ہر جز ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔

سورہ کی ابتداء میں بیان کردہ صفات کے مصداق میں مفسرین کا اختلاف

سورت کے شروع میں جو پانچ صفات مذکور ہیں ان کے مصداق کی تعیین میں اختلاف ہے، کہ ان پانچ صفات کا مصداق کیا ہے؟ بعض نے ان سب کا مصداق ایک ہی چیز قرار دی ہے، بعض نے متعدد چیزیں مراد لی ہیں جن کے درمیان باہم مناسبت ہے، اور اُن کا آپس میں تعلق وربط ہے، اور بعض نے اس طرح کی مناسبت کا لحاظ نہیں کیا اور مختلف ومتفرق چیزیں مراد لی ہیں۔

اس کے علاوہ باقی جس سورۃ کی ابتداء بھی اسی طرح کی ہے جیسے سورۂ مرسلات اور سورۂ عادیات ہیں تو اُن میں بھی یہی اختلاف ہے۔

اب اقوال کو تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے۔

صوفیاء کا قول

حضرات صوفیا قدس اللہ اسرارھم فرماتے ہیں "والنزعت غرقًا" سے اہل سلوک کے دل مراد ہیں کہ ان کے نفوسِ امارہ جو خواہشات میں غرق ہو گئے ان کو زور سے کھینچتے ہیں۔

"نـاشطات" سے بھی ان کے دل مراد ہیں، جو درگاہِ الٰہی میں پہنچنے کے مشتاق ہیں، اس لئے کہ

عبادت کے موانع ان کے نفسوں سے دور ہو گئے ہیں، عبادت چاہے فرض ہو یا نفل وہ لوگ نہایت خوشی و سرور سے اپنے اوقات کو اس میں مشغول رکھتے ہیں۔

"سابحات" سے بھی دریائے مغفرت میں تیرنے والوں کے دل مراد ہیں، اس لئے کہ اس دریائے بے پایاں کے اندر خوض کرنا، غوطہ لگانا مجاہدے کا ثمرہ ہے، اسی مجاہدے کے نتیجے میں وہ ان مقامات واحوال تک پہنچتے ہیں۔

"سابقات" سے مراد وہ دل ہیں جو مراد کو پہنچ گئے ہیں، یعنی سلوک کی منزلوں کو طے کرنے کے بعد قرب ووصال کے انتہائی مرتبے تک پہنچ گئے، اور قرب ووصال کے میدانوں میں ایک دوسرے سے سبقت کرتے ہیں۔

"مدبرات امرا" سے مراد کامل ومکمل لوگوں کے دل ہیں جو مراد کو پہنچنے کے بعد درگاہِ الٰہی میں صفات الٰہی سے متصف ہو کر خالق کی جانب دعوت کے لئے مخلوق کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔

صوفیاء کے قول کے مطابق جوابِ قسم

اس صورت میں جوابِ قسم "یوم ترجف الرّجفة" سے پہلے مقدر ہے اور وہ یہ ہے "لترجعُنّ الی الله مرضیّین إن اتصفتم بهذه الصفات أو مطرودین إن اتصفتم باضدادها" یعنی تم اگر ان صفات سے متصف ہوئے تو اللہ کی طرف ہنسی خوشی پہنچو گے اور اگر اس کے خلاف ہوئے تو راندۂ درگاہ کئے جاؤ گے۔

علماءِ ظاہر کا قول

علماءِ ظاہر رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ ان مراتب سے مراد قوتِ علمیہ کا کامل کرنا ہے، چنانچہ "نازعاتِ غرقا" سے مبتدی طالب علم مراد ہیں جو مشکل معانی کو اپنی فکر کے زور سے متون، شرح اور حواشی کی عبارات سے کھینچ کر نکالتے ہیں۔

"ناشطات" سے متوسط حال کے طالب علم مراد ہیں جو سخت مطلب کو حل کرتے اور مشکل کو آسان کرتے ہیں (فرماتے ہیں کہ) "نشط" کا لفظ "نشط البعیر" سے لیا گیا ہے عرب میں یہ مثل مشہور ہے (غالبا کسی مشکل کو حل کر لینے کے وقت بولی جاتی ہے) یعنی اونٹ کے پاؤں کھول دیئے

گئے۔ (گویا ان کی مسلسل محنت کے نتیجے میں پہلے مرتبے کی مشکلیں ان کے لئے کھل گئی، حل ہو گئی ہیں)

"سابقات" سے بڑے بڑے فاضل اور باریک بین محقق مراد ہیں کہ ان کا ذہن مشکل اور باریک بات کی طرف سبقت کرتا ہے۔

"مدبراتِ امر" سے کتابیں تصنیف کرنے والے، قواعد بنانے والے اور (کسی فن کے) اصول وفروع مقرر کرنے والے مراد ہیں۔

علماءِ ظاہر کے قول کے مطابق جوابِ قسم

اس صورت میں بھی جوابِ قسم اسی جگہ مقدر ہوگا (تقدیری عبارت یہ ہوگی)

"**لتبعثنّ یوم ترجف الراجفة فیکشف لکم من حسن الاشیاء وقبحها و تعرفون الحق عن الباطل والهدی من الضلل**" یعنی ضرور تم اس دن اٹھائے جاؤ گے جس دن کانپنے والی کانپے گی پھر تمہارے لئے ہر چیز کی اچھائی اور برائی کھول دی جائے گی اور تم حق و باطل اور ہدایت و گمراہی کو پہچان لو گے۔

امام مجاہدؒ کا قول

مجاہدؒ فرماتے ہیں یہ صفات مجاہدین، ان کے گھوڑوں اور ہتھیاروں کی ہیں، چنانچہ "نازعاتِ غرقًا" سے مجاہدین کے ہاتھ مراد ہیں جو کمانوں کو زور سے کھینچتے ہیں۔

"ناشطات" سے بھی مجاہدین کے ہاتھ مراد ہیں جو تیروں کو کافروں کی طرف (بہت سہولت سے) پھینکتے ہیں (اس صورت میں "نشط" ماخوذ ہوگا) "**نشط الدلو إذا نزحه بسهولة**" سے یہ مثال عرب اس وقت بولتے ہیں جب ڈول آہستگی سے نکالتے ہیں۔

یا اس سے مجاہدین کا وہ گروہ مراد ہے جو خوشی اور اٹھکھیلی سے اور جذبۂ جہاد سے سرشار جھومتا ہوا میدان میں اترتا ہے۔

"سابحات" سے مجاہدین کے گھوڑے مراد ہیں جو دشمنوں کی صفوں میں تیرتے ہوئے جاتے ہیں۔

"سابقات" سے ہراول دستہ یا ان کے گھوڑے مراد ہیں۔

"مدبرات امر" سے بادشاہ، امیر اور وزیر مراد ہیں کہ جہاد کا عمل انہی کی حسنِ تدبیر سے انجام

پاتا ہے، اور لشکر کا کوچ، مقام، ٹھہرنا اور چلنا انہی کی تجویز سے ہوتا ہے۔

علم النجوم والوں کا قول

نجوم والے کہتے ہیں کہ اس سے ستارے مراد ہیں (گویا یہ ساری صفات ستاروں کی ہیں) اوّلاً ان کی حالت ایسی ہے گویا کمان سے تیر چھوڑے گئے ہیں اس لئے کہ پہلے فلک الافلاک کی حرکت کی وجہ سے تابع ہو کر حرکت کرتے ہیں (جیسے تیر و کمان کی حرکت بھی کسی کے تابع ہوتی ہے) اسی حالت کو ''نازعات غرقًا'' سے تعبیر کیا ہے۔

دوسرے نمبر پر وہ خاص اپنی حرکت سے ایک برج سے دوسرے برج کی طرف جاتے ہیں اس کو ''ناشطات'' سے تعبیر فرمایا ہے، انہوں نے ''نشط'' کو اس مثال سے نکالا ہے ''ثور ناشط'' یہ اس وقت بولتے ہیں جب بیل ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف بھاگ جائے۔

اور ''سابحات'' سے مراد ان کے مراکز کی حرکت ہے، کہ اس حرکت کے دوران وہ مچھلی کی طرح تیرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اور انہی حرکتوں کے دوران وہ آپس میں ایک دوسرے کے موافق و مخالف حرکت کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت کرتے ہیں (سابقات سے یہی مراد ہے)

اور اس حالت میں ان کی جو مختلف اوضاع ہیں الگ الگ ان کے اعتبار سے وہ عالم کی تدبیر کرتے ہیں، ہر ستارے کے متعلق جو کام ہے وہ اس میں دخل رکھتا ہے، وصال و جدائی، موسموں کی تبدیلی، اوقات کا پہچاننا اور دنیا میں ہونے والے یا آنے والے حادثات کا علم ستاروں سے ہی سمجھا جاتا ہے (فالمدبرات امرًا سے یہی مراد ہے) حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے بھی یہی قول منقول ہے۔

واعظین کا قول

وعظ کرنے والے کہتے ہیں یہ فرشتوں کی صفات ہیں یعنی فرشتے کافروں کی ارواح نکالتے ہیں تو نہایت سختی سے کھینچتے ہیں تو ان پر ''نازعات غرقًا'' صادق آتا ہے۔

اور مسلمانوں کی روحیں سہولت و آسانی سے نکالتے ہیں اس لحاظ سے وہ ''ناشطات'' ہیں۔

پھر روحوں کو قبض کر لینے کے بعد روحوں کو عالم برزخ کی سیر کراتے ہیں اس اعتبار سے وہ

"سابحات سبحا" ہیں۔

اور اُس جگہ آپس میں ایک دوسرے سے آگے ہوتے ہیں (اس اعتبار سے ان کی صفت "سابقات سبقًا" ذکر فرمائی)

اور پھر سوال و جواب اور عذاب قبر یا قبر کے اندر بہتری کی تدبیر کرتے ہیں (اس اعتبار سے وہ "مدبرات امر" ہیں)

اہلِ نجوم اور واعظین کے قول کے مطابق جوابِ قسم

ان دونوں صورتوں میں بھی جواب قسم اسی جگہ محذوف ہے (اور تقدیری عبارت یہ ہوگی) "لتبعثنّ بدليل انقلاب الحرب وانقلاب الحوادث بتدبير الكواكب و بشهادة الموت"

واعظین کی دوسری جماعت کا قول

ان میں سے بعض کہتے ہیں کہ "نازعات" اور "ناشطات" سے وہ فرشتے مراد ہیں جو مسلمانوں اور کافروں کی روحیں قبض کرتے ہیں اور "سابحات" اور "سابقات" وہ فرشتے ہیں جو رسالت اور (دیگر) امور کے جاری کرنے پر مقرر ہیں، اور "مدبرات امرا" سے بڑے مرتبے کے فرشتے مراد ہیں جیسے حضرت جبرئیل، حضرت میکائیل، حضرت اسرافیل اور حضرت عزرائیل علیہم السلام ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کو مع اپنے لشکر و سرداروں کے ان کے ذریعہ ہونے والے کاموں کی تدبیر کے لئے مقرر فرمایا گیا ہے۔

کون سے تکوینی اُمور کس فرشتے کے متعلق ہیں؟

جیسے حضرت جبرئیل علیہ السلام کے متعلق یہ امور ہیں، ہوا اور جنگوں کا انتظام اور رسولوں پر وحی اتارنا۔

حضرت میکائیل علیہ السلام کے متعلق یہ امور ہیں: بارش برسانا، زمین سے پیداوار اُگانا اور رزق پہنچانا۔

حضرت اسرافیل علیہ السلام کے متعلق یہ امور ہیں، صور پھونکنا، آدمیوں اور جانوروں میں روح ڈالنا، لوحِ محفوظ (کی نگرانی) اور رزق، عمر اور ہر چیز کا اندازہ کرنا (تقدیر)

حضرت عزرائیل علیہ السلام کے متعلق یہ امور ہیں، روحیں قبض کرنا، بیماریاں اور آفتیں (لانا)

بعض دیگر مفسرین کا قول

بعض کہتے ہیں کہ "نازعات" سے مجاہدین کی کمانیں مراد ہیں کہ تیروں کو کمانوں کے اندر کھینچتے ہیں۔

اور "ناشطات" سے اونٹ اور بیل مراد ہیں کہ وہ کنوؤں سے پانی نکالتے ہیں۔

"سابحات" سے کشتیاں مراد ہیں کہ دریا میں تیرتی ہیں۔

"مدبرات امرًا" سے عقل وحکمت والے مراد ہیں جو ہر مقدمے میں اپنی عقل کے زور سے تدبیر نکالتے ہیں اور ہر مشکل کام کے لئے حیلے بتاتے ہیں۔

ان صورتوں میں بھی جواب قسم وہی ہے جو پہلے مذکور ہوا۔ ان قسموں کا مقسم علیہ جو کہ قیامت کا دن ہے کے ساتھ مناسبت ظاہر ہے ادنیٰ تأمل سے معلوم ہو سکتی ہے۔

جب اس کلام سے یہ معلوم ہوا کہ کتنے ہی دل قیامت کے دن نہایت ہی بے چینی و بے قراری میں ہوں گے، آنکھیں تاریک اور پتھرا جائیں گی تو اس بات کا گمان ہوا کہ شاید کسی سننے والے کے دل میں یہ گذرے کہ اس نہایت ہی پُر خوف اور مہلک بات کو سن کر کافروں نے کیا کہا ہوگا، کیا اس یقینی آنے والے واقعہ کی دہشت سے کوئی (سدھرنے کی) فکر و تدبیر کرتے ہیں یا ابھی تک اسی طرح غافل و بے خبر پڑے ہیں؟ اس کے جواب میں ارشاد فرمایا:

يَقُوْلُوْنَ ءَ اِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِى الْحَافِرَةِ ○

لوگ کہتے ہیں کیا ہم پھر آئیں گے اُلٹے پاؤں

یعنی کافر کہتے ہیں کہ کیا ہم پھر اپنی پہلی حالت پر بنائے جائیں گے، یعنی مرنے کے بعد کیا ہم دوبارہ زندہ ہوں گے۔

"حافرہ" لغت میں راستہ کاٹنے کو کہتے ہیں، اس لئے کہ "حافر اور حافرۃ" بیل کے کھر کو کہتے ہیں، تو جس راستے پر وہ چلتا ہے اس پر اس کے کھروں کے نشان پڑ جاتے ہیں تو گویا کھر کا نام دیا، پھر جس راستے پر سم کے نشان بنتے ہیں اس کو بھی مجازاً حافر کہہ دیا گیا۔

غرض یہ ہے کہ کافر آخرت میں دوبارہ جینے کا انکار کرتے ہیں اس شبہ کی وجہ سے کہ اگر موت کے بعد زندگی ہوتی تو اسی پہلی حالت کی طرف رجوع لازم آتا اور حالتِ اولیٰ کی طرف رجوع خلاف واقعہ

ہے (خارج میں ایسا ہونا ثابت نہیں کہ کوئی بوڑھا دوبارہ جوان ہوا ہو) ورنہ (اول حالت کی طرف رجوع مان لینے کی صورت میں) سفسطہ لازم آئے یعنی بے فائدہ اور فضول کام، اور بوڑھے کا جوان ہونا، جوان کا لڑکا بن جانا اور لڑکے کا بچہ ہو جانا، اور بچے کا دوبارہ ماں کے پیٹ میں چلے جانا سب درست ہو (اس لئے کہ حالت اولیٰ یہی ہے اور جب ایسا نہیں تو موت کے بعد زندگی کا قول بھی درست نہیں، العیاذ باللہ)

پھر اسی شبہے کو مزید مضبوط و قوی کرنے کے لئے تعجب و انکار کے طور پر استفہام کرتے ہیں:

ءَ إِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً ۝

کیا جب ہم ہو چکیں ہڈیاں کھوکھری

یعنی کیا ہم پھر زندہ ہوں گے؟ جبکہ ہم کھوکھلی ہڈیاں ہو جائیں گے، ایسی ہڈیاں کہ ہوا کے گذرنے سے ان سے آواز نکلتی ہے۔

"نخر" ہوا کی اس آواز کو کہتے ہیں جو کسی خالی چیز کے اندر سے ہوا گذرنے سے پیدا ہوتی ہے۔

کافروں کے استدلال کی تقریر

اس استفہام سے ان کے شبہہ کو تقویت اس طرح ہوتی ہے کہ تجربہ یہ ہے کہ جب کسی مرکب چیز کی ترکیب بگڑ جائے اس کے اجزا جدا جدا ہو جائیں تو اگر اسی وقت بلا تاخیر اس چیز کو اس کی اصلی حالت پر لانا چاہیں تو ایسا ہو سکتا ہے اس لئے کہ ابھی اس کے اجزاء مکمل طور پر منتشر نہیں ہوئے ہوتے اور نہ ہی ان کے اندر کوئی نقص آیا ہوتا ہے لہٰذا ان کو اصلی حالت پر دوبارہ جوڑا جا سکتا ہے۔

لیکن جب ایک طویل زمانہ گذر جائے اور اس کے اجزاء مکمل طور پر متفرق و منتشر ہو جائیں اور اس کے بعض اجزاء میں نقص واقع ہو جائے بلکہ بعض مکمل طور پر خراب ہو جائیں تو اس وقت اس چیز کو سابقہ حالت پر لانا مشکل ہی نہیں محال ہو جاتا ہے، یہ بات اپنی بنائی ہوئی چیز میں بار بار ہم نے دیکھی اور تجربہ کیا ہے۔

لہٰذا مُردوں کے دوبارہ زندہ ہونے کا مسلمان جو دعویٰ کرتے ہیں یہ اگر موت کے فوراً بعد کے لئے ہوتا تو شاید درست ہو سکتا تھا لیکن وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ایسا بہت زمانے اور صدیاں گذرنے کے بعد

ہوگا جبکہ ہڈیاں گل سڑ چکی ہوں گی، اور رطوبت وتری جو زندگی کی شرط ہے وہ بالکل خشک ہو چکی ہوگی اب اس دعویٰ پر کس طرح یقین کیا جائے؟

مذکورہ شبہے کا جواب اور موت کے بعد پہلی حالت کی طرف لوٹنے کی نوعیت

اگر پہلی حالت کی طرف لوٹنا کافروں پر ظاہری دلائل سے ثابت کیا جائے تو ان کے استفہام کے جواب میں کہا جاسکتا ہے کہ مرنے کے بعد پہلی حالت کی طرف لوٹ آنے سے مراد بعینہٖ اسی حالت کا لوٹنا نہیں ہے، بلکہ مراد پہلی حالت کے مشابہ اور اس سے ملتی جلتی حالت ہے، جو تعاقبِ امثال کے طریقے پر حاصل ہوگی، (تعاقب امثال کا مطلب یہ ہے کہ ایک چیز کے بعد اس کی مثل آئے جو دیکھنے میں بالکل ویسی ہی ہو جیسے دن، دن کے مثل ہے، رات رات کی، نیند نیند کی، اور بیداری بیداری کی مثل ہے وغیرہ) اور تعاقبِ اَمثال میں کوئی تردد وانکار کی گنجائش نہیں ہے، اس لئے کہ دن رات میں پے در پے نیند و بیداری کا آنا، ہر رات چاند کا نئی شکل بدلنا، ہر مہینے آفتاب کا نئے برج میں داخل ہونے کی وجہ سے فصلوں کا بدلنا اور ہر سال گرمی وسردی کے موسم کا بدل کر آنا ہر شخص پر ظاہر ہے اس میں ہرگز شک و تأمل کی گنجائش نہیں ہے۔ (کہ دن رات کے بعد دن رات، چاند کے بعد چاند، فصل کے بعد فصل، گرمی کے بعد گرمی اور سردی کے بعد سردی، یہ سب مثل ہیں پہلے کی لہٰذا اسی طرح موت کے بعد کی زندگی موت سے پہلے کی زندگی کی مثل ہوگی) اور کسی چیز کو بگاڑ دینا پھر ایک مدتِ دراز کے بعد اس کو اسی طرح بنا ڈالنا کچھ تعجب خیز بات نہیں ہے، خصوصاً جبکہ بنانے والا کامل واکمل قدرت کا مالک ہو، تو اس کے لئے بگاڑ کر اسی وقت بنانا یا ہزاروں سال گذرنے کے بعد بنانا یکساں ہے۔

قَالُوْا تِلْكَ اِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ ۝

بولے تو یہ پھر آنا ہے ٹوٹے کا

یعنی پھر دوسری مرتبہ ہنسی اور تعجب سے کہتے ہیں کہ یہ دوسری مرتبہ کا جینا ہر ہر عضو کے جُدا ہونے اور تمام رطوبات کے خشک ہونے کے بعد تو بڑا خسارہ ہے اس لئے کہ (جب دوبارہ زندہ ہوں گے تو) ہم بہت سی اپنی چیزیں نہیں پائیں گے (جو موت سے پہلے ہماری تھیں) وہ ہم سے گم ہو چکی ہوں گی، اپنا کمایا ہوا مال واسباب ہم سے جُدا ہو چکا ہوگا، یہ دوسری مرتبہ ہمارا اس جہاں میں لوٹ کر آنا تو اس

مسافر کے لوٹنے کی طرح ہوا جو بہت سا مال و اسباب لے کر گھر سے صحیح سلامت سفر کو نکلا اور سب کچھ لٹوا بیٹھا، اب تنِ تنہا زخموں سے چور بدن لے کر بلکہ ہاتھ کٹوا کر گھر کو لوٹا تو یہ لوٹنا تو بہت نقصان کا لوٹنا ہے۔

اللہ تعالیٰ جل شانہ ان کے تعجب کے جواب میں فرماتے ہیں کہ تمہارا یہ تعجب اس سبب سے ہے کہ تم اللہ کے کام اور تاثیر کو اپنے کام و تاثیر پر قیاس کرتے ہو اور اس قادرِ مطلق کو اپنی طرح اسباب کا پابند سمجھتے ہو کہ (جس طرح تم سے) آلات و اسباب کے بغیر کوئی چیز نہیں ہو سکتی (اسی طرح وہ بھی ہے) یہ تمہارے فہم کی غلطی ہے اس لئے کہ مالک الملک کا فعل اور تاثیر کسی چیز پر موقوف نہیں کہ جب تک وہ موقوف علیہ چیز نہ پائی جائے تو کام نہ ہو سکے جب وہ چیز پائی جائے تو کام ہو ایسا نہیں بلکہ اس کے ''کُن'' کہنے سے سب کچھ ہو جاتا ہے، آلات و اسباب بھی اسی کے حکم سے سب جمع ہو جاتے ہیں۔ (یہی بات یوں ارشاد فرمائی ہے)

فَاِنَّمَا هِيَ زَجۡرَةٌ وَّاحِدَةٌ ۝

سو وہ تو صرف ایک جھڑکی ہے

یعنی یہ زندگی تو محض ایک جھڑکی ہے (کہ ایک جھڑکی سے زندگی وجود میں آجائے گی) جھڑکی (زجرۃ) سے مراد صور ثانی ہے اس کی صرف آواز سے ہی سب روحیں اپنے اپنے بدنوں کے اندر آجائیں گی اور سب اسباب و شرائط زندگی بھی خود جمع ہو جائیں گی، اور روح کے بدن کے اندر آتے ہی کامل زندگی حاصل ہو گی ویسی زندگی نہیں ہو گی جیسی بچے کو ماں کے پیٹ میں یا نو مولود بچے کو حاصل ہوتی ہے، کہ اس کی عقل اور تمام قوتیں نہایت ضعیف ہوتی ہیں بہت مشکل سے حرکت کرتا ہے۔ اس لئے کہ وہ سب صرف یہ زور کی آواز سنتے ہی جلدی سے حرکت کریں گے اور زمین کے نیچے ہلیں گے۔

فَاِذَا هُمۡ بِالسَّاهِرَةِ ۝

پھر تب ہی وہ آرہیں میدان میں

یعنی اس وقت سب آگئے برابر میدان میں۔ ''ساھرۃ'' لغت میں سفید اور ہموار زمین کو کہتے ہیں یہ حشر کے میدان کا نام ہے کہ اس دن اس زمین کی یہی حالت ہو گی۔

"السَّاهِرَةِ" کی دوسری تفسیر

یہ بھی احتمال ہے کہ اس جگہ ساھرۃ بیداری کے معنی میں ہو، "سھر" سے نکالا گیا ہو جس کا معنی بیداری ہے، کاذبہ اور خاطئہ کی طرح، اس احتمال پر آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ کافر جو مسلمانوں کو الزام دیتے ہیں کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کا وعدہ قیامت کے دن ہے اور مرنے سے لے کر قیامت تک ہزاروں سال کا فاصلہ ہے اس عرصے میں ہڈیاں گل سڑ جائیں گی، بدن کے سب اجزاء اور رطوبتیں نیست و نابود ہو جائیں گی تو دوسری مرتبہ کس طرح سابقہ شکل درست ہوگی حالانکہ زندگی اسی کا نام ہے۔

تو مسلمان کہتے ہیں کہ ان سب باتوں کے باوجود دوبارہ زندہ ہوں گے، اس لئے کہ دوسری زندگی کے لئے بدن کے اجزاء اصلیہ کا باقی رہنا شرط ہے سب چیزوں کا باقی رہنا ضروری نہیں ہے، اور اجزاء اصلیہ کو اللہ تعالیٰ اپنی قدرتِ کاملہ سے محفوظ رکھیں گے، مسلمانوں کے اس کہنے پر کافروں نے پھر کہا "تلک إذًا کرّۃ خاسِرَۃ" یعنی اس طرح زندہ ہونا کہ سب اجزاء باقی نہ رہیں یہ تو ناقص زندگی ہے، اس لئے کہ جب سب اجزاء زندہ نہ ہوں گے اور دوسری زندگی جو کہ اجزاء اصلیہ کے سبب پائی گئی وہ بھی ناقص ہی ہوگی جیسے پیٹ کے اندر بچے کی زندگی اور نومولود بچے کی زندگی ناقص ہوتی ہے، حالانکہ تم یہ دعویٰ کرتے ہو کہ وہ زندگی اس دنیا کی زندگی کے مقابلے میں بہت زیادہ طاقت و قوت والی اور کامل ہوگی، لہٰذا تمہارے، مذہب اور دعویٰ کے خلاف بات ثابت ہوئی۔

تو حق تعالیٰ شانہٗ نے کافروں کے جواب میں فرمایا "فَإِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَاحِدَةٌ ۝ فَإِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ" یعنی دوسری مرتبہ کا جینا تو محض ایک چنگھاڑ کا اثر ہے پس اسی وقت سب بیداری یعنی کچھ غفلت اور کچھ ہوشیاری میں آجائیں گے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ زندگی کا کمال قوتِ روحانیہ کے کامل ہونے پر ہے، اور زندگی کا نقص قوتِ روحانیہ کے نقص میں ہے، بدن کے اجزاء کی کمی زیادتی پر نہیں ہے، اور پیٹ کے بچے اور نومولود بچے کی زندگی کے ناقص ہونے کی وجہ اس کی قوتِ روحانیہ کا نقص ہے کہ وہ ابھی اپنے کمال کو نہیں پہنچی بلکہ رفتہ رفتہ ترقی کر رہی ہے، بخلاف مُردوں کی ارواح کے کہ وہ سب اپنے کمال کو پہنچ کر اس جہان سے

مر گئے، اور مرنے کے بعد ان کی روحوں کا ان کے بدنوں سے جُدا ہونا ان کی کامل قوت روحانیہ کے نقصان کا باعث نہیں ہوا کہ یہ کہا جائے کہ جینے کے وقت ناقص اُٹھیں گے، بلکہ مرنے کے بعد دوبارہ ظاہری بدن سے تعلق بالکل منقطع ہو جاتا ہے، حس و حرکت اور سمجھ بوجھ، نیند کی حالت ختم ہو جاتی ہے، لیکن ایک سخت آواز پر روح کا تعلق جیسا تھا ویسا ہی بحال ہو جاتا ہے اور اس وقت اس کی قوت روحانیہ میں کچھ نقص و کمی نہیں ہوتی کہ جس کو کامل کرنے کی حاجت ہو، جیسا کہ چھوٹے بچے کو کمال حاصل کرنے کے لئے بالغ ہونے کا انتظار کرنا پڑتا ہے اور وہ رفتہ رفتہ کمال تک پہنچتا ہے۔

"السَّاهِرَة" کی تیسری تفسیر

اور یہ بھی احتمال ہو سکتا ہے کہ ساہرہ کا لفظ اسم فاعل ہے، سہر سے نکلا ہے، بے خوابی کے معنی ہیں، (اور ساہرہ سے پہلے اس کا موصوف الأبدان محذوف ہے اور تقدیری عبارت یوں ہوگی) "فاذا هم متلبسون بالأبدان الساهرة" یعنی پھر یکایک ان کی روحیں ان کے جاگے ہوئے ابدان کے اندر آ جائیں گی، (الساهرة کو الأبدان کی صفت اس لئے قرار دیا یعنی جاگے ہوئے بدن اس لئے کہنا درست ہے) کہ صور پھونکے جانے سے قبل نفوسِ سماویہ قویۃ الإدراک کے ساتھ تعلق کی وجہ سے اور ان کے اندر ان کے قویٰ کے آ جانے کی وجہ سے (یہ ابدان) زندگی قبول کرنے کے لئے تیار و مستعد ہو چکے تھے کہ نیند کے بھی قابل نہ رہے اسی وجہ سے وہاں کی زندگی دنیا کی زندگی کے مقابلے میں کامل ہے اس لئے کہ دنیا کی زندگی تھوڑی بہت موت سے بھی میلان رکھتی ہے (اس طرح کہ نیند کو قبول کرتی ہے) اور نیند موت کی طرح ہی ہے، جبکہ وہاں کی زندگی میں نیند بھی نہیں ہے، موت اور موت سے مشابہ چیز سے وہ زندگی اس قدر دور ہے، چنانچہ جنتیوں کو جنت میں اور دوزخیوں کو دوزخ میں نیند نہیں آئے گی، جیسے فرشتوں اور نفوسِ سماویہ کو نیند نہیں آتی ہے۔

کافروں کی بے جا ضد پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تسلی

جب کفار باوجود ایسے واضح بیان اور مثالوں کے مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کا یقین نہیں کرتے اور اپنی ہی ضد پر قائم ہیں اور کہتے ہیں کہ ان دلیلوں اور تمثیلوں سے ہماری تسلی خاطر نہیں ہوتی اس لئے کہ ایسی سوکھی بلکہ گلی سڑی ہڈیاں جن کے اندر زندگی قبول کرنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے وہ ایک مدت دراز

گذرنے کے بعد سب ایک ہی دن زندہ ہو جائیں ہرگز ہماری عقل میں نہیں آتا، جب تک ہم اپنی آنکھ سے اس طرح کی کوئی چیز نہ دیکھ لیں اور ہم ایک مرتبہ اپنی آنکھ سے کسی مردے کو زندہ ہوتے نہ دیکھ لیں۔

مسلمان ان کی ان باتوں سے عاجز و رنجیدہ ہو کر اپنے دلوں میں کہتے تھے کیا اچھی بات ہوتی اگر حق تعالٰی کسی ایسے مردے کو جس پر ہزار ہا سال گذرے ہوں ان کے سامنے زندہ کر دیتے تو ان کا سارا انکار ٹوٹ جاتا اور فوراً ان پر الزام دھرا جا سکتا تھا۔

اس لئے حق تعالٰی شانہٗ (بطور تسلی) ہر مسلمان کو خطاب کر کے استفہام کے انداز میں فرماتے ہیں:

هَلْ اَتٰكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ○

کیا پہنچی ہے تجھ کو بات موسٰی کی

کیا تجھ کو موسٰی علیہ السلام کی یعنی قصے کی خبر پہنچی ہے جو فرعون کے ساتھ پیش آیا تھا؟ وہ بڑا سرکش بادشاہ تھا ہزار ہا آدمی اسکے دربار میں حاضر رہتے تھے، ہوا یہ تھا کہ حضرت موسٰی علیہ السلام نے بارہا اس کے سامنے اپنی لاٹھی کو زمین پر ڈالا اور زمین پر گرتے ہی وہ ایک اژدھا بن جاتا تھا، منہ پسارتا اور سخت آواز نکالتا تھا۔

یہ زندگی ایسی لکڑی کے اندر پیدا ہوئی تھی جو خشک تھی اور اس کے اندر زندگی کی کوئی صلاحیت ولیاقت نہیں تھی، لیکن ایک بے جان لکڑی کے اندر ایسی کامل زندگی دیکھنے کے بعد بھی فرعون یومِ جزاء کا قائل نہیں ہوا اور نہ ہی مالک ارض وسماء کی قدرتِ کاملہ کا اعتقاد کیا، لہٰذا یہ کافر بھی اگر کسی مردہ کو زندہ ہوتے دیکھ لیں تو انکار سے باز اور سیدھی راہ پر نہیں آئیں گے بلکہ اور زیادہ عذاب کے مستحق ہو جائیں گے، اس لئے کہ عادتِ الٰہی یوں ہی جاری ہے کہ اگر معجزے کے دیکھنے کے بعد بھی کافر ایمان نہ لائیں بلکہ اسی کفر وانکار پر مصر رہیں تو فوراً اللہ کے عذاب میں گرفتار ہو جائیں اور لحہ بھر ان کو فرصت نہ دی جائے۔

اِذْ نَادٰىهُ رَبُّهٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ○

جب پکارا اُس کو اُس کے رب نے پاک میدان میں جس کا نام طوٰی ہے

حضرت موسٰی علیہ السلام کا قصہ

سورۂ طٰہٰ، سورۂ قصص اور دیگر سورتوں کے مطابق اس قصے کی ابتداء اس طرح ہے کہ جب حضرت

موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ سے مصر میں جو کہ آپ کی جائے پیدائش و جائے سکونت تھی غلطی سے ایک قبطی قتل ہو گیا تو فرعون آپ کے قتل کے درپے ہوا آپ بھاگ کر شہر مدین چلے گئے، اس شہر میں حضرت شعیب علیہ السلام قیام پذیر تھے، ان کا قصہ بھی قرآن میں کئی جگہ بیان ہوا ہے، وہاں جا کر حضرت شعیب علیہ السلام کی خدمت میں مشغول ہو گئے، حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی بیٹی ان کے نکاح میں دے دی، جب آٹھ برس یا دس برس علی حسب اختلاف الاقوال پورے ہوئے تو حضرت شعیب علیہ السلام سے رخصت کی اجازت چاہی کہ اگر اجازت ہو تو اپنے وطن جاؤں، اور اپنے گھر والوں کو بھی ساتھ لیتا جاؤں، تاکہ اپنی ماں کی زیارت کروں، اور اپنے بڑے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کے ساتھ ملاقات کروں، اس لئے کہ اس طویل عرصہ میں فرعون اور اس کے لوگ قبطی کا خون بھول گئے ہوں گے، حضرت شعیب علیہ السلام نے راضی ہو کر آپ کو بیوی سمیت رخصت کیا، ساتھ دو غلام بھی کر دیئے کہ مصر پہنچا کر واپس آئیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی بیوی کو ساتھ لے کر روانہ ہوئے، چونکہ آپ کے مزاج میں غیرت بہت تھی اس لئے بیوی کو لے کر قافلے کے ساتھ چلنا گوارا نہ فرمایا کہ شاید سواری پر چڑھتے یا اترتے، نکلتے یا بیٹھتے کسی غیر محرم کی نظر پڑ جائے، اس لئے تنہا وہاں سے بیوی کو لے کر روانہ ہوئے، اور "شام" کے درّے کو چھوڑ کر دریا کے کنارے سفر اختیار کیا، اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ایسا نہ ہو کہ فرعون کا ماتحت کوئی حاکم پہچان کر قتل کے مقدمہ میں گرفتار کر لے، یا کچھ ایذاء پہنچائے، آپ کے ساتھ ایک خچر تھا اس پر اپنا سامان لاد کر ایک غلام کے حوالے کیا اور کچھ بکریاں تھیں ان کو ہانک کر لے چلنے پر دوسرے غلام کو مقرر کیا اور خود اپنی بیوی کی سواری کے ساتھ ہو لئے، چلتے چلتے ایک دن راستہ بھول گئے اور کوہ طور کی طرف جا نکلے، بہت راستہ تلاش کیا مگر درست سمت نہ مل سکی، بالآخر اسی طرح شام ہو گئی، پھر رات ہو گئی، یہ جمعہ کی رات تھی، ذیقعدہ کی اٹھارہ تاریخ اور سردی کا موسم تھا، اتفاق سے بکریاں جنگل میں اِدھر اُدھر پھیل گئیں، دونوں غلام ان کے جمع کرنے میں مشغول ہو گئے، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی بیوی کے پاس بیٹھ گئے، سفر کی مشقت اور سواری کی حرکت کی وجہ سے اچانک آپ کی بیوی کو دردِ زہ شروع ہوا، مدت حمل بھی پوری ہو چکی تھی، تب انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اپنا حال ظاہر کیا اور کہا کہ اگر کہیں سے آگ کا بندوبست ہو جاتا تو آگ تاپتے اور روشنی بھی ہوتی، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے

غلاموں سے کہا دیکھو جنگل میں کہیں آگ کا کوئی نشان نظر آتا ہے، غلام چاروں طرف دوڑ کر گئے اور کہیں آگ یا آبادی کا کوئی نام ونشان نظر نہ پایا، تب حضرت موسیٰ علیہ السلام آگ کی تلاش میں خود چل نکلے، آپ کے دائیں ہاتھ کی طرف ایک پہاڑ تھا، اس پر دور سے آپ نے کچھ روشنی دیکھی، آپ نے غلاموں اور بیوی سے کہا کہ تم لوگ یہیں ٹھہرو مجھے پہاڑ پر روشنی نظر آئی ہے وہاں سے آگ لے آؤں اور جو کوئی وہاں پر موجود ہوگا اس سے راستہ بھی معلوم کرکے آؤں گا تاکہ منزل تک ہم پہنچ سکیں۔

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اس جگہ کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ وہ آگ نہیں بلکہ قدرتِ الٰہی کی تجلی ہے جو دور سے آگ معلوم ہو رہی تھی، حقیقت میں وہ ایک بہت بڑا نور ہے جس نے عَوْسَج کے درخت کو گھیر رکھا ہے، عوسج ایک درخت ہے جو ''عناب'' کے درخت کی طرح ہوتا ہے اور ملک شام کے پہاڑوں پر بکثرت پایا جاتا ہے، وہ درخت جڑ سے چوٹی تک تروتازہ ہو رہا ہے، اور اس کی روشنی کی اتنی تیز چمک تھی کہ نگاہیں اس پر ٹھہر نہیں سکتی تھیں اور اس کے اردگرد فرشتوں کی تسبیح کی گونج تھی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ سب کچھ دیکھنے کے باوجود میدان سے گھاس پھوس جمع کیا اور ایک پولا بنا کر ارادہ کیا کہ اس نور آتشیں رنگ سے سُلگا لیں لیکن جوں ہی اس کے قریب ہوئے وہ آگ ان کی طرف اس طرح لپکی گویا ان کو جلا ڈالے گی، آپ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئے، آگ بھی واپس ہوگئی، موسیٰ علیہ السلام نے پھر اسی طرح کیا آگ بھی اسی طرح ان کی طرف لپکی موسیٰ علیہ السلام پھر پیچھے ہٹ گئے، اس طرح کئی بار ہوا، بالآخر موسیٰ علیہ السلام یہ ماجرا دیکھ کر حیران وششدر کھڑے ہوگئے، اور کارخانۂ الٰہی کے اس عجوبے کا تماشا دیکھنے لگے، پھر اچانک اس آگ سے ایک بہت بڑا نور بلند ہوا اور اس نے زمین وآسمان کے درمیان سب کچھ روشن کردیا، اس نور کی چمک اتنی تیز تھی کہ موسیٰ علیہ السلام کی آنکھیں چندھیا گئیں، آنکھوں سے ان کو کچھ نظر نہیں آرہا تھا، انہوں نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے، اس کے ساتھ فرشتوں کی تسبیح کی آواز بلند ہوئی، اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس آگ سے ایک آواز سنی، وہ یہ تھی '' یاموسیٰ انی انا ربک فاخلع نعلیک'' اے موسیٰ میں تیرا رب ہوں، اور یہ آگ کی طرح کی روشنی میری تجلی ہے، اپنے جوتے اتاردو، اس لئے کہ یہ جگہ تجلی الٰہی اور فرشتوں کے حاضر ہونے کی وجہ سے جو کہ اس تجلی کے خادم ہیں کعبہ اور مسجد الحرام کے حکم میں ہوگئی ہے۔

پھر سلسلۂ کلام شروع ہوا، موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟ عرض کیا لاٹھی ہے

جو میں اپنے ہاتھ میں رکھتا ہوں، حکم ہوا اس کو زمین پر ڈال دو، انہوں نے زمین پر ڈال دی، زمین پر گرتے ہی وہ لاٹھی اژدھا بن گئی جو زمین پر دوڑنے لگا، موسیٰ یہ دیکھ کر ڈر کر بھاگے، ارشاد ہوا بھاگو مت، اس اژدھے کو پکڑو یہ دوبارہ تمہارے ہاتھ میں لاٹھی بن جائے گی، (چنانچہ ایسا ہی ہوا) پھر حکم ہوا اپنے ہاتھ کو بغل میں رکھو، اور پھر نکالو، انہوں نے ایسے ہی کیا تو ان کا ہاتھ آفتاب کی طرح روشن ہوگیا، کہ آنکھ اس کی روشنی میں پڑ نہیں سکتی تھی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ آواز سنتے ہی مجھے یقین ہوگیا تھا کہ یہ حق تعالیٰ کی آواز ہے، اس لئے کہ ہر طرف (اطراف ستہ میں) سے میں نے یہ آواز سنی، اور میرے ہر ہر عضو نے یہ آواز سنی۔

حاصل کلام یہ ہے کہ یہ کرشمۂ قدرت دکھا کر اور توحید کی حقیقت، عبادت کے آداب، قیامت کے آنے اور دیگر رسالت کے لئے ضروری امور کی تعلیم دیکر حکم ہوا:

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ○

جا فرعون کے پاس اُس نے سر اُٹھایا

یعنی جایئے فرعون کی طرف، تا کہ اس کی بہتری کی تدبیر کرسکیں، اور اس وقت آپ کو سابقین و مقربین کا جو مرتبہ حاصل ہوا اس سے آگے بڑھ کر "مدبرات امراً" کے مرتبے کو پہنچیں۔

اور آپ کو فرعون کی اصلاح کی تدبیر کرنے کے لئے اس لئے بھیج رہے ہیں کہ "وہ حد سے بڑھ گیا ہے" یہاں تک کہ اس نے خدائی کا دعویٰ کر دیا ہے، اور جب فرعون کے پاس پہنچیں تو:

فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى ○

پھر کہہ تیرا جی چاہتا ہے تو سنور جائے

یعنی اس سے صرف یہ کہیئے کہ کیا تجھے نفس کی برائیوں سے پاک ہونے کی رغبت ہے؟ کہ وہی تیری سرکشی اور خرابی کا سبب ہیں، اور میں تجھے صرف تیری برائیاں کھود کر ہی نہ بتاؤں گا کہ اتنی بات تو سارے ہی سعادت مند اور حکمتِ الٰہی کے واقفوں سے ہوسکتی ہے بلکہ میں تجھ کو بڑے مرتبے تک پہنچاؤں گا، اور تجھے ولی کامل اور عارف واصل کر دوں گا۔

وَ اَهۡدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخۡشٰى ۝

اور راہ بتلاؤں تجھ کو تیرے رب کی طرف پھر تجھ کو ڈر ہو

یعنی تجھ کو تیرے رب کا راستہ دکھاؤں گا، تا کہ تو اپنے پروردگار کی ذات، صفات اور افعال کو یقین کی آنکھ سے پہچان لے، تا کہ پھر تیرے اندر ایسی خشیت پیدا ہو کہ تیرا نفس مرجائے، اور تجھے ایسی پوری فنا حاصل ہو کہ پھر کبھی نفس کی سرکشی کے مرض کا خوف نہ رہے، اس لئے کہ "الفانی لا یرد" فنا ہوئی چیز واپس نہیں آتی۔

القصہ موسیٰ علیہ السلام فرعون تک پہنچے، اللہ تعالیٰ کا حکم اس کو پہنچایا، فرعون نے اس کے جواب میں پہلے یہ کہا کہ کیا تو وہی شخص نہیں جس کو بچپن سے میں نے پالا پرورش کیا اور مدتوں تک ہمارے پاس رہا، پھر تُو وہ کام کر کے یہاں سے چلا گیا جس کو تُو بخوبی جانتا ہے یعنی قبطی کو مار ڈالا، اس طرح تُو نے ہماری نعمتوں کی ناشکری کی، اب تمہیں یہ مرتبہ کہاں سے حاصل ہو گیا کہ میرا ہادی و مرشد بن کر آ گیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کے جواب میں کہا سچ ہے میں وہی ہوں اور جو کام مجھ سے ہوا تھا نادانی میں ہوا تھا پھر جب میں تیرے ڈر سے بھاگا تو اللہ تعالیٰ نے مجھ پر عنایت فرمائی اور مجھے علم و حکمت، اور ہدایت وراہنمائی کا مرتبہ عطا فرمایا اور اپنا پیغمبر و رسول بنا کر تیرے پاس بھیج دیا، فرعون نے کہا کہ اب تو تُو نے رسالت کا دعویٰ کر دیا کہ تُو اللہ کا بھیجا ہوا ہے اگر تُو اپنے دعوے میں سچا ہے تو اس پر کوئی دلیل پیش کر۔

فَاَرٰىهُ الۡاٰيَةَ الۡكُبۡرٰى ۝

پھر دکھلائی اُس کو وہ بڑی نشانی

یعنی تب موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو بڑی نشانی دکھائی۔

دو نشانیوں کو ایک نشانی قرار دینے کی وجہ

اگر چہ موسیٰ علیہ السلام کے پاس دو نشانیاں تھیں ایک عصا جو اژدھا بن جاتا تھا، دوسرا یدِ بیضا لیکن چونکہ ایک ہی مجلس میں ایک ہی مطلب کو ثابت کرنے کے لئے تھیں اس لئے دونوں کو ایک نشانی اعتبار کیا، اور ایک دوسری وجہ بھی ہے، وہ یہ کہ یدِ بیضا، عصا ڈالنے کے تابع تھا، یعنی پہلے عصا زمین پر ڈالتے

تھے وہ اژدھا ہو جاتا تھا تب ہاتھ بغل میں ڈالنے سے آفتاب کی طرح چمکنے لگتا تھا، تو گویا اصل نشانی عصا ہی تھا۔

اور نکتہ اس میں (عصا کے اصل اور یدِ بیضا کے تابع ہونے) یہ ہے کہ انبیاء و رسل جب بھیجے جاتے ہیں تو وہ پہلے مخالفین و منکرین کی طرف قہر و غضب کے ساتھ توجہ کرتے ہیں اس کے بعد طالبین و مسترشدین کی طرف ہدایت و راہنمائی کی توجہ فرماتے ہیں۔ سو عصاء قہر کی شکل تھا اور یدِ بیضاء ہدایت و راہنمائی کا نمونہ، اور نیز عصا میں حیاتِ غیبیہ خوفناک اور ڈراونی شکل میں ظاہر ہوتی تھی اور یدِ بیضا میں نورِ غیبی اعلیٰ درجے کی روشنی و چمک کے ساتھ جلوہ گر ہوتا تھا۔ اور قہر و سیاست ظاہرِ نبوت کے ساتھ متعلق ہے اور نور، باطنِ نبوت کے ساتھ متعلق ہے کہ یہ ولایت کا مرتبہ ہے اور فرعون جو کہ ازلی کافر تھا (ولایت اس کے نصیب میں کہاں) اس پر حجت لازم کرنا اور خوف دلانا مقصود تھا تو اس کے حق میں اصالۃً آیتِ کبریٰ عصا ہی تھا نہ کہ یدِ بیضاء

عصاء موسیٰ کے ہزار معجزات

عصاء میں دوسرے معجزے بھی تھے ایک یہ کہ پانی کھینچتے وقت کنویں کی گہرائی کی مقدار کے مطابق عصاء لمبا ہو جاتا تھا اس کی دم میں بندھی ہوئی رسی سے ڈول بندھ جاتا تھا، دوسرے تاریکی میں اس سے روشنی کی دو شاخیں ظاہر ہوتی تھیں، تیسرے یہ کہ جب موسیٰ علیہ السلام سو جاتے تو وہ کھڑا ہو انگرانی و پہرہ دیتا تھا، بکریوں کے پاس چھوڑ آتے تو درندوں وغیرہ کو نہیں آنے دیتا تھا، یہاں تک کہ بعض نے کہا ہے کہ عصاء میں ایک ہزار معجزے تھے۔

دو عمدہ معجزے کلام اللہ میں بھی بیان ہوئے ہیں ایک اس کی ضرب سے دریا کا پھٹنا، دوسرے اس کی ضرب سے پتھر سے چشموں کا پھوٹ پڑنا تو آیتِ کبریٰ وہی عصا ہوا نہ کہ یدِ بیضاء۔

عصا اور ید بیضا کے درمیان موازنہ

بعض نے کہا ہے کہ یدِ بیضا افضل تھا اس لئے کہ یہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کی ولایت کے کمال کی صورت تھی، اور نبی کی ولایت اس کی نبوت سے افضل ہوتی ہے، دوسری وجہ یہ ہے کہ فرعون کے جادوگر عصا کی نقل اتار گئے لیکن یدِ بیضا کی نقل نہ اتار سکے۔

حق بات یہ ہے کہ یہ دونوں ہی معجزے بڑے تھے اور آیتِ کبریٰ میں داخل ہیں، دونوں ایک ہی

نشانی کا حکم رکھتے ہیں اور موسیٰ علیہ السلام کو جو معجزے عطا کئے گئے تھے ان سب میں یہ افضل ہیں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ یہ دو معجزے ایسے تھے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دعویٰ کو ثابت کرنے کے لئے دو عادل گواہ تھے، اس لئے کہ لکڑی کے اندر ان کے ہاتھ سے زندگی آ جانا جو کہ ایسا جسم ہے جو ہرگز زندگی کی لیاقت وصلاحیت نہیں رکھتا اس بات کی صریح دلیل تھی کہ ان کے ذریعے سے مردہ دلوں کا زندہ ہونا بطریق اولیٰ ہوگا، اور نفس کو برائیوں اور خباثتوں سے پاک وصاف کر دینا ان کے لئے آسان کام ہوگا۔

اور ان کے ہاتھ پر نورِ الٰہی کا چمکنا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ان کے ہاتھ سے راہِ خدا کے سالکین کو تجلیاتِ الٰہی کے انوار تک پہنچا دینا بخوبی ہو سکے گا، لیکن فرعون یہ سب دیکھنے کے باوجود فرمانبردار نہ ہوا بلکہ تکذیب وانکار پر اُتر آیا چنانچہ فرمایا:

فَكَذَّبَ وَعَصٰى ○

پھر جھٹلایا اُس نے اور نہ مانا

یعنی موسیٰ علیہ السلام کی رسالت کا انکار کیا، اور حق تعالیٰ کا جو پیغام حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبانی اس کو پہنچا تھا اس نے اس کو نہیں مانا، اور اتنی ہی نافرمانی پر اس نے اکتفا نہیں کیا بلکہ:

ثُمَّ اَدْبَرَ يَسْعٰى ○

پھر چلا پیٹھ پھیر کر تلاش کرتا ہوا

یعنی پھر موسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کی تدبیر کرنے کی کوشش کرنے کے لئے پیٹھ پھیر کر چل دیا، جب دیکھا کہ ان دونوں معجزوں کے دیکھنے سے حاضرینِ مجلس کے دلوں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سچائی آ جائے گی تو:

فَحَشَرَ قف فَنَادٰى ○

پھر سب کو جمع کیا پھر پکارا

یعنی اس نے موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے کے لئے جادوگروں کو جمع کیا اور ملک کے لوگوں کو بھی یہ

مقابلہ دکھانے کے لئے جمع کیا اس سے وہ یہ باور کرانا چاہتا تھا کہ یہ کام (معجزے کا ظہور) انسانی حیلے اور تدبیر سے بھی ہوسکتا ہے، اللہ تعالیٰ کا کیا ہوا نہیں ہے۔ پھر مقابلے سے پہلے اس نے لوگوں کو پکارا (کہ میں تمہارا سب سے اعلیٰ رب ہوں،) تا کہ اگر جادوگر موسیٰ علیہ السلام سے مقابلہ میں ہار بھی جائیں تو موسیٰ علیہ السلام کا مطالبہ پورا نہ ہوسکے اس مقصد کے لئے حیلہ یہ اختیار کیا کہ (اپنے لئے ربوبیت علیا کا دعویٰ کر دیا اور) موسیٰ علیہ السلام جس ذات کا رسول ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں وہ ربوبیت میں مجھ سے کمتر ہے اور اعلیٰ کے ہوتے ہوئے ادنیٰ کی تابعداری اختیار کرنا خلاف عقل ہے۔

فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ۝

تو کہا میں ہوں رب تمہارا سب سے اوپر

فرعون کا منطقی طرزِ استدلال

یعنی بالفرض اگر کوئی دوسرا رب میرے علاوہ جہان میں موجود ہو بھی جیسے وہ رب جس نے موسیٰؑ کو رسول بنا کر میرے پاس بھیجا ہے تو وہ مرتبے میں مجھ سے کمتر ہوگا، لہٰذا موسیٰؑ اگر اپنی رسالت ثابت بھی کر لے تو وہ اتباع کے قابل نہیں اس کی تابعداری نہیں کرنی چاہئے۔

اور جس طرح سورۂ زخرف وغیرہ میں مذکور ہے، وہ اپنی ربوبیت باطلہ کو رب العالمین کی ربوبیت پر اس طرح فوقیت دیتا تھا کہ وہ کہتا تھا اگر حق تعالیٰ کی ربوبیت مان لی جائے تو وہ عام ہے سب مخلوقات پر، میری ربوبیت خاص ہے مصر والوں پر اور خاطرداری اور خدمت گذاری کے اعتبار سے خاص مقدم ہوتا ہے عام پر (لہٰذا پھر بھی میں مقدم ہی ہوں)

دوسرے یہ بھی اس کی دلیل تھی کہ حق تعالیٰ کی ربوبیت آنکھ سے غائب ہے جو عقل میں نہیں آتی اور میری ربوبیت ظاہر ہے کہ تم سب دیکھتے ہو، (لہٰذا میں اعلیٰ ہوا)

تیسرے یہ بھی کہ موسیٰ علیہ السلام جو حق تعالیٰ کا ایلچی ہے وہ میرے ایلچیوں کی طرح طمطراق نہیں رکھتا، نہ ہاتھوں میں سونے کے کنگن ہیں، نہ خزانہ ہے، نہ لاؤ لشکر (پروٹوکول) ساتھ ہے، تو اس کی سفارت وایلچی گری میں نقص وکمی ہے، اور ایلچی کے نقص سے بادشاہ کا نقص بھی صاف سمجھا جاتا ہے، (تو معلوم ہوا کہ میں اعلیٰ ہوں، العیاذ باللہ)

موسیٰؑ حق میں اور فرعون باطل میں درجۂ کمال کو پہنچے ہوئے تھے

حاصل کلام یہ ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام کے آنے سے پہلے فرعون اگرچہ گمراہی میں مرتبۂ سابقات کو پہنچا ہوا تھا مگر ان تدبیروں اور حیلہ سازیوں سے بچا ہوا تھا، لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کے آنے کے بعد ان کو جھٹلانے کی تدبیروں میں پڑا تو ضلالت وگمراہی کے مرتبۂ "مدبرات امراً" تک پہنچ گیا (ان مراتب کی مکمل تشریح سورت کے شروع میں گذر چکی ہے)

یہ دونوں شخص ہدایت وگمراہی کے مرتبۂ کمال کو پہنچے، یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام ہدایت کے کمال کو پہنچے ہوئے تھے اور فرعون گمراہی کی انتہا کو پہنچا تھا، لیکن حق تعالیٰ کا فضل وعنایت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تدبیر کو شامل حال ہو کر ان کو اعلیٰ درجے تک پہنچایا، فرعون ملعون دنیا وآخرت میں ناکام ہوا۔

فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى ○

پھر پکڑا اُس کو اللہ نے سزا میں آخرت کی اور دنیا کی

یعنی دنیا میں اس کو پانی میں ڈبو کر رسوا کیا اور آخرت میں اس کو دوزخ میں ڈالے گا، جیسے دوسری جگہ فرمایا "اغرقوا فادخلوا ناراً"

آیت میں عذابِ آخرت کو مقدم کرنے کی وجہ

اگرچہ دنیا کا عذاب آخرت کے عذاب پر مقدم ہے لیکن یہاں اس کو مقدم کیا ہے دنیا کے عذاب پر اس لئے کہ وہ مقصودِ اصلی ہے، اور دنیا کا عذاب اس تک پہنچنے کا وسیلہ ہے، اور یہ وجہ بھی ہے کہ آخرت کا عذاب دائمی ہے اور دنیا کے عذاب کے مقابلے میں ہزار درجے سخت ہے اس لئے اس کو پہلے ذکر کرنا اولیٰ ہے۔

اور اگرچہ دنیا دارالجزاء نہیں ہے لیکن ایسے فرعونوں اور شریروں کو دوسروں کی عبرت کے لئے دنیا میں بھی الزامِ حجت کے بعد ان کے برے اعمال کی پاداش میں سزا دی جاتی ہے، چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ○

بیشک اس میں سوچنے کی جگہ ہے جس کے دل میں ڈر ہے

یعنی اس میں عبرت ہے اس شخص کے لئے جو حق تعالیٰ سے ڈرتا ہے۔

فرعون کے واقعے میں عبرت کی وجوہات

کئی وجہوں سے اس میں عبرت ہے، پہلی وجہ یہ ہے کہ گمراہی کے پیشواؤں کی تدبیر زیادہ دیر نہیں چل سکتی، ایک نہ ایک دن سب کیا کرایا برباد ہو جاتا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ اپنی صفتِ حلیمی کی وجہ سے اگرچہ گمراہوں کو ڈھیل دیتا ہے مگر بالکل مہمل نہیں چھوڑ دیتا بلکہ ایک نہ ایک دن قرار واقعی سزا ضرور دیتا ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ معجزوں کا دیکھنا اس شخص کے لئے مفید ہوتا ہے جس کے دل میں کفر کی جڑ جم نہ گئی ہو اور اس کے ریشے پھیل نہ گئے ہوں ورنہ ہر معجزے کو کسی نہ کسی مکرو حیلے سے مسترد کر دے گا، اور ہر دلیل و حجت کو مغالطہ آرائی سے غلط ثابت کر دے گا، یعنی دھوکا دے کر مقابلہ کرے گا۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے ایسے کافر و سرکش سے جو خدائی کا دعویٰ کرتا تھا نہایت نرمی سے بات کی بالآخر ان کو فتح حاصل ہوئی، لہٰذا پیغمبروں اور ان کے فرمانبرداروں کو چاہئے کہ بے ادبی یا کفریہ کلمات سن کر غصے میں نہ آجایا کریں نہ غمگین ہوں تاکہ آخر کار ان کو فتح حاصل ہو۔

حیات بعد الموت پر کافروں کا ایک اور شبہہ

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے میں یہ ثابت ہو چکا کہ حیاتِ غیبیہ کا فیضان جسم کی لیاقت و قابلیت پر موقوف نہیں ہے بلکہ بار بار زندگی کا آنا اور جانا (مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا) ہو سکتا ہے جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا میں اس کا مشاہدہ ہوا تو اب کافروں کو اس دلیل میں (حیات بعد الموت پر) شبہہ پیدا کرنے کی گنجائش تھی کہ (مذکورہ واقعہ میں تو ایک حیوانی زندگی کا بار بار آنا جانا معلوم ہوا اور) حیوان کی زندگی ناقص ہے (انسانی زندگی کو اس پر قیاس نہیں کیا جا سکتا) لہٰذا یہ زندگی (حیوانی) اگر کسی پتھر یا لکڑی میں پائی جائے تو ایسا ممکن ہے اسی طرح اس زندگی کا بار بار آنا بھی کچھ بعید نہیں ہے، اس لئے کہ ہم خود برسات وغیرہ کے موسم میں اس بات کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ اس قسم کے بہت سے جانور مثلاً سانپ، بچھو اور مینڈک خود بخود بغیر جوڑے کے پیدا ہو جاتے ہیں، اور زمین خشک ہو یا تر اُن حیوانوں کی صورت قبول نہیں کرتی، پھر جب وہ موسم گذر جاتا ہے تو وہ صورت اپنے مادے سے جدا ہو جاتی ہے، اور پھر جب وہی موسم آتا ہے تو وہ اجزائے مادیہ جو اس جگہ پڑے رہ گئے تھے پھر

وہی صورت (جانور کی) اختیار کر لیتے ہیں (مگر یہ سب حیوانی زندگی میں ہے اور ہماری بحث انسانی زندگی میں ہے) اور آدمی کی پیدائش اس طور پر ہرگز نہیں ہوسکتی، بلکہ اس کی تمثیل ونظیر بیان کی جانی چاہئے تا کہ بات ذہن نشین ہو جائے۔ اس کے جواب میں ارشاد ہوتا ہے:

ءَ اَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ط بَنٰهَا O

رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰهَا O

کیا تمہارا بنانا مشکل ہے یا آسمان کا، اُس نے اُس کو بنالیا اونچا کیا اُس کا اُبھار پھر اُس کو برابر کیا

کافروں کے شبہے کا جواب

یعنی کیا پیدائش کے اعتبار سے تم زیادہ سخت ہو، "اَمِ السَّمَآءُ" یا آسمان زیادہ سخت ہے؟ اور تمہاری نظروں میں اس کی پیدائش اور اس کا بنانا زیادہ مشکل معلوم ہوتا ہے، لہٰذا اس سوال کا جواب ظاہر ہے کہ آسمان اندازے میں انسان سے اتنا بڑا ہے کہ انسان کو اس سے کوئی نسبت نہیں، اور اجزا کی تفصیل کے اعتبار سے بھی بڑا ہے، اس میں مختلف ستارے و بروج پھر ان کی مختلف تاثیرات اور احکام ہیں، اور اس کی قوتِ جسمانیہ بھی آدمی کی قوتِ جسمیہ سے بہت زیادہ ہے اس لئے کہ اس کو حق تعالیٰ نے ایسا بنایا "بَنٰهَا" کہ زمانے گذر جانے کے باوجود پھٹا نہ پرانا ہوا، اور اس کی قوتِ روحانیہ بھی انسان کی قوتِ روحانیہ سے بہت زیادہ ہے اس لئے کہ "رَفَعَ سَمْكَهَا" اللہ تعالیٰ نے اس کی بلندی کو اونچا کیا ہے، اس طرح کہ دیواریں ہیں نہ ٹیک ہے۔

"سَمْک" لغت میں اس امتداد کو کہتے ہیں جو طول وعرض پر قائم ہو اور اگر اس کو نیچے سے اوپر دیکھا جائے تو اس کو بلندی کہتے ہیں چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اس دیوار یا چھت کی بلندی اتنی ہے اور اگر اوپر سے نیچے دیکھا جائے تو اس کو "عمق" کہتے ہیں چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اس دریا یا کنویں کی گہرائی "عمق" اتنا ہے۔

(جب ایسے سخت اور عظیم الشان آسمان کو اللہ نے پیدا کیا ہے اور کسی سابقہ نمونے کے بغیر پیدا کیا ہے تو اس کے لئے انسان کو دوبارہ پیدا کرنا کیا مشکل ہے)

آسمانوں کی بلندی و موٹائی اور اہلِ شرع و اہلِ ہیئت کا اختلاف

اہل تفسیر ومحدثین نے یوں روایت نقل کی ہے کہ زمین سے آسمان کی بلندی کا فاصلہ پانچ سو برس کی

مسافت کا ہے، اسی طرح ساتوں آسمانوں کے درمیان کا فاصلہ ہے، اور ہر آسمان کی موٹائی اور چوڑائی بھی اتنی ہی ہے، اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ساتوں آسمانوں کی بلندی، چوڑائی کیا کچھ ہوگی۔

اور روایت میں پانچ سو برس کی مسافت میں اس بات کی تعیین نہیں ہے کہ کس چلنے والے کی اتنی مسافت بنی ہے، اور یہ کہ کونسی چال مراد ہے؟ یہ خیال میں رہے کہ چڑھائی کا سفر، ہموار زمین کے سفر سے زیادہ مشکل ہوتا ہے، جتنی دیر ہموار زمین کے سفر میں لگتی ہے اتنی ہی مسافت کے چڑھائی کے سفر میں اس سے دوگنا وقت لگتا ہے، چنانچہ اس کا تجربہ میدانی اور پہاڑ کی چڑھائی کے سفر سے ہو چکا ہے۔

اہل ہیئت کے نزدیک آسمانوں کی موٹائی معلوم کرنے کا ایک دوسرا طریقہ ہے جس پر علمِ ہندسہ کی دلیلیں قائم ہیں، اور اہل ہیئت نے (زمین و آسمان کے درمیان) بُعد (دُوری) کے فاصلے کا اندازہ کوسوں سے کیا ہے۔ اس صورت میں ہوسکتا ہے کہ براہین ہندسیہ اور روایات شرعیہ دونوں مطابق ہو جائیں۔

لیکن اہلِ ہیئت کے نزدیک افلاک کے سطوح (چھتیں) ملے ہوئے ہیں ان کے درمیان فاصلہ نہیں ہے، جبکہ روایاتِ شرعیہ کے مطابق فاصلہ ثابت ہوتا ہے۔

(اس اختلاف کے رفع کرنے میں ترجیح و تطبیق دونوں راستے موجود ہیں ترجیح کا طریقہ یہ ہے کہ) اہل ہیئت کے نزدیک آسمانوں کا آپس میں ملا ہوا ہونا (عدم) فصل فی الافلاک کے قاعدے پر مبنی ہے اور یہ قاعدہ خود ظنی ہے کسی دلیل قطعی سے ثابت نہیں (جبکہ اس کے مقابلے میں اہل شرع کا موقف ایک مسلمہ اصول پر مبنی ہے کہ مخبرِ صادق اگر کسی بات کی خبر دے اور وہ بات عقلاً محال نہ ہو تو اس کو قطعی ماننا ضروری ہے، لہٰذا روایاتِ شرعیہ جن کو مخبر صادق نے بیان فرمایا جب فصل فی الافلاک کا تقاضا کرتی ہیں اور فصل محال نہیں تو عقلاً بھی یہ بات راجح ہوگی، واللہ اعلم بالصواب)

اور یہ بات بھی ہے کہ اہلِ ہیئت کے سامنے آسمانوں کے درمیان فاصلہ ثابت کرنے کی ضرورت ہی نہیں آئی اس وجہ سے انہوں نے فاصلہ کو ثابت نہیں کیا لیکن اہلِ شرع کو آسمانوں کے درمیان فرشتوں کا چلنا آنا جانا معلوم ہوا اسلئے انہوں نے آسمانوں کے درمیان فاصلہ کو ثابت کیا ہے، بس کوئی اختلاف نہیں رہا۔

(تطبیق کی صورت یہ ہے)

البتہ ابعادِ فلکیات کے بیان میں براہین ہندسیہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ چیز آسمانوں کے درمیان فاصلہ و فُرجہ ماننے بغیر ثابت ہے جس کو روایاتِ شرعیہ نے ثابت کیا (اور اس کے نتیجے میں فاصلہ ماننا پڑا)

لیکن یہ اختلاف بھی لفظی ہے اس لئے کہ اہلِ ہیئت نے جس مقدار کو آسمان کے موٹاپے میں داخل کیا ہے شاید بعض اہلِ شرع نے اس کو فُرجہ وفاصلہ اعتبار کیا ہو، فیرفع النزاع،

اب حاصل کلام یہ ہے کہ آسمان کی قوت جسمانیہ وروحانیہ کا انسان کی قوت جسمیہ وروحیہ سے زیادہ ہونا اظہر من الشمس ہے، اور اگر آدمی کو یہ فخر ہے کہ میرا مزاج کمالِ اعتدال پر واقع ہوا ہے اس لئے کہ نفسِ ناطقہ مجردہ کے تعلق کے قابل ہوا ہوں، تو جواب اس کا یہ ہے کہ آسمان بھی کمال اعتدال ولطافت پر واقع ہوا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں "فَسَوّٰهَا"

پھر ان کو معتدل المزاج کیا، اور نفوسِ کاملہ کو ان کے اجرام کے ساتھ متعلق کیا ہے جو لطافت وتجرّد میں نفوس انسانیہ سے کامل تر ہیں، اور اس کے ساتھ آسمانوں کو ایک زبردست تاثیر بھی بخشی ہے، وہ یہ کہ سورج وستاروں کی شعاع ظاہر ہونے کی وجہ سے آسمان عالم کے اندر ایک قوی حرارت چھوڑتے ہیں، اور سورج کے غروب ہونے سے وہ عالم کے اندر نہایت خنکی پیدا کرتے ہیں یہ بات ہر روز دن رات کے آنے جانے میں نظر آتی ہے۔

وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا وَ اَخْرَجَ ضُحٰهَا ۝

اور اندھیری کی رات اُس کی اور کھول نکالی اُس کی دھوپ

رات کو آسمان کی طرف منسوب کرنے کی وجہ

اگرچہ "شب" مخروط ظلی زمین کا نام ہے لیکن وہ مخروط آفتاب کی شعاع کے سبب پیدا ہوتا ہے، اور آفتاب کا ایک کنارے پر غروب ہونا اُس کنارے والوں پر اس مخروط کے طلوع ہونے کا سبب ہوتا ہے، اور آفتاب کا طلوع ہونا اس مخروط کے غروب ہونے کا سبب ہوتا ہے، اور چونکہ آفتاب کی حرکت آسمان کی حرکت کے تابع ہے اس لئے رات کو آسمان کی طرف منسوب کردیا۔

(حاصل یہ ہے کہ دن رات سورج کے طلوع وغروب کا نام ہے اور سورج کی حرکت آسمان کی حرکت کے تابع ہے اس لئے رات کو اِس آیت میں آسمان کی طرف منسوب کردیا یعنی "لیلها" فرمایا)

بعض اہل ہیئت نے آسمان کے تسویے کو اس کی کرویّت پر محمول کیا ہے یعنی "سواها" کا معنی یہ کرتے ہیں کہ آسمان کو کروی شکل میں بنادیا اور کروی شکل آفات کو قبول نہیں کرتی، بخلاف دوسری شکلوں

کے، پس اس وجہ سے بھی آسمان کی خلقت انسان کی خلقت سے زیادہ محکم ہوئی، اور بعض نے تسویے کو شقوق وشگاف نہ ہونے پر محمول کیا ہے، اس کے مقابلے میں انسان میں سوراخ اور مسامات بہت ہیں، اسی وجہ سے انسان بہت سی آفات کی زد میں ہے، مناسب ونا مناسب ہوا اس کے بدن میں داخل ہوتی، موذی جانور اس کے سوراخواں سے داخل ہوسکتے ہیں، لیکن آسمان ان سب آفات سے محفوظ ہے۔

"وَاَخْرَجَ ضُحٰهَا" یعنی "نکالی اس کی روشنی" جو آفتاب کی صورت میں ہے، "ضحیٰ" کے وقت کا ذکر خاص طور پر اس لئے کیا کہ، وہ وقت دن کے تمام اجزاء میں نور وروشنی کے اعتبار سے کامل تر وقت ہے۔

اور سورج کی شعاع کو عالم کے اندر نہایت گرمی کا احساس پیدا کرنے میں خاص تاثیر دی گئی ہے، عالم کے تمام عناصر اس سے گرم ہوجاتے ہیں، خصوصاً زمین کہ وہ کثافت اور خشکی کی وجہ سے بہت دیر تک اس کیفیتِ مقبولہ کو محفوظ رکھتی ہے اور دن رات آسمان کو جو گرمی سردی بہم پہنچتی آسمان ان کیفیتوں کے قبول کرنے کے قابل نہیں تھا اس لئے لامحالہ ان کو زمین نے قبول کرلیا اس سبب سے زمین ہل جوتنے، بونے اور چشمے ونہریں جاری ہونے کے قابل ہوئی (چنانچہ اگلی آیات میں اس کو بیان فرمایا ہے)

وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا ○

اور زمین کو اُس کے پیچھے صاف بچھا دیا

یعنی اس کے بعد زمین کو ہموار کیا، اور اس کی چمن بندی کی، وہ اس طرح کہ زمین کے اندر گرمی سردی جمع ہونے کی وجہ سے اس سے پانی نکالا چنانچہ فرماتے ہیں

اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰهَا ○

باہر نکالا زمین سے اُس کا پانی اور چارا

تاکہ زمین کے پانی جو سردی کے سبب پانی قبول کرنے کے قابل ہوئے تھے، سورج کی شعاع کی گرمی کی وجہ سے بہہ کر زمین سے باہر آجائیں۔

اور جب پانی اور مٹی ملے، پھر حرارت وگرمی کے اثر نے ان کو ابھارا تو سبزہ وگھاس اُگ آیا، چنانچہ فرماتے ہیں: "وَمَرْعٰهَا" "اور زمین کا چارا نکالا" یعنی زمین بنجر پڑی تھی اب اس کو باغ بنا دیا، کہ پانی بھی اس میں ہے اور طرح طرح کا سبزہ بھی اس میں ہے۔

پہاڑوں کے گاڑنے میں حکمت

اور اس واسطے کہ پانی کا مادہ زمین میں محفوظ رہے ایک اور تدبیر فرمائی (وہ یہ کہ پہاڑوں کو زمین میں گاڑ دیا۔) چنانچہ فرماتے ہیں:

وَالْجِبَالَ اَرْسٰهَا ○

اور پہاڑوں کو قائم کر دیا

یعنی پہاڑوں کو لنگروں کی طرح زمین پر مقرر کیا، تاکہ وہ بخارات جو زمین کے اندر ہیں، اگر باہر نکلنے چاہیں، تو پہاڑوں کے موٹاپے کی وجہ سے نہ نکل سکیں، بالآخر لوٹ کر پانی بن جاتے ہیں، پھر پہاڑوں کے اندر جو سوراخ ہوتے ہیں ان سے چشموں اور نہروں کی شکل میں جاری ہو جاتے ہیں۔

اور یہ وجہ بھی ہے کہ جو پانی آسمان سے (برف کی شکل میں) زمین پر نازل ہوتا ہے، پہاڑوں کے موٹاپے کی وجہ سے وہ ان میں جذب نہیں ہوتا، بلکہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر جمع ہو جاتا ہے، پھر آہستہ آہستہ نشیب کی طرف جاری ہوتا ہے، اسی وجہ سے چشمے اور نہریں پہاڑوں سے جاری ہوتی ہیں، اور قرآن میں جا بجا چشموں اور نہروں کے ذکر کے ساتھ پہاڑوں کا ذکر بھی آتا ہے۔

یہ ساری تدبیریں کیوں فرمائیں؟ (وجہ خود بیان فرماتے ہیں)

مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ○

کام چلانے کو تمہارے اور تمہارے چوپایوں کے

(معلوم ہوا کہ) تمہاری بقاو معاش سب آسمانوں کے ساتھ مربوط ہے، تمہاری زندگی آسمان کی زندگی کی محتاج ہے، پھر تم اپنی خلقت کو آسمان کی خلقت سے محکم کیسے سمجھ سکتے ہو؟

زمین کی پیدائش پہلے ہوئی یا آسمان کی

یہاں پر یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ سورۂ بقرہ اور سورۂ فصلت میں دو آیات میں زمین کی پیدائش کو آسمان کی پیدائش سے پہلے بتایا گیا ہے، بلکہ سورۂ فصلت میں تو پہاڑوں کا قائم کرنا، اور زمین کے اندر تخلیقی قوتوں کی برکت کے القا کو بھی آسمان کی پیدائش پر مقدم بیان کیا گیا ہے، (جبکہ اس سورت سے

معلوم ہوتا ہے کہ زمین کی پیدائش آسمان کے بعد ہوئی، بظاہر یہ تعارض ہے، اس تعارض کو دور کرنے کے لئے) صاحب کشاف اور بعض دوسرے مفسرین نے کہا ہے کہ زمین کے جسم کی پیدائش آسمان سے پہلے ہوئی ہے البتہ زمین کا پھیلانا، اور بچھانا یہ آسمان کی پیدائش کے بعد ہوا ہے، لیکن یہ تقریر نہیں چل سکے گی اس لئے کہ سورۂ فصلت میں زمین کی تمام مخلوقات کی پیدائش کو آسمان کی پیدائش پر مقدم بیان فرمایا ہے، اسی طرح سورۂ بقرہ کی اس آیت میں بھی ہے "وخلق لکم ما فی الارض جمیعًا ثمّ استویٰ الی السماء"

یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ زمین کی تمام مخلوقات آسمان کے تسویے سے پہلے پیدا کی گئیں ہیں (یعنی صاحب کشاف کی تفسیر کے مطابق صرف سورۂ نازعات کی آیت جس میں زمین کے پھیلانے کو تسویۂ سماء کے بعد بیان کیا گیا ہے اس کے درمیان اور سورۂ بقرہ وغیرہ کی ان آیات کے درمیان تطبیق دی گئی ہے جن میں زمین کی پیدائش تسویۂ سماء سے مقدم بیان کی گئی ہے لیکن جن آیات میں زمین کی مخلوقات کو بھی تسویۂ سماء سے مقدم بیان کیا گیا ہے ان میں تطبیق ہنوز تشنہ ہے)

اسی وجہ سے علماء کی ایک جماعت کا یہ خیال ہوا ہے کہ آسمان کی پیدائش (یعنی آسمان کے مادے کی بشکل دھواں پیدائش) تو زمین پر مقدم ہے البتہ آسمان کا تسویہ زمین سے مؤخر ہے، لیکن اس جماعت کو اس سورہ (نازعات) سے غفلت ہوئی ہے، اس لئے کہ اس میں تو یوں فرمایا ہے: "فَسَوّٰهَا ○ وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا وَ اَخْرَجَ ضُحٰهَا ○" اس کے بعد یوں ارشاد فرمایا "وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا" (اس میں تو صراحتًا آسمان کا تسویہ بھی زمین پر مقدم بیان فرمایا ہے)

قولِ فیصل

لہٰذا تحقیق یہ ہے کہ زمین کا ہموار کرنا جو اس سورت میں تسویۂ سماء کے بعد بیان کیا گیا ہے اس سے مراد "قضاء" اور "ایجاد ما فی الارض" کا مرتبہ ہے، اور زمین کو بصورت باغ اس پر مرتب کیا ہے (کہ جب زمین پر درخت، سبزہ، نباتات وغیرہ کو بالفعل وجود بخشا گیا تو زمین ایک گلستان کی صورت میں ظاہر ہوئی) اور زمین کی مخلوقات یعنی نباتات، پہاڑ اور سبزہ زار جن کو سورۂ بقرہ اور سورۂ فُصّلت میں آسمان کے تسویے سے مقدم ذکر کیا گیا ہے وہاں ان کی تخلیق سے مراد ان چیزوں کا اندازہ اور تقدیر کا مرتبہ ہے، بالفعل ایجاد اور پیدا کر دینا مراد نہیں، ظاہر ہے کہ معادن و نباتات کے وجود میں آنے اور

موجودہ صورت اختیار کرنے کے لئے اسباب کے درجے میں سورج، چاند اور تاروں کی روشنی کا اور ان روشنیوں کی مختلف اوضاع کا دخل ہے بلکہ ان کا وجود ان پر موقوف ہے۔ اور آسمانی سیارے اور ان کی مختلف اوضاع وشعاعیں حرکتِ فلک کے ساتھ مربوط ہیں لہٰذا آسمان کی پیدائش سے پہلے زمین کی تمام مخلوقات کا بالفعل وجود میں آنا ممکن ہی نہیں ہے۔

دفع تعارض میں ایک اور قول

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہاں "بعد ذلک" ترتیب کے لئے نہیں ہے، بلکہ مطلقاً نعمتوں کے شمار کے لئے ہے، کہ بہت زیادہ شفقت وعنایت کی وجہ سے (نعمتوں کی پیدائش کے اعتبار سے ان میں) مقدم ومؤخر کی ترتیب کا لحاظ ان کو ذکر کرتے ہوئے نہیں کیا (بس شمار کر دیں کہ یہ یہ نعمتیں ہم نے تم کو دی ہیں) جیسے کوئی شخص اپنے غلام سے کہے کیا میں نے تم کو فلاں فلاں چیز نہیں دی، اور کیا میں نے تیری پرورش نہیں کی، اور کیا میں نے تم کو پہلے آقا کے ظلم سے نہیں چھڑایا (یہاں نعمتوں کے ذکر میں آقا نے ان کے وقوع میں آنے کی ترتیب کا لحاظ نہیں کیا پہلی کو بعد میں ذکر کر دیا بعد والی کو پہلے، جیسے پہلے آقا سے چھڑانا، پرورش کرنا وغیرہ اس تفسیر کے مطابق آیات میں تعارض نہیں رہتا)

چوتھا قول

بعض نے کہا ہے کہ یہاں "بعد" تراخی کے لئے ہے جیسے "ثم کان من الذین امنوا" میں "ثم" ہے کہ "فک رقبہ" اور دیگر عبادات مالیہ کے بعد اس کو ذکر کیا گیا، اور زمین کا بچھانا بھی انسانوں کے حق میں آسمانی نعمتوں میں سے بہت بڑی نعمت ہے (یعنی نعمتوں کو شمار کرتے ہوئے اس کو بھی ذکر اسی لئے فرمایا ہے کہ یہ بڑی نعمت ہے، اس قول کا حاصل بھی یہی ہے کہ ترتیب مقصود نہیں ہے)

پانچواں حضرتِ ابن عباسؓ کا قول

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ یہاں "بعد ذلک" مع ذلک کے معنی میں ہے جیسے "بعد ذلک زنیم" کے اندر ہے۔

چھٹا حضرت حسن بصریؒ کا قول

حضرت حسن بصریؒ سے منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے زمین کو بہت چھوٹا پیدا کیا، اس میں

پہاڑوں کی رگیں پیدا کیں، ان رگوں میں برکت دی جس کے سبب وہ پانی کو اپنے اندر جذب کر سکیں اور ان سے چشمے جاری ہو سکیں اور کھانے پینے کی اشیاء کا بھی اندازہ مقرر کر دیا، اس کے بعد اللہ تعالیٰ آسمانوں کی طرف متوجہ ہوا، جو ایک دھواں تھا، اس کے سات آسمان بنا دیئے اس کے بعد پھر زمین کو پھیلایا، جتنی کہ اس وقت ہے، زمین کی پیدائش سب سے پہلے مکہ مکرمہ کے مقام پر ظاہر ہوئی، وہیں سے پھیلائی گئی، اسی لئے اس خانۂ مکرمہ کے حق میں دوسری جگہ فرمایا ہے ''ان اوّل بیتٍ وضع للناس للذی ببکۃ'' اور اسی لئے مکہ کے شہر کو ''ام القریٰ'' کہتے ہیں واللہ اعلم

(اس تفسیر کے مطابق بھی زمین و آسمان کی تخلیق کے اندر اولیت کے بارے میں آیات کے اندر جو بظاہر تعارض ہے وہ رفع ہو جاتا ہے تأمل تدبر)

نعمتوں کے بیان میں بعض جگہ حرف عطف ذکر کرنے اور بعض جگہ حذف کرنے میں نکتہ

یہاں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ ان نعمتوں کے شمار کرنے میں بعض جگہ حرف عطف لائے ہیں اور بعض جگہ حذف کر دیا ہے، سو اس نکتے کے معلوم کرنے کا قاعدہ یہ ہے کہ جہاں پہلی نعمت مجمل ہے، اس کی تفصیل کرنا منظور ہے تو وہاں حرف عطف کو حذف کر دیا ہے اس لئے کہ مجمل اور مفصل ایک ہی ہے ان کے درمیان حرف عطف لانے کی گنجائش نہیں ہے، جیسے ''والارض بعد ذلک دحٰھا أخرج منھا ماء ھا و مرعٰھا'' ہے اور جیسے ''بنٰھا رفع سمکھا فسوٰھا'' ہے۔ اور جہاں پہلی نعمت کے بیان سے فارغ ہو کر دوسری نعمت کو بیان کرنا مقصود ہے وہاں حرف عطف لائے ہیں چنانچہ باقی سب آیات میں حرف عطف مذکور ہے۔

آنے والی آیات کا ماقبل سے ربط

جب کافروں کے ان شبہات کے ردّ سے فارغ ہوئے جو وہ حیات اُخروی کے متعلق کرتے تھے تو وہ بات جو اصل مقصود تھی یعنی نیکوں اور بدکاروں کے حال کی تفصیل، اور ہر دو طائفوں کا امتیاز جو بیان ہوتے ہوئے درمیان میں رہ گیا تھا اب اس کو مکمل کرنے کی طرف رجوع فرماتے ہیں کہ جس دن نفخۂ ثانیہ کے بعد دوبارہ زندگی ملے گی تو کتنے ہی دل اس صور کی آواز سننے سے مضطرب و بے قرار ہوں گے،

اوران کے اضطراب کا ثمرہ بھی ظاہر ہوگا، جس بلا سے ڈرتے تھے بالآخر وہی واقع ہوگی، چنانچہ فرمایا:

فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى ۝

پھر جب آئے وہ بڑا ہنگامہ

بس ''رادفہ'' کے آنے سے لوگ مضطرب و بے قرار ہو جائیں گے، کہ دیکھئے آج یہاں اس زندگی میں میرے ساتھ کیا معاملہ پیش آتا ہے ''اور جب دوسرا حادثہ آئے گا جو بہت بڑا اور سب پر غالب آنے والا ہے'' اس سے مراد تجلی قہر الٰہی ہے، جو جزا و سزا کے واسطے ہوگی، اور اعمال کے صحیفوں، گواہوں کے حاضر کرنے اور ارواح و ملائکہ کے حاضر کرنے کے واسطے ہوگی، اور دوزخ کو اس کے مقام پر کھڑا کرنے اور قریب کرنے کے واسطے اور گنہگاروں کی پکڑ، ان سے سوال و سزا کے واسطے (یہ تجلی) ہوگی۔

''طامہ'' کا لفظ ''طمّ'' سے ماخوذ ہے جو غلبے اور علو کے معنی میں آتا ہے ''یقال فی المثل جری الوادی فطمّ'' جب نالا جاری ہوتا ہے تو گڑھے پر پانی غالب آجاتا ہے۔

''کبریٰ'' اس حادثے کے غلبے اور علو کی تاکید کے لئے ہے، ''فاذا'' کی جزا ''فاما من طغیٰ'' اپنے معطوف کے ساتھ ہے۔

چونکہ حادثہ بالاصالۃ نوعِ انسان کی جزا کے لئے ہوگا، آسمان کا پھٹنا زمین کا متزلزل ہونا، اور دیگر حادثے اس کی تمہید کے لئے ہوں گے اس لئے یہ حادثہ اس دن ہوگا جس دن......

يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰى ۝

جس دن کہ یاد کرے گا آدمی جو اس نے کمایا

اس دن آدمی وہ تمام چیزیں یاد کرے گا جو دنیا میں تلاش و سعی کے ساتھ کی تھیں، گویا کام کرنے کے بعد جب اس نے اپنے کام کی جزا آنکھوں سے نہیں دیکھی تھی، اس کا ثمرہ نہیں چکھا تھا تو بھول گیا تھا، اب جو اس کا بدلہ آنکھوں سے دیکھے گا تو ان سب کاموں کو یاد کرے گا، اپنے اعمال کو صحیفوں کے اندر ایک جگہ لکھے ہوئے دیکھے گا اور جو چیزیں اس کے ذہن سے اتر گئی تھیں، وہ سب تازہ ہو جائیں گی، اور قوائے فلکیہ کے سرایت کر جانے کی وجہ سے مدرکہ و خیال میں ان اعمال کو ان کی صورتوں سے معلوم کرلے گا، آسمان و زمین کے پھٹ جانے سے سفلی و علوی عالمِ مثال کو دیکھے گا۔

وَ بُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى ○

اور نکال ظاہر کردیں دوزخ کو جو چاہے دیکھے

یعنی کھول دی جائے گی دوزخ جو چاہے دیکھے، اس وقت سب لوگ دوزخ کے دیکھنے میں برابر ہوں گے، جس طرح دنیا میں انبیاء واولیاء دوزخ کو دیکھتے ہیں اور عوام نہیں دیکھتے وہاں یہ تفریق نہ ہوگی، پس "لمن یریٰ" کا اضافہ اس کے ظہور کی تعمیم کے لئے ہے، جیسے یوں کہا جاتا ہے:

"قدبین الصبح للذی له عینان" صبح ظاہر ہوئی ہر اس شخص کے لئے جو دو آنکھیں رکھتا ہے۔

اگرچہ یہ عظیم حادثہ تمام محشر والوں کو بے حواس کردے گا اور قہر الٰہی کی نشانیوں کو دیکھنے میں جو دوزخ کی صورت میں نمودار ہوں گی سب شریک ہوں گے مگر اس غضب کا اثر سب کو نہیں پہنچے گا بلکہ اس وقت لوگوں کے دو فریق ہو جائیں گے:

فَاَمَّا مَنْ طَغٰى ○

سو جس نے کی ہو شرارت

یعنی جس نے سرکشی وشرارت کی تھی دنیا میں اور اللہ کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز کیا تھا (اس کا انجام آگے بیان ہوتا ہے) اور اکثر سرکشی وشرارت کا سبب دنیا کی محبت ہوا کرتی ہے اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "حبّ الدنیا رأس کل خطیئة" کہ دنیا کی محبت ہر برائی کی جڑ ہے، اور یہ طاغی دنیا کی محبت کے مرتبے سے بھی آگے بڑھ گیا تھا، اس نے تو

وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ○

اور بہتر سمجھا ہو دنیا کا جینا

یعنی اس نے دنیا کی زندگی، اس کی لذتوں کو اللہ تعالیٰ پر اور ثواب پر ترجیح دی تھی۔

فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى ○

سو دوزخ ہی ہے اُس کا ٹھکانا

کیونکہ دوزخ قہر الٰہی کا مظہر اور اس کی جناب سے دوری ومھجوری کی صورت ہے، لہٰذا اس شخص نے

غیر اللہ یعنی دنیا کو جو اللہ پر ترجیح دی تو اللہ تعالیٰ سے نہایت دور جا پڑا، پس ایسے شخص کا دوزخ کو دیکھنا ایسا ہی ہے جیسے چور کا جلاّد یا سولی کو دیکھنا ہے۔

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ

اور جو کوئی ڈرا ہو اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے

یعنی دنیا میں جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا، اور اس نے یہ سمجھا کہ مجھے اس کے حضور کھڑا ہونا ہے اس لئے اس کی مقرر کی ہوئی حدود سے تجاوز اور سرکشی نہیں کرنا چاہئے ورنہ وہاں روسیاہی حاصل ہوگی اور دنیا کی زندگی کی حیثیت ایک سفر سے زیادہ نہیں ہے، اللہ کی مرضیات اور آخرت کے ثواب پر دنیا کو ترجیح نہیں دینا چاہئے۔

وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ○

اور روکا ہو اس نے جی کو خواہش سے

یعنی اپنے نفس کو ناجائز خواہش سے روکا کہ اکثر دنیا کی ترجیح کا باعث یہ ناجائز خواہش ہی ہوا کرتی ہے۔

فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِىَ الْمَاْوٰى ○

سو بہشت ہی ہے اُس کا ٹھکانا

ابوبکر ورّاق کا قول

شیخ ابوبکر ورّاقؒ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا و آخرت میں اس خواہش نفس سے بری کوئی چیز پیدا نہیں کی جو حق کے مخالف ہو، اسی واسطے اہل طریقت کے نزدیک آدمی بالغ اس وقت ہوتا ہے جب ہوائے نفس سے خلاصی حاصل کرلے اور عام لوگوں کے عُرف میں آدمی بالغ اس وقت ہوتا ہے جب کھیل کود کی محبت سے آزاد ہو جائے۔

خلق اطفال اند جز مستِ خُدا
نیست بالغ جز رہیدہ از ہوا

پس اس (جنتی) کا دوزخ کو دیکھنا ایسے ہوگا جیسے تماشہ دیکھنے والے جلاّد یا سولی کو دیکھیں کہ اس طرح دیکھنا فرحت وخوشی کا باعث ہوتا ہے۔

اگر چہ اس مقام پر انسانوں کے دو فریقوں کا بیان کرنا منظور ہے کہ محشر کے دن ہر ایک کا انجام اپنا ایک الگ ہی رنگ رکھتا ہے لیکن مفسرین نے کہا ہے کہ ان دو وصفوں میں قریش کے دو حقیقی بھائیوں کے حال کی طرف اشارہ ہے۔

حضرت مصعبؓ اور عامر کا قصہ

مصعبؓ اور عامر یہ دونوں حقیقی بھائی تھے، ان کو باپ کی وراثت میں بہت سا مال ملا تھا، ان کی ماں ان سے بہت پیار کرتی تھی اور شب وروز اچھا کھلانے اور اچھا پہنانے میں مصروف رہتی تھی، ان میں سے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں حاضر ہوا کرتے تھے جس کے نتیجے میں اللہ کے خوف سے انہوں نے دنیا کی لذتیں چھوڑ دیں، راتوں کو تہجد گذاری میں بیدار رہتے، دن کو روزہ رکھتے تھے، اچھا کھانا چھوڑ دیا کہ عورتوں کی خواہش زیادہ ہوگی، آخر انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانے سے مال ومتاع، دولت وحشمت چھوڑ، سارے گھر بار سے جدا ہوکر غربت وکربت میں مدینہ منورہ کی ہجرت کی، اور وہاں کے لوگوں کو قرآن کریم پڑھانے میں مشغول ہوگئے، اور پھر جنگِ اُحد کے دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا پرچم اُٹھائے کمال جوانمردی، استقلال اور آزادی کے ساتھ لڑتے ہوئے شہید ہوئے اور دنیا سے رخصت ہوئے ''اناللہ وانا الیہ راجعون''

یہاں تک کہ ان کے کفن کے لئے ایک چادر کے سوا کچھ میسر نہ تھا، اگر سر ڈھانپتے تو پاؤں کھل جاتے اور پاؤں ڈھانپتے تو سر کھل جاتا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا چادر سے سر ڈھانپ دو اور پاؤں پر اذخر گھاس ڈال دو، چنانچہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے ایسا ہی کیا۔

دوسرا بھائی جس کا نام عامر بن عمیر تھا وہ شب وروز عیش وعشرت میں مصروف رہتا اور محرمات شرعیہ میں مستغرق رہتا، ترکِ دنیا کی وجہ سے اپنے بھائی سے ہمیشہ لڑتا رہتا تھا، دنیا کی محبت کی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں حاضر ہونے سے بھاگتا، ایمان قبول نہ کرتا، یہاں تک کہ جنگِ بدر میں کافروں کے ساتھ مارا گیا اور دوزخ کا ایندھن بنا، اعاذنا اللہ من سوء الخاتمۃ، (تو گویا أما من خاف الخ سے اشارہ حضرت مصعب کی طرف ہے اور اما من طغی سے انکے بھائی عامر کی طرف ہے)

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قیامت کے احوال بیان فرماتے ہوئے بتاتے کہ جہنم سرکشوں، دنیا طلب کرنے والوں کا ٹھکانا ہے، اور جنت متقیوں، اللہ سے ڈرنے والوں کی اقامت گاہ ہے تو کافر (اعتراض کرتے ہوئے) کہتے یہ سب کچھ تو قیامت کے بعد ہوگا لیکن تم ہمیں یہ بتاؤ وہ قیامت قائم کب ہوگی اس کا کب وقت آئے گا؟ اللہ تعالیٰ ان کے اس بے ہودہ سوال پر خفگی کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰهَا O

تجھ سے پوچھتے ہیں وہ گھڑی کب ہوگا قیام اُس کا

نبی کے لئے آئندہ کی باتوں کا علم ضروری نہیں

حالانکہ ان کا یہ سوال محض بے جا ہے، اس لئے کہ آئندہ کی باتوں کو بتانا تیرا کام نہیں ہے کہ تجھ سے اس قسم کی باتیں پوچھتے ہیں، یہ تو نجومیوں، جفر والوں، رمل والوں اور کاہنوں کا کام ہے تیرا کام تو اللہ کے احکام کو پہنچانا، اور بغیر تعیینِ وقت کے اس کے عذاب سے ڈرانا ہے۔

فِيْمَ اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰهَا O

تجھ کو کیا کام اُس کے ذکر سے

گاہے گاہے انبیاء کرام اور اولیاء کرام آگے ہونے والی کسی بات کا وقت (وحی یا کشف والہام سے) بتا دیتے ہیں، سو یہ اس لئے تا کہ اس بات کے ہو جانے سے لوگوں کو ان کی نبوت و ولایت کا اعتقاد ہو جاتا ہے تب لوگ ان سے اللہ کی راہ سیکھتے اور ہدایت حاصل کرتے ہیں، جیسے ظاہری اطبا، بعض اوقات تقدمۃ المعرفہ کے طور پر مریض کے آئندہ ہونے والے مزاجی تغیرات کو بتا دیتے ہیں، اس لئے کہ لوگوں کو ان تغیرات کے دیکھنے سے ان کی طبابت کا اعتقاد ہو جائے، اور مخلوق ان کے معالجے سے نفع اٹھائے ورنہ آئندہ کی باتوں کو بیان کرنا نبوت وولایت کی شرائط میں سے نہیں ہے جیسے تقدمۃ المعرفہ کا بیان کرنا طبابت کے لئے شرط نہیں ہے تاہم ایک بات ہے جس کا فی الجملہ فائدہ بھی ہوتا، لیکن قیامت کا وقت بیان کرنے میں تو کچھ فائدہ بھی نہیں ہے، اس لئے کہ بالفرض قیامت کا وقت بیان کرنے کے بعد جب اس کا وقت آ گیا تو اب اگر کسی کو انبیاء کی نبوت کا اعتقاد آیا بھی تو کیا فائدہ، ایمان کا وقت تو فوت

ہو گیا، اور قیامت کے واقع ہونے سے پہلے اس کے بیان کردہ وقت کی موافقت معلوم نہیں ہو سکتی، لہٰذا قیامت کے وقت کو بتانا ہرگز کارِ نبوت کے ساتھ موافقت نہیں رکھتا۔

اور اس سب باتوں کے ساتھ (قیامت کا) علم بھی ایسا نہیں کہ کسی بشر کا مدرکہ (عقل) اس کا احاطہ کر سکے، اس لئے کہ عالم کے اندر جتنے حادثات رونما ہوتے ہیں ان کے اسباب بھی اس عالم کے اندر موجود ہوتے ہیں سو ان حادثات کا وقت مقرر کر سکتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں کہ جب فلاں فلاں اسباب جمع ہو جائیں گے، اور فلاں فلاں موانع دور ہو جائیں گے تب وہ حادثہ خواہ مخواہ واقع ہو جائے گا، بخلاف اس حادثۂ عامہ کے کہ اس کے رونما ہونے کی وجہ سے عالم کے تمام ارکان کو صدمہ پہنچے گا، مسببات کی طرح خود اسباب بھی درہم برہم ہو جائیں گے، اس لئے اس کا سبب اِس عالم کے اسباب کے علاوہ ایک اور بھی ہے جس تک انسانی فکر کی رسائی نہیں ہو سکتی، اسی لئے اس کے بارے میں جس سے بھی سوال کیا جاتا ہے بالواسطہ یا بلاواسطہ وہ اس کو علمِ الٰہی کے حوالے کر دیتا ہے، چنانچہ فرمایا:

اِلٰی رَبِّکَ مُنْتَہٰہَا ○

تیرے رب کی طرف ہے پہنچ اُس کی

یعنی ''تیرے رب کی طرف ہی ہے اس کی انتہاء'' کیونکہ قیامت کے وجود کا سبب اللہ کا ارادۂ قہری ہے، جو بنی آدم کے گنہگاروں سے بدلہ لینے کے لئے متوجہ ہوگا، اور اس ارادے کا وقت جاننا کہ کب ہے؟ اور بنی آدم کی برائیوں کی تعداد معلوم کرنا کہ کتنی ہیں، اور کون سی برائی سزا دینے کے قابل ہے؟ یہ سب اسی ذات کا خاصہ ہے، تیرا یا کسی دوسرے انسان کا کام نہیں کہ اس علم کو جان سکے، ہاں ایک صورت ہے کہ اللہ تعالیٰ خود کسی کو یہ علم عنایت فرما دیں اور یہ ہونے والی بات نہیں ہے اس لئے کہ:

اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ یَّخْشٰہَا ○

تو تو ڈر سنانے کے واسطے ہے اُس کو جو اُس سے ڈرتا ہے

ایک شبہہ اور اس کا جواب

یہاں ایک شبہہ ہوتا ہے کہ ڈرنے والے کو ڈرانے کا کیا معنیٰ؟

جواب اس کا یہ ہے کہ ہر عاقل کو جزا و سزا کے بارے میں ایک اجمالی علم حاصل ہے اس سبب سے

وہ یہ جانتا ہے کہ یہ دنیا مجازات کا مقام نہیں بلکہ مجازات (جزاوسزا) کے لئے ایک اور عالم ہونا چاہئے سو اس طرح اس کو قیامت کا ڈر پیدا ہوتا ہے، اور انبیاء کرام کا ڈرانا اس مجازاتِ اُخروی، اور اس جہاں کی مضرات و نافعات کی تفصیل سے آگاہ کرنا ہے، پس جو شخص مجازات پر علمِ اجمالی نہیں رکھتا وہ انبیاء و مرسلین کے ڈرانے سے بے بہرہ ہے۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ "من یخشی" سے مراد یہ ہے کہ آخرت کے خوف کی استعداد بالقوۃ اس میں موجود ہے نہ یہ کہ بالفعل وہ ڈرتا ہے، اور جن میں خوف آخرت کی استعداد بالقوۃ نہیں انبیاء کے ڈرانے سے ان کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ ڈرنے والے اور ڈرانے والے کو اس چیز کے وقت کے بارے میں سوال کی کوئی ضرورت نہیں ہے جیسے کسی مسافر کو کوئی چوروں، قزاقوں سے ڈرائے تو وہ یہ کہے کہ یہ بتاؤ وہ کس وقت مجھ پر آپڑیں گے جب تک وقت نہ بتاؤ گے میں یقین نہیں کروں گا، (جس طرح یہ بے ہودہ سوال ہے اسی طرح قیامت کے وقت کے بارے میں سوال بھی ہے)

ظاہر ہے کہ اگر قیامت کے وقت کے بارے میں کافروں کا سوال اس لئے تھا تاکہ وہ اس وقت ایمان لائیں تو یہ بے جا ہے اس لئے کہ قیامت کے واقع ہونے کے بعد ایمان معتبر نہ ہوگا۔

اور اگر ان کا سوال اس لئے تھا تاکہ اس کا قرب و بُعد معلوم ہوتا کہ اگر دور ہو تو خاطر جمع رکھ کر بیٹھے رہیں، اور اگر نزدیک ہو تو اس کی فکر کریں تو یہ بھی بے حاصل ہے، کیونکہ جب قیامت قائم ہوگی تو ان کو یہ مدت دراز جو گذری ہے، بہت تھوڑی معلوم ہوگی، چنانچہ فرمایا:

كَأَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوٓا إِلَّا عَشِيَّةً أَوْ ضُحٰهَا ○

ایسا لگے گا جس دن دیکھیں گے اُس کو کہ نہیں ٹھہری تھی دنیا میں مگر ایک شام یا صبح اُس کی

گویا کہ وہ لوگ جس روز قیامت کی نشانیاں دیکھیں گے تو یوں سمجھیں گے کہ دنیا میں ان کے ٹھہرنے کی مدت نہایت تھوڑی تھی ایک روز کامل بھی نہ تھی بلکہ وہ یہ گمان کریں گے کہ وہ دنیا اور برزخ میں نہیں ٹھہرے مگر ایک "عشیۃ"، یعنی شام جو زوال آفتاب سے غروب تک کی مدت ہے، یا ایک ضحیٰ جس کا وقت طلوع آفتاب سے زوال تک ہے۔

عشیہ اور ضحیٰ میں تردد کی وجہ

(یہاں عشیہ اور ضحیٰ میں تردد بیان فرمایا ہے یعنی یہ کہ وہ یہ گمان کریں گے کہ اب تک وہ ایک صبح ٹھہرے رہے یا ایک شام) وجہ اس تردد کی یہ ہے کہ اگر تو انکی زندگی رنج و مشقت میں گذری تھی اور برزخ میں بھی وہ عذاب میں گرفتار رہے تو وہ یوں کہیں گے کہ ہماری بقا کی مدت عشیہ یعنی دن کا دوسرا نصف حصہ ہے اسلئے کہ تھکاوٹ و رنج کا وقت یہی ہے، اور اگر انکی عمر راحت میں گذری اور برزخ میں بھی وہ معذب نہیں ہوئے تو وہ اب تک اپنے ٹھہرنے کی مدت کو ضحیٰ سمجھیں گے۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ اکثر لوگوں کے نزدیک جیسے ہندو اور یونانی وغیرہ ہیں دن رات کے دورے کی ابتداء دوپہر سے ہوتی ہے اور شریعت میں فجر سے ہے، اس لحاظ سے اہلِ محشر جب اپنی مدتِ بقاء آدھے دن سے بھی کم بتلانا چاہیں گے تو کہیں گے کہ اکثر دن کی ابتداء نصف النہار سے ہے تو ہم نے دیر نہیں کی مگر ایک عشیہ کے برابر (شام کے برابر) اور اگر دن کی ابتداء فجر سے ہے تو ہم نے دیر نہیں کی مگر ایک ضحیٰ کے برابر، اور بظاہر عشیہ کے ضحیٰ پر مقدم کرنے کا راز یہی ہے۔

اور ضحیٰ کی اضافت عشیہ کی طرف اس وجہ سے ہے تاکہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ ان کے نزدیک دنیا کی کل مدت ایک روز کے برابر ہوگی، چنانچہ دوسری جگہ ان کی زبان سے فرمایا، ''ان لبثتم الا یوما'' اور دنیا میں اپنی نوع کی بقاء کا زمانہ اس روز کی ایک ساعت کے برابر جانیں گے، نہ یہ کہ ایک روز کی عشیہ اور دوسرے دن کی ضحیٰ، اور اگر عشیۃ وضحیٰ فرماتے، ضحیٰ کی اضافت عشیۃ کی ضمیر کی طرف نہ کرتے تو ایک دن کا اتحاد سمجھ میں نہ آتا۔

اور احتمال ہے آیت کے معنی اس طرح ہوں ''الا عشیة او ضحها ایضاً مع العشیة'' حاصل یہ ہے کہ دنیا میں رہنے کی مدت کے بارے میں ان کو تردد ہوگا کہ ایک دن کامل تھا یا آدھا تھا، چنانچہ دوسری جگہ انہی کے قول کی حکایت کی ہے: لبثنا یوما او بعض یوم ○ فسئل العادین ○

واللہ اعلم بالصواب

مقدمہ سورۂ عبس

یہ سورہ مکی ہے، اس میں بیالیس (۴۲) آیات، ایک سوتیس (۱۳۰) کلمات اور پانچ سو پینتیس (۵۳۵) حروف ہیں۔

سورۂ نازعات کے ساتھ ربط کی وجوہات

اس سورہ کا ربط سورۂ نازعات کے ساتھ کئی طرح پر ہے۔

اوّل

یہ کہ سورۂ نازعات کے آخر میں فرمایا "اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَّخْشٰهَا" (آپ کا منصب اِنذار بیان فرمایا) اور اس سورہ میں اس منصب کے لوازمات کے ترک پر خطاب وعتاب فرمایا "وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى ○ وَهُوَ يَخْشٰى ○ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى"

دوم

یہ کہ اِس سورہ کا قصہ اُس سورہ کے قصے کے ساتھ تقابل رکھتا ہے وہاں پر مذکور ہے کہ جلیل القدر پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایک صاحبِ اقتدار بادشاہ کے پاس بھیجا اور اس کی خوشامد کا حکم ہوا، فرمایا "هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى" اور یہاں پر ایک اندھے خاکسار فقیر کو خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور لائے اور اس کی خاطر داری کا حکم ہوا، اور ثروت والوں کی طرف توجہ کرنے پر عتاب ہوا۔

وہاں پر حضرت موسیٰ علیہ السلام آرزومند نظر آتے ہیں کہ فرماتے ہیں "هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى"

اور یہاں خود حق جل شانہ آرزو فرمارہے ہیں کہ فرمایا "لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰى"

اس بادشاہ کو طغیان وسرکشی کے ساتھ متصف فرمایا، اور اس فقیر کو خوف وخشیت کے ساتھ، وہ بادشاہ اپنی جگہ تھا اور پیغمبر کو حکم ہوا اس کے پاس جاؤ "اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ" اور یہاں پر فقیر خود دوڑا چلا آرہا ہے "اَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى" تاکہ معلوم ہو کہ کاروبارِ انبیاء تو سراسر تابعداری اور فرمانبرداری ہی ہے، جس طرح ارشاد ہوتا ہے ویسے ہی عمل کرتے ہیں، اگر اغنیاء وسرکشوں کی ملاقات کا حکم ہوتا ہے تو بسروچشم، اور اگر فقیروں، خاکساروں کی تعظیم وتوقیر کا حکم ہوتا ہے تو علی الرأس والعین، نہ فقیروں کی

فرمانبرداری وتابعداری سے خوشدل ہوں (بہت زیادہ) اور نہ متکبروں کی جباری وسرکشی سے تنگدل۔

فرعون کو دیکھئے کس صفت سے موصوف ہوا کہ "ثُمَّ اَدْبَرَ یَسْعٰی" پھر پیٹھ پھیر کر راہِ حق سے بھاگتا تھا، اِدھر اس مسکین نابینا پر غور کیجئے کہ کس طرح آتا ہے، "جَآءَکَ یَسْعٰی" یعنی حق کی طرف منہ کر کے دوڑتا ہے۔

سوم

دونوں صورتوں میں قیامت کے احوال ایک ہی انداز سے مذکور ہیں، اُس سورہ میں ہے "فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْکُبْرٰی ○ یَوْمَ یَتَذَکَّرُ الْاِنْسَانُ مَاسَعٰی" الی آخرہ اور اس سورہ میں ہے "فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ ، یَوْمَ یَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِیْهِ" الخ

چہارم

آدمی کی پیدائش اور اس کے درست رکھنے کے بارے میں ان دونوں سورتوں میں جن نعمتوں کو شمار کیا گیا ہے ان میں مناسبت اتنی قریب ہے کہ گویا دونوں ایک ہی ہیں۔ اُس سورہ میں فرمایا "اَخْرَجَ مِنْهَا مَاءَهَا وَ مَرْعٰهَا" اور اِس سورہ میں فرمایا "وَّفَاکِهَةً وَّ اَبًّا ○ مَّتَاعًا لَّکُمْ وَلِاَنْعَامِکُمْ" اور اُس سورہ میں آسمان زمین، دن رات اور پہاڑوں کی پیدائش کو ذکر فرمایا اور اِس سورۃ میں آدمی کی پیدائش نطفے سے لے کر تا دمِ مرگ ذکر فرمائی ہے۔

شانِ نزول

شانِ نزول سے پہلے بطور تمہید کے ایک مقدمہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے جن محبوب بندوں کو ہدایت وارشاد کے لئے چُن لیا ہے، ان کے درمیان اور دوسرے لوگوں کے درمیان جنسیت کے اعتبار سے اوصافِ بشریت اور صفاتِ نفس میں کوئی فرق نہیں ہے۔ فرق صرف اس جہت سے ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے محبوبوں کی خود تربیت فرماتے ہیں، اور اگر کبھی بتقاضائے جبلتِ بشری ان سے کوئی صفت نفس کی صفات سے ظاہر ہوتی ہے، اور کوئی ایسی حرکت سرزد ہو جاتی ہے جو نورِ حق سے حجاب کا سبب ہوتی ہے، تو اللہ تعالیٰ فوراً تادیب وعتاب فرما کر اس کا تدارک فرما دیتے ہیں، چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کی طرف اشارہ فرمایا ہے، فرماتے ہیں:

"اَدّبنی ربیّ فاحسن تادیبی وعلمنی فاحسن تعلیمی"

(یہ تربیت اللہ تعالیٰ کی جانب سے جاری رہتی ہے) یہاں تک کہ اوّل ان حضرات کو تخلق باخلاقِ الٰہیہ حاصل ہو جائے جو مرتبۂ وصول اور فنائے نفس کے لئے لازم ہے، اس کے بعد ان اخلاق کی تحقیق میسر ہو جو مرتبۂ بقاء کے تابع ہے، اور اس حالت کو حالتِ استقلال و تمکین کہتے ہیں۔

لہٰذا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی سے اس طرح کے کسی فعل کا صادر ہونا ان کے منصب و مرتبے کے منافی نہیں ہے بلکہ اس طرح کی کسی بات پر اللہ کی طرف سے تادیب و عتاب عین دلیل ہے آپ کے منصب و مرتبۂ عظیم کی۔

جب یہ تمہیدی مقدمہ مکمل ہوا تو اب یہ سنیئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن مسجدِ حرام میں تشریف فرما تھے (ہجرت سے پہلے) اور اس وقت آپ کے پاس بڑے بڑے سردارانِ قریش، عتبہ، ربیعہ، ابوجہل، عباس اور دوسرے سردار بیٹھے تھے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کو دینِ اسلام کی خوبی اور بت پرستی کی برائی سمجھا رہے تھے، اور کمال توجہ کے ساتھ ان کے ساتھ باتوں میں مشغول تھے کہ اتنے میں ایک نابینا صحابی عبداللہ بن شریح ابن مالک بن ربیعہ زہری جن کو ابن اُمِ مکتوم بھی کہتے تھے (مکتوم عربی میں اندھے کو کہتے ہیں اس لئے ان کی ماں کو اُمِ مکتوم کہتے تھے) وہ آ گئے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت ان کے آنے سے ناخوش ہوئے کہ یہ نابینا آدمی ہیں، مجلس کے رنگ ڈھنگ کو جانیں گے نہیں، بے موقعہ بات کریں گے، بات کے درمیان میں بات کر بیٹھیں گے، جس سے میری ان سرداروں سے دعوتِ اسلام کے سلسلے میں ہونے والی گفتگو نا تمام رہ جائے گی، چنانچہ وہی ہوا، آتے ہی کہنے لگے، میری طرف توجہ فرمائیں اور کلام اللہ کی فلاں فلاں سورت سکھائیں، میں بڑی محنت و مشقت سے پوچھتا پوچھتا آپ تک پہنچا ہوں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سرداروں کی خاطر داری کی وجہ سے کوئی جواب نہ دیا اتنا فرمایا ذرا ٹھہرو، وہ نابینا تھوڑی دیر تو ٹھہرے رہے پھر اسی طرح کہنے لگے، جب کئی بار اس طرح ہوا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کی اس حرکت سے جو ان سرداروں کے لئے بھی رنجش و تنگدلی کا باعث تھی چیں بجبیں ہوئے، اور چہرے پر خفگی کے آثار نمودار ہو گئے، اور آپ نے اپنا رُخ نابینا سے دوسری طرف پھیر دیا، بس اسی حال میں یہ سورت اتری، اور اس معاملے پر سخت خفگی اتری، روایت میں ہے کہ جوں جوں نبی

کریم صلی اللہ علیہ وسلم جبرئیل امین سے یہ آیات سنتے جاتے تھے خوف سے آپ ، کے چہرۂ انور کا رنگ زرد ہوتا جاتا تھا، یہاں تک کہ جب "کلا انھا تذکرۃ" جبرئیل امین کی زبان سے سنی تو خوش ہو گئے، دل سے خوف کم ہوا اور رنگ مبارک ٹھکانے آیا، سمجھے کہ یہ خفگی فقط نصیحت کے لئے مہربانی وعنایت کے طور پر ہے غضب کے طور پر نہیں ہے، اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان نابینا صحابی کے گھر گئے، ان سے معذرت کی اور ساتھ لے کر اپنے گھر تشریف لائے، چادر بچھائی اور ان کو اس پر بٹھایا، اس کے بعد جب بھی یہ صحابی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں حاضر ہوتے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی نہایت تعظیم فرماتے اور فرماتے "مرحبًا بمن عاتبنی فیہ ربی" خوش آمدید آپ وہی شخص ہیں جن کے بارے میں میرے رب نے مجھے عتاب فرمایا، اور جب دیکھتے تو فرماتے آپ کی کوئی حاجت یا کام ہو تو کہیں، اور دوبار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو سفر پر جاتے ہوئے مدینہ میں اپنا نائب بنایا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ان نابینا صحابی کا ایک عجیب حال مروی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ جنگِ قادسیہ میں، میں نے ان کو دیکھا زرہ پہنے ہوئے تازی گھوڑے پر سوار آگے آگے ہیں ان کے آگے ایک سیاہ پرچم ہے اور باوجود نابینا ہونے کے کفار کی صفوں پر حملے کرتے ہیں۔

یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی فقیر سے کبھی چیں بجبیں نہیں ہوئے اور نہ کسی دولت مند کی خوشامد فرمائی۔

عتاب کے متعلق مفسرین کا اشکال

مفسرین کو عتاب کے معاملے میں بڑا اشکال ہوا ہے اس لئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس معاملے میں قواعد شرعیہ کے خلاف کوئی عمل نہیں ہوا اس لئے کہ شریعت کا قاعدہ ہے کہ نفعِ عام مقدم ہے نفعِ خاص پر، لہٰذا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سرداروں کو اسلام کی طرف دعوت دینے کو مقدم رکھا نابینا کو قرآن سکھانے پر اس لئے کہ ان لوگوں کے اسلام لانے میں سارے شہر مکہ کے اسلام قبول کرنے کی توقع تھی، کہ "الناس علی دین ملوکھم" اور تعلیم قرآن سے خاص نابینا کو ہی فائدہ تھا، دوسرے اسلام کی دعوت قرآن کی تعلیم پر مقدم ہے، اس لئے کہ وہ اصل ہے اور یہ فرع ہے، نیز فقہاء کے ہاں یہ طے شدہ بات ہے کہ اگر ایک شخص اسلام قبول کرنے کے لئے آئے اور دوسرا قرآن کی تعلیم

حاصل کرنے کے لئے تو اس وقت اسلام کی تلقین تعلیم قرآن پر مقدم ہے، کیونکہ اس میں دیر کرنے میں بڑے نقصان کا اندیشہ ہے چونکہ کافر روحانی مرض میں مبتلا ہے جو سرسام کی طرح ہے کہ ذرا سی غفلت کرنے سے وہ علاج کے درجے سے نکل جائے گا، اور جو شخص شریعت کے مسائل یا قرآن پڑھنا چاہتا ہے وہ اس مریض کی طرح ہے جس کا مرض زیادہ خطرناک نہیں اس کا آہستہ آہستہ علاج ہوسکتا ہے۔

اسی طرح اس واقعے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو ترشروئی ظاہر ہوئی وہ دو وجہ سے مواخذے کے قابل نہیں، اوّل تو اس لئے کہ یہ تغیر غیر اختیاری ہے اختیاری نہیں اور غیر اختیاری کاموں کا مکلف بنانا تکلیف مالا یطاق ہے۔

دوسرے اس لئے کہ نابینا کے سامنے ترشرو ہونا یا خوش رو ہونا، متوجہ ہونا یا چہرہ پھیر دینا سب برابر ہے، اس لئے کہ وہ دیکھتا ہی نہیں کہ ترشروئی سے اس کو رنج ہو، نیز ان سب باتوں کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس عمل کا اللہ کے نزدیک ناپسند ہونا معلوم ہی نہ تھا اس لئے کہ ابھی تک اس فعل کی ممانعت نازل نہیں ہوئی تھی، پھر ابتدائے نہی میں اس قدر خفگی کا کیا محل تھا؟

اشکال کا جواب

ان کے اشکال کا جواب یہ ہے کہ ۔

کارِ پاکاں را قیاس از خود مگیر
گرچہ ماند در نوشتن شیر و شِیر

اگرچہ چہرۂ مبارک کے اس تغیر کو نابینا نہیں دیکھتا تھا مگر دوسرے لوگ تو دیکھ رہے تھے جس سے وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ اغنیاء کی خاطر داری اور فقراء سے بے پرواہی ہو رہی ہے، اس لئے حق تعالیٰ نے اپنے محبوب کے حق میں اتنے توہم کو بھی پسند نہیں کیا اور یہ چاہا کہ میرے محبوب کا ظاہر و باطن میری ہی رضا کی جستجو میں مصروف رہے اور ہرگز کسی کو میرے محبوب کی نسبت ریاء کی تہمت کا گمان بھی نہ ہو۔

اور (اس عتاب سے یہ بتانا بھی مقصود ہے) کہ نفوسِ قدسیہ (جیسے انبیاء) کو چاہئے کہ سیکھنے والے کی استعداد کے موافق فیض و فائدہ پہنچائیں اور انجام پر نظر رکھیں کہ بہت سے فقیر و خاکسار اپنی عالی استعداد کی وجہ سے شمعِ عالم ہوئے ہیں، لہٰذا شاگرد کی قوتِ استعداد کے اعتبار سے نفعِ عام کا امیدوار رہنا چاہئے، اور تابعداروں کی کثرت جو بالفعل اغنیاء کو حاصل ہے اس سے فریب کھانا تو ظاہر بینوں اور

ناواقفوں کا کام ہے، جو نفوس کی استعداد کے مراتب کو نہیں جانتے۔

پھر یہ بات بھی ہے کہ اس نابینا کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضِ صحبت سے فائدہ اُٹھانا یقینی امر ہے، جبکہ ان سرداروں کا اسلام قبول کرنا پھر ان کی تابعداری میں پورے شہر کا مسلمان ہو جانا ایک امرِ موہوم ہے، لہٰذا موہوم بات کو یقینی بات پر ترجیح نہیں دی جاسکتی۔

اور حقیقت یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسے کرنا ذرا بھی شریعت کے خلاف نہیں لیکن اللہ تعالیٰ اپنے محبوبوں سے فقط گناہ سے بچنے پر اکتفا نہیں چاہتے بلکہ ان سے تخلق باخلاق الٰہی چاہتے ہیں جیسے اگر کوئی (باوضع) باپ اپنے بیٹے سے اپنی وضع کے خلاف کوئی بات دیکھتا ہے اگرچہ وہ جائز ہو پھر بھی غصہ کرتا ہے، چنانچہ بادشاہ اپنے بیٹوں سے یہ پسند نہیں کرتا کہ وہ صلحاء و مشائخ کی طرح مسجد میں معتکف ہوں یا گوشہ نشینی اختیار کرلیں، اسی طرح مشائخ و صلحاء یہ نہیں چاہتے کہ ہماری اولاد سپاہیوں یا نوکر پیشہ لوگوں کی طرح تلاش معاش میں مشغول ہوں گو کہ حلال طریقے سے ہی ہو، علیٰ ہذا القیاس

پس یہ عتاب وخطاب کسی گناہ یا تقصیر پر نہیں ہے بلکہ یہ تو ایسا ہے جیسے والدین اپنی اولاد کی تربیت میں کرتے ہیں۔

وجہ تسمیہ

اس سورت کا نام ''عبس'' رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں اس واقعے کی یاد ہے جب وہ ذات پاک اپنے عظیم القدر نبی سے اس بنا پر خفا ہوئی کہ انہوں نے اپنے ادنیٰ شاگرد سے منہ پھیرا اور امیروں کی طرف متوجہ ہوئے ان کی اس ادا کو ہی اس سورت کا نام رکھ دیا تا کہ مدتوں تک اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت و مہربانی شاگردوں اور طالب علموں پر ہر مسلمان بالخصوص مرشدوں اور معلموں کے پیشِ نظر رہے، تاکہ اس سورت کا نام سنتے ہی وہ قصہ یاد آجائے اور اس سے عبرت پکڑیں۔

یہ بھی ہے کہ اس پیغمبر کی کمال محبوبیت حضور خداوندی میں ثابت ہو، کہ ان کے چہرے کا اتنا تغیر بھی اتنا شاق جانا کہ بار بار پڑھنے والوں کی زبان سے یاد فرماتے اور خبر دیتے ہیں، اور اس قصہ کو شروع ہی ایسی طرح کیا ہے جیسے عاشقِ شیداء اپنے محبوب کے معاملۂ نامرغوب کو شاق جان کر اس کا وقت، جگہ اور پتہ بھی اس معاملے کے ساتھ بتاتا ہے۔

تمت المقدمہ والحمدللہ

تفسیر سورۂ عَبَسَ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عَبَسَ وَتَوَلّٰی ۝ اَنْ جَآءَہُ الْاَعْمٰی ۝

تیوری چڑھائی اور منہ موڑا ۝ اس بات سے کہ آیا اُس کے پاس اندھا

فرمایا عبس :۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے تیوری چڑھائی اور اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ "وتولی" اور منہ موڑا "ان جاءہ الاعمی" اس بات سے کہ ان کے پاس اندھا آیا۔

اندھے کے واقعے کے ذکر کی وجہ میں مفسرین کا اختلاف

اس بارے میں مفسرین کا اختلاف ہے کہ اس جگہ نابینا کے آنے کا ذکر کس وجہ سے کیا گیا ہے؟

پہلا قول :۔ بعض کہتے ہیں کہ محض بیان واقعے کے لئے ہے۔

دوسرا قول :۔ بعض کہتے ہیں کہ زیادتِ عتاب کے لئے اندھے کے آنے کا ذکر کیا، کہ ہم نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو رحمۃ للعالمین بنایا ہے، اور رحمت کے زیادہ لائق تو کمزور، ضعیف، فقیر اور اندھے ہیں، اندھے شاگرد رہنمائی کے زیادہ مستحق ہیں اس قسم کے لوگوں سے منہ موڑنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتبے سے نہایت بعید ہے۔ اس کی مثال تو ایسی ہوئی کہ کوئی اپنے خادم سے کہے کہ راستہ بھول جانے والوں کو راستہ بتانا، وہ خادم دیکھنے بھالنے والوں کو تو راستہ بتائے لیکن اندھے نابینوں کی طرف توجہ ہی نہ کرے۔

تیسرا قول :۔ بعض نے کہا ہے کہ کمال خفگی کی وجہ سے اس کلام میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب بھی نہ فرمایا کیونکہ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حق کی مرضی سے غائب ہو گئے تھے اگرچہ (وہ غیبوبت بھی اس وجہ سے تھی کہ) اس کے بندوں کو اسی کی طرف دعوت دے رہے تھے لیکن حضرت حق سے غائب کے حکم میں قرار پائے، اس لئے کہ اس وقت حضرتِ حق کے طالبین کے مطلب سے غفلت ہو گئی تھی، اور غائب خطاب کے لائق نہیں ہوتا، پھر جو گلہ شکوہ شروع کیا تو اچھی طرح دھمکانے کے لئے خطاب فرمایا، جیسے کوئی شخص اپنے مجرم غلام کی شکایت پہلے لوگوں کے سامنے کرتا ہے

اور کمال خفگی کی وجہ سے اس کو مخاطب نہیں کرتا پھر شکایت کرتے کرتے جب جوش میں آتا ہے تو اس غلام کو مخاطب کر لیتا ہے، اور چونکہ یہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کوئی دوسرا مخاطب نہیں تھا کہ ان کی شکایت اس کے سامنے بیان فرماتے اس لئے اوّل ان کی شکایت انہی سے غائب کے صیغے سے بیان فرمائی پھر عتاب آمیز خطاب شروع کیا تاکہ اس انداز سے شدتِ خفگی کی طرف اشارہ ہو۔

محققین کا قول

محققین کہتے ہیں کہ اس قصے کا یہاں لانا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے عذر بیان کرنے کی تمہید ہے، اور یہ نہایت ہی رحمت ومحبت کی بات ہے کہ عین عتاب کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا عذر بیان فرماتے ہیں جیسے کوئی شفیق باپ اپنے بیٹے کی نامناسب بات کی شکایت کرتا ہے اور عین اس شکایت کے وقت اس کا عذر بھی بیان کرتا جاتا ہے تاکہ لوگ یہ سمجھ لیں کہ یہ لڑکا ناراضگی کے قابل نہیں ہے، لیکن یہ شفقتِ پدری کا کمال ہے کہ بیٹے کے حق میں اتنی سی بات کے لئے بھی راضی نہیں ہے، وہ چاہتا ہے کہ اس کی تربیت درجۂ کمال کو پہنچ جائے، اتنی سی بات بھی اس میں نہ رہے۔

عذر کی وجہ یہ ہے کہ گویا یوں ارشاد ہوتا ہے کہ اس پیغمبر کے اخلاق اصلاً اس بات کا تقاضا نہیں کرتے کہ یہ ایسے فقیروں محتاجوں کو جو حق کے طالب اور دین کے راستے کے متلاشی ہیں ان سے اس طرح پیش آئے، لیکن جب اُن کو اس سے ناگوار بات پہنچی تو انہوں نے یہ سمجھا کہ یہ نابینا آدمی ہے یہ ترشروئی یا خندہ پیشانی میں امتیاز نہیں کرسکتا اس لئے اس کی بے جا حرکتوں سے تیوری چڑھائی اور منہ موڑا، طبیعت پر جبر کر کے اپنے آپ کو اس فعل سے نہیں روکا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے کمال رحمت وعنایت کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر حذف کر کے فعل غائب کے صیغہ کو بغیر فاعل کے ذکر کیا تاکہ محبوب کی طرف اس فعل کی تصریح نہ ہو، اور یوں ارشاد ہوتا ہے کہ ''تیوری چڑھائی اور منہ موڑا ایک تیوری چڑھانے والے اور منہ موڑنے والے نے'' اگر خطاب کا صیغہ لاتے تو محبوب کی طرف اس فعل کی نسبت صراحتاً ہوتی اور یہ کمال رحمت وشفقت کے خلاف ہے، عین شکایت وعتاب کے دوران بھی لطف ومحبت کی رعایت کئے چلے جا رہے ہیں۔

اور بعض نے کہا کہ اندھے کی تعلیم مشکل ہے چونکہ وہ فقط یاد کرنے پر ہی اکتفا کرتا ہے، لکھی ہوئی چیز کی طرف مراجعت اس سے ممکن نہیں، لہٰذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے عذر اس طرح بیان

ہوا کہ آپؐ نے اس اندھے کو کم استعداد جان کر اس سے منہ پھیرا اس لئے آپ معذور ہیں لیکن درحقیقت آنکھوں کا اندھا پن منہ پھیرنے کا سبب نہیں دل کا اندھا پن منہ پھیرنے کا سبب ہونا چاہئے، اور وہ امیر و سردار سب دل کے اندھے تھے لہٰذا آپ کے لئے مناسب تو یہ تھا کہ ان سے منہ پھیرتے نہ کہ اس آنکھوں کے اندھے سے کیونکہ دل کا بینا ہے۔

وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهُ يَزَّكَّىٰ ○

اور تجھ کو کیا خبر ہے شاید کہ وہ سنورتا

یعنی آپ کو کیا معلوم شاید وہ اندھا پاک ہوجائے، اور اس کے دل کا آئینہ ایسا صاف ہوجائے کہ یہ آنکھوں والے امور غیبیہ، کشفیہ میں سے جو کچھ نہیں دیکھ سکتے وہ دیکھے، اور ایک عالم کا مقتدا ہوجائے، اندھا ہونے کے باوجود ہزاروں آنکھوں والوں سے بہتر ہوجائے، اسی لئے کہا گیا ہے ؎

فدائے کوری خفاش چشم بینائے
کہ بے خبر ز رخ آفتاب نیم شی است

اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرَىٰ ○

یا سوچتا تو کام آتا اُس کے سمجھانا

یعنی اگرچہ قلب صیقل کے مرتبے کو نہ پہنچے لیکن قرآن کے معانی، امر و نہی اس کے دل میں اس طرح پختہ ہوجائیں کہ وہم و خیال کی آمیزش اس میں نہ رہے۔

پس نصیحت پکڑنا اس کو نفع دے جس کی وجہ سے دین کی عمدہ عمدہ منفعتیں حاصل کرے، ضرر پہنچانے والی چیزوں سے اپنے کو بچائے، اس کا لطیفۂ عقل روشن ہوکر عالمِ ربانی بن جائے اور ہزاروں آنکھوں والوں سے بہتر ہوجائے جیسا کہ شقِ اوّل (تزکیہ) میں اس کا لطیفۂ قلب صاف ہوکر اس کو صاحب عرفان اور صاحب کشف ولی کا مرتبہ حاصل ہوسکتا ہے۔

"یَزَّکّٰی" اور "یَذَّکَّرُ" کے درمیان کلمۂ "اَوْ" لانے کی وجہ

چونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے دیکھنے والوں کو اس اندھے کے بارے میں دونوں شقوں (تزکیہ یا تذکر) میں سے کسی ایک کا یقینی طور پر حاصل ہونا معلوم نہیں تھا اس لئے کلمۂ "اَوْ"

لائے جو شک اور مانعۃ الخلو پر دلالت کرتا ہے، لیکن اس نابینا کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے فیض حاصل کرنے کا کمال شوق و کثرتِ حرص، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے انسیت اور قرآن کریم کی تلاوت، اس کے معانی کے اندر غور و تأمل سے اس قدر سب کو یقین تھا کہ یہ ضرور کچھ نہ کچھ بن کے رہے گا، دونوں مرتبوں سے بالکل محروم نہ ہوگا۔

صاحب کشاف بھی "اَوْ" کے مدلول پر متنبہ ہو کر اپنی تفسیر میں اس بات کو بطور سوال لایا ہے (سوال یہ اٹھایا) پاک ہونے سے زیادہ نصیحت کا کون سا نفع متوقع ہے (کہ نصیحت سے نفع اٹھانے کو تزکیہ پر تشکیک کے ساتھ لائے)

جواب یہ لکھا ہے کہ تزکیہ نام ہے تقویٰ اور گناہوں سے بچنے کا، اور تذکر (نصیحت کا نفع کرنا) نام ہے طاعات کے بجالانے کا اور طاعات سے ثواب کی امید ہے اور ثواب دائمی منفعت ہے، (لہٰذا دو الگ الگ چیزیں ہوئیں)

ایک اور اعتراض اور اس کا جواب

لیکن یہاں ایک اور اعتراض ہوتا ہے کہ علم حاصل ہو جانے سے یہ دونوں چیزیں حاصل ہو جاتیں ہیں، گناہوں سے بچنا بھی اور عملِ طاعت کا کرنا بھی، لہٰذا یہ "واو" کا مقام تھا "اَوْ" کا نہ تھا۔

اس اعتراض کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ طالب علم کو یقینی طور پر معلوم نہیں کہ وہ کیا سنے گا اگر نہی سنے گا تو گناہ سے باز رہے گا، امر سُنے گا تو طاعت میں اضافہ کرے گا اور اگر دونوں سُنے گا تو دونوں کام کرے گا لہٰذا یہاں اَوْ کو مانعۃ الخلو کے طور پر لائے نہ کہ مانعۃ الجمع کے طور پر، یہ ایک توجیہ ہے اور حق بات وہی ہے جو اولاً مذکور ہوئی۔

اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ۝

وہ جو پروا نہیں کرتا

یعنی جو شخص آپ کے ارشاد اور آپ کی راہ سے بے پرواہی کرتا ہے اور اپنے مال و جاہ پر ریجھ رہا ہے۔

فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ۝

سو تو اُس کی فکر میں ہے

یعنی آپ اس کی ہدایت کے درپے ہیں اور شوقین شاگردوں سے منہ موڑتے ہیں، اس خیال سے

کہ جو بے پرواہ ہے اس کو اس راہ کا طالب اور شوقین کرنا چاہئے، اور جو طالب شوقین ہے اس کے لئے تو شوق ہی راہبر ہے وہ آخر کار اپنے مقصد کو حاصل کر لے گا۔

وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى ○

اور تجھ پر کچھ الزام نہیں کہ وہ نہیں درست ہوتا

یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی الزام نہیں کہ وہ لا پرواہ پاک کیوں نہ ہوا کیونکہ آپ کا کام تو احکامِ الٰہی کا پہنچانا، مستعد اور شوقین لوگوں کی تربیت کرنا ہے سو یہ بات آپ کو حاصل ہے چاہے یہ لا پرواہ لوگ قبول کریں یا نہ کریں۔

وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى ○

اور وہ جو آیا تیرے پاس دوڑتا

یعنی جو شخص محنت کے ساتھ آپ کے پاس دوڑا آتا ہے، جیسا کہ یہ نابینا ہے کہ ہاتھ پکڑنے والا بھی نہیں رکھتا، اور ٹھوکریں کھاتا ہوا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا تھا۔

وَهُوَ يَخْشٰى ○

اور وہ ڈرتا ہے

یعنی اول تو خدائے تعالیٰ سے ڈرتا ہے کہ کہیں اللہ تعالیٰ کی مرضیات سے دور نہ ہو جائے اور منہیات میں مبتلا نہ ہو جائے، اور یہی خوف اس کے لئے علم حاصل کرنے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں پہنچنے کے شوق کا سبب ہے، پھر راستے میں کافروں کی ایذاء رسانی سے بھی ڈرتا ہے کہ مبادا ان کو اطلاع ہو جائے اور وہ تکلیف دیں، اور گرنے ٹھوکر کھانے سے بھی نہیں ڈرتا، پھر آپ کے پاس جب حاضر ہوتا ہے تو اپنے سبق کے فوت ہو جانے سے بھی ڈرتا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کہیں مشغول ہوں اور میں استفادے سے محروم ہو جاؤں۔

فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى ○

سو تو اُس سے تغافل کرتا ہے

یعنی پھر آپ اس سے منہ پھیر کر دوسروں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور اس کے حال کی طرف متوجہ

نہیں ہوتے گویا کلی فائدہ آپ اسی میں دیکھتے ہیں کہ بے پرواہوں اور بھاگنے والوں کو تابعدار بنائیں، اور ہدایت کی طرف لائیں، اور مشتاقین، سچے طالبین کو تاخیر سے کمال شوق میں مضطرب رکھیں۔

کَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۝

یوں نہیں یہ تو نصیحت ہے

یعنی یہ آیاتِ قرآنی اللہ تعالیٰ اور اس کے اسماء، اس کی صفات، افعال، احکام اور ان کی جزاؤں کے یاد کرنے کے واسطے ہیں، تاکہ لوگوں کے لئے معرفت، عبادت، محبت، خوف اور رجاء کی راہ کھل جائے اور اللہ کی اس راہ پر چلنا اختیار کریں، اس بات میں التجاء اور منت وزاری مفید نہیں بلکہ (طالب کے) دل کے اختیار اور اس کی طبیعت کی رغبت درکار ہے۔

فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ۝

پھر جو کوئی چاہے اُس کو پڑھے

یعنی جو شخص سچی طلب رکھتا ہے وہ اس قرآن کو پڑھے، کہ حقیقت میں یہ ذکر اللہ ہے، اور ذکر الٰہی بغیر دل کی رغبت اور صدقِ ارادت کے مفید نہیں ہوتا۔

"اِنَّهَا" میں ضمیر مؤنث اور "ذَكَرَهٗ" میں مذکر لانے کی وجہ

"اِنَّهَا" میں ضمیر مؤنث، "ذَكَرَهٗ" میں مذکر ہے حالانکہ مرجع دونوں کا ایک ہے یعنی "قرآن" وجہ اس کی یہ ہے کہ قرآن کا تذکرہ ہونا آیتوں اور سورتوں کے اعتبار سے ہے، ہر ایک آیت الگ الگ مضمون رکھتی ہے بعض میں اسماء وصفات کا بیان ہے، بعض میں احکام وشرائع کا، اور بعض میں وعدہ و وعید ہے۔

اور قرآن کا "ذکر" ہونا اس کی وحدانیت کے اعتبار سے ہے کہ تمام قرآن اس میں برابر ہے، اس کے "ذکر" ہونے میں مضامین کے اختلاف کا کچھ دخل نہیں، اس لئے کہ کوئی سا مضمون ہو سب کلام الٰہی ہے، (حاصل یہ ہوا کہ ھا مؤنث کی ضمیر آیات وسورت کے لحاظ سے ہے اور ذکرہ کی مذکر ضمیر قرآن واحد مذکر کے لحاظ سے ہے)

کلام اللہ کے افضل الذکر ہونے کی عجیب توجیہ

نام کا اتصال جتنا مسمّٰی سے ہوتا ہے، کلام کا اتصال متکلم کے ساتھ اس کی نسبت اقوی واشد ہے اور جو التفات و توجہ کسی کا نام لیتے وقت اس کی طرف ہوتی ہے وہ اس سے بہت کم ہے جو توجہ اس کا کلام پڑھتے وقت اس کی طرف ہوتی ہے، چنانچہ یہ بات تجربہ سے ثابت ہے نیز کسی بھی شخص کا کلام اس کی ذات کی علامات ونشانات میں ایک بہترین علامت ونشان ہے (جس سے اس کی ذات کی یاد تازہ رہتی ہے) چنانچہ کلام پڑھتے ہوئے اس کی ذات دل پر روشن ہو جاتی ہے، اسی لئے بزرگوں کا نام لینے کے مقابلے میں ان کا کلام زیادہ دل پر اثر کرتا ہے اسی وجہ سے حدیث میں کلام اللہ کے متعلق آیا ہے "**هو حبل الله المتين**" (وہ اللہ کی مضبوط رسی ہے) اور امام جعفر صادق رحمہ اللہ نے فرمایا "**تجلى الله لعباده في كلامه ولكنهم لا يبصرون**" (اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے اپنے کلام میں اپنی تجلی ظاہر کی ہے لیکن لوگ اس کو نہیں دیکھتے)

ایک شبہے کا جواب

(آنے والی آیت ایک شبہے کا دفعیہ کرتی ہے) اگر کسی کے دل میں یہ شبہہ گذرے کہ جب دنیاوی لحاظ سے بڑے لوگ، سرمایہ دار، سردار اور دولتمند جب کسی کتاب، یا کلام وغیرہ کی طرف شوق کرنے لگتے ہیں تو اس کی عزت وقدر لوگوں میں بڑھ جاتی ہے، پھر اس کتاب کو لکھنے والے (چھاپنے والے) اس کو بہت عمدہ کاغذ، عمدہ کتابت، اور قیمتی جلد میں مجلد کرتے، بلکہ اس کو سنہری حروف میں لکھتے ہیں (چونکہ اس کی قدر واہمیت بڑھ جاتی ہے) اس طرح اس کلام کا مرتبہ بڑھ جاتا ہے اور اس کی عظمت لوگوں کے دلوں میں زیادہ ہو جاتی ہے، جیسے دلچسپ شعر اگر خوش آوازی سے پڑھا جائے تو زیادہ اثر کرتا ہے لیکن جلدی جلدی پڑھ لیا جائے تو وہ اثر اس کا نہیں ہوتا۔

لہٰذا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی امراء وسرداروں کو دعوت دینے میں مشغول تھے اور اس وقت فقراء سے انہوں نے منہ پھیرا تو یہی وجہ ہوگی، (لہٰذا اس پر عتاب نہ ہونا چاہئے تھا)

ہم کہتے ہیں کہ یہ قرآن اس قسم کا نہیں کہ ان چیزوں سے اس کی عزت وقدر میں اضافہ ہو، بلکہ اس کی عزت وقدر اس اعتبار سے دیکھنی چاہئے کہ کہاں سے یہ نازل ہو رہا ہے، چنانچہ فرمایا:

فِیْ صُحُفٍ مُّکَرَّمَۃٍ ۝

لکھا ہے عزت کے ورقوں میں

یعنی قرآن کی آیات عزت والے اوراق میں لکھی گئی ہیں یعنی حق تعالیٰ نے خود انکی عظمت بڑھائی ہے،

مَّرْفُوْعَۃٍ

اونچے رکھے ہوئے

یعنی وہ صحیفے اونچے رکھے گئے ہیں، ''بیت العزت'' کے اندر، بیت العزت آسمانِ دنیا میں ایک مقام ہے جہاں سب سے پہلے قرآن کریم لوحِ محفوظ سے نقل کرا کر رکھا گیا، وہاں سے تھوڑا تھوڑا نازل ہوتا رہا۔

مُّطَهَّرَۃٍ ۝

نہایت ستھرے

یعنی وہ صحیفے تمام گندگیوں اور آلودگیوں سے پاک کئے گئے ہیں، اگر دنیا کے سردار و دولتمند لوگ قرآن کی آیتوں کو طلائی اور حریری کاغذ پر لکھوا دیں، ایسے ہی رحلوں اور صندوقوں پر رکھ دیں تب بھی قرآن اس عظمت و بلندی کے مرتبہ کو نہ پا سکے گا، اسی طرح اگر دنیا والے اس کو عطر و خوشبو میں ڈبو دیں اور نجاستوں سے دور رکھیں تب بھی وہ پاکیزگی کے اس درجہ کو نہیں پہنچے گا، اس لئے کہ وہاں کوئی گنہگار ہاتھ اس تک نہیں پہنچتا بلکہ وہ اوراق:

بِاَیْدِیْ سَفَرَۃٍ ۝ کِرَامٍ بَرَرَۃٍ ۝

ہاتھوں میں لکھنے والوں کے جو بڑے درجے والے نیک کار ہیں

یعنی وہ صحیفے ایسے ہاتھوں کو سونپے گئے ہیں کہ وہ ہاتھ لکھنے والے بڑی قدر والے نیکوکار ہیں، ان سے نیکی کے سوا کبھی کسی اور بات کا ظہور نہیں ہوتا، جبکہ دنیا کے لکھنے والے گناہوں اور ذاتی خباثتوں سے آلودہ ہیں اگرچہ اپنا ظاہر وہ آراستہ رکھیں اس سے کیا حاصل، لہٰذا قرآن کے بارے میں دنیاداروں کی رغبت، ان سے عزت و قدر کی توقع رکھنا بے جا ہے (اول تو اس کی ضرورت ہی نہیں اور توقع بھی نہیں ہے) بلکہ دنیادار لوگ اگر اس کی قدر کریں تو غنیمت ہے کیونکہ انسان کے مزاج میں کُفرانِ نعمت ہے،

چنانچہ فرمایا:

قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ ○

مارا جائیو آدمی کیسا ناشکرا ہے

یعنی ہلاک ہو انسان کیسا ناشکرا ہے، کہ جس نے اس عظیم القدر کلام سے اس کو نوازا اس کے اندر طرح طرح کی ہدایات وارشادات اس کے لئے بیان فرمائے مگر اس کو خبر ہی نہیں، اور نہ اس کے حقوق ادا کرتا ہے الٹا اپنے مال وجاہ پر مستغنی و بے نیاز ہوا بیٹھا ہے، بلکہ وہ تو اپنی اصل کی بھی خبر نہیں رکھتا کہ وہ کیا تھا۔

مِنْ اَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ ○

کس چیز سے بنایا اُس کو

یعنی کس حقیر چیز سے اسکو پیدا کیا، اگر انسان اس سوال کا جواب دینے سے شرماتا ہے تو ہم بتادیتے ہیں:

مِنْ نُّطْفَةٍ ۭ خَلَقَهٗ

ایک بوند سے، بنایا اُس کو

یعنی نطفے کی بوند سے اس کو پیدا کیا جو ایک پیشاب کے راستے سے نکلا اور دوسرے پیشاب کے راستے میں چلا گیا، پھر خون اور نجاستوں سے مل کر گوشت کا ٹکڑا بن گیا،

فَقَدَّرَهٗ ○

پھر اندازہ پر رکھا اُس کو

یعنی اس کے اعضاء، ہاتھ، پاؤں، آنکھ، کان، ناک، قد و قامت بھی مقرر کئے اور رزق، زندگی، موت اور نیک و بد عمل بھی اس کے متعین کردیئے اس کے ساتھ ماں کے پیٹ کے اندر رہنے کی مدت بھی نو مہینے یا کم وبیش متعین کی۔

ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ ○

پھر راہ آسان کردی اُس کو

یعنی پھر اس کو نکلنے کا راستہ آسان کردیا، کیونکہ بچہ جب ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے اس کا سر ماں

کے سر کی طرف اور پاؤں ماں کے پاؤں کی طرف ہوتے ہیں، پھر جب پیدا ہونے کا وقت قریب آتا ہے تو اس کو الہام ہوتا ہے وہ فوراً ابھر جاتا ہے اور سر نیچے کی طرف اور پاؤں اوپر کی طرف کر لیتا ہے تا کہ نکلنا آسان ہو جائے، پھر جب ماں کے پیٹ سے باہر آ جاتا ہے تو معاش کی راہ اس کے لئے آسان کر دی جاتی ہے۔

اس طرح کہ ماں کا پستان ہاتھ میں آ جائے تو وہ مضبوطی سے پکڑ کر پینا شروع کر دیتا ہے، اور رونے دھونے سے اپنے بھوکا ہونے کو ظاہر کرتا ہے۔ اسی طرح سال بسال اس کے لئے راہیں آسان کر دی جاتی ہیں یہاں تک کہ وہ درجۂ کمال کو پہنچ جاتا ہے، اور انبیاء کرام کے بھیجنے، کتابوں کے نازل کرنے، شفیق مرشدوں کی صحبت اور محقق علماء کی شاگردی کے ذریعہ سے اس کے لئے اچھی بُری، اور حق و باطل کی راہ میں تمیز آسان کر دی جاتی ہے۔

پھر بعض کے لئے نجات و جنت کی راہ آسان کر دی جاتی ہے وہ اس پر چلنے کی توفیق پاتے ہیں اور بعض کو ہلاکت و دوزخ کی راہ آسان نظر آتی ہے وہ اس پر چل پڑتے ہیں۔ حاصل کلام یہ ہے کہ آخر عمر تک اس کے لئے کمالات کا حاصل کرنا آسان کر دیا جاتا ہے۔

ثُمَّ اَمَاتَهٗ

پھر اُس کو مردہ کیا

پھر اس کو موت دیتا ہے تا کہ دنیا کے اندر کمالات حاصل کرنے کے لئے اس نے جو محنتیں اُٹھائی تھیں ان کا پھل پائے اور عالمِ برزخ میں اپنے اعمال کی نشانیاں دیکھے،

موت ایک نعمت ہے

موت بھی ایک بڑی نعمت ہے کہ تجارت (اُخروی) کا فائدہ اسی (موت کے) سفر کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے ورنہ اگر موت نہ ہوتی تو آدمی ہمیشہ اعمالِ شاقہ کی کش مکش میں گرفتار رہتا اور اپنی مشقت کا پھل نہ پا سکتا، اسی وجہ سے اس مقام پر نعمتوں کو گنتے ہوئے موت کو بھی ذکر کیا ہے چنانچہ بزرگوں سے منقول ہے: "الموت جسر يوصل الحبيب إلى الحبيب" "موت ایسا پل ہے جو ایک دوست کو دوسرے دوست تک پہنچاتا ہے"

بعض مفسرین کا تسامح

بعض ظاہر بین مفسرین کو موت کے نعمت ہونے سے غفلت ہوئی اس لئے انہوں نے یہاں سوال کیا ہے کہ نعمتوں کی گنتی میں موت کو کیوں ذکر کیا گیا ہے؟ پھر اس کا اس طرح جواب دیا ہے کہ بلغاء کے کلام کا مدار اور اس سے فائدہ حاصل کرنے کا مقام اس کلام کا آخر ہوا کرتا ہے، لہٰذا یہاں پر موت کے بعد قبر میں ڈالنے کے حکم کو ذکر فرمایا ہے اور قبر میں ڈالنا دراصل یہ نعمت ہے (اور یہ نعمت موت کے بعد حاصل ہوتی ہے اسلئے موت کو نعمتوں کے شمار میں ذکر کر دیا) اگرچہ موت فی نفسہٖ نعمت نہ ہو، جیسا کہ کوئی شفیق باپ اپنے بیٹے سے اپنی نعمتیں بیان کرتے ہوئے کہے کہ میں نے تیرے ساتھ ایسا ایسا سلوک کیا پھر تو بیمار ہوا تو تیرا علاج کرایا، یہاں حقیقت میں مقصود نعمتِ علاج ہے، لیکن اس کا نعمت ہونا بیمار ہونے پر موقوف ہے اس لئے کلام میں بیماری کا ذکر کرنا پڑا۔ اسی طرح اس آیت میں بھی ہے، اور اسی بات کی طرف اشارہ کرنے کیلئے (یعنی اصل مقصود نعمت اقبار ہے) اماتت اور اقبار کے درمیان "ثم" نہیں لائے "فاء" لائے ہیں چنانچہ فرمایا:

فَاَقْبَرَهٗ ۝

پھر قبر میں رکھوا دیا اُس کو

گویا ارشاد فرماتے ہیں کہ اماتت و اقبار کا مجموعہ نعمتوں میں داخل ہے نہ کہ فرداً فرداً ہر ایک نعمت ہے۔

فائدہ:۔ یہاں پر یہ بھی جان لینا چاہئے کہ قبر میں ڈلوانے کو اِقبار کہتے ہیں اور ڈالنے کو قبر کہتے ہیں کہا جاتا ہے "أقبر الرجل عبده إذا حكم بان يقبر" یعنی "أقبر الرجل عبده" اس وقت کہا جاتا ہے جب آدمی اپنے غلام کی میت کو دفنانے کا حکم دے،" وقبر الرجل عبده إذا ادخله في القبر" اور "قبر الرجل عبده" اس وقت کہا جاتا ہے جب آدمی غلام کی میت کو قبر میں داخل کرے۔

مردوں کو دفنانے کی ابتداء

مردے کو دفنانے کے لئے اللہ تعالیٰ کے حکم کی صورت، اول بار اس طرح واقع ہوئی کہ جب قابیل نے ہابیل کو مار ڈالا تھا تو دنیا میں انسان کے مرنے کا یہ پہلا واقعہ تھا، اس لئے اس کو معلوم نہ تھا کہ وہ اس مردے کا کیا کرے؟ اس لئے وہ اس لاش کو ایک چادر میں باندھ کر اپنے ساتھ لئے پھرتا تھا، جب اس

لاش کو لئے ہوئے پھرتے پھرتے تنگ آ گیا تو ایک جنگل میں غمگین ہو کر بیٹھ گیا، اچانک دو کوّے وہاں آ گئے اور آپس میں لڑنے لگے یہاں تک کہ ایک نے دوسرے کو مار ڈالا، پھر مارنے والے نے اپنے پنجوں اور چونچ کے ذریعہ سے ریت کے اندر ایک گڑھا بنایا اور مرے ہوئے کوّے کو اس میں ڈال کر اس کے اوپر خوب ریت ڈال دی کہ ایک تودہ سا بن گیا۔

اب قابیل کے سمجھ بات آئی کہ مردے کو اسی طرح دفن کرنا چاہئے، چنانچہ اس نے بھی اسی طرح بھائی کی لاش کو دفن کر دیا اور قبر بنا دی۔

پھر جب حضرت آدم علیہ السلام نے وفات پائی تو آسمان سے فرشتے اترے، انہوں نے ان کی اولاد کے سامنے ان کی تجہیز و تکفین کی اور ان کو قبر میں دفن کیا، اسی روز سے یہ طریقہ معمول بن گیا، یہ تعلیمِ الٰہی پہلی بار قابیل کو اس کی استعداد کے قصور کی وجہ سے کوّے کے ذریعے دی گئی، اور دوسری بار حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد کو فرشتوں کے ذریعے تعلیم دی گئی۔

مُردے کو قبر میں دفنانے کی خوبیاں اور جلانے کی برائیاں

مردے کو قبر میں دفنانا، اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں پر بہت بڑی نعمت ہے ورنہ لوگ لاش کو جانوروں کی طرح گھسیٹ کر پھینک دیا کرتے، وہ ادھر ادھر لڑھکتی پھرتی، جب گل سڑ جاتی تو لوگ اس کی بدبُو سے تنگ آتے اور بدگوئیاں کرتے، درندے، پرندے اس کے اعضاء کے جوڑ جوڑ کو گلی کوچے میں لئے پھرتے، الغرض وہ مردار خور اور ناپاک جانوروں کی خوراک بن جاتی، اور ہر ایک کے سامنے اس کے عیب ظاہر ہوتے جس سے لوگوں کی نظر میں مرنے والے کی عزت و توقیر جاتی رہتی، اس میں انسانیت کی نہایت ہی توہین تھی، اللہ تعالیٰ نے انسان کی عزت و تکریم کے لئے غیب سے یہ تعلیم عطا فرمائی۔

اب ہم آتے ہیں اس بات کی طرف کہ ہندو مردے کو جلاتے ہیں دفناتے نہیں اور کہتے ہیں کہ آگ ہر ناپاک کو پاک کرنے والی، ہر بدبُو کو مٹانے والی ہے، سو جو سڑانا چاہتے ہیں، وہ دفن کرتے ہیں لیکن آگ میں جلانا بہتر ہے۔

جواب اس کا یہ ہے کہ آگ خائن ہے جو چیز اس کے حوالے کرو وہ اس کو کھا جاتی ہے، اور زمین امانت دار ہے جو چیز اس میں دفن کی جاتی ہے وہ باقی رہتی ہے، لہٰذا مردے کو خائن کے سپرد کرنے سے بہتر ہے زمین کے اندر رکھا جائے، اسی لئے انسانوں بلکہ جانوروں تک کی یہ عادت ہے کہ جس چیز کو

محفوظ رکھنا چاہیں اس کو زمین میں دفن کر دیتے ہیں جیسے مال، خزانہ وغیرہ، اور جس چیز کو نیست و نابود کرنا چاہیں اس کو آگ میں جھونک دیتے ہیں۔

دفنانے کے افضل ہونے کی دوسری وجہ

انسانوں کو دوبارہ اٹھنے اور ارواح کا اپنے چھوڑے ہوئے اجسام میں واپس آنے کا انتظار ہے، مردے کو جلا دینا یہ اس انتظار کے خلاف ہے (اگرچہ حقیقت میں اس سے دوبارہ اٹھنے میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہوگی لیکن ظاہراً یہ طریقہ اس کے خلاف ہے گویا اب یہ مردہ ہمیشہ کے لئے فنا ہو گیا)

تیسری وجہ

اس میں مردے کی انتہائی بے قدری و بے حرمتی ہے کہ اپنے ہاتھوں اس کو جلا کر اس کی خاک کو ہوا میں اُڑا دیں، ایسا معاملہ تو ناکارہ و ناپاک چیزوں سے کرتے ہیں اگر کوئی عمدہ پاکیزہ چیز ہو اور اس کو باقی رکھنا منظور ہو تو زمین میں دفن کرنے کا معمول ہی چلا آیا ہے۔

چوتھی وجہ

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ آگ بدبُو دور کرتی اور زمین سڑانڈ پیدا کرتی ہے، یہ بات اس وقت قابلِ لحاظ ہو سکتی ہے جب اس چیز کو زمین سے نکالنا مقصود ہو، جب اس کو وہیں باقی رکھنا ہے تو سڑانڈ وغیرہ سے کیا فرق پڑے گا، اس کا اثر باہر تھوڑا ہی آتا ہے، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی تو دیکھیں کہ قبر میں رطوبتیں گل سڑ کر خشک ہو جاتی ہیں، ہاتھ، پیر، جوڑ (ڈھانچہ) اپنی شکل و صورت پر باقی رہتا ہے، گویا جس طرح اپنی زندگی میں وہ سوتا تھا اب بھی وہ سو رہا ہے، اس کے مقابلے میں آگ کے اندر جلانے سے جسم کا حُلیہ بگڑ جاتا ہے۔

پانچویں وجہ

انسان کی پیدائش مٹی سے ہوئی ہے لہٰذا ”کل شئ یرجع الی اصلہٖ“ کے قاعدے کے مطابق انسان کو اپنی اصل کی طرف لوٹنا چاہئے (اور وہ مٹی ہے) جبکہ آگ جنات و شیاطین کی پیدائش کا مادّہ ہے، (اس کی طرف انسانوں کو لوٹانا خلافِ اصل ہے) پھر جب موت کے بعد انسانوں کے بدن کو جلاتے ہیں تو روح جو لطیف شی ہے، آگ کے دھوئیں سے مل کر جنات و شیاطین کے ساتھ کامل

مشابہت اختیار کرلیتی ہے، اسی وجہ سے اکثر ان لوگوں کی روحیں جن کو جلا دیا جاتا ہے شیاطین کے حکم میں ہوجاتی ہیں، انسانوں سے چمٹتی، اور ایذاء دیتی پھرتی ہیں، لہٰذا مردے کو دفن کرنا شی کو اپنی حقیقت کی طرف لوٹانا ہے، اور جلانا اس کے خلاف ہے۔

ایک دانشمند ہندو کا واقعہ

حکایت ہے کہ اسلام کا ایک لشکر سیستان کے علاقے کی طرف آیا تو ایک ہندو جو عقلمند تھا، وہ اسلام کی چال ڈھال اور طرز وطریقہ دیکھنے کے لئے گیا کہ اسلام اس وقت ایک نیا مذہب تھا، چنانچہ وہ اسلامی طرز وطریقہ اچھی طرح دیکھنے کے بعد کہنے لگا، تمہاری سب چیزیں اچھی ہیں سوائے ایک چیز کے (پوچھا گیا کہ وہ کون سی چیز ہے؟ تو اس نے کہا) کہ تم لوگ مردے کو دفن کرتے ہو اور آگ میں جلاتے نہیں ہو، حالانکہ دفنانا سرانڈ وناپاکی کا سبب ہے جبکہ آگ میں جلانا بدبُو اور تعفن کو مٹا دیتا ہے، اتفاق سے وہاں فقہائے اسلام میں سے ایک فقیہہ موجود تھے انہوں نے اس ہندو سے کہا میں تم سے ایک بات پوچھتا ہوں، پہلے تم اس کا جواب دو پھر میں تمہارے اعتراض کا جواب دوں گا، اس نے کہا پوچھئے، فقیہہ نے فرمایا کہ بھلا ایک آدمی اگر کسی ملک میں سفر کرکے جائے، وہاں وہ ایک عورت سے نکاح کرے اور ایک دوسری عورت کو کھانے پکانے کے لئے خادمہ رکھے، پھر اس منکوحہ کے ہاں ایک بچہ پیدا ہو، اب اتفاق سے اس کو کہیں دوسرا سفر درپیش آجائے تو بتایئے کہ وہ بچہ ماں کے حوالے کرنا چاہئے یا پکانے والی خادمہ کے سپرد کرنا چاہئے، اس پر ہندو نے کہا کہ ماں کے ہوتے ہوئے بچہ پکانے والی کے حوالے نہیں کرنا چاہئے، تب فقیہہ اسلام نے فرمایا تم نے خوب بات کہی اب اپنے اعتراض کا جواب سنو!

روحِ آسمانی جب دنیا کے گھر میں آئی تو بدن زمین سے بنا کر اس کو دیا گیا پھر ہمیشہ زمین سے اس کے لئے غذا، دوا، لباس اور طرح طرح کے فائدے پہنچائے گئے، اور آگ سوائے پکانے جلانے کے آدمی کے کسی فائدے کے لئے نہیں، آگ کا زیادہ سے زیادہ فائدہ یہ ہے کہ زمین سے کچی جو چیزیں اُگیں ان کو وہ پکا دیتی ہے لہٰذا زمین آدمی کی ماں ہوئی اور آگ باورچن، اب جب روح نے جو باپ کی مانند ہے عالمِ برزخ کی طرف سفر کرنا چاہا تو بدن جو اس کے بیٹے کی مانند ہے اس کو ماں کے حوالے کیا جانا چاہئے نہ کہ پکانے والی باورچن کے حوالے کیا جائے، ہندو یہ سن کر قائل ہوگیا۔

نیز یہ بھی ہے کہ آگ بدن کو پراگندہ کردیتی ہے جس کی وجہ سے روح کا تعلق بدن سے ختم ہوجاتا

ہے، اِس عالم (بدن کے عالم) کے آثار روح کو کم پہنچتے ہیں، اور روح کی کیفیات بھی ادھر کم سرایت کرتی ہیں، لیکن اس کے مقابلے میں دفن کرنے کی صورت میں چونکہ بدن کے تمام اجزاء اپنے مقام پر برقرار رہتے ہیں تو روح کا تعلق ان کے ساتھ از راہِ نظر و عنایت بحال رہتا ہے، اور زیارت کے لئے آنے والے حضرات کی طرف روح کی توجہ آسان ہوتی ہے، اس لئے کہ بدن کی جگہ متعین ہونے کی وجہ سے گویا روح کی جگہ بھی معین ہوگئی۔ چنانچہ اِس عالم کے آثار جیسے صدقہ خیرات، تلاوت قرآن وغیرہ جو بدن کے مدفن پر ہوتے ہیں وہ آسانی سے فائدہ بخش ہوتے ہیں۔

لہٰذا جلا دینا گویا روح کو بے مکان کر دینا ہے اور دفن کرنا گویا روح کو ٹھکانا دینا ہے، اسی وجہ سے جو اولیاء اللہ، صلحاء، مومنین دفن کیے گئے ہیں ان سے فائدہ متصور اور فیض لینا جاری ہے، بخلاف جلائے ہوئے مردوں کے کہ یہ چیزیں ان کے مذہب والوں کے نزدیک بھی ان سے متصور نہیں ہیں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ دفن کرنے کا طریقہ انسانوں کے حق میں ایک بہت بڑی نعمت ہے، اگر بعض لوگ اس نعمت کی ناشکری کریں جیسے اور بہت ساری نعمتوں کی کرتے ہیں تو کوئی شکوہ نہیں کہ انسان کی جبلت میں ناشکری ہے۔ پھر اس نعمت پر اکتفاء نہیں بلکہ فرمایا:

ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ ○

پھر جب چاہا اُٹھا نکالا اُس کو

یعنی پھر جب چاہے گا زندہ کر کے قبر سے باہر نکال لائے گا، تاکہ انسان عالم آخرت میں اپنے اعمال کا بدلہ چکھے اور ہمیشہ کی زندگی پائے، اگرچہ یہ نعمت (دوبارہ زندہ ہو کر اٹھنا) وقوع میں نہیں آئی کہ اس کو نعمہائے معلومہ و مکفورہ کی تعداد میں شمار کیا جائے، لیکن عاقل شخص ذرا خیال کرے تو اس کو یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ اس وقت موجودہ جو نعمتیں ملی ہیں جب ان میں سے کسی نے مشیت کی مخالفت نہیں کی (جب اللہ کی مشیت ہوئی وہ نعمتیں وجود میں آگئیں ایسا نہیں ہوا کہ اللہ نے کسی نعمت کو عطا کرنے چاہا ہو اور وہ عطا نہ ہوئی ہو) تو دوبارہ اٹھنا، جینا اللہ کی مشیت سے یہ بھی (یقیناً) ہو جائے گا، اللہ کی مشیت کے خلاف نہیں ہوگا، اسی لئے اس نعمت کو یہاں اللہ کی مشیت کے ساتھ (خاص طور پر) معلق فرمایا ہے، اس کے علاوہ آدمی کی اول پیدائش یہ خود دلیلِ صریح اور برہان واضح ہے اس بات پر کہ دوبارہ پیدائش (میں کچھ شبہ نہیں) لہٰذا اگر کوئی اس نعمت کا انکار کرے تو اس کی نادانی و حماقت ہی ہے۔

ایک شبہے کا ازالہ

یہاں اس شبہہ کا اندیشہ تھا کہ کہیں انسان یہ نہ سمجھنے لگ جائے کہ مجھے پیدائش سے ہی فضیلت سے نوازا گیا ہے، پھر میرا مرنا جینا بھی دوسری مخلوقات سے الگ اور ممتاز ہے، لہٰذا آخرت میں بھی مجھے ضرور نوازا ہی جائے گا، اس لئے کہ ''نواختہ رانباید انداخت وعزیز کردۂ خود را ذلیل نباید ساخت'' اور نیز دوسری بار جب روح ڈالی جائے گی تو اس وقت بھی انسان ہی ہوں گا، اور انسانیت تو بہرحال تعظیم و اکرام کا سبب ہے، اس گمان کو دفع کرنے کے لئے فرماتے ہیں:

كَلَّا

ہرگز نہیں

یعنی ہرگز ایسا گمان نہیں کرنا چاہئے، اس لئے کہ پہلی بار کا اکرام تو اس وجہ سے تھا کہ ابھی گناہوں کا صدور نہیں ہوا تھا، اور گناہوں کے سرزد ہو جانے کے بعد پھر جب دوبارہ اس کو اٹھایا جائے گا تو اگرچہ انسان ہی ہوگا مگر اب گنہگار انسان ہوگا، لہٰذا اس اعادے کو پہلی حالت پر قیاس نہیں کرنا چاہئے، کرم سابق کی وجہ سے کرم لاحق کا امیدوار نہیں ہونا چاہئے، اور انسان کس طرح کرم لاحق کا امیدوار ہو کر پھول سکتا ہے جب کہ اس کا یہ حال ہے کہ:

لَمَّا يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ

پورا نہ کیا جو اُس کو فرمایا

یعنی ابھی تک اس نے وہ بات انجام نہیں دی جو بات اس کے خالق، اس کو عزت بخشنے والے نے فرمائی تھی، اگر اس کے فرمان کو بجالاتا، بندگی سے عہدہ برآ ہوتا پھر تو عزت واکرام کی توقع بجا تھی لیکن تقصیر و نافرمانی کی صورت میں ڈر اور خوف رکھنا چاہئے، بلکہ ذلت وخواری کی توقع ہونا چاہئے، اور یہ جو کہتے ہیں کہ ''نواختہ رانباید انداخت'' واقع کے خلاف ہے بلکہ بہت سی چیزیں ہیں جو اکرام کے بعد سزا پاتی اور ان کی تذلیل وتحقیر کی جاتی ہے اگر اس بات میں کچھ شک ہو تو:

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖٓ

اب دیکھ لے آدمی اپنے کھانے کو

یعنی انسان کو اپنی خوراک کی طرف دیکھنا چاہئے کہ کس طرح ناپاک فضلہ بن جاتی ہے حالانکہ نہایت

احترام، صفائی واحتیاط کے ساتھ پکائی گئی تھی، اور اللہ کی عنایات جس خوراک کے پیدا کرنے اور پالنے میں کارفرما تھیں وہی انسان کے پیدا کرنے میں مصروف تھیں، چنانچہ اس بات میں اچھی طرح غور کرے کہ:

اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ۝ ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا

کہ ہم نے ڈالا پانی اوپر سے گزرتا ہوا پھر چیرا زمین کو پھاڑ کر

یعنی پھر ہم نے زمین کو چیر کر پھاڑا جس طرح پھاڑنے کا حق ہے جو کہ بچے کی پیدائش کے وقت بچہ دانی کے کھلنے سے بہت زیادہ ہے، اور یہ عنایات تو اس ضعیف گھاس پر تھیں جو زمین کے اندر سے نکلنے کی طاقت نہیں رکھتی تھی۔

فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا ۝

پھر اُگایا اُس میں اناج

یعنی پھر ہم نے اس زمین سے دانے اُگائے جیسے گیہوں، چنے وغیرہ، جو قوت بخش ہیں۔

وَّعِنَبًا

اور انگور

یعنی انگور پیدا کئے جو طاقت وقوت بھی دیتے ہیں اور میوے کا میوہ ہیں، شراب بھی ان سے بنتی ہے۔

وَّ قَضْبًا ۝

اور ترکاری

یعنی جڑیں پیدا کیں جو کھائی جاتی ہیں جیسے شلجم، گاجر، چقندر اور شکر قند وغیرہ جو کھانے میں نہایت قوت بخش ہیں، پھر اگر کچی کھائی جائیں تو حرارت وتشنگی دور کرتی ہیں، پکایا جائے تو بہترین سالن اور اگر مربا بناؤ تو لذیذ میوہ ہے۔

وَّزَيْتُوْنًا

اور زیتون

یعنی زیتون کو پیدا کیا، جو تیل بھی ہے سالن بھی۔

وَّ نَخۡلًا ۝

اور کھجوریں

یعنی کھجور پیدا کی، جو قوتِ غذائیت بھی رکھتی ہے، میوہ بھی ہے، سالن بھی، سرکہ بھی ہے، نبیذ بھی۔

وَّحَدَآئِقَ

اور گھن کے

یعنی باغات پیدا کئے جن کے چار دیواری ہوتی ہے، ان کے اندر طرح طرح کے پھل دار درخت اور جڑی بوٹیاں اُگائی جاتی ہیں۔

غُلۡبًا ۝

باغ

(وہ باغات) گھنے درختوں والے ہیں جن کی ٹہنیاں موٹی موٹی ہوتی ہیں۔

غُلب کی لغوی تحقیق

لغتِ عرب میں غلب اس اونٹنی کو کہا جاتا ہے جس کی گردن پر بہت بال ہوتے ہیں، یہاں استعارے کے طور پر اس باغ کو غلب کہا گیا ہے جس کے درخت گنجان اور ڈالے موٹے ہوں۔

وَّفَاکِہَۃً

اور میوہ

یعنی وہ میوے پیدا کئے جو باغوں میں نہیں ہوتے، صحرائی یا کوہستانی ہیں۔

وَّ اَبًّا ۝

اور گھاس

یعنی خودرَو گھاس پیدا کی جس کو کوئی بوتا نہیں خود بخود اُگتی رہتی ہے۔

مَّتَاعًا لَّکُمۡ وَلِاَنۡعَامِکُمۡ ۝

کام چلانے کو تمہارے اور تمہارے چوپایوں کے

یعنی تمہارے اور تمہارے چوپایوں کے فائدے کے لئے یہ سب کچھ پیدا کیا۔

جو اشیاء ذکر کی گئی ان میں سے بعض خاص طور پر جانوروں کے لئے ہیں، جیسے گھاس، بعض مشترک ہیں۔ انسانوں اور جانوروں دونوں کے استعمال میں آتی ہیں، جیسے اناج دانے وغیرہ، اور بعض وہ ہیں کہ ان کی اصل اور اچھی چیز تو انسان کھاتے ہیں اور ان کی بھوسی، چھلکے، گٹھلیاں اور پتے وغیرہ جانور کھاتے ہیں، پھر کھا لینے کے بعد یہی غذاء کس قدر ذلیل وحقیر ہو جاتی ہے کہ نجاست و گوبر بن جاتی ہے، گھروں سے اس کو دور پھینک دیا جاتا ہے، اس کی بدبو سے لوگ نفرت کرتے ہیں، اب ذرا غور کرلیا جائے اس سابقہ عزت اور انجام کی اس ذلت کے بارے میں (کہ عزت کے بعد ذلت ہوئی کہ نہیں)

اور انسان اس دھوکے میں نہ پڑے کہ دونوں باتوں میں بڑا فرق ہے، اس لئے کہ آدمی کی خوراک عزت کے بعد جھٹ پٹ ہی ذلیل کردی جاتی ہے، یعنی کھانے کے بعد غلاظت بن کر نکلتی ہے، جب کہ آدمی کی عزت تو ایک مدتِ دراز کے بعد ذلت سے بدلی جائے گی، لہٰذا دونوں میں بہت فرق ہے، اس دھوکے میں نہیں رہنا چاہئے، اس لئے کہ اس مدت کی ایک حد معیّن ہے، غیر محدود نہیں اور وہ یہ ہے:

فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ ○

پھر جب آئے وہ کان پھوڑنے والی

یعنی جب وہ چیخ آئے گی جو سب کے کان بہرے کردے گی، اس سے صور پھونکنے کی طرف اشارہ ہے۔

يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ○

جس دن کہ بھاگے مرد اپنے بھائی سے

یعنی اس دن آدمی اپنے بھائی سے بھاگے گا، حالانکہ دنیا میں اس کو دوسروں سے زیادہ عزیز رکھتا اس سے مشورہ کرتا، اس کی تائید و مدد کرتا اور بچپن سے اس کے ساتھ مانوس تھا۔

وَاُمِّهٖ

اور اپنی ماں سے

یعنی اپنی ماں سے بھی بھاگے گا جبکہ ماں کو تو بھائی سے بھی زیادہ چاہتا تھا اور ماں کے حق بھی بہت ہیں۔

وَ اَبِيْهِ ○

اور اپنے باپ سے

یعنی اپنے باپ سے بھاگے گا حالانکہ اس کی تعظیم ماں سے بھی زیادہ کرتا تھا، اور حقوق بھی اس کے بہت ہیں بلکہ گویا بیٹا اسی کا ہے۔

وَصَاحِبَتِهٖ

اور اپنی ساتھ والی سے

یعنی اپنی بیوی سے بھاگے گا جبکہ اس کے ساتھ سب سے زیادہ پیار کرتا تھا، اس لئے کہ تاحیات اس کی رفاقت اس کے ساتھ تھی، ماں باپ کے بارے میں تو یہ سمجھتا ہے کہ خواب وخیال تھا جو گذر گیا اب ان سے کچھ واسطہ نہیں رہا۔

وَ بَنِيْهِ ○

اور اپنے بیٹوں سے

یعنی اپنے بیٹوں سے بھاگے گا، جبکہ بیٹے بیوی سے بھی زیادہ پیارے ہوتے ہیں اس لئے کہ ان کو مرنے کے بعد اپنا قائم مقام سمجھتا ہے۔

ان قرابتوں کے ذکر کرنے میں ادنی سے اعلیٰ کی طرف ترقی کی ترتیب رکھی ہے، چنانچہ ظاہر ہے جو اتنے قریبی رشتہ داروں سے بھاگے گا تو دور کے لوگوں سے تو بدرجۂ اولیٰ بھاگے گا۔

وہ اولین لوگ جو اپنے اقرباء سے بھاگیں گے

کہتے ہیں سب سے پہلے جو شخص اپنے بھائی سے بھاگے گا وہ قابیل ہوگا جو اپنے بھائی ہابیل سے بھاگے گا تاکہ وہ دنیا کے خون کا اس سے مطالبہ نہ کرے، اور سب سے پہلے جو اپنی ماں اور باپ سے بھاگے گا وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہوں گے کہ کہیں وہ شفاعت کے لئے منت وزاری نہ کرنے لگیں اور کافر کے حق میں سفارش قبول نہیں ہے۔

اور اپنی بیوی سے بھاگنے والے سب سے پہلے حضرت نوح وحضرت لوط علیہما السلام ہوں گے، ان دونوں کی بیویاں منافق تھیں اور منافق کے حق میں سفارش قبول نہیں کی جائے گی۔

اپنے بیٹے سے بھاگنے والوں میں بھی سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام ہوں گے، ان کا بیٹا کنعان کفر کی حالت میں مرا تھا۔

اپنے اقرباء سے بھاگنے کی وجہ

اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ قیامت کے دن آدمی اپنے رشتہ داروں سے کیوں بھاگے گا؟ بعض نے کہا کہ حقوق کے مطالبے کے خوف سے بھاگے گا، یعنی دنیا میں مجھ سے اس کی جو کچھ حق تلفی ہوئی ہے کہیں اس کا مطالبہ نہ کر بیٹھے، جیسے مفلس آدمی اپنے قرض خواہ سے بھاگتا ہے، چنانچہ حدیث میں بھی آتا ہے کہ قیامت کے دن آدمی اپنے دوستوں آشناؤں سے زیادہ بھاگے گا، غیروں سے اتنا نہیں بھاگے گا اس لئے کہ دنیا میں اجنبی اور نا آشنا لوگوں سے کوئی واسطہ ہی نہ تھا کہ آج کسی قسم کے مطالبے کا خوف ہو۔

بعض نے کہا کہ مدد و شفاعت کے خوف سے بھاگے گا کہ ایسا نہ ہو کہ میرے آشنا و رشتہ دار کو دوزخ کا حکم ہو اور وہ مجھے دیکھ کر مجھ سے کچھ نیکیوں کی درخواست کرنے لگ جائے یا کہیں اس کے گناہوں میں سے کچھ مجھے لینے نہ پڑ جائیں چنانچہ قحط سالی میں لوگ اسی طرح ایک دوسرے سے بے التفاتی کرتے ہیں۔

بعض نے کہا اپنے رشتہ دار کو عذاب میں دیکھنے کا حوصلہ نہ ہوگا اور نہ ہی نیکیاں دینے یا سفارش کرنے کی طاقت ہوگی اس لئے چھپتا پھرے گا۔ صحیح بات یہ ہے کہ یہ سب وجوہات ہوں گی کوئی ایک وجہ سے بھاگے گا کوئی دو، یا تین وجہ سے بھاگے گا، بلکہ اس دارو گیر کے دن ہر شخص اپنے ہی حال میں گرفتار ہوگا (بدحواسی ایسی ہوگی کہ اپنی فکر میں بھاگتا پھرے گا کسی اپنے کی طرف) کوئی توجہ نہیں کرے گا چنانچہ فرماتے ہیں:

لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُّغْنِيْهِ ○

ہر مرد کو اُن میں سے اُس دن ایک فکر لگا ہوا ہے جو اُس کے لئے کافی ہے

یعنی ہر شخص پر اس دن غم و تشویش کی ایسی حالت ہوگی جو اس کو بے پرواہ کر دے گی اس کو اتنی فرصت ہی نہ ملے گی کہ دوسروں کی حالت کی طرف توجہ کر سکے۔

پھر اس حادثہ کے دن عزت و ذلت کے لحاظ سے لوگوں کی الگ الگ حالت ہوگی چنانچہ فرمایا:

وُجُوۡهٌ يَّوۡمَئِذٍ مُّسۡفِرَةٌ ۝

کتنے منہ اُس دن روشن ہیں

یعنی بہت سے چہرے اس دن روشن ہوں گے اس لئے کہ ان کا نورِ ایمانی باطن سے ظاہر پر جلوہ افروز ہو کر چہروں کو روشن کر دے گا۔

ضَاحِكَةٌ

ہنستے

یعنی ہنستے ہوں گے، اس لئے کہ اپنے اندر جب انعام واکرام کے اثار محسوس کریں گے تو ملنے کی توقع پر ہنستے ہوں گے۔

مُّسۡتَبۡشِرَةٌ ۝

خوشیاں کرتے

یعنی خوشیاں مناتے ہوں گے، اس لئے کہ مسلسل انعام واکرام میں اضافہ ہوتا رہے گا اور خوشی و راحت کے اسباب روز بروز بڑھ رہے ہوں گے۔

وَوُجُوۡهٌ يَّوۡمَئِذٍ عَلَيۡهَا غَبَرَةٌ ۝

اور کتنے منہ اُس دن اُن پر گرد پڑی ہے

یعنی بہت سے چہرے اس دن ایسے ہوں گے جن پر سیاہی وغبار ہوگا، یہ وہ گناہوں کی تاریکی ہے جو دنیا میں ان کے دلوں پر جم گئی تھی، اب وہ باطن سے چہرے پر ظاہر ہوگی۔

تَرۡهَقُهَا قَتَرَةٌ ۝

چڑھی آتی ہے اُن پر سیاہی

یعنی ان پر سیاہی چڑھ رہی ہوگی، یہ کفر کی سیاہی ہوگی جو گناہوں کی سیاہی کے اوپر آ جائے گی، کفر کی سیاہی اگرچہ دل کی گہرائی میں ہوتی ہے گناہوں کی تاریکی سے بھی زیادہ پوشیدہ لیکن اس دن کفر کی شدت وغلبہ کی وجہ سے یہ تاریکی گناہوں کی تاریکی کے اوپر چڑھ جائے گی، جیسے تیل کو جتنا ہی پانی کے

نیچے ڈالیں وہ پانی کے اوپر ہی چڑھ جاتا ہے چنانچہ فرمایا:

اُولٰٓئِکَ هُمُ الْکَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ۝

یہ لوگ وہی ہیں جو منکر ہیں ڈھیٹھ

یعنی یہی منہ کالے لوگ کافر و بدکار ہیں، جو کفر بھی کرتے تھے اور گناہ بھی کرتے تھے، آج انتہائی ذلت وخواری کے سزاوار ہوئے، ان کی انسانیت کچھ کام نہ آئی، کسی اکرام کے مستحق نہ ٹھہرے حالآنکہ پہلی دفعہ دنیا کی پیدائش میں یہ بڑے معزز و مکرم تھے، خُدا کی ساری عنایات ان کی پرورش میں کارفرما تھیں۔

دو طرح کی سیاہی کے مستحق لوگ

جو لوگ کفر کے ساتھ گناہ بھی کرتے تھے دو رنگوں کی سیاہی ان کی خصوصیت ہے، گناہوں کا رنگ سیاہ مٹیالا ہوگا، اور کفر کا رنگ سیاہ بھورا، جو لوگ صرف گناہ کرتے تھے، یا صرف کفر کے مرتکب تھے ان کے لئے ایک ہی رنگ ہوگا۔

سورۂ عبس میں خاص فوائد و حکمتیں

اب یہاں ایک سوال یہ ہے کہ اس سورت میں اللہ تعالیٰ کے عتاب و ناراضگی کا ذکر ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسے جلیل القدر پیغمبر پر ہوئی تو اس کے نازل کرنے میں کیا حکمت ہے؟ بظاہر عقل میں یوں آتا ہے کہ اس عتاب و خطاب کو پوشیدہ طریقے سے جبرئیل امین کے ذریعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچادیتے، اور لوگوں کو معلوم نہ ہوتا، لیکن بجائے اس کے یہ قصہ قرآن بن کر نازل ہوا قیامت تک لوگوں کی زبانوں پر تلاوت کی صورت میں جاری رہے گا اور تازہ رہے گا۔

جواب اس کا یہ ہے کہ دراصل اس میں بہت سے تعلیم و ارشاد کے فوائد و آداب اور حسنِ اخلاق کے قواعد تھے، اس لئے رحمت باری تعالیٰ نے چاہا کہ اس قصہ کو قرآن کا جزو بنادیا جائے تاکہ لوگ ہمیشہ ان سے فیضیاب ہوتے رہیں، محروم نہ رہیں۔

ان سب فوائد میں سے بعض ہم یہاں ذکر کرتے ہیں اور باقی سننے والے کی عقلِ کامل وفہمِ صائب کے سپرد کرتے ہیں۔

انبیاء کی خطاء اجتہادی

فائدہ نمبر۱: کبھی کبھی انبیاء کرام بھی اجتہاد کرتے اور اپنی عقل کے مطابق کوئی فیصلہ کرتے ہیں، بسا اوقات اجتہادی خطا ہو جاتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ فوراً آگاہ فرما دیتے ہیں اس خطا پر برقرار نہیں رہنے دیتے۔ چنانچہ اس قصے میں بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں سمجھا کہ نفع عام کو نفع خاص پر مقدم رکھنا چاہئے، ان سرداروں کو اسلام کی دعوت دینے میں نفع عام ہے، نابینا کو قرآن کی تعلیم دینا نفع خاص ہے، لہٰذا دعوت کو تعلیم قرآن پر ترجیح دینا چاہئے پھر یہ کہ یہ نابینا صاحب خود طالبِ صادق اور شوقین ہیں فوری توجہ ان کی طرف نہ ہوئی تو بھی ان کا شوق انہیں محروم نہیں ہونے دے گا یہ سیکھ ہی لیں گے، یہاں یہی خطا ہوئی کہ نفعِ عام جو موہوم تھا اس کو نفعِ خاص جو کہ ظاہر اور یقینی تھا پر ترجیح دی گئی۔

نفعِ عام کب نفعِ خاص پر مقدم ہوتا ہے

فائدہ نمبر۲: یہاں سے معلوم ہوا کہ نفعِ عام، نفعِ خاص پر اس وقت مقدم ہوتا ہے جب دونوں معلوم یا دونوں موہوم ہوں، موہوم کو معلوم پر ترجیح دینا صحیح نہیں۔

دعوت، تعلیم پر کب مقدم ہے

فائدہ نمبر۳: اسلام کی دعوت کو قرآن کی تعلیم پر اس وقت ترجیح دینی چاہئے جب اس کے قبول ہونے کا یقین ہو، اگر قبول کرنے کا یقین نہ ہو تو اتمام حجت ایک دفعہ دعوت پہنچا دینے سے بھی ہو جاتا ہے اصرار کرنے کی ضرورت نہیں، ایسے میں دین کے دیگر امور کو نہ چھوڑنا چاہئے۔ اسی طرح نافرمانوں کو مطیع و فرمانبردار بنانے کی کوشش اس وقت کرنی چاہئے جب ان سے ماننے کی توقع ہو، جب پہلے سے نا اُمیدی ہو تو گویا ٹھنڈا لوہا پیٹنا ہے۔

اشتباہ کے وقت غرض صالح کا ترک لازم ہے

فائدہ نمبر۴: اسی طرح یہ بات بھی ہے کہ اگر غرضِ صالح بظاہر غرضِ فاسد کے ساتھ مشتبہ ہونے لگے تو غرضِ صالح کو چھوڑ دینا ضروری ہے اسی وجہ سے فرمایا ہے "اتقوا مواضع التّهمة" تہمت کی جگہوں سے بچو۔

یہاں پر ان سرداروں، مالداروں کی خاطر داری اور اندھے فقیر سے بے توجہی سے یہ گمان ہو سکتا تھا کہ دنیا داروں، مالداروں کی دلداری ہو رہی ہے دل میں ان کی عظمت ہے، اور فقراء کی قدر نہیں اس لئے اس تہمت کے اندیشہ سے ان کو دعوت دینا چھوڑ دینا چاہئے تھا۔

رتبہ کی بلندی وجہ عتاب ہوسکتی ہے

فائدہ نمبر۵: یہ بھی معلوم ہوا کہ بسا اوقات کوئی کام جس کا مرضی حق کے خلاف ہونے کا علم پہلے سے نہیں ہوتا لیکن کرنے والا انتہائی بلند مرتبہ و منصب، عظیم قوتِ استعداد رکھنے والا ہوتا ہے، اس وجہ سے اس پر شکوہ ہوسکتا ہے اگرچہ پہلے سے اس کا گناہ ہونا معلوم نہ ہو، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کام کے مرضی حق کے خلاف ہونے کا پہلے سے علم نہیں تھا اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر خفگی ہوئی۔

واجب التعظیم شخص کی تعظیم ضروری ہے

فائدہ نمبر۶: جو شخص واجب التعظیم ہو اس کی تعظیم ضروری ہے چاہے وہ اس وقت تعظیم سے بے خبر ہو، وہ صحابی نابینا ہونے کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ انور کی کیفیت سے بے خبر تھے کہ آپؐ اس وقت ترشی میں ہیں یا بشاشت میں، چہرۂ مبارک ان کی طرف ہے یا دوسری طرف پھیر دیا ہے مگر چونکہ وہ صحابی ایمان اور اللہ کی راہ کے طالب تھے اس لئے ان کی تعظیم ضروری تھی اس کے ترک پر خفگی ہوئی، اسی وجہ سے حدیث شریف میں ہے: ”ترک السّلام علی الضریر خیانة“ نابینا پر سلام نہ کرنا خیانت ہے، کیونکہ اگرچہ وہ ترکِ سلام سے رنجیدہ نہ ہو لیکن اسلام کا حق تو تلف ہوا۔

کفار کی طرف میلان کا حکم

فائدہ نمبر۷: یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی غرض شرعی کی وجہ سے کفار کی طرف بھی مائل ہو جانا ان کی طرف توجہ کرنا اگرچہ جائز ہے لیکن ضرر سے خالی نہیں۔

مسلمان سے بے توجہی کرنا

فائدہ نمبر۸: مسلمان سے منہ پھیرنا، یا کسی درجے میں اس کی اہانت کرنا چاہے بلا قصد وارادہ ہی ہو قباحت سے خالی نہیں۔

دوست پر خفگی کا اظہار کرنا

فائدہ نمبر۹: یہ بھی معلوم ہوا کہ دوستوں سے کبھی کوئی کوتاہی ہو جائے تو تنبیہ اور خفگی کا اظہار کر دینا چاہئے، اسی سے دوستی اور محبت باقی رہے گی اسی وجہ سے کہا جاتا ہے ”ویبقی الوُد مابقی العتاب“ جب

تک شکوہ باقی تب تک دوستی بھی باقی ہے، شکوے شکایت چھوڑ دینے کا مطلب ہوتا ہے لاتعلقی اختیار کر لینا۔

سرکار کا اپنے آدمی سے باز پرس کرنا

فائدہ نمبر ۱۰: یہ فائدہ بھی معلوم ہوا کہ جو شخص کسی عہدے اور منصب پر فائز کیا جائے تو چاہے وہ حاکم کا مقرب ہی ہو اس کے حالات سے باخبر رہنا، اور اس کی باز پرس کرتے رہنا چاہئے، اس سے غفلت نہیں برتنی چاہئے ورنہ یہ عہدیدار مطلق العنان بن جائیں گے اور کاروبارِ سلطنت میں خلل پیدا کریں گے۔

کسی کو حقیر نہ جاننا چاہئے

فائدہ نمبر ۱۱: یہ فائدہ بھی معلوم ہوا کہ بظاہر کوئی کتنا ہی حقیر نظر آتا ہو کسی کو بھی حقیر نہ سمجھنا چاہئے، کیا پتہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا کیا مرتبہ و مقام ہو۔

خاکساران جہاں را بحقارت منگر

توچہ دانی کہ دریں گرد سواری باشد

وہ نابینا ظاہر میں حقیر معلوم ہوتا تھا لیکن اس کی وجہ سے کائنات کے سردار پر عتاب ہوا۔

موانع کی وجہ سے طلب علم نہ چھوڑا جائے

فائدہ نمبر ۱۲: یہ بھی معلوم ہوا کہ طالب علم کو اگرچہ رکاوٹیں پیش آئیں طلب علم کو نہ چھوڑے، یہ اندھا فقیر اس کا ہاتھ پکڑنے والا بھی کوئی نہ تھا اس کے باوجود تحصیل علم کے لئے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا، کوئی اگر طلب علم کی راہ میں، اللہ تعالیٰ کے راستے میں موانع و مشکلات کا بہانہ کرے وہ کبھی مقصود تک نہ پہنچ سکے گا، اسلئے کہ کوئی بھی آدمی اپنے حالات کے مطابق موانع سے خالی نہیں۔

استاذ و مرشد شفقت کو لازم پکڑیں

فائدہ نمبر ۱۳: یہ بھی معلوم ہوا کہ استاذ کے لئے لازم ہے کہ طالب علم پر شفقت کرے، مرشد کے لئے ضروری ہے کہ راہِ خدا کے طالب پر شفقت و عنایت کرے اور اس کو مطلوب تک پہنچنے میں پوری مدد کرے۔

فرقِ مراتب میں مال و جاہ کا لحاظ نہیں

فائدہ نمبر ۱۴: یہ بھی معلوم ہوا کہ استاذ اپنے شاگردوں کے درمیان اور مرشد اپنے مریدوں کے درمیان دنیاوی مال و جاہ کی بنیاد پر فرق مراتب نہ کرے، بلکہ شوق کی کثرت اور استعداد کی قوت کے

اعتبار سے فرق و امتیاز رکھے۔

چھوٹوں سے رنج کا تدارک

فائدہ نمبر ۱۵: یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کسی بڑے سے کسی چھوٹے کو کوئی رنج و تکلیف کی بات پہنچ جائے تو بڑے کو فوراً اس کا تدارک کرنا چاہئے، یہ بات بڑے کے مرتبے کے خلاف نہیں بلکہ اس سے اس کے مرتبہ و عزت میں اضافہ ہی ہوگا کمی نہیں ہوگی دیکھئے ان آیتوں کے نازل ہوتے ہی کس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اُن نابینا صحابی کے پیچھے دوڑ پڑے، ان امراء و سرداروں کی کوئی پرواہ نہ کی، کیا ہی خوب کسی نے کہا ہے۔

تواضع زگردن فرازاں نکوست
گداگر تواضع کند خوے اوست

روٹھے کو منانا اور عزت افزائی کرنا

فائدہ نمبر ۱۶: یہ بھی معلوم ہوا کہ روٹھے کو منایا جائے تو اس کی عزت و مرتبہ پہلے سے زیادہ بڑھا دیا جائے تا کہ زخم کا مرہم ہو سکے، اس لئے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان نابینا صحابی کو راستے سے واپس لائے تو اپنی چادر بچھائی اس پر بٹھایا اور فرمایا "أنت فی عیال محمد مّا بقیت" جب تک زندہ ہو میرے عیال میں ہو، تمہاری کفالت میں ہی کروں گا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی وحی پوشیدہ نہیں رکھی

فائدہ نمبر ۱۷: قرآن کریم کے اندران آیات کے باقی رہنے سے معلوم ہوا کہ وحی پہنچانے میں پیغمبر انتہائی امانتدار تھے، اور وحی میں سے کوئی بات پوشیدہ نہیں رکھی ورنہ یہ عتاب و شکایتِ باری تعالیٰ آپ پر نہایت گراں، کسرِ شان کا باعث تھی اگر کچھ پوشیدہ رکھتے تو اس وحی کو بھی لوگوں کے کان تک نہ پہنچنے دیتے چنانچہ حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا تھا کہ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وحی میں سے بھی کچھ پوشیدہ رکھتے تو حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے قصے کو پوشیدہ رکھتے۔

طالب علم خدا سے ڈرنے والا ہونا چاہیے

فائدہ نمبر ۱۸: یہاں ایک فائدہ یہ بھی معلوم ہوا کہ طالب علم خدا سے ڈرنے والا ہونا چاہئے، اس

لئے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے اس طالب علم کی مدح کرتے ہوئے فرمایا "وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى وَهُوَ يَخْشٰى"

اللہ کے نافرمان رشتہ داروں سے صحبت نہ رکھنا

فائدہ نمبر ۱۹: اس مجلس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی چچا حضرت عباس بن عبد المطلب اور دوسرے قریبی رشتہ دار ابوجہل وغیرہ تھے، ان کے اختلاط وصحبت کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر عتاب نازل ہوا حالانکہ یہ قریبی رشتہ دار تھے اس سے معلوم ہوا کہ اگر اقرباء اللہ کے نافرمان ہوں تو ان سے میل جول زیادہ نہ رکھا جائے، ان کی مجلس وصحبت اختیار نہ کی جائے، دوسرے غیر رشتہ دار جو نیک ہوں ان کی صحبت ومجلس کو اختیار کرنا چاہئے، اس لئے کہ دوست کے دشمنوں کو دوست رکھنا بڑی غلطی ہے اسی طرح دوست کے دوست سے منہ پھیرنا بھی افسوس کا مقام ہے، اسی لئے قرآن کریم میں دوسری جگہ فرمایا گیا ہے

"لا تجد قوما يؤ منون بالله واليوم الآخر يوادون من حادالله ورسوله ولو كانوا اباء هم او ابناء هم او اخوانهم او عشيرتهم"

یہیں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تعلیم وتربیت، ارشاد وتزکیہ میں بھی استعداد وشوق والوں کو قرابت والوں پر مقدم رکھنا چاہئے۔

جو عتاب کا سبب بنے اس کے ساتھ برتاؤ

فائدہ نمبر ۲۰: یہ فائدہ بھی معلوم ہوا کہ اگر ایک آدمی پر کسی دوسرے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے، یا پیغمبر خدا کی طرف سے، یا استاذ ومرشد کی طرف سے کوئی عتاب وناراضگی واقع ہو تو جس پر عتاب ہوا وہ اس دوسرے آدمی سے جس کی وجہ سے عتاب ہوا نفرت وبغض نہ رکھے بلکہ اس سے زیادہ دوستی رکھے کہ وہ اس کے لئے ایک بہت بڑے فائدے کا ذریعہ بنا، یعنی اس کی وجہ سے اس کو ادب سکھلایا گیا، چنانچہ اس عتاب کے نزول کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقتیں اور عنایات اُن نابینا صحابی پر بڑھ گئی تھیں، نہایت عزت کرتے، دیکھتے ہی مرحبا کہتے، قریب بٹھاتے اور ان کی حاجتیں پوری فرمایا کرتے تھے۔

والله الموفق المعين و به نستعين تم نقل تفسير سورة عبس والحمدلله اولا و آخرا

مقدمہ سورۃ التکویر

یہ سورت مکی ہے، اس میں انتیس (۲۹) آیات، ایک سو چار (۱۰۴) کلمات اور پانچ سو چونتیس (۵۳۴) حروف ہیں۔

اس سورت کا مرتبہ و مقام

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو کوئی یہ چاہتا ہے کہ قیامت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے تو وہ سورۃ "إذا الشمس كوّرت" پڑھے۔

ایک دن حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ! بڑھاپے نے آپؐ پر جلدی کی، یعنی آپ کے مزاج مبارک کی قوت سے یہ توقع نہیں تھی کہ ساٹھ کے پیٹے میں ہی آپ پر بڑھاپے کے آثار ظاہر ہونا شروع ہو جائیں گے، جنابِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے ان پانچ سورتوں نے بوڑھا کر دیا، سورۂ ھود، سورۂ واقعہ، سورۂ مرسلات، سورۂ نبا اور سورۂ تکویر۔ ان سورتوں میں دنیا و آخرت میں اللہ تعالیٰ کے اس عذاب کا ذکر ہے جو امتیوں پر پیغمبروں کی مخالفت کرنے کی وجہ سے اس سے پہلے آیا اور آئندہ آئے گا، اپنی امت کے غم نے نہایت غلبہ کر دیا، اور غم کا خاصہ ہے کہ آدمی کو جلد بوڑھا کر دیتا ہے۔

سألت من الأطباء ذات يوم اخبروني
ما شيبني قال بلغم
فقلت له على غير اختتام
لقد أخطأت فيما قلت بل غم

یہ بات ذہن میں رہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بڑھاپے سے مراد ضعفِ قویٰ اور بدن کی سُستی ہے، ورنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بال ایسے سفید نہیں ہوئے تھے جو دیکھنے والے پر ظاہر ہوں، حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادمِ خاص ہیں فرماتے ہیں وفات کے دن تک آپ کے سر اور داڑھی مبارک میں صرف بیس بال سفید تھے، ظاہر ہے اتنے سفید بال تو نظر بھی نہیں آتے، نہ ہی عرف میں اتنی سفیدی کو بڑھاپا کہا جاتا ہے۔

سورۂ عبس کے ساتھ ربط کی وجوہ

ربط کی پہلی وجہ

سورۂ عبس کے شروع میں قرآن کے اوصاف اس طرح مذکور ہیں:

كَلَّآ إِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۝ فَمَنْ شَاءَ ذَكَرَهُ ۝ فِي صُحُفٍ مُكَرَّمَةٍ ۝ مَّرْفُوعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ۝ بِأَيْدِي سَفَرَةٍ ۝ كِرَامٍ بَرَرَةٍ ۝ یہی مضمون سورۂ تکویر کے آخر میں ترتیب معکوس کے طور پر مذکور ہے، ”إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ“ اور ”إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِينَ“

ربط کی دوسری وجہ

سورۂ عبس کے آخر میں قیامت کے احوال مذکور ہیں يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ ۝ وَأُمِّهِ وَأَبِيهِ ۝ وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيهِ ۝ اور سورۂ تکویر کی ابتداء میں یہی مضمون شرح وبسط اور تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

وجہ تسمیہ

اس سورت کی ابتداء میں سورج کے بےنور ہونے کا ذکر ہے اس لئے اس سورت کا نام ”تکویر“ رکھا گیا ہے۔

بارہ حادثاتِ قیامت کا ذکر اور ان میں سورج کے حادثے کا سب سے زیادہ سخت ہونے کی وجہ

اس سورت میں قیامت کے بارہ حادثے ذکر کئے گئے ہیں، ان میں سب سے زیادہ سخت سورج کے بےنور ہو جانے کا واقعہ ہے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ جو حادثہ یا مصیبت کسی مقصود بالذات چیز پر واقع ہو وہ زیادہ شدید، ناقابلِ برداشت ہوتا ہے بنسبت اس حادثے کے جو غیر مقصود بالذات چیز پر واقع ہو، مثلاً جان کا ضائع ہونا، اس پر کسی حادثہ یا مصیبت کا گرنا مال پر حادثہ پڑنے سے زیادہ تکلیف دہ ہے، اس لئے کہ جان مقصود بالذات ہے اور مال کی ذات مقصود نہیں ہوتی وہ تو جان کے نفع کے لئے عزیز ہوتا۔

دوسرے یہ کہ جس حادثہ کے مقابلے میں کوئی دوسرا حادثہ معارض نہ ہو وہ اس حادثے سے زیادہ شدید ہوتا ہے جس کے مقابلہ میں کوئی دوسرا اس کے معارض حادثہ بھی موجود ہو، مثلاً اگر جان پر کوئی حادثہ آ جاتا ہے جان جانے کا خطرہ ہے دوسری طرف مال و دولت، جاہ و منصب حاصل ہونے کی توقع بھی ہے تو آدمی بسا اوقات جان پر بھی کھیل جاتا ہے۔

(ان دو تمہیدی مقدمات کے بعد اب یہ سمجھئے کہ آفتاب کے بے نور ہونے کا حادثہ زیادہ شدید کس طرح ہے) قیامت کے بارہ حادثات جن کا یہاں ذکر ہوا ہے ان میں سے ہر حادثہ یا تو غیر مقصود بالذات پر واقع ہونے والا ہے، جیسے آسمان کی کھال کا اتار دینا یہ حادثہ بھی رونما ہوگا لیکن آسمان دنیا والوں کے لئے بالذات مطلوب نہیں، یعنی براہِ راست اس کی ذات مقصود نہیں ہے، بلکہ اہلِ دنیا کا جو نفع ہے اس کا تعلق ستاروں سے ہے، اور آسمان تو محض صندوق کی طرح ہے، جس میں ہیرے جواہرات اور سامان واسباب رکھا گیا ہو، اگر کبھی صندوق ٹوٹ جائے اور ساز و سامان محفوظ ہو تو کچھ زیادہ ناگواری کی بات نہیں ہوتی۔ لہٰذا یہ حادثہ مقصود بالذات پر واقع نہیں ہوا۔

یا وہ حادثات ایسے ہیں کہ ان کے معارض کوئی حادثہ بھی ساتھ ہے، جو اس حادثہ کی شدت میں کمی کر دیتا ہے، جیسے تسعیرِ جحیم (جہنم کا بھڑکانا) کا حادثہ ہے مگر اس کے ساتھ اِزلاف جنت کا حادثہ بھی ہے جو فرحت و خوشی کا ذریعہ ہے یعنی جس طرح جہنم بھڑکائی جائے گی وہاں یہ بھی ہے کہ متقیوں کے لئے جنت قریب لائی جائے گی۔

اسی طرح ستاروں کا بے نور ہو جانا سورج کے بے نور ہو جانے کے مقابلے میں کوئی بڑا حادثہ نہیں۔ ستارے ڈوبتے اور بے نور ہوتے رہتے ہیں۔

اسی طرح دریائے شور کا بھڑک اٹھنا بھی اس حادثے سے بڑا نہیں کہ دریا شور بھی انسانی ضروریات میں خاص نافع نہیں لہٰذا یہ بھی مقصود بالذات نہیں، پہاڑوں کے اندر زلزلہ برپا ہونا بھی سورج کے حادثے کے مقابلے میں بڑا نہیں، اسی طرح دیگر حادثات بھی اس کے مقابلے میں شدید نہیں ہیں، لیکن ان سب کے مقابلے میں سورج کو بے نور کر دینے کا حادثہ مقصود بالذات پر واقع ہے، کہ سورج کی روشنی مقصود بالذات ہے اس سے مخلوق کا نفع براہِ راست متعلق ہے، پھر اس کے معارض کوئی حادثہ بھی نہیں جو فرحت افزا ہو، لہٰذا قیامت کے حادثات میں سے یہ حادثہ سب سے زیادہ سخت و شدید ہے۔

تاریکی کے عجیب فوائد

آفتاب کے بے نور کردینے میں نفسِ انسانی کے وجدانی حالات کھولنے کے نہایت ہی عمدہ اسباب موجود ہیں، سورج کی روشنی وچمک کی مدد سے آنکھوں کے ذریعہ تو بہت سی چیزیں نظر آتی ہیں، مگر یہی روشنی معقولات وجدانیات کے لئے حجاب بن جاتی ہے (فکر وخیال کے دریچے اس وقت کھلتے ہیں جب ظاہری آنکھیں کچھ نہ دیکھ رہی ہوں) یہی وجہ ہے کہ عقلی چیزوں میں غور وفکر کے لئے بہترین وقت رات کا ہے، خواب کے لئے بھی یہی وقت مقرر ہے، عاشقوں، مریضوں، دردمندوں اور مصیبت زدوں کو جو کیفیات نفسانی پیش آتی ہیں ان کیفیات کا بھی یہی وقت ہے، اسی طرح اہل مراقبہ وتوجہ بھی اپنی نسبت باطنی کو اسی وقت بڑھاتے ہیں، ساحر وجادوگر، اور نفساتی تاثیرات کا عمل کرنے والے لوگ بھی رات کو ہی اپنے کام میں مشغول ہوتے ہیں۔

ان بارہ واقعات کے یہاں ذکر کرنے کی حکمت

ان بارہ حادثوں کو یہاں کیوں ذکر کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ ایک وقت ایسا آئے گا جب نفس انسانی کی توجہ اپنے تمام مالوفات ومضرات (جو چیزیں انسان کی طبیعت ونفس کو پسندیدہ وناپسند ومضر ہیں) سے کلی طور پر منقطع ہوجائے گی، انسان کا فہم وشعور ارواحِ سماویہ کی مدد سے بہت وسیع وکشادہ ہوجائے گا، اعمال اپنی اپنی مثالی صورتوں میں ظاہر ہوں گے، اور ہر اچھے برے عمل کی جزا کھل کر سامنے آجائے گی جس کو اس آیت میں بیان کیا گیا ہے "عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ"

ان بارہ حادثوں میں سے ہر حادثہ کا اس انقطاع میں دخل ہے، اب اس کی تفصیل ملاحظہ فرمائیں کہ کس طرح یہ حادثات انسان کے نفس کی توجہ کے انقطاع کا ذریعہ ہوں گے، سب سے پہلے سورج وستاروں کے بے نور ہوجانے والے حادثہ کو لیجئے، جب سورج وستارے تاریک وبے نور ہوجائیں گے تو انسان کے نفس کا آسمان کے ساتھ اپنی حوائج وضروریات کی وجہ سے جو تعلق ہے وہ منقطع ہوجائے گا، اس لئے کہ آسمان سے جو نفع کا تعلق تھا وہ انہی کی وجہ سے تھا مثلاً روشنی کی وجہ سے انسان چیزیں دیکھتا تھا، موسم وفصلیں بھی سورج ستاروں کی وجہ سے بدلتی تھیں، چاند کے بدلنے سے مہینوں کی ابتدا وانتہاء ہوتی تھی اور انہی اجرامِ فلکی کی وجہ سے آنے والے حادثات کی خبر پہلے سے معلوم کی جاتی تھی جب یہ

وسائل ہی ختم ہو گئے تو اب نفع کی توقع بھی نہیں رہی، اس انقلاب کی وجہ سے اس پسندیدہ و مانوس جہاں کی چھت بھی خراب ہو جائے گی اس حادثہ سے نفس کا تعلق آسمان سے منقطع ہو جائے گا، پہاڑوں کے چلانے اور زمین میں زلزلہ برپا کر دینے کی وجہ سے اس زمین کے ساتھ مسکن ہونے کی وجہ سے جو طبعی محبت تھی وہ ختم ہو جائے گی اب زمین سے خزانوں کے دریافت ہونے، کھیتی میووں کے اُگنے، اور چشموں و نہروں کے بہنے کی امید ٹوٹ جائے گی، اور اس گھر کا صحن برباد ہو کر رہ جائے گا۔

(لہٰذا انسان کے نفس کو جو تعلق تھا اس جہاں سے وہ مزید کمزور بلکہ ختم ہوتا جائے گا)

گابھن جانوروں کے حمل گر جانے و معطل ہو جانے کی وجہ سے انسان کے نفس کو اس جنس سے جو طبعی اُنس اور اس سے حاصل ہونے والے فوائد مثلاً دودھ، پشم، گھی وغیرہ کی وجہ سے جو تعلق ہے وہ ختم ہو جائے گا، اس انقلاب کی وجہ سے گویا اس گھر کا مطبخ و خزانہ برباد ہو جائے گا۔

وحوش کے جمع ہو جانے کی وجہ سے انسان کے نفس کو شکار کی طرف جو میلان ہے، اور ان شکاری جانوروں سے حاصل ہونے والے فوائد مثلاً صوف و پشم، مشک نافہ وغیرہ کی وجہ سے ان جانوروں کو پکڑنے، ان کو مسخر کرنے کی جو ہمت و شوق تھا وہ ختم ہو جائے گا۔

دریاؤں کے جوش مارنے والے حادثے کی وجہ سے بحری سفر، سمندر سے موتی و عقیق اور عنبر حاصل ہونے کی امید ختم ہو جائے گی۔

یہ چھ حادثے اس عالم دنیا اور انسان کے جسم سے متعلق تھے اس کے بعد باقی کا تعلق عالمِ آخرت سے ہے چنانچہ جب نیک نفس اپنے ہم جنس نیک نفسوں سے ملیں گے، اور شریر نفس اپنے ہم جنس شریر نفسوں سے ملیں گے اس سے ہر ایک کی کیفیاتِ نفسانیہ دوسرے کے قلب پر منعکس ہوں گی جس سے ہر شخص پر اپنی وجدانیات (دل کی باتیں) کما حقہ ظاہر ہو جائیں گی، اجمالی طور پر اس کو یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ وہ اہلِ خیر میں سے ہے یا اہلِ شر میں سے۔

موءودہ یعنی وہ بچی جسے زندہ گاڑ دیا گیا تھا اس سے سوال کئے جانے کے واقعہ سے انسان پر یہ بات واضح ہو گی کہ انسانی فہم و شعور نے اس عالم میں نہایت ہی ترقی کر لی ہے اس میں عظیم وسعت پیدا ہو گئی ہے، اس لئے کہ یہ موءودہ دنیا سے اس حال میں رخصت ہوئی تھی کہ اس کا نفس بالکل سادہ اور فہم و شعور کی وسعتوں سے خالی تھا، آج جب یہ بھی سوال و جواب کے قابل ہو رہی ہے تو معلوم ہوا کہ انسانی

شعور میں عظیم الشان وسعت پیدا ہوگئی ہے۔

اسی واقعہ سے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ جس نے بھی کسی کا حق تلف کیا ہے چاہے چھوٹا ہو یا بڑا، خواہ جس کے حقوق تلف کئے ہیں اس کے ساتھ کتنا ہی قریبی تعلق کیوں نہ ہو مثلاً باپ بیٹا ہونے کا تعلق ہی ہو لیکن حق تلفی کی جوابدہی سے کوئی نہ بچ سکے گا۔

صحیفوں کے کھولے جانے سے انسان اپنے اقوال واعمال کی تفصیل معلوم کرلے گا۔

آسمان کی پوست وکھال اتارنا کنایہ ہے عالم مثال کی تجلی سے عالم مثال کا مرکز ومعدن افلاک کی قوتِ خیالیہ ہے، سو آسمان کی پوست اتر جانے سے انسان اپنے اعمال کی مثالی صورتیں دیکھے گا، اور اس پر حقیقت حال کھل جائے گی۔ ع

که باکے باخته ام عشق درشب دیجور

اپنے اعمال کے موافق دوزخ کے بھڑکائے جانے، جنت کے قریب لانے، اس کی آرائش و سجاوٹ کے واقعہ سے اس پر اپنے اعمال پھر اپنے انجام کے اعتبار سے تمام صورت حال کھل کر سامنے آجائے گی چونکہ یہ سب کچھ اس کے اعمال کا کیا دھرا ہی ہے اور اسی کی صورتِ مثالی ہے اس وقت اس آیت کا مضمون اس کے سامنے جلوہ گر ہوگا، "عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ"

یہ چھ انقلاب وحوادث عالم آخرت اور انسان کے قوائے عقلیہ وخیالیہ سے تعلق رکھتے ہیں، اس تقریر سے اس ترتیب کی رعایت کی وجہ بھی ظاہر ہوگئی۔

عالم برزخ کے متعلق فائدہ

اوپر کی تفصیل سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ عالم برزخ میں انسان کا نفس اگر چہ بدن سے جدا رہتا ہے لیکن اس کو اپنے اعمال کے تمام احوال پر اطلاع ممکن نہیں ہے کیونکہ زمین وآسمان ابھی تک قائم ہیں اس کو اپنے سابقہ مکانات کے ساتھ تعلق، پسندیدہ چیزوں کی طرف رغبت، اپنے اقرباء کے حال کی طرف توجہ، اور گذرے ہوئے حالات کی یاد ابھی تک کچھ باقی ہے، ابھی تک نفسِ انسانی خالص طور پر اور کامل درجے میں عالم غیب میں نہیں پہنچا اس لئے اس کو عالم برزخ کہتے ہیں کہ کسی درجے میں اس کا تعلق دنیا کے ساتھ ہے اور کسی درجے میں اس کا تعلق عالم آخرت کے ساتھ بھی ہے، درمیان درمیان ہے دنیا وآخرت

کی درمیانی حالت ہے، برزخ کا معنی درمیان کی آڑ ہوتا ہے۔

عالم برزخ کی مثال یہ ہے جیسے کوئی آدمی بہت عرصہ تک ایک شہر یا ملک میں رہا پھر کسی دوسرے شہر میں چلا گیا مگر اس کا ایک گھر ابھی تک سابقہ شہر میں بھی ہے رشتہ دار بھی ہیں خط و کتابت اور آمد و رفت بھی جاری رہتی ہے ایسی صورت میں اس آدمی کا تعلق سابقہ شہر سے مکمل طور پر ختم نہیں ہوا۔

الحمد لله تمت مقدمة سورة التكوير

تفسیر سورة التکویر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ○

جب سورج کی دھوپ تہہ ہو جائے

''تکویر'' کے معنی لغت میں کسی چیز کے گرد لپیٹنے کے ہیں، عمامے کے پیچ کو ''کور'' کہتے ہیں، ''کور العمامة'' اسی سے ہے۔

''تکویر شمس'' میں استعارہ ہے

تکویر کی نسبت شمس کی طرف کرنے میں استعارہ ہے، آفتاب کی طویل شعاعیں ختم کر دینے کو پگڑی کے لپیٹ دینے سے تشبیہ دی ہے، جب اس کی شعاعیں پھیلی ہوئی تھیں تو گویا وہ اس کپڑے کے تھان کی طرح تھا جس کو کھول کر پھیلا دیا گیا ہو، اور شعاعیں جب ختم کر دی گئیں اور اس کا وجود ٹکی کی طرف رہ گیا تو گویا ان شعاعوں کو کپڑے کے تھان کی طرح لپیٹ دیا گیا۔

حدیث شریف میں آتا ہے ''**الشمس والقمر ثوران مکوران یوم القیامة**'' یعنی قیامت کے دن سورج اور چاند پنیر کی دو ٹکیوں کی طرح بے نور پڑے ہوں گے بعض روایات میں ''ثورانِ عقیرانِ'' کے الفاظ بھی آئے ہیں یعنی کٹی ہوئی کونچوں والے دو بیلوں کی طرح ہوں گے، ان کا دور و سیر جو جاری رہا کرتا تھا سب ختم ہو چکا ہوگا۔

حدیث میں چاند وسورج کو، ثوران مکوّران کہنے کی وجہ

''ثور'' لغت میں بیل کو کہتے ہیں اور پنیر کی چکی کو بھی کہتے ہیں، جب ستاروں کی ارواح کا تعلق ستاروں کے وجود سے منقطع ہو جائے گا تو ستاروں کا نور بھی زائل ہو جائے گا، اور ان کا دورو سیر یعنی اپنی منازل کی طرف چلنا، آنا جانا یہ بھی ختم ہو جائے گا، حدیث میں زوال نور کی طرف نظر کر کے ان کو پنیر کی چکی سے تشبیہ دی گئی اور کبھی ان کی حرکت کے ختم ہو جانے کی طرف نظر کر کے کٹی ہوئی کونچوں والے بیلوں سے ان کو تشبیہ دی گئی ہے۔

صرف تکویر شمس کے ذکر کی وجہ

اس حادثے میں حدیث کی رُو سے اگرچہ سورج و چاند دونوں ہی بے نور ہو جائیں گے مگر سورت میں صرف سورج کے بے نور ہونے کا خاص طور پر اس لئے ذکر کیا ہے کہ چاند کی روشنی ذاتی نہیں سورج کی روشنی سے ہی چاند بھی روشن ہوتا ہے، جب سورج کے بے نور ہونے کا ذکر کر دیا گیا تو خود ہی چاند کا بے نور ہو جانا بھی معلوم ہو گیا، اس کے بے نور ہونے کو علیحدہ سے بیان کرنے کی ضرورت نہ رہی۔

وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ

اور جب تارے میلے ہو جائیں

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ستارے نور کی زنجیروں میں لٹکتے ہیں، وہ زنجیریں فرشتوں کے ہاتھوں میں ہیں، جب فرشتے مرجائیں گے زنجیریں ان کے ہاتھوں سے گر جائیں گی ستارے گر کر بکھر جائیں گے اور بے نور ہو جائیں گے۔

ستاروں پر جو انقلاب آنے والا ہے اس سورت میں اس انقلاب کی انتہاء کا ذکر ہے (یعنی اوّلاً وہ ٹوٹ کر بکھریں گے، یہ اس انقلاب کی ابتداء ہے پھر بے نور ہو جائیں گے یہ اس انقلاب کی انتہا ہے) اور اگلی سورت میں اس انقلاب کی ابتداء کا ذکر ہے۔

سورۂ تکویر میں ''نجوم'' اور سورۂ انفطار میں ''کواکب'' کا لفظ اختیار کرنے کی وجہ

یہاں ''نجوم'' کا لفظ اختیار کیا گیا ہے اور اگلی سورت ''انفطار'' میں ''کواکب'' کا لفظ آیا ہے اس کی

ایک وجہ تو اسلوب میں تفنن ہے (جو بلاغت کا حصہ ہے) دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ ''نجم'' کے لفظ سے ذہن فوراً ظہور طلوع اور اشراق کی طرف جاتا ہے اس لئے روشنی وچمک کے مناسب انکدار (بے نور ہونا) ہے (یہاں انکدار کی نسبت کی جارہی ہے لہٰذا ''نجم'' کا لفظ اختیار کیا گیا)

اور ''کواکب'' کے لفظ سے استقرار واستحکام سمجھا جاتا ہے اس کے مناسب انتشار ہے (اس لئے وہاں ''کواکب'' کا لفظ آیا ہے تاکہ اس کی طرف انتشار (انتثار) کی نسبت کی جائے)

وَاِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ

اور جب پہاڑ چلائے جائیں

یعنی بادلوں کی طرح ہواؤں میں اڑائے جائیں گے، پہاڑ جو زمین کو اپنے بھاری وزن کے ذریعہ ہلنے سے روکے ہوئے تھے، زمین کا ٹھہراؤ انہی کے بل بوتے پر تھا، جب ان کی یہ حالت ہوگی تو زمین کو بھی اسی پر قیاس کر لینا چاہئے کہ اس کی خرابی کا کیا حال ہوگا۔

وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ

اور جب بیاتی اونٹنیاں چھٹی پھریں

یعنی جب دس ماہ کی گابھن اونٹنیاں چھٹی پھریں گی، ان کے مالک ان کی طرف کوئی توجہ نہیں دیں گے۔

گابھن اونٹنی کی تخصیص کی وجہ

اس جگہ گابھن اونٹنی کا خاص طور پر اس لئے ذکر فرمایا کہ یہ بتانا مقصود ہے کہ انسان اپنے مال و اسباب سے کتنا بے تعلق ہو چکا ہوگا، اور تمام اموال میں جانور سب سے زیادہ حفاظت وخبر گیری کے محتاج ہوتے ہیں، زر وجواہر، کھیتی باڑی، باغات اور عمارات اتنی زیادہ خبر گیری کے محتاج نہیں ہوتے، جانوروں کی طرف انسان کی ہر وقت توجہ رہتی ہے، کبھی دھوپ سے سائے میں باندھنا، کبھی سائے سے دھوپ میں باندھنا، پھر چارہ دانہ پانی کی فکر رہتی ہے کہ جانوروں کی ضرورت ہے، جبکہ دوسرے اموال کو حفاظت میں رکھنے کے بعد کچھ بے فکری حاصل ہو جاتی ہے۔

دوسرے، اہل عرب کے نزدیک گابھن اونٹنی انتہائی قیمتی مال سمجھا جاتا تھا، اس لئے کہ اس میں دو خوشیاں ہوتی تھیں ایک بچہ جننے کی، دوسری دودھ کی کہ یہ جانور دوسرے جانوروں کے مقابلے میں دوگنا

تین گنا زیادہ دودھ دینے والا ہوتا تھا، لہٰذا ایسے قیمتی مال کی طرف بہت توجہ اور اس کے ساتھ خاص قلبی لگاؤ ہوتا ہے، چونکہ قرآن کے مخاطب اوّل اہلِ عرب ہی تھے اس لئے بلاغت کے تقاضے کے مطابق وہ چیز ذکر فرمائی جو جلد ان کی سمجھ میں آجائے۔

(ایسی چیز جس کے ساتھ تعلق ولگاؤ کی گونا گوں وجوہات ہیں اس کے باوجود اس دن کی ہولناکی کا یہ عالم ہوگا کہ انسان اس سے بے تعلق ہوجائے گا)

ایک اشکال اور اس کا حل

یہاں پر ایک اشکال ہے جس کو بہت سے ذہین لوگ مشکل سمجھتے ہیں، حاصل اس کا یہ ہے کہ جب صور پھونکا جائے گا تو تمام جانور مرجائیں گے اس کے بعد قیامت قائم ہوگی اس وقت اونٹنیاں کہاں ہوں گی جو چھٹی پھریں گی، اور صور پھونکنے سے پہلے اگر فرض کریں تو اس وقت قیامت ہی قائم نہ ہوئی ہوگی کہ اس کی وجہ سے اونٹنیاں معطل پھریں پھر یہ کس وقت کی بات ہے؟ اکثر عقلا و دانشمندوں نے اس کا حل یہ پیش کیا ہے کہ یہ ایک فرضی وخیالی بات ہے، کہ بالفرض اگر اس دن گابھن اونٹنیاں ہوں تو وہ چھٹی پھریں ایسا شدید اور خوفناک دن ہوگا، ان کی طرف کوئی توجہ بھی نہ کرے جیسے ''یوم یجعل الولدان شیبا'' میں یہی بات کہی گئی ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی تحقیق

تأمل وغور کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس تکلف کی ضرورت نہیں جو لوگوں نے کیا ہے، اس لئے کہ جب اسرافیل علیہ السلام صور پھونکیں گے اس وقت سب انسان وجانور جن میں یہ حاملہ اونٹنیاں بھی ہوں گی مرجائیں گے، پھر دوبارہ صور پھونکیں گے تو سب زندہ ہوجائیں گے، جن میں دس ماہ کی گابھن اونٹنیاں بھی ہوں گی وہ اسی حالت میں زندہ ہوں گی، چونکہ صحیح حدیث میں آیا ہے کہ جو جس حال میں مرے گا اسی حال میں اٹھایا جائے گا، چنانچہ ان اونٹنیوں کے مالک اس وقت ان کی طرف کوئی توجہ نہیں کریں گے۔

''عشار'' کی ایک اور تفسیر

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ''عشار'' سے مراد بادل ہیں، کیونکہ عرب بادلوں کو حاملہ جانور کی طرح

قرار دیتے ہیں، جس طرح جانوروں میں نر مادہ کے ملاپ سے حمل قرار پاتا ہے، اسی طرح بادلوں میں ہوا کے ملاپ کی وجہ سے پانی بھر جاتا ہے، گویا ہوا نر کی طرح اور بادل مادہ کی مانند ہوئے، اب معنی یہ ہوں گے کہ بادل اس دن پانی سے خالی ہوں گے کسی کام کے نہ ہوں گے، لیکن اس تفسیر میں جو کچھ بُعد ہے وہ ظاہر ہے۔

"عشار" کی وجہ تسمیہ

عشار عشراء کی جمع ہے جیسے نفاس، نفساء کی جمع ہے، عشراء دس مہینے کی گابھن اونٹنی کو کہتے ہیں، سال پورا ہونے تک اس کو یہی کہتے ہیں اگرچہ اونٹنی کی کل مدتِ حمل پورا سال ہے، اس لئے اس کو یہاں اس نام سے ذکر فرمایا۔

وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ

اور جب جنگل کے جانوروں میں رول پڑ جائے

یعنی جس وقت وحشی جانور جمع کئے جائیں گے، یعنی وہ جانور جو پہاڑوں اور جنگلوں میں رہنے والے ہیں، وہ انسانوں کے ساتھ آ کر جمع ہو جائیں گے، یہ اس وجہ سے ہوگا کہ پہاڑ اور جنگل خراب ہو جائیں گے، آگ اور دھواں ہر طرف سے آ کر ان جانوروں کو گھیرے گا وہ بدحواس ہو کر انسانوں کے مجمعوں میں آ کر گھسیں گے، جیسے سرد علاقوں میں برف پڑنے کے زمانے میں وحشی جانور لوگوں کے گھروں میں آ کر گھستے رہتے ہیں اور وحشت بھول جاتے ہیں۔

اس واقعہ میں واضح دلیل ہے اس بات کی کہ اس دن کی ہولناکی اتنی شدید ہوگی کہ وحشی جانوروں کو انسانوں سے طبعی نفرت نہ رہے گی، ایک دوسرے سے جو طبعی خوف ہے وہ بھی اس دن نہیں رہے گا۔

حشر وحوش کی دوسری تفسیر

حضرت قتادہ اور دوسرے مفسرین نے کہا ہے ان وحشیوں کے حشر سے مراد ان کا زندہ کرنا ہے، قصاص کے لئے ان جانوروں کو دوبارہ زندہ کیا جائے گا، چنانچہ حدیث میں ہے کہ جانوروں میں بھی قصاص جاری ہوگا، یہاں تک کہ بے سینگ والی بکری کو سینگ والی بکری سے قصاص دلایا جائے گا، قصاص ہو جانے کے بعد سب خاک کر دیئے جائیں گے۔

بعض جانور جنت میں ہوں گے اور بعض دوزخ میں

جو جانور اللہ کے نام پر ذبح کئے گئے تھے وہ جنت کی خاک بنیں گے، مگر وہ جانور جو جنت والوں کی تفریح اور خوشی کا ذریعہ ہوں گے وہ جنت میں باقی رہیں گے، جیسے مور، گھوڑا یا اور کوئی خوبصورت یا خوش آواز جانور اس کے علاوہ وہ جانور جو جنت والوں کی پسندیدہ غذا ہوں گے وہ بھی ہوں گے، چنانچہ سورۂ واقعہ میں اس کا ذکر آیا ہے "وَلَحْمِ طَيْرٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ"

اسی طرح وہ جانور جو دوزخیوں کی تکلیف وعذاب کا ذریعہ ہوں گے وہ دوزخ میں رہیں گے جیسے سانپ، بچھو، اور مکھی، مکھی ان کے جلے بھنے بدن پر بیٹھے گی جس سے ان کی تکلیف میں اضافہ ہوگا، لیکن اللہ کی قدرت سے ان جانوروں کو دوزخ کی آگ سے کچھ تکلیف نہیں پہنچے گی، حدیث شریف میں آتا ہے "الذباب كله في النار" اور دوسری حدیث میں آتا ہے "ان في الجنة طيرا ناعمة وأكلها انعم منها"

وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ

اور جب دریا جھونکے جائیں

یعنی جس دن دریا بھڑکائے جائیں گے، ان کا پانی آگ اور دھواں بن جائے گا، یہ آگ اور دھواں جب ہوا کے ساتھ ملے گا تو ہوا کے اندر گرمی اور حرارت بہت زیادہ ہو جائے گی، جس کی وجہ سے اہل محشر کو سخت تکلیف ہوگی، لیکن ایمان والوں کو اس سے کچھ زیادہ تکلیف نہیں ہوگی، صحیح حدیث میں آتا ہے کہ اس دن دھوئیں سے اہل ایمان کو زکام سا ہوگا اس سے زیادہ تکلیف نہیں ہوگی۔

وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ

اور جب جیوں کے جوڑے باندھے جائیں

یعنی نفوس انسانی کو آسمان وزمین کے نفوس کے ساتھ ملایا جائے گا تا کہ انسانی نفوس کے اندر خیر وشر معلوم کرنے کی قوت زیادہ ہو جائے اس کے نتیجے میں وہ ہر عمل کی پوری سزا کا احساس پورے کامل درجے میں کرسکیں۔

تزویج نفوس کی تفسیر میں دوسرا قول

بعض نے کہا ہے تزویج نفوس سے مراد روحوں کا اپنے جسموں سے ملنا ہے۔

تیسرا قول

بعض نے کہا کہ تزویج تقسیم کے معنی میں ہے یعنی لوگوں کی تین قسمیں کردی جائیں گی جس کی تفصیل سورۂ واقعہ کی اس آیت میں ہے "وَكُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً"

چوتھا قول

بعض نے کہا ہے کہ ہر شخص کو اپنے ہم مشرب وہم مذہب آدمی کے ساتھ اکٹھا کر کے سب لوگوں کے الگ الگ گروہ بنا دیئے جائیں گے، خیر وشر کے طبقوں کی رعایت کے ساتھ یہ ترتیب ہوگی (سو تزویج نفوس سے یہی مراد ہے)

پانچواں قول

بعض نے کہا ہر شخص کا حشر اس کے ساتھ ہوگا جس کے ساتھ دنیا میں وہ بہت زیادہ محبت رکھتا تھا چاہے جس سے وہ محبت رکھتا تھا وہ نیک ہو یا بُرا، جیسے استاذ، پیر ومرشد اور بادشاہ وامیر، (تو تزویج نفوس سے ان کے ہاں یہ مراد ہے)

چھٹا قول

حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ مؤمنین کی روحوں کو "حور عین" کے ساتھ ملا دیا جائے گا اور کافروں کی روحوں کو شیطانوں کے ساتھ جوڑ دیا جائے گا (تزویج نفوس کی تفسیر ان کے ہاں یہ ہوئی)

ساتواں قول

زجاجؒ نے کہا ہے کہ ہر انسان کو اس کے عمل کی صورت مثالی کے ساتھ اکٹھا کیا جائے گا خواہ اس کے اعمال نیک ہوں یا بُرے ہوں (تزویج نفوس کا یہی معنی ہے)

وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ

اور جب بیٹی جیتی گاڑ دی گئی کو پوچھیں

یعنی جب موءودۃ سے پوچھا جائے گا، موءودۃ لغت میں اس لڑکی کو کہتے ہیں جو زندہ گاڑ دی گئی ہو

یہ لفظ مشتق ہے "واد یئد" سے۔

عرب کے معاشرے میں یہ رسم تھی کہ لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی زندہ دفنا دیا کرتے تھے، اور اس رسمِ بد کے مختلف اسباب تھے۔

لڑکیوں کو زندہ دفنانے کے اسباب

بعض اس وجہ سے زندہ دفناتے تھے کہ تنگدستی کا خوف تھا، لڑکی کی شادی بیاہ کے اخراجات کے ڈر سے ایسا کرتے تھے، بعض اس عار و شرم میں مبتلا تھے کہ ہم بیٹی کسی کو دیں گے تو وہ ہمارا داماد کہلائے گا اس بات کو وہ عار سمجھتے تھے، اس فاسد و بے ہودہ خیال میں گرفتار ہو کر یہ بدترین کام کرتے تھے، اس زمانے میں اس بدترین عمل کا کچھ ایسا رواج پڑ گیا تھا کہ لوگ اس کو غیرت مندی سمجھتے اور اس پر فخر کرتے تھے، اس بدترین گناہ کے ارتکاب پر انہیں عذاب کا خوف بھی نہیں تھا، قرآنِ کریم نے جابجا ان کے اس بُرے فعل کی مذمت کی ہے۔

لڑکیوں کو زندہ دفنانے کی برائیاں

اس قبیح فعل میں بہت سی برائیاں ہیں ایک تو یہ کہ اس میں قطع رحمی ہے اپنی اولاد کو زندہ درگور کرنا سب سے بڑی قطع رحمی ہے، دوسرے ظلم و ستم ہے ایک معصوم و بے گناہ کا خونِ ناحق ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ارادے و مرضی پر ناخوش ہونا ہے کہ اس نے لڑکی پیدا کیوں کی، اللہ تعالیٰ کا مقابلہ کرنا لازم آتا ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے نو مہینے ماں کے پیٹ میں پرورش کیا اس کے پیدا ہوتے ہی اس کو ہلاک کر ڈالنے کا ارادہ کیا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کے رزاق و کارساز ہونے پر بے اعتمادی کا اظہار ہے، اس کے ساتھ انتہائی درجے کا بخل بھی ہو رہا ہے کہ اولاد پر خرچ کرنے کی بجائے اولاد کو ہلاک کرتا ہے۔

اسی طرح اور بہت سی قباحتیں ہیں، خود عرب کے اندر جو سمجھدار لوگ تھے انہی برائیوں کے معلوم ہو جانے کے بعد وہ اس فعل قبیح سے دوسروں کو روکتے تھے، لیکن قوم کی رسم کے سامنے مجبور و بے بس تھے۔

زید بن عمرو بن نفیل کا کارنامہ

چنانچہ حضرت امیر المؤمنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے چچازاد بھائی زید بن عمرو بن نفیل زمانۂ

جاہلیت میں اس رسمِ بد کے سدِ باب کی کوشش میں سرِ فہرست تھے، جہاں سنتے کسی کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی ہے اور اس کے زندہ درگور ہونے کا اندیشہ ہے وہ فوراً وہاں پہنچتے گھر والوں سے کہتے بس یہ میری بیٹی ہے اس کے کھانے پینے کے جملہ اخراجات شادی بیاہ تک سب میرے ذمے ہیں اس طرح انہوں نے بہت سی لڑکیاں بچالیں، اسی وجہ سے ان کا لقب "محی الأموات" مشہور ہوگیا تھا (یعنی مردوں کو زندہ کرنے والے)

ان کو دیکھ کر ان کی اتباع میں دوسرے قبائل میں بھی بہت سے ایسے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے جو اس رسمِ بد کو روکنے کے لئے کوشش کرنے لگے انہی میں فرزدق شاعر کے دادا ''صعصعہ'' بھی ہیں، اسی وجہ سے فرزدق نے اپنے اشعار میں اپنے دادا کی بہت تعریف کی ہے۔

چھوڑے ہوئے گناہ میں شیطان کے پھنسانے کا طریقہ

یہ گناہ اُمت میں ایک نئے طریقے سے ظاہر ہوا ہے، اور شیطان کے گمراہ کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ جب لوگ کسی گناہ کو شرعی یا عقلی دلائل کی وجہ سے بُرا جان کر چھوڑ دیتے ہیں تو شیطان اسی گناہ کو کسی نئی صورت میں لوگوں کی نظروں میں عمدہ کر کے پیش کرتا ہے تاکہ اس کا اصل مقصد فوت نہ ہو، زندہ درگور والے گناہ کو اس طرح نئی صورت میں ظاہر کیا ہے کہ اگر کسی کو لونڈی یا کم اصل بیوی کے حمل ٹھہر جاتا ہے تو وہ اس حمل کو چار ماہ گذرنے کے بعد بھی جبکہ روح پڑ چکی ہوتی ہے گرا دیتا ہے تاکہ کسی کم اصل آدمی کو داماد نہ بنانا پڑ جائے، پھر اس بُرے فعل پر وہ فخر بھی کرتا ہے، حالانکہ اس بدترین فعل اور بچی کو زندہ درگور کرنے کے درمیان سرِ مو فرق نہیں ہے۔

روح پڑنے سے پہلے حمل گرانے کی تحقیق

اس میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کا اختلاف ہوا ہے کہ جان پڑنے سے پہلے حمل گرانا جائز ہے یا نہیں؟ بعض فرماتے تھے کہ عذرِ شرعی کی وجہ سے گرا دینا جائز ہے، مثلاً ولادت کی تکلیف کا تحمل اگر نہ ہو، یا عیال کی کثرت ہے، یا تنگدستی ہے یا مسافرت سے دوچار ہے، یا لونڈی ہے اس کے متعلق یہ خیال ہے کہ بچہ کی پیدائش کے بعد خدمت کی نہیں رہے گی، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دربار میں اس بارے میں بہت گفت وشنید جاری رہی یہاں تک کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"واللہ لاتکون موء ودۃ حتی تأتی علیہ التارات السبع" (۱)

اس بات کو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے پسند فرمایا اور اسی پر فیصلہ ہو گیا، لیکن بعض صحابہ کرام احتیاط کے پیشِ نظر اس کے جواز کے قائل نہ تھے، اس کو موء ودہ صغریٰ کہا کرتے تھے اس لئے کہ یہ اگرچہ قتلِ نفس کامل نہیں ہے، تاہم رزق کے معاملے میں عدمِ توکل، اور صورتاً اللہ کے فعل کے ساتھ معارضہ بالضد لازم آرہا ہے اس کے علاوہ دیگر قباحتیں بھی پائی جاتی ہیں۔

لیکن صحیح بات یہی ہے کہ یہ جائز ہے عزل پر قیاس کرتے ہوئے۔

عزل اور مانع حمل ادویہ کا حکم

حدیث میں عزل کے بارے میں جو "ذلک وادخفی" کے الفاظ آئے ہیں اس سے عزل کے حرام ہونے پر دلالت نہیں ہوتی، ہاں کراہت ثابت ہوتی ہے اور اس سے اس طرف اشارہ ہے کہ عزل کے نتیجے میں اولاد کا حصول نہ ہو سکے گا، یہ مطلب نہیں کہ جو حکم وأدِ جلی کا ہے وہی وأدِ خفی کا ہے، خفی اس کے طرف جلی کے حکم میں نہیں ہوتا، مثلاً ریا کو شرکِ خفی کہا گیا ہے لیکن وہ شرکِ جلی کے حکم میں نہیں ہے۔

اور عزل کا جواز روایات صحیحہ مشہورہ سے ثابت ہے "لا شبھۃ فیہ" اسی طرح مانع حمل دوائیں استعمال کرنا، حمل سے پہلے یا بعد، عزل کی طرح جائز ہے۔

ایک شبہے کا ازالہ

یہاں اکثر لوگوں کو ایک شبہہ ہوتا ہے کہ موء ودہ بے چاری تو مظلوم ماری گئی اس سے سوال کے کیا معنیٰ؟ سوال تو قاتل سے ہونا چاہئے تھا کہ تو نے اس کو کیوں قتل کیا تاکہ سرزنش ہوتی؟

جواب اس کا یہ ہے کہ موء ودہ سے سوال اس طرح نہیں ہوگا کہ تُو کیوں قتل ہوگئی؟ بلکہ اس انداز سے ہوگا کہ تُو کس جرم کی وجہ سے قتل کی گئی؟ ظاہر ہے یہ سوال مظلوم سے ہی کیا جانا چاہئے کیونکہ اس سے مقصد دعویٰ کرنے کی تلقین ہے کہ وہ کہہ سکے مجھے بلاوجہ فلاں نے قتل کیا اور مجھ پر ظلم کیا۔

---

(۱) خدا کی قسم وہ مؤودۃ نہیں کہلائے گی جب تک اس پر سات دور نہ گذر جائیں، حمل پر سات دور گذرتے ہیں ہر دور چالیس دن کا ہوتا ہے تو مطلب یہ ہوا کہ حمل جب تک نو ماہ کا نہ ہو جائے اس کا گرانا مؤوودہ کے حکم میں نہیں ہے ۱۲ سفیر احمد

موءودہ سے سوال کرنے کی حکمتیں

مؤودہ سے سوال کرنے میں بہت سے اسرار ہیں، یہ بھی ہے کہ اس جہاں میں اگرچہ شعور اور سمجھ بوجھ کی صلاحیت بچی کے اندر پیدا ہو جائے گی تاہم دنیا کے مشاق مقدمہ بازوں کی طرح نہ ہوگی اس لئے تلقینِ دعویٰ کے لئے اس سے یہ سوال ہوگا۔

یہ بھی ہے کہ جب وہ قتل کی گئی تھی اس کو تکلیف کا خاص احساس نہیں ہوا تھا وہ زندگی تو اس کے لئے محض خواب کی طرح تھی آنکھ کھولی تھی کہ ختم ہوگئی (اس لئے شاید اس کو یاد بھی نہ ہو کہ اس پر کسی نے ظلم کیا تھا)

یہ بھی ہے کہ ماں باپ پر پہل کرتے ہوئے دعویٰ کرنے میں شاید اس کو حیا آئے۔

ان ساری وجوہات کی بنا پر ضروری ہوا کہ اسے دعویٰ یاد دلایا جائے، اس انداز سے اس کے ساتھ بات کی جائے کہ اس کو دعویٰ کرنا آسان ہو جائے، جیسے کوئی ناسمجھ مظلوم جب اپنی بات اور دعویٰ پیش نہیں کرسکتا تو عدل وانصاف والے حکام اس کو دعویٰ کی خود تلقین کرتے ہیں تاکہ اس کے حقوق ضائع نہ ہوں، اسی طرح اگر کوئی دنیا میں ایسا مظلوم ہو جو ظالم کے خوف سے یا شرم سے اپنی بات صاف صاف نہ کرسکتا ہو تو ارباب عدالت یہی طریقہ اختیار کرتے ہیں۔

فقہاء نے بھی ایسے موقعہ پر مدعی اور شاہد کو تلقین کرنا درست قرار دیا ہے، کیونکہ اس کے بغیر مظلوم کو اس کا حق نہیں دیا جاسکتا۔

اس کے باوجود بظاہر والدین کے ساتھ اولاد کے ادب کی رعایت کی گئی ہے، کہ قاتل کا ذکر نہیں ہے گویا قاتل سے کوئی سروکار نہیں ہے، یہ اس لئے تاکہ والد کی رسوائی نہ ہو، اسی لئے مجہول کا صیغہ لائے ہیں (اگرچہ نتیجتاً زبردست رسوائی ہے جیسا کہ آئندہ آرہا ہے)

سوال اس گناہ کے بارے میں ہوا جس کی وجہ سے قتل کی گئی ہے، گویا اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ والدین کی اپنی اولاد کے ساتھ شفقت ومحبت ایسی ہوتی ہے کہ کسی عظیم گناہ کے بغیر تم سے یہ معاملہ نہ کیا ہوگا اس لئے وہ گناہ بتاؤ کیا ہے؟ مؤودہ سے سوال کرنے میں والدین کے ساتھ ادب کی رعایت درحقیقت ان کی رسوائی اور کمال ذلت کا سبب ہوگی، بالخصوص مؤودہ سے گناہ کا سوال کرنا جب کہ وہ گناہ

کی اہل ہی نہیں ہے والدین پر صریح الزام کی تعریض ہے، اگر بجائے اس کے پہلے ہی والدین سے براہِ راست سوال کیا جاتا کہ بے گناہ بیٹی کو کیوں قتل کیا تو اس میں اس درجہ رسوائی اور خوف و دہشت ان پر اتنا طاری نہ ہوتا۔

اس میں یہ بھی ہے کہ ان کی کمال بدبختی و شقاوت ظاہر کرنا مقصود ہے کہ وہ اس بدترین گناہ کی وجہ سے اللہ کے قہر و غضب کے اتنے مستحق ہوئے کہ ان سے یہ پوچھنا بھی گوارہ نہیں کہ انہوں نے اس کو کیوں قتل کیا، بلکہ خود مقتولہ بیٹی سے پوچھا جارہا ہے کہ اسے کیوں قتل کیا گیا، اگر ان سے براہِ راست خطاب و کلام کیا جائے تو کلام باری تعالیٰ کی لذت سے عذاب و مصیبت کی تکلیف میں کمی واقع ہوگی، چنانچہ کسی کا شعر ہے۔

پُرسش اگر نیست بگونا سزا
کز دہنت یک سخنم آرزو است

''انا للہ وانا الیہ راجعون''

الوائدة والموء ودة فی النار کا مطلب

حدیث میں آتا ہے الوائدة والموء ودة فی النار جس عورت نے اپنی بیٹی زندہ گاڑی وہ اور اس کی بیٹی دونوں جہنم میں جائیں گی، یہ صحیح حدیث ہے، معتزلہ کو اس حدیث سے بہت حیرت ہوئی، اس کے مقابلے میں وہ اس آیت سے استدلال کرتے اور کہتے ہیں کہ وہ رب جو کافر سے بیٹی کو زندہ دفنانے پر باز پرس کرے گا ممکن نہیں ہے کہ وہ خود اس موء ودہ کو عذاب دے۔

ان لوگوں کا اس آیت سے استدلال کرنا پرلے درجے کی جہالت ہے، کیونکہ ماں باپ کو خونِ ناحق کی وجہ سے عذاب ہوگا اور مؤودہ کو کفر میں ان کے تابع ہونے کی وجہ سے عذاب ہوگا جیسے ظالم و مظلوم اگر دونوں کافر ہوں تو دونوں کو عذاب ہوگا اصل عذاب جو کفر کی وجہ سے ہے وہ دونوں کو ہوگا اگرچہ ظالم کو ظلم کی وجہ سے بھی ہوگا، اسی لئے اہل سنت کے نزدیک شریعت کے قاعدے کے مطابق کفار کے بچوں کا معذّب ہونا ظاہر ہے کیونکہ وہ ماں باپ کے ٹکڑے کی طرح ہیں جب والدین کو عذاب دیا جائے گا ان کے ساتھ ان کی معیت میں نفسِ سادہ کو بھی عذاب دیا جائے گا۔

جیسے جڑواں بچے ہوتے ہیں خوشی، غم اور بھوک و پیاس ایک ساتھ محسوس کرتے ہیں کیونکہ ابھی تک

ان کا اتصال نفسانی الگ الگ نہیں ہوا۔ واللہ اعلم (۱)

بِاَیِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ

کہ کس گناہ پر وہ ماری گئی

قُتِلَتْ کے اندر نکتہ

یہاں ایک نکتہ ہے وہ یہ کہ "قُتِلَتْ" کا صیغہ لائے ہیں، جو غائب کا صیغہ ہے، مقام کا تقاضا یہ تھا کہ مخاطب کا صیغہ لاتے، کہ تجھے کیوں قتل کیا گیا اس کا حل یہ ہے کہ یہاں اصل مقصود قیامت کے واقعات کو بیان کرنا ہے، کہ وہاں ایسا ایسا ہوگا چنانچہ موٗودہ کے بارے میں بتلایا کہ اس سے سوال کیا جائے گا کہ وہ کیوں قتل کی گئی، بعینہٖ وہاں جو اس سے سوال ہوگا خطاب کے صیغہ کے ساتھ اس کی حکایت نہیں ہو رہی۔

قتلِ اولاد کا دنیوی حکمِ شرعی

اگر غلطی سے کسی کے ہاتھ سے اپنی اولاد ضائع ہو جائے، جیسے چار ماہ کے بعد حمل کا گرا دینا، یا اندازے سے زیادہ افیون کھلا دینا جس سے وہ ہلاک ہو جائے یا حفاظت میں کوتاہی کی جیسے کوئی عورت بچے کو لے کر چھتے پر بیٹھی اس کو کھلا رہی تھی اچانک بچہ ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا اور مر گیا، ایسی صورت میں فقہ میں حکم شرعی یہ مذکور ہے کہ کفارہ لازم ہوتا ہے۔

اور حضرت قتادہ سے روایت ہے کہ قیس بن عاصم تمیمی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، عرض کیا زمانہ کفر میں مجھ سے بہت سنگین گناہ ہوا، کہ میری آٹھ بیٹیاں ہوئی ان سب کو میں نے زندہ دفنا دیا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر بیٹی کے بدلے میں ایک غلام آزاد کرو، اس نے کہا میں اونٹوں والا ہوں غلام تو میرے پاس نہیں ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ایک اونٹ ایک بیٹی کے بدلے میں اللہ کے راستے میں دو۔

---

(۱) الوائدۃ والموٗدۃ میں ایک تاویل یہ بھی کی گئی ہے کہ اس کا صلہ مقدر ہے تقدیر یوں ہے "والموٗدۃ لھا" وائدہ سے مراد دایہ جو بچی کو دفناتی ہے اور "موٗدۃ لھا" سے مراد بچی کی ماں جس کے حکم سے بچی کو دفنایا گیا ہے۔ اسی طرح مشرکین کے بچوں کے متعلق اہل السنت کے ائمہ اربعہ سے توقف مروی ہے یا نجات (اشرف التوضیح) سفیر احمد

وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ ○

اور جب اعمالنامے کھولے جائیں

نشرِ صحف کا مطلب

یعنی وہ اعمال نامے جو لپیٹ کر سجین یا علیین میں رکھے گے ہیں کھول دیئے جائیں گے، جو کچھ ان کے اندر درج ہے ہر شخص وہ دیکھ لے گا۔

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اعمال نامے ہر انسان کے مرنے کے بعد لپیٹ کر رکھ دیئے جاتے ہیں۔

بعض مفسرین نے ''نشر'' کا معنی بکھیرنے اور پھیلانے سے کیا ہے یعنی اعمال نامے پھیلا دیئے جائیں گے، جس جگہ رکھے گئے ہیں وہاں سے نکال کر لوگوں میں بانٹ دیئے جائیں گے، کسی کو بائیں ہاتھ میں پشت کی طرف سے اعمال نامہ دیا جائے گا کسی کو سامنے سے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا۔

مرثد بن وداعہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ قیامت کے دن پرچیاں عرش کے نیچے سے اڑائی جائیں گی، اڑتی ہوئی خود لوگوں کے ہاتھ میں آئیں گی جو پرچہ ایماندار کے ہاتھ آئے گا اس پر لکھا ہوگا: ''فی جنة عالیة'' (اعلیٰ مرتبے کی جنت میں ہو) اور جو کافر کے ہاتھ میں آئے گا اس پر لکھا ہوگا ''فی سموم و حمیم'' (گرم لُو اور کھولتے ہوئے پانی میں)

یہ پرچے فال کے قرعوں کی طرح ہوں گے، اعمال کے صحیفے نہیں ہوں گے کشاف میں یہی مذکور ہے۔

وَاِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ ○

اور جب آسمان کا پوست اُتار لیں

یعنی جس طرح جانور کو ذبح کرنے کے بعد اس کی پوست (کھال) اتار دیتے ہیں پھر اس کے تمام اعضاء، اجزاء اور ریشے ظاہر ہو جاتے ہیں ایسے ہی جب آسمان کی کھال اتاری جائے گی تو فلک کی تمام پوشیدہ اشیاء صورِ مثالیہ میں ظاہر ہو جائیں گی، اور صحیفوں کو اٹھانے والے فرشتے اور دوسری قسم کے فرشتے اترنا شروع ہوں گے۔

وَاِذَا الْجَحِيْمُ سُعِّرَتْ ○

اور جب دوزخ دہکائی جائے

یعنی جب دوزخ بھڑکائی جائے گی، اس کی سوزش میں اضافہ ہو جائے گا۔

وَاِذَا الْجَنَّةُ اُزْلِفَتْ ○

اور جب بہشت پاس لائی جائے

یعنی جب جنت محشر کے قریب لائی جائے گی، اس سے مسلمانوں کو خوشی پر خوشی اور کافروں کو حسرت پر حسرت ہوگی۔

یہ بارہ حادثے جن میں سے چھ صور پھونکنے سے پہلے دنیا میں اور چھ صور پھونکنے کے بعد ہوں گے جب ہو چکیں گے تب

عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ

جان لے گا ہر ایک جی جو لے کر آیا

یعنی ہر نفس جان لے گا وہ نیکی یا بدی میں سے کیا ساتھ لایا ہے۔

قیامت کے بارہ حادثات کا موت کے وقت سامنا

بعض اہل تاویل نے کہا ہے کہ ان بارہ حادثات کے نمونہ کے طور پر موت کے وقت انسان کو بارہ حالتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس لئے کہ موت قیامت کا نمونہ ہے اسی لئے حدیث میں آتا ہے "من مات فقد قامت قیامته" چنانچہ موت کو قیامت صغریٰ کہا جاتا ہے، وہ بارہ حالتیں جو ان حادثات کا نمونہ ہیں وہ یوں ہیں کہ روح سورج کی طرح ہے، اس کی شعاع سے بدن زندہ رہتا ہے جب روح کا تعلق جسم سے منقطع ہو گیا تو گویا سورج بے نور ہو گیا، اور ستاروں کے بکھرنے کا نمونہ انسان کے حواس اور قوتوں کا بیکار ہونا ہے کہ موت کے وقت انسان کے اعضاء وقویٰ بیکار ہو جاتے ہیں، اور پہاڑوں کا زلزلہ اس کا نمونہ اعضائے رئیسہ کا معطل ہونا اور بدن کی ہڈیوں کا ٹوٹ پھوٹ کر برباد ہونا ہے۔

گابھن اونٹنی کے معطل ہونے کا نمونہ انسانی دودھ و چربی کا خشک ہونا ہے اور طبعی افعال کا رک جانا

مثلاً جگر اور دیگر اعضاء جو آلات ہیں غذا کے ہضم وغیرہ کے وہ سب بے کار ہو جاتے ہیں۔

اور وحشی جانوروں کے جمع ہونے کا نمونہ افعال بہیمیہ اور سبعیہ کے نتائج کا ظاہر ہونا ہے یعنی نفرت انگیز کاموں کی بدنما شکلیں سامنے آئیں گی۔

دریاؤں کے بھڑکائے جانے کا نمونہ خون اور دوسری رطوبات کا خشک ہونا ہے، یا امیدوں، آرزوؤں کے خیالات وِادہام کا فنا ہونا اس کا نمونہ ہے کہ یہ دریائے ناپیدا کنار ہے اور موت اضطراری یا اختیاری کے بغیر ان کا انقطاع ناممکن ہے۔

تزویج نفوس کا نمونہ ملکات مکسوبہ (کسب شدہ) کا جمع ہونا ہے نورانی ملکات جمع ہوں گے نورانی ملکات کے ساتھ اور ظلمانی ملکات ظلمانی کے ساتھ جمع ہوں گے۔

موءودہ کا نمونہ انسان کی وہ قوت ہے جو اس نے اپنے مصرف پر استعمال نہیں کی کسی غیر مصرف پر اسے برباد کیا تو انسان سے اس کی قوت وصلاحیت کے بارے میں گویا سوال ہوگا کہ کہاں صرف کی؟

دل پر وارد ہونے والے علمی نکتہ کی حفاظت

بعض دانشوروں کا قول ہے اگر کوئی نفیس علمی نکتہ اذکیاء کے دل پر گذرے اس کو لکھ کر محفوظ نہ کرنا اور یوں ہی بھلا دینا موءودہ کے حکم میں ہے۔

آسمان کی کھال اتارنے کا نمونہ موت کے بعد روح کے احکام کا ظاہر ہونا ہے، اور تسعیر جحیم کا نمونہ موت کے بعد کی سختیاں اور شدائد ہیں جو انسان دیکھے گا، بہشت کے قریب لانے کا نمونہ موت کے بعد نیک روحوں کو ملنے والی خوشی اور راحت ہے جس سے گنہگار محروم ہوں گے۔

اور بعض اہل تصوف نے ان سب حالتوں کو سلوک کے مراتب طے کرنے پر منطبق کیا ہے کہ ابتدائے سلوک سے لے کر فنا تک جو منازل آتی ہیں ان پر ان کا انطباق کیا ہے، اس کی تفصیل بہت ہی زیادہ لمبی ہے اس تفسیر کا محل نہیں اس لئے اس کو چھوڑتے ہیں۔

نفسِ انسانی پر خیر وشر کی حقیقت کھلنے کے جو اسباب بیان کئے گئے ہیں ان کی خبر اللہ تعالیٰ نے دی ہے جو سچائی کا خالق اور اصدق الصادقین ہے، اس خبر کے یقینی ہونے میں کوئی شک نہیں ہوسکتا اس لئے یقین دلانے کے لئے قسم کھانے کی حاجت نہیں چنانچہ فرمایا:

فَلَآ اُقۡسِمُ بِالۡخُنَّسِ ۝

سو قسم کھاتا ہوں میں پیچھے ہٹ جانے والوں

الۡجَوَارِ الۡكُنَّسِ ۝

سیدھے چلنے والوں دبک جانے والوں کی

فَلَآ اُقۡسِمُ ، ''پس قسم نہیں کھاتا ہوں'' کیونکہ جب خبر میں نے دی ہے تو قسم کھانے کی حاجت نہیں، لیکن اگر اس کے باوجود تمہیں قسم کی ضرورت ہے تو (سنو) بِالۡخُنَّسِ ۝ الۡجَوَارِ الۡكُنَّسِ ۝ میں قسم کھاتا ہوں پیچھے ہٹنے والے، سیدھے چلنے والے، دبک جانے والے ستاروں کی۔

الخنس، الجوار، الکنس کی تفسیر

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور اکثر مفسرین صحابہ سے منقول ہے کہ ان سے مراد پانچ مشہور ستارے ہیں جن کو ''خمسہ متحیرہ'' کہا جاتا ہے وہ یہ ہیں، زحل، مشتری، مریخ، زہرہ اور عطارد ان کی حرکت تبدیل ہوتی رہتی ہے اس لئے ان کو متحیرہ کہتے ہیں، پہلے ان کی حرکت مغرب سے مشرق کی طرف ہوتی ہے ان کی یہ حرکت برجوں کی ترتیب کے مطابق ہوتی ہے یعنی ''حمل'' سے ثور میں، ثور سے جوزاء میں جاتے ہیں، اس کے بعد تھوڑے دن ان کی حرکت دکھائی نہیں دیتی یوں معلوم ہوتا ہے کہ ایک جگہ پر کھڑے ہیں، پھر الٹی حرکت شروع کرتے ہیں یعنی پہلی حرکت کے خلاف، جس طرف سے آئے تھے اسی طرف واپس جانے لگتے ہیں یہ حرکت مشرق سے مغرب کی طرف ہوتی ہے۔

علم ہیئت کی اصطلاح میں ان کی پہلی حالت کو ''استقامت'' کہتے ہیں دوسری حالت کو ''وقوف'' اور تیسری حالت کو ''رجعت'' کہتے ہیں، یہ تین حالتیں کسی اور ستارے میں نہیں پائی جاتی، مثلاً سورج تھوڑا سا وقوف رکھتا ہے مگر رجعت اس میں نہیں، اور دیگر ستارے وقوف رکھتے ہیں نہ رجعت۔

ستاروں کے تغیرات ان کے فنا کی دلیل ہیں

ان پانچ ستاروں میں حرکتوں کی تبدیلی اس بات کی صریح دلیل ہے کہ عالم افلاک فنا کی زد میں ہے نیز ان ستاروں اور تمام آسمانی چیزوں میں پیدا ہونے والے کسی بڑے انقلاب کے امکان کا ثبوت ہے۔

علم ہیئت والوں کے نزدیک خمسہ متحیرہ کی مختلف حالتوں کی وجہ

ماہرینِ ہیئت نے ان پانچ ستاروں میں رونما ہونے والی ان تین حالتوں استقامت، وقوف، رجعت کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ حوامل اور ان کی تداویر کی مختلف حرکتوں کی وجہ سے یہ مختلف حالتیں ہمیں نظر آتی ہیں۔(۱)

تفصیل یہ ہے کہ حوامل مغرب سے مشرق کی طرف حرکت کرتے ہیں اور ان کے اندر جو دائرے (تداویر) ہیں وہ چونکہ زمین کو شامل نہیں ہیں اس لئے ان کا اوپر والا حصہ مغرب سے مشرق کی طرف اور نیچے کا حصہ مشرق سے مغرب کی طرف حرکت کرتا ہے، ستارے دائروں کے اندر، دائرے حوامل کے اندر اور حوامل آسمان میں جڑے ہوئے ہیں، جب ستارے دائرے میں گڑھے ہوئے اور دائرے حوامل کے اندر ہوئے تو ستاروں کی دونوں حرکتیں شرقاً غرباً جو نظر آتی ہیں وہ بالتبع ہوئیں، ان کی اپنی حرکت نہ ہوئی۔

جب تک حوامل و دوائر کی حرکت موافق رہتی ہے، ستاروں کی حرکت تیز معلوم ہوتی ہے، اور سیدھی ہوتی ہے، سو یہی حالت ان کی استقامت کہلاتی ہے۔

اور حوامل و دوائر کی حرکت موافق نہ رہے تو ستاروں کی رفتار سست نظر آتی ہے پھر جب حوامل و دوائر کی حرکت بالکل ایک دوسرے کے معارض ہو جائے کہ ایک کی حرکت سے ستارہ آگے بڑھا پھر اس کے خلاف دوسری حرکت سے پیچھے ہٹا تو اس وقت ستارہ ایک جگہ رکا ہوا معلوم ہوتا ہے یہی حالتِ وقوف ہے

---

(۱) قولہ حوامل: افلاک علویہ یعنی فلکِ زحل، فلکِ مشتری اور فلکِ مریخ اسی طرح افلاکِ سفلیہ یعنی فلک زہرہ، عطارد اور فلک

قمر سب کو حوامل کہتے ہیں، حوامل حامل کی جمع ہے یہ اپنے اندر تداویر کو اٹھائے ہوئے ہیں اس لئے ان کو حوامل کہتے ہیں۔

تداویر: ان افلاک کے اندر چھوٹے چھوٹے اور آسمان ہیں ان کو تدویر کہتے ہیں، تدویر ایسا فلک ہے جس کی دونوں سطحیں متوازی

نہیں ہوتیں اور یہ مرکزِ عالم اور زمین کو محیط نہیں ہوتا بلکہ اپنے حوامل میں ایک طرف واقع ہوتا ہے۔

۱۲ اسفیر احمد، افادات شیخ موسیٰ

لیکن جب دوسری حرکت غالب آ جائے تو تیزی سے ستارہ جدھر سے گیا تھا اسی طرف واپس مڑا ہوا معلوم ہوتا ہے یہی رجعت ہے۔(۱)

ستاروں کی حالت کی تبدیلی کی کوئی وجہ ہو اس سے مقصود پر کوئی فرق نہیں پڑتا بلکہ اس سے اور زیادہ مقصود واضح ہو جاتا ہے کہ آسمان کے ستارے تغیر و انقلاب قبول کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، اور اس بحث سے یہی ثابت ہوا کہ ان کی مختلف حرکتوں اور وضعوں کے اسباب مختلف ہیں، اور ان کے اندر تخالف وتجاذب طبعی ارادی ثابت ہوا لہٰذا معلوم ہوا کہ وہ صدمات (ٹوٹ پھوٹ) قبول کر سکتے ہیں یعنی خراب وفنا ہو سکتے ہیں، جو چیز تغیر سے محفوظ ہو، اس میں کوئی انقلاب واقع ہونے سے تعجب ہو سکتا ہے لیکن جو چیز تغیر کو قبول کرتی ہو اس میں اگر کوئی انقلاب واقع ہو تو کچھ تعجب کی بات نہیں (۲)

خمسہ متحیرہ کو خاص طور پر ذکر کرنے کی حکمت

ان پانچ ستاروں کو یہاں اس لئے ذکر کیا کہ ستارے دو قسم کے ہیں:

(۱) جن کو سیارات کہتے ہیں یعنی چلنے والے وہ سات ہیں۔

(۲) دوسری قسم کو ثوابت کہتے ہیں یہ اپنی جگہ پر ٹھہرے رہتے ہیں۔

سیارات کو افلاک کے متعدد ہونے کی وجہ سے مختلف حرکتیں لاحق ہوتی ہیں، اور ثوابت کو مختلف

---

(۱) یہ علم ہیئت کی خالص فنی بات ہے اس کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے فن کی کتب کی طرف مراجعت کرنی چاہئے البتہ تفسیر حقانی میں یہی بات نسبتاً آسان اسلوب میں آ گئی ہے اسی کو یہاں نقل کیا جاتا ہے: فلاسفۂ قدیم کہتے ہیں کہ: ''آسمان کی موٹائی میں ایک دوسرا آسمان ہے اس کو حامل کہتے ہیں اور حامل میں ایک گول پہیہ سا لگا ہوا ہے جس کو تدویر کہتے ہیں، اس تدویر میں ستارہ جڑا ہوا ہے پھر اس ستارہ کو لے کر تدویر گھومتی ہے اور گھومتی ہوئی تدویر کو لے کر حامل گھومتا ہے اس گھومنے میں تدویر اور حامل کی حرکت موافق ہو تو ستارہ سیدھا چلتا ہوا معلوم ہوتا ہے اور اگر مخالف ہو تو ستارے کی رفتار سست محسوس ہوتی ہے پھر وہ مخالفت اگر اس درجہ تک ہے کہ جس قدر ستارہ ایک کی حرکت میں ٹھہرا ہوا معلوم ہوتا ہے، اور اگر مخالف حرکت غالب آ کر اس کو الٹا ادھر ہی لانے لگے جدھر سے وہ چلا تھا تو اس وقت ستارہ الٹا حرکت کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے'' تفسیر حقانی ج ۵ ص ۵۵، ۲۵۰۔ ۱۲ اسفیر احمد

(۲) فلاسفۂ قدیم اجرام فلکی کے قِدم کے قائل تھے اسی وجہ سے اجرام فلکی کے فنا کے بھی قائل نہ تھے، اور اسلام نے ان چیزوں کے فنا کی خبر دی ہے اس لئے حضرت مصنفؒ ان کی تردید کر رہے ہیں البتہ جدید سائنس نے اسلام کی تصدیق کر دی ہے۔ ۱۲ اسفیر احمد

حرکتیں نہیں ہوتی بلکہ ان کے فلک کی حرکت بھی بہت سست اور کم دکھائی دیتی ہے، ثوابت کو رجوع، استقامت اور وقوف کی حالتیں درپیش نہیں آتیں، نہ ہی ان کو رفتار کی تیزی یا سستی والی حالت پیش آتی ہے، البتہ سیارات کو یہ سب کچھ درپیش آتا ہے، اور سیاروں میں سے سورج اور چاند کو قرآن کریم میں بارہا تغیر وانقلاب کے مقام میں ذکر کیا گیا ہے۔

اور ان دونوں کے اندر رونما ہونے والی تبدیلیاں اور تغیرات عام وخاص میں مشہور ہیں، چاند کا تغیر تو ہر مہینے دیکھنے میں آتا ہے وہ گھٹتا بڑھتا ہے اسی طرح سورج گرہن اور چاند گرہن بھی سب کو معلوم ہے۔

اس مقام پر چونکہ آسمانی تغیر بیان کرنا اصل مقصد ہے اور اجرام فلکی میں سے ان پانچ سیاروں کے اندر بھی تغیر پیدا ہوتا رہتا ہے اس لئے موقع کی مناسبت سے ان پانچ ستاروں کو خصوصیت سے ذکر فرمایا۔

اسی طرح غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ "ثوابت" کا آپس میں کوئی ربط نہیں ہے اسی وجہ سے ان کا ایک ہی حال ہے، ان کے مقابلے میں ان پانچ ستاروں کا آپس میں بھی اور سورج و چاند کے ساتھ بھی ربط و جوڑ کئی طرح سے ہے، یہ متعدد قوتوں کے مصدر ومنبع ہیں اور سورج کے ساتھ عجیب وغریب ارتباطات رکھتے ہیں، ان کے ہر ارتباط میں ایک نئی تاثیر ظاہر ہوتی ہے۔ تو یہ پانچ ستارے عالم افلاک میں مرکبات عنصریہ کی مانند ہوئے جیسے (زمین کے اندر) معادن، نباتات، حیوانات اور انسان ہیں اور ان چاروں کی برزخیں (یعنی ان سب کو ایک دوسرے سے جدا رکھنے والی رکاوٹ) اور سورج و چاند مرکبات ناقصہ کے مانند ہیں جیسے (زمین کے اندر) غبار، بخارات اور دھواں ہے اور "ثوابت" عنصریہ بسائط کی مانند ہیں۔

پھر یہ بھی ہے کہ ان پانچ سیاروں کی تاثیرات، ان کے افعال اور ان کی حرکتیں اختیار وارادہ کی صلاحیت رکھنے والوں کی طرح معلوم ہوتیں ہیں، ان کی حرکتیں ایسی ہیں گویا یہ اپنے اختیار سے حرکتیں کررہے ہیں کیونکہ ان کی حرکات مرکب ہیں صعود، ہبوط، توجہ، رجوع، ہرب اور طلب سے (یعنی یہ کبھی اوپر چڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں کبھی نیچے اترتے ہوئے، کبھی آگے چلے جاتے ہیں اور کبھی واپس آتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، یہ سب ایسی حرکات ہیں جیسے کوئی اپنے شعور اور ارادہ سے یہ حرکتیں کررہا ہو)

لہٰذا ان پانچ سیاروں میں رونما ہونے والا تغیر اور انقلاب مقصد کے زیادہ قریب ہے (یعنی قرآن جو مقصد انسانوں کو سمجھانے چاہتا ہے اور وہ ہے اس عالم کا فنا ہونا اس مقصد کے یہ زیادہ قریب ہے) اس لئے کہ ان کا انقلاب ارادی ہے طبعی نہیں۔

حاصل کلام یہ ہوا کہ ان پانچ ستاروں کی حالتیں اولاً تو اجرام فلکی کے اندر انقلاب کے ممکن ہونے پر دلیل ہیں، ثانیاً زمین اور اس کی ساری اشیاء میں انقلاب کی دلیل ہیں، اس لئے کہ جب اجرام فلکی میں تغیر و انقلاب ممکن ہو گیا تو زمین میں ہونے پر کیا اشکال ہو سکتا ہے، رات دن یہاں تغیرات ہوتے رہتے ہیں اور وہ نظر آتے ہیں، جس سے معلوم ہوا کہ زمین اور اس کی تمام اشیاء تغیر پذیر ہیں۔

اور اگر اس انقلاب عظیم کے رونما ہونے میں کسی کو شک ہو تو دوسری قسم کھائی جاتی ہے۔

وَالَّيْلِ اِذَا عَسْعَسَ ۝

اور رات کی جب پھیل جائے

یعنی میں قسم کھاتا ہوں رات کی جب وہ پھیلے، جب رات آتی ہے تو ایک بڑا انقلاب ظاہر ہوتا ہے کہ بازار اجڑ جاتے ہیں، چوروں ڈاکوؤں کا ڈر، درندوں کا خوف پیدا ہو جاتا ہے، راستے بند، تلاش معاش موقوف، اور تمام لوگ چپ چاپ مُردوں کی طرح بے حس و حرکت پڑے رہتے ہیں اور شیاطین و جن پھیل جاتے ہیں۔ یہ ایک انقلاب عظیم ہے جو ہر رات زمین والوں کو اتھل پتھل کر رکھ دیتا ہے، اگر کسی نے صرف دن ہی دیکھا ہو رات کبھی نہ دیکھی ہو اس کے سامنے اگر رات کے اس انقلاب کو ذکر کیا جائے تو اتنا تعجب کرے گا کہ کافر قیامت کے بارے اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں کرتا۔

رات کے عجائبات میں سے یہ بھی ہے کہ بہت سی دور کی چیزیں جو دن کی روشنی میں نظر نہیں آتی وہ رات کو نمودار ہو جاتی ہیں جیسے ستارے، چاند وغیرہ اور جو چیزیں قریب ہیں اور دن کو نظر آتی ہیں وہ رات کی تاریکی میں غائب ہو جاتی ہیں جیسے زمین کی چیزیں ہیں۔

بہت سی ظاہر چیزوں کے پوشیدہ ہونے اور بہت سی پوشیدہ چیزوں کے ظاہر ہونے میں دنیا و آخرت کے درمیان جو فرق ہے یہ دن رات بالکل اس کی مثال ہے اسی لئے اس بات کی تکمیل و تتمہ کے طور آگے فرماتے ہیں:

وَالصُّبۡحِ اِذَا تَنَفَّسَ ۝

اور صبح کی جب دم بھرے

یعنی قسم ہے صبح کی جس وقت وہ سانس لیتی ہے، اس وقت بھی ایک انقلاب عظیم ظاہر ہوتا ہے، لوگ نیند سے بیدار ہو جاتے ہیں، قوائے حیوانیہ کے اندر فرحت و سرور کی لہر دوڑ جاتی ہے، بازار و مجالس پھر سے آباد ہو جاتے ہیں، لوگ تلاشِ معاش میں سرگرداں ہو جاتے ہیں، قافلے و لشکر پہاڑوں کی طرح رواں دواں ہو جاتے ہیں، ہر چیز ظاہر روشن ہو جاتی ہے، مگر روشن ستارے بے نور اور پوشیدہ ہو جاتے ہیں۔

صبح کی طرف تنفس کی نسبت کرنے میں عجیب استعارہ ہے

''صبح کا سانس لینا'' یہ دراصل کنایہ ہے سورج ظاہر کرنے کی طرف، صبح علامت ہے اس کے ظاہر ہونے پر، کنایہ اس طرح ہے کہ سورج کو تشبیہ دی ہے سمندر کے اندر تیرتی ہوئی مچھلی سے جو پانی کے اندر نظروں سے اوجھل تیرتی ہوئی چلی جاتی ہے اور اس کے سانس لینے سے پانی منتشر ہوتا ہے اور اڑتا ہوا نظر آتا ہے، سورج کے طلوع ہونے سے پہلے صبح کے وقت یہی کیفیت ہوتی ہے سورج ابھی طلوع نہیں ہوا ہوتا مگر روشنی کی لہریں پھوٹ پھوٹ کر عالم کو روشن کرتی جاتی ہیں یہی لہریں جو دھوپ سے پہلے ظاہر ہوتی ہیں ان کو سمندر میں اڑتے ہوئے پانی سے تشبیہ دی ہے جو مچھلی کے سانس لینے سے اڑتا اور منتشر ہوتا چلا جاتا ہے مچھلی بھی پانی کے اندر ہوتی ہے اسی طرح سورج بھی ابھی نگاہوں سے اوجھل ہوتا ہے۔

بعض نے کہا ہے، کہ صبح کا سانس لینا یہ کنایہ ہے نسیم صبح سے، یہ ایک ہوا ہوتی ہے جو بہار کے دنوں میں چلتی ہے، تو نسیم کو سانس سے تشبیہ دی ہے اس لئے کہ اس کی وجہ سے لوگ راحت و سکون محسوس کرتے ہیں، گویا صبح بھی ایک مریض اور غمگین شخص تھا جس نے اب راحت کا سانس لیا ہے۔

صبح کی طرف سانس لینے کی نسبت کرنا عربی اور فارسی شعراء کے کلام میں مشہور و معروف ہے کوئی اجنبی بات نہیں ہے۔

عَسۡعَسَ کی تحقیق و تفسیر

عسعس کا لفظ اضداد میں سے ہے یعنی اس کا معنی آنا بھی ہوتا ہے اور جانا بھی مثلاً یہاں ''واللیل اذا عسعس'' کا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ''قسم ہے رات کی جب پھیلنے لگے'' یعنی آئے، اور یہ ترجمہ

بھی ہو سکتا ہے "قسم ہے رات کی جب ڈھلنے لگے" یعنی جانے لگے، اور دونوں معنوں کی یہاں مناسبت موجود ہے، اگر اس لحاظ سے دیکھیں کہ اس کے مقابلے میں آگے صبح اور اس کے تنفس کا ذکر ہے اور یہ دن کی ابتداء کا وقت ہوتا ہے لہٰذا مقابلے کی رعایت کرتے ہوئے "عسعس" کا معنی رات کے پھیلنے سے کرنا مناسب ہے اس لئے کہ یہ رات کی ابتداء ہونے کا وقت ہے۔

اور اگر اس لحاظ سے دیکھیں کہ جب رات جاتی ہے تو صبح آتی ہے لہٰذا ایک کے آنے سے دوسرے کا جانا لازمی ہے، اس اعتبار سے ان کے درمیان تلازم ہے، اس صورت کے مناسب یہ ہے کہ "عسعس" کا معنی جانے اور ڈھلنے سے کیا جائے اس لئے کہ اس کے متصل بعد صبح کے آنے کا ذکر ہے۔

یہ کلام اللہ کا کمال اعجاز ہے کہ ایسے ذو وجہین مقام کے لئے لفظ بھی ایسا ارشاد فرمایا جو مشترک بین الضدین ہے، البتہ دوسرے معنی یعنی جانا اور ڈھلنا کرنے کی صورت میں یہاں صرف ایک ہی انقلاب کا ذکر ہوگا کیونکہ رات کا جانا اس انقلاب کی ابتداء ہے اور صبح کا تنفس اس کی انتہا ہے (جبکہ پہلے معنی کی صورت میں دونوں آیتوں میں دو انقلاب کا ثبوت ہوتا ہے ایک رات جو مستقل ایک انقلاب ہے، دوسرا صبح کا آنا جو مستقل اپنے اندر ایک انقلاب رکھتا ہے)

دن کا آنا ایک ایسا انقلاب ہے جو انقلابِ آخرت سے کامل مشابہت رکھتا ہے، اس لئے کہ یہ نمونہ ہے حیات بعد الموت کا (گویا رات موت کے مشابہ ہے اور اس کے بعد دن کا آنا موت کے بعد زندگی کے مشابہ ہے) پھر وہ چیزیں جو رات کی تاریکی میں چھپی رہتی ہیں وہ دن کی روشنی میں بالکل ظاہر ہو جاتی ہیں، اس لئے اس پر اکتفا کرنا بہت ہی مناسب ہے (آخرت میں بھی ہر نیکی اور برائی جو دنیا میں لوگوں سے مخفی ہے ظاہر ہو جائے گی لہٰذا اس انقلابِ یومی کو انقلاب آخرت سے کامل مشابہت ہے)

بارہ حوادث میں حکمت اور ان کے وقوع کا عقلاً امکان

اصل غرض یہاں پر یہ ہے کہ قیامت کے جن بارہ انقلاب و حوادث کا ذکر سورت کے شروع میں بیان ہوا ہے اور جن کے واقع ہونے کے بعد انسان پر خیر و شر کی حقیقت کھل جائے گی، بتلانا یہ ہے کہ ان حوادث سے ملتے جلتے حوادث و انقلابات دنیا میں بھی رونما ہوتے رہتے ہیں، صرف غور و فکر کی ضرورت ہے، لہٰذا ان حوادث کے واقع ہونے کو یقینی بتانے کے لئے قسم کھانے کی ضرورت نہیں، اس لئے کہ ان کا ممکن ہونا دلیلِ عقل سے ثابت ہو گیا۔

اور ان حوادث کا انسان کے لئے خیر وشر کی حقیقت کھلنے کا سبب ہونا عقل کے لئے ظاہر ہے بشرطیکہ غور وفکر کیا جائے۔ دوسری وجہ قسم کھانے کی حاجت نہ ہونے کی یہ ہے کہ عقل کا یہ مسلمہ قاعدہ ہے کہ مخبرِ صادق اگر کسی ایسی شی ممکن کے وقوع کی خبر دے جو سبب ہو کسی اور خبر کا تو اس خبر کا علم یقینی حاصل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قسم کی حاجت نہ ہونے پر آگے اس کی علت و وجہ خود بیان فرمارہے ہیں چنانچہ فرمایا:

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۝

مقرر یہ کہا ہے ایک بھیجے ہوئے عزت والے کا

''انہ'' تحقیق یہ قرآن، جو اپنے دامن میں قیامت کی خبروں کو سمیٹے ہوئے ہے ''لقول رسول'' یہ اللہ کے قاصد کی لائی ہوئی بات ہے، جو اس نے اللہ کی طرف سے پہنچائی ہے، لہٰذا اس کے جھوٹ یا من گھڑت ہونے کی کوئی گنجائش نہیں ہے، کیونکہ اللہ کا کلام قطعی الصدق ہے یعنی اس کا سچا ہونا یقینی ہے۔

قرآن کے کلام اللہ ہونے پر شبہہ کا جواب

اگر کسی کو یہ شبہہ ہو کہ اللہ کا کلام براہِ راست ہم تک نہیں پہنچا کہ ہمیں اسکے بارے میں کلام اللہ ہونے کا یقین ہو، یہ تو ہم تک واسطے کے ذریعہ سے پہنچا ہے، اور سند ثابت نہیں ہے لہٰذا یقین کیسے کیا جاسکتا ہے؟

جواب:۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ قرآن جو تم پیغمبر علیہ السلام سے براہِ راست سنتے ہو یہ اللہ تعالیٰ سے تم تک دو واسطوں سے پہنچا ہے، دو سے زیادہ واسطے نہیں ہیں، پہلا واسطہ تو وہ شخص ہے جو اللہ کی طرف سے پیغمبر تک یہ قرآن پہنچاتا ہے، دوسرا واسطہ خود پیغمبر علیہ السلام ہیں، ان دونوں واسطوں میں ثقاہت و اعتماد کے اعتبار سے کیا کمی ہے ان کے عادل ہونے میں کیا شبہہ ہوسکتا ہے؟ خود غور کرلو، دیکھو پہلا واسطہ جو اللہ اور رسول کے درمیان ہے اس کی یہ صفات ہیں:

''کریم'' وہ بہت عزت ومرتبہ والا ہے۔ اس کی عدالت وتقویٰ انتہائی درجے کے ہیں، اس لئے کہ عزت ومرتبہ تقویٰ کے بغیر نہیں ہوسکتا، چنانچہ حدیث میں آتا ہے: ''الکرم التقویٰ والحسب المال'' اور قرآن میں بھی اسی طرف اشارہ موجود ہے: ''ان اکرمکم عنداللہ اتقاکم'' لہٰذا اس کا جو پہلا واسطہ اور راوی ہے اس میں عدالت وتقویٰ تو موجود ہے۔

اب اگر اس کی قوتِ حافظہ معلوم کرنا چاہتے ہو تو دوسری صفت اس کی یہ ہے:

ذِیْ قُوَّةٍ

قوت والا

یعنی اس کے حافظے اور یادداشت میں کوئی خلل نہیں ہے، جو بات سنتا ہے بغیر کسی کمی بیشی کے اس کو یاد رہتی ہے اور اسی طرح پوری پوری بات آگے پہنچا دیتا ہے، اگر چہ یہاں پر جبرئیل علیہ السلام کی قوتِ حافظہ اور قوتِ بیانیہ کو بیان کرنا مقصود ہے، مگر ان دونوں قوتوں میں کمال علی الاطلاق حاصل نہیں ہوتا ،اس لئے ان کو یہاں مطلق قوت کے ساتھ موصوف کر دیا ہے۔

جبرئیل علیہ السلام کی قوت

حدیث میں آتا ہے ایک دن پیغمبر علیہ السلام نے حضرتِ جبرئیل علیہ السلام سے فرمایا، اللہ تعالیٰ نے آپ کی بڑی بڑی صفات بیان فرمائی ہیں، آپ کی قوت وامانت کی بڑی تعریف کی ہے، اپنی قوت و امانت کا کچھ حال تو ہم سے بیان فرمائیے، انہوں نے کہا قوت میرے اندر اتنی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے قومِ لوط علیہ السلام کو برباد کرنے کا حکم فرمایا، اس قوم کے چار شہر تھے، ایک شہر کا نام ''سدوم'' تھا اس میں بچوں، عورتوں کے علاوہ لڑائی کے قابل مردوں کی تعداد چار لاکھ تھی میں نے ان چاروں شہروں کو صرف ایک پَر کے ذریعہ ساتوں زمین کی تہہ سے اُٹھایا اور اتنا اوپر لے گیا کہ آسمان کے رہنے والوں نے ان کے مرغوں اور کتوں کی آوازیں سنیں، پھر میں نے ان کو الٹ کر اسی گڑھے میں پھینک دیا، اس کے باوجود مجھے کچھ تکلیف یا بوجھ محسوس نہیں ہوا۔

اور میری امانت داری کا یہ حال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کبھی کسی کام کی ذمہ داری مجھے نہیں سونپی مگر میں نے بلا کم و کاست اسے پورا کیا، جب بھی کوئی مجھے راز دیا گیا میں نے اسے پوشیدہ رکھا۔

ان دو صفات کے بیان کرنے سے روایت کی دو شرطیں یعنی عدالت اور قوتِ حفظ ثابت ہوگئی ہیں، اب ان کے علاوہ دیگر صفات ان کی بیان فرماتے ہیں۔

روایات کے درمیان ترجیح کا اصول

چونکہ یہ صفات بھی ایسی ہیں کہ اسناد و روایات کے علم میں جانچ پرکھ رکھنے والے لوگ روایات کے

درمیان ترجیح دیتے وقت راوی کے اندران صفات کا اعتبار کرتے ہیں، چنانچہ ان میں سے ایک صفت یہ بھی ہے جو آگے جبرئیل امین کی بیان فرمارہے ہیں:

عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ٥

عرش کے مالک کے پاس درجہ پانے والا

راوی کے قابل اعتماد ہونے کی وجوہات

ظاہر ہے جو آدمی ہر وقت بادشاہ کے دربار میں حاضر رہتا ہو، بادشاہ کے ہاں اس کا خاص مرتبہ و مقام بھی ہو، جب بادشاہ کا کوئی پیغام وہ پہنچائے تو اس میں زیادہ اعتماد ہوگا بنسبت اس آدمی کے پیغام کے جو ہر وقت حاضرِ دربار نہیں رہتا یا عام درباری اور عہدہ دار ہے۔

اس مقربِ خاص کے پیغام میں زیادہ اعتماد ہونے کی دو وجہیں ہیں۔

(۱) پہلی وجہ یہ ہے کہ وہ مقرب آدمی بادشاہ کا کلام براہِ راست بغیر کسی واسطے کے سنتا ہے، اس لئے اس بات میں یہ اندیشہ نہیں کہ کسی دوسرے نے بات اس تک پہنچانے میں شاید کچھ کمی بیشی کردی ہو۔

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ شخص اپنے منصب و مرتبے کے وقار کو بحال رکھنے کے لئے پیغام پہنچانے میں انتہائی احتیاط سے کام لے گا۔

یہی وجہ ہے کہ امام بخاریؒ، امام مسلمؒ، امام مالکؒ اور دیگر ائمہ حدیث، روایات کے درمیان ترجیح دیتے وقت اور روایات میں جب اختلاف واضطراب پیدا ہو جائے تو اُن رُواتِ حدیث کی روایات کو ترجیح دیتے ہیں، جو راوی اپنے استاد و شیخ کی صحبت میں پابندی اور ہمیشگی کے ساتھ رہا ہو اور جن کی عزت وقدر استاد و شیخ کے ہاں زیادہ تھی۔

عام اہلِ دنیا کا عرف ورواج بھی یہی ہے کہ جب بادشاہ کا کوئی وزیر یا امیر اس کا کوئی پیغام پہنچائے تو اس کو زیادہ معتبر سمجھتے ہیں، لیکن کوئی عام سرکاری عہدہ دار اگر کوئی پیغام پہنچاتا ہے تو اتنا اعتبار نہیں کرتے۔

اور جبرئیل علیہ السلام بھی اللہ کے دربار میں ایسے ہی ہیں لہٰذا ان کے ذریعہ پہنچنے والے پیغام میں کیا شبہہ ہوسکتا ہے۔

مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيۡنٍ ○

سب کا مانا ہوا وہاں کا معتبر ہے

وہ عالمِ بالا جو مملکتِ الٰہیہ کی کسوٹی ہے، جبرئیل کی اس عالم میں اطاعت وفرمانبرداری کی جاتی ہے، عالمِ بالا کے تمام اراکین کسی تحقیق کے بغیر اس کی ہر بات مانتے ہیں، اور یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ کا ہی حکم ہوگا یہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتے، اس دربارِ عالی کے ہر فرد کے ذہن میں یہ بات جم چکی ہے کہ جبرئیل نمائندہ خاص ہیں، چنانچہ معراج کی رات جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے ساتھ لے کر گئے تو آسمان کے، اور جنت ودوزخ کے دربانوں نے ان کے حکم سے دروازے کھول دیئے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جہاں چاہتے سیر کرتے تھے، معراج کی احادیث میں اس کا مفصل بیان موجود ہے۔

ساتوں آسمان والوں کو ہمیشہ احکامِ الٰہی وہی پہنچاتے ہیں، گویا اللہ کا پیغام پہنچانے کی خاص صفت میں جبرئیل فرشتوں میں مشہور ومعروف ہیں، ان کا آنا علامت ہوتی ہے اس بات کی کہ وہ ضرور اللہ کا کوئی پیغام لائے ہیں۔

جب راوی اس قدر ثقہ اور با اعتماد ہو کہ تمام ثقات اس کی روایت کو قبول کرتے ہوں اور اس سے سند کا مطالبہ نہ کرتے ہوں، تو پھر بھی جھوٹ یا بناوٹ کا احتمال نکالنا مالیخولیا کے سوا کچھ نہیں۔

اس کلام اللہ میں دوسرا واسطہ تمہارا پیغمبر ہے، وہ ایسا شخص ہے کہ چالیس سال تک تمہارے درمیان رہا، خلوت وجلوت میں اس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا، اپنے پرائے کسی نے اس سے جھوٹ کا تجربہ نہیں کیا، پھر ایسے آدمی کی خبر پر اعتبار نہ کرنا بالکل خلافِ عقل بات ہے۔

ہاں اگر یہ شبہ ہو کہ شاید وہ سودائی اور خفقانی آدمی ہے، اندرونی حواس کے اندر خرابی پیدا ہو جانے کی وجہ سے عجیب وغریب خیالات اس کے دل ودماغ میں گردش کرتے ہیں، جن کی کوئی حقیقت نہیں، حواسِ باطنہ میں خلل کی وجہ سے اس کو عجیب وغریب آوازیں سنائی دیتی ہیں اور جو کچھ خیال میں آتا ہے اس کو واقعی سمجھتا ہے۔ اس شبہے کی بھی یہاں کوئی گنجائش نہیں ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

وَمَا صَاحِبُكُمۡ بِمَجۡنُوۡنٍ ○

اور یہ تمہارا رفیق کچھ دیوانہ نہیں

یعنی تمہارا ہم نشین یہ جلیل القدر پیغمبر کوئی سودائی اور خیالی قسم کا آدمی نہیں ہے کہ اس کی خبر کو دیوانگی کا

اثر سمجھنے لگو، اس لئے کہ یہ تمہارا ساتھی ہے، ایک طویل عرصہ تک تمہاری آپس میں رفاقت وصحبت رہ چکی ہے، اس کی عقل ودانائی کا بار بار تم تجربہ کر چکے ہو، تمہیں اس بات کا بھی اچھی طرح تجربہ ہو چکا ہے کہ ان کے حواس، فہم وادراک اتنا سلیم، کامل اور اعلیٰ ہے کہ تمام عقلاء ان کے سامنے ہیچ ہیں، لہذا پھر ان کی خبر کے حق وسچ ہونے میں کیا شبہ باقی رہ جاتا ہے؟

لیکن ان سب باتوں کے باوجود اگر کسی کے دل میں یہ شبہ گذرے کہ پیغمبر علیہ السلام کسی صورت کا مشاہدہ کرتے ہیں، اس کی زبانی اللہ کا کلام سنتے ہیں، اب ہمیں کیسے یقین ہو کہ یہ صورت جبرئیل کی ہے ممکن ہے کوئی جن یا شیطان فریب کرتا ہو، اور پیغمبر اس کو جبرئیل سمجھ رہے ہوں؟

ہم کہتے ہیں کہ یہ شبہ اس وقت درست ہوتا جب پیغمبر علیہ السلام نے کبھی جبرئیل امین کو اصلی شکل میں نہ دیکھا ہوتا حالانکہ ایسا نہیں ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ ۝

اور اُس نے دیکھا ہے اُس فرشتہ کو آسمان کے کھلے کنارے کے پاس

یعنی پیغمبر نے جبرئیل کو اس کی اصلی شکل میں اُفقِ شرقی پر دیکھا ہے اور چونکہ اس جانب سورج ہوتا ہے اس لئے اس طرف دیکھنے میں کوئی شک وشبہ نہ رہا، اور جب کسی چیز کی حقیقت ایک بار دیکھ لی جائے اور اس کو پہچان لیا جائے تو پھر چاہے وہ حقیقت جس صورت ولباس میں بھی آئے پہچاننا آسان ہوتا ہے، جیسے کوئی بچہ اگر دریا دیکھے پھر ایک پیالے میں پانی لاکر اس کو دکھایا جائے تو وہ دیکھتے ہی پہچان لے گا کہ یہ وہی چیز ہے، اسی طرح جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل کو ان کی اصلی شکل میں دیکھا تو ان پر حقیقتِ جبرئیلیہ منکشف ہوگئی، اس کے بعد جبرئیل کو وہ ہر صورت ولباس میں دیکھ کر پہچان لیتے تھے۔

تو خواہی جامہ خواہی قبا پوش
بہر رنگے تُرا من می شناسم

ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جبرئیل کو پہچان نہ سکنے کی وجہ؟

البتہ ایک بار جبرئیل اجنبی آدمی کے بھیس میں آئے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دین کے

مسائل پوچھے تھے، اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فوراً ان کو پہچان نہیں سکے تھے، وہ اس وجہ سے کہ جبرئیل نے اپنی حقیقت سے نزول کرلیا تھا، جبرئیل کی حقیقت اللہ کی رسالت ونمائندگی کی ہے، اس وقت انہوں نے اس سے تنزل کیا اور ایک سائل کی شکل میں ظاہر ہوئے تھے، اور چونکہ ان کا یہ آنا وحی پہنچانے یا احکام الٰہی پہنچانے کے لئے نہیں تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ان کی حقیقت منکشف ہوجاتی، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو نہ پہچان سکے۔

جبرئیل کو اصلی شکل میں دیکھنے کا ذکر

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں نے جبرئیل کو دوبار اصلی شکل میں دیکھا، پہلی مرتبہ وحی کے شروع زمانے میں دیکھا، جب میں بے چین ہوکر چاہتا تھا کہ اپنے آپ کو پہاڑ پر سے گرادوں اسی کیفیت میں، میں جارہا تھا، مکہ معظمہ میں مقامِ جیاد پر میں نے جبرئیل کو اصلی شکل میں دیکھا، دیکھتا ہوں زمین وآسمان کے درمیان سونے کی ایک چمکتی ہوئی معلق کرسی پر مشرق کی طرف رُخ کئے ہوئے بیٹھے ہیں، انتہائی خوبصورت نورانی شکل ہے، اور جسم اتنا بڑا کہ آسمان کے دونوں کنارے ان کے جسم سے پُر تھے، چھ سو ان کے پَر تھے جو سب کے سب یاقوت اور موتیوں کے تھے۔

دوسری بار شب معراج میں سدرۃ المنتہیٰ کے پاس بھی اسی شکل میں دیکھا۔

افقِ ''اعلیٰ'' اور افقِ ''مبین'' کی حقیقت

سورۂ نجم کے شروع میں دونوں بار دیکھنے کا ذکر ہے، البتہ وہاں پہلی بار دیکھنے کے متعلق فرمایا کہ جبرئیل کو ''افقِ اعلیٰ'' میں دیکھا اور اس سورت میں اسی کے متعلق یہ فرمایا کہ ''افقِ مبین'' پر ان کو دیکھا، عبارت کے اسلوب میں اس تغیر میں نکتہ یہ ہے، کہ اس سورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر کی سچائی اور اس کے صاف واضح ہونے کو بیان کرنا مقصود ہے، لہٰذا اس مقام کے مناسب لفظ مبین تھا (کہ اس کا معنیٰ بھی صاف واضح ہے) اور سورۂ نجم کے اندر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام ومرتبہ کی بلندی، اور ان کا آسمان کے طبقات اعلیٰ کی طرف جانا بیان کرنا مقصود تھا اور اس مقام کے مناسب ''لفظ اعلیٰ'' تھا اس لئے اس کو وہاں ذکر دیا۔

نیز یہ بات بھی ہے کہ سورۂ نجم میں جبرئیل کے متعلق فرمایا ''فاستویٰ و ھو بالافق الاعلیٰ'' وہ

سیدھا ہوا، اور وہ افقِ اعلیٰ میں تھا'' یہ ''استویٰ'' دراصل حقیقتِ جبرئیلیہ کی تجلی سے کنایہ ہے، اس کی ابتداء ایسی صورت میں ہوئی کہ حقیقتِ جبرئیلیہ کا مقتضاء افقِ اعلیٰ میں تھا اور اس کی انتہا و قرب افقِ مبین میں۔

بعض محققین نے کہا ہے کہ عالم مثال کے دو افق ہیں، ایک اُفقِ اعلیٰ، دوسری افقِ ادنیٰ، افق اعلیٰ عالم تجرّد و تقدس کے ساتھ ملی ہوئی ہے، اور افقِ ادنیٰ عالم شہادت (شہود) کے ساتھ ملی ہوئی ہے، جب جبرئیل امین نے چاہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایسی شکل میں ظاہر ہوں، جو ان کے کمالات کے مناسب ہے تو سب سے پہلے وہ جسمِ مثالی کے لباس میں افقِ اعلیٰ میں ظاہر ہوئے، پھر آہستہ آہستہ نزدیک ہوتے گئے یہاں تک کہ عالم شہود کے کنارے افقِ مبین تک پہنچ گئے، پھر بڑھتے بڑھتے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مل گئے اور اتصالِ تام کر لیا۔

لہٰذا افقِ مبین سے مراد یہ ہے کہ وہ اس حقیقت کو واضح کرنے والی تھی آسمان کا کنارہ مراد نہیں، گویا استعارے کے طور عالم مثال کے ان دونوں کناروں کو افق سے تعبیر کر دیا (ہم جس کو افق کہتے ہیں وہ یہاں مراد نہیں) عالمِ مثال کے کناروں کو افق سے تعبیر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ غیب کے جتنے بھی عالم ہیں وہ اہل کشف وشہود کو اکثر دائروں کی شکل میں نظر آتے ہیں، سورۂ نجم کے اندر قرآن کا اسلوب بھی اسی تقریر کی تائید کرتا ہے۔

جب قرآن کریم کے کلام اللہ ہونے کے متعلق تمام شبہات ختم ہو گئے تو اب اس کو اللہ کی طرف منسوب کرنے میں جھوٹ کا کوئی احتمال باقی نہ رہا، البتہ بعض کفار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کاہن ہونے کا شبہ کرتے اور قرآن کو کہانت سمجھتے تھے اس لئے اس شبہ کا ازالہ بھی ضروری ہوا۔

کاہن کی حقیقت اور شبہہ کہانت کا رد

کاہن کی حقیقت یہ ہے کہ بعض انسانوں کو شیطانوں کے ساتھ مناسبت حاصل ہو جاتی ہے، وہ شیاطین چوری چھپے آسمان میں فرشتوں کی مجلس میں پہنچ جاتے ہیں، اور فرشتوں کی مجلس میں آئندہ ہونے والے امور کی تدابیر کے متعلق گفتگو ہوتی ہے، وہ شیاطین اس گفتگو کو چوری چھپے سن کر آ کر اس اپنے دوست انسان کے کان میں ڈال دیتے ہیں، پھر وہ آدمی لوگوں کے سامنے آئندہ ہونے والے کسی کام کی خبر دیتا ہے، بعض اوقات وہ خبر اسی طرح ہو جاتی ہے جیسے اس نے دی تھی، شیاطین کا یہ معاملہ انسانوں کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے بہت رائج تھا، اس فن میں اس زمانے کے

بعض لوگ بہت مشہور ہوئے، جیسے شق، اور سطیح وغیرہ، ان کے عجیب وغریب قصے غیب کی خبروں کے سلسلے میں مشہور ہیں۔

آنے والی دونوں آیتوں میں اس شبہے کا رد کیا ہے، تفصیل اس کی یہ ہے کہ کاہن کا علم، غیب کی تمام اقسام کو محیط نہیں ہوتا، وہ تو مستقبل قریب میں ہونے والی بعض ان باتوں کی خبر دیتا ہے، جن باتوں کا فرشتوں کی مجالس میں کبھی اس وجہ سے تذکرہ ہوجاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان باتوں کو روبعمل لانے کا حکم فرشتوں کو دیا ہوتا ہے، اور شیاطین فرشتوں کی اس گفتگو کو چوری چھپے سن کر کاہن تک رمز واشارے کے طور پر پہنچا دیتے ہیں، اور کاہن بھی آگے رمز واشارے سے ہی بیان کرتا ہے، تفصیل سے بیان نہیں کرسکتا اور شیاطین چونکہ پوری بات سن یا سمجھ نہیں پاتے اس لئے کچھ اشارے اس تک پہنچاتے ہیں اور اس میں اپنی طرف سے بہت سا جھوٹ بھی ملا لیتے ہیں، اسی طرح کاہن بھی اس رمز والی بات کے اندر اپنی طرف سے قیاس آرائی کرکے بہت سی باتیں اضافہ کردیتا ہے، اسی لئے اس کی بہت سی باتیں اور پیشگوئیاں غلط ثابت ہوتی ہیں، البتہ بعض اوقات تکا لگ بھی جاتا ہے، اس کے علم کی بنیاد فرشتوں کی مجالس کی گفتگو ہے جو قریب زمانے میں واقع ہونے والے بعض جزوی واقعات سے متعلق ہوتی ہے، اس کے پاس کلی علم نہیں ہوتا۔

چنانچہ کاہن سے اللہ کے ناموں اور صفاتِ غیبیہ کے بارے میں پوچھا جائے، یا احکامِ شرعیہ کے متعلق جو ابھی پردۂ غیب میں ہیں اور جنت وجہنم کے احوال کے متعلق، یا مذاہب وملل کے حق وباطل ہونے کے متعلق، یا یہ کہ موت کے بعد ارواح کو کیا حالات پیش آتے ہیں، یا پہلے زمانے کے لوگوں کی تاریخ پوچھی جائے تو وہ بالکل لاجواب ہوجائے اور خاموش رہ جائے۔ اس کے مقابلے میں قرآن کو دیکھو وہ تمام فنون غیب سے لبریز ہے، اگلوں پچھلوں کی خبریں اس میں، جنت ودوزخ اور دیگر مستقبل کے امور غیبیہ اس کے اندر موجود ہیں لہٰذا کہانت کو اس سے کیا نسبت ہے۔

وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ ۝

اور یہ غیب کی بات بتانے میں بخیل نہیں

انسان کو معاش ومعاد، اور علم وعمل کے لئے جن باتوں کی ضرورت ہے وہ سب اس کے اندر موجود

ہیں، لہٰذا ایسا کلامِ حق جو سراسر ارشاد و ہدایت ہے اس کے متعلق کہانت کا شبہ کرنا زرباف و بوریا باف کے قصے کی طرح ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ کاہن کی زبان سے جو کچھ نکلتا ہے وہ سخنِ شیطانی ہوتا ہے جو فرشتوں کی مجلس سے چرایا جاتا ہے، چنانچہ فرمایا:

وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيمٍ ٥

اور یہ کہا ہوا نہیں کسی شیطان مردود کا

کیونکہ شیطان آدم علیہ السلام کی تعظیم نہ کرنے کی وجہ سے راندۂ درگاہ ہوا، اس کے بعد اس کو حضرت آدم اور ان کی اولاد سے کمال درجے کی عداوت و دشمنی پیدا ہوگئی، اور اللہ تعالیٰ سے بھی عداوت و بغض اس کے دل میں پیدا ہوگیا۔ لہٰذا اب ذرا غور کرو کہ قرآن میں تو اللہ کی توحید، اس کی صفات، اور شرک کی مذمت کا بیان ہے اور انسانوں کے لئے ہدایات، اوامر، نواہی، جنت کا تذکرہ و ترغیب، جہنم کا تذکرہ و ترہیب ہے، اور نیک اعمال کی تعریف، اعمالِ خیر میں مجاہدۂ و مشقت کرنے کی ترغیب و تعریف ہے، بتوں کی مذمت، برے اعمال کی مذمت اور نفسانی ترغیبات کی مذمت ہے، نیک لوگوں، انبیاء و صلحاء کی تعریف ہے اور فرعون صفت بدکاروں کے انجام بد کا ذکر ہے۔

بھلا شیطان کا ان تعلیماتِ خیر سے کیا تعلق، یہ چیزیں تو اس کے جگر کا کانٹا ہیں، اس کے ہر کام کی تہہ میں آدم دشمنی پوشیدہ ہوتی ہے اس لئے اس کا کام تو گمراہ کرنا اور بہکانا ہے، جبکہ قرآن میں شیطان کی اور اس کی پیروی کرنے والوں کی شدید مذمت بیان کی گئی ہے، شیطان تو ایسی باتوں کو سن کر کانوں میں انگلیاں ڈال کر بھاگتا ہے ع

دیو بگریزد ازاں قوم کہ قرآں بخوانند

اب ایسے کلام ہدایت کو شیطان کا کلام سمجھنا پرلے درجے کی حماقت ہے، چنانچہ کافروں کے اسی فاسد و باطل خیال پر ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے ڈانٹتے ہیں:

فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ ٥

پھر تم کدھر چلے جا رہے ہو

''کدھر جا رہے ہو'' اور کن خیالوں میں سرگرداں ہو؟ ایک سچی بات جو حقیقت ہے اس کو چھوڑ کر

ایسے بودے احتمالات کی طرف توجہ کرتے ہو جو ناممکنات میں سے ہیں، ان سے کوئی فریب کھا سکتا ہے جس پر بچے بھی تمسخر اڑائیں؟ گویا تم لوگ گھر کی راہ بھول کر کنویں میں گرتے ہو۔

"ضنین" کی قراءت میں قرّا کا اختلاف

اکثر معتبر قراء نے "ضنین" کو ضاد کی بجائے ظاء کے ساتھ پڑھا ہے یعنی "ظنین"، ظنین بالظاء کے معنی ہیں متّھم، اس صورت میں 'وما ھو" میں "ھو" ضمیر راجع ہوگی "صاحبکم" کی طرف، اب ترجمہ یوں ہوگا "اور تمہارا پیغمبر غیب پر متہم نہیں ہے" یعنی اس پر یہ تہمت نہیں لگائی جاسکتی کہ غیب کی باتیں اپنی طرف سے بیان کرتا ہے، اس لئے کہ جب تم اس کو معمولی باتوں میں جھوٹا نہیں کہتے تو اس عظیم الشان معاملے میں اس پر جھوٹ کی تہمت کیسے لگائی جاسکتی ہے۔

یہاں سے اس شبہے کا ازالہ بھی ہوگیا کہ پیغمبر علیہ السلام نے جبرئیل کو اصلی شکل کے اندر دیکھنے میں دروغ گوئی سے کام لیا ہے، العیاذ باللہ۔

"ضاد" اور "ظاء" کے مخرج کا فرق

"ضاد" اور "ظاء" کے مخرج کے درمیان فرق کرنا بہت مشکل ہے، اس ملک (ہندوستان) کے رہنے والے اکثر لوگ ان کے مخرج میں فرق نہیں کرتے دونوں کو یکساں نکالتے ہیں، "ضاد" کو صحیح طرح اس کے اپنے مخرج سے نہیں نکالتے اور نہ ہی "ظاء" کو اس کے اپنے مخرج سے نکالتے ہیں، قرآن پڑھنے والے کے لئے ضروری ہے کہ ان دونوں کے مخرج کو پہچانے اور مخرجِ صحیح سے ان کو نکالے۔

"ضاد" کا صحیح مخرج:۔ زبان کی جڑ کا دایاں طرف یا بائیں طرف کو ڈاڑوں کی جڑ کے ساتھ لگا کر ضاد ادا کیا جاتا ہے ان داڑوں کو اضراس کہتے ہیں۔

"ظاء" کا مخرج:۔ ظاء زبان کے اگلے کنارے کو سامنے کے اوپر کے دانتوں کی جڑ میں لگانے سے نکلتا ہے، ان دانتوں کو ثنایا علیا کہتے ہیں، دال، اور تاء کا مخرج بھی یہی ہے۔

"فلا أقسم" کا جوابِ قسم

اکثر مفسرین کا قول یہ ہے کہ "انه لقول رسول الخ" فلا اقسم" کا جواب قسم ہے، اس کے مضمون کو مقسم علیہ قرار دیا ہے، یعنی قرآن کے کلام اللہ ہونے پر قسم کھائی گئی ہے۔

فاء تعقیب میں نکتہ

لیکن یہ قسمیں جو "فلا أقسم" کی فاء کا مدلول ہیں ان کو سابقہ مضمون کی تعقیب میں لانے کی وجہ واضح طور پر معلوم نہیں ہو رہی، اس میں کچھ خفاء ہے، البتہ یوں کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قیامت کے دن اعمال کی جزاء کے انکشاف کو ان بارہ اسباب و حوادث پر معلق کیا جو سورت کی ابتداء میں بیان ہوئے ہیں۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ ان حوادث کے وقوع سے پہلے پہلے کچھ تدبیر کر لینی چاہئے اور یہ تدبیر جب تک خود اللہ تعالیٰ نہ بتائیں کسی کی سمجھ میں آنا ممکن نہیں اور اللہ تعالیٰ جو کچھ بتائیں بذریعہ وحی ہی بتلاتے ہیں، اور یہ قرآن وہی وحی ہے جو تدبیر بتلانے کے لئے آئی ہے، لہٰذا قرآن کے مضامین کے صحیح ہونے پر قسم کھانے کی ضرورت محسوس ہوئی تا کہ لوگ اس قرآن کے مطابق زندگی گذاریں اور قیامت کے دن ان کو کوئی حسرت و ندامت نہ ہو۔

مقسم بہ اور مقسم علیہ کے مضمون کے درمیان مناسبت کی عجیب تقریر

اب ہم آتے ہیں اس بات کی طرف کہ ان قَسموں کی مناسبت آئندہ مضمون سے کیا ہے؟ وہ یہ ہے کہ ان ستاروں کا چلنا، ٹھہرنا، لوٹنا اور چھپ جانا ایک نمونہ ہے پہلے انبیاء پر بار بار وحی آنے اور ایک مدتِ دراز تک اس کے نشان باقی رہنے پھر منقطع ہو کر چھپ جانے اور غائب ہو جانے کا، اور رات کا آنا نمونہ ہے اس تاریک دور کا جو خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت سے پہلے دنیا پر گذرا کہ کسی شخص کو حق و باطل کی تمیز نہ رہی تھی، اور وحی کے آثار بالکل مٹ چکے تھے، اس کے بعد صبح صادق کا دم بھرنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اس جہاں میں تشریف لانا اور قرآن کا اترنا ہے، کہ ہر چیز کو ہدایت کے نور سے دن کی طرح روشن کر دیا، گویا پہلے انبیاء کا نور ستاروں کی طرح تھا اور اس نورِ اعظم کو آفتابِ درخشاں کہنا چاہئے، اور کیا ہی خوب کسی نے کہا ہے۔

فإنه شمس فضل هم كواكبها
يظهرن أنوارها للناس في الظلم
حتىٰ إذا طلعت في الكون عمّ هداها
للعالمين و أحيت سائر الأمم

قرآن کی سچائی کے بیان اور مخالفین کے بے بنیاد الزامات کی تردید کے بعد اب قرآن کی تھوڑی سی خوبیاں ''حصر'' کے طور پر بیان فرما رہے ہیں، حصر کا مطلب یہ ہے کہ اس میں صرف خوبیاں ہی ہیں اس کے سوا کچھ نہیں، لہٰذا اسکے بارے میں خوبی کے اعتقاد کے سوا کسی دوسرے احتمال کی گنجائش نہیں۔ چنانچہ فرمایا:

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝

یہ تو ایک نصیحت ہے جہان بھر کے واسطے

چونکہ قرآن اسماءِ باری تعالیٰ، صفاتِ الٰہیہ پر مشتمل ہے اور یہ اللہ کے قرب اور اس تک پہنچنے کا وسیلہ ہے اس لئے اس کو نصیحت کہا ہے۔

''للعالمین'':۔ تمام جہانوں سے مراد انسان، جن اور فرشتے ہیں، اس لئے کہ نصیحت کا فائدہ جہاں بھر میں صرف انہی تین طبقوں کو ہوتا ہے۔

انسان اور جنات قرآن سے نصیحت بھی پکڑتے، گناہوں سے بھی بچتے اور تلاوت کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا قربِ معنوی بھی حاصل کرتے ہیں اور فرشتے بھی اس کی تلاوت سے انس رکھتے، دور دراز سے اس کے سننے کو آتے ہیں اور اس کے حروف وکلمات کی خدمت کرتے ہیں کہ ان کو آسمان پر لے جاتے اور مقبولیت کے مقام تک پہنچاتے ہیں، یہ سب باتیں ان کے لئے اللہ کے نزدیک قرب کی زیادتی کا ذریعہ ہیں۔

لیکن قرآن کے یہ فوائد مخصوص لوگوں کو ہی حاصل ہوتے ہیں چنانچہ فرمایا:

لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ ۝

جو کوئی چاہے تم میں سے کہ سیدھا چلے

یعنی قرآن نصیحت اس شخص کے لئے ہے جو سیدھا چلتا ہے، اور جو کج روی اختیار کرے تو قرآن اس کو بجائے فائدہ دینے کے اس سے اس کا دل مزید سخت ہو جائے گا، جس کے بعد وہ نصیحت سے دور بھاگے گا اور اللہ سے سرکشی اور دوری اختیار کرے گا۔

قرآن کی مثال اس غذائے لطیف کی ہے جسے کوئی صحت مند بدن استعمال کرے تو اس کو قوت و توانائی کے کمال تک پہنچا دے، اور نقص وخرابی والے بدن کو کھلائی جائے تو نقص و بیماری میں مزید

اضافہ کرے چنانچہ دوسری جگہ فرمایا ہے "فی قلوبھم مرض فزادھم اللہ مرضا" اور فرمایا "وأما الذین فی قلوبھم مرض فزادتھم رجسًا إلی رجسھم"

مرضِ روحانی کی غذاء اور دواء

اسی لئے محققین نے کہا ہے کہ قرآن مجید، نورِ پیغمبر، صحبتِ اولیاء اور علماء کا وعظ ونصیحت یہ سب مذاہب کی تکمیل وحفاظت کے لئے غذاء کی طرح ہیں، جہل وگمراہی کے مرض کے لئے دواء نہیں ہیں، اس کی دواء اور چیز ہے یہ چیزیں نہیں ہیں، اگر یہ چیزیں جہالت وگمراہی کے مرض کی دواء ہوتیں تو آج دنیا میں کوئی شخص جہالت وگمراہی میں گرفتار نہ ہوتا، سب ہی اچھے ہوجاتے، اب اس چیز کو بیان کرتے ہیں جو دواء ہے کہ وہ اللہ کے ہاتھ میں ہے اس میں کسی اور کا کوئی دخل نہیں ہے، چنانچہ فرمایا:

وَمَا تَشَآءُ وْنَ اِلَّا اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ

اور تم جبھی چاہو کہ چاہے اللہ

یعنی علم وعمل میں سیدھا چلنے کی چاہت تمہارے اندر اسی وقت پیدا ہوگی جب اللہ چاہے گا، کیونکہ تم اس کے قبضۂ قدرت میں مجبور ہو اور تمہارا ارادہ اس کے ارادے کے تابع ہے۔

انسان کے اختیار کی حقیقت

تمہارا ارادہ اللہ تعالیٰ کے ارادے کے تابع ہے جیسے بازی گر جو پتلیوں، مورتیوں کا تماشا دکھانے والا ہوتا ہے، کہ پتلیاں اس کے ہاتھ میں ہوتی ہیں ان کی حرکات بازی گر کے ہاتھ کی حرکت کے تابع ہوتی ہیں، لیکن فرق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے اختیار وارادے سے تمہارے اندر ارادہ اور اختیار پیدا کرتا ہے، پھر تم اپنے ارادہ واختیار کے موافق عمل کرتے ہو، اس پر تم ثواب یا عذاب کے مستحق ہوتے ہو۔

اور بازی گران پُتلیوں کے اندر ارادہ واختیار پیدا نہیں کرسکتا وہ صرف حرکت دے سکتا ہے، اسی لئے پُتلیوں کے کام بازی گر کی طرف منسوب ہوتے ہیں، ان کے کام وتماشا کی خامی یا خوبی ان کی طرف منسوب نہیں ہوتی بازی گر کی طرف منسوب کی جاتی ہے، لیکن اس کے مقابلے میں انسان جو اپنے اختیار وارادہ سے کام کرتے ہیں اس کام کی اچھائی یا برائی انسانوں کی طرف ہی منسوب کی جاتی ہے، اور وہی ثواب یا سزا کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ عقلاء نے کہا ہے کہ فعل اور اس کے سبب کے درمیان فاعلِ مختار کے واسطہ بن جانے کی وجہ سے فعل کا تعلق سبب سے منقطع ہو جاتا ہے، یعنی فعل کی نسبت سبب کی بجائے فاعل مختار کی طرف کی جاتی ہے، چنانچہ دینوی امور کی تدابیر میں غلطی یا درستگی کی نسبت کام انجام دینے والے کی طرف کی جاتی ہے، مشورہ دینے والوں کی طرف اس کی نسبت نہیں کی جاتی، یوں نہیں کہا جاتا کہ فلاں کام فلاں فلاں نے (جنہوں نے مشورہ دیا تھا) غلط کیا، بلکہ یوں کہا جاتا ہے فلاں آدمی نے یہ کام غلط کیا، یعنی جس نے عملاً وہ کام کیا ہوتا ہے، اسی طرح سب کاموں میں یہ قاعدہ جاری ہے۔

باوجود اس کے کہ ہدایت کو اپنی مشیّت کے ساتھ بعض افراد کے لئے خاص کیا ہے، مگر اس کی ربوبیت تمام جہاں والوں کے لئے بحال و برقرار ہے اس لئے کہ اس کی صفت ہے رب العالمین چنانچہ فرمایا:

رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ۝

سارے جہان کا مالک

اس کی رضامندی اس کی فرمانبرداری میں ہے، اور اس کی ناراضگی اس کی نافرمانی میں ہے، تاکہ مختلف عالموں کا ربط ایک دوسرے کے ساتھ درہم برہم نہ ہو جائے، یعنی اگر گنہگاروں کے ساتھ بھی فرماں برداروں کی طرح راضی رہتا ان پر ناراض نہ ہوتا تو اس کے قہر و سیاست، حکمت و عدالت کا عالم جس کا مظہر دوزخ اور اس کے طبقات ہیں بیکار رہ جاتا۔

اور اگر فرماں برداروں کو لطف و کرم سے نہ نوازتا جنت کی نعمتیں ان کو عنایت نہ کرتا تو اس کا عالمِ لطف و قدردانی جس کا مظہر جنت، اس کے درجات اور حور و غلمان ہیں سب بیکار رہ جاتا۔

تم تفسیر سورۃ التکویر

بفضل اللہ تعالیٰ والحمد للہ اولا و اخرا

مقدمہ سورۂ انفطار

یہ مکی سورہ ہے اس میں انتیس (۲۹) آیات، اور تین سو انتیس (۳۲۹) حروف ہیں۔

سورۂ تکویر کے ساتھ ربط

اس سورت کا ربط سورۂ تکویر کے ساتھ اتنا واضح ہے کہ بیان کی ضرورت ہی نہیں۔ بلا تشبیہ اس سورت کو سورۂ تکویر کا دوسرا مصرعہ کہنا چاہئے، یہ ایک جان دو قالب ہیں۔ البتہ یہ سوال پیدا ہوگا کہ جب دونوں ایک ہی ہیں تو ان کو علیحدہ علیحدہ کیوں نازل کیا ایک ہی سورت بنا کر نازل کر دیتے؟

سو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں سورتوں میں قیامت کے ابتدائی حادثات کا بیان کرنا مقصود ہے، کہ کس طرح سے یہ کائنات فنا و برباد ہوگی اور ایک دوسرا عالم وجود میں آئے گا جہاں پر انسان کی قوتِ علمیہ یعنی اس کی سمجھ بوجھ عقل و شعور کمال کی بلندی تک پہنچ جائے گی، اور اس کی قوتِ عملیہ یعنی کام کرنے کی صلاحیت قوتِ خیالیہ کے ملنے اور دیگر اسباب و مواد کی طاقت حاصل ہو جانے کی وجہ سے رب العالمین کی قدرت کی طرح (بلا تشبیہ) ہو جائے گی کہ جس طرح اللہ کی قدرت یہ ہے کہ وہ ایک لمحے میں ''کن'' کے اشارے سے تمام کاموں کو انجام دے دیتا ہے اسی طرح اس عالم آخرت میں جنتی انسان کو قدرت عطا ہوگی، اور وہاں انسان کی خلافت صحیح معنوں میں کھلے طور پر نظر آئے گی، یعنی اللہ کا نائب و خلیفہ ہونے کی واضح شکل وہاں نظر آئے گی۔

دونوں سورتوں کے درمیان فرق

دونوں سورتوں کے مضامین میں اس اتحاد کے ساتھ ساتھ ان کے درمیان فرق بھی ہے اور فرق کی وجوہات حسب ذیل ہیں۔

(۱) سورۂ انفطار میں اس کائنات کے اصول کی فنا و بربادی کی کیفیت بیان فرمائی ہے، اور سورۂ تکویر میں اس کائنات کے تمام اصول و فروع کی خرابی و تباہی کی کیفیت کے ساتھ دوسرے جہان میں دو منزلوں یعنی جنت و جہنم کی تعمیر کو بھی بیان فرمایا ہے۔

(۲) سورۂ انفطار میں ان تمام کاموں پر انسان کے احاطۂ علمی کو بیان فرمایا جو دنیا میں اس سے صادر

ہوئے یعنی ان سب افعال وتروک کا علم اس کو قیامت کے دن حاصل ہو جائے گا (۱)

اور تکویر میں اس چیز پر انسان کا احاطۂ علمی بیان فرمایا جو قیامت کے دن اس کو فی الوقت کام آئے گی (۲) یعنی وہ حیاتِ وحدانیہ جو افعال وتروکِ کثیرہ سے ممتزج ہے اور وہ افعال وتروک اس زندگی کے جوہر نفس کو لازم ہو چکے ہیں۔ (اس پوری کیفیت کا اس کو علم ہو جائے گا)

(۳) سورۂ انفطار میں حوادث قیامت کے بیان کے ساتھ ساتھ اس ضمن میں قیامت کی جزا وسزا کو بیان کیا اور اس کے منکرین کے اعتقاد باطل کی تردید کی طرف توجہ مبذول فرمائی ہے۔

اور سورۂ تکویر میں اس بیانِ مذکور کے ساتھ ساتھ رسالت اور قرآن کی حقانیت کا اثبات کیا اور ان دونوں باتوں کے منکرین پر رد بھی کیا ہے۔ یہ بیان دونوں سورتوں میں مختلف وجوہات کا لحاظ کیا گیا ہے اسی اختلاف کی وجہ سے ان دونوں کو علیحدہ علیحدہ نازل فرمایا ہے۔

(یہ درمیان میں دونوں سورتوں کے اختلاف کی وجوہات تھیں، ابتداء کلام سے یہاں تک جو بات اجمالی طور پر بیان ہوئی ہے اب اس کی تفصیل بیان کی جاتی ہے جو مقدمہ کے اختتام تک جائے گی۔)

دنیا کے فنا ہونے اور عالم آخرت کے وجود میں آنے کی حسّی مثال

اس سے پہلے جو اجمالی بیان ہوا اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب کسی چیز کو خراب کر کے اور توڑ پھوڑ کر اسی جیسی چیز دوسری جگہ بنانے چاہتے ہیں تو دستور یہ ہے کہ اس چیز کو جڑ اور بنیاد سے کھودتے ہیں، پھر اس کے ساز وسامان میں سے حسب ضرورت تھوڑا بہت دوسری جگہ لے جاتے ہیں اور سابقہ شکل و صورت میں تبدیلی کر کے نئی چیز بناتے ہیں تاکہ جو کام اس نئی جگہ انجام دینے ہیں وہ اسی نئی صورت میں انجام دیئے جائیں، جیسے جب کسی حویلی کو باغ بناتے ہیں یا باغ کو حویلی، یا مقبرہ، یا خالی زمین پر حویلی یا کھیتی بنانا چاہتے ہیں تو اسی قسم کا معاملہ کرتے ہیں، اس تمہیدی مثال کے بعد اب تفصیل سمجھئے:

خلافت، انسان کا مقصدِ تخلیق

دنیا کا عالم بھی ایک بنائی ہوئی چیز ہے اور یہ جگہ انسانوں کے ہمیشہ رہنے کی نہیں ہے بلکہ انسان کو یہاں اس لئے لائے کہ وہ یہاں رہ کر اپنے اندر کمال پیدا کرے تاکہ اللہ تعالیٰ کی خلافت کی اہلیت و

(۱) یہ بات اس آیت میں بیان ہوئی "عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَ اَخَّرَتْ"
(۲) اشارہ ہے سورۂ تکویر کی اس آیت کی طرف "عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا اَحْضَرَتْ"

لیاقت اس میں پیدا ہو جائے اور عالمِ آخرت کو علم وعمل کی وسعتوں کے ساتھ آباد کر سکے، چنانچہ سب سے پہلے انسان کو جسم اور روح دو چیزوں سے ملا کر پیدا کیا، روح آسمانی چیز ہے اس کی غذا آسمان سے اترتی ہے اور جسم زمینی چیز ہے اس کی غذا زمین سے پیدا ہوتی ہے۔

پھر کاروبارِ خلافت کا خوگر بنانے کے لئے انسان کو زمین وآسمان دونوں کی چیزوں کے اندر تصرف کرنے کی صلاحیت عطا فرمائی تاکہ چیزوں کے جمع کرنے، جوڑنے اور ملانے کا سلیقہ اپنے اندر پیدا کر کے خلافتِ کبریٰ کا لائق ہو سکے، یہی وجہ ہے کہ انسان زمین کی تمام چیزوں کو خواہ وہ کھانے پینے کی ہوں، یا دوسری مثلاً پتھر، گھاس، درخت، چشمے، نہریں، جانور اور پرندے وغیرہ سب کو اپنے کام میں لانے کے لئے مشغول رہتا ہے اور چیزوں کی جمع تالیف میں مصروف رہتا ہے، اسی محنت کے نتیجے میں وہ عجیب و غریب صنعتیں، اور فن پاروں کی ایجاد کرتا رہتا ہے، نئے نئے کھانے، نئے نئے لباس، سواریوں اور گھروں کے نئے نئے نمونے اور ہر طرح کی چیزیں جو مختلف خاصیتیں اور تاثیریں رکھتیں ہیں ان کی ایجاد کرتا ہے، گویا اس میں وہ خالق الأصول والفروع جل جلالہٗ کے ساتھ ایک گونہ مشابہت اختیار کر لیتا ہے۔

اسی طرح آسمانی مخلوقات جن میں ستارے ہیں، سیارے ہیں اور بڑے عالی رتبہ فرشتے ہیں ان کے ذریعہ سے اپنے کام نکالتا ہے اور آسمان کی بلندیوں سے کوسوں دور زمین پر بیٹھ کر وہ آسمان کی مخلوق کی تسخیر کے طریقے جانتا ہے۔

خلافت کے اعتبار سے انسانوں کی دو قسمیں اور عالمِ آخرت کی ضرورت

لیکن بعض انسان بہت نقصان وگھاٹے میں پڑ گئے کہ تصرف کی جو صلاحیت اللہ تعالیٰ نے ان کو ملکۂ خلافت پیدا کرنے کے لئے عطا کی تھی انہوں نے اس سے غلط فائدہ اٹھایا اور بے جا تصرف کرنے لگے، جو کام کرنے کے تھے وہ تو چھوڑ دیئے، اور جو نہیں کرنے تھے وہ کئے، آخر کار وہ خلافت کا منصب ومقام تو کجا، بندگی کے مقام سے بھی نیچے گر گئے، چنانچہ سزا وعذاب کے مستحق ٹھہرے۔

اسی لئے عالمِ آخرت کو جزاء وسزا کے لئے مقرر فرمایا تاکہ وہاں نیک وبرے دونوں طرح کے انسانوں کے درمیان فرق وامتیاز کیا جا سکے، اور ان فرمانبرداروں کو جنہوں نے صحیح جدوجہد کر کے اپنے اندر خلافتِ کبریٰ کی صلاحیت وملکہ پیدا کیا تھا ان کی یہ خلافتِ کبریٰ کی لیاقت وصلاحیت پوری وسعت و کشادگی اور دوام وہمیشگی کی صفت کے ساتھ ظہور پذیر ہو، اور جنہوں نے سرکشی، نافرمانی اور اپنے آقا

سے دوری کو اس طرح اپنایا کہ وہ سرکشی و نافرمانی ان کے مزاج میں رچ بس گئی اور ان کا ملکہ بن گئی، پھر یہ ملکہ عالم آخرت میں جا کر اوجِ کمال تک پہنچ گیا تا کہ وہ اپنے ان بدترین اعمال کے نتیجے میں ہمیشہ کے عذاب میں گرفتار ہو سکیں۔

آخرت میں مؤمن کی بے پناہ قدرت وقوت کا راز

پھر اسی کام کے لئے یعنی انسان کی صلاحیت و ملکہ کو ہیشگی کے ساتھ لامحدود طور پر بڑھا دینے اور وسعت دے دینے کے لئے عالمِ آخرت میں یہ ضروری ہوا کہ تمام اجسام وارواح کو انسان کی خدمت و تابعداری میں لگا دیا جائے، اس لئے کہ یہ ضعیف وکمزور انسان نہ تو اس کے جسمانی ڈھانچے میں دوام و ہیشگی کی طاقت ہے اور نہ اس کی روح غیر معمولی بڑے کام ہیشگی کے ساتھ کر سکتی ہے، لہٰذا یہ قرار پایا کہ تمام آسمانی ارواح اس کی روح کی مددگار بنیں اور تمام قوائے عقلیہ وخیالیہ اس کی قوتِ عقلیہ وخیالیہ کے اندر آکر پیوست ہو جائیں، اور زمین کے تمام مواد جو اس کے جسم اور اس کے متعلقات کے لئے تقویت کا ذریعہ ہوں، متعلقات سے مراد جسم کی ضروریات وحوائج ہیں جیسے لباس کھانے پینے، رہنے سہنے اور پاکی وغیرہ کی چیزیں ہیں، بلکہ سانپ وبچھو، طوق وزنجیر اور آگ وشعلے بھی اس کے مددگار اور اسی کے کام میں مصروف ہو جائیں، تا کہ فرمانبرداروں کی خلافت کا معنی بہترین صورت میں جلوہ گر ہو اور باغیوں، سرکشوں کی بغاوت وسرکشی بھی صحیح صورت میں ظاہر ہو (۱)

(۱) اجسام وارواح کا انسان کی مدد یا خدمت وتابعداری کرنے سے معروف معنی مراد نہیں ہیں بلکہ حضرت شیخ قدس سرہ کی مراد واللہ اعلم یہ ہے:۔ کہ روح درحقیقت ایک لطیف اور نورانی قوت کا نام ہے لہٰذا آسمانی ارواح جو نورانی قوتیں ہیں وہ انسانی روح کی مددگار بنیں گی اس طرح اس ایک روح کی طاقت وقوت کئی ارواح کی قوت کے برابر ہو جائے گی، یہی حال قوت عقلیہ وخیالیہ کا ہے۔

اسی طرح انسانی جسم جو کہ مادے سے بنا ہے اس کو لامحدود قوت اس طرح حاصل ہوگی کہ زمین کے تمام مواد کی قوتیں اس کے اندر سرایت کر جائیں گی اس طرح اس ایک جسم کی طاقت وقوت بے شمار اجسام کی طاقت کے برابر ہو جائے گی، اگر چہ یہ مادی قوتیں عالمِ دنیا میں مختلف صورِ شخصیہ رکھتی تھیں مثلاً سانپ بچھو، زنجیر وسلاسل وغیرہ یہ سب مادے کی صورِ نوعیہ شخصیہ تھیں، ان سب کا انسانی جسم کے مددگار ہونے کا یہی معنی ہے اور یہ اللہ کی قدرت سے ہوگا، واللہ اعلم بالصواب۔ یہ پوری بحث بندہ نے انتہائی فکر وکوشش سے آسان اور عام فہم کرنے کے لئے اپنے الفاظ میں ماحاصل کے طور پر بیان کی ہے عین ممکن ہے بندہ حضرت مصنف علام کے مقصد وغرض کو سمجھنے میں کہیں چوک گیا ہو اس لئے اگر کوئی شبہہ پیدا ہو تو اصل ''فارسی'' کی طرف مراجعت فرمائی جائے۔ ۱۲ سفیر احمد

اس سورت میں چار انقلاب بیان فرمائے ہیں اور ان چاروں کا تعلق اس عالم کے اصول کے ساتھ ہے۔

پہلا انقلاب

پہلا انقلاب آسمان کا پھٹنا ہے، آسمان کے پھٹ جانے سے آسمانی عقول ونفوس کا تعلق اپنے اجرام سے ختم ہو جائے گا یعنی وہ آسمانی اجسام جن کے ساتھ ان عقول ونفوس کا تعلق تھا ان کا یہ تعلق ان اجسام سے منقطع ہو جائے گا، اور ان کا تعلق اس وقت انسانی نفوس کے ساتھ قائم ہو جائے گا،

شریعت نے اسی مقصد کو اس طرح تعبیر کیا ہے کہ اس دن ساتوں آسمان کے فرشتے اتریں گے، انسانوں کے ارد گرد جمع ہو جائیں گے اور انسانی ارواح کے بہت قریب ہو جائیں گے۔

جب ان نفوس سماوی کا تعلق، نفوس انسانی کے ساتھ قائم ہوگا تو ہر انسان کے فہم وادراک، سمجھ بوجھ اور فکر وشعور کی قوت میں ایک عظیم بشاشت ووسعت پیدا ہوگی، اور اسی کے نتیجے میں انسان سے دنیا میں خیر وشر کے جو اعمال سرزد ہوئے ہوں گے ان سب کی حقیقت واشگاف طریقے سے کھل کر اس کے سامنے آجائے گی۔

دوسرا انقلاب

دوسرا انقلاب یہ کہ آسمان کے سب ستارے ٹوٹ کر گر جائیں گے، اور وہ نورانی ارواح جن کا تعلق ان ستاروں کے ساتھ تھا وہ انسانی بدن کے ساتھ متعلق ہو جائیں گی، لیکن اس تعلق میں اس مناسبت کا لحاظ ہوگا جو دنیا میں رہتے ہوئے انسانی افراد کو ان ارواح سے حاصل ہوئی تھی، یا پیدائشی طور پر اللہ تعالیٰ نے وہ مناسبت کسی کو جتنی عطا فرمائی تھی اسی مناسبت کی بقدر آج ان ارواح کا تعلق انسانوں سے قائم ہوگا، ان ارواحِ کوکبیہ کے ملنے سے انسانی روح کی قوت میں اضافہ ہوگا۔

اسی مقصد کو قرآن میں ''قیام روح'' اور ''نزول روح'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔(۱)

یہ دونوں آسمانی انقلاب ہیں ان کی وجہ سے انسانی روح کو بہت فرحت وسرور اور خوشی وبشاشت حاصل ہوگی۔

---

(۱) یوم یقوم الروح والملائکۃ صفًا

تیسرا انقلاب

تیسرا انقلاب یہ بیان ہوا کہ سمندر اپنی تمام خلیجوں سمیت جوش مارے گا تو اس کے پانی کا کچھ حصہ بخارات و دھواں بن جائے گا، کچھ حصہ زمین کے اندر جذب ہو کر زمین میں نمی پیدا کرے گا تا کہ مٹی آسانی سے صورتوں شکلوں میں ڈھل سکے (وہ شکلیں جو اس کے اندر دفن کی گئیں ہیں اور مٹی میں مل چکی ہیں) اور اس کے پانی کا کچھ حصہ آگ بن کر بھڑک اٹھے گا اور دوزخ کے بھڑکنے کا سبب ہوگا، اسی مقصد کو قرآن میں کہیں ''تفجیر بحار'' سے تعبیر فرمایا ہے اور کبھی ''تسجیر بحار'' کے الفاظ سے بیان فرمایا ہے۔اور حدیث میں بھی آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سمندر کے بارے میں فرمایا ''إنَّ تحته نارًا'' اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب دریائے شور کو دیکھتے تو فرماتے ''یا بحرمتی تعود نارًا'' اے سمندر تو آگ میں کب تبدیل ہوگا؟

چوتھا انقلاب

چوتھا انقلاب زمین کا ہلنا ہے، قرآنِ کریم میں جگہ جگہ اس انقلاب کو ''زلزلۃ الساعۃ'' سے تعبیر فرمایا ہے، اور اس کے آثار و نتائج جو اس کے رونما ہونے سے ظاہر ہوں گے قرآن و حدیث میں مختلف بیان کئے گئے ہیں، چند ایک یہ ہیں، مثلاً ایک نتیجہ اور نشانی تو اسی سورۂ انفطار کی اس آیت میں بیان فرمائی ہے: ''وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ'' یعنی اجزائے بدنیہ گوشت، ہڈیاں، جلد وغیرہ کا جمع ہو کر زمین کے اوپر آ جانا۔

اس کی ایک اور نشانی ''تسییر جبال'' ہے یعنی پہاڑوں کا چلنا، انہی میں سے ''اخراجِ اثقال'' ہے یعنی زمین کے اندر چھپے خزائن اور دفن کئے گئے مردوں کا زمین کے اوپر آ جانا، انہی میں سے زمین کا ہموار ہو جانا ہے، انہیں میں سے زمین کی قوتِ نامیہ کا باطل ہو جانا بھی ہے، زمین کے اس انقلاب کے آثار میں سے وہ بھی ہے جس کا ذکر صحیح حدیث میں آیا ہے کہ اس دن زمین سفید میدے کی روٹی کی طرح ہو جائے گی اور محشر والوں کے لئے غذا کا کام دے گی، اس کے علاوہ اور بہت سے آثار و نشانیاں ہیں سب کو اگر ذکر کیا جائے تو بات لمبی ہوگی۔

یہ دونوں انقلاب (یعنی سمندر کا بھڑکنا اور زمین کا ہلنا) زمینی ہیں ان کی وجہ سے جسمِ انسانی کا مواد حاصل ہوگا تا کہ یہ اس نفس وسیعہ اور روح کاملہ کی کاریگری کا موضوع یعنی موقوف علیہ بن سکے۔

ان چار انقلابوں کے بعد ایک نئے عالم کی بنیاد رکھی جائے گی جس کو عالم آخرت کہتے ہیں، اس عالم کے قیام کی بنیادی اور اصلی وجہ یہ ہے تا کہ اچھے اور برے اعمال کی حقیقت کھل جائے (یعنی دنیا میں نیک عمل یا برے عمل کا نتیجہ اچھا یا برا نظر نہیں آتا کہ کیا ہے وہاں اچھے عمل پر ثواب اور اچھا نتیجہ اور برے عمل کا برا نتیجہ واشگاف طریقے سے کھل کر سامنے آجائے گا) اسی لئے اس سورت میں ان چار انقلابات کے ذکر کے بعد اسی بات کو بیان فرمایا ہے۔

کائنات کے چار بنیادی ارکان

یہاں صرف چار انقلابوں کے بیان پر ہی اکتفا کی ہے وجہ یہ ہے کہ تحقیق کے بعد یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس عالم کے بنیادی اصول چار ہی چیزیں ہیں (۱) آسمان (۲) ستارے (۳) پانی (۴) زمین

ان کے علاوہ اس کائنات میں باقی جتنی چیزیں ہیں وہ انہی کے اجزاء سے مرکب ہیں ان کا کوئی مستقل الگ مرکز نہیں، جیسے معدنیات، نباتات، جاندار اور زمین و آسمان کے درمیان کی تمام مخلوقات سب عقلا کے نزدیک انہی چاروں سے پیدا ہوتی ہیں۔

کرۂ ناریہ اور کرۂ ہوائیہ کا وجود نہیں

لیکن کارخانہ عقل کے ظاہر بینوں نے ہواء اور آگ کو مستقل مان لیا مگر تحقیقی بات یہ ہے کہ ہواء ایک ایسا جسم ہے جو پانی کی لطافت یا بعض ستاروں کی تاثیر سے کم یا زیادہ پیدا ہوتی رہتی ہے اس کی پیدائش کے لئے مستقل کوئی مرکز جسے دوسرے الفاظ میں کُرہ کہیں نہیں ہے، نہ اس کا بالاستقلال کوئی کُرہ ہے اور نہ یہ کوئی صورت قبول کرتی ہے، اس کا کام صرف چلنا اور مخلوقات کی کیفیات کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا دینا ہے جیسے بُو کو ناک میں، آواز کو کان میں، گرمی، سردی، خشکی تری کو قوتِ لامسہ میں یعنی جاندار کی جلد تک پہنچا دینا ہے، اسی پر دوسری چیزوں کو قیاس کر لیا جائے۔

اور ''آگ'' تو وہ ہواء ہی ہے جو سخت حرکت کی وجہ سے یا سورج کی تاثیر سے سلگ گئی ہے اور اس نے اپنی ایک خاص شکل وصورت بھی اختیار کر لی ہے ورنہ اس کا کوئی مستقل مرکز نہیں، اس کا کام کچی چیزوں کو پکا دینا اور بے کار چیزوں کو جلا دینا ہے۔

فلاسفۂ قدیم کا یہ خیال کہ کرۂ ناریہ اور کرۂ ہوائیہ نے زمین و پانی کے گِردوں کو گھیرا ہوا ہے (یعنی پانی

کے کرے کو چاروں طرف سے یکے بعد دیگرے ان دونوں کروں نے گھیر رکھا ہے جس طرح پانی کے کرے نے زمین کے کرے کو گھیر رکھا ہے) یہ محض بے دلیل بات ہے یہ ایسی ہی بے اصل بات ہے جیسے وہ آسمان وستاروں کا خرق والتیام محال سمجھتے ہیں۔

انفطار کی وجہ تسمیہ

اس سورۂ کا نام انفطار اس لئے رکھا ہے کہ اس میں آسمان کے انفطار یعنی پھٹنے کا ذکر ہے جو کہ بہت عمدہ سبب ہے نفوس وعقولِ سماوی کے انسانی نفوس وعقول کے ساتھ مل جانے کا اور درحقیقت اسی ملاپ و تعلق کی وجہ سے "ما قدمت و ما اخرت" کا علم حاصل ہوگا اور اس سورت میں اسی کا بیان مقصود ہے۔ واللہ اعلم

تمت المقدمہ والحمدللہ

تفسیر سورۂ انفطار

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ۝

جب آسمان چر جائے

آسمان کے چرنے کی کیفیت یہ ہوگی کہ عرش الٰہی کے نیچے سے بادل کے ٹکڑے کی طرح کوئی چیز گرے گی اس کے شدید ٹکراؤ کی وجہ سے تمام آسمان ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے، اور درحقیقت وہ قہر الٰہی کی تجلی ہوگی، جب اللہ عزوجل اس عالم کے فنا و برباد کردینے کا ارادہ فرمائیں گے اس وقت وہ تجلی قہر اس صورت میں ظاہر ہوگی۔

یہاں بعض ذہین طالب علم سوال کرتے ہیں کہ جب اس عالم کی بنیاد ڈالی تھی تو ابتداء زمین سے ہوئی تھی اب اس کے ختم کردینے کے وقت ابتداء آسمان سے کیوں ہوئی؟

جواب اس کا یہ ہے کہ جب کسی عمارت کی تعمیر شروع کرتے ہیں تو ابتداء نیچے سے ہوتی ہے، جب اس کو گرایا جاتا ہے تو اس کے اکھیڑنے کی ابتداء چھت سے کی جاتی ہے، اور آسمان بھی اس عالم کا چھت

ہے اس لئے فنا کرنے کے لئے ابتداء آسمان سے ہوئی۔

وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ○

اور جب تارے جھڑ پڑیں

آسمان کا چرنا اور ستاروں کا چھٹک کر جھڑنا یہ دو انقلاب جب رونما ہوں گے تو آسمانی نفوس کا تعلق آسمان و ستاروں سے ختم ہو جائے گا، اس تعلق کے ٹوٹ جانے کی وجہ سے ان نفوس کے عقول کا تعلق بھی اپنے نفوس سے منقطع ہو جائے گا، پھر نفوس کے ضمن میں افلاک کے قوائے خیالیہ کا تعلق بھی اپنے اجرام سے ٹوٹ جائے گا اور ان سب کا ربط و تعلق نفوس انسانی سے قائم ہو جائے گا تب ان عقول کا فیضان اور افلاک کی قوائے خیالیہ کی کرشمہ سازیاں سب انسانی نفس کے ساتھ متعلق ہوں گی چنانچہ ان سب اسباب کی وجہ سے نفسِ انسانی کے شعور و احساس میں عظیم وسعت پیدا ہو جائے گی اور وہ "ما قدمت و ما أخرت" کے معنوں پر سو فیصد مطلع ہو جائے گا یعنی ہر چھوٹی بڑی چیز جو اس سے سرزد ہوئی، تمام کلیات و جزئیات جو اس نے مقدم کیں یا مؤخر ان سب پر اس کو کامل اطلاع ہو جائے گی۔

وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ○

اور جب دریا اُبل نکلیں

یعنی آج جو دریاؤں میں ٹھہراؤ اور سکون ہے وہ باقی نہیں رہے گا بلکہ دریا بہہ نکلیں گے، شیخ ابو منصور ماتریدی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ سب سے پہلے تمام دریا ایک جگہ اکٹھے کئے جائیں گے، ان سب کے جمع ہونے کی وجہ سے پانی میں ایک جوش اور اُبال پیدا ہوگا جس سے ایک شعلہ بلند ہوگا اور سارے سمندر میں آگ لگ جائے گی تب کچھ پانی دھواں بن کر میدانِ قیامت کی ساری فضا کو پُر کر دے گا، اور کچھ دوزخ کی آگ بن جائے گا:۔

"تسجیر بحار" اور "تفجیر بحار" میں فرق

اس سمندری انقلاب کے دو حصے ہیں ایک ابتداء ہے جب تمام دریا اپنے موجودہ ٹھہراؤ اور سکون سے متغیر ہو کر بہہ نکلیں گے اور دوسرا حصہ جب سب اکٹھے ہو جائیں گے تو جوش و اُبال کی شدت کی وجہ

سے وہ بھڑک اُٹھیں گے، اب یہ سمجھئے کہ سورۂ انفطار میں اس انقلاب کا اول حصہ بیان ہوا کہ جب وہ اُبل کر بہہ پڑیں گے اور ٹھہراؤ اور سکون ان کا ختم ہو جائے گا، اور سورۂ تکویر میں اس انقلاب کا دوسرا اور آخری حصہ بیان ہوا جب وہ سب دریا ایک جگہ جمع ہونے کی وجہ سے بھڑک اٹھیں گے۔

اور دونوں سورتوں میں مقام کی مناسبت سے یہ فرق ہوا ہے اس لئے کہ سورۂ انفطار میں اس کے متصل "بعثرت القبور" (قبروں کے کھولے جانے) کا ذکر ہے اس کی مناسبت سے بہہ جانے کو اختیار فرمایا اس لئے کہ جب پانی بہہ کر مکان کی بنیاد میں پہنچ جاتا ہے تو اس کو خراب کر دیتا ہے، اور سورۂ تکویر میں "تسعیر جحیم" کی مناسبت سے سمندر کے بھڑکائے جانے کو اختیار فرمایا ہے۔

"بحر" کی لغوی تحقیق اور سمندروں کا ذکر

"بحر" لغت میں سمندر کو کہتے ہیں اور میٹھے دریاؤں کو "نہر" کہتے ہیں خواہ کتنے لمبے چوڑے اور گہرے کیوں نہ ہوں، اور سمندر حقیقت میں تو ایک ہے لیکن اس کے مختلف ٹکڑوں اور خلیجوں کی رعایت سے "بحار" جمع لائے ہیں، تاریخ دانوں نے لکھا ہے کہ سمندر کے ایک ٹکڑے کا نام "بحر چین" ہے، ایک کا نام "بحر ہند" ایک کا نام "بحر فارس" ایک کا "بحر روم" اور ایک "بحر قلزم" ہے۔ بحر روم میں فرنگیوں کے جزیرے ہیں اور بحر قلزم عرب وحبشہ کے درمیان بہتا ہے، اسی طرح اور بھی مختلف نام ہیں۔

جب سمندر زمین پر بہہ نکلیں گے تو ان کے بہنے سے (مٹی میں رطوبت و نمی پیدا ہوگی جس کی وجہ سے) انسانی بدن کے مواد اور اس کے بدن کو عذاب و تکلیف دینے کے اسباب میں اضافہ ہوگا، اور نفوسِ سماوی کا تعلق انسانی ابدان کے ساتھ صحیح ہو جائے گا۔

وَإِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ ○

اور جب قبریں زیروزبر کردی جائیں

یعنی قبروں کے مردے اور جو کچھ زمین کے اندر ہے سب الٹ کر زمین کے اوپر آجائے گا انسانی جوڑوں کے (مٹی میں بکھرے ہوئے) اجزاء آپس میں مل جائیں گے، اس وقت عرش کے نیچے سے ایک ایسا پانی برسے گا جس میں زندگی پیدا کرنے کی قوت ہوگی وہ انسانی منی کی تاثیر رکھے گا، اس کے بعد حضرت اسرافیل علیہ السلام صور پھونکیں گے تو تمام انسانی روحیں اپنے اپنے بدن کے ساتھ مل جائیں

گی اور آسمانی روحیں ان کی خادم و مددگار ہوں گی پھر حشر قائم ہوگا اس وقت ہر نفس کو اپنے اعمال کے متعلق سب کچھ معلوم ہو جائے گا چنانچہ فرمایا:

عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَ اَخَّرَتْ ○

جان لے ہر ایک جی جو کچھ کہ آگے بھیجا اور پیچھے چھوڑا

یعنی نیکی اور بدی میں سے جو کچھ اللہ تعالیٰ کے پاس آگے بھیجا ہے، اور بھیجنے سے مراد اعمال کا کرنا ہے اس لئے کہ انسان نے جو عمل کیا ہے وہ اعمال نامہ میں لکھ دیا گیا اور وہ اعمال نامے لکھنے والوں کے واسطے سے اللہ کے دربار میں پہنچے ہیں۔

"وَ اَخَّرَتْ" نیکی اور بدی میں سے جو کچھ پیچھے چھوڑا ہے، پیچھے چھوڑنے سے مراد نہ کرنا ہے، یعنی جو کام اس نے نہیں کیے وہ بھی معلوم ہو جائیں گے، نہ کیے گئے کاموں کو پیچھے چھوڑنے سے اس لئے تعبیر کیا کہ جو کیا نہیں وہ نامۂ اعمال میں لکھا بھی نہیں گیا لہٰذا وہ آگے نہیں پہنچا۔

"ما قدمت" اور "اخرت" میں مفسرین کے اقوال

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے مراد مال ہے لہٰذا جو مال اس نے اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کی خاطر خرچ کیا ہے وہ سب آخرت میں ذخیرہ ہو گیا ہے (یہ ما قدمت ہے) اور جو مال اس نے خرچ نہیں کیا تو وہ اپنے وارثوں کے لئے پیچھے چھوڑا ہے (یہ ما اخرت ہے)

دوسرا قول:۔ بعض نے کہا ہے کہ "ما قدمت" سے مراد وہ اولاد ہے جو ماں باپ کے سامنے مر گئی، اور "ما اخرت" سے مراد وہ اولاد ہے جو انسان کے مرنے کے بعد پیچھے رہی یعنی زندہ رہی۔

تیسرا قول:۔ بعض نے کہا ہے کہ "ما قدمت" سے مراد اول عمر کے اعمال ہیں چاہے وہ اچھے ہوں یا برے، اور "ما اخرت" سے آخری عمر کے اعمال مراد ہیں۔

چوتھا قول:۔ بعض نے کہا کہ نیکی یا برائی میں سے کسی کا کرنا یا چھوڑنا یہ سب "ماقدمت" میں داخل ہیں (یعنی ہر وہ عمل جو کرنے والے کی ذات تک محدود ہو چاہے اس کا تعلق کرنے سے ہو یا چھوڑنے سے) اور ایسی رسم، طریقہ، یا مذہب جس کی بنیاد کسی نے ڈالی ہے اور اس طریقہ پر دوسرے لوگ بھی چلے ہیں چاہے وہ رسم و طریقہ اچھا ہو یا برا یہ سب "ما اخرت" میں داخل ہیں۔

چنانچہ حدیث میں آتا ہے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے

"ما قدمت من خير أو شر و ما أخرت من سنة حسنة استن بها بعده فله أجره و أجور من اتبعه من غير أن ينتقص من أجور هم شئ أو سنة سيئة عمل بها بعده فعليه وزره و وزر من عمل بها بعده لا ينتقص من أوزار هم شئ"

یعنی جو نیکی اور بدی میں سے آگے بھیجا اور جو اچھے طریقے میں سے پیچھے چھوڑا کہ وہ اچھا طریقہ لوگوں نے اس کے بعد اختیار کیا تو اس شخص کے لئے اپنے عمل کا اجر ہے اور ان لوگوں کے اجر سے بھی اس کو ملے گا جنہوں نے اس کے طریقہ کو اپنایا لیکن ان لوگوں کے اجر میں کچھ کمی نہ کی جائے گی، یا جس نے کوئی برا طریقہ ایجاد کیا کہ اس کے بعد دوسرے لوگوں نے بھی اس کو اختیار کیا تو اس شخص کو اپنے کئے کا بھی گناہ ہوگا اور جتنے لوگوں نے اس طریق کو اپنایا ان کا گناہ بھی اس پر ہوگا مگر ان کے گناہوں سے ان کے لئے کچھ کمی نہیں کی جائے گی۔

دوسری حدیث میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ ایک حاجت مند شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں آیا اس نے سوال کیا، لوگ خاموش رہے اتنے میں حاضرین میں سے ایک بزرگ اُٹھے اور پہل کرتے ہوئے اس سائل کو کچھ دیا، پھر اس کے بعد سب حسب توفیق اُٹھ اُٹھ کر اس سائل کو دینے لگے، تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو آدمی کوئی اچھا طریقہ نکالتا ہے پھر اس کے مطابق لوگ عمل کرتے ہیں تو اس پہلے شخص کو اپنے عمل کا بھی ثواب ملتا ہے اور دوسرے لوگوں کے عمل کا ثواب بھی اس کو ملتا ہے لیکن دوسروں کے اپنے ثواب میں کچھ کمی نہیں ہوتی، اسی طرح اگر کوئی بُری رسم نکالتا ہے اور لوگ بھی اس پر عمل پیرا ہوتے ہیں تو اس اوّل شخص کو اپنے عمل کا بھی گناہ ہوگا اور جتنے لوگوں نے اس بری رسم کو اختیار کیا ان کا گناہ بھی اس کو ہوگا مگر اس سے خود ان لوگوں کے گناہ میں کچھ کمی نہیں ہوگی۔

اس حدیث کے راوی کہتے ہیں کہ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ نے یہ قصہ نقل کرنے کے بعد یہ آیت تلاوت فرمائی "عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَ اَخَّرَتْ"

حاصل کلام یہ ہے کہ انسان کو نیکی اور برائی کی حقیقت وہاں اچھی طرح معلوم ہو جائے گی، جب دیکھے گا کہ نیکی کا بدلہ یہ ہے اور برائی کی سزا یہ ہے یہ بھی دیکھے گا کہ جو اس نے کیا وہ سب بُرا تھا اور جو چھوڑا وہ اچھا تھا، تب اس کو اپنے کئے پر حسرت و ندامت ہوگی اس وقت اس سے کہا جائے گا:

یٰۤاَیُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِیْمِ ○

اے آدمی کس چیز سے بہکا تو اپنے رب کریم پر

یعنی اے انسان تیرا نام تو انس سے نکالا گیا ہے تو نے یادِ حق کے ساتھ انس کیوں حاصل نہ کیا، اور نیکیاں نہیں کیں، تُو حق کے علاوہ جن کے ساتھ مانوس ہوا وہ سب تیرے لئے سانپ و بچھو تھے، تُو ہیرے جواہرات اور سونے کے نگینے سمجھ کر ان سے مانوس ہوا اور ان سے محبت کی۔

مَا غَرَّكَ:۔ یعنی تجھ کو کس چیز نے فریب دیا، نفس نے، شیطان نے، مخلوق نے، یا دنیا نے؟

بِرَبِّكَ الْكَرِیْمِ:۔ تیرے ایسے پروردگار سے (کس نے فریب میں ڈالا) کہ جس نے طرح طرح سے تیری پرورش و تربیت کی، اور تیرے ساتھ وہ معاملہ کیا جو اس کی صفتِ کرم کا تقاضا تھا، اور اس کے مقابلے میں تُو نے نافرمانی و بغاوت کا دھبہ اپنے اوپر لگایا، تُو نے اپنی وہ بزرگی و عظمت جو تجھے ساری مخلوق پر عطا کی گئی تھی سب برباد کر دی۔

"کریم" کے معنی میں علماء کے مختلف اقوال

(۱) بعض نے کہا کہ کریم وہ ہے جس کا کام ہی انعام و احسان کرنا ہو اور اس کی ہر حرکت و سکون میں خیر ہی پوشیدہ ہو۔

(۲) بعض نے کہا کریم وہ ہے کہ انعام و احسان کرنے میں جس کے مدِّنظر نہ تو اپنی ذات کے لئے کوئی نفع حاصل کرنا ہو نہ کسی ضرر کو دفع کرنا۔

(۳) بعض نے کہا کریم وہ ہے جو دوسروں کا حق اپنے ذمہ میں نہ رہنے دے اور اپنا حق دوسروں سے طلب نہ کرے۔

(۴) بعض نے کہا کریم وہ ہے جو دوسروں سے بہت تھوڑی خیر و بھلائی قبول کرنے پر اس کا بدلہ بہت زیادہ دے، اور اللہ تعالیٰ کے کرم کا مقتضا بھی یہی ہے کہ وہ گنہگاروں کے گناہوں کو بخشتا ہے اور اسی پر بس نہیں کرتا بلکہ ان کی تمام تر نافرمانی کے باوجود ان پر مسلسل انعام و احسان بھی کر رہا ہے اور گناہوں کی پردہ پوشی بھی فرماتا ہے۔

"ماغرّک بربک الکریم" پر اشکال

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ یہاں فرمایا ربِ کریم سے تجھے کس چیز نے غرور وفریب میں ڈالا، گویا کریم سے فریب کھانے پر نکیر فرمائی جارہی ہے کہ کریم سے فریب نہیں کھانا چاہئے تھا، حالآنکہ فریب کھانے پر سرزنش کے لئے مناسب یہ تھا کہ صفتِ قہر ذکر فرمائی جاتی اس لئے کہ قہار سے بے خوف ہوجانا اور چھٹکارے کے فریب میں مبتلا ہوجانا واقعی قابلِ مذمت بات ہے، لیکن کریم کا کرم تو بے خوفی کے فریب میں ڈالنے کا خود بڑا سبب ہے، چنانچہ واقعات اس کی گواہی دیتے ہیں،

تاریخ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ ایک دن نوشیرواں بادشاہ کے دربار میں اس کے دربار کے لوگ، خدام وخواص آپس میں کسی بات پر ہنس پڑے تو ایک وزیر نے کہا تمہیں کچھ خوف نہیں، بادشاہ کے سامنے ایسی حرکتیں کرتے ہو، اس پر نوشیرواں نے کہا کہ ہمیں چاہئے کہ دشمن کو خوف دلائیں نہ یہ کہ اپنے خدمت گاروں کو خوف زدہ رکھیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک دن کسی کام کے لئے اپنے غلام کو آواز دی، دو تین بار پکارا مگر اس نے سننے کے باوجود کوئی جواب نہ دیا آپ باہر تشریف لائے دیکھا تو غلام دروازے کے پاس کھڑا ہے آپ نے اس سے پوچھا کیا وجہ ہوئی تم نے جواب نہیں دیا؟ اس نے کہا مجھے آپ کے کرم پر اعتماد تھا کہ آپ سزا نہیں دیں گے، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس کا جواب پسند آیا اور اسی وقت اس کو آزاد کردیا۔

ان دو واقعات سے معلوم ہوا کہ جو چیز (کرم) خود فریب وغرور کا سبب ہو اسی کو فریب کھانے پر مذمت وانکار کے طور پر بیان کرنا کہ اس سے تم نے کیوں فریب کھایا بظاہر مناسب معلوم نہیں ہوتا۔

اشکال مذکور کے جوابات

(۱) اس جگہ صفتِ کرم فریب کھانے کی وجہ وسبب کے بیان کے لئے ذکر فرمائی ہے کہ اس کے کریم ہونے کی وجہ سے تم دھوکے میں اور غلط فہمی میں پڑ گئے، جب تمہاری نافرمانی کے باوجود اس نے تمہاری پکڑ نہیں کی، لطف وکرم کا معاملہ جاری رہا تو تم مغرور ہوگئے غلط فہمی میں پڑ گئے کہ شاید کبھی بھی ہماری پکڑ نہ ہوگی چنانچہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے "إلٰهي غرّني حلمك لو أخذتني

بالأولی ما جرات بالثانیة'' ''الٰہی! تیرے حلم نے مجھے دھوکہ میں ڈالا اگر تُو میری پہلی غلطی پر مجھے پکڑ لیتا تو مجھے دوسری کی جراءت نہ ہوتی''

حضرت فضیل بن عیاض رحمہ اللہ سے لوگوں نے پوچھا کہ اگر قیامت کے دن اللہ تعالیٰ آپ کو کھڑا کر کے پوچھے ''ماغرک بربک الکریم'' تو آپ کیا جواب دیں گے، انہوں نے فرمایا میں عرض کروں گا ''غرنی ستورک المرخاة'' گناہوں کے چھپانے کے لئے تیرے لٹکتے ہوئے پردوں نے مجھے فریب میں مبتلا کیا، یعنی میں نے کتنے گناہ کئے مگر دنیا میں تُو نے مجھے رسوا نہیں فرمایا تو میں اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا کہ شاید میں کبھی بھی رسوا نہ ہوں گا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''کم من مغرور بالستر علیه و کم من مستدرج بالاحسان إلیه'' بہت سے لوگ پردہ پوشی کی وجہ سے (معافی) کے دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں اور بہت سے اللہ کے احسان واکرام کی وجہ سے استدراج میں (یعنی ڈھیل میں) گرفتار ہیں۔

پھر جب مجموعۂ کلام پر استفہام انکار داخل ہوا تو قاعدۂ عربی کے مطابق کلام میں سرزنش و ملامت کے معنی پیدا ہو گئے لہٰذا اس غرور پر بھی سرزنش وارد ہو گئی جو کریم کے کرم کو ملاحظہ کرتے ہوئے پیدا ہو گیا تھا، اور جب کرم پر فریب کھانے کی وجہ سے سرزنش ہو گئی حالانکہ کرم فریب میں ڈالنے کا بڑا سبب ہے، تو اس سے مطلق غرور کی نفی بہت اچھی طرح واضح ہو گئی، اس لئے کہ جب کرم غرور کا محل نہیں ہو سکتا تو قہر و غضب غرور کا محل کیسے ہو سکتا ہے؟ اور اللہ تعالیٰ کی صفت جس طرح کرم ہے اسی طرح قہر و غضب بھی اس کی صفت ہے وہ کریم ہے اور قہار و منتقم بھی، اور ان سب صفات کے ساتھ ساتھ وہ حکیم بھی ہے، جب اس کی حکمت کا تقاضا قہر و غضب کا ہوگا تو اس وقت صفت کرم کے آثار ظاہر نہ ہوں گے، اور آخرت میں بدکاروں، گنہگاروں اور نافرمانوں کے ساتھ لطف و کرم حکمت کے خلاف ہے، یہی بات جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کو تلاوت کر کے اس موقعہ پر فرمائی ہے، فرمایا:

''غرّہ باللّٰہ جھلہ'' یعنی انسان کو دھوکہ میں ڈالا اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات سے جہالت نے، انسان صرف ایک صفتِ کرم پر تکیہ لگائے بیٹھا رہا اور اللہ کی دوسری صفات حکمت و عدالت بھول گیا (اگر وہ بھی یاد رہتیں تو مغالطے میں نہ پڑتا)

دوسرا جواب

کسی کام پر ڈانٹ ڈپٹ وہیں ہوتی ہے جہاں اس کام کے سرزد ہونے کا احتمال ہو، کریم کے کرم سے دھوکہ ہوسکتا ہے لہٰذا اس پر انکار و توبیخ بھی مناسب ہے لیکن قہر و غضب سے کوئی مغرور نہیں ہوسکتا لہٰذا قاہر کے قہر سے فریب کھانے پر ڈانٹ ڈپٹ کی کوئی مناسبت نہیں ہے مثلاً عرف میں کہتے ہیں فلاں آدمی کے حلم پر بھروسہ نہ کرنا اس کے حلم سے دھوکے و غلط فہمی میں نہ پڑ جانا لیکن یہ کوئی بھی نہیں کہتا کہ فلاں کے غصہ سے غلط فہمی میں نہ پڑنا، اس پر اعتماد مت کرنا اس لئے کہ قہر و غضب اعتماد کی چیز نہیں بچنے کی چیز ہے ایسے موقعہ پر بچا جاتا ہے نہ کہ مغالطہ ہوتا ہے۔

تیسرا جواب

بعض بزرگوں نے ایک اور جواب دیا ہے کہ بندے کو جواب سمجھانے کے لئے صفت کرم ذکر فرمائی کہ اس کو جواب کی تلقین ہو جائے یعنی جب بندے سے کہا جائے کہ ''رب کریم سے کس نے تمہیں دھوکے میں رکھا'' تو اس کو اس سوال سے ہی جواب سمجھ آجائے اور یوں کہے کہ **''غرنی کرمک''** میرے رب تیرے کرم نے ہی دھوکے میں ڈال دیا۔

لیکن یہ جواب نہیں چل سکتا، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا لطف و کرم بھی حکمت سے خالی نہیں ہوتا، اور یہ تو اس کی حکمت کے خلاف ہے کہ بندوں کو بغیر جزا و سزا کے مہمل چھوڑ دے، اس کی حکمت کا تقاضا تو یہ ہے کہ مظلوم کا بدلہ ظالم سے لیا جائے، مخلوق کے حقوق ضائع نہ ہوں، نیکو کار و بدکار کو اپنی اپنی حیثیت کے مطابق مقام دیا جائے، ان کے ساتھ ایک ہی جیسا سلوک نہ کیا جائے تاکہ فرمانبردار اور نافرمان کے درمیان فرق و امتیاز ہوسکے، اس جواب پر تو الٹا بندے کے اوپر الزام آئے گا کہ ارے! تُو نے میرے کرم کی آڑ میں میری حکمت کا انکار کر دیا؟

اور حقیقت یہ ہے کہ بندے پر اللہ تعالیٰ کا لطف و کرم اس کی پیدائش سے بھی پہلے جاری ہے، اس کی پیدائش میں نہ اس کی خواہش کا دخل ہے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کو اس سے کسی بدلے یا غرض کی توقع تھی، پھر طرح طرح کی نعمتوں سے اس کو نوازا، لیکن یہ کوئی ضروری نہیں کہ اللہ کا کرم آئندہ بھی اسی طرح رہے گا، اور گناہوں، نافرمانیوں کے باوجود اس سے کوئی بازپُرس نہ ہوگی اس لئے کہ پہلا کرم دوسرے کرم کا

سبب نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے پہلے کرم پر مغرور ہونے اور مغالطے میں پڑنے کی بجائے زیادہ خوف و ڈر پیدا ہونا چاہئے، چونکہ کسی ایسے کی مخالفت کرنا جس کا کوئی احسان نہ ہو زیادہ تعجب خیز نہیں، لیکن احسانات وانعامات سے نوازنے والے ولیٔ نعمت کی مخالفت کرنا تو بہت بڑی ناشکری اور انتہائی خوف و ڈر کا مقام ہے، لہٰذا یہ بالکل نامعقول بات ہے کہ پہلے کرم کی بنیاد پر ایسے ناشکرے آدمی سے درگذر کا معاملہ کیا جائے، عرف میں ایسی چشم پوشی کو تو ذلت سمجھا جاتا ہے خاص طور پر اس وقت کہ ایسے کی ناشکری ہو کہ ساری نعمتیں اسی نے دی ہوں اور اس کی نعمتوں کو کسی دوسرے کی طرف منسوب کیا جائے یا اس کی مرضی کے خلاف استعمال کیا جائے۔ العیاذ باللہ۔ جب ایسی چشم پوشی اور معافی کو عرف میں بھی عیب سمجھا جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ سے اس کی توقع کہاں کی عقلمندی ہے؟ **اعاذنا الله من ذلك**

غرور، تمنا اور رجاء کے درمیان فرق

اب یہ جاننا چاہئے کہ یہاں تین چیزیں ہیں:

(۱) غرور (۲) تمنا (۳) رجاء

غرور و تمنا کو قرآن میں جگہ جگہ ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے ان کی مذمت آئی ہے، جیسے فرمایا:

"**لايغرنكم بالله الغرور**" دوسری آیت:۔ "**ليس باما نيكم ولا بأماني أهل الكتاب**"

تیسری آیت: "**و تلك أمانيهم**" ان کے علاوہ اور بھی آیات ہیں۔

رجاء جس کا معنی امید ہے قرآن وحدیث دونوں میں اس کی مدح وتعریف آئی ہے اس کو پسندیدہ قرار دیا گیا ہے جیسے فرمایا "**يرجون رحمة الله**" اور دوسری آیات میں بھی اس کی مدح آئی ہے۔ لہٰذا ان تینوں کے درمیان واضح فرق معلوم ہونا چاہئے تاکہ اچھی اور بری چیز کے درمیان التباس نہ رہے۔

رجاء کی حقیقت

امید کی حقیقت یہ ہے کہ کسی دلپسند اور مرغوب چیز کے اسباب مہیا کر کے اس کے انتظار میں دل خوش رہے، جیسے ایک کسان نے اچھا وعمدہ بیج ایک اچھی پیداواری زمین میں بویا، وقت پر زمین کو پانی بھی دیا اور ہر طرح سے محنت کی، اب وہ غلّے کا منتظر ہے تو اس کو امید کہیں گے، کہ یہ کسان غلّے کی امید میں ہے۔

غرور کی حقیقت

اگر ایک چیز کے حاصل ہونے کے بہت سے اسباب ضائع کرنے کے باوجود اس چیز کے انتظار میں کوئی رہے تو یہ غرور و حماقت ہے، جیسے ایک کسان نے بنجر زمین میں بیج بویا اور وقت پر زمین کو نہ سینچا پھر وہ غلّے کی انتظار میں بیٹھا ہے تو یہ حماقت وغرور ہے۔

تمنا و آرزو کی حقیقت

اگر کسی چیز کے اسباب مہیا ہونے میں شک ہے اس کے باوجود اس کا انتظار ہے تو یہ محض تمنا و آرزو ہے جیسے کوئی کسان اچھی زمین میں بیج بوتا ہے مگر زمین کو سینچا نہیں یا سینچا تو ہے مگر بیج بنجر زمین میں بویا پھر غلّے کی انتظار میں بیٹھا ہے تو اس کو آرزو کہتے ہیں۔

جب یہ مثالیں خوب اچھی طرح سمجھ آ گئیں تو اب ایمان والے آدمی کو چاہئے کہ وہ اپنی فلاح و نجات کے لئے اپنی قدرت و طاقت کے مطابق خوب کوشش کر کے اس کے اسباب جمع کرے مثلاً اللہ تعالیٰ کے حکموں کو ماننا اور منع کی ہوئی باتوں سے بچنا وغیرہ اسباب نجات ہیں، پھر رحمت الٰہی کی امید میں خوش و خرم زندگی بسر کرے، لیکن جس نے اپنی فلاح و نجات کے سارے اسباب کھو دیئے، اپنی عمر کو اللہ تعالیٰ کی مرضیات کے خلاف چیزوں میں ضائع کر دیا پھر بھی وہ نجات کا منتظر ہے تو یہ احمق ہے جو غرور میں مبتلا ہے، اور گر اسباب نجات میں شک ہے جیسے نماز روزہ کیا ان کی شرائط کا اچھی طرح خیال نہیں کیا پھر نجات کا منتظر ہے تو وہ محض آرزومند ہے، اللہ تعالیٰ کو آخری دونوں صورتیں پسند نہیں ہیں۔

سلیمان بن عبدالملک اور شیخ ابو حازمؒ کی باہمی گفتگو

حکایت ہے کہ سلیمان بن عبدالملک اپنے دارالخلافہ شام سے حج کے لئے حرمین شریفین حاضر ہوا، مدینہ طیبہ میں حضرت ابو حازم رحمہ اللہ سے ملاقات ہوگئی، سلیمان بن عبدالملک نے ان سے پوچھا بتایئے قیامت کے دن بندوں کی اللہ تعالیٰ کے ساتھ ملاقات کی کیا کیفیت ہوگی؟

ابو حازمؒ نے فرمایا اگر بندہ نیک ہے دنیا میں نیکی کر کے گیا ہے اس کی اللہ تعالیٰ سے ملاقات اس طرح ہوگی جیسے کوئی آدمی بہت طویل عرصے تک اپنے وطن سے دور رہا ہو وہاں سے وہ بہت سارا مال و اسباب کما کر ساتھ لایا ہو اب آپ خود اندازہ لگالیں اس وقت وہ خود کتنا خوش ہوگا اور اس کے گھر والے

کتنے خوش ہوں گے اور کس طرح اس کی خاطر داری اور خدمت کریں گے۔

اور اگر بندہ بدکار رہا، دنیا میں بدکاری کرتا رہا اس کی ملاقات اس طرح ہوگی جیسے کوئی غلام اپنے آقا کی چوری کر کے بھاگ گیا ہو، آقا نے اس کی تلاش میں اس کے پیچھے پیادے دوڑا دیئے ہوں وہ پیادے اس کو پکڑ کر پاؤں میں بیڑیاں، ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور گردن میں طوق ڈال کر آقا کے سامنے لا کر پیش کریں، اندازہ کر لیجئے اس وقت اس غلام کی ذلت و حسرت کا کیا عالم ہوگا اور آقا کے سامنے کتنا ملعون ہوگا۔

یہ سن کر سلیمان بن عبدالملک پر رقت طاری ہوگئی اور بہت رویا پھر کہنے لگا کاش مجھے معلوم ہوتا کہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کے وقت ان دونوں صورتوں میں سے مجھے کون سی صورت پیش آئے گی۔

ابو حازمؒ نے فرمایا اس بات کا معلوم کرنا بہت آسان ہے قرآن میں اس کا صاف صاف ذکر موجود ہے۔ سلیمان نے کہا کس آیت میں؟

ابو حازمؒ نے یہ آیت تلاوت فرمائی "إن الأبرار لفی نعیم و ان الفجار لفی جحیم" اور فرمایا کہ اس آیت کی روشنی میں اپنے اعمال کا جائزہ لے لو کہ تم "ابرار" میں ہو یا "فجار" میں۔

سلیمان نے کہا اگر ہمارے اعمال کے مطابق انجام ہے تو اللہ کی رحمت کہاں گئی؟

ابو حازمؒ نے فرمایا اس کا پتہ بھی قرآن نے دے دیا ہے، سلیمان نے کہا کس آیت میں ہے؟

ابو حازمؒ نے فرمایا یہ آیت ہے "ان رحمة الله قریب من المحسنین"

یہ سن کر سلیمان پر خوف کا اتنا غلبہ ہوا کہ روتے روتے حالت متغیر ہوگئی اور یہ کہتا ہوا اُٹھ کر چل دیا کہ مجھے تمہاری باتیں سننے کی طاقت نہیں میرا پتا پھٹا جاتا ہے۔

الَّذِیْ خَلَقَکَ فَسَوّٰکَ فَعَدَلَکَ ○

جس نے تجھ کو بنایا پھر تجھ کو ٹھیک کیا پھر تجھ کو برابر کیا

اس سے پہلی آیت میں جب اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کو دیکھتے ہوئے فریب کھانے اور مغرور ہونے پر سرزنش کی کہ بڑے کرم پر ہی مغرور نہیں ہونا چاہئے، اب یہاں سے کئی ایسی نعمتیں بیان فرما رہے ہیں جو تقاضا کرتی ہیں کہ اللہ کے فضل و کرم کی وجہ سے غرور میں گرفتار نہیں ہونا چاہئے، چنانچہ فرمایا:

"الذی خلقک" وہ کریم کہ جس نے محض اپنے فضل و کرم سے تجھے پیدا کیا، نیست و عدم کی

حالت میں تجھ سے کسی درخواست کا تصور بھی ناممکن ہے اس نے بغیر تیری درخواست کے پیدا کیا، اور اس کو تیری پیدائش میں کسی نفع کی توقع بھی نہیں تھی۔

"فسواک" پھر تجھے ٹھیک بنایا، سب جوڑ اور اعضاء برابر کئے، دونوں ہاتھ ایک دوسرے کے برابر، دونوں پاؤں ایک دوسرے کے برابر، دونوں آنکھیں ایک دوسرے کے برابر، دونوں کان ایک دوسرے کے برابر، ان میں سے کوئی چھوٹا بڑا نہیں، پاؤں ہی مثلاً اگر چھوٹے بڑے ہوجاتے تو چلنے میں بھی دشواری ہوتی اور دیکھنے میں بھی بُرے معلوم ہوتے یہ اسی کا کرم ہے کہ ایک قطرۂ ناپاک سے تجھے کیسا خوبصورت اور سڈول بنادیا۔

"فعدلک" پھر تیرے مزاج کو معتدل بنایا، بدن کے اخلاط کے جوارکان ہیں، گرمی، سردی، خشکی اور تری ان سب کو برابر اور متوازن رکھا، تاکہ اعتدال سے ہٹی ہوئی حالتیں معلوم کرسکو ان کی پہچان کرسکو، اس سے یہ بھی سمجھ لو کہ جب ظاہری اعضاء کا اعتدال سے ہٹا ہوا ہونا تکلیف دہ ہوتا ہے تو باطنی بے اعتدالی کس قدر باعث تکلیف ہوسکتی تھی (مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اس تکلیف سے بچایا)

فِیْۤ اَیِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ ۝

جس صورت میں چاہا تجھ کو جوڑ دیا

تیرے پروردگار نے جس طرح چاہا تجھے بنادیا، اس وقت تم موجود نہیں تھے کہ مطالبہ کرتے کہ فلاں صورت اچھی ہے فلاں اچھی نہیں، مجھے اچھی صورت پر بنایا جائے بری صورت میں نہ بنایا جائے، اسی کا کرم ہے کہ انتہائی اچھی صورت پر تجھے بنادیا، اور یہ اعضاء اس نے اپنی اطاعت وفرمانبرداری کے لئے بنائے ہیں، چنانچہ ہاتھ دیئے تاکہ تکبیر میں اُٹھائے جائیں، ان میں قرآن کریم پکڑا جائے، جہاد کے لئے اسلحہ اُٹھایا جائے، اور اس کے علاوہ بہت سے اعمال نیکی کے ہاتھوں سے انجام پاتے ہیں۔

زبان عطا فرمائی، ذکر، تسبیح وتحمید، تلاوتِ قرآن اور نیکی کا حکم کرنے، برائی سے منع کرنے کے لئے، اور اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے حقائق بیان کرنے کے لئے۔

پاؤں دیئے، نماز میں کھڑے ہونے، جہاد کے لئے چلنے، طواف کرنے، مریض کی عیادت کرنے، اولیاء اللہ کی زیارت کرنے کے لئے اور دیگر بہت سے امور خیر کے لئے۔

اسی طرح ہر عضو اپنی بندگی و اطاعت کے لئے عطا فرمایا مگر تم نے ان نعمتوں کو اسکے برعکس استعمال کیا، اللہ کی نافرمانی اور گناہوں کا ذریعہ بنایا سو جس نے اپنے مالک کی ایسی نافرمانی کی ہو وہ اس کی صفتِ کریمی کا ہرگز سزاوار و مستحق نہیں ہے، ایسے کو زیب نہیں دیتا کہ وہ اللہ کے کرم پر فریب کھائے اور مغرور ہو بیٹھے۔

پیدائش کی نعمت بیان کرنے میں نکتہ

اس مقام پر نعمتوں کو بیان کرتے ہوئے خاص پیدائش کی نعمت بیان کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ نعمت ایسی ہے جس کے عطا ہونے میں نہ تو بندے کے سوال وخواہش کا دخل ہے، اور نہ اللہ تعالیٰ کو اس نعمت کے عطا کرنے میں کسی منفعت کی توقع یا ضرر کو دور کرنا مقصود تھا، یہ محض کرم ہی کرم ہے۔ بخلاف دوسری نعمتوں کے جو پیدائش کے بعد عطا ہوئیں ان میں انسان کی خواہش وسوال کا کچھ نہ کچھ دخل ہے خواہ انسان نے اپنی خواہش کا اظہار قولاً کیا ہو یا حالاً کیا ہو، لہٰذا یہ نعمتیں کرم پر دلالت نہیں کرتیں۔

اور ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ انسان کی پیدائش بہت ہی اچھے طریقے پر ہوئی، اعضاء ومزاج میں اعتدال وتناسب رکھا گیا ہے، یہ اس بات کی صریح دلیل ہے کہ ایسی مخلوق مہمل و بے کار پیدا نہیں کی گئی، بلکہ (جب یہ خود معتدل ومتناسب پیدا ہوئی تو) اعتقاد وعمل کی معتدل وسیدھی راہ کو پہچاننے، اور اعتماد و عمل کی غیر معتدل وٹیڑھی راہ سے بچنے کے لئے پیدا کی گئی ہے اس لئے کہ غیر معتدل کو معتدل ہی پہچان سکتا ہے (وبضدها تتبين الأشياء)

چنانچہ طب کی کتابوں میں یہ قاعدہ لکھا ہے کہ غیر معتدل اس کیفیت سے جو اس کی ہم جنس نہ ہو اور اعتدال سے خارج ہو، متاثر نہیں ہوتا اس کی بجائے اپنی ہم جنس کی تاثیر زیادہ قبول کرتا ہے اور تھوڑے کو زیادہ جانتا ہے۔

جب انسان نے اعتدال کی راہ پہچاننے میں کوتاہی کی، اور اللہ کی نافرمانی اختیار کی تو وہ غضب و ناراضگی کا زیادہ مستحق ہوا لہٰذا کرم کی وجہ سے فریب کھانا چہ معنی دارد؟

فِي أَيِّ صُورَةٍ الخ میں ایک اشکال اور اس کا جواب

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہاں نعمتوں کو شمار کرتے ہوئے اُن کے درمیان حرف عطف

لائے ہیں مگر فی ایّ صورۃ الخ میں حرف عطف ذکر نہیں کیا اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب:۔ یہ ہے کہ خلق، تسویہ، اور تعدیل یہ تینوں فعل ترتیب سے بیان ہوئے ہیں اور ان کے درمیان تعقیب کی گنجائش ہے جو کہ فاء کا مدلول ہے، اس لئے ان کے درمیان فاء عاطفہ ذکر فرمائی مگر ان کے بعد صورت کی ترکیب لازم ہے بلکہ تسویہ و تعدیل بعینہٖ تصویر (صورت گری) ہی ہے لہٰذا یہاں حرف عطف کی گنجائش نہیں ہے (کہ عطف مغائرت کو چاہتا ہے اور یہاں تعدیل، تسویہ اور ترکیب صورت کے درمیان کوئی مغائرت نہیں) جب یہ نعمت یعنی صورت، تسویہ و تعدیل سے مل کر پیدا ہوئی تو اس کو ان دونوں نعمتوں کے بیان کے طور پر بغیر عطف ذکر فرمایا۔

فی ایّ صورۃ الخ کی تفسیر میں مفسرین کے اقوال

پہلا قول:۔ اس آیت کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ بچہ کبھی باپ کی شکل و صورت پر ہوتا ہے، کبھی ماں کے مشابہ، کبھی چچا یا ماموں کے مشابہ اور کبھی ان میں سے کسی کے مشابہ نہیں ہوتا جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی سے پوچھا ''ماولدک؟'' تیری اولاد کیا ہے؟

اس نے عرض کیا ''یا رسول اللہ وما عسیٰ ان یولد فی إما غلام أو جارية'' یعنی ابھی تک تو کچھ نہیں مگر امید ہے لڑکا پیدا ہوگا یا لڑکی، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا ''ممن تشبه'' بچہ کس کے مشابہ ہوتا ہے، اس نے کہا ''تشبه أمه أو أباه'' بچہ ماں یا باپ کے مشابہ ہوتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ۔نے فرمایا:

لا تقل هكذا ان النطفة اذا استقرت فی الرحم أحضر الله کل نسب بينها و بين ادم، أما قرأت هذه الاية فِيْٓ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ"

یعنی یہ نہیں کہو بلکہ نطفہ جب رحم میں ٹھہر جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس نطفے اور آدم علیہ السلام کے درمیان جتنے نسب ہیں سب کو حاضر کرتا ہے، کیا تم نے یہ آیت نہیں پڑھی ''فِيْٓ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ''

دوسرا قول:۔ بعض نے کہا اس سے مراد خوبصورتی اور بدصورتی ہے، لوگوں کی صورتیں مختلف ہوتی ہیں بعض اچھی ہوتی ہیں اور بعض بُری ہوتی ہیں۔

تیسرا قول:۔ بعض نے کہا کہ اس سے انسانی صورتوں کا زیادہ ہونا مراد ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی قدرت کے عجائبات میں سے ایک یہ ہے کہ طرح طرح کی بے شمار صورتیں پیدا کیں اور حقیقت بھی یہی

ہے کہ اس قدر کروڑوں انسانوں کے چہرے حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر اس وقت تک علیحدہ پیدا کئے باوجود اس کے کہ جسم و چہرے کے جن اعضاء سے صورت بنتی ہے مثلاً کان، آنکھ، ناک وغیرہ وہ سارے انسانوں میں یکساں ہیں لیکن پھر بھی ہر شخص کی شکل وصورت دوسرے سے جُدا ہے یہاں سے اللہ تعالیٰ کے خزانوں کی لامحدود وسعت اور اسکے علم کی کثرت معلوم ہوتی ہے کہ کتنے بے انتہاء نقشے اسکے خزانے میں موجود ہیں۔

چوتھا قول:۔ بعض نے کہا صورت سے مراد مذکر و مؤنث ہونے کے اعتبار سے مختلف ہونا ہے کہ مذکر یا مؤنث میں سے جو چاہا بنا دیا، اس صورت میں آیت کا ربط پہلی آیتوں سے یہ ہوگا کہ مذکر کی تعدیل وتسویہ مؤنث کی تعدیل وتسویہ سے علیحدہ ہے لیکن یہ اختلاف وفرق صرف صنفی اعتبار سے ہے ورنہ نفسِ تعدیل وتسویہ میں مذکر و مؤنث دونوں شریک ہیں، اور اسی صنفی فرق کی وجہ سے اطباء کہتے ہیں عورت کا مزاج تر ہے اور مرد کا مزاج خشک ہے، اور جیسا کہ ذکر کر دیا کہ نفسِ تعدیل وتسویہ جو نوع انسانی کا مقتضا ہے وہ دونوں میں مشترک ہے۔

پانچواں قول:۔ بعض نے کہا کہ اس سے رنگوں کا اختلاف مراد ہے جیسا کہ پہلی اقلیم اور دوسری کے رہنے والے سیاہ رنگ کے ہوتے ہیں اس لئے کہ سورج ہمیشہ ان کے اوپر ہوتا ہے یا ذرا ہٹا ہوا، اور مسلسل سورج کی گرمی پڑتی رہے تو رنگ سیاہ ہو جاتا ہے جیسے دھوبیوں اور دھوپ کے اندر ننگے کام کرنے والے دیہاتیوں میں اس کا مشاہدہ ہے کہ وہ کالے ہو جاتے ہیں،

اور تیسری اقلیم کے رہنے والے اکثر گندم گوں ہوتے ہیں، اور چوتھی اقلیم کے رہنے والے گورے مائل سرخی ہوتے ہیں، پانچویں اقلیم کے رہنے والے سرخ رنگ ہوتے ہیں اور چھٹی، ساتویں اقلیم کے رہنے والے زرد رنگ ہوتے ہیں۔

چھٹا قول:۔ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ بعض کو ایسی صورت پر پیدا کیا کہ ان کو خاص اپنی بندگی کے لئے چن لیا جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں فرمایا:

"وَاصْطَنَعْتُکَ لِنَفْسِی" "اور تم کو اپنے لئے منتخب کر لیا" اور دوسرے انبیاء کے بارے میں بھی فرمایا "إِنَّهُ كَانَ مُخْلَصًا" وَإِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ"

یہ گروہ بادشاہ کے خاص مقربین کی طرح ہے جو خاص خاص خدمات پر مامور و مقرر رہتے ہیں، لیکن

ان کے مقابلے میں بعض کو ایسی صورت پر پیدا کیا کہ وہ اس کے غیر میں مشغول ہیں جیسے بعض تجارت و مال میں بعض کھیتی باڑی میں اور بعض دیگر دنیوی کاموں میں مشغول ہیں تاکہ دنیا کا نظام چلے۔

كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ ۝

ہرگز نہیں پر تم جھوٹ جانتے ہو انصاف کا ہونا

گذشتہ آیت میں سوال کے انداز میں جو سرزنش آئی ہے اس کے اندر اللہ تعالیٰ کی صفتِ کریمی کا ذکر ہے، اس بات کا گمان تھا کہ یہ سن کر کہیں کافر یہ نہ کہنے لگ جائیں کہ ہمارا غرور و اعتماد تو اللہ کے کرم پر تھا اس لئے دوسری تنبیہ پہلی سرزنش سے زیادہ سخت ارشاد فرمائی فرمایا "كَلَّا" ہرگز ایسا نہیں ہے کہ تم اس کے کرم پر اعتماد کرتے ہوئے گناہ کرتے ہو یہ اعتماد جب ہوتا کہ تم آخرت کی جزاء کا اعتقاد رکھتے ہوتے حالانکہ تمہارا یہ اعتقاد نہیں ہے۔

"بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ" بلکہ تم تو جزا کا انکار کرتے ہو، حالانکہ جزا کا وعدہ بھی اسی کا کرم ہی ہے تاکہ اچھی جزا کی امید پر تم فرمانبرداری اختیار کر کے دین و دنیا کے سارے کاموں کو بنالو، اور عذاب کے خوف سے نافرمانی و گناہ کی زندگی سے باز آؤ اور دونوں جہاں کے کام بگڑنے سے بچالو۔

وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۝

اور تم پر نگہبان مقرر ہیں

یعنی جزاء کا انکار تم سے کس طرح بن پڑے گا حالانکہ تم پر نگران مقرر ہیں تاکہ تمہارے اچھے برے کاموں کی خبر گیری کریں، نہ تمہاری کوئی نیکی ضائع ہو نہ برائی رائیگاں جائے۔

كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ۝

عزت والے عمل لکھنے والے

"كِرَامًا" یعنی وہ نگران و چوکیدار بھی حق تعالیٰ کی صفت کے موافق تم سے کرم کا معاملہ کرتے ہیں۔

انسانوں کے ساتھ کراماً کاتبین کے کرم و مہربانی کی صورتیں

کراماً کاتبین کی ایک مہربانی تو یہ ہے کہ وہ تمہاری آنکھوں سے غائب رہتے ہیں تمہارے سامنے

ظاہر نہیں ہوتے ورنہ تم اپنی عورتوں کے پاس جانے، بیت الخلاء جانے سے شرم محسوس کرو اور لذت کی چیزوں کو چھوڑ دینے پر مجبور ہو جاؤ۔

اور ان کے کرم و مہربانی میں سے یہ بھی ہے کہ تمہیں رسوا نہیں کرتے تمہارے راز دوسروں کے سامنے بیان نہیں کرتے۔

یہ بھی ان کا کرم ہے کہ جب تم کوئی ایک نیکی کرتے ہو تو وہ اس کو دس گنا بڑھا کر لکھتے ہیں جیسے ایک روپیہ اگر تم اللہ کے راستے میں خرچ کرتے ہو تو اس کو دس روپے لکھتے، اور اگر کبھی تم نے کسی نیکی کا ارادہ کیا مگر تم کر نہ سکے تو فرشتے اس ارادہ کو بھی نیکی ہی لکھتے ہیں، اور اگر کبھی تم نے گناہ کا ارادہ کیا پھر چھوڑ دیا نہ کیا، تو وہ اس چھوڑنے کو بھی نیکی لکھتے ہیں، اور اگر تم سے کبھی گناہ سرزد ہو جائے، تو چھ ساعت تک وہ اس کو نہیں لکھتے اس انتظار میں رہتے ہیں کہ شاید تم توبہ کرلو، استغفار کرلو، یا اس کے بعد کوئی ایسی نیکی کرلو جو اس گناہ کو مٹا دے، اور جب اتنے عرصے میں اس گناہ کا کوئی تدارک نہیں کرتے تو اس وقت وہ ایک گناہ لکھ لیتے ہیں، پھر جب تم توبہ کر لیتے ہو یا اس گناہ کو مٹانے والی کوئی نیکی، تو اس لکھے ہوئے کو مٹا دیتے ہیں، اور وہ نگران تمہارے کاموں کو یاد رکھنے میں بہت احتیاط کرتے ہیں، فرشتہ ہونے کی وجہ سے ان کے اندر بھول جانے کا مادہ نہیں، مگر اس کے باوجود ''کاتبین'' وہ لکھ رکھتے ہیں، اپنی یاد پر اعتماد نہیں کرتے۔

دن، رات میں انسان کے نگران فرشتے

صحیح روایات کے مطابق ہر آدمی کے اعمال لکھنے والے چار فرشتے ہیں، دو دن کے اور دو رات کے ہوتے ہیں، ہر دن و رات کے لکھے ہوئے رجسٹر الگ چھوڑتے ہیں، بعض روایات میں آتا ہے کہ ان دونوں کے بیٹھنے کی جگہ انسان کے دونوں کندھے ہیں، اور بعض نے کہا کہ انکے بیٹھنے کی جگہ ہر آدمی کے اوپر کے دو بڑے دانت ہیں، انسان کی زبان ان کا قلم اور تھوک ان کی سیاہی ہے۔

اور جب دن رات کا یہ دفتر حق تعالیٰ کے حضور لے جاتے ہیں، تو باوجود اس کے کہ اللہ تعالیٰ بندے کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے، ان کو حکم ہوتا ہے کہ اس لکھے ہوئے کا لوحِ محفوظ کے ساتھ مقابلہ کرلو، اس لئے کہ بندہ جو کچھ کرے گا وہ سب کچھ بغیر ادنیٰ کمی زیادتی کے لوحِ محفوظ میں لکھا ہوا ہے، جب وہ مقابلہ کر لیتے ہیں تو حکم ہوتا ہے نیکی اور گناہ کے سوا جو کچھ ہے سب مٹا دو، صرف نیکی اور گناہ

رہنے دو اس پر اس کو ثواب و عذاب ہوگا۔

يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ۝

جانتے ہیں جو کچھ تم کرتے ہو

یعنی ان نگرانوں سے تمہارے حالات پوشیدہ نہیں ہیں، یہ بھی مت گمان کرنا کہ جس طرح دنیا کے اخبار نویسوں، اور خفیہ نویسوں سے کسی حیلہ و مکر سے اپنا کام چھپا رکھتے ہو ان سے بھی چھپا رکھو گے، اس لئے کہ وہ جانتے ہیں جو تم کرتے ہو اگرچہ ہزار پردے کے اندر تم کرو۔

فرشتوں کا آدمی کے اعمال و تروک اور نیات پر مطلع ہونا

اب یہ سمجھ لینا چاہئے کہ نگران فرشتوں کا انسان کے افعال پر مطلع ہونا اس آیت (**یعلمون ما تفعلون**) سے ثابت ہوا، اور اقوال پر اطلاع سورۂ قاف کی اس آیت سے ثابت ہوتی ہے "**ما یلفظ من قول الا لدیہ رقیب عتید**" اور ان کا تروک پر مطلع ہونا یعنی کسی کام کے چھوڑ دینے پر جیسے روزہ، اعتکاف، یا مثلاً احرام میں جو چیزیں ممنوع ہیں ان کا چھوڑنا یا اس طرح کی جو بھی چیزیں ہیں ان پر مطلع ہونا دلیل عقلی سے ثابت ہے اس لئے کہ حاجت و ضرورت کے وقت بغیر کسی عذر و مانع کے کوئی کام نہیں کیا ہے تو صاف ظاہر ہے کہ یہ کام چھوڑ دیا۔

لیکن فرشتوں کا انسان کی نیتوں کا حال معلوم کرنا، اور دل میں چھپی بات پر مطلع ہونا اس بارے میں علماء کا اختلاف ہے، اکثر علماء نے کہا ہے کہ فرشتوں کو دل کی بات کی خبر نہیں ہوتی، مگر صحیح حدیث میں وارد ہے کہ لکھنے والے فرشتے نیکی کے ارادے کو اور برائی چھوڑ دینے کے ارادے کو نیکی لکھتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو دل کی باتوں پر اطلاع ہے، جو علماء اس کا انکار کرتے ہیں وہ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ یہ اطلاع فرشتوں کو خود سے نہیں ہو جاتی بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انکو الہام ہوتا ہے کہ فلاں بندے نے دل میں نیکی کا ارادہ کیا ہے یا گناہ کا ارادہ کر کے پھر چھوڑنے کا ارادہ کیا ہے اس کی ایک نیکی لکھ لو، **وھو الأظھر**

جب بات یوم آخرت کی جزاء تک آگئی تو اب ضروری ہوا کہ نیک اور فرمانبرداروں کے ثواب اور بدکاروں، نافرمانوں کے عذاب و سزا کا بھی ذکر کر دیا جائے چنانچہ فرمایا:

اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ ۝

وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ ۝

بیشک نیک لوگ بہشت میں ہیں اور بیشک گنہگار دوزخ میں ہیں

یعنی نیک لوگ نعمتوں میں ہوں گے اور بُرے دوزخ میں ہوں گے۔

یَصْلَوْنَهَا یَوْمَ الدِّیْنِ ۝ وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِیْنَ ۝

ڈالے جائیں گے اُس میں انصاف کے دن اور نہ ہوں گے اُس سے جُدا ہونے والے

فرمایا وہ اس سے غائب ہونے والے نہ ہوں گے حاصل اس کا یہ ہے کہ وہاں ایسا نہیں ہوگا جس طرح دنیا میں ہوتا ہے کہ کوئی مصیبت آجائے تو اس سے بھاگ کر یا چھپ کر جان بچا سکتے ہیں، وہاں ایسا کوئی حیلہ و مکر نہ چل سکے گا، اس بلا سے ان کی گلوخلاصی نہیں ہو سکے گی، اس لئے کہ اس آگ کی لپک دور دور سے بدکاروں کو کھینچ کر اپنے اندر لے آئے گی اور دوزخ کے دروازوں پر کھڑے فرشتے ان کو زنجیروں، طوقوں میں باندھ کر دوزخ میں ڈال دیں گے، وہاں سے نہ بھاگنے کی گنجائش ہوگی نہ مقابلے کی طاقت۔

''غائبین'' کی تفسیر میں دوسرا قول

بعض مفسرین نے غائب نہ ہونے سے مراد ''عدم الاخراج'' لیا ہے یعنی ''فجار'' اس سے غائب نہ ہوں گے سے مراد یہ ہے کہ وہاں سے کبھی نکالے نہیں جائیں گے، اس قول کے مطابق ''فجار'' سے مراد خاص طور پر صرف کفار ہوں گے اس لئے کہ اہلِ ایمان گنہگار تو ضرور جہنم سے نکالے جائیں گے۔

فنون بلاغت کے نکات

علمِ بدیع کے ماہرین نے کہا ہے کہ اس کلام میں صفتِ جمع اور صفتِ تقسیم ہے (۱)

یعنی پہلے ''اِنَّ عَلَیْكُمْ لَحٰفِظِیْنَ'' فرمایا اس میں انسان کے تمام افراد کو خواہ وہ نیک ہوں یا

(۱) علم البدیع کی اصطلاح میں صفتِ جمع کہتے ہیں کلام میں امورِ متعددہ کو ایک حکم میں جمع کر دینا، اور صفتِ تقسیم کی بہت سی قسمیں ہیں ان میں سے ایک قسم یہ ہے کہ پہلے امورِ متعددہ کو ذکر کریں پھر ان میں سے ہر ایک کے کوئی مناسب بات متعین کر کے اس کی طرف منسوب کر دی جائے۔ (کذافی دروس البلاغۃ ص ۹۶/۹۷) سفیر احمد

برے ایک حکم میں جمع کر دیا پھر اس کے بعد جزا بیان کرتے ہوئے ہر ایک کی الگ الگ جزا بیان فرمادی، یعنی ''اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ ٥ وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ ٥

اور اس کلام میں صفتِ ترصیع بھی ہے، علم بدیع کی اصطلاح میں جس کلام میں یہ صفت پائی جاتی ہے اس کو ''مرصّع'' کہتے ہیں۔ کلام مرصّع وہ ہوتی ہے جس کے دو یا زیادہ فقروں کے الفاظ وزن اور سجع میں برابر ہوں (سجع سے مراد یہاں قافیہ ہے) یعنی وزن بھی ایک ہو اور آخری حرف بھی، اور اس کلام میں یہ دونوں باتیں موجود ہیں، ابرار، فجار کا ہم وزن وہم قافیہ ہے اور ''نعیم، جحیم، کے ہم وزن وہم قافیہ ہے، اسی صفتِ ترصیع کو کسی شاعر نے اس شعر میں جمع کیا ہے۔

اے منور بتو نجومِ جلال

وی مقرر بتو رسوم کمال

اس شعر میں یہ الفاظ ہم وزن وہم قافیہ ہیں، منور، مقرر، نجوم، رسوم، جلال، کمال۔

اور اس کلام میں صفت تضاد بھی پائی جاتی ہے اس کو طباق اور تطبیق بھی کہتے ہیں، اس صفت کا مطلب یہ ہے کہ کئی متضاد چیزوں کو ایک جگہ جمع کر دینا جیسا کہ اس شعر میں ہے ع

ہشیار درون رفت برون آمدمست

اس آیت میں بھی نعیم، جحیم کی ضد ہے اور ابرار، فجار کی ضد ہے۔

وَمَآ اَدْرٰکَ مَا یَوْمُ الدِّیْنِ ٥

اور تجھ کو کیا خبر ہے کیسا دن ہے انصاف کا

گذشتہ آیات میں کفار کی جزا بیان کرتے ہوئے درمیان میں انصاف کے دن کا ذکر آ گیا تھا (بل تکذبو بالدین) وہاں اس دن کی سختیاں، شدائد اور ہولنا کیاں خاطر خواہ بیان نہیں ہوئیں تھیں اسلئے مناسب ہوا کہ اب اس دن کی کچھ سختیاں بیان کی جائیں چنانچہ اجمالی طور پر استفہام تہویلی کے ساتھ بیان فرماتے ہیں کہ ''تم کیا جانو انصاف کا دن کیا ہے'' اس کلام کا حاصل یہ ہے کہ اس دن کی مصیبتیں، سختیاں کوئی انسان اپنی عقل کے ذریعہ معلوم نہیں کر سکتا اس لئے کہ دنیا میں کیسی ہی مصیبتیں، پریشانیاں اور تکلیفیں کسی پر گذری ہوں یا کسی سے سنی ہوں ان سارے مصائب کی اس دن کی سختیوں کے سامنے کوئی حقیقت نہیں ہے، لہٰذا عقل کے ذریعہ قیاس نہیں کیا جا سکتا کہ اس دن کے مصائب کا کیا عالم ہوگا۔

ثُمَّ مَآ اَدۡرٰكَ مَا يَوۡمُ الدِّيۡنِ ۝

پھر بھی تجھ کو کیا خبر ہے کیسا دن ہے انصاف کا

یعنی ہم مہلت کے بعد پھر کہتے ہیں ''تم کیا جانو انصاف کا دن کیا ہے''

ثمّ کا فلسفہ

اس مقام پر ''ثم'' کا حاصل یہ ہے کہ بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن کو سنتے ہی آدمی اس کی حقیقت سمجھ نہیں پاتا البتہ کچھ دیر غور وفکر کرنے کے بعد بات سمجھ میں آجاتی ہے، لیکن جو چیزیں ایسی ہوں کہ وہم وخیال میں اس کی گنجائش ہی نہ ہو تو ایسی چیزوں پر مدتوں غور وفکر کے لئے سر کھپانا یا سنتے ہی اس کی حقیقت سے آگاہ ہونے سے مایوس ہو جانا دونوں برابر ہے، اسی لئے فرمایا کہ مہلت وفرصت کی مدتِ دراز کے بعد بھی حقیقتِ حال سے واقف نہ ہو سکو گے، مگر ہم خود اس دن کی شدت و ہولنا کی تھوڑی سی بیان کر دیتے ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں:

يَوۡمَ لَا تَمۡلِكُ نَفۡسٌ لِّنَفۡسٍ شَيۡـًٔا ۝

جس دن کہ بھلا نہ کر سکے کوئی جی کسی جی کا کچھ بھی

اب یہاں سے اس دن کی شدت وسختی سمجھنے کے لئے پہلے یوں غور کریں کہ دنیا میں اگر کسی پر کوئی مصیبت یا پریشانی آجائے تو وہ کیا کرتا ہے، عام دستور یہ ہے کہ آدمی اس پریشانی سے خلاصی حاصل کرنے کے لئے پہلے عوام الناس کی طرف رجوع کرتا ہے، لیکن جب وہاں سے کوئی حل نہیں نکلتا تو وہ خواص کی طرف رجوع کرتا ہے، مثلاً مصیبت کا تعلق اگر بیماری سے ہے تو وہ ماہر طبیبوں کے پاس جاتا ہے اگر مصیبت کا تعلق ظلم وجبر کے ساتھ ہے تو عادل حکام کی طرف رجوع کرتا ہے، اگر خواص سے مقصد برآری میں دشواری ہو رہی ہو وہ اس کے حال کی طرف توجہ نہ دے رہے ہوں، تو پھر وہ ان خواص کے دوست احباب سے سفارش کرواتا ہے تاکہ اس کی مشکل دور ہو سکے، لیکن اُس دن سارے رشتے، سارے تعلقات نیست ونابود ہو جائیں گے، سوائے نفسی نفسی کے کسی کو کسی کے حال پر کوئی شفقت و ہمدردی نہ ہوگی، ماں باپ کو اپنی اولاد پر رحم ہوگا نہ اولاد کو والدین کا کچھ غم، سب اپنے حال میں گرفتار ہوں گے، وہاں کے مقدمات میں کسی ادنیٰ یا اعلیٰ کو کوئی دخل نہ ہوگا، خواص بھی عوام کی طرح حیران و

پریشان ہوں گے، بڑے بڑے سردار عام لوگوں کی طرح سرگشتہ و بدحواس ہوں گے، اس دن مالک الملک کی اجازت کے بغیر خود سے کوئی سفارش کی جراءت نہ کرسکے گا، عاجزی و چاپلوسی، یا صبر و استقلال سب بے کار، اس دن جس پر ارحم الراحمین رحم فرمائے وہی نجات پائے گا، اور جس پر اس کا غضب ہوگیا اس کے لئے بربادی ورسوائی ہے۔ العیاذ باللہ

آیت میں تین عموم

اس آیت میں تین عموم ہیں:

(۱) نفسِ مالک (لا تملک نفس) یعنی کوئی نفس مالک نہ ہوگا)

(۲) نفس مملوک (لنفس) (کوئی نفس مملوک نہ ہوگا کسی بھی درجے میں یعنی حاجت براری کی حد تک بھی کوئی کسی کا ماتحت نہ ہوگا)

(۳) شی مملوک (شیا) ان تینوں عموم سے انتہائی درجے کی مایوسی ثابت ہوئی کہ اس دن کوئی کسی کی کچھ بھی چارہ جوئی نہ کرسکے گا۔

وَالۡاَمۡرُ یَوۡمَئِذٍ لِّلّٰهِ ؀

اور حکم اُس دن اللہ ہی کا ہے

جس طرح بادشاہ کا حکم رعایا پر، والدین کا اولاد پر، آقا کا نوکر پر، خاوند کا بیوی پر، چلتا ہے اس دن یہ سارے حکم ختم ہوجائیں گے سوائے مالک مطلق کے کسی میں دم مارنے کی ہمت نہ ہوگی، جس کو مالک نے ہر طرح سے پسند کرلیا اس کی نجات ہے، جس کو مالک نے ہر طرح سے ناپسند کرلیا وہ برباد ہوا، اور جس میں کچھ پسندیدہ باتیں تھیں اور کچھ مالک کی ناپسندیدہ باتیں تو ایسوں کے بارے میں انبیاء، اولیاء، علماء، شہداء، حفاظ اور فرشتوں کو حکم ہوگا کہ تم سفارش کرو تاکہ تمہاری بھی عزت افزائی ہوجائے، ایسی سفارش جو حاکم کے حکم پر موقوف ہو اس میں کسی کا دخل ہوتا ہے نہ اس پر بھروسہ کرنا چاہئے، اس مضمون سے معلوم ہوگیا کہ اس آیت میں شفاعت کی نفی نہیں جیسے معتزلہ نے کہا، بلکہ شفاعت کو حاکم کے حکم پر موقوف رکھا ہے، یہی اہل سنت والجماعت کا صحیح مذہب اور عقیدہ ہے۔

واللہ اعلم بالصواب الحمدللہ

مقدمہ سورۂ مطفّفین

اس سورت میں چھتیس (۳۶) آیات اور چار سو چھتیس (۴۳۶) حروف ہیں، اس میں اختلاف ہے کہ یہ سورت مکی ہے یا مدنی، اکثر معتبر تفاسیر میں لکھا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ طیبہ تشریف لائے تو اس وقت وہاں کے لوگ ناپ تول میں کمی زیادتی کرتے تھے تب یہ سورت نازل ہوئی، چنانچہ وہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض سے قرآن کی تعلیم کے مطابق ایسے سنورے کہ اُس وقت سے لے کر آج تک پوری دنیا میں ان کے برابر ناپ تول درست رکھنے والا کوئی نہیں ہے۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ سورت مکی ہے وہ اس واقعے کی یہ توجیہ کرتے ہیں کہ یہ سورت مکہ میں نازل ہو چکی تھی جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ تشریف لائے تو وہاں کے لوگوں کے اندر ناپ تول میں کوتاہی دیکھی تو آپ نے یہ سورت تلاوت فرمائی اور اس کی ان کو تعلیم دی، اس سے لوگ یہ سمجھے کہ شاید سورت یہاں نازل ہوئی ہے۔

عطا مکی رحمہ اللہ کا قول یہ ہے کہ یہ سورت ہجرت کے سفر میں مکہ اور مدینہ کے درمیان نازل ہوئی تھی۔

سورۂ انفطار کے ساتھ ربط

سورۂ انفطار کے ساتھ اس کا ربط یہ ہے کہ سورۂ انفطار میں انسانوں کے نامۂ اعمال کے ابتدائی مرحلہ کا ذکر ہے کہ وہ دنیا میں لکھے جاتے ہیں اور اِس سورت میں ان اعمال ناموں کے درمیانی مرحلہ کا ذکر ہے کہ موت کے بعد قیامت سے پہلے یہ اعمالنامے علّیین، یا سجین کے نگران فرشتوں کے حوالے کئے جاتے ہیں، اور سورۂ انشقاق جو اس کے بعد آرہی ہے اس میں ان اعمالناموں کے آخری مرحلے کا ذکر ہے کہ حشر میں ہر شخص کو اس کا اعمالنامہ ہاتھ میں دیا جائے گا۔

وجہ تسمیہ

اس سورت کا نام مطفّفین اس لئے رکھا ہے کہ اس کی ابتداء میں مطففین (ناپ تول میں خیانت کرنے والے) کے انجامِ بد کا ذکر ہے جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ جو شخص مخلوق کا تھوڑا سا حق تلف

کرے گا اس کا انجام ایسا بُرا ہوگا تو پھر جو اپنے پروردگار کا حقِ عظیم یعنی اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لانا یہ ضائع کرے اس کا انجام کیا ہوگا؟

دونوں سورتوں کے درمیان نظم ونسق کی مناسبت

دنوں سورتوں کے درمیان نظم کی مناسبت بھی ظاہر ہے۔

سورۂ انفطار میں ہے "کلا بل تکذبون بالدین و إن علیکم لحافظین" اور اس سورت میں ہے "ویل یومئذ للمکذبین ○ الذین یکذبون بیوم الدین ○ وما ارسلوا علیھم حافظین" سورۂ انفطار میں ہے "ان الأبرار لفی نعیم" اور اس سورت میں بھی بعینہٖ یہ ہے، اور سورۂ انفطار میں ہے "ان الفجار لفی جحیم یصلونھا یوم الدین" اس سورت میں ہے "ثم انھم لصالوا الجحیم"

سورۂ انفطار کا اختتام اس کلمے پر ہے "والامر یومئذٍ اللّٰہ" اور اس سورت کے اوائل میں یہ ہے "یوم یقوم الناس لرب العالمین"

تمت المقدمة

تفسیر سورۂ مطففین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَيۡلٌ لِّلۡمُطَفِّفِيۡنَ

خرابی ہے گھٹانے والوں کی

یعنی ہائے افسوس ان لوگوں کے اعمال پر جو ناپ تول میں لوگوں کے حقوق ضائع کرتے ہیں۔

تطفیف کا وسیع مفہوم

تطفیف کا لفظ اگرچہ لغت میں ناپ تول میں خیانت کرنے کے معنی میں آتا ہے لیکن شیخ ابوالقاسم قشیری قدس سرہ اور دوسرے بزرگوں نے فرمایا کہ مندرجہ ذیل باتیں بھی تطفیف میں داخل ہیں:

(۱) لوگوں کے عیب ظاہر کرنا اور وہی عیب اپنے اندر ہو تو اس کو چھپانا۔

(۲) دوسروں سے انصاف کی خواہش رکھنا اور خود ان کے ساتھ انصاف کا معاملہ نہ کرنا۔

(۳) اپنے عیوب سے بے خبر رہنا اور دوسروں کے عیوب پر نظر رکھنا۔

(۴) لوگوں سے اپنی تعظیم کی خواہش رکھنا اور خود واجب التعظیم لوگوں کی تعظیم نہ کرنا۔

(۵) جو اپنے لئے پسند کرنا وہ دوسرے کے لئے پسند نہ کرنا۔

(۶) نوکروں، ملازموں سے پورا پورا کام لینا مگر ان کی تنخواہ دینے میں کوتاہی کرنا۔

(۷) اللہ تعالیٰ سے اپنا مقدر رزق پورا پورا چاہنا اور اس کی اطاعت و فرمانبرداری میں کوتاہی کرنا، یہ سب تطفیف میں داخل ہیں۔

چنانچہ حدیث شریف میں آتا ہے:

"الصلٰوۃ مکیال فمن وفی، وفی له و من طفف فقد علمتم ما قال اللّٰہ تعالی فیه"

''کہ نماز بھی اللہ کے حق کی ادائیگی کا ایک پیمانہ ہے جس نے پورا پورا اداء کیا اسکو پورا پورا اجر عطا ہوگا اور جس نے ڈنڈی ماری تو تمہیں معلوم ہے کہ تطفیف کرنے والوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے کیا فرمایا ہے"

حدیث قدسی ہے: **"أوف یا ابن ادم کما تحب أن یوفی لک و أعدل کما تحب أن یعدل لک"** اے ابن آدم پورا پورا حق ادا کر جیسا اپنے لئے چاہتا ہے کہ تیرا حق پورا پورا ادا کیا جائے، اور انصاف کر جیسا اپنے لئے چاہتا ہے کہ تیرے ساتھ انصاف کیا جائے۔

ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس سورت کی تلاوت فرمائی پھر مدینے کے لوگوں سے فرمایا "خمس بخمس" (پانچ کے بدلے پانچ) پانچ گناہوں کے بدلے پانچ عذاب مسلط ہوتے ہیں۔

(۱) جو قوم عہد شکنی کرتی ہے اس پر دشمن مسلط کر دیئے جاتے ہیں۔

(۲) جو قوم شریعت کے خلاف فیصلے کرے اور رشوت لے کر شریعت کا حکم تبدیل کر دے وہ فقر و افلاس میں گرفتار کر دیئے جاتے ہیں۔

(۳) جن لوگوں میں زنا اور لواطت عام ہو جائے ان میں موت کی وبا پھیل جاتی ہے۔

(۴) جو لوگ ناپ تول میں خیانت کرنے لگ جائیں ان کی زراعت تباہ ہو جاتی ہے اور ان پر قحط مسلط ہو جاتا ہے۔

(۵) جو قوم زکوٰۃ دینا چھوڑ دے ان سے بارش روک لی جاتی ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ ناپ تول کا معاملہ بہت اہم ہے، حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم پر جو عذاب آیا تھا وہ اسی گناہ کی شامت میں آیا تھا۔

تطفیف کا گناہ صغیرہ ہے یا کبیرہ؟

اس کے کبیرہ ہونے میں علماء کا اختلاف ہے، ایک گروہ مبالغے کے طور پر یہاں تک کہتا ہے کہ اس برے کام کا ارادہ بھی کبیرہ گناہ ہے، اور بعض علماء اس کے اندر قلیل وکثیر کا فرق کرتے ہیں، یعنی اگر ناپ تول میں اتنی کمی کی کہ حد سرقہ کے نصاب کے برابر ہے، جو ہمارے ملک (ہندوستان) میں تین روپے رائج وقت ہے، تو کبیرہ ہے، اگر اس سے کم ہے تو صغیرہ ہے۔(۱)

تطفیف کے کبیرہ ہونے میں ایک شبہہ کا ازالہ

بعض ظاہر بین لوگوں کو شبہہ ہوتا ہے کہ جتنی مقدار میں تطفیف ہوتی ہے اس قدر اگر کوئی کسی کا حق غصب کرے تو بالاجماع صغیرہ گناہ ہے پھر تطفیف کو کبیرہ میں کیوں شمار کیا جاتا ہے اور اس پر اتنی سخت وعید کیوں ہے؟

جواب اس کا یہ ہے کہ غصب ایک گناہ تو ہے مگر اس کے ضمن میں شریعت کا قلب موضوع لازم نہیں آتا (یعنی شریعت نے جو چیز جس مقصد کے لئے وضع کی ہے اس کو اس مقصد کے بالکل برعکس اور اُلٹ استعمال کرنا، اس کا ارتکاب غصب میں نہیں ہوتا اور تطفیف میں ہوتا ہے) تطفیف تو عدل کی صورت میں ظلم ہے۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ ناپ تول کے آلات کو اللہ تعالیٰ نے عدل وانصاف قائم کرنے کے لئے مقرر فرمایا ہے تو انسانوں کے معاملات کا مدار انہی دو چیزوں (ناپ تول) پر رکھا ہے، اگر انہی دونوں کو ظلم کا ذریعہ بنالیا جائے تو یہ ایسے ہی ہے جیسے عبادت کو گناہ کا ذریعہ بنالیا جائے، نیز تطفیف ایک ایسی خیانت اور فریب ہے جس سے انسان کے نفس کی خیانت کا پتہ چلتا ہے، بخلاف غصب کے۔ دوسرے یہ مزاج کا نہایت ہی گھٹیا پن، خساست اور ذلت ہے کہ پیسہ بھر جَو کی خاطر آدمی اپنا ایمان بیچ ڈالے، اور اللہ کے عدل کو ظلم کی صورت میں ظاہر کرے، ایسی ہی سنگین وجوہات کی بنا پر اس گناہ کی سنگینی بڑھ گئی جو

(۱) یہ حضرت مصنف رحمہ اللہ کے زمانے کے تین روپے کا حکم ہے، آج کے رائج روپے کا حکم نہیں ہے۔۱۲ اسفیر احمد

دوسرے صغیرہ گناہوں کے اندر نہیں ہے۔

اگرچہ بعض بزرگوں سے منقول ہے کہ اپنے وقت کے بادشاہ کو نصیحت کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا تمہیں کچھ معلوم ہے مطفف کے بارے میں کیا وعیدیں آئی ہیں؟ تم جو قوم کا مال بغیر تول وحساب کے کھاتے ہو سوچ لو تمہارا کیا حشر ہوگا، لیکن ان کی مراد یہ ہے کہ بادشاہ کا ظلم اور تطفیف اس اعتبار سے دونوں ایک جیسے ہیں کہ دونوں میں شریعت کا قلبِ موضوع ہے۔جس طرح ناپ تول کے آلات شریعت نے عدل کرنے کے لئے مقرر کئے لیکن مطفف ناپ تول میں کمی کر کے اس مقصد کے بالکل الٹ میں ان کو استعمال کرتا ہے اسی طرح قدرت وسلطنت کا مقصد شریعت کی نظر میں عدل قائم کرنا اور ظلم کو مٹانا ہے اب بجائے اس کے بادشاہ اگر اپنی سلطنت وقدرت کو عدل کے مٹانے اور ظلم کو قائم کرنے میں استعمال کرے تو قلب موضوع لازم آیا یعنی شریعت کے مقصد کے بالکل برعکس اس نے سلطنت کو استعمال کیا، تو قلبِ موضوع میں یہ دونوں برابر ہوگئے۔

بہرحال اس گناہ میں مخلوق کی حق تلفی کے علاوہ دھوکہ دہی، فریب، حکمتِ الٰہی میں رخنہ اندازی کرنا اور ظلم کو عدل کی صورت میں ظاہر کرنا یہ ایسا ہے جیسے درمیان میں قرآن رکھ کر دھوکہ بازی کی جائے ایسی ہی خباثتیں جمع ہو جانے کی وجہ سے یہ کبیرہ ہوا ہے۔

(جب یہ معلوم ہوگیا کہ جو چیز جس مقصد کے لئے شرعاً مقرر ہے اس کے عکس میں اس کو استعمال کرنا تطفیف ہے تو) اسی میں سے یہ بھی ہے کہ نجاست کو مسجد میں ڈالنا حرام ہے، کسی دوسری جگہ پھینکنا حرام نہیں ہے، لہٰذا دین کے کام کو دنیا کی غرض کے لئے کرنا اور صلحاء کی شکل بنا کر شیطانی کردار ادا کرنا، کھل کر اور واضح ہو کر دنیا کے کام کرنے سے اور فسق وفجور کرنے سے زیادہ بدتر ہے۔

ناپ تول میں کمی بعض اوقات لاپروائی کی وجہ سے بھی ہو جاتی، بعض لوگوں کے مزاج میں ہی لااُبالی پن ہوتا ہے وہ اپنا حق لینے میں بھی زیادہ کنج وکاوش نہیں کرتے اگر اپنے حق کے لینے میں یہ غفلت ہو تو مضائقہ نہیں لیکن اس غفلت ولاپرواہی کے نتیجے میں دوسرے کا حق ضائع ہو تو یہ بھی ناجائز ہے، تاہم یہ ایسا شدید گناہ نہیں کہ اس پر ''ویل'' کے لفظ کے ساتھ وعید سنائی جائے، سو تطفیف کی اس قسم سے احتراز کرنے کے لئے مطففین کی ایک اور صفت آگے بیان کی ہے جس سے یہ معلوم ہوگیا کہ ان کی یہ تطفیف کسی غفلت یا مزاج کے لااُبالی پن کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ یہ لوگ جان بوجھ کر کمال ہشیاری وچالاکی

سے اور انتہائی حرص ولالچ کی وجہ سے تطفیف (ناپ تول میں کمی) کرتے تھے، وہ صفت یہ ہے

الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۝

وہ لوگ کہ جب ماپ کرلیں لوگوں سے تو پورا بھرلیں

یعنی لوگوں پر ان کا جو حق ہے اس کو پورا بھر لیتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے حق سے ایک دانہ بھی کم نہ ہو، بلکہ پورا لینے کے بہانے وہ تھوڑا سا زیادہ لے لیتے ہیں اور صفائی یہ پیش کرتے ہیں کہ ہمیں اپنا حق پورا وصول ہونے میں اس وقت تک یقین نہیں آتا جب تک تھوڑا سا زیادہ نہ لے لیں۔

ماپنے کا ذکر ہے تول کا نہیں اس کی کیا وجہ ہے؟

اور جب ناپ میں وہ حیلہ کرتے ہیں تو، تول میں بدرجۂ اولیٰ پورا کرنے کے بہانے زیادہ لیتے ہیں، اس لئے کہ ناپ میں عام طور پر کمی بیشی میں چشم پوشی کرنے کا رواج ہے جبکہ تول میں ایسا نہیں وہاں تنگی کا رویہ ہوتا ہے (لہٰذا وزن کو ذکر کرنے کی ضرورت نہ رہی)

بعض اشیاء میں ناپ اور بعض میں تول کے رواج کی حکمت

اور یہ بات کہ ماپنے میں کشادہ دلی کا معاملہ ہوتا ہے اور تول میں تنگی اس کا راز یہ ہے کہ ناپ کا تعلق اشیاء کی لمبائی چوڑائی کے ساتھ ہے اور تول کا تعلق اشیاء کے وزن و بوجھ سے ہے سو جن چیزوں کے ساتھ انسان کا تعلق لباس وسکونت کے طور پر ہے جیسے کپڑا، زمین ان کے اندر ناپ و پیمائش رائج ہے، اور جن کا تعلق انسان کی باطنی قوتوں کے ساتھ ہے مثلاً غذاء ودواء، یا جن کا تعلق مالیت کے ساتھ ہے جیسے سات دھاتیں کہ جن کے بغیر دنیا کا نظام نہیں چلتا جیسے سونا، چاندی، لوہا اور تانبا وغیرہ ثقل و بھاری پن کی وجہ سے ان کے اجزاء ٹھوس شکل میں یکجا جمع ہیں، اور اجزاء اس طرح یکجا ہونے کی وجہ سے یہ لمبے عرصہ تک باقی رہتے ہیں ختم نہیں ہوتے اور طولِ بقا کی وجہ سے ان کی مالیت زیادہ ہوگئی یعنی ہر آدمی ان کے حاصل کرنے کی خواہش رکھتا ہے، اس وجہ سے ان کے اندر وزن رائج ہوا (کہ ہر شخص کی شدید خواہش ہے کہ یہ چیزیں حاصل ہوں لہٰذا ان کا لین دین کرتے وقت لینے والا اور دینے والا اپنے حق میں ذرا بھی چھوٹ دینے کے لئے تیار نہیں سو ان کے لین دین کے لئے وزن کا طریقہ رائج ہوا تا کہ ہر

ایک کا حق ٹھیک ٹھیک اس کو ملے)

یہی وجہ ہے کہ جو چیزیں گھٹیا ہوتی ہیں ان میں اکثر ناپ و پیمائش ہوتی ہے اور جو چیزیں اعلیٰ ونفیس ہیں وہ تولی جاتی ہیں تاہم کبھی کبھی اس کے خلاف بھی ہوتا ہے کہ خسیس چیزیں تولی جاتی ہیں اور نفیس چیزوں میں پیمائش وناپنے کا عمل ہوتا ہے جیسے شلغم، گاجر وغیرہ تولی جاتی ہیں اور کمخواب و گوٹا کناری کی پیمائش ہوتی ہے، حاصل کلام یہ ہے کہ اس آیت میں وزن کا ذکر نہ کرنا اور فقط ناپ (اکتیال) پر اکتفاء کرنا اس میں بھی خاص راز وحکمت ہے (جس کی تفصیل بیان ہوگئی)

آیت میں صرف کیل پر اکتفاء کی وجہ میں دوسرا قول

اس آیت میں اکتیال پر اکتفاء کرنے اور وزن کا ذکر نہ کرنے کی بعض اذکیاء نے یہ وجہ بیان کی ہے کہ تول کر لینے کی صورت میں خریدار کے لئے زیادہ لینا ممکن نہیں اس لئے کہ ترازو بیچنے والے کے ہاتھ میں ہوتا ہے اگر دو دانے بھی زیادہ پڑجائیں تو ترازو کا پلہ جھک جائے اور زیادتی ظاہر ہو جائے تب بیچنے والا زائد کو فوراً کم کردے گا، لیکن ناپ یا ماپ کر لینے کی صورت میں خریدار اگر کچھ زائد لینا چاہے تو ممکن ہے، اس طرح کہ مثلاً پیمانے کو ذرا ہلا دے تاکہ دو چار دانے زیادہ سما سکیں یا کپڑا ماپتے ہوئے ذرا جھول دے دے تو کچھ زائد آجائے گا، اسی لئے اس آیت میں یہ نہیں فرمایا کہ وزن کر کے لیتے ہوئے اس طرح بھر کر لیتے ہیں کہ کچھ زائد بھی آجائے کہ ایسا ممکن نہیں، اور ناپ کر لینے میں اس کا امکان ہے لہٰذا اسی پر اکتفاء کیا، بخلاف اس صورت کے کہ جب دوسرے کا حق دینا ہو اس وقت چونکہ ترازو اور ناپ دونوں دینے والے کے ہاتھ میں ہیں لہٰذا دونوں میں خیانت کا ارتکاب ہوتا ہے اس لئے آنے والی آیت میں جس میں یہ صورت مذکور ہے وہاں دونوں کو ذکر فرمایا ہے۔

"علیٰ" لانے کی وجہ

"اذا اکتالوا علی الناس" میں "علی" لانے کی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ ناپ کر کے لینے میں دوسروں کو ضرر پہنچانے کا ارادہ رکھتے ہیں صرف اپنا حق پورا لینا ہی ان کا مقصد نہیں ہوتا تھا (اس لئے 'علی' لائے جو ضرر پر دلالت کرتا ہے) ورنہ اکتیال "من" کے ساتھ متعدی ہوتا ہے چنانچہ یوں کہا جاتا ہے "اکتلتُ منک"

وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ۝

اور جب ماپ کر دیں اُن کو یا تول کر تو گھٹا کر دیں

''کیل'' اور ''وزن'' کا لفظ جس طرح لغت میں ناپنے اور تولنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اسی طرح ناپ کر دینے اور تول کر دینے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، لہٰذا ''ھم'' ضمیر سے پہلے ''لام'' مقدر ماننے کی ضرورت نہیں جیسا کہ بعض مفسرین کی رائے ہے، وہ کہتے ہیں کہ ''لام'' مقدر ہے گویا مراد یوں ہے ''کالوا لھم اَو وزنوا لھم'' وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ لامؔ رمقدر نہ مانیں تو معنی یہ ہوگا کہ ''ان لوگوں کو ناپتے ہیں یا ان کو تولتے ہیں'' اور یہ درست نہیں اس لئے کہ وہ مطففین لوگوں کو نہیں ناپتے تولتے تھے بلکہ ان کے اموال کو ناپتے تولتے تھے اس لئے لام کو مقدر ماننا ضروری ہے، اور لام چونکہ اکثر نفع کے لئے آتا رہتا ہے تو کثرت استعمال کی وجہ سے اس کو حذف کر دیا۔

(مگر یہ رائے درست نہیں جیسا کہ اوپر ذکر ہوا کہ کیل و وزن ناپ کر دینے اور تول کر دینے کے معنی میں بھی استعمال ہوتے ہیں) نیز لام کو نفع کے لئے مقدر ماننے کی صورت میں کلام کے اندر تناقض کا وہم پیدا ہوتا ہے کیونکہ مقصود تو یہ بتلانا ہے کہ وہ لوگ دیتے وقت لوگوں کے ضرر و نقصان کا ارادہ کیا کرتے تھے۔

ناپ تول کے اعتبار سے لوگوں کی قسمیں

لین دین کا معاملہ کرتے ہوئے گھٹانے بڑھانے کے اعتبار سے لوگوں کی چار قسمیں ہو سکتی ہیں۔

(۱) لیتے وقت، اور دیتے وقت پورا بھرے۔

(۲) دونوں صورتوں میں گھٹا دے۔

(۳) دینے میں تو گھٹائے مگر لیتے وقت پورا پورا لے، یہی صورت اس آیت میں مذکور ہے۔

(۴) دے پورا مگر لے کم، یہ اعلیٰ مرتبہ ہے اور بڑے حوصلہ والوں کا کام ہے۔

ان میں سے پہلی دونوں صورتوں کو یہاں اس لئے ذکر نہیں فرمایا کہ اگرچہ ان میں بھی قباحت و حرمت موجود ہے لیکن اس درجہ شدید برائی ان میں نہیں کہ ایسوں کے حال پر ''ہائے افسوس کہا جائے'' کیونکہ دینے کا نقصان لینے کے نقصان کا بدلہ ہو جاتا ہے، اسی طرح زیادہ لینا زیادہ دینے کا معاوضہ ہو جاتا ہے، تو ان میں ایک اعتبار سے نیکی اور ایک اعتبار سے برائی پائی گئی۔

قرض وصول کرنے اور ادا کرنے کے اعتبار سے لوگوں کی چار قسمیں

یہ چار قسمیں اس حدیث پر قیاس کر کے نکالی گئی ہیں جس میں یہ آتا ہے کہ قرض کے معاملے میں لوگ چار قسم کے ہیں۔

(۱) وہ شخص جو لوگوں سے اپنا قرض بسہولت وصول کرتا ہے اور لوگوں کا قرض جو اس کے ذمے ہے وہ بھی اچھے طریقے سے ادا کرتا ہے، یہ سب سے بہتر آدمی ہے۔

(۲) وہ شخص جو اپنا قرض لوگوں سے نہایت شدت و بے مروتی سے وصول کرتا ہے اور لوگوں کا قرض بھی نہایت شدت اور ایذاء دہی سے ادا کرتا ہے یہ سب سے بدتر آدمی ہے۔

(۳) وہ شخص جو لوگوں کا قرض بخوبی ادا کر دیتا ہے اور اپنا قرض نہایت شدت سے وصول کرتا ہے۔

(۴) وہ شخص جو لوگوں کا قرض برے طریقے سے اداء کرتا ہے مگر اپنا قرض بہت نرمی اور سہولت سے وصول کرتا ہے، یہ دونوں قسمیں درمیانی ہیں، ان میں ایک جانب خوبی اور دوسری جانب برائی ہے، یہ دونوں قسمیں خالص برائی سے بہتر ہیں۔

غصے کے معاملے میں لوگوں کی چار قسمیں

اسی طرح غصے کے معاملے میں فرمایا لوگوں کی چار قسمیں ہیں۔

(۱) جو جلد غصے میں آ جائے اور جلد ہی راضی بھی ہو جائے۔

(۲) دیر سے غصے میں آئے اور دیر سے راضی ہو، یہ دونوں درمیانی قسمیں ہیں۔

(۳) جلد غصے میں آ جائے اور دیر سے راضی ہو، یہ بدترین آدمی ہے۔

(۴) دیر سے غصے میں آئے اور جلد راضی ہو جائے یہ سب سے افضل آدمی ہے۔

ناپ تول میں خیانت کا اصل سبب

جب مطففین کے حال پر ''ہائے افسوس'' کہہ کر ڈانٹ پلائی تو اب یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ یہ لوگ اس برائی کا ارتکاب اس لئے کرتے ہیں کہ ان کے دل میں قیامت کا اعتقاد نہیں ہے، جس کا عقیدہ یہ ہو کہ قیامت کے دن جوابدہی ہوگی تو وہ مخلوق کی حق تلفی کی جراءت نہیں کرتا بالخصوص ٹھگی، فریب اور مکاری سے لوگوں کے حقوق پامال نہیں کرسکتا، اسی لئے استفہامِ انکاری کے طور پر فرمایا:

اَلَا یَظُنُّ اُولٰٓئِکَ اَنَّھُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ۝ لِیَوْمٍ عَظِیْمٍ ۝

کیا خیال نہیں رکھتے وہ لوگ کہ اُن کو اٹھنا ہے اُس بڑے دن کے واسطے

یعنی عقل و شعور سے دور افتادہ یہ لوگ گمان بھی نہیں کرتے۔

''ظن'' کا لفظ گمان کے معنی میں آتا ہے، اس موقعہ پر یہ لفظ لا کر بتلانا یہ ہے کہ ہر عقلمند آدمی اس عقیدے پر مکمل یقین رکھتا بلکہ ہر لمحہ یہ عقیدہ اس کی آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے، مگر یہ احمق لوگ تو اس عقیدے کا گمان بھی نہیں رکھتے یقین تو دور کی بات ہے۔

دوسرے یہ لفظ لانے میں اس طرف بھی اشارہ کرنا مقصود ہے کہ اس دن کا اگر یقین نہ ہو صرف گمان بھی ہو تو اس طرح کے خطرات کے گمان سے بھی حفاظتی انتظام کیا جاتا ہے چنانچہ مسافر راستے کی مشکلات کے صرف گمان پر ہی ضروری حفاظتی بندوبست کر لیتا ہے مگر یہ نادان لوگ تو اس کا گمان بھی نہیں رکھتے۔

''لیوم عظیم'' اس دن کی عظمت و بڑائی اس وجہ سے ہے کہ اس دن عدل و انصاف قائم ہوگا، حقوق اللہ اور حقوق العباد کا مطالبہ ہوگا، مخلوق کے حقوق دبانے، تلف کرنے والوں سے نہایت سختی سے نمٹا جائے گا، اور اس دن کی عظمت کا سبب یہ بھی ہے کہ وہ رسوائی کا دن ہوگا اس لئے کہ اس کی صفت یہ بھی ہے:

یَوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝

جس دن کھڑے رہیں گے لوگ راہ دیکھتے جہان کے مالک کی

یعنی اس دن تمام اگلے پچھلے لوگ اللہ رب العزت کے سامنے کھڑے ہوں گے یہاں پر اسمِ ذاتی (اللہ) کی بجائے رب العالمین کا صفتی نام ذکر فرمایا ہے، اس سے اس بات کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ اس کی ربوبیت عامہ اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ اپنے تمام بندوں کو ان کا پورا پورا حق پہنچائے، سو جن لوگوں نے دوسروں کے حقوق پامال کئے انکا اللہ تعالیٰ کے روبرو کھڑا ہونا کمال درجے کی ذلت و رسوائی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے رہنے کی مدت

بعض مفسرین نے کھڑے ہونے سے مُردوں کا زندہ ہونا مراد لیا ہے جیسے کہا جاتا ہے فلاں شخص نیند سے اُٹھ گیا یعنی بیدار ہو گیا لیکن صحیح ترین بات یہ ہے کہ یہاں کھڑے ہونے سے حقیقی معنی میں کھڑا ہونا مراد ہے، چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لوگ قیامت کے دن تین سو برس کے برابر میدانِ حشر میں کھڑے رہیں گے، اس عرصہ میں ان کو کوئی حکم نہیں ملے گا، لیکن یہ طویل ترین مدت مؤمنین کو اتنی معلوم ہوگی جتنی دیر میں نماز سے فراغت ہوتی ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت مقداد بن الاسود کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا "یقوم الناس فی رشحهم إلی أنصاف اذانهم"

لوگ اس حال میں کھڑے ہوں گے کہ پسینہ ان کے کانوں کی لُو تک ہوگا۔

صحیح مسلم اور دوسری کتب صحاح میں یہ بھی مروی ہے کہ قیامت کے دن سورج ایک یا دو کوس کی بلندی پر ہوگا، اس کی گرمی سے لوگ پگھلنے لگیں گے، پسینے سے شرابور ہو جائیں گے، البتہ اپنے اپنے برے اعمال کے مطابق ان کو تکلیف اور پسینہ ہوگا چنانچہ بعض کا پسینہ گردن تک ہوگا، بعض کا کان کی لُو تک پہنچ کر منہ میں لگام کی طرح رہے گا، اور کسی کے سینے تک، کسی کی کمر تک، کسی کے زانو تک، اور کسی کے ٹخنوں تک ہوگا۔

حضرت عبداللہ بن عمر کے بارے میں روایت ہے کہ ایک دن نماز میں انہوں نے یہ سورت شروع کی، جب اس آیت پر پہنچے تو شدتِ خوف سے آنکھیں چھلک پڑیں یہاں تک کہ بے تاب ہو کر گر پڑے اور اس وقت نماز نہ پڑھ سکے۔

كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِىْ سِجِّيْنٍ ۝

ہرگز نہیں، بیشک اعمالنامہ گنہگاروں کا سجین میں ہے

یعنی ناپ تول میں کمی کرنے والوں کو چاہئے کہ یہ حرکت چھوڑ دیں، اور قیامت کے دن زبردست عادل کے سامنے کھڑے ہونے سے غافل نہ رہیں، ان کا ہر اچھا یا برا عمل اعمالنامے میں لکھا ہوا ہے پھر وہ اعمالنامے ان فرشتوں کے سپرد ہیں جو ان اعمالناموں کو بڑے دفتر (سجین) میں داخل کرتے ہیں،

لہٰذا مخلوق کے جو حقوق بھی انہوں نے تلف کیے اس دفتر کے مطابق ان سے باز پُرس ہوگی، اور اگر وہ پوچھیں کہ ہمارے مرنے کے بعد ہمارے اعمالنامے کہاں محفوظ ہوں گے ان کو پہچاننے کی کیا علامت ہے تو ان سے کہہ دیجئے "إن كتاب الفجار لفي سجين" کہ بدکاروں کے اعمالنامے ان کے ناموں کے ساتھ سجین کے دفتر میں ہیں۔

"سجین کی تحقیق"

سجین، سجن سے مبالغے کا صیغہ ہے، سجن قید خانے کو کہتے ہیں، وہ جگہ جہاں اس دفتر (فائل) میں اندراج ہوتا ہے وہ نہایت تنگ و تاریک جگہ ہے دوزخیوں کی ارواح کا قید خانہ بھی وہی ہے اسی لئے اس دفتر/ فائل/ رجسٹر کا نام بھی سجین رکھ دیا چنانچہ مزید اس کی تحقیق بیان فرماتے ہیں:

وَمَآ اَدْرٰكَ مَا سِجِّيْنٌ ○

اور تجھ کو کیا خبر ہے کیا ہے سجین

كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ○

ایک دفتر ہے لکھا ہوا

یعنی سجین ایک دفتر (رجسٹر/ فائل) ہے جس میں ہر دوزخی کا نام درج ہوتا ہے اور بندوں کے عمل لکھنے والے فرشتے جن کا ذکر اس سے پہلی سورت میں آچکا ہے، ان بدکاروں کے مرنے اور ان کے عمل منقطع ہونے کے بعد ہر شخص کے اعمال علیحدہ علیحدہ فردوں (کاغذوں) میں لکھ کر اس بڑے دفتر (رجسٹر/ فائل) میں داخل کرتے اور پھر اس فرد پر یا ہر ایک دوزخی کے نام پر ایک علامت بنا دیتے ہیں جس کے دیکھتے ہی معلوم ہو جائے کہ یہ شخص دوزخی ہے۔

اصل لغت میں "رقم" اس علامت کو کہتے ہیں جو کپڑے کی تجارت کرنے والے کپڑے کے تھان پر لگا دیتے ہیں تا کہ فروخت کرتے وقت اس کی قیمت کی پہچان رہے۔

سجین کے متعلق بعض ضعیف احادیث میں مزید تفصیل آئی ہے چنانچہ کعب احبارؒ سے روایت ہے کہ سجین کے نام سے جو دفتر موسوم ہے وہ ساتوں زمینوں کے نیچے ہے، وہاں ایک سیاہ پتھر پڑا ہے اس سے بدبو اور دھواں نکل رہا ہے، جو شیطان اذکار و انوار سے بھاگتے ہیں وہ اسی جگہ جا کر ٹھہرتے ہیں،

بدکاروں کی روح قبض کرنے کے بعد آسمانوں پر لے جائی جاتی ہے مگر آسمان کے دربان جب اس کے لئے دروازے نہیں کھولتے تو واپس زمین پر اس کو لایا جاتا ہے یہاں بھی اس کے لئے جب کوئی ٹھکانہ نہیں ملتا تو آخر کار ساتوں زمین کے نیچے اسی پتھر کے نیچے اس کو رکھا جاتا ہے، جو فرشتے اس دفتر (سجین) پر مقرر ہیں وہ اس کا نام اس دفتر میں لکھ لیتے ہیں کہ فلاں بن فلاں اس تاریخ کو دنیا سے برزخ میں پہنچا اور یہ یہ اعمال ساتھ لایا، اور اس کے اعمال کی فردیں (فہرستیں) کراماً کاتبین کے روزنامچے سے لے کر اس دفتر میں داخل کر دیتے ہیں تاکہ قیامت کے دن یہ سب اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے، اور بدکاروں کی روحیں اسی جگہ رکھی جاتی ہیں اور ان کو طرح طرح کی اذیتیں دی جاتی ہیں۔

علم معانی کے مطابق پیدا ہونے والے دو سوالوں کا جواب

علم معانی کے قواعد کے مطابق یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔ پہلا سوال یہ ہے کہ فجار کے دفتر کا ذکر یہ ایک ابتدائی خبر ہے سننے والے جس سے ناواقف اور خالی الذہن ہیں، پہلے اس کا ذکر انہوں نے نہیں سنا اور علم معانی کا قاعدہ یہ ہے کہ پہلی مرتبہ جو بات بیان کی جائے کہ اس سے پہلے سننے والا جس سے بے خبر ہو اس میں تاکید نہیں لایا کرتے، تو یہاں دو تاکیدیں کیوں ذکر کی گئی ہیں ایک ''اِنَّ'' اور دوسری ''لام تاکید'' ہے؟

جواب اسکا یہ ہے کہ سننے والے اگرچہ اس بات سے ناواقف تھے کہ فجار کے اعمال کا دفتر سجین میں ہے مگر اسکے اثبات سے اصل دفترِ اعمال کے وجود کا اثبات لازم آتا ہے اور اس کا کفار شدت سے انکار کرتے تھے اس لئے کہ وہ سرے سے قیامت اور جزا و سزا کے ہی قائل نہیں تھے، تو انکے اس شدید انکار کے مطابق بہت مضبوط و قوی تاکید لائی گئی، جو عین قاعدہ کے مطابق ہے، اس بات کو ایک مثال سے سمجھئے، مثلاً کسی ایسے شخص کے سامنے جو زید کے وجود کا ہی منکر ہو یوں کہا جائے ''إن زیدًا لفی دارِ فلان'' تو یہ بالکل قاعدے کے مطابق درست ہے اگرچہ سننے والا اس فلاں شخص کے گھر کو جانتا ہو نہ اسکا کبھی نام ہی سُنا ہو۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ سجین کا جب پہلے ذکر ہو چکا تو ''وما ادرک ماسجین'' میں سجین کو لامِ عہد کے ساتھ معرّف باللام لانا چاہئے تھا اور یوں کہنا چاہئے تھا ''ما ادرک ماالسجین'' جیسے ''کما ارسلنا إلی فرعون رسولا O فعصی فرعون الرسول'' میں الرسول ہے۔

جواب اس کا یہ ہے کہ یہاں سجین کا لفظ سننے والے اس کے معنی سے بالکل ناواقف ہیں گویا اس کا ذکر کرنا نہ کرنا دونوں برابر ہے لہٰذا اس کو جب دوبارہ ذکر کیا تو اس کو نکرہ لانا ہی مناسب ہوا گویا یوں فرمایا ''اور تم کیا جانو کہ وہ سجین مجہول جس کا ابھی تک معنی معلوم نہیں ہوا وہ کیا ہے''

اس کے مقابلے میں رسول کا لفظ سنتے ہی عربی زبان سے واقف لوگ اس کا معنی سمجھ جاتے ہیں اس لئے اس کو دوبارہ ذکر کرتے ہوئے معرف باللام لانا ہی مناسب ہے۔

اہل نظم کے ایک شبہے کا جواب

اہل نظم کو یہاں ایک شبہہ ہوتا ہے کہ قرآن کا اسلوب یہ ہے کہ ہر جگہ نیک وفرمانبردار لوگوں کا ذکر پہلے ہوتا ہے اور بدکاروں نافرمانوں کا ذکر بعد میں ہوتا ہے، اور نیک لوگوں کے مقام وعظمت کے مناسب بھی یہی ہے کہ ان کا ذکر پہلے ہو، لیکن یہاں کس وجہ سے بدکاروں کا ذکر پہلے اور نیکوکاروں کا بعد میں ہوا؟

جواب اس کا یہ ہے کہ اس سورت کی ابتداء ہی سے مطففین کے متعلق کلام شروع ہوا جو بدکاروں کا ایک گروہ ہے اور اس موقعہ کے لحاظ سے مناسب یہی ہے کہ ان کے ڈرانے کے لئے بغیر وقفہ کئے سب سے پہلے بدکاروں کے دفتر کا ذکر کیا جائے ورنہ درمیان میں دوسری بات شروع ہو جانے سے یہ مقصد اچھی طرح حاصل نہیں ہوسکتا، اور موقعہ ومقام کی رعایت کرنا شرافت ومرتبہ کی رعایت سے زیادہ اہم ہے۔

جب اس آیت میں بدکاروں کا حال مطلقاً بیان ہوا اور یہ بھی ذکر ہو چکا کہ ناپ تول میں خیانت کرنے والے آخرت کا اعتقاد نہیں رکھتے تو اب ترقی کر کے اور آگے بڑھ کر قیامت کا انکار کرنے والے لوگوں کا ذکر کرتے ہیں، تاکہ مطففین کی سرزنش اچھی طرح سے ہوسکے، فرمایا:

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ○

خرابی ہے اُس دن جھٹلانے والوں کی

یعنی جس دن کہ اس دفتر (سجین) کو کھول کر ہر ایک کو اس کے اعمال بتائے جائیں گے، اس دن جائے بربادی ہے ان منکرین کے حال پر جو اس دن کا اعتقاد نہیں رکھتے تھے، اور یہ گمان کرتے تھے کہ لوگوں کے حقوق کا ان سے حساب نہ لیا جائے گا، اس لئے کہ ان کی صفت تو یہ ہے:

الَّذِيْنَ يُكَذِّبُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ٥

جو جھوٹ جانتے ہیں انصاف کے دن کو

یعنی وہ لوگ جزا کے دن کا انکار کرتے ہیں، حاصل یہ ہے کہ ان کا انکار حقوق کی باز پرس اور واپسی کی حد تک ہی نہیں بلکہ وہ سارے کارخانہ جزا و سزا کے ہی منکر ہیں، اور آخرت کا یہ انکار بہت ساری برائیوں کی نشاندہی کرتا ہے کہ اس کے نتیجے میں بہت سی برائیاں جنم لیتی ہیں چونکہ آخرت کے اعتقاد کا ایمان کے تمام امور میں دخل ہے چاہے وہ عبادات ہوں یا معاملات۔

وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖٓ اِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ٥

اور اُس کو جھٹلاتا ہے وہی جو بڑھ نکلنے والا گنہگار ہے

یعنی اس دن کی تکذیب وہی کرتا ہے جو کفر و فسق میں حد سے گذر گیا، کفر میں حد سے گذر جانا اس لحاظ سے ہے کہ جو شخص روزِ جزا کا منکر ہے وہ گویا اس بات کا منکر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت دائمی ہے، اور یہ کہ وہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں رہے گا، وہ یہ سمجھتا ہے کہ مرنے کے ساتھ ہی میں اللہ تعالیٰ کی بندگی سے نکل جاؤں گا اور اللہ میرے مالک ہونے کے منصب سے معزول ہو جائے گا جیسا دنیا کا مالک مملوک کے فوت ہونے سے اس کا مالک نہیں رہتا وہ اس بات کا بھی منکر ہے کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرنے کی طاقت و قدرت اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے، اس کے ساتھ اللہ عزوجل کے عادل ہونے کا بھی منکر ہے کیونکہ جب دنیا میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ظالم سے مظلوم کا بدلہ نہیں لیا اب آخرت میں بھی اگر مظلوم کو حق نہ دلائے تو مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ ظلم پر راضی ہے اور عادل نہیں ہے العیاذ باللہ، انہی فاسد عقائد کی وجہ سے وہ چند در چند کفر کا مرتکب ہو کر حد سے گذر گیا۔

اور فسق میں حد سے تجاوز اس وجہ سے ہے کہ جب روزِ جزا کا خوف دل سے اٹھ گیا تو وہ گناہوں پر دلیر ہو گیا اور یہ سمجھ لیا کہ موہوم جزا کے خوف سے نقد لذتوں کو چھوڑنا بڑی نادانی اور بے وقوفی کی بات ہے تب وہ نفسِ امارہ کی خواہش کے مطابق فسق و فجور میں پھنس کر ساری حدود دپھلانگ گیا، چنانچہ ''اثیم'' جو ''آثم'' سے مبالغے کا صیغہ ہے اسی معنی کی گواہی دیتا ہے۔

معتدِ اَثیم کی تفسیر میں دوسرا قول

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ معتد سے مراد ظالم، غاصب اور حقوق العباد تلف کرنے والا گنہگار ہے، اور ''اثیم'' سے وہ فاسق و گنہگار مراد ہے جو حقوق اللہ تلف کرے جیسے زنا، لواطت، شراب نوشی اور نماز روزہ چھوڑنے والا، پہلا گناہ متعدی ہے دوسرا محض اس کی جان کا وبال ہے۔

غرض مقصود یہ ہے کہ روزِ جزا کا منکر وہی شخص ہو سکتا ہے جو کسی مذہب و مشرب، اور دین وملت کا قائل نہ ہو اور اس موقف کے حق میں جو عقلی دلائل قائم کئے گئے ہیں ان سے محض الحاد و بے دینی کی وجہ سے آنکھیں چرائے، بلکہ قرآن کی آیات اور انبیاء کی خبریں جن کی تائید معجزات قطعیہ سے کی گئی ہے وہ بھی اس کے ذہن میں کوئی فکر و عبرت پیدا نہیں کرتیں چنانچہ فرمایا:

اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝

جب سنائے اُس کو ہماری آیتیں کہے نقلیں ہیں پہلوں کی

یعنی جب اس کو ہماری آیتیں سنائی جاتی ہیں جن میں روزِ جزا کا اثبات اور مخلوق کے حقوق کے متعلق باز پرس کا ذکر ہوتا ہے تو وہ محض ضد و عناد کی وجہ سے کہتا ہے یہ تو پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں جو بُرے کاموں سے ڈرانے کے لئے گھڑ لی گئی ہیں، تاکہ ملک میں ظلم، غضب اور فتنہ و فساد کی روک تھام ہو سکے ورنہ ان باتوں کی حقیقت کچھ نہیں جس پر یقین کیا جائے۔

كَلَّا بَلْ سکته رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝

کوئی نہیں پر زنگ پکڑ گیا ہے اُن کے دلوں پر جو وہ کماتے تھے

یعنی ایسا نہیں کہنا چاہیئے اس لئے کہ روزِ جزا کا واقع ہونا، اور مخلوق کے حقوق ان کو واپس دلانا ایسی اٹل حقیقت ہے جو واضح عقلی دلائل اور متواتر نقلی شواہد سے ثابت ہے، پھر اگر ان دلائل و شواہد سے انکی تشفی نہیں ہوتی تو اس میں دلائل کا کچھ قصور نہیں بلکہ ان کے دلوں پر ان کے بُرے اعمال کا زنگ چڑھ گیا ہے۔

دل کے زنگ آلود ہونے کی کیفیت

حضرت عبداللہ بن مسعود اور دیگر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے روایت ہے، فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب بندہ کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے، اگر اس نے توبہ کر لی تو اس کا آئینۂ دل صاف وروشن ہو جاتا ہے، اگر توبہ نہیں کی ایک اور گناہ کر لیا تو ایک اور نقطہ پڑ جاتا ہے اسی طرح گناہوں کی وجہ سے رفتہ رفتہ اس کے دل پر سیاہی بڑھتی رہتی ہے یہاں تک کہ اس کا سارا دل سیاہ ہو جاتا ہے۔

دل کی مثال آئینے کی سی ہے آئینہ جتنا صاف ہو اس میں صورتوں کا انعکاس اتنا ہی شفاف ہوتا ہے اگر زنگ آلود ہو تو کسی صورت کا اس میں انعکاس نہیں ہوتا۔

دل پر زنگ پیدا ہو جانے کی وجہ سے دلیل کے ساتھ بھی حق بات سمجھنے کی استعداد وصلاحیت باطل ہو جاتی ہے، پھر ایسے شخص کے لئے دلائل ذکر کرنا، یا انبیاء کرام علیہم السلام کی صورت کا نور کچھ اثر نہیں کرتا، وہ حق کو باطل، اور باطل کو حق سمجھنے لگتا ہے۔

قلب اور اس پر سیاہ داغ کی حقیقت

حدیث کے مطابق دل پر جو سیاہ داغ پیدا ہوتا ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ ہر گناہ لطیفۂ قلب پر ایک ظلمت وتاریکی کی صورت پیدا کرتا ہے یہ ظلمت گوشت کے اس ٹکڑے پر نہیں ہوتی جس کو دل کہا جاتا ہے بلکہ اس لطیفہ (لطیف قوت) پر ہوتی ہے جو گوشت کے اس ٹکڑے سے متعلق ہے، جیسے بینائی اور شنوائی ایک چیز (قوت) ہے جس کا تعلق ظاہر عضو آنکھ وکان کے ساتھ ہے، تو حقیقت میں دل اسی قوتِ روحانیہ کا نام ہے گوشت کے ٹکڑے کا نہیں۔

"بلْ" پر سکتہ کرنے میں ایک باریک نکتہ

حفص رحمہ اللہ اور دیگر معتبر قراء حضرات "بــل" کے لام پر سکتہ کرتے ہیں، اور "قاعدۂ یرملون" کے مطابق لام کو راء میں صاف ادغام نہیں کرتے، ظاہر ہے اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے اور بذریعہ وحی اس طرح بھی اس کا نزول ہوا ہے، سو اس میں ایک خاص نکتہ ہے جو بہت باریک ہے جب تک بطور تمہید ایک مقدمہ بیان نہ کر لیا جائے وہ نکتہ اچھی طرح ذہن نشین نہیں ہوتا۔

وہ مقدمہ یہ ہے کہ ہر زبان کے بلغاء کا یہ قاعدہ ہے کہ ان کی زبان میں جو الفاظ اِضراب کے معنی کے لئے آتے ہیں (۱)

جیسے "بـل" عربی زبان میں ہے، اردو میں "بلکہ" ہے اسی طرح ہر زبان میں اس معنی کے لئے جو الفاظ آتے ہیں، جب ان کے بعد کوئی ایسی بات ذکر کی جائے کہ اسی کو بیان کرنا مقصود ہو، تب ان الفاظ اور اس بات کے درمیان وقفہ نہیں کرتے متصل ہی اس بات کو ذکر کر دیتے ہیں۔

لیکن بسا اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ "بـل" وغیرہ الفاظِ اضراب کے بعد اصل چیز بعینہٖ نہیں ذکر کرتے یا تو اس وجہ سے کہ وہ نہایت ہی ذلیل وحقیر چیز ہے کہ قابلِ ذکر نہیں یا انتہائی ناپسند ہے یا کسی اور مصلحت کی وجہ سے بلغاء اپنی زبان پر اس کو نہیں لاتے، ایسی صورت میں اس کی بجائے اس سے ذرا کمتر چیز جو مقصد کے اظہار کے لئے بھی کافی ہو اس کو ذکر کر دیتے ہیں، تب "بل" وغیرہ اور اس چیز کے درمیان تھوڑا سا وقفہ لازمی سمجھتے ہیں، اس وقفے کی رعایت نہایت بلاغت سمجھی جاتی ہے، چنانچہ ہر لغت کے اہلِ بلاغت اس بات سے بخوبی واقف ہیں۔

جب یہ مقدمہ سمجھ لیا تو اب یہ سمجھئے کہ یہاں "بل" کے لام پر سکتہ کر کے اس بات کی طرف اشارہ فرمایا کہ یہ کفار آیاتِ قرآنی کے بارے میں جو یہ گمان کرتے ہیں کہ پُرانے افسانے ہیں، ان کے دلوں کی حالت اس درجہ خراب ہو چکی ہے کہ اگر اس کو بیان کیا جائے تو لوگ کما حقہٗ اس کو سمجھ نہیں پائیں گے، لوگ تو اپنے دلوں کے احوال سے واقف نہیں ہوتے وہ دوسروں کے دلوں کے احوال کو کیا سمجھ سکیں گے لہٰذا اس کی بجائے ذرا سکتہ کر کے یہ فرمایا کہ ان کے دل زنگ آلود ہو گئے ہیں، اتنی بات اصل مقصد سمجھنے کے لئے کافی ہے اس لئے کہ زنگ آلود چیز صاف وشفاف نہیں رہتی کہ اس میں کسی چیز کا عکس نظر آسکے، تو گویا ان کے دل کے آئینے میں حق بات کا صحیح، واضح اور شفاف انعکاس نہیں ہو رہا، اور یہ بات لوگوں کی سمجھ کے قریب ہے اس لئے کہ ظاہری آئینوں کے متعلق ان کا مشاہدہ ہے کہ زنگ آلود ہو جانے کے بعد آئینے میں کسی بھی چیز کا عکس صحیح نظر نہیں آتا۔

الغرض اس آیت میں بہت زیادہ ڈرانا مقصود ہے اس آدمی کو جو گناہ پر گناہ کئے جا رہا ہے، اور ندامت وشرمندگی، توبہ استغفار کے ساتھ جلد اس کے علاج کی طرف توجہ نہیں کر رہا، اس کی مثال ایسی

---

(۱) اضراب کا معنی اِعراض ہے، یعنی کلام میں سابقہ مضمون سے اعراض کرنا۔۱۲ اسفیر احمد ثاقب

ہے کہ کوئی آدمی ابھی تھوڑا بیمار ہوا وہ اس تھوڑی سی بیمای کی طرف توجہ نہیں کرتا لیکن یہی بیماری جب جڑ پکڑ لے گی تو علاج ناممکن ہو جائے گا۔

اور اس روحانی مرض کو روحانی اطباء یعنی انبیاء و اولیاء کے سوا کوئی جانتا ہے نہ علاج کر سکتا ہے، ایک بہت بڑی خرابی و قباحت اس کی یہ ہے کہ جس طرح یہ مرض روح کے مزاج کو فاسد کر دیتا ہے کہ صحیح نظر اور حقیقت کے انکشاف کے لئے رکاوٹ بن جاتا ہے اسی طرح اطباءِ روحانی کی پہچان کی صلاحیت سے محروم کر دیتا ہے، اس پہچان سے بہت بڑا حجاب بن جاتا ہے، جب طبیب کو ہی نہ پہچانا تو دجّال کو مسیح سمجھ بیٹھے گا، تب تو علاج محال ہو جائے گا اور نوبت مایوسی تک جا پہنچے گی، اَعاذنا اللہ من ذالک

اگر کبھی زنگ آلودہ دل رکھنے والے یوں کہنے لگیں کہ ہم کو ذکر اذکار، اور گناہ چھوڑ کر دل کو صاف و شفاف کرنے کی کیا ضرورت کل قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ کی تجلی ہوگی جیسا کہ مسلمان کہتے ہیں تو اس کی تجلی کی چمک سے ہمارے دلوں کا سارا زنگ صاف ہو جائے گا، ان کی تردید کے لئے فرمایا:

كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ○

کوئی نہیں وہ اپنے رب سے اُس دن روک دیئے جائیں گے

یعنی یہ گمان ہرگز نہیں کرنا چاہئے کہ ان کے دلوں کے زنگ نے ان کو صرف دنیا کی زندگی کی حد تک ہی متاثر کیا کہ حق کے سمجھنے، اللہ کی آیات کے پہچاننے اور آخرت کا اعتقاد رکھنے سے روک رکھا، بلکہ اس زنگ کی تاثیر قیامت کے دن اور زیادہ ہو جائے گی، کہ پروردگار اور ان کے درمیان پردے حائل ہو جائیں گے اس کی تجلی کے نور سے وہ بہرہ ور نہ ہو سکیں گے، اور اس کے دیدار سے محروم ہو جائیں گے، اس لئے کہ عقلی اصول و قانون بھی یہ ہے کہ نور کو بغیر نور کے نہیں دیکھا جا سکتا سو جس طرح دنیا میں ان کا دیدۂ بصیرت تہہ بتہہ زنگ آلود ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی تلاوت کی جانے والی روشن آیات کے دیکھنے سے اندھا ہو گیا تھا اسی طرح آج قیامت کے دن ان کا دیدۂ بصیرت ظلماتِ ذاتیہ و عرضیہ کی وجہ سے اللہ عزّ و جل کے دیدار اور اس کی تجلیات کے دیکھنے سے اندھا ہو جائے گا۔

ہر کہ امروز نہ بیند اثر قدرت دوست

غالب آنست کہ فردا شب نہ بیند دیدار

جنت میں اللہ عزّ وجل کے دیدار کی دلیل و کیفیت

یہاں کفار کے بُرے انجام کو بیان کرنے کے مقام پر قیامت کے دن ان کا دیدارِ الٰہی سے محروم ہونے کو بیان کرنا اس بات کی صریح دلیل ہے کہ مسلمان اس روز دیدارِ الٰہی کی نعمت سے سرفراز ہو کر شاداں و فرحاں ہوں گے، اگر مسلمانوں کو بھی یہ دولت نصیب نہ ہو تو پھر کفار اور ان کے درمیان اس بات میں کیا فرق رہ جائے گا، پھر تو خاص طور پر کفار کی اس نعمت سے محرومی بیان کرنا بلاغت کے سراسر خلاف ہے، اللہ کی پناہ! کیا کلامِ الٰہی بھی اس نوعیت کا ہوسکتا ہے؟

جہاں تک موسیٰ علیہ وعلی نبینا الصلوٰۃ والسلام کے واقعے کا تعلق ہے کہ جب انہوں نے اللہ سے دیدار کا سوال کیا تھا تو ارشاد ہوا تھا "لَنْ تَرَانِیْ" "تم ہرگز مجھے نہ دیکھ سکو گے"

اس کا مطلب یہ تھا کہ دنیا کے اندر جسم کے ان فانی آلات میں اللہ عزوجل کے دیدار کی طاقت نہیں، یہ مقصود نہیں تھا کہ تم آخرت میں بھی نہ دیکھ سکو گے اس لئے کہ اسی موقعہ پر آگے یہ آیت ہے: "اِنِ اسْتَقَرَّ مَکَانَہٗ فَسَوْفَ تَرَانِیْ" کہ اگر وہ پہاڑ اپنی جگہ پر برقرار رہا تو دیکھ سکو گے، اس آیت میں دیدار کو "استقرار" پر موقوف ٹھہرایا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اگر استقرار پایا جائے تو دیدار ہوسکتا ہے، اب قرآن کی دوسری آیت دیکھئے اس میں جنت کے بارے میں یہ ارشاد ہے: "حسنت مستقرا و مقاما"

اس سے معلوم ہوا کہ جنت میں استقرار ہے سو یہی دیدار کی شرط تھی لہٰذا "عند حصول الشرط یجب حصول المشروط" کے قاعدے کے مطابق یہ ثابت ہوگیا کہ جنت میں دیدارِ الٰہی ضرور ہوگا۔

اور احادیث اس بارے میں تواترِ معنوی کی حد تک پہنچی ہوئی ہیں، کہ تمام مؤمنین کو یہ دولت نصیب ہوگی، البتہ اپنے اپنے اعمال کے مطابق اس نعمتِ بے بدل سے سرفراز ہونے میں لوگوں کے درجات میں فرق ہوگا، عام مؤمنین کو صرف جمعہ کے دن جس کو وہاں "یوم المزید" کہا جائے گا یہ نعمت نصیب ہوگی، خواص کو روزانہ دو بار صبح، شام دیدار نصیب ہوگا، اور اخص الخواص جو جنتِ عدن کے مکین ہیں ان کو ہمیشہ ذاتِ پاک کا قرب اور تجلیات کا انکشاف نصیب ہوگا، چنانچہ صحیح حدیث میں ہے:

"ما بین القوم و بین أن ینظروا إلی ربھم إلا رداء الکبریاء علی وجھہ فی جنۃ عدن"

دیدار کی کیفیت کے بارے میں بعض سلف کے قول اور احادیث صحیحہ کے درمیان تطبیق اور بے نظیر تحقیق

اللہ تعالیٰ کے دیدار کے متعلق بعض بزرگوں سے جو یہ قول منقول ہے کہ وہ بلا کیف، بلا مقابلہ و مواجہہ ہوگا یہ ان احادیثِ صحیحہ کے مخالف نہیں جن میں دیدار کی کیفیت صورت کے ساتھ بتائی گئی ہے اس لئے کہ صورت کے ساتھ دیدار حشر کے میدان میں ہوگا اور جنت میں داخل ہونے کے بعد دیدار بلا صورت ہوگا، یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ بعض اوقات دیدار، کیفیت و مقابلہ کے ساتھ ہوگا اور بعض اوقات بلا کیفیت و بلا مقابلہ ہوگا۔

اور تحقیق یہ ہے کہ اللہ عزّ وجل کے دیدار کے وقت تمام ماسوی اللہ نظر سے محو ہو جائیں گے (مٹ جائیں گے) دنیا میں ہم جب کسی چیز کو دیکھتے ہیں تو اس کے ساتھ کچھ دوسری چیزیں بھی نظر آتی ہیں اس وجہ سے عقل اس چیز کو دوسری اشیاء سے مشخص و ممتاز کرنے کے لئے مقابلہ، جہت اور دیگر خصوصیات کا لحاظ کرتی ہے (چونکہ ہم ابھی دنیا میں ہیں اور عقل نے اپنی اس خاص ترتیب کے مطابق دیکھنے کا عادی بنا دیا ہے اس لئے دیدار کے متعلق ہم یہی تصور قائم کرتے ہیں) مگر جب اس ذاتِ پاک کے ساتھ سرے سے کوئی دوسری چیز نظر ہی نہیں آئے گی تو جہت، مقابلہ اور دیگر خصوصیات جو کسی چیز کو دیکھتے وقت عقل کی ترتیب ہے یہ سب کچھ عقل کے نزدیک ختم ہو جائے گا۔ (اس بات کو مزید کھول کر یوں کہہ سکتے ہیں) دنیا میں ہم جب کسی چیز کو دیکھتے ہیں تو بینائی کے آلات اس چیز کو دیکھنے میں مصروف ہو جاتے ہیں، دوسرے آلات و قویٰ اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہوتے ہیں اور عقل اپنے کام میں مصروف ہو جاتی ہے وہ یہ کہ جس چیز پر ہماری نگاہ پڑ رہی ہوتی ہے عقل اس کی شکل و صورت، رنگ، اعضاء کا تناسب، لمبائی چھوٹائی اور دیگر خصوصیات کی تشخیص و تعیین کرتی ہے، لیکن جب تمام اعضاء و جوارح دیدار میں مصروف ہو جائیں اور اس میں مکمل استغراق ہو جائے اس وقت ان چیزوں کی تشخیص بالکل ممکن ہی نہیں ہے، چنانچہ دنیا میں بھی بعض اوقات جب دوسرے حواس بھی کسی محبوب چیز کے دیکھنے میں فی الجملہ شریک ہو جاتے ہیں تو اس حالت (استغراق) کا نمونہ نظر آ جاتا ہے، حالانکہ اس استغراق اور اس استغراق میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

جب یہ بیان فرمادیا کہ دلوں کے زنگ کی تاثیر قیامت کے دن یہ ہوگی کہ وہ دیدارِ الٰہی سے محروم ہوں گے جو کہ اعلیٰ ترین لذت ونعمت ہے تو یہ گمان ہوسکتا تھا کہ زنگ آلودہ دلوں والے لوگ جسمانی لذتوں کے عادی، حرص وہوس میں گرفتار ہیں وہ اس بدنصیبی کو بڑا عذاب نہیں سمجھیں گے اس کو آسان سمجھیں گے، اس لئے اب یہ بیان فرمارہے ہیں کہ ان کے بارے میں صرف اسی محرومی وبدنصیبی پر اکتفا نہ ہوگی بلکہ:

ثُمَّ اِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيْمِ ۝

پھر مقرر وہ گرنے والے ہیں دوزخ میں

یعنی پھر وہ دہکتی آگ میں ڈالے جائیں گے، اب آگ کے اندر جلنے میں دیدار کی لذت سے محروم ہونے کی وجہ زیادہ تکلیف محسوس کریں گے اس لئے کہ دیدار کی لذت سے سرشاری جہنم کی تکلیفوں کو کم کردیتی، اور مقصود ان کے عذاب وتکلیف میں اضافہ کرنا ہے، اسی لئے صرف جہنم میں داخل کردینے پر بھی اکتفاء نہیں فرمایا بلکہ:

ثُمَّ يُقَالُ هٰذَا الَّذِىْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ۝

پھر کہا جائے گا یہ وہی ہے جس کو تم جھوٹ جانتے تھے

یہ اس لئے کہا جائے گا تاکہ حسّی عذاب کے ساتھ عقلی عذاب بھی جمع ہوجائے، اور جس طرح بدن آگ میں کوئلہ ہورہا ہے اس طنز وجھڑکی کی خجالت سے روح بھی کباب ہوجائے۔

جب فجار کے بُرے انجام کے بیان سے فارغ ہوئے تو یہ گمان ہوسکتا تھا کہ شاید قیامت کا دن جو جزاوسزا اور مکافاتِ عمل کے لئے واقع ہوگا اس کے لئے بس یہی بدکاروں کا ایک دفتر کافی ہوگا اسی سے بدکاروں اور نیکوکاروں کے درمیان فرق وامتیاز بھی ہوجائے گا، اس طرح کہ بدکاروں کو ان کے اعمال دکھا کر اور جن لوگوں کے انہوں نے حقوق تلف کئے تھے ان کی تلافی کرلی جائے گی اور نیکوکاروں سے کچھ بات چیت نہیں ہوگی انہوں نے خالق ومخلوق کے جو حقوق ادا کئے تھے ان کا یہ عمل وہاں ظاہر نہیں ہوگا، اس لئے کہ حقدار تک حق کا پہنچادینا کوئی احسان نہیں کہ جس کی جزاء کی توقع کی جائے، بس اس کی یہی جزاء کافی ہے کہ کسی طرح کی سرزنش وعذاب سے سلامت رہے، سو اس گمانِ فاسد کو رد فرماتے ہیں، فرمایا:

كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ ۝

ہر گز نہیں بیشک اعمالنامہ نیکوں کا علیین میں ہے

یعنی ہر گز یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ اس دن مکافاتِ عمل اور جزاء و سزا کے سلسلے میں صرف بدکاروں کے معاملہ پر قناعت ہوگی، ایسا نہیں ہے بلکہ اس روز مؤمنین کو طرح طرح کی نعمتوں، کامیابیوں اور سرفرازیوں سے نوازا جائے گا تاکہ بدکاروں کو مزید تکلیف ہو، مؤمنین کو ایسا نوازیں گے، ایسا نوازیں گے کہ ان کے سامنے یہ بدکار ایک ٹھٹھا بن کر رہ جائیں گے، تاکہ بدکاروں کی اس ہنسی ٹھٹھہ کا بدلہ ہو سکے جو وہ دنیا میں مسلمانوں، نیکوکاروں کے ساتھ کیا کرتے تھے۔

''علّیّین'' کے لفظ کی تحقیق اور اس کو جمع اور سجین کو مفرد لانے میں نکتہ

''علیین'' علو سے مشتق، علیؔ بروزن فعیل کی جمع اور سجین کے ہموزن ہے، علّیّین نیک لوگوں کی ارواح کے مقام کا نام ہے، اس کو جمع اس لئے لائے تاکہ اس مقام کی وسعت و کشادگی پر دلالت کرے، معنی کے لحاظ سے اگر چہ یہ مفرد ہے مگر لفظوں میں جمع کی صورت پر ہے کہ اشارہ اس مقام کی وسعت کی طرف ہے (جیسے کسی ایک آدمی کی قوت وسعت کی زیادتی بتانے کے لئے کہہ دیا جاتا ہے کہ وہ تو پوری جماعت ہے یا قوم ہے وغیرہ) اس لئے اس کا اِعراب جمع مذکر سالم والا ہوتا ہے۔

سجین کو مفرد اور علّیّین کو جمع لانے میں یہی نکتہ ہے کہ سجین کے معنی میں (یعنی اس مقام میں جس کا نام سجین ہے) تنگی، گھٹن اور ازدحام ہے اس لئے لفظوں میں بھی اس کو مفرد لائے، چونکہ ایک مکان کے اندر اگر جم غفیر داخل ہو جائے تو اس میں تنگی اور ازدحام پیدا ہو جائے گا، اور علّیّین کے معنی میں (یعنی اس مقام میں جس کا نام علّیّین ہے) وسعت، فراخی اور کشادگی ہے اس لئے لفظوں میں بھی اس کو جمع لائے گویا یوں ارشاد ہوا کہ نیک لوگوں کی ارواح میں سے ہر ایک روح ایک بہت بلند و بالا اور وسیع مکان میں ہے (یعنی علّیّین کو جمع لا کر اس کی وسعت و کشادگی کی طرف اشارہ کیا کہ وہ اتنی وسیع و عریض جگہ ہے کہ ارواح کے اجتماع سے وہاں تنگی یا ازدحام پیدا نہیں ہوتا بلکہ ہر روح کے لئے اتنی وسیع جگہ ہے جو بہت وسیع ہے گویا وہ ایک مقام ایک نہیں کئی مقامات پر مشتمل ہے۔ واللہ اعلم)

یہاں یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ مکان جتنا بلند ہوگا وہ لازماً اتنا ہی وسیع و فراخ بھی ہوگا لہٰذا سجین اور

علّیین کے درمیان لغوی معنی کے لحاظ سے بھی تقابل درست ہوا اس لئے کہ دونوں کے درمیان تقابل بالعرض متحقق ہو گیا (یعنی سجن لغوی لحاظ سے پستی اور علو بلندی کے معنی میں آتا ہے)

علّیین کا محلِ وقوع

علّیین ساتوں آسمان کے اوپر واقع ہے، اس کا نچلا سرا سدرۃ المنتہیٰ کے پاس ہے اور اوپر کا سرا عرشِ مجید کے دائیں پائے کے متصل ہے، نیک لوگوں کی ارواح قبض کرنے کے بعد وہیں لے جائی جاتی ہیں، اور ان کے اعمالنامے وہاں پہنچانے اور ان کے نام وہاں درج کر لینے کے بعد اپنے اپنے درجات کے مطابق ان کو مختلف مقامات میں رکھا جاتا ہے، مقربین یعنی انبیاء و اولیاء تو وہیں رہتے ہیں، عام صلحاء میں سے بعض کو آسمانِ دنیا میں کسی کو زمین و آسمان کے درمیان اور کسی کو زمزم کے کنویں میں رکھا جاتا ہے۔

ارواح کا اپنی قبور سے تعلق ہوتا ہے

اور ان ارواح کا اپنی قبر سے بھی ایک تعلق ہوتا ہے چنانچہ قبر پر آنے والے لوگوں اور دوست و اقرباء کی ان کو اطلاع ہو جاتی ہے اس لئے کہ روح کو اطلاع حاصل کرنے میں مقام اور جگہ کے قریب یا دور ہونے سے کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی، اس کی مثال انسان کے وجود میں روحِ بصری (یعنی نگاہ) ہے کہ ساتوں آسمانوں کے ستاروں کو کنویں کے اندر سے دیکھ سکتی ہے (اسی طرح روح کو سمجھ لیں)

جب مقام علّیین ایسا ہے کہ اس تک انسانی عقل کی رسائی نہیں ہو سکتی جب تک خود باری تعالیٰ نہ بتا دیں تو اس لئے اس کی تفسیر سوال و جواب کے انداز میں ارشاد فرماتے ہیں:

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا عِلِّيُّوْنَ ○ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ○

اور تجھ کو کیا خبر ہے کیا ہے علّیین، ایک دفتر ہے لکھا ہوا

یعنی وہ لکھا ہوا اور علامت لگایا ہوا دفتر ہے کہ اس علامت کو دیکھتے ہی ہر شخص پہچان لے کہ یہ شخص جنتی ہے (علامت کی تفصیل پیچھے سجّین کے تحت گذر چکی ہے)

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ (وہ دفتر) ایک زمرّد کی سبز کھدی ہوئی تختی ہے جو عرش معلیٰ کے دائیں پائے سے لٹک رہی ہے اس کا پائین سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچا ہوا ہے، اور وہ دفتر اللہ کے خاص بندوں کے حوالے ہے چنانچہ فرمایا:

يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ ۝

اُس کو دیکھتے ہیں نزدیک والے یعنی فرشتے

یعنی اس دفتر کے پاس مقرب فرشتے موجود رہتے ہیں جو حاملانِ عرش اور خادمانِ کُرسی ہیں۔

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ''مقربون'' سے مراد یہ ہو کہ اس عالیشان مقام میں اہلِ کمال کی ارواح قیام پذیر ہیں جیسے انبیاء علیہم السلام واولیاء کرام ہیں۔اور ''ابرار'' کے لئے یہی فخر کافی ہے کہ اس مقدس مقام میں ان کے نام درج ہیں اور اعمال نامے ہیں۔

مقربین وسابقین، ابرار واصحاب الیمین میں فرق

یہاں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ ''اہلِ نجات'' کو قرآن میں کئی سورتوں کے اندر دو قسموں میں بیان فرمایا ہے۔

(۱) کبھی مقربین وسابقین کے نام سے ان کو ذکر کیا ہے۔(۲) اور کبھی اصحاب الیمین وابراران کو کہا ہے۔

ان دونوں قسموں کی تحقیقِ حقیقت میں محققین کا اختلاف ہے، بعض کہتے ہیں کہ ''سابقین ومقربین'' سے مراد اصحابِ محبتِ ذاتیہ ہیں یعنی وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ سے صرف اس کی ذات کی وجہ سے محبت کرتے ہیں، اور ''ابرار واصحاب الیمین'' وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ سے محبت انعام کی توقع پر کرتے ہیں۔

اسی قول کے قریب یہ قول بھی ہے کہ ''مقربین وسابقین'' سے مراد وہ لوگ ہیں جو فنا فی اللہ، اور بقا باللہ کے مقام کو پہنچ گئے ہیں اور ''ابرار و اصحاب الیمین'' سے وہ لوگ مراد ہیں جو اذکار وطاعات کے انوار سے منور ہو چکے ہیں اور انشراحِ صدر پیدا کرلیا لیکن ہنوز بقا وفنا کا مرتبہ حاصل نہیں کر سکے۔

بعض کہتے ہیں کہ ہر نیک عمل کی دو حدیں ہیں۔ایک حد فوقانی ہے (اوپر کی) اور دوسری حد ہے تحتانی (نیچے کی) پس جس آدمی نے کوئی نیک عمل انتہائی صدق واخلاص کے ساتھ اس عمل کی تمام شرائط، سنن وآداب کی مکمل رعایت کرتے ہوئے اس طرح پابندی کے ساتھ کیا کہ اس عمل کے ثواب وثمرات کو ضائع ہونے سے بچائے رکھا اور ان ساری باتوں کی رعایت اس درجے کی کہ حدِ فوقانی تک پہنچ گیا تو وہ شخص ''مقربین'' میں ہے (اس عمل کے اعتبار سے) اور جس نے ان ساری باتوں کی رعایت پہلے کی بنسبت کم درجے میں کی تو وہ ''ابرار'' میں ہے (اس عمل کے اعتبار سے)

اس تقریر کے مطابق ایک ہی آدمی بعض اعمال کے اعتبار سے مقربین کے مرتبے کا اور بعض اعمال

کے اعتبار سے ابرار کے مرتبے کا ہوسکتا ہے، ایک ہی شخص میں یہ دونوں مراتب جمع ہوسکتے ہیں۔

حضرت مصنفؒ علّام کی تحقیق

اور وہ بات جو مقربین، سابقین، ابرار اور اصحاب الیمین کے الفاظ سے، اور قرآن کی اس ترتیب و نسق سے جو اللہ تعالیٰ نے ان دو گروہوں کی صفات بیان کرتے ہوئے اختیار فرمائی ہے اس سے سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ ابرار و اصحاب الیمین ایسی جماعت ہے جو حقوق اللہ، حقوق العباد ادا کرتی ہے، مخلوق کے ساتھ احسان کرتی اور جملہ نیک اعمال کے انجام دینے میں جدوجہد کرتی ہے، اور ان سارے اعمال میں اس نے اس درجہ کوشش کی کہ انہوں نے اپنی قوتِ ملکیہ کو اپنی قوتِ بہیمیہ وسبعیہ پر غالب کرلیا (۱) اور ''مقربین و سابقین'' وہ جماعت ہے کہ ان اعمال و صفات کے ساتھ ساتھ جذبِ الٰہی کے طریق پر ان کے باطنی پردے اُٹھ گئے، کامل شہود و حضوری نصیب ہوگئی، ان کا سلوک جذب کے طریق پر منتہی ہوگیا اور اپنے محبوب سے انہوں نے قربِ حقیقی حاصل کرلیا۔ واللہ اعلم

بعض عارفین کی نظر میں ''علّیین'' و ''سجّین'' کے مقام کی تحقیق

علّیین و سجّین کی تصویر بعض عرفاء نے یوں کھینچی ہے کہ نوعِ انسانی کا کام، معرفت کی وسعت و تنگی کے اعتبار سے، اور لطائف کی تہذیب و تکدر، انوارِ ملکیہ کی تحصیل یا ظلماتِ بہیمیہ وسبعیہ کے لحوق کے اعتبار سے ایک عرض عریض ہے، یا یوں کہہ لیجئے کہ ایک وسیع میدان ہے، اس قدر وسعت و کشائش کسی اور نوع میں ممکن نہیں چنانچہ کسی شاعر نے کہا ہے ؎

ولم أر أمثال الرجال تفاوتاً
لدی الفخر حتی عد الف بواحد

اس وسیع میدان کو ایک خیالی دائرہ فرض کرنا چاہئے، اس دائرے کا مرکز انسانیت کا ادنیٰ مرتبہ ہے

(۱) قوتِ ملکیہ سے مراد انسان کے اندر رکھی گئی وہ قوت ہے جو نورانی اعمال سے بڑھتی رہتی ہے جس شخص میں یہ قوت جتنی زیادہ ہوگی اس کو فرشتوں اور عالم ملکوت کے ساتھ اتنی زیادہ مناسبت ہوگی۔
قوتِ بہیمیہ سے مراد وہ قوت ہے جو حیوانی خواہشات کا تقاضا کرتی ہے مثلاً پیٹ کی اور جنسی خواہشات وغیرہ۔
قوتِ سبعیہ سے مراد غضب و غصہ کی قوت ہے جو حد سے بڑھ جائے تو انسان درندگی پر اتر آتا ہے۔ ۱۲ سفیر احمد

جو انتہائی گھٹیا اور فروتر مرتبہ ہے اور دائرے کا محیط انسانیت کا اعلیٰ مرتبہ ہے۔

جب اس خیالی شکل نے عالم غیب میں صورتِ مثالی اختیار کی تو اس کا محیط علیّین کے نام سے موسوم ہوا اور اس کا مرکز سجین قرار پایا۔

اور یہ ثابت ہے کہ دائرے کے اندر جو دائرے کھینچے جائیں ان میں سے جو اس بڑے دائرے کے مرکز کے جتنے قریب ہوتے جائیں گے وہ اتنے ہی درجہ بدرجہ چھوٹے اور تنگ ہوتے جائیں گے اور جو دائرے محیط کے قریب ہوتے جائیں گے وہ اتنے ہی درجہ بدرجہ وسیع ہوتے جائیں گے۔

چنانچہ ''فجار'' کی انسانیت کے مراتب درجہ بدرجہ مرکز کے قریب ہیں یہاں تک کہ بعض تو مرکز تک ہی پہنچ گئے ہیں، اور انسانیتِ ابرار کے مراتب درجہ بدرجہ ترقی کرتے ہوئے محیط کے قریب ہوتے چلے جاتے ہیں اور ایک دوسرے سے ان کی وسعت بڑھتی جاتی ہے، یہاں تک کہ نوبت اعلیٰ علیّین تک جا پہنچتی ہے، جو مقربین و سابقین کا مقام ہے، ابرار کو بھی مقربین کی تبعیت و پیروی میں اس مقام کا روحانی عبور عطا ہوتا ہے مگر یہ ان کے ٹھہرنے کا مقام نہیں ہے، البتہ ابرار کی ارواح کو جسم سے جدا ہونے کے بعد اس مقام پر عبور کرایا جاتا ہے، اور اس عبور کا فائدہ واثر یہ ہے کہ ان کے نام اس مقام کے رہنے والوں کی پیروی کرنے والوں میں لکھ دیئے جاتے ہیں۔

اِنَّ الۡاَبۡرَارَ لَفِىۡ نَعِيۡمٍ ۝

بیشک نیک لوگ ہیں آرام میں

جب اس بیان سے فارغ ہوئے کہ ابرار کی ارواح قبض کرنے کے بعد کیا معاملہ پیش آتا ہے، تو اب ان کے اس انجام کو بیان فرماتے ہیں جو قیامت کے دن ان کا ہوگا، فرمایا کہ نیک لوگ نعمتوں میں ہوں گے۔

''نعیم'' کا لفظ ان تمام چیزوں کو شامل ہے جو جنت میں ہوں گی جیسے، حور و قصور، کھانا پینا، پہننا، سواریاں، خوبصورت خادم اور مکانات وغیرہ جو کچھ وہاں تیار کیا گیا ہے، اس کے علاوہ جنت کی ایک نعمت یہ بھی ہے کہ جنتی سونے کا جڑاؤ کئے ہوئے تختوں پر بٹھائے جائیں گے، ان تختوں پر موتیوں کے قبے قائم کئے جائیں گے، ان قبوں کے اندر جنتی بیٹھیں گے، اس طرح کہ وہ سب کچھ دیکھیں گے مگر وہ دکھائی نہیں دیں گے، چنانچہ فرماتے ہیں:

عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ ۝

تختوں پر بیٹھے دیکھتے ہوں گے

یعنی نیک لوگ سایہ دار تختوں پر بیٹھے دیکھتے ہوں گے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مؤمن کو جنت کی تمام نعمتوں سے لطف اندوز ہونا نصیب فرمائیں گے، اس کے مقابلے میں دنیا کے اندر اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کو نعمتوں سے تو نوازتے ہیں مگر ان سے لطف اندوز ہونا ان کو نصیب نہیں ہوتا، جیسے کوئی بادشاہ بیمار ہو یا ضعیف الباہ ہو تو لذیذ کھانوں اور حسین عورتوں سے کچھ کیف وسرور اُٹھا نہیں سکتا۔

یہ بھی حدیث میں آتا ہے کہ سب سے کم درجے کے جنتی کو اس دنیا جتنی جگہ نعمتوں سے لبریز ملے گی۔

"يَنْظُرُوْنَ" کے مفعول کو حذف کرنے کی وجہ

"يَنْظُرُوْنَ" کے مفعول کو تعمیم کے لئے حذف کر دیا ہے (یعنی مفعول ذکر کر کے منظور الیہ کو مخصوص نہیں کیا) تا کہ دیکھنے میں عموم پیدا ہو کہ وہ سب کچھ دیکھیں گے، حوریں، محلات، نہریں، باغات اور بہشت کی دیگر نعمتیں اور کفار کے عذاب کو بھی یہ دیکھنا شامل ہو، مقصد یہ ہے کہ یہ سایہ دار تخت ان کو جنت کی سیر اور جہنم کو دیکھنے میں رکاوٹ نہیں بنیں گے۔ بخلاف دنیا کے تختوں کے کہ وہ بیٹھنے والوں کو سیر و نظارہ کرنے سے رکاوٹ بنتے ہیں۔

أرائک کی لغوی تحقیق

اُرائک، اریکۃ کی جمع ہے لغت میں اریکہ اس تخت کو کہتے ہیں جس پر سائبان کی طرح قبہ بنا ہوا ہو جو رنگین پردوں، مزیّن جھالروں سے آراستہ ہو، اس کو ہندی زبان میں چھپر کھٹ کہتے ہیں۔

اُرائک کی تفسیر میں عارفین کا قول

ارائک جو جنت میں ابرار کو نصیب ہوں گے اور ان کا ذکر قرآن میں بھی جا بجا بہت تعریف کے ساتھ آیا ہے، عارفین نے ان کے متعلق فرمایا ہے کہ یہ اسمائے الٰہیہ کے مقامات کی صورت مثالیہ ہے جن میں یہ ابرار دنیا میں تھے، مگر دنیا میں ان کے یہ مقامات آنکھ اور عقل سے پوشیدہ تھے، مگر یہ ابرار ان

مقامات میں ٹھہر کر وہاں سے ''وجود'' کے سارے مراتب کی سیر کیا کرتے تھے۔

تَعۡرِفُ فِیۡ وُجُوۡهِهِمۡ نَضۡرَةَ النَّعِیۡمِ ۝

پہچان لے تو اُن کے منہ پر تازگی آرام کی

یعنی اے دیکھنے والے تو ان کے چہرے پر نعمتوں کی تازگی دیکھ لے گا، کہ دوزخیوں کا برا حال دیکھ کر ملال یا غبارِ خاطر نہ ہوگا کہ جس کا تغیر چہرے پر ظاہر ہو بلکہ دشمنوں کا عذاب میں مبتلا دیکھنا تو مزید فرحت وسرور کا باعث ہوگا اسی وجہ سے خوشی وسرور کے آثار ان کے چہرے سے ٹپکتے ہوں گے۔

یُسۡقَوۡنَ مِنۡ رَّحِیۡقٍ مَّخۡتُوۡمٍ ۝

اُن کو پلائی جاتی ہے شراب خالص مہر لگی ہوئی

یعنی ان کو خالص شراب پلائی جائے گی، اس لئے کہ یہ اللہ کی محبت کی صورتِ مثالی ہے جو شراب کی طرح ان کے دلوں، رگ وریشہ اور روح میں سرایت کرگئی تھی، وہ خالص محبت تھی اس میں نفسانیت یا معاصی کی آمیزش نہیں تھی۔

مختوم کی تفسیر

جنت میں شراب نہروں، چشموں کی صورت میں بہہ رہی ہوگی چنانچہ قرآن کی بہت سی سورتوں میں اس کا ذکر ہے اور یہ عام استعمال ہوگی، ہر خاص وعام اس میں ہاتھ ڈالے گا اس لئے اس عام استعمال میں آنے والی شراب سے احتراز کرنے کے لئے ابرار کے لئے مخصوص کردہ شراب کی ایک اور قید ذکر فرمائی ہے یعنی ''مختوم'' کہ وہ خالص شراب مہر (سیل) کی ہوئی ہے، یہ دوسری شرابوں سے ممتاز اور جدا ہے۔

اور یہ خالص شراب جو محبتِ الٰہیہ کی صورتِ مثالی ہے اس کے سیل مہر کرنے میں راز یہ ہے کہ یہ محبت باوجود انتہائی جوش وہیجان ہونے اور عشق کے مرتبے سے بھی کوسوں آگے بڑھ جانے کے شریعت کی مہر سے مہر کی گئی تھی شریعت سے تجاوز نہیں کرتی تھی، احکامِ الٰہی کی مہر کے نیچے محفوظ تھی، اور اس محبت کے ساتھ حرام محبت، شہواتِ نفسانیہ ممنوعہ، اور نجاسات شیطانیہ کی ہرگز آمیزش نہیں تھی (گویا یہ مہر احکام شریعت سے عدم تجاوز کی صورتِ مثالی ہوگی)

خِتٰمُهٗ مِسْكٌ ط

جس کی مہر جمتی ہے مشک پر

دنیا کی شرابوں کو جس شیشی، بوتل میں ڈالا جاتا ہے اس میں بھی حفاظت اور احتیاط کے پیش نظر مہر کی جاتی ہے مگر وہ سیل مہر یا مٹی کی ہوتی ہے یا موم وغیرہ کی لیکن اس شرابِ مختوم کے عجائبات میں سے ایک بات یہ بھی ہے کہ اس پر جس چیز کی مہر کی ہے وہ مشک ہے، تا کہ بوتل اٹھاتے ہی مشک کی خوشبو مشام جان کو معطر کر دے۔

اور یہ مشک صورتِ مثالی ہے شریعت کے اس حکم کی جو ان چیزوں کی اباحت کے بارے میں وارد ہوا تھا جو چیزیں دنیا میں ان نیکوکار لوگوں کے دلوں کو تقویت دینے والی، خوش کرنے والی اور ذوق وشوق کو بڑھانے والی تھیں۔

وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ ۝

اور اُس پر چاہئے کہ ڈھکیں ڈھکنے والے

یعنی یہ شراب جو نمونہ اور صورتِ مثالی ہے اس نفیس چیز (محبت الٰهیہ) کی، رغبت کرنے والوں کو اس میں رغبت کرنی چاہئے، یہ کوئی رغبت کی چیز ہے کہ مٹھی بھر جَو یا گندم میں لوگوں کا حق ماریں، اس خسیس چیز کی اس سے کیا نسبت ہے؟

ختام کے معنی میں بعض مفسرین کا قول

بعض مفسرین نے ختام کا معنی ''ختم'' اور انتہا سے کیا ہے یعنی خالص شراب کے ختم پر، مشک ہوگی چنانچہ اس معنی کے مطابق حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنتیوں کی آخری شراب مشک ہے، اور مشک وہ شراب ہے جو چاندی کی طرح سفید ہے اگر اس شراب میں ہاتھ ڈبو کر دنیا میں کوئی ظاہر کر دے تو دنیا کے تمام جاندار اس کی خوشبو سے مَست ہو جائیں۔

ظاہر یہ ہے کہ وہ شرابِ خالص جنتیوں کو سب سے آخر میں پلائی جائے گی اس جہت سے اس کو مشک کا نام دیدیا گیا ہے، اس لئے کہ مشک گرم دواؤں میں سے ہے، غذا کو جلد ہضم کرتی اور منہ کو

خوشبودار کرتی ہے، وہ شراب بھی جنتیوں کی محفلِ شراب کے ختم پر پلائی جائے گی اور اس کی بھی یہی خاصیت ہوگی۔

وَمِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍ ۝

اور اُس کی ملونی ہے تسنیم سے

یعنی بعض اوقات مجلس والے شراب میں کوئی اور چیز ملاتے بھی ہیں اس لئے فرمایا کہ جنت میں اس شراب خالص کے اندر جب کچھ ملانا چاہیں گے تو ایسا کر سکیں گے، اور وہ تسنیم ہے جس کو ملائیں گے۔

''تسنیم'' کی تحقیق

لغت میں تسنیم اس چیز کو کہتے ہیں جس کو خوشبو یا ذائقہ کے طور پر شراب میں ملایا جائے جیسے گلاب، یا مشک وغیرہ ہے اور ''تسنیم'' سنام سے مشتق ہے، سنام اونٹ کی کوہان کو کہتے ہیں (تو تسنیم کا معنی ہوا کوہان بنانا) چونکہ ایسی خوشبو والی چیزیں ڈالنے سے شراب میں بلبلے اٹھنے لگتے ہیں جو اونٹ کی کوہان کی شکل کے ہوتے ہیں اس لئے اس کو تسنیم کہتے ہیں۔

یہاں پر تسنیم سے مراد جنت کا ایک خاص چشمہ ہے جو تمام شرابوں سے بہتر اور لذیذ ہے، مقربین و سابقین کو تو خالص اسی سے پلائیں گے ابرار کو (تسنیم کے طور پر) گلاب و مشک ملانے کی طرح شراب میں اس کو تھوڑا سا ملا کر پلائیں گے۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ ''تسنیم'' کا چشمہ جنت کی زمین سے جاری نہیں ہے بلکہ ہَوا میں جاری ہے، فضاء و ہوا کے اندر اس کے جاری ہونے میں راز یہ ہے کہ وہ چشمہ محبتِ ذاتیہ الٰہیہ کا نمونہ وصورتِ مثالی ہے کہ وہ محبت بھی صورت و محل کے تعین کے بغیر ہی تھی بلکہ محبوب کے حال و صفت کی تشخیص و تعیین کے بغیر مقربین کی ارواح کو فریفتہ کر دیا تھا۔ کہتے ہیں کہ وہ چشمہ عرش کے نیچے سے ابلتا ہے اور مقربین کے گھروں کے صحن میں گرتا ہے، چنانچہ اس کے حال میں فرماتے ہیں:

عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ ۝

وہ ایک چشمہ ہے جس سے پیتے ہیں نزدیک والے

یعنی ''تسنیم'' سے ہماری مراد وہ چشمہ ہے جس سے مقرب لوگ پیتے ہیں، حاصل کلام یہ ہے کہ

مقربین خالص اسی سے پیتے ہیں اور ''ابرار'' کو اس سے تھوڑا سا گلاب کے طور پر شرابِ خالص میں ملا کر دیتے ہیں، اس لئے کہ مقربین اللہ کے ماسوی کی طرف مشغول نہیں ہوئے اور اللہ کی محبت میں کسی اور کی محبت کو نہیں ملایا، بخلاف ابرار کے کہ انہوں نے اللہ سے محبت اللہ کے افعال وصفات کے آثار کی وجہ سے کی تھی (یعنی اللہ تعالیٰ کے انعام واکرام کی بدولت اس سے محبت تھی)

جب ابرار (نیکوکاروں) کا جنت میں نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کے ذکر میں ان کی شراب نوشی کا ذکر فرمایا تو اب اس شراب نوشی کا نکتہ بیان فرماتے ہیں، تفصیل اس کی یہ ہے کہ اصل میں اس دن حق تعالیٰ کو منظور یہ ہے کہ کفار دنیا میں مسلمانوں کے ساتھ جو ٹھٹھہ مذاق کیا کرتے تھے، اس کا بدلہ اسی طرح آج ان کی ہنسی مذاق اڑا کر لیا جائے، مگر اللہ کے نیک بندے کمال تمکین و وقار کی وجہ سے ان کی ہنسی اڑانے میں کچھ توقف کریں گے، تب ان کو شراب کے جام پلائے جائیں گے، جس سے وہ سرشار ہو جائیں گے اس سرشاری وفرحت کی وجہ سے ان کے وقار وتمکنت میں کچھ کمی آ جائے گی، پھر تو وہ خوب اپنے ٹھٹھوں کا بدلہ لیں گے، چنانچہ فرماتے ہیں:

اِنَّ الَّذِیْنَ اَجْرَمُوْا کَانُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یَضْحَکُوْنَ ○

وہ لوگ جو گنہگار ہیں تھے ایمان والوں سے ہنسا کرتے

یعنی جو لوگ دنیا میں گناہ کرتے تھے جیسے اللہ کی آیات کا انکار، مخلوق کے حقوق پامال کرنا اور ناپ تول میں کمی کرنا، یہ دنیا میں ایمان لانے والے لوگوں کی ہنسی اڑاتے تھے کہ ان کو کیا بے ہودہ فکر دامن گیر ہوگئی ہے کہ سامنے نظر آنے والی لذتوں کو محض خیالی لذتوں کی توقع پر چھوڑتے ہیں، اور صرف اسی ہنسی پر بس نہیں کرتے تھے بلکہ:

وَ اِذَا مَرُّوْا بِهِمْ یَتَغَامَزُوْنَ ○

اور جب ہو کر نکلتے اُن کے پاس کو تو آپس میں آنکھ مارتے

یعنی مسلمانوں کے پاس سے جب گذرتے تو ایک دوسرے کو آنکھیں مارتے کہ یہی وہ بے عقل، احمق لوگ ہیں جنھوں نے نقد لذتوں سے اپنے آپکو جنت کی محض وہمی خیالی لذتوں کی وجہ سے محروم کر رکھا ہے۔

وَاِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓی اَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا فَكِهِيْنَ ○

اور جب پھر کر جاتے اپنے گھر پھر جاتے باتیں بناتے

یعنی یہ کافر لوگ جب لوٹ کر گھر جاتے تو گھر میں دنیاوی لذتوں کا مختلف ساز وسامان دیکھتے، خوبصورت عورتیں، نوکر چاکر، نفیس قسم کے فرش، مکلف برتن، عمدہ عمدہ کھانے، پینے کے لئے ٹھنڈے خوشبودار مختلف مشروبات تو وہ یہ سمجھتے کہ یہ سب کچھ ہمیں ہمارے عقیدۂ انکارِ آخرت کی وجہ سے ملا ہے، کہ اس دن کا ہمیں کچھ خوف وڈر نہیں ہے اور مسلمان ان نعمتوں سے اس وجہ سے محروم ہیں کہ وہ جنت کی موہوم نعمتوں کی توقع اور جہنم کے خیالی عذاب کے ڈر سے ان سب سے دست بردار ہوئے بیٹھے ہیں، ان کی مثال تو اس مجنون جیسی ہے جو بہت مفید اور لطیف غذاؤں سے ڈرتا اور پرہیز کرتا ہے، اس خوش فہمی میں مبتلا ہو کر وہ کافر لوگ خوش طبعی کی باتیں کرنے لگ جاتے، خوش گپیاں کرنے لگ جاتے۔

وَاِذَا رَاَوْهُمْ قَالُوْٓا اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَضَآلُّوْنَ ○

اور جب اُن کو دیکھتے کہتے بیشک یہ لوگ بہک رہے ہیں

یعنی جب مسلمانوں کو دیکھتے کہ طاعات وعبادات میں سخت مشقت وجانفشانی کر رہے ہیں، لباس بھی اچھا نہیں پہنتے، کھانا بھی خشک وبے مزہ کھاتے ہیں، سخت گرمی میں روزے رکھتے ہیں تو کہتے ''بیشک یہ لوگ تو بھٹکے ہوئے ہیں'' کہ وہمی خیالی لذتوں کو سامنے موجود لذتوں پر ترجیح دیتے ہیں، اور ان بے مقصد مشقتوں کا نام حقیقی کمالات رکھا ہوا ہے۔

وَمَآ اُرْسِلُوْا عَلَيْهِمْ حٰفِظِيْنَ ○

اور اُن کو بھیجا نہیں اُن پر نگہبان بنا کر

یعنی کافروں کو مسلمانوں کے اوپر نگران بنا کر نہیں بھیجا گیا ہے کہ وہ ان کی نگرانی کرتے رہیں کہیں سیدھی راہ سے ہٹ تو نہیں گئے، اور یہ کہ ہر مجلس میں ان کا پیچھا کریں، طعن وتشنیع کرتے پھریں، اور ان پر پھبتیاں اڑائیں اور آوازے کسیں۔

یہ کفار اس معاملے میں اس حد تک آگے بڑھ گئے تھے کہ پہلے تو مسلمانوں کو دیکھ دیکھ کر حقارت سے ہنستے، پھر غمزے واشارے کرتے، اسکے بعد انکے پسِ پشت ان کی پھبتیاں اڑاتے، پھر اس سے بھی

بڑھ کر منہ پر ان کو گمراہ کہتے (مسلمانوں کے متعلق کفار کے یہ چار حال اسی ترتیب سے یہاں بیان فرمائے ہیں)

مسلمانوں کی اہانت میں کفار کے چار افعال بالترتیب بیان کرنے میں نکتہ

اور کافروں کی ان چار حالتوں کو اس ترتیب سے بیان کرنے کی وجہ یہ ہے کہ جب کسی آدمی کو کسی کی کوئی بات ناپسند ہوتی ہے تو سب سے پہلے وہ اس پر حقارت سے ہنستا ہے، جب نفرت مزید بڑھتی ہے تو اپنے مزاج و مذاق کے لوگوں کو چشم و ابرو سے اشارے کر کے بتاتا ہے تا کہ وہ بھی اس کی اہانت میں شامل ہوں، جب نفرت انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو غائبانہ بھی اس پر پھبتیاں کستا اور اس کے لطیفے بنا بنا کر ہنستا ہنساتا ہے، اور جب نفرت حد سے بڑھ جاتی ہے تو پھر برسرِ عام، آمنے سامنے اس کے منہ پر اس کو احمق، جاہل اور گمراہ کہنا شروع کر دیتا ہے، اس وجہ سے اِن آیات میں اس ترتیب کی رعایت فرمائی ہے۔

اور کافروں کا یہ ظلم بیان کرنے کے بعد مسلمانوں کو تسلی کے طور ارشاد ہوتا ہے کہ کفار کا یہ ظلم یوں ہی بیکار نہیں جائے گا بلکہ جزا کے دن اس ظلم کا بدلہ لیں گے، چنانچہ فرمایا:

فَالْيَوْمَ الَّذِينَ آمَنُوا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُونَ ٥

سو آج ایمان والے منکروں سے ہنستے ہیں

یعنی جو لوگ ایمان لائے تھے، اور ایمانی قوت کے ساتھ نفسانی لذات پر حقیقی کمالات کو ترجیح دیتے ہوئے اختیار کیا تھا، وہ آج ان کفار پر ہنستے ہیں جو کمالات کے منکر اور سارا کمال دنیاوی لذتوں میں ہی سمجھتے تھے، آج مسلمان ان کی کوتاہ اندیشی، حماقت پر ہنستے ہیں کہ کیسی فانی و خسیس چیز کو کتنی نفیس اور ہمیشہ رہنے والی چیز پر انہوں نے ترجیح دی تھی اور اب دوزخ میں طوق و زنجیر کے اندر جکڑے ہوئے ہیں۔

حدیث میں آتا ہے دوزخ کا ایک دروازہ جنت کی طرف کھولا جائے گا اور جہنم کے نگران فرشتے کفار سے کہیں گے جلدی آؤ جنت کی طرف وہ طوق و زنجیر میں جکڑے گرتے پڑتے اس کی طرف آئیں گے جب قریب پہنچیں گے تو دروازہ بند کر دیا جائے گا اور دوسری طرف ایک دروازہ کھول دیا

جائے گا کہ ادھر سے آؤ، یہ گرتے پڑتے ادھر دوڑیں گے جب اس کے قریب پہنچیں گے تو وہ بھی بند کردیا جائے گا اسی طرح یہ تماشہ ان کے ساتھ ہوتا رہے گا اور مسلمان جنت میں بیٹھے جب یہ نظارہ دیکھیں گے تو ہنسیں گے لیکن مسلمان کافروں کا یہ تماشہ دیکھنے کے باوجود ہنسی میں تمکنت، وقار اور سنجیدگی کے اندر ہی رہیں گے، نہ آنکھوں سے ایک دوسرے کو اشارے کریں گے، نہ پھبتیاں اڑائیں گے اور نہ ہی اپنی مجالس میں غائبانہ ان کی برائی بیان کریں گے جس طرح دنیا میں کفار ان کے ساتھ کرتے تھے بلکہ باوجود اس عجیب تماشہ کے کہ دنیا میں اس طرح کے تماشوں کا نظارہ کرنے کے لئے لوگ دور دور جاتے ہیں، وہ اپنی جگہ سے ہلیں گے بھی نہیں چنانچہ فرمایا:

عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ ۝

تختوں پر بیٹھے دیکھتے ہیں

یعنی ان سایہ دار تختوں پر ہی بیٹھے دیکھتے ہیں اور آپس میں کمال تمکنت کے ساتھ ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں:

هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝

اب بدلا پایا ہے منکروں نے جیسا کچھ کہ کرتے تھے

یعنی کیا کفار نے اپنے اعمال کی سزا پائی ہے، وہ اعمال جو دنیا میں کرتے تھے جیسے ٹھٹھہ، غمزہ کرنا، پھبتیاں کسنا اور گمراہ کہنا وغیرہ۔

تمت سورة المطففين والحمدلله

مقدمہ سورۂ انشقت

سورۂ انشقت (انشقاق) مکی ہے، اس میں پچیس آیات، ایک سونو (۱۰۹) کلمات اور چار سوتیس (۴۳۰) حروف ہیں۔

سورۂ مطففین کے ساتھ ربط کی وجود

اس سورت کا ربط سورۂ مطففین کے ساتھ مضامین ومعانی دونوں اعتبار سے بالکل ظاہر ہے، دونوں کا مضمون ومعنی قریب قریب ہے۔ سورۂ مطففین میں ہے:

(۱) "وَیْلٌ لِّلْمُطَفِّفِیْنَ ـــــ وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُکَذِّبِیْنَ" یہی مضمون سورۂ انشقاق میں یوں ہے "یَدْعُوْ ثُبُوْرًا"

(۲) سورۂ مطففین میں ہے "اَلَا یَظُنُّ اُولٰٓئِکَ اَنَّھُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ" اس سورت میں یہ مضمون اس طرح ہے "اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ یَّحُوْرَ" سورۂ مطففین میں ہے "یَوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" اور اس سورت میں یہ بات اس طرح ہے "فَمُلٰقِیْهِ"

(۳) سورۂ مطففین میں یہ بیان ہوا ہے کہ مرنے کے بعد نیک لوگوں اور بُرے لوگوں کے اعمالنامے علّیین اور سجّین کے دفتر (رجسٹر) میں داخل ہوں گے، اِس سورت میں بھی اعمالناموں کے متعلق یہ مذکور ہے کہ حشر کے دن وہ دائیں یا بائیں ہاتھ میں تھمائے جائیں گے۔

(۴) سورۂ مطففین میں کافروں کا قرآن کی تکذیب کرنے کو ان الفاظ سے بیان فرمایا ہے:

"اِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِ اٰیٰتُنَا قَالَ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ" اور یہی بات اِس سورت میں ان الفاظ کے ساتھ ہے "وَاِذَا قُرِئَ عَلَیْهِمُ الْقُرْاٰنُ لَا یَسْجُدُوْنَ"

(۵) سورۂ تطفیف میں ہے "اِنَّھُمْ لَصَالُوا الْجَحِیْمِ" اِس سورت میں یوں ہے "یَصْلٰی سَعِیْرًا"

(٦) سورۂ تطفیف میں اہلِ نجات کے متعلق ہے "تَعْرِفُ فِیْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِیْمِ" اور یہ بھی ہے "فَالْیَوْمَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْکُفَّارِ یَضْحَکُوْنَ" اِس سورت میں یہ مضمون اس طرح ہے "وَیَنْقَلِبُ اِلٰٓی اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا"۔

(۷) سورۂ تطفیف میں کافروں کا مسلمانوں کے ساتھ تحقیر آمیز سلوک کو یوں بیان فرمایا ہے:

"فَالْیَوْمَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْکُفَّارِ یَضْحَکُوْنَ ، وَاِذَا انْقَلَبُوْآ اِلٰٓی اَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا فَکِهِیْنَ " اس سورت میں یوں فرمایا "کَانَ فِیْٓ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا" علی ھذا القیاس غور و تأمل کرنے سے مناسبت کلی ظاہر ہوتی ہے۔

وجہ تسمیہ

اس سورہ کا نام ''انشقت'' اور ''انشقاق'' اس وجہ سے رکھا ہے کہ (انشقاق کا معنی ہے پھٹنا) اس میں شروع میں ہی قیامت کے دن اللہ کے حکم سے آسمان کا پھٹنا بیان ہوا ہے۔

اس واقعے میں انسان کے اوپر بہت بڑی حجت قائم کی گئی ہے، کہ آسمان جیسی عظیم، اور بلند ترین مخلوق بغیر ثواب یا عذاب کی توقع کے پھٹ جانے کا دشوار ترین عمل محض اللہ تعالیٰ کے حکم سے بجالایا، تو انسان جو آسمان کے مقابلے میں بہت کمزور و ذلیل ہے، اور وہ عذاب یا ثواب کی توقع بھی رکھتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے آسمان حکم کو کیوں بجا نہ لائے حالانکہ وہ حکم ایسا دشوار و سخت بھی نہیں ہے۔

تمت المقدمة

تفسیر سورۂ انشقاق

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ۝

جب آسمان پھٹ جائے

حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے کہ آسمان کہکشاں کے مقام سے پھٹے گا۔

آسمان کے پھٹنے کی وجہ

آسمان اس وجہ سے پھٹے گا کہ، اس دن وہ فرشتے جو مخلوق کا رزق اتارنے، بندوں کے اعمال اوپر لے جانے کے لئے آسمان کے دروازوں پر مقرر ہیں وہ اس کام سے فارغ ہوجانے کی وجہ سے نیچے اتر آئیں گے، اور دوسرے فرشتے بھی حشر کے میدان میں اتر کر صفیں باندھ کر کھڑے ہوجائیں گے، تب قہر الٰہی کی تجلی عرش پر غالب ہو کر اس کو نیچے کی جانب دبائے گی، اس تجلی کے دباؤ و صدمے سے اور عرش کے بوجھ سے آسمان پاش پاش ہوجائے گا۔

اور یہ وجہ بھی ہے کہ اس دن ایک نئے عالم کی تعمیر مدِ نظر ہے اس لئے پہلے عالم کی تخریب ضروری ہوئی کیونکہ سابق بنی ہوئی چیز کی تخریب کے بغیر اس کی جگہ نئی تعمیر نہیں ہو سکتی۔

درسِ عبرت

یہاں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ انسان دو چیزوں سے مرکب ہے۔ (۱) روح (۲) جسم

انسان کی روحانیت کا مرکز و منشاء آسمان ہے اس لئے کہ اس کا نفس ناطقہ نفوسِ سما، یہ سے ماخوذ اور ان سے کامل مشابہت رکھتا ہے، اور اس کی ''روح ہوائی'' جو نفس کے ساتھ مرکب اور گوشت پوست کے بدن میں سرایت کئے ہوئے ہے اس کا جوہر بھی آسمان کے جوہر کے ساتھ کلی مشابہت رکھتا ہے کہ ٹوٹنے پھوٹنے کو قبول نہیں کرتا (سوائے اللہ کے حکم کے) یہ روح اگرچہ بیماریاں اور بڑے بڑے صدمات اٹھاتی ہے مگر بالکل فنا نہیں ہوتی، اس کے فنا کی انتہا یہ ہے کہ بدن سے جُدا ہو جاتی ہے، پھر ارواح کے نگران و محافظ فرشتوں کے پاس محفوظ رہتی ہے۔

اور روح کی سعادت و شقاوت جس کو عرف میں بخت (نصیب، قسمت) کہتے ہیں اور طالع کی طرف بھی منسوب کرتے ہیں اس کا سبب بھی آسمان و ستاروں کی حرکات کی مختلف اوضاع ہیں۔

اور روح کی غذاء اس کی بیماریوں کی دواء جو شریعت و طریقت کی صورت میں ہے یہ بھی آسمان سے نازل شدہ ہے۔

لہٰذا آسمان کا پھٹنا اس بات کی قوی و مضبوط ترین دلیل ہے کہ انسان کی روحانیت کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے بغیر چارۂ کار نہیں ہے، کیونکہ آسمان جو اس روحانیت کا مرکز ہے وہ اپنی تمام تر عظمت و بلندی کے باوجود اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری سے نہیں نکل سکتا۔

پھر یہ آسمان کا پھٹنا اس وجہ سے نہ ہوگا کہ آسمان کی بنیاد و تعمیر میں کچھ کمزوری ہے جیسا کہ دنیا کی عمارتوں میں ہوتا ہے، بلکہ اس کی قوت، مضبوطی اور سختی کے باوجود اللہ کے حکم کی تابعداری میں ایسا ہوگا چنانچہ فرماتے ہیں:

وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَ حُقَّتْ ۝

اور سُن لے حکم اپنے رب کا اور وہ آسمان اسی لائق ہے

یعنی یہ حکم جو نہایت شاق تھا آسمان نے سنتے ہی اس کی تابعداری کی، اس حکم کے ماننے میں ذرہ بھر

سرکشی نہیں کی، اور آسمان کی یہ فرمانبرداری ایسی نہیں ہے کہ اس کی عظمت و بلندی کے منافی ہو بلکہ یہ تذلیل و عاجزی اس کی عظمت کے مناسب ولائق ہے۔

وَ اِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ ○

اور جب زمین پھیلا دی جائے

یعنی جب زمین کھینچ کر لمبی چوڑی کر دی جائے گی تا کہ اس دن جو مجمعِ عظیم ہوگا اس کی جگہ ہو سکے، اس میں ساتوں آسمان کے فرشتے، حاملینِ عرش، تمام مخلوقات، جن، انسان ان کے پچھلے سب اس وقت جمع ہوں گے۔

دوسرے اس لئے بھی زمین کو کھینچ کر لمبا چوڑا کیا جائے گا تا کہ زمین ہموار ہو جائے، اس میں عمارتیں، ٹیلے، پہاڑ وغیرہ جو ہیں وہ سب برابر ہو جائیں تا کہ کھڑے ہونے والے سب برابر اور ایک دوسرے کے سامنے ہوں کوئی کسی چیز کی آڑ میں نہ ہو سب ایک دوسرے کے حال کو دیکھ سکیں۔

اس بات کا مشاہدہ کسی بچھونے کے کھینچ کر اور پھیلا کر بچھانے میں ہوتا ہے کہ اس سے دو فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ (۱) یہ کہ وسعت اور گنجائش پیدا ہو جاتی ہے۔ (۲) یہ کہ ہمواری پیدا ہو جاتی ہے۔

جسم کو اللہ کی نافرمانی سے بچانے کا فطری تقاضا

زمین انسان کے جسم کا منشاء و مرکز ہے، اس کے جسم کا غالب حصہ زمین سے ماخوذ ہے، جسم کی غذا اور بہت سے منفعتیں زمین سے ہی حاصل ہوتی ہیں، لہٰذا زمین کا اللہ کے حکم کے سامنے مطیع و فرمانبردار ہونا اس بات کی قوی دلیل ہے کہ انسان اپنے جسم کے تمام اعضاء، رگ و ریشے کو اللہ کے حکم کا مطیع و فرمانبردار رکھے۔

وَ اَلْقَتْ مَا فِیْهَا وَ تَخَلَّتْ ○

اور نکال ڈالے جو کچھ اُس میں ہے اور خالی ہو جائے

یعنی پھیلا دینے کے لئے زمین جب کھینچی جائے گی تو کھینچنے کی وجہ سے زمین اپنے خزانے، دفینے، کانیں اور مُردوں کے اجزاء اُگل دے گی تا کہ انسانوں کا حشر تمام اجزاء کے ساتھ حاصل ہو، اور زمین سے حاصل ہونے والے جن منافع کی وجہ سے لوگ قتل و قتال کرتے ایک دوسرے کی حق تلفیاں کرتے

تھے ان منافع کی کامل ذلت و بے قدری لوگوں کے سامنے ظاہر ہو سکے۔

اور زمین انسانوں کے تمام آثار و اعمال سے بتکلف خالی کر دی جائے گی تاکہ اس کے مطابق ان کو جزاء دی جاسکے۔

اور زمین کا اپنے دفینوں کا اگلنا، اور خالی ہو جانا کسی ذاتی فائدے، یا بدلے کی لالچ میں یا ضرر کے خوف سے نہ ہوگا بلکہ فرمانِ الٰہی کی وجہ سے وہ ایسا کرے گی۔

وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَ حُقَّتْ ٥

اور سن لے حکم اپنے رب کا اور وہ زمین اسی لائق ہے

یہاں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اکثر عوام یہ سمجھتے ہیں کہ یہ آیت مکرر ہے مگر ایسا نہیں ہے پہلی بار آسمان کے متعلق ہے اور یہاں زمین کے متعلق ہے۔

"اِذا" کی جزاء

اِذا شرطیہ کی جزاء محذوف ہے، یعنی جب آسمان و زمین نے اللہ تعالیٰ کی ایسی فرماں برداری اختیار کی، تو اے انسان تجھ پر صریح الزام و حجت قائم کی جائے گی کہ تُو کس وجہ سے روحانی جسمانی ہر اعتبار سے اللہ کا نافرمان ہو گیا اور ساری عمر اللہ کے حکم کی مخالفت میں گذار دی، چنانچہ الزام حجت کو بیان کرنے کے لئے واضح طور پر فرماتے ہیں:

يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا

اے آدمی تجھ کو تکلیف اُٹھانی ہے اپنے رب تک پہنچنے میں سہہ سہہ کر

یعنی اے انسان تو آسمان سے بڑا ہے نہ زمین سے زیادہ سخت کہ اپنے پروردگار کی اطاعت نہ کرے، اور یہ بھی ہے کہ تجھے جو حکم دیا گیا ہے وہ آسان ہے اور زمین و آسمان کو جو حکم دیا گیا وہ نہایت ہی مشکل ہے مگر باوجود اس کے انہوں نے حکم بجالانے میں روگردانی نہیں کی، اور نہ ہی زمین و آسمان کو کسی عذاب یا ثواب کی توقع ہے لیکن تمہیں جو حکم دیا گیا ہے اس کے نتیجے میں عذاب یا ثواب بھی متوقع ہے کیونکہ "اِنک کادح" یعنی تُو تو اپنے پروردگار کا قرب حاصل کرنے کے لئے کمال مشقت سے

کوشش کرنے والا ہے، اس لئے کہ تجھے وصول کی استعداد بھی عطا فرمائی ہے اور دماغ میں بھی اس کی ڈھن رکھی ہے، مگر آسمان وزمین میں وصول کی استعداد ہے اور نہ اس کا کچھ خیال ہی ہے۔

اور جس وصول اور بے پردہ دیدار کا تجھ سے وعدہ کیا گیا یہ محض خیالی نہیں ہے جس پر تو دنیا میں خوش تھا بلکہ واقع میں ایسا ہونے والا ہے چنانچہ فرمایا:

فَمُلٰقِيْهِ ۝

پھر اُس سے ملنا ہے

یعنی اپنے رب سے بغیر خیال وادراک کے پردے اور بغیر نمونہ ومثال کے پردے کے ملاقات کرے گا، لہٰذا اللہ کے حکم کی تابعداری کی جتنی تجھے ضرورت ہے اتنی کسی اور مخلوق کو نہیں ہے تاکہ اس دن عین ملاقات وحضوری کے وقت تجھے شرمندگی نہ اٹھانی پڑے، کیونکہ قرب کے مراتب حاصل کرنے کے لئے تُو نے جیسی بھی کوشش کی ہوگی کمزور یا طاقتور وہ سب ظاہر ہو جائے گی، اور یہ کوشش کا ظہور جس طرح ہوگا اس کو بیان فرماتے ہیں:

فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ۝

سو جس کو ملا اعمالنامہ اُس کا داہنے ہاتھ میں

یعنی پروردگار کی ملاقات کے وقت جس کو اعمالنامہ دیا جائے گا کہ جس میں اس کی بہترین کوشش، اللہ کے احکام کی فرماں برداری لکھی ہوگی تاکہ جس بات کے شوق میں حکم بجالایا تھا اس کی خوشی ولذت اسے حاصل ہو اور یہ جان لے کہ میری کوشش ٹھکانے لگی ہے۔

اور اعمالنامہ دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا کہ یہ نجات ورضامندی کی علامت ہے، کیونکہ اکثر دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر غالب ہوتا ہے، اس نے بھی اللہ کے حکم کی اطاعت کی اور نفس کی خواہشوں پر غالب آیا، ایک عظیم قوت حاصل کی، اور نیکیاں برائیوں پر غالب ہوگئیں۔

فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا ۝

تو اُس سے حساب لیں گے آسان حساب

اعمالنامے سیدھے ہاتھ میں دینے کے بعد ان بُرے کاموں کا آسان حساب لیا جائے گا جو نیکیوں

کے مقابلے میں مغلوب اور تھوڑے سے رہ گئے تھے۔

حدیث میں آیا ہے حضرت اُم المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا یا رسول اللہ! ''حساب یسیر'' کیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حساب یسیر یہ ہے کہ بندے کو اس کا نامۂ اعمال دکھایا جائے گا اور آواز آئے گی اے میرے مسلمان بندے تُو نے میری جو بندگی کی میں نے قبول کی اور جو غلطیاں تجھ سے ہوئیں بخش دیں، کسی بات پر لے دے اور مناقشہ نہ ہوگا کہ یہ کیوں کیا؟ یا اس طرح کیوں نہ کیا؟

فرمایا ''فاما من نوقش فی الحساب عذب'' جس سے پوچھ گچھ اور مناقشہ شروع ہوگیا وہ مصیبت میں پڑ گیا۔ اس لئے کہ کوئی شخص گناہ کا کوئی عذر رکھتا ہے نہ گناہ سے خالی ہے۔

یوں بھی روایت ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس سے حساب لیا جائے گا وہ تو عذاب میں گرفتار ہو جائے گا اس پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کیا اللہ تعالیٰ نے یوں نہیں فرمایا ''فسوف یحاسب حسابًا یسیرًا'' اس آیت سے تو معلوم ہوتا ہے مومن لوگ حساب کے بعد نجات پا جائیں گے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ محض اعمال کا دکھانا ہوگا (پیشی ہوگی) کہ تم نے یہ کیا ہم نے معاف کیا، فلاں کام نہیں کیا ہم نے درگزر کیا، میری مراد حساب سے مکمل جانچ پڑتال، تحقیق و تفتیش ہے سو یہ معاملہ جس سے ہوگیا وہ تو ہلاک ہوگیا۔

وَ یَنۡقَلِبُ اِلٰۤی اَهۡلِهٖ مَسۡرُوۡرًا ۝

اور پھر کر آئے گا اپنے لوگوں کے پاس خوش ہو کر

خوش خوش اپنے گھر والوں کی طرف لوٹے گا، نہ عذاب کا ڈر رہا نہ غصے یا جھڑکی کا خوف و شرمندگی، نجات مل جانے کی خوشی جب اپنے گھر والوں کے ساتھ ملنے کی خوشی کے ساتھ جمع ہوگی تو اس کو راحت و لذت، سرور و فرحت کی ایسی عجیب کیفیت حاصل ہوگی کہ جس کے مقابلے میں کوئی راحت و خوشی نہیں ہے۔

اھلہ: ۔اہلِ خانہ سے مراد ہے جنت کی حوریں جو اس کو ملیں گی اور دنیا کی بیویاں جو جنتی ہوں گی اور اس کے دیگر احباب و رشتہ دار جو اسکے حساب و کتاب کی اطلاع پانے کیلئے حشر میں منتظر کھڑے ہوں گے۔

بندے پر دو غم مسلط نہیں ہوتے

یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا اللہ تعالیٰ اپنے بندے میں دو غم جمع نہیں کرتا، دنیا میں جس نے دین کا غم کھایا وہ اس دن خوش ہوگا۔

سَوْفَ لانے میں نکتہ

"سَوْفَ" تراخی اور مہلت کے لئے آتا ہے، یہاں "سوف" لا کر اس طرف اشارہ فرمایا کہ نیک بندے کو سب سے پہلے دائیں ہاتھ میں اعمالنامہ دے کر خوش کریں گے، پھر کافی عرصہ کے بعد اس کو برائیوں پر بھی مطلع فرمائیں گے تاکہ شروع میں ہی برائیوں سے مطلع ہو کر شرمندہ و پشیمان نہ ہو۔

وَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ ۝

اور جس کو ملا اُس کا اعمالنامہ پیچھے سے

الٹے ہاتھ میں اعمالنامہ دینا ہلاکت و بربادی کی علامت ہے (اور نکتہ اس میں یہ ہے کہ) الٹا ہاتھ چونکہ سیدھے ہاتھ کے مقابلے میں کمزور ہوتا ہے سو اس نے بھی زندگی میں ضعیف جانب یعنی خواہشاتِ نفسانی کی جانب کو قوی جانب پر مقدم کیا تھا یعنی اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری قوی جانب ہے اس نے اس جانب کو نظر انداز کیا اور ضعیف پہلو کو اہمیت دے کر قوی کیا اور قوی کو ضعیف کیا گویا اس نے معاملہ اُلٹا کیا اسی لئے اس کو بھی اعمالنامہ الٹے ہاتھ میں دیا گیا۔ (گویا اس کو الٹے ہاتھ میں اعمالنامہ تھمانا اس کے دنیا میں طرز عمل کی تمثیل ہے)

اور اعمالنامہ سامنے کی طرف سے اس کو نہیں دیا جائے گا چونکہ اس کے ہاتھ پیچھے بندے ہوئے ہوں گے اس لئے پیچھے سے اس کو اعمالنامہ دیا جائے گا۔

فَسَوْفَ یَدْعُوْا ثُبُوْرًا ۝

سو وہ پکارے گا موت موت

یعنی آرزو کرے گا کاش موت آجائے اور میں اپنے برے کاموں کی سزا سے نجات پاسکوں۔

"سوف" میں نکتہ

"سوف" تاخیر پر دلالت کرتا ہے یہاں اس کو اس لئے لائے ہیں کہ فوراً اس کو اپنی بربادی کا یقین

نہیں ہوگا بلکہ اپنی زندگی کی تمام کارگذاری کا تفصیل کے ساتھ جائزہ، جانچ پڑتال اور تحقیق کے بعد ہوگا، پہلے مرحلے میں تو جب اچھے بُرے ملے جُلے اعمال دیکھے گا تو وہ سوچنے لگے گا شاید میرے نیک اعمال برائیوں پر غالب آ جائیں اور میری نجات ہو جائے، سو اعمال کا تفصیل کے ساتھ جائزہ و مطالعہ اس کے لئے مہلت اور کچھ وقفہ درکار ہے اسی لئے ''سوف'' لائے ہیں۔

سورۂ حاقہ کی آیت اور سورۂ انشقاق کی آیت کے درمیان تعارض نہیں ہے

سورۂ حاقہ اور بعض دوسری سورتوں میں جو یہ بات بیان کی گئی ہے کہ بعض لوگوں کو اعمالنامہ دائیں ہاتھ میں اور بعض کو بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا، یہ اس کے منافی نہیں کہ بائیں ہاتھ میں پیٹھ پیچھے سے دیا جائے گا جیسے اس آیت میں ہے، کیونکہ بائیں ہاتھ میں اعمالنامہ دینے کی صورت یہی ہوگی کہ پیٹھ پیچھے سے دیا جائے گا۔

اعمالنامے حاصل کرنے کی کیفیت کے متعلق بعض مفسرین پر ردّ

بعض مفسرین نے بیان کیا ہے کہ اس دن لوگ تین طرح کے ہوں گے۔

(۱) نجات پانے والے، ان کو دائیں ہاتھ میں اعمالنامے دیئے جائیں گے۔

(۲) دائمی ہلاکت والے، ان کو اُلٹے ہاتھ میں اعمالنامے دیئے جائیں گے۔

(۳) وہ لوگ جن کو عذاب کے بعد نجات ہوگی، ان کو سیدھے ہاتھ میں پیٹھ پیچھے سے اعمالنامے دیئے جائیں گے، یا ابدی ہلاکت والوں کو پیٹھ پیچھے سے بائیں ہاتھ میں اعمالنامے دیئے جائیں گے اور عذاب کے بعد نجات پانے والوں کو اُلٹے ہاتھ میں سامنے کی طرف سے اعمالنامے دیئے جائیں گے۔

یہ قول قرآن وسنت کے مطابق نہیں محض احتمال ہے، اس لئے کہ اہل شمال (بائیں ہاتھ والے) اور اہلِ ظہر (پیٹھ پیچھے والے) کے بارے میں جو وعیدیں آئی ہیں وہ قریب قریب ایک ہی طرح کی ہیں وہ ان میں سے کسی کے حق میں نجات یا خلاصی کی نشاندہی نہیں کرتیں (جس سے معلوم ہوا کہ یہ دونوں الگ الگ قسمیں نہیں ایک ہی قسم کے لوگوں کو دو مختلف ناموں سے ذکر کیا گیا ہے)

اس کے علاوہ بعض احادیث میں اعمالنامے دینے کی صورت کی اسی طرح تصریح آئی ہے جیسے آیت کے ذیل میں بیان ہوئی ہے۔ واللہ اعلم

جب یہ بات بیان فرمادی کہ پیٹھ پیچھے اعمالنامہ دیا جانا دوزخی ہونے کی علامت ہے جب وہ شخص یہ جان لے گا تو فریاد وشور مچائے گا، اپنی ہلاکت وموت کو پکارے گا، اب یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ اس کی اس جزع فزع، بے تابی و بے قراری، اور اضطراب و پریشانی پر ہی بس نہ ہوگی بلکہ جس چیز سے وہ ڈرتا تھا اس میں اس کو گرفتار کیا جائے گا چنانچہ فرمایا:

وَيَصْلٰى سَعِيْرًا ۝ اِنَّهٗ كَانَ فِيْٓ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ۝

اور پڑے گا آگ میں وہ رہا تھا اپنے گھر میں بے غم

دنیا میں اپنے گھر والوں کے درمیان خوش وخرم اور بے غم تھا، نہ دنیا کا غم تھا نہ آخرت کا، کفر و گناہ سے ہی ڈر تھا نہ اللہ کی رضامندی کی طرف کچھ توجہ تھی۔

یہاں سے معلوم ہوا کہ دنیا کی خوشی کے پیچھے آخرت کا غم چھپا ہے، چنانچہ دوسری جگہ فرمایا "فلیضحکوا قلیلاً و لیبکوا کثیرا" جس نے دنیا میں آخرت کا غم کھایا وہ ہمیشہ کی خوشی ومسرت پائے گا۔

ہر خوشی مذموم نہیں

یہاں یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ دنیا میں وہی خوشی مذموم ہے جو غفلت، خوشحالی وآسودگی سے پیدا ہو ورنہ جو خوشی اللہ کے حکم پر راضی رہنے کی وجہ سے حاصل ہو یا دین کے مراتب عالیہ حاصل ہونے کی وجہ سے حاصل ہو وہ سراسر محمود و نافع ہے چنانچہ سورۂ یونس میں فرمایا: "قل بفضل اللہ و برحمتہ فبذلک فلیفرحوا" اور جس خوشی کو سورۂ انشقاق میں (محل ذم) میں بیان فرمایا ہے اس سے یہی خوشی مراد ہے جو غفلت کی وجہ سے ہو چنانچہ صاف فرمادیا:

اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ يَّحُوْرَ ۝

اُس نے خیال کیا تھا کہ پھر کر نہ جائے گا

وہ یہ گمان کرتا تھا کہ دوبارہ عالم ارواح کی طرف لوٹایا نہ جائے گا، اور اپنے اعمال کا حساب نہیں

دے گا، اسلئے کہ اگر عین خوشی کے وقت آخرت کا غم یاد آ جائے، یہ یقین ہو جائے کہ روح عالم ارواح کی طرف جائے گی اور قیامت کے دن اپنے تمام اعمال کا بدلہ پانا ہے تو ساری خوشی کرکری ہو جاتی ہے اسلئے کہا گیا ہے۔

مرا در منزلِ جاناں چہ امن و عیش چوں ہر دم
جرس فریاد میدارد کہ بر بندید محملہا

یہی مضمون اس شعر میں بھی ہے۔

عشرتِ امروز بے اندیشۂ فردا خوش است
فکرِ شنبہ تلخ دارد جمعۂ اطفال را

آگے حشر نشر، جزاوسزا، حساب کو ثابت کرنے اور اس کے گمان کی تردید کرنے کے لئے فرماتے ہیں:

بَلٰی ج

کیوں نہیں

ایسا نہیں، جیسا اس نے گمان کیا ہے بلکہ اس کی روح کا عالم ارواح کی طرف لوٹنا، پھر وہاں سے حشر و نشر کے عالم میں پہنچنا، پھر وہاں سے حساب کتاب اور وزنِ اعمال کے مقام تک پہنچنا پھر وہاں سے جزاوسزا کے مقام تک جو جنت ودوزخ کی صورت میں ہے پہنچنا ضروری ہے، اور دلیل اس کی یہ ہے:

اِنَّ رَبَّهٗ كَانَ بِهٖ بَصِيْرًا ۝

اُس کا رب اُس کو دیکھتا تھا

اس کی پیدائش کی ابتداء سے لے کر موت کی انتہا تک اس کا سب کچھ پروردگار کی نظر میں ہے، روح اس کی کہاں سے آئی، کس کس چیز سے مل کر بنا، پھر عقائد واعمال کیسے رہے، دل میں کیا چیز جمی رہی، زبان سے کیا نکلا، ہاتھوں سے کیا سرزد ہوا پھر موت کے بعد روح کہاں گئی اور جسم کہاں کہاں بکھرا ہے، ان سب باتوں سے جو واقف ہے وہ اس کو مہمل و بے کار نہیں چھوڑے گا، اس کی روح کو بدن کے اجزا کے ساتھ جمع کرے گا اور پھر اس کے کئے کا اس کو پورا بدلہ دے گا، لہٰذا یہ گمان کہ دوبارہ لوٹنا نہیں محض غلط ہے، اس کی تردید وابطال کے لئے قسم کھانے کی حاجت نہیں، تاہم اگر کسی کو ان عجیب حالات

کے سننے سے کہ موت کے بعد دوبارہ زندگی ہوگی اور ایسے ایسے واقعات رونما ہوں گے کچھ شک ہو تو (بقسم کہتا ہوں کہ شک کی گنجائش نہیں ایسا ضرور ہوگا چنانچہ فرمایا)

فَلَآ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ۝

سو قسم کھاتا ہوں شام کی سرخی کی

شفق کی تعریف، ائمہ کرام کا اختلاف اور مفتیٰ بہ قول

شفق نام ہے اس سرخی کا جو آفتاب کے غروب ہونے کے بعد مغربی افق پر ظاہر ہوتی ہے، جب تک یہ سرخی باقی رہے اس وقت تک مغرب کی نماز کا وقت ہے، چنانچہ امام شافعی رحمہ اللہ اور صاحبین رحمہما اللہ کا یہی مذہب ہے اور اسی پر فتویٰ ہے۔

حضرت امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ ''شفق'' اس سفیدی کا نام ہے جو اس سرخی کے بعد مغربی افق پر نمودار ہوتی ہے اور دیر تک رہتی ہے لیکن صحیح بات یہ ہے کہ امام صاحبؒ نے اس قول سے رجوع فرمالیا تھا۔

نیز عرب کے لوگ اشعار میں اور محاروں میں کسی چیز کی سرخی کو تشبیہ دینے کے لئے شفق کو استعمال کرتے ہیں یہ اس بات کی صریح دلیل ہے کہ شفق سے مراد سرخی ہے نہ کہ سفیدی۔

سفیدی کے شفق ہونے پر ایک استدلال اور اس کا جواب

اور وہ بات جو بعض علماء نے کہی ہے کہ دن کی ابتداء ہونے میں مشرقی افق کی سرخی (صبح کاذب) روزہ، نماز کا وقت ہونے کے طور پر معتبر نہیں ہے، بلکہ اس باب میں وہ سفیدی معتبر مانی گئی ہے جس کو صبح صادق کہتے ہیں، لہٰذا مناسب ہے کہ نماز مغرب کا وقت نمازِ فجر کے وقت کے برعکس ہو کہ اس کی ابتداء غروبِ آفتاب سے ہو اور انتہاء مغربی افق کی سفیدی کے غائب ہونے پر ہو، جس طرح نمازِ فجر کے وقت کی ابتداء مشرقی افق کی سفیدی سے ہوتی ہے اور انتہاء طلوع آفتاب پر ہوتی ہے۔

جواب اس کا یہ ہے کہ فجر کا وقت شب کی تاریکی وظلمت سے نور و روشنی کے ظہور کا وقت ہے، اور اس نور کے ظہور کی ابتداء اس سفیدی کے نمودار ہونے سے ہوتی ہے جس کو صبح صادق کہتے ہیں جو ہر خاص و عام کو محسوس ہوتی ہے اور اس سے پہلے شب کی تاریکی میں گم تھی، اور مغرب کا وقت روشنی ونور

کے بعد تاریکی پھیلنے کا وقت ہے سو غربی افق کی سرخی غائب ہو جانے کے بعد تاریکی ہر خاص و عام کو محسوس ہو جاتی ہے اور سورج کے باقی ماندہ اثرات بالکلیہ زائل ہو جاتے ہیں۔

لہٰذا نمازِ مغرب کے وقت کی انتہاء سرخی کے غائب ہونے پر ٹھہرا لینا اور فجر کے وقت کی ابتداء سفیدی کے آنے پر متعین کر لینا ہی مناسب و صحیح ہے۔

اور دونوں وقتوں کے درمیان فرق کی وجہ ظلمت کا نور پر مقدم ہونا یا نور کا ظلمت پر مقدم ہونا ہے، اس لئے کہ حکمت و فلسفہ کا یہ قاعدہ ہے کہ اُحد الضدین کے ساتھ جب حاسہ منفعل (متاثر) ہو جاتا ہے تو اس انفعال کی وجہ سے مقابل ضد کا احساس بہت تیز اور قوی ہو جاتا ہے (روشنی دیکھتے ہی تاریکی کی معرفت اور اس کا زوال معلوم ہو جاتا ہے و بالعکس) اور اس کی مقابل ضد کے ضعف کا اثر محسوس ہوتا ہے۔ واللہ اعلم

وَالَّيْلِ وَ مَا وَسَقَ ۝

اور رات کی اور جو چیزیں اُس میں سمٹ آتی ہیں

جانداروں کی یہ عادت ہے کہ دن کو ہر ایک تلاش معاش کے سلسلے میں نکل کھڑا ہوتا ہے اور رات کو سب اقرباء و متعلقین ایک گھر اور جگہ میں جمع ہو جاتے ہیں وہیں رات گذارتے ہیں اسی وجہ سے رات کو جامع المتفرقین (بکھرے ہوؤں کو جمع کرنے والی) کہا جاتا ہے۔

اسی طرح اچھے یا بُرے کام جو خفیہ اور پوشیدہ کئے جاتے ہیں جیسے ذکر اللہ کے حلقے، تراویح کی جماعتیں، رقص و سرود کی محفلیں، شراب و کباب کی مجالس یہ اکثر رات کو ہی ہوتی ہیں، گویا رات ان کو جمع کرتی ہے۔

وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ۝

اور چاند کی جب پورا بھر جائے

یعنی جب چاند کا نور بھرپور ہو جاتا ہے (چودھویں کو) شام سے لے کر صبح تک رات کی تاریکی کو دور کرتا ہے، (اور تاریکی کے اجنبی اور) بُرے حجاب کو اٹھاتا ہے۔

موت کے بعد آدمی کی تین حالتیں

یہ تین چیزیں، شفق، تاریک رات اور روشن چاند یہ ان تین حالتوں کا نمونہ ہیں جو انسان کو موت

کے بعد پیش آتی ہیں، موت کی مثال تو گویا آفتابِ زندگی کی ہوئی جو غروب ہوا، اس کے بعد تین حالتیں درپیش ہوتی ہیں۔

پہلی حالت:۔ سب سے پہلی حالت روح کے بدن سے جدا ہوتے ہی پیش آتی ہے کہ ابھی سابقہ زندگی کے ساتھ روح کا تعلق، اپنے دوست احباب کے ساتھ الفت کے احساسات باقی ہیں یہ حالت گویا دنیا کی زندگی اور عالمِ قبر کے استغراق کے درمیان برزخ ہے کچھ اِدھر کا تعلق بھی ہے اور کچھ اُدھر کا بھی، اور یہ حالت بعینہٖ شفق کے وقت کی طرح ہے، کہ شفق کا وقت بھی ایسا ہے کہ ابھی تک دن کا کاروبار کسی حد تک جاری رہتا ہے، لوگ آجا رہے ہوتے ہیں، تمام جاندار بیدار ہوتے ہیں اور لوگ دن کے ادھورے کاموں کے پورا کرنے میں مشغول ہوتے ہیں، (رات کی خاموشی کا استغراق ابھی تک شروع نہیں ہوا ہوتا)

یہ حالت بھی انکشاف (احوال آخرت) کی حالت ہے اور نیکیوں برائیوں کی برزخی جزاء کی حالت ہے۔

ایصالِ ثواب کا اہم وقت

اس وقت مُردوں کو زندوں کی مدد (صدقات خیرات) جلد پہنچتی ہے اور وہ اس مدد کے منتظر رہتے ہیں، اور یوں سمجھتے ہیں کہ گویا وہ ابھی زندہ ہیں، چنانچہ حدیث میں قبر کے حالات کے بارے میں آیا ہے کہ مسلمان وہاں کہتا ہے "دعونی أصلی" چھوڑیئے مجھے نماز پڑھنے دیجئے۔

اور یہ بھی آتا ہے کہ اس حال میں مُردے کی مثال ڈوبنے والے کی ہے جو فریاد رسی کے انتظار میں ہاتھ پاؤں مارتا رہتا ہے، صدقات، دعائیں، فاتحہ خوانی اس وقت اس کے بہت کام آتی ہیں۔

اسی وجہ سے بہت سے لوگ ایک سال تک اور خاص طور پر ایک چلّے تک ایصال ثواب کے سلسلے میں بہت کوشش کرتے ہیں، مُردے کی روح بھی موت کے قریب دنوں میں اکثر خواب میں اور عالم مثال میں زندوں کو نظر آتی ہے، اور اپنا حال بیان کرتی ہے۔

دوسری حالت:۔ دوسری حالت وہ ہے جب دنیوی تعلقات کے ساتھ لگاؤ بالکلیہ منقطع ہو جاتا ہے، اور اپنی نیکیوں اور برائیوں کی کیفیات کے ملاحظہ سے انسان کو ایک استغراقِ عظیم طاری ہوتا ہے، اور ادراک وتصرف کی ساری قوتیں اِس عالَم سے یک لخت ٹوٹ کر اُس عالم کی طرف متوجہ ہو جاتی ہیں،

اِس جہان کا جو کچھ معنوی احساس تھا وہ معطل و بیکار ہو جاتا ہے۔

یہ حالت رات کی تاریکی طرح ہے جو شفق کے بعد یکدم ہجوم کر کے چھا جاتی ہے، لوگ محوِ خواب ہو جاتے ہیں ان کے حواس و حرکات تعطل کا شکار ہو جاتیں ہیں، جملہ مالوفات سے انسان غافل ہو جاتا ہے، لیکن ان مالوفات و مکسوبات کا تعلق ظاہری بدن سے تو منقطع ہو جاتا ہے مگر باطن میں وہ جمع ہو جاتے ہیں اور روح ان کو رنگارنگ صورتوں میں دیکھتی اور ان سے لطف اندوز ہوتی یا اذیّت محسوس کرتی ہے، یہ حالت عام مُردوں کی ہے۔

اولیاء اللہ کا مرنے کے بعد افاضہ و تصرف

بعض خاص اولیاء اللہ جن کو اللہ تعالیٰ نے محض اپنے بندوں کی ہدایت وارشاد کے لئے پیدا کیا ہوتا ہے ان کو اس حالت میں بھی عالمِ دنیا میں تصرف کا حکم ہوتا ہے اور وہ اس طرف متوجہ ہوتے ہیں، ان کے مدارک کے اندر کمال وسعت کی وجہ سے اِس طرف کی توجہ ان کے استغراق میں خلل انداز نہیں ہوتی، اور نہ ہی وہ استغراق ان کی توجہ کے لئے مانع ہوتا ہے، بہت سے لوگ اپنے باطنی کمالات انہی سے حاصل کرتے ہیں، اور مشکلات (روحانی اور باطنی) کے حل کے اسباب ان سے (باطنی طور پر) معلوم کرتے ہیں۔ اور ان کے کہنے کے مطابق چلتے ہیں۔ وہ زبان حال سے اس وقت گویا یہ کہہ رہے ہوتے ہیں ع

من آیم بجان گر تو آئی بہ تن (۱)

تیسری حالت:۔ یہ حالت حشر و نشر کے بعد ظاہر ہوگی یہ چودھویں رات کے چاند کی طرح ہے کہ جس طرح چودھویں کا چاند تاریکی کے پردوں کو چاک کر کے سب کچھ روشن کر دیتا ہے اسی طرح اس

(۱) یہاں چند باتیں سمجھ لینی چاہیں۔

ارواح اولیاء کرام کا افاضہ و تصرف کسی نص سے ثابت نہیں، اہل کشف کا قول ہے، اور کشف دلیل ظنی ہے، لہٰذا درجہ ظن میں اس کا قائل ہونا صحیح ہے، مگر کشف دوسرے کے لئے حجت نہیں اس لئے اس کا بالکل انکار بھی جائز ہے، چنانچہ بعض اکابر رحمہ اللہ سے انکار منقول ہے۔

(۲) استفاضہ کے لئے مستفیض میں بعض شرائط کا ہونا ضروری ہے، ہر ایک کے بس کا روگ نہیں۔

(۳) افاضہ و تصرف میں وہ (اولیاء) خود مختار نہیں ہوتے، ان کے بارے میں ایسا اعتقاد رکھنا شرک ہے، چنانچہ خود حضرت شاہ صاحب قدس سرہ نے سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں اس کی صراحت فرمائی ہے، اس مسئلہ کی تفصیل و تحقیق کے لئے امداد الفتاویٰ ج ۵ ص ۲۶۴/ ۱۷/۴ کی طرف مراجعت کی جائے۔ ۱۲ سفیر احمد ثاقب

حالت میں انسانوں کے سامنے نفع ونقصان، نیکی وبرائی، اور زہر وتریاق سب کچھ واضح ہو جائے گا، یہی حالت اعمال ناموں کے دینے، اچھے وبُرے اعمال کا مختلف صورتوں میں ظاہر ہونے، حساب وکتاب، وزنِ اعمال اور دیگر کاموں کی ہوگی، اس حالت کی انتہا ایک اور زندگی کی ابتداء ہے جو پہلی زندگی سے زیادہ مکمل اور بھرپور ہوگی، اس میں کبھی کوئی تغیر وتبدیلی نہیں آئے گی ہمیشہ ایک حالت پر برقرار رہے گی، چونکہ اس میں تغیر وتبدل نہیں اس لئے اس کی کوئی مثال بھی نہیں کہ یہاں قَسم کے موقعہ پر اس کی مثال بھی ذکر کی جاتی، اسی لئے ان تین حالتوں پر اکتفا کی۔ اور آگے جس مضمون کو ثابت کرنا منظور ہے اس کو ارشاد فرماتے ہیں:

لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ۝

کہ تم کو چڑھنا ہے سیڑھی پر سیڑھی

یعنی دنیا سے جانے کے بعد پہلے ایک حال میں ہوگے، اسی کو تم رجوع الی اللہ سمجھوگے، اس کے بعد پھر ایک اور حالت آجائے گی تم سمجھوگے کہ اللہ کی طرف رجوع کی یہی حالت ہے اس سے پہلی حالت اس کی تمہید تھی، علیٰ ھذا القیاس، یہاں تک کہ جنت یا جہنم میں جا ٹھہروگے اور تمہارا سفر مکمل ہو جائے گا۔ اس کے بعد سدا وہیں رہوگے۔

رکوب وطبق میں نکتہ

ان حالتوں کا گذرنا چونکہ سفر کی منازل ومراحل کے طے کرنے کے مشابہ تھا اس لئے ''رکوب'' کا لفظ (لترکبن رکوب سے ہے) استعمال فرمایا جس کا معنی سوار ہونے کا آتا ہے۔

اور عالم دنیا سے عالم آخرت کی طرف انتقال کی حرکت، صعودی ہے کہ عالم خاکی کی پستیوں سے عالمِ بالا کی رفعتوں کی طرف جاتے ہیں اس لئے اس کی حالتوں کو ''طبقًا عن طبق'' ارشاد فرمایا۔

''طبقًا عن طبق'' تہہ بتہہ چیز کو کہتے ہیں، آسمان کے سات طبق تو سب کو معلوم ہی ہیں، عمارت کے درجات ومنازل کو بھی عرف میں طبقے ہی کہتے ہیں۔

اور ایک طبقے سے دوسرے طبقے کی طرف ان انتقالات کے دلائل ہر خاص وعام، ہر دن، ہر مہینے، اور ہر سال اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے تو کافروں کے ایمان نہ لانے اور موت کے بعد ایک طبقے سے

دوسرے طبقے کی طرف انتقال کے وقوع پر یقین نہ لانے پر بطور تعجب کے فرماتے ہیں:

فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ○

پھر کیا ہوا ہے اُن کو جو یقین نہیں لاتے

یعنی اتنی واضح اور روشن مثالوں کے باوجود یہ ایمان کیوں نہیں لاتے وہ اس کا یقین کیوں نہیں کرتے کہ مرنے کے بعد ان کو سفر درپیش ہوگا اور اس سفر کی فکر، اس کے لئے توشہ اور بندوبست کیوں نہیں کر لیتے۔

طبقًا عن طبق میں بعض مفسرین کا ضعیف قول

بعض مفسرین نے طبقاً عن طبقٍ کو دوسرے معنوں پر محمول کیا ہے جو اس مقام سے کچھ مناسبت نہیں رکھتے اگرچہ اپنی جگہ وہ معنی بالکل درست ہیں، وہ یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کو خطاب کیا جا رہا ہے، اور توبیخ و تشنیع کے طور پر کہا جا رہا ہے کہ ضرور تم گناہوں کے ایک طبقے کے بعد دوسرے طبقے پر سوار ہوگے۔ جسطرح پہلی اُمتوں نے صغیرہ وکبیرہ گناہ اور طرح طرح کے الحاد و بدعات اختیار کی تھیں ایسے ہی تم بھی کرو گے۔ چنانچہ صحیح حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم ضرور پہلی اُمتوں کی پیروی کرو گے، "شبرًا ابشبرٍ و زراعًا بذراع الخ" یعنی گذشتہ امتوں میں سے اگر کوئی بالشت بھر راہِ حق سے ہٹا تھا تو تم بھی بالشت بھر ہٹو گے، اگر ان میں سے کوئی گز بھر راہِ حق سے ہٹا تھا تو تم بھی ایسا ہی کرو گے، یہاں تک کہ اگر گذشتہ لوگوں میں سے کسی نے اپنی ماں سے زنا کیا ہوگا تو تم میں سے بھی کوئی بد بخت ایسا ہوگا جو ایسا کرے گا، اور پہلی امتوں میں سے اگر کوئی گوہ کے بل میں گھسا ہوگا تو تم میں سے بھی کوئی ایسا کرے گا۔

یہ بھی صحیح حدیث میں آتا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہارا حال بھی حقوق اللہ، حقوق العباد ادا نہ کرنے، اللہ کے پیغمبر، اس کی کتاب اور قیامت کو جھٹلانے میں پہلی امتوں کی طرح ہے تم اس میں اتنے برابر ہو جیسے ایک جوتی دوسری جوتی کے برابر ہوتی ہے جو بھر ان میں فرق نہیں ہوتا۔

بلکہ تم بہت سے وہ گناہ بھی کرو گے جو پہلی امتوں نے نہیں کئے جیسے آزاد لوگوں کا بیچنا، اس کی قیمت کھانا، شعر بازی کرنا، اور عورتوں کا مساحقہ کرنا۔

انہی گناہوں میں سے پیغمبر کی اولاد کو قتل کرنا بھی ہے کہ جس پیغمبر پر ایمان لائے اسی کی اولاد کو قتل کرتے ہیں، ایسی بات پہلی کسی امت نے نہیں کی کافروں نے ضرور پیغمبروں کو قتل کیا ہے مگر حالت کفر میں، ایسا نہیں ہوا کہ ایمان لانے کے بعد ایسا کام کریں۔

''لترکبن'' میں دوسری قراءت اور بعض مفسرین کا قول

بعض قراء نے ''لترکبن'' کی باء پر زبر پڑھی ہے (یعنی واحد مذکر حاضر کا صیغہ) اس صورت میں بعض مفسرین نے کہا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے اور مراد معراج کا وعدہ ہے کہ آپ ضرور بُراق پر سوار ہو کر آسمان کے سات طبقات پر یکے بعد دیگرے گذریں گے، لیکن یہ معنی بھی آیات کے سیاق وسباق سے بالکل مناسبت نہیں رکھتے، بلکہ باء کے زبر کی صورت میں بھی خطاب بنی آدم کے ہر فرد کو ہے جیسا کہ باء کے پیش (جمع کا صیغہ) کی صورت میں مجموعی طور پر سب کو خطاب تھا، الغرض ظاہر وہی معنی ہیں جو پہلے بیان ہوئے۔

اور مقصد کافروں کو ڈانٹنا اور تنبیہ کرنا ہے کہ آخرت کے سفر کی واضح نشانیاں جانتے ہوئے بھی اس سفر کا انکار کرتے ہیں اور وہاں پیش آنے والے واقعات پر ایمان نہیں لاتے۔

اگر وہ اپنی عقل سے آخرت کے معاملات کو نہیں سمجھ سکتے تو ان کے لئے ضروری تھا کہ قرآن کے بیان سے فائدہ اٹھاتے اور اس کو غور وفکر سے سنتے، لیکن آخرت کے وہ اس قدر منکر ہیں کہ قرآن میں بھی ان مضامین کو سُن کر فرمانبرداری نہیں کرتے، چنانچہ فرمایا:

وَاِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْاٰنُ لَا يَسْجُدُوْنَ ۝

اور جب پڑھیے اُن کے پاس قرآن وہ سجدہ نہیں کرتے

قرآن جس کی عبارت سراسر اعجاز ہے جب ان پر پڑھا جاتا ہے تو حیرت زدہ ہو جاتے ہیں مگر عاجزی اور تذلل اختیار نہیں کرتے جب قرآن سُن کر مسلمان عاجزی سے سجدے میں گر پڑتے ہیں تو اس وقت یہ لوگ سجدہ نہیں کرتے، حالانکہ جس اللہ نے ایسا فصیح وبلیغ کلام اتارا کہ کوئی ایک سورت بھی اس جیسی نہیں بنا سکتا اس اللہ کے سامنے سجدہ کرنا کسی مذہب میں منع نہیں۔

اور صرف نافرمانی اور سجدہ نہ کرنے پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ:

بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُكَذِّبُوْنَ ۝

اوپر سے اور یہ کہ منکر جھٹلاتے ہیں

اگر چہ زبان سے انکار نہیں کرتے مگر اللہ تعالیٰ ان کے دل میں چھپے انکار کو بھی بخوبی جانتا ہے چنانچہ فرمایا:

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُوْعُوْنَ ۝

اور اللہ خوب جانتا ہے جو اندر بھر رکھتے ہیں

یعنی تکذیب و انکار کے علاوہ جو کچھ ان کے باطن میں ہے مثلاً اللہ تعالیٰ کے احکام کی مخالفت و نافرمانی دنیا کی زندگی پر خوشی و شادمانی یہ کہ آخرت کا سفر ہمیں پیش نہیں آئے گا، اور گناہوں، شہواتِ نفسانی کی محبت پیغمبر علیہ السلام کے خلاف مکر و حیلے کے خیالات سے ان کے دل جس طرح لبریز ہیں وہ اللہ تعالیٰ سے پوشیدہ نہیں ہے۔

''یوعون'' کے لفظ میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ یہ نادان و کوتاہ اندیش لوگ ان قبیح و بدترین چیزوں کو بڑی احتیاط کے ساتھ دل کے برتن میں محفوظ کر رہے ہیں لیکن جب یہ ڈسنے والی چیزیں اس برتن سے ظاہر ہوں گی تب ان کو پتہ چلے گا کہ انہوں نے کتنی ٹھوکر کھائی اور رات کی تاریکی میں سیاہ ناگ کو پھولوں کا گجرہ سمجھ کر گلے میں ڈالا تھا۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

بوقت صبح شود ہمچو روز معلومت

کہ باکہ باختۂ عشق درشب دیجور

یہ جاہل جن برائیوں کو نیکی سمجھ کر زر و جواہر کی طرح آئندہ کے نفع کے لئے مٹی تانبے کے برتن کی بجائے دل کے برتن میں رکھتے ہیں تو آپ بھی انکے اس باطل اعتقاد کے موافق ان سے طنز کی بات کریں:

فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝

سو خوشی سنادی اُن کو عذاب دردناک کی

یعنی ان کی دنیاوی خوشی و مسرت کے مقابلے میں آخرت میں دکھ دینے والے عذاب کی خوش خبری دیں، خوشخبری کا لفظ اس جگہ طنز کے طور پر لایا گیا ہے، اور اس انداز سے ڈرانا اور خوف دلانا مقصود ہے۔

اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ○

مگر جولوگ کہ یقین لائے اور کام کیئے بھلے اُن کے لئے ثواب ہے بے انتہا

یعنی سب لوگوں کو عذابِ الیم کی بشارت دیجئے سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے ایمان لایا، نیک اعمال کیئے، اور اپنے نیک اعمال کی بدولت انہوں نے گناہوں کو مٹا ڈالا، سو ایسے لوگوں کے لئے تو ہمیشہ رہنے والا اجر ہے، جو کبھی ختم نہیں ہوگا۔

اگرچہ ان کا ایمان نیند وغیرہ کی حالت میں منقطع ہو جاتا تھا، نیک اعمال بھی بیماری، سفر، اور موت کے بعد منقطع ہو گئے مسلسل نہیں رہے لیکن اس کے باوجود اللہ کی رحمت نے اس غیر دائمی اور غیر مسلسل ایمان وعمل کو دائمی، نہ ختم ہونے والا قرار دیا ہے اسی وجہ سے اس پر نہ ختم ہونے والا اجر عطا فرمایا ہے۔

سجدۂ تلاوت کے وجوب کی بحث اور ائمہ کا اختلاف

یہ سورۃ ان سورتوں میں سے ہے جن میں سجدۂ تلاوت ہے اور ''غیر ممنون'' پر سجدۂ تلاوت کیا جاتا ہے۔

امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سجدۂ تلاوت واجب ہے، اور دلیل انکی یہ ہے کہ ترکِ سجدۂ تلاوت پر وعیدیں آئی ہیں، اور جس عمل کے ترک پر وعید ہو وہ واجب ہوتا ہے۔ سنت کے ترک پر وعید نہیں آتی۔

امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سجدۂ تلاوت سنت ہے، اور اس سورت میں کفار کے سجدہ نہ کرنے پر ان پر جو عتاب و مذمت آئی ہے جس سے سجدۂ تلاوت کا وجوب معلوم ہوتا ہے اس کا وہ جواب یہ دیتے ہیں کہ اس جگہ سجدہ سے مراد سجدۂ تلاوت نہیں ہے، خضوع وانقیاد مراد ہے اور نماز کے فرض سجدے کا عزم مراد ہے (یعنی کفار خضوع اختیار نہیں کرتے اور نماز نہیں ادا کرتے)

لیکن یہ جواب مخدوش ہے اس لئے کہ اگر یہی مراد ہوتی تو اس جگہ سجدۂ تلاوت مسنون کیوں ہوتا (جیسا کہ آپ بھی کہتے ہیں) اور صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عشاء کی نماز میں اس سورت کی قراءت کی اور اس آیت پر سجدہ کیا اور مقتدیوں نے بھی سجدہ کیا۔

ظاہر ہے کہ کافروں کی مذمت جب سجدہ نہ کرنے کی وجہ سے ہوئی ہے تو مسلمانوں پر کفار کی مخالفت کی وجہ سے لازم ہے کہ وہ سجدہ کریں۔

آیاتِ سجدہ کا مشترک مضمون اور یہ کہ سجدۂ تلاوت توقیفی ہے قیاسی نہیں

قرآن کریم کی جتنی آیات میں سجدہ واجب ہے ان سب میں یہ بات مشترک ہے کہ یا تو آیت میں کفار کے سجدہ نہ کرنے کی مذمت ہے، یا مسلمانوں اور ملائکہ کے سجدہ کرنے پر مدح ہے، لیکن یہ ضروری نہیں کہ جس آیت میں بھی یہ مضمون ہو وہاں سجدہ واجب ہو بہت سی آیات میں یہ مضمون موجود ہے لیکن وہاں سجدہ کرنا ثابت نہیں ہے، اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ سجدے کی آیات توقیفی ہیں (موقوف ہیں ثبوت پر) قیاسی نہیں ہیں (کہ کسی علت کی وجہ سے سجدہ ہو اور وہ علت جہاں پائی جائے وہاں ضرور سجدہ کیا جائے چاہے ثبوت نہ ہو) **واللہ اعلم بحقیقۃ الحال**

الحمدللہ

مقدمہ سورۃ البروج

سورۂ بروج مکی ہے، اس میں بائیس (۲۲) آیات، ایک سونو (۱۰۹) کلمات اور چار سوتیس (۴۳۰) حروف ہیں۔

سورۂ انشقاق کے ساتھ ربط کی وجوہ

(۱) سورۂ انشقاق کے ساتھ اس کا ربط یہ ہے کہ سورۂ انشقاق کے شروع میں آسمان کے پھٹنے کا ذکر ہے اور اِس سورت میں دنیا میں آسمان کے بارہ برابر حصوں کا ذکر ہے، ان میں کا ہر حصہ اپنا جُدا حکم و تأثیر رکھتا ہے۔

(۲) پھر اُس سورت کے آخر میں تھا " بَلِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا یُکَذِّبُوْنَ ٥ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِمَا یُوْعُوْنَ " یہی مضمون اس سورت میں اس طرح آیا ہے "بَلِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فِیْ تَکْذِیْبٍ ٥ وَّ اللّٰہُ مِنْ وَّرَآئِہِمْ مُّحِیْطٌ "

(۳) اسی طرح اُس سورت میں اہل جنت اور اہلِ جہنم کا تذکرہ تھا سو وہ تذکرہ یہاں بھی ہے، لہٰذا دونوں سوتوں میں کمال مناسبت پیدا ہوگئی۔

شانِ نزول

اس سورت کا شان نزول یہ ہے کہ ہجرت سے پہلے مکہ کے اندر کفار مسلمانوں کو ستاتے اور طرح طرح کی اذیتیں دیتے تھے، مسلمانوں نے اپنی دردناک حالت کا ذکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ گھبراؤ نہیں وہ وقت آنے والا ہے جب اللہ تعالیٰ تم کو ان کفار سے بدلہ لینے کی طاقت عطا فرمائے گا، پھر اس وقت یہ لوگ تمہارے سامنے ایسے ہوں گے جس طرح آج تم ہو، مشرکینِ مکہ نے جب یہ بات سُنی تو انہوں نے تمسخر اڑایا، ٹھٹھہ مذاق کرنے لگے کہ بھلا یہ مفلس و ذلیل بھی کبھی ہم سے بدلہ لینے کی طاقت حاصل کرسکیں گے، ہم اگر اللہ کے نزدیک عزت والے نہ ہوتے تو ہم کو ان پر اللہ غالب کیوں کرتا، سو ہمارے نصیب میں ہی عزت و سرفرازی اور غلبہ وقوت ہے، اور ان کے نصیب میں دائمی ذلت وخواری ہے۔

مشرکین کے جواب میں یہ سورت نازل ہوئی اور اس کے شروع میں آسمان کی قسم یوں کھائی کہ وہ

آسمان جو بروج والا ہے، ہر بُرج دراصل اس جہان اور جہان والوں کے لئے تبدیلیوں اور انقلابات کا سبب ہے، بہت سی چیزیں ایک بُرج کی تاثیر سے عزت والی ہوتی ہیں وہی چیز دوسرے بُرج کی تاثیر سے ذلیل و بے قدر ہو جاتی ہے جیسے گرم لباس و پوشاک گرمیوں میں اور ٹھنڈا پانی اور برف جاڑوں میں ذلیل و بے قدر ہو جاتا ہے، اشارہ اس طرف کرنا ہے کہ ہر سال موسموں کا انقلاب ان کے سامنے رونما ہوتا ہے آج ایک موسم کے لحاظ سے ایک چیز قدر و قیمت والی ہے کل وہی چیز دوسرے موسم میں بے قدر و قیمت ہو جائے گی سو یہاں دوام کسی بات کو نہیں اس لئے اپنی وقتی عزت و غلبہ پر انہیں مغرور نہ ہونا چاہئے اور نہ ہی مسلمانوں کا تمسخر اُڑائیں، اس انقلاب کو ذہن میں رکھیں اور عبرت پکڑیں۔

وجہ تسمیہ

یہاں سے معلوم ہوا کہ اس سورت کا نام سورۃ البروج اسی مناسبت سے رکھا گیا ہے، اور بتلانا یہ ہے کہ نیکی اور بدی ایک دوسرے کے تعاقب میں ہیں اور سعادت و نحوست کے ایام بدلتے رہتے ہیں، تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ آج جو لوگ مسلمانوں کو ایذاء پہنچاتے ہیں اور غلبہ و قوت رکھتے ہیں ممکن ہے ان کے یہ دن بدل جائیں اور انتقام میں پکڑے جائیں۔

اور نیک بختی اور بدبختی کے اسباب میں سے عوام کے نزدیک مشہور اسباب آسمان کے بارہ بُرج ہیں کہ ہر سال وہ ان کا مشاہدہ کرتے اور دیکھتے ہیں۔ (یعنی زمین کی سورج کے گرد سالانہ گردش کے نتیجے میں سورج آسمان کے اندر اس طرح حرکت کرتا ہوا نظر آتا ہے کہ ہر مہینہ میں وہ ایک مخصوص حصے کے اندر پہنچتا ہے اس طرح سال میں وہ بارہ حصوں کو مکمل کرتا ہے یہی بارہ حصے بارہ بُرج کہلاتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ کے مطابق سورج کی اسی گردش کے نتیجے میں دنیا پر موسموں کی تبدیلی اور دیگر انقلابات رونما ہوتے ہیں، اور یہ تبدیلیاں اور انقلابات کسی کے حق میں فائدے کا ذریعہ ہوتے ہیں اور کسی کے حق میں نقصان کا ذریعہ، اسی لئے ان بُروج کو عام طور پر نیک بختی اور بدبختی کا سبب سمجھا جاتا ہے) اسی لئے قمری مہینوں کو خوش نصیبی یا بدنصیبی کے بارے میں معتبر نہیں سمجھا گیا کہ ان کے بدلنے سے زمین میں کوئی تغیر وانقلاب رونما نہیں ہوتا بلکہ وہ خود بُرجوں کے انقلاب کو قبول کرتے ہیں اور ہر موسم میں آتے ہیں۔

تفسیر سورۃ البروج

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ۝

قسم ہے آسمان کی جس میں بُرج ہیں

ہر بُرج اچھائی، برائی، اور سعادت ونحوست (کی تاثیر میں ظاہری اعتبار سے) الگ حکم رکھتا ہے، اور ہر بُرج اپنی الگ تاثیر رکھنے کے باوجود (سورج کے چکر کی وجہ سے) بار بار لوٹ کر آتا ہے۔ کچھ عرصہ تک وہ اپنی تاثیر دکھاتا ہے پھر اس کی جگہ دوسرا بُرج ظاہر ہوجاتا ہے اور پہلے والا زائل ہوجاتا ہے، یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہتا ہے، (جس طرح ان بُروج میں سے کسی ایک ہی بُرج کی تاثیر ہمیشہ نہیں رہتی، بلکہ اس میں تغیر ہوتا رہتا ہے اسی طرح) کسی شخص کو اس گھمنڈ میں نہیں رہنا چاہئے کہ اس کی اچھی حالت اسی کے ساتھ خاص ہے کسی دوسرے کو میسر نہیں آئے گی، اس لئے کہ ہوسکتا ہے اس کی موجودہ حالت ختم ہوجائے اور اس کی بجائے بری حالت میں مبتلا ہوجائے (جیسا بُروج میں تغیر ہوتا ہے)

بارہ بُروج کی حقیقت

بُرجوں کی حقیقت یہ ہے کہ سورج کی گردش آسمان (خلاء) میں جس انداز سے ہوتی ہے اس سے (فضائے بسیط) میں ایک (فرضی بیضوی شکل کا) دائرہ بنتا ہے جس کو دائرۃ البروج کہتے ہیں سورج اس دائرے کو ایک سال کے عرصے میں مکمل طے کرتا ہے، اس دائرے کو بارہ برابر حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے اس طرح اس کے بارہ حصے بنتے ہیں ہر حصے کو بُرج کہا جاتا ہے۔ (۱)

اور ہندی، فارسی، عربی، یونانی اور فرنگی تمام ماہرینِ فلکیات اس دائرے کے بارہ حصے ہونے پر ہی متفق ہیں اس سے کم یا زیادہ کا کوئی قائل نہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ اپنے دائرے میں سورج کی گردش کے

(۱) جدید ماہرین فلکیات کی تحقیق یہ ہے کہ سورج زمین کے گرد نہیں گھومتا بلکہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے چنانچہ علامہ شیخ محمد موسیٰ البازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: دائرۂ بروج اوپر ستاروں اور فضائے بسیط میں اس راستے کو کہتے ہیں جس میں آفتاب سارا سال ہمارے اردگرد گردش کرتے ہوئے نظر آتا ہے، اور یہ بات واضح ہے کہ آفتاب کی اس حرکت کا سبب درحقیقت زمین کی حرکت حول الشمس ہے، پس زمین آفتاب کے اردگرد دائرہ بروج میں متحرک رہتی ہے زمین کی اس حرکت کی وجہ سے ہمیں آفتاب زمین کے اردگرد مشرق سے مغرب کی طرف دائرۂ بروج میں حرکت کرتا ہوا نظر آتا ہے اس مناسبت سے منطقۃ البروج کو طریق الشمس بھی کہتے ہیں، یہ دائرہ چونکہ بروج پر گذرتا ہے اس لئے اسے دائرۂ بروج بھی کہتے ہیں بلکہ بارہ بروج اسی دائرے کے بارہ مساوی ٹکڑوں کا نام ہے، ہر ٹکڑا ہر بُرج میں آفتاب تقریباً ایک ماہ رہتا ہے اور سال میں بارہ بروج طے کرلیتا ہے (سماء الفکری شرح ھیئۃ الکبری ص ۴۴)

نتیجے میں زمین پر چار قسم کے موسم پیدا ہوتے ہیں، سردی، گرمی، بہار اور خزاں یعنی سورج دائرۂ بروج میں گردش کرتے ہوئے جب ایک مخصوص حصے میں پہنچتا ہے تو زمین پر اس کی گرمی و حرارت پہنچنے کی مناسبت سے خاص موسم پیدا ہوتا ہے، اس طرح جب دوسرے حصہ میں پہنچتا ہے تو دوسرا موسم اور اسی طرح تیسرا اور چوتھا، گویا اس اعتبار سے اس دائرے کے چار حصے فرض کر لئے گئے اور پھر چونکہ ایک موسم کے بعد دوسرا موسم دفعۃً نہیں آجاتا جیسے گرمی کے بعد فوراً سردی نہیں آجاتی بلکہ ایک درمیانی عرصہ ایسا ہوتا ہے جو دونوں سے ملتا جلتا ہے اس لئے ہر موسم کے تین حصے ہوئے، ابتداء، درمیان، اور انتہاء لہٰذا اب سورج کے گردشی دائرے کے چاروں حصوں میں سے ہر حصے کے اندر مزید فرضی تین حصے اور ہوگئے، اس طرح اس دائرے کے بارہ مساوی حصے ہوئے، اور ہر حصے کا نام بُرج رکھ لیا گیا۔

اور یہ وجہ بھی ہے کہ سورج کو اپنے سال کا دورہ پورا کرنے میں بارہ مرتبہ چاند کے ساتھ جمع ہونے اور ملنے کا اتفاق ہوتا ہے اور ہر بار چاند کا سورج کے ساتھ جمع ہونا آخر تک یہی قمری مہینہ ہوتا ہے تو سورج و چاند کے جمع ہونے کی تعداد کے اعتبار سے بھی آسمان (خلاء کے دائرۃ البروج) کے بارہ حصے مقرر کئے اور ہر حصے کا نام بُرج رکھا (۱)

---

(۱) یہ بات تو مسلّم ہے کہ قمری ماہ چاند کے ایک مکمل چکر کا نام ہے، لیکن قمری ماہ کے مبداء و منتہیٰ اور بعض دیگر عوامل کی وجہ سے ماہرین نے قمری ماہ کی تین قسمیں ذکر کیں ہیں، قسم اول شرعی ماہ، اس کی مدت ایک ہلال سے دوسرے ہلال تک ہے، شرعی ماہ ۲۹ دن سے کم اور ۳۰ دن سے زیادہ نہیں ہوتا۔

قمری ماہ کی دوسری قسم شہرِ (ماہ) فلکی ہے اسے شہرِ نجمی بھی کہتے ہیں، اس قسم کا مبنیٰ و مدار چاند کا حقیقی کامل دورہ ہے، دیگر عوارض مثلاً حرکتِ ارض حول الشمس، رؤیت ہلال سے قطع نظر چاند کی ایک گردش حول الارض شہرِ فلکی و نجمی کہلاتی ہے، وجہ تسمیہ بالفلکی والنجمی یہ ہے کہ یہ ماہ فلک یعنی بالا خلاء بسیط کے نجوم ثوابت میں سے کسی ایک نجم سے اس تک دوبارہ عودِ قمر کی مدت کا نام ہے۔

قمری ماہ کی تیسری قسم شہرِ اقترانی سے موسوم ہے اقتران، قران اور اجتماع تینوں مترادف الفاظ ہیں، مطلب یہ ہے کہ قمری ماہ کے آخر میں چاند و سورج کے مابین اجتماع ہوتا ہے، چاند کا زمین و سورج کے درمیان آنا اس طرح کہ زمینی شخص کی آنکھ سے وہمی نکلا ہوا خط پہلے چاند پر اور پھر سورج پر گذرے اقتران و اجتماع کہلاتا ہے اسی حالت کو محاق بھی کہتے ہیں، اسی وجہ سے اقترانی ماہ کی یہ تعریف درست ہے کہ وہ ایک اجتماع سے دوسرے اجتماع تک کے زمانہ کا نام ہے (سماء الفکری ص ۴۰۴، ۴۰۵)

چاند کا نصف ہمیشہ کے لئے سورج کے سامنے ہوتا ہے اور دوسرا نصف پوشیدہ ہوتا ہے، زمین بھی اسی طرح ہے، ہمیشہ زمین کے تقریباً نصف حصہ پر دن ہوتا ہے اور بالمقابل نصف میں رات ہوتی ہے، پس چاند کا نصف سورج کے سامنے ہونے کی وجہ سے روشن ہوتا ہے اور دوسرا دائماً تاریک ہوتا ہے۔۔۔۔۔ محاق (اجتماع) قمری ماہ کے آخری ایک دو دنوں میں ہوتا ہے، حالتِ محاق میں چاند نظر نہیں آتا، محاق اس وقت متحقق ہوتا ہے جب کہ چاند اور آفتاب ایک برج میں مجتمع ہوں اصطلاح میں اجتماع شمس و قمر کا مطلب یہ ہے کہ چاند اور آفتاب تقریباً ایک سمت پر واقع ہوں، قمری ماہ کے آخری ایک دو دن میں شمس و قمر تقریباً اکٹھے حرکت کرتے ہوئے طلوع ہوتے ہیں اور اکٹھے غروب لہٰذا حالتِ اجتماع میں چاند کا تاریک نصف ہماری طرف اور روشن نصف آفتاب کی طرف ہوتا ہے، اس لئے چاند ہمیں مہینے کے آخری ایک دو دن نظر نہیں آتا اھ (سماء الفکری ص ۴۱۱ تا ۴۱۲)

برجوں کے نام

پھر رات کو انہی برجوں میں مختلف ستاروں کے جمع ہونے سے جو مخصوص شکلیں رونما ہوتی ہیں انکی مناسبت سے برجوں کے حسب ذیل نام رکھے ہیں

(۱) حمل	(۲) ثور	(۳) جوزا
(۴) سرطان	(۵) اسد	(۶) سنبلہ
(۷) میزان	(۸) عقرب	(۹) قوس
(۱۰) جدی	(۱۱) دلو	(۱۲) حوت

گھنٹہ، منٹ، سیکنڈ کی حقیقت

اور فلکیات والوں نے آفتاب کی حرکت کے دنوں کے مطابق ان بُرجوں میں سے ہر بُرج کو تیس حصوں میں تقسیم کیا ہے اور ہر حصے کا نام درجہ رکھا ہے، پھر ہر درجے کو ساٹھ حصوں میں تقسیم کیا اور ہر حصے کا نام دقیقہ رکھا جس کو ہندی میں گھڑی کہتے ہیں، پھر ہر دقیقہ کو ساٹھ حصوں میں تقسیم کیا اور ہر حصے کا نام ثانیہ رکھا جس کو ہندی میں پل کہتے ہیں، پھر ہر ثانیہ کو ساٹھ حصوں میں تقسیم کیا اور ہر حصے کا نام ثالثہ رکھا جس کو ہندی میں چھن کہتے ہیں علی ھذا القیاس

برجوں کے ناموں کی وجہ تسمیہ

(۱) حمل:۔ بکری کا بچہ، چونکہ تیئیس (۲۳) ستاروں کے باہم ملنے سے بکری کے بچے کی سی صورت پیدا ہوگئی ہے جس کا سر مغرب کی طرف اور دُم مشرق کی طرف ہے، پانچ ستارے اور بھی اس کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں گو کہ وہ شکل سے باہر واقع ہیں۔

(۲) ثور:۔ بیل، بتیس (۳۲) ستاروں کے ملنے سے بیل کی صورت نمودار ہوگئی ہے، جس کا سر بجانب مشرق اور دُم بجانب مغرب ہے، اور بھی اس کے ساتھ ستارے ہیں جن کو عین الثور کہتے ہیں اور ثریا بھی جو انگور کے خوشہ کی طرح ہیں۔

(۳) جوزا:۔ (دو آدمی ملے ہوئے) اٹھارہ ستاروں کے ملنے سے ایسی صورت پیدا ہوگئی ہے

گویا دو آدمی ملے ہوئے ہیں کہ ان کے سر شمال مشرق کی طرف ہیں اور پاؤں جنوب مغرب کی طرف۔

(۴) سرطان:۔(کیکڑا) نو ستاروں کے ملنے سے یہ صورت بن گئی ہے۔

(۵) اسد:۔(شیر) ستائیس ستاروں کے ملنے سے یہ صورت پیدا ہوگئی ہے، اور زہرہ ستارہ بھی اس سے تعلق رکھتا ہے۔

(۶) سنبلہ:۔(خوشہ) یہ ایک عورت کے ہاتھ میں معلوم ہوتا ہے جس کا سر اس کی دم کی طرف اور پاؤں میزان کی طرف ہیں، اور اس کے ہاتھ کے پاس کہ جس میں خوشہ معلوم ہوتا ہے ایک ستارہ ہے جس کو سماک اعزل کہتے ہیں، یہ شکل چھبیس ستاروں سے بنی ہے۔

(۷) میزان:۔ یہ ترازو کی صورت ہے جو آٹھ ستاروں سے مرکب ہے۔

(۸) عقرب:۔(بچھو) یہ شکل اکیس ستاروں سے بنی ہے۔

(۹) قوس:۔(کمان) یہ ایسی شکل ہے کہ ایک شخص کے ہاتھ میں کمان ہے جس میں تیر لگا ہوا ہے، یہ اکتیس ستاروں سے مرکب ہے۔

(۱۰) جدی:۔(بھیڑ کا چھوٹا بچہ) یہ اٹھائیس ستاروں سے بنی ہوئی شکل ہے، سعد ذابح ستارہ اسی سے متعلق ہے۔

(۱۱) دلو:۔(ڈول) ایک مرد کے ہاتھ میں ایک ڈول سا معلوم ہوتا ہے یہ بیالیس ستاروں سے مرکب ہے۔

(۱۲) حوت:۔(مچھلی) یہ دو مچھلیاں باہم ملی ہوئی معلوم ہوتی ہیں ایک کا منہ دوسرے کی دم کی طرف ہے یہ چوبیس ستاروں سے مرکب ہے۔

برجوں کے احکام وخواص کا اختلاف

برجوں کی اشکال کے اختلاف کے علاوہ ان کے احکام وخواص میں بھی اختلاف ہے، جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) برج حمل:۔حمل مریخ کا گھر، زہرہ کا وبال اور آفتاب کا شرف ہے، جب وہ اس کے اندر انیسویں درجہ پر ہو اور زحل کے لئے ہبوط ہے اور حمل کو بُرج مذکر، نہاری، گرم خشک، صفراوی اور بُرج

منقلب ربیعی، شمالی کہتے ہیں (۱)

(۲) برجِ ثور:۔ یہ زہرہ کا گھر، مریخ کا وبال اور قمر جب اس کے تیسرے درجے میں تو اس کے لئے شرف ہے، یہ مؤنث، لیلی، سرد خشک، سوداوی اور ثابت ہے۔

(۳) برجِ جوزاء:۔ یہ عطارد کا گھر، مشتری کا وبال، رأس کا شرف اور ذنب کا ھبوط ہے، اس کو مذکر، نہاری، گرم وتر، دموی اور ذوجسمین شمار کرتے ہیں (ذوجسمین وہ بُرج ہوتا ہے جس میں سورج کو اعتدال ہوتا ہے)

(۴) برجِ سرطان:۔ یہ قمر کا گھر، زحل کا وبال، مشتری کا شرف اور مریخ کا ھبوط ہے، اس کو مؤنث، لیلی، اور برجِ منقلب شمار کرتے ہیں۔

(۵) برجِ اسد:۔ یہ سورج کا گھر، زحل کا وبال، اور ثابت ہے، اس میں شرف وھبوط نہیں، اس کو مذکر، نہاری، گرم وخشک اور صفراوی شمار کرتے ہیں۔

(۶) برجِ سنبلہ:۔ یہ عطارد کا گھر، اسی کا شرف بھی ہے، اور مشتری کا وبال ہے، زہرہ اور ذوجدین کا وبال ہے، اور اس کو مؤنث، لیلی، سرد وخشک، سوداوی کہتے ہیں۔

---

(۱) نجوم، فلکیات وہیئت کے فن میں بُروج وسیارات کے مختلف حالات کے اعتبار سے مختلف فنی اصطلاحات مقرر کی گئی ہیں، مثلاً بعض بُروج کو بعض سیارات کا گھر قرار دیتے ہیں، جیسے مصنفؒ نے فرمایا کہ بُرج حمل مریخ کا گھر ہے اسی طرح ہر بُرج کے درجات مقرر کئے ہیں جیسے مصنفؒ پیچھے ذکر فرما چکے ہیں پھر ان درجات کی سیاروں کے لحاظ سے کچھ خاصیات ہیں، جیسے مصنفؒ نے فرمایا آفتاب جب حمل کے انیسویں درجے میں ہو تو اس کے لئے شرف ہے اور زحل کے لئے ھبوط (پستی، گراوٹ) اسی طرح نجوم کے ماہرین نے ہر بُرج کی طبیعت، مزاج، جنس اور ماہیئت بھی مقرر کی ہے، بعض کی طبیعت ومزاج گرم خشک اور بعض کی سرد تر ہے، بعض کی جنس مذکر ہے اور بعض کی مؤنث، بعض کی ماہیئت منقلب ہے اور بعض کی کچھ اور، مصنفؒ نے بُرج حمل کی جنس مذکر، طبیعت گرم خشک صفراوی، اور ماہیئت منقلب ربیعی شمالی بیان فرمائی ہے، منقلب وہ بُروج ہوتے ہیں جن میں سورج کو انقلاب آتا ہے، یعنی سورج کی حرکت میں دائرۃ البروج کے اندر تبدیلی واقع ہوتی ہے، کہ وہ ایک بُرج سے نکل کر دوسرے میں داخل ہوتا ہوا نظر آتا ہے، اس انقلاب کے نتیجے میں موسم کی تبدیلی ہوتی ہے چنانچہ سورج کا یہ انقلاب سال میں چار مرتبہ ہوتا ہے اسی لئے چار موسم رونما ہوتے ہیں، اور بعض بُروج کو ثابت کہا جاتا ہے کہ ان میں سورج رُکا ہوا معلوم ہوتا ہے، پھر چھ بُروج شمالی ہیں اور چھ جنوبی، بُرج حمل شمالی ربیعی ہے یعنی معدل النہار کے خط سے جانب شمال میں واقع ہے۔۱۲۔ سفیر احمد

(۷) برجِ میزان:۔ یہ زہرہ کا گھر، مریخ کا وبال، زحل کا شرف آفتاب کا ھبوط اور برجِ منقلب ہے، اسے مذکر، نہاری گرم وتر اور دموی قرار دیتے ہیں۔

(۸) برجِ عقرب:۔ یہ مریخ کا گھر، زہرہ کا وبال، قمر کا ھبوط اور برجِ ثابت ہے، اس کو مؤنث، سرد وتر اور بلغمی قرار دیتے ہیں۔

(۹) برجِ قوس:۔ یہ مشتری کا گھر، عطارد کا وبال، رأس وذوجدین کا ھبوط اور ذنب کا شرف ہے، اسے مذکر، نہاری گرم وخشک اور صفراوی کہتے ہیں۔

(۱۰) برجِ جدی: یہ زحل کا گھر، قمر کا وبال، مریخ کا شرف مشتری کا ھبوط، اور برجِ منقلب مؤنث ہے۔

(۱۱) دَلو:۔ یہ زحل کا گھر، آفتاب کا وبال، اس میں شرف وھبوط نہیں اور ثابت ہے، اس کو ہوائی، گرم و تر، مذکر اور نہاری شمار کرتے ہیں۔

(۱۲) برجِ حوت:۔ یہ مشتری کا گھر، عطارد کا وبال، اسی کا ھبوط اور زہرہ کا شرف ہے، اس کو مؤنث، لیلی، سرد وتر، بلغمی اور ذوجدین شمار کرتے ہیں۔

خلاصۂ کلام

حاصل کلام یہ ہے کہ ان بُروج کے خواص جو عوام کے ذہن کی نسبت سے زیادہ واضح وروشن ہیں وہ موسموں کا ادلنا بدلنا ہے، کہ ان موسمی تبدیلیوں کے ضمن میں (معاش، صحت وبیماری کے حوالے سے اکثر ایسے حالات رونما ہوتے ہیں کہ) اس دنیا میں (لوگوں کے اندر) عزت وذلت کے حالات بدلتے رہتے ہیں، یہ انقلاب وتبدیلی ہر سال ہوتی رہتی ہے، پس یہ صریح دلیل ہے اس بات کی کہ حالات ہمیشہ ایک جیسے نہیں رہتے، عزت وذلت بدلتی رہتی ہے، اس سال عزت ہے ذلت مفقود ہے تو آئندہ سال اس کا عکس ہوسکتا ہے کہ ذلت آجائے عزت چلی جائے۔

یہ تو وہ انقلاب ہے جو خاص وعام کسی سے مخفی نہیں اس کے پہچاننے کے لئے نورِ نبوت کی مدد کی بھی ضرورت نہیں، لیکن اب ایک ایسے انقلاب کو بیان فرمارہے ہیں جو لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ، اور عقل کے بل بوتے پر جس تک رسائی ممکن نہیں جب تک کہ نورِ نبوت (نبوی علوم) کی مدد حاصل نہ ہو، چنانچہ فرماتے ہیں:

وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ ۝

اوراُس دن کی جس کا وعدہ ہے

فرمایا اس دن کی قسم کھاتا ہوں بدلہ دینے کے لئے جس کا وعدہ کیا گیا ہے اس دن ایک بہت بڑی تبدیلی اور انقلاب برپا ہوگا، یہ زمین، آسمان اور اس کے بُروج سب اُلٹ پلٹ دیئے جائیں گے، ایک دوسرا عالم وجود میں آجائے گا، اس عالم میں یہاں کے عزت والوں کو (جو اللہ کے نافرمان ہیں) ذلت ورسوائی کا سامنا ہوگا، اور جنہیں یہاں ذلیل سمجھا جاتا ہے (اور وہ اللہ کے فرمانبردار ہیں) وہاں عزت سے سرفراز ہوں گے۔

جزادینے کے لئے تین اُمور لازمی ہیں

جب وہ دن جزاو بدلے کے لئے مقرر کیا گیا ہے، تو سمجھ لینا چاہئے کہ جزا کے عمل کو وجود میں لانے کے لئے تین چیزیں ضروری ہیں۔

(۱) جزا کا استحقاق۔

(۲) حاکم کا ہونا جو ہر ایک کو اس کے مناسب جزا دے۔

(۳) وہ کام جس پر جزا دی جارہی ہے اس کا ہونا جیسے نیکی، اور بدی۔

ان تین چیزوں کو بیان کرنے کے لئے دو مزید قسمیں کھائی ہیں چنانچہ فرمایا:

وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ ۝

اوراُس دن کی جو حاضر ہوتا ہے اوراُس کی کہ جس کے پاس حاضر ہوتے ہیں

اور (قسم ہے) اس دن کی جو حاضر ہوتا ہے اور اس کی جس کے پاس حاضر ہوتے ہیں۔ یعنی میں ہر حاضر ہونے والے کی قسم کھاتا ہوں جو اس دن حاضر ہوگا چاہے اس کا تعلق انسانوں کی جنس سے ہو یا جنوں سے یا فرشتوں سے کہ یہ سب اس دن ایک جگہ میں جمع ہوں گے، ایک مجمعٔ عظیم ہوگا، کہ اس جیسے اجتماع کی مثل کا کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا اس عظیم اجتماع کی بدولت جزاو بدلہ دینے کا معاملہ ٹھیک طریقے سے ظہور پذیر ہوگا، کہ مدعی، مدعیٰ علیہ، اور گواہ سارے افراد موجود ہوں گے۔

مشہود کی مختلف صورتیں

(۱) اچھے یا برے اعمال جو قبروں سے اُٹھتے ہی ساتھ ہوں گے۔

(۲) فرشتے جو طرح طرح کے آرام پہنچانے اور عذاب دینے کے لئے لوگوں کے ساتھ ہوں گے، اور ساتوں آسمان، عرش کے حاملین، اور اعمال لکھنے والے تمام فرشتے اس دن لوگوں کو سرعام نظر آئیں گے۔

(۳) اعمال نامے، جو ہر شخص کو دیئے جائیں گے تا کہ وہ مطالعہ کرے۔

(۴) وزنِ اعمال، جو تولتے وقت واضح ہو جائے گا۔

(۵) تجلی الٰہی، جو اس دن کی حاکم ہے، بے حجاب جلوہ افروز ہوگی۔

(۶) جنت اور دوزخ، جو اس جہاں میں نظروں سے اوجھل ہیں، اس دن جنت آرائش کی تمام جلوہ سامانیوں کے لباس میں ظاہر ہوگی اور دوزخ اپنے تمام تر عذاب وشدائد اور خوفناک منظر کے ساتھ ظاہر ہوگی۔

ان چھ چیزوں کے ظاہر ہونے سے انسان کے اندر بلکہ پورے عالم کے اندر ایک عجیب انقلاب برپا ہوگا۔

شاھد ومشہود کی تفسیر میں مختلف اقوال

شاھد ومشہود کی تفسیر میں بہت اختلاف ہے، ہم نے جو تفسیر ذکر کی ہے یہ صحابہ کرام دیگر معتبر مفسرین کا قول ہے، جیسے حضرت ابنِ عباس، حضرت حسن، ضحاک، مجاہد اور ابن مسیب رضی اللہ عنہم

دوسرا قول:۔ لیکن تفسیر معالم التنزیل میں بغوی سے، اور دوسری معتبر کتب حدیث میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''شاھد'' سے مراد جمعہ کا دن ہے، اس دن ہر شہر اور مسجد میں جہاں جمعہ پڑھا جاتا ہے برکتیں نازل ہوتی ہیں اور ''مشہود'' سے مراد عرفہ کا دن ہے، حاجی لوگ دور دراز کے ملکوں سے سفر کر کے حج کے انوار حاصل کرنے کے لئے اس دن ایک خاص جگہ (میدانِ عرفات) میں جمع ہوتے ہیں گویا وہ دن اس خاص جگہ میں رہتا ہے اور لوگ اس کے شوق میں اس کے پاس حاضر ہوتے ہیں۔ (اس لئے اس کو مشہود کہا گیا)

شاھد ومشہود کو نکرہ لانے کی وجہ

شاھدٌ ومشھودٌ سے پہلے کی قسمیں معرف باللام ہیں اور شاھد ومشہود کو نکرہ لایا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جمعہ اور عرفہ کا دن کسی ایک خاص فرد میں منحصر نہیں ہے، یہ دن بار بار آتا ہے، اس کے مقابلے میں

آسمان، بُروج، اور قیامت متعین اور غیر مکرر دن ہیں۔

جمعہ وعرفہ کے فضائل

حدیث میں آتا ہے " خیر یوم طلعت فیه الشمس یوم الجمعة فیه خلق اٰدم، وفیه أدخل الجنة، وفیه أهبط منها، و فیه تقوم الساعة وفیه تاب الله علی اٰدم "

یعنی جس دن میں سورج طلوع ہوتا ہے اس میں سب سے بہتر دن جمعہ کا دن ہے، اسی میں حضرت آدم کو پیدا کیا گیا اسی میں ان کو جنت میں داخل کیا گیا، اسی میں ان کو زمین پر اتارا گیا، اسی میں قیامت قائم ہوگی اور اسی میں اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کی توبہ قبول فرمائی۔

یہ بھی حدیث میں آتا ہے کہ جمعہ کے دن ایک گھڑی ایسی ہے جس میں بندہ جو بھی اللہ سے دعاء کرے ضرور قبول ہوتی ہے۔ ایک اور حدیث میں آتا ہے:

" أکثروا الصلوٰة علی یوم الجمعة " " جمعہ کے دن مجھ پر کثرت سے درود بھیجو "

حدیث میں آتا ہے اللہ تعالیٰ عرفہ کے دن فرشتوں سے فرماتے ہیں میرے بندوں کو دیکھو کیسے گردوغبار سے آلودہ اور بکھرے بالوں میں کتنی دور دور سے میرے گھر کا حج کرنے آئے ہیں، تم گواہ رہو میں نے ان کو بخش دیا۔

عرفہ کے دن شیطان اللہ تعالیٰ کی عام مغفرت کو دیکھ کر چیختا ہے اور سر پر مٹی ڈالتا ہے۔

اس دن کا روزہ دو سال گذشتہ اور دو سال آئندہ کے گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے۔

یہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہفتے میں بہترین دن جمعہ کا ہے اور سال کے دنوں میں بہترین دن عرفے کا ہے، اور اگر دونوں جمع ہو جائیں تو نورٌ علیٰ نورٌ ہے۔

ان دونوں دِنوں میں بھی ایک طرح کا انقلاب ہے کہ ہماری شریعت میں جمعہ ہفتے کی ابتداء ہے اور عرفہ کا دن سال کی عبادتوں کی انتہاء ہے۔ اس لئے کہ اس دن عبادتِ کبریٰ یعنی حج ادا کیا جاتا ہے۔

تیسرا قول:۔ بعض مفسرین نے کہا ہے جس دن میں کوئی عظیم اجتماع ہو، وہ دن مشہود اور اجتماع میں حاضر ہونے والے شاھد ہیں، اس تفسیر کے مطابق جمعہ کا دن، عیدین کے دن، عرفہ اور ترویہ کا دن مشہود ہیں اسی طرح ہر اجتماع کا دن مشہود ہے، اور حاضرین شاھد۔

چوتھا قول:۔ بعض مفسرین نے مشہود و شاھد کو شہود سے نہیں لیا جس کا معنی حاضر ہونا ہے، بلکہ شہادۃ

سے لیا ہے جس کے معنی گواہی کے ہیں، اس لحاظ سے شاهد اور مشهود بہت سی چیزیں ہیں، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) شاہد حق تعالیٰ ہیں اور مشہود مخلوق ہے یہی حضرت سالم بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے جیسا کہ قرآن میں ہے "و کفیٰ باللّٰہ شهیدا"

(۲) حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا شاہد اللہ تعالیٰ ہے اور مشہود بہ توحید ہے (گویا مشہود سے مراد مشہود بہ ہے) جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "شهد الله أنه لا إله إلا هو"

(۳) شاہد اللہ کے پیغمبر ہیں اور مشہود علیہ ہر پیغمبر کی اُمت ہے، جس کی دلیل یہ ارشاد ہے "فكيف إذا جئنا من كل أمة بشهيد" (گویا مشہود کا صلہ علیہ محذوف ہے)

(۴) شاہد اعمال لکھنے والے فرشتے اور مشہود مکلفین ہیں اس پر یہ آیت دلالت کرتی ہے:
"وجاء ت كل نفس معها سائق و شهيد"

(۵) شاہد انسان کے اعضاء ہیں اور مشہود علیہ خود انسان ہے اس پر یہ آیت دلالت کرتی ہے:
"يوم تشهد عليهم السنتهم و أيديهم و أرجلهم"

(۶) شاہد دن اور رات ہیں اور مشہود انسانوں کے اعمال ہیں جیسے حضرت حسن بصریؒ سے منقول ہے کہ "ما من يوم إلا ينادى إني يوم جديد و إني على ما يعمل في شهيد"
(یہ حضرت حسن بصریؒ کا قول ہے)

(۷) آسمان وزمین شاہد ہیں اس لئے کہ آسمان کے جس حصے کے نیچے بھی کوئی اچھا یا برا فعل کیا گیا ہے آسمان کا وہ حصہ قیامت کے دن اس پر گواہی دے گا، اور زمین کے جس حصے پر بھی کوئی نیکی یا برائی کی گئی ہے قیامت کے دن زمین کا وہ ٹکڑا اس پر گواہی دے گا۔ اور مشہود بہ وہ کام ہیں اچھے یا برے جو آسمان کے نیچے اور زمین پر کئے جاتے ہیں۔

(۸) شاہد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مقدس ہے اور مشہود علیہ دوسری اُمتیں ہیں جیسا کہ اس آیتِ کریمہ میں ہے "وكذلك جعلناكم امة وسطالتكونو شهداء على الناس ويكون الرسول عليكم شهيدا"

(۹) امامِ رازی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمام ممکنات شاہد ہیں اور حق تعالیٰ کی ذات واجب

الوجود مشہود ہے، اس لئے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ حق تعالیٰ کی ذات وصفات کے وجود پر گواہی دیتا ہے۔

اس تفسیر کے مطابق اہلِ کلام کی یہ اصطلاح ہے کہ غائب کو حاضر پر قیاس کرنا درست نہیں لیکن حاضر کے ذریعہ غائب پر استدلال کیا جاسکتا ہے۔

(۱۰) شاہد حجرِ اسود ہے، اور حجاج کرام مشہود لہ ہیں، اس لئے کہ صحیح حدیث میں آتا ہے:

"الحجر الأسود يمين الله في الأرض يجيئ يوم القيامة له عينان يبصر بهما ولسان ينطق به يشهد على من استلمه بحق"

(۱۱) حضرات صوفیہ نے فرمایا ہے کہ "مقام جلاء" میں حق شاہد ہے اور مخلوق مشہود اور "مقام استجلا" میں مخلوق شاہد اور حق مشہود ہے۔

بہرحال یہ جتنی چیزیں ذکر کی گئیں یہ سب عظمت وشرافت کی وجہ سے اس قابل ہیں کہ ان کی قسم کھائی جائے، نیز فی الجملہ یہ انقلاب احوال پر بھی دلالت کرتی ہیں، اور بعض معانی کے اعتبار سے ان میں تنکیر وابہام بھی مناسب ہے، (یعنی "شاهد و مشهود" قرآن میں نکرہ آئے ہیں اگر مذکورہ چیزوں میں سے کسی کو بھی شاہد ومشہود کا مصداق ٹھہرایا جائے تو درست ہے کہ ان چیزوں میں بعض معانی کے اعتبار سے ابہام وتنکیر مرادلیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح مصنفؒ کے نزدیک یہ قَسم ایک انقلاب کی طرف اشارہ کرنے کے لئے ہے سو مذکورہ چیزیں بھی فی الجملہ انقلابِ احوال پر دلالت کرتی ہیں)

جوابِ قسم میں مفسرین کے پانچ اقوال

جوابِ قسم کے متعلق مفسرین کا اختلاف ہے: (۱) بعض کہتے ہیں کہ "قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ" جوابِ قسم ہے اور "قُتِلَ" سے پہلے "لَقَدْ" مقدر ہے۔

(۲) بعض کہتے ہیں کہ اس کلام میں تقدیم وتاخیر ہے، یعنی یوں ہے "قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ"

(۳) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت قتادہ سے منقول ہے کہ "بطش ربک لشديد" جوابِ قسم ہے اور قَسم اور جوابِ قسم کے درمیان جو کلام ہے یہ جملہ معترضہ ہے۔

(۴) صاحبِ کشاف اور کچھ متقدمین نے کہا ہے کہ جوابِ قسم محذوف ہے اور وہ یہ ہے:

"لعن من يؤذي المؤمنين لإيمانهم كما لعن أصحب الأخدود"

(۵) اور اصح یہ ہے کہ جوابِ قسم "إن الذین فتنوا المؤمنین" ہے اور "قتل اصحب الأخدود" کا مضمون اس جواب قسم پر بطور شاہد کے ہے۔ اس مضمون کو چار قسموں کے بعد جواب قسم سے پہلے درمیان میں اس لئے لائے ہیں تاکہ عقلی دلائل کے ساتھ ساتھ نقلی دلائل بھی جمع ہو جائیں جس سے مدّعیٰ اور مطلب کا اثبات زیادہ قوت سے ہو گیا ہے۔

قسم سے متعلق دیگر نکات

نیز ان قسموں سے مطلقاً یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایک دن جس کا وعدہ کیا گیا ہے ایسا آئے گا جب اس عالم میں انقلاب برپا ہوگا، اسی طرح یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ایک وعدہ کئے ہوئے دن میں کہ جب شہادت قائم ہوگی اور مشہود بہ کا اظہار ہوگا تب دنیا کے اندر ہی ظالم سے انتقام لے لیا جائے گا۔

(قتل اصحب الخ سے جس قصے کی طرف اشارہ ہے) اس قصے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مسلمان بندوں کی مدد اللہ کی طرف سے ضرور ہوتی ہے۔

پس اس قصے کا یہاں ذکر کرنا تقریبِ سخن کے لئے ہے، اور تنزیل العام علی الخاص کی قبیل سے ہے (یعنی اس عام قصے سے خاص مسلمانوں کے دشمن مراد ہیں) گویا یوں فرماتے ہیں کہ مسلمانوں پر ظلم کرنے والوں سے دنیا و آخرت میں ضرور انتقام لیا جائے گا، جس وقت کہ گواہیاں قائم ہو جائیں گی اور الزام ثابت ہو جائے گا، جیسا کہ اس سے پہلے بھی دنیا میں یہ واقعہ ہو چکا ہے چنانچہ فرمایا:

قُتِلَ اَصۡحٰبُ الۡاُخۡدُوۡدِ ۝

مارے گئے کھائیاں کھودنے والے

یعنی ان خندق والوں کا قتل عام کیا گیا، یہ خندقیں چالیس گز لمبی اور بارہ گز چوڑی کھودی گئی تھیں، تاکہ ان میں مسلمانوں کو ڈال کر عذاب دیں، وہ خندقیں اس قدر گرم ہوئیں کہ:

النَّارِ ذَاتِ الۡوَقُوۡدِ ۝

آگ ہے بہت ایندھن والی

یعنی وہ آگ شعلہ والی تھی، یا یہ معنی ہے کہ بہت سی لکڑیوں والی کہ انہیں جلا کر نہایت گرم کیا گیا تھا۔

حدیث میں آتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تلاوت کرتے ہوئے جب اس آیت پر پہنچے تو

فرماتے تھے "أعوذ بالله من جهد البلاء" یہ ظالم خندقوں والے مسلمانوں کو ان خندقوں میں ڈالنے کے بعد مسلمانوں کے انتقام میں اسی آگ کے اندر جلا دیئے گئے، گھر تک جانے کی بھی فرصت نہ ملی، یہ بہت جلد اور فوری انتقام تھا جو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کا لیا اور یہ انتقام اس وقت لیا گیا کہ وہ ظالم لوگ وہیں بیٹھے تھے۔

اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ ۝

جب وہ اُس پر بیٹھے

یعنی وہ لوگ آگ کی ان خندقوں کے کنارے کرسیوں پر بیٹھے تماشا دیکھ رہے تھے، اسی حال میں اس آگ نے ان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور سب جل کر خاکستر ہوگئے، تھوڑی سی مہلت وفرصت بھی انکو نہ ملی۔

اس طرح کا جلد اور فوری انتقام عوام کی نظروں میں عبرت کا سامان ہوا کرتا ہے اور حقیقت میں بھی ان ظالموں نے ظلم کی بھی حد کردی تھی، اس لئے کہ عام طور پر ظالم خود اپنے سامنے ظلم نہیں کرتے اپنے کارندوں کے ذریعہ کراتے ہیں یا قید خانے میں قید کروا دیتے ہیں تاکہ خلاف وقار ومروّت نہ ہو، لیکن انہوں نے تو اپنے سامنے سب کچھ کیا۔

وَّهُمْ عَلٰی مَا یَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ شُهُوْدٌ ۝

اور جو کچھ وہ کرتے مسلمانوں کے ساتھ اپنی آنکھوں سے دیکھتے

خندق والوں کے چار قصے

یہاں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ ایمان والوں کو ایمان کی وجہ سے آگ کی خندقوں میں جلانے اور جلانے والوں کا خود آگ میں بھسم ہوجانے کے چار قصے ہیں جو چار مختلف مقامات پر واقع ہوئے، اور جن بستیوں میں یہ واقعات ہوئے وہ حجاز سے قریب ہیں، اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں چاروں ہی مراد ہیں کہ مقصود یہ ہے کہ اہلِ مکہ ڈریں، عبرت پکڑیں اور مسلمانوں کی ایذا ہی سے باز آئیں۔

پہلا قصہ ملک شام کا

صحیح مسلم اور دوسری صحاح کی کتب میں وارد ہے حضرت صہیب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ملک

شام میں ایک عظیم الشان بادشاہ تھا، اس کے ہاں ایک ماہرِ فن جادوگر رہتا تھا، اس بادشاہ کی سلطنت گویا اس کی وجہ سے قائم تھی، اگر کوئی دشمن حملہ آور ہوتا تو جادوگر اپنے جادو سے دشمن کو ہلاک کر دیتا اور بادشاہ کو لڑنے بھڑنے کی نوبت نہ آتی، اور اگر کبھی ارکانِ سلطنت بادشاہ کی نالائق حرکتوں کی وجہ سے برگشتہ ہو جاتے تو وہی جادوگر اپنے جادو کے زور سے ان کو پھر آمادۂ اطاعت کر لیتا تھا، یہاں تک کہ وہ جادوگر بوڑھا ہو گیا اور زندگی سے نا اُمید ہو گیا، تب اس نے بادشاہ سے کہا کہ میں اب زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہوں گا، میں چاہتا ہوں کہ کوئی ہشیار اور عاقل لڑکا اپنے غلاموں میں سے میرے سپرد کریں جس کو میں جادو سکھا سکوں تاکہ میرے مرنے کے بعد بھی آپ کا کاروبار سلطنت چلتا رہے۔

چنانچہ بادشاہ نے ایک قابل اور ہشیار لڑکا اپنے غلاموں سے منتخب کر کے جادوگر کے حوالے کیا، اور لڑکے کو حکم دیا کہ صبح سے شام تک روزانہ جادو سیکھا کرو، لڑکے نے جادوگر کے گھر آنا شروع کر دیا اور جادو کا فن حاصل کرنے لگا۔

ایک دن راستے میں آتے ہوئے اس نے دیکھا بہت سے لوگ ایک مکان سے نکل رہے ہیں اس نے کسی سے پوچھا یہاں کون ہے جس کے پاس اتنے لوگ جاتے ہیں، اس کو بتایا گیا کہ یہاں ایک راہب رہتا ہے جو دنیا ترک کر کے اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول رہتا ہے یہ لڑکا بھی اندر چلا گیا راہب کے پاس بیٹھ گیا، راہب کی باتیں سننے لگا، راہب کی باتوں کا اس پر اتنا اثر ہوا کہ اب ہر روز آتے جاتے راہب کے پاس بیٹھنے لگا، رفتہ رفتہ جادوگر سے اس کا دل اچاٹ ہونے لگا اور زیادہ دیر راہب کے پاس بیٹھنے لگا، اور تھوڑے وقت کے لئے جادوگر کے پاس جاتا اس پر جادوگر نہایت غضب ناک ہوتا اسے ڈانٹتا، آخر تنگ آ کر ایک دن جادوگر نے بادشاہ سے کہلا بھیجا کہ لڑکا بہت سستی اور دیر کرتا ہے، بادشاہ نے اپنے ماتحتوں کو تاکید کی کہ یہ لڑکا صبح سویرے جادوگر کے پاس جایا کرے، اس پر لوگوں نے کہا یہاں سے تو سویرے ہی جاتا ہے، راستے میں کہیں دیر کرتا ہے، یہ بات جب بادشاہ کو معلوم ہوئی تو سمجھا کہ لڑکپن ہے شاید لڑکوں کے ساتھ راستے میں کھیل کود میں دیر کرتا ہے۔ اس لئے بادشاہ اور جادوگر دونوں نے خوب ڈرایا دھمکایا کہ آئندہ دیر کی تو خیر نہ ہوگی۔

ایک دن بادشاہ کے دولت خانے کی طرف آتے ہوئے راستے میں اس نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا اژدھا ہے راستہ بند ہے لوگ اِدھر کے اِدھر اور دوسری طرف کے اسی طرف پھنسے ہوئے ہیں لڑکے نے

یہ دیکھا تو دل میں کہا کہ آج امتحان کرتا ہوں کہ جادوگر کی صحبت بہتر ہے یا راہب کی چنانچہ اس نے ایک پتھر اُٹھایا اور یوں دعا کی کہ اے اللہ اگر راہب کا دین جادوگر سے بہتر ہے تو اس اژدھے کو ہلاک کردے اور لوگوں کو اس عذاب سے نجات عطا فرما، یہ کہہ کر اس نے اژدھے پر پتھر پھینکا، اس کا پتھر اژدھے کو لگنا تھا کہ اژدھا وہیں ہلاک ہوگیا، لوگ یہ منظر دیکھ کر پکار اُٹھے کہ یہ لڑکا جادوگری میں درجۂ کمال کو پہنچ گیا ہے، ہوتے ہوتے یہ خبر راہب تک بھی جا پہنچی۔

راہب نے ایک دن لڑکے کو تنہائی میں بلایا، اس سے کہا اللہ تعالیٰ نے تمہیں بلند مرتبہ عطا فرمایا ہے اور مجھے خوب معلوم ہے کہ تم ایک بہت بڑی آزمائش میں مبتلا کئے جاؤ گے، خبردار میری اطلاع کسی کو نہ دینا لڑکے نے پختہ عہد کیا کہ کچھ بھی ہوجائے آپ کا نام ظاہر نہیں کروں گا، آپ اطمینان رکھیں۔

راہب کی صحبت اور انجیل مقدس کی تلاوت اور دینِ عیسوی کی اتباع کی برکت سے کہ اس زمانے میں حق اسی دین میں منحصر تھا اللہ تعالیٰ نے اس لڑکے کو ولایتِ عظمیٰ کے مقام پر پہنچایا، یہاں تک کہ کوڑھی اور مادرزاد اندھے اس کے ہاتھ سے ٹھیک ہوجاتے تھے، جن مریضوں کے علاج سے بڑے بڑے طبیب اور معالج عاجز آجاتے وہ اس لڑکے کی دعاء سے تندرست ہوجاتے۔

اتفاق سے بادشاہ کے ایک خاص درباری مصاحب کی بینائی ختم ہوگئی، اور بادشاہ کی مصاحبت وغیرہ سب کچھ چھوٹ گیا، جب اس نے اس لڑکے کی شہرت سنی تو کچھ ہدیہ نذرانہ لے کر اس لڑکے کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا، مجھ پر بھی توجہ فرمایئے اور مجھے شفا بخشئے، لڑکے نے کہا کہ میں کیا چیز ہوں کہ شفا دوں شفا تو اللہ تعالیٰ عطا فرماتے ہیں، اگر تم اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آؤ، بت پرستی چھوڑ دو اور بادشاہ کو پروردگار نہ جانو تو میں اللہ تعالیٰ سے تمہاری شفا کے لئے دعا کروں گا، وہ اندھا اسی مجلس میں ایمان لے آیا، اور اس لڑکے کی دعاء سے فوراً اچھا ہوگیا۔

جب بینائی کے ساتھ دوبارہ یہ بادشاہ کے پاس پہنچا تو بادشاہ دیکھ کر حیران ہوا اور کہا اتنے بڑے بڑے سرکاری طبیب تمہارا علاج نہ کرسکے تھے، یہ کس طرح تم ٹھیک ہوگئے، اس آدمی نے کہا مجھے میرے پروردگار (پرورش کرنے والا) نے بغیر کسی واسطہ کے خود ہی شفا عطا فرمادی۔

بادشاہ نے کہا، ہیں۔ میرے سوا تمہارا پروردگار کون ہے؟ مصاحب نے کہا میرا اور تمہارا پروردگار اللہ تعالیٰ ہے، جس نے مجھے، تجھے اور ساری مخلوق کو پیدا کیا ہے، بادشاہ غضب ناک ہوگیا اور اس کو سخت

مارنے پیٹنے کا حکم دیا اور کہا کہ بتاؤ تمہیں یہ عقیدہ کس نے سکھایا، جب مار پیٹ حد سے گذر گئی تو اس نے لڑکے کا نام بتا دیا، بادشاہ نے لڑکے کو طلب کیا، لڑکا حاضر کیا گیا، بادشاہ نے لڑکے سے کہا کہ میری پرورش اور جادوگر کی محنت کے فیض سے تم اس مقام پر پہنچے کہ اندھوں کو بینا کرنے لگے ہو، اس مقام تک پہنچ کر ناشکری کرتے ہو کہ میرے علاوہ تمہارا پروردگار کوئی اور ہے؟ لڑکے نے کہا میرا، آپ کا اور ساری مخلوق کا پروردگار صرف اللہ تعالیٰ ہے، اور شفا نہ میرے ہاتھ میں ہے اور نہ کسی اور کے ہاتھ وہ صرف اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہے۔

بادشاہ نے کہا اس لڑکے کو سخت ترین سزائیں دو یہ ساحر سے غائب رہتا ہے معلوم ہوتا ہے یہ کہیں اور جاتا ہے یہ عقیدہ اس نے وہیں سے سیکھا ہے۔

جادوگر بھی یہ سن کر گرتا پڑتا دربار میں حاضر ہوا اور کہنے لگا یہ لڑکا بہت عرصے سے میرے پاس نہیں آرہا معلوم نہیں کہاں جاتا ہے، دربار کے لوگوں نے بھی کہا یہاں سے تو روزانہ سویرے چلا جاتا ہے، بادشاہ نے سخت حکم دیا کہ اسے سخت ترین سزائیں دے کر معلوم کرو کہ یہ کہاں جاتا ہے اور یہ عقیدہ کہاں سے سیکھا ہے؟

شدید ترین تکلیفوں سے بے چین ہو کر لڑکے نے گوشہ نشین راہب کا نام بتا دیا۔

بادشاہ نے اس راہب کو بلا کر آرا اس کے سامنے رکھا اور کہا یا اپنے دین سے پھر جاؤ ورنہ اس آرے سے تم کو چیر دوں گا، راہب نے کہا، میں ہرگز اپنے دینِ حق سے نہیں پھروں گا تمہاری جو مرضی ہے کر ڈالو، بادشاہ نے حکم دیا کہ اس کو آرے سے چیر ڈالو، فوراً بادشاہ کے کارندوں نے اس کو آرے سے چیر ڈالا۔

پھر اس مصاحب کو سمجھایا کہ اس دین سے پھر جاؤ، جب وہ بھی نہ مانا تو اس کو بھی ہلاک کر دیا۔

اب بادشاہ لڑکے کی طرف متوجہ ہوا، کہنے لگا تم نے ان دونوں کا انجام دیکھ لیا ایک بار پھر کہتا ہوں کہ ان دونوں سے بیزاری اختیار کرو اور اس دین کو چھوڑ دو، لڑکے نے انکار کر دیا، تو بادشاہ نے اپنے مصاحبوں کو کہا کہ اس کو فلاں پہاڑ کی چوٹی پر لے جاؤ، وہاں لے جا کر ایک مرتبہ پھر اس کو دین چھوڑ دینے کا کہنا اگر نہ مانے تو اس چوٹی سے اس کو نیچے گرا دینا تا کہ اس کا ایک ایک انگ پاش پاش ہو جائے۔

وہ لوگ جب اس کو لے کر پہاڑ کی چوٹی پر پہنچے تو اس کو سمجھانے لگے، لڑکے نے دل میں اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اے اللہ ان کے شر سے مجھے بچا، اسی وقت پہاڑ پر شدید زلزلہ آیا وہ سب لوگ پہاڑ سے گر کر ہلاک ہوگئے اور لڑکا صحیح سلامت واپس آ گیا۔

بادشاہ نے پوچھا جو لوگ تمہارے ساتھ گئے تھے ان کا کیا ہوا، لڑکے نے کہا جس خُدا کا میں نے دین قبول کیا ہے اسی خُدا نے ان کی تکلیف سے مجھے بچالیا، بادشاہ کو اور زیادہ غصہ آیا، اس نے اپنے اور ملازموں کو مامور کیا کہ اس کو ایک کشتی کے اندر بٹھا کر دریا کے اندر لے جاؤ، اگر یہ اپنے دین سے پھر جاتا ہے تو بہتر ورنہ اس کو دریا کے اندر پھینک کر آ جاؤ، چنانچہ یہ لوگ اسے لے کر دریا کے اندر گئے، وہاں جا کر دین چھوڑ دینے کی ترغیب دینے لگے، اس نے اس موقعہ پر پھر اللہ تعالیٰ سے دعاء کی کہ اے اللہ مجھے ان کے شرّ سے بچا، ایک دم سے کشتی اُلٹ گئی وہ سب لوگ غرق ہوگئے اور یہ لڑکا صحیح سلامت باہر نکلا آیا، بادشاہ کے پاس پہنچا اور سارا قصہ سنایا، بادشاہ حیرت میں ڈوب گیا۔ اب لڑکے نے کہا اگر آپ مجھے قتل ہی کرنا چاہتے ہیں تو اس کی صرف ایک ہی تدبیر ہے، بادشاہ نے پوچھا وہ کیا؟ لڑکے نے کہا تدبیر یہ ہے کہ اس شہر کے تمام لوگوں کو ایک کھلے میدان میں جمع کریں، پھر مجھے سولی پر لٹکا کر ایک تیر انداز کو مقرر کریں جو یہ فسون پڑھ کر مجھ پر تیر چلائے بس میں ختم ہو جاؤں گا، وہ فسون یہ ہے:

"بسم اللہ ربّ الغلام" اللہ کے نام سے جو لڑکے کا رب ہے۔

بادشاہ نے اسی تدبیر پر عمل کیا، جب تیر انداز کا تیر لڑکے کی کنپٹی پر جا کر لگا تو اس نے اپنا ہاتھ اس پر رکھا اور با آواز بلند یہ کہا میں نے اپنا مقصد حاصل کرلیا، اور اللہ کے نام پر قربان ہوگیا۔ یہ واقعہ ہونا تھا کہ پورے مجمعے میں ایک شور برپا ہوگیا اور سب لوگ پکار پکار کر کہہ رہے تھے "اٰمنّا برب الغلام، اٰمنّا برب الغلام" "ہم ایمان لائے لڑکے کے رب پر، ہم ایمان لائے لڑکے کے رب پر"

یہ منظر دیکھ کر بادشاہ کے درباریوں، اور خواص نے کہا یہ تو بہت بُرا ہوا، تدبیر اُلٹی پڑگئی، جس بات کا ڈر تھا وہی ہوگئی، اب سارے شہر والوں کو یہ یقین ہوگیا ہے کہ لڑکے کا دین سچا تھا، اس کا ربّ آپ سے بہت زیادہ طاقت و قدرت والا ہے، جب تک اس کے رب کا نام نہ لیا گیا وہ ہلاک نہ ہوسکا، یہ سن کر بادشاہ سیخ پا ہوگیا، اور اپنی خفت و شرمندگی مٹانے کیلئے جھنجھلا کر کہنے لگا، شہر کے تمام کوچوں، کناروں میں خندقیں کھدواؤ میں ان سب نافرمانوں کو آگ میں جلاؤں گا۔

چنانچہ خندقیں کھودی گئیں، ان میں آگ بھڑکائی گئی اور بادشاہ کے حکم سے ان تمام مسلمانوں کو ڈالا جانے لگا، ان میں ایک عورت کو لایا گیا جس کی گود میں دودھ پیتا بچہ تھا، خندق کے قریب پہنچ کر وہ گھبرائی اور پیچھے ہٹی، بادشاہ کے ظالم کارندوں نے کہا ذرا ٹھہرو شاید یہ اپنے دین سے باز آجائے، اس کو مہلت دو، اتنے میں اس کا دودھ پیتا بچہ پکار کر بولا اس کی یہ بات سب نے سُنی وہ ماں سے کہہ رہا تھا، او میری نادان ماں! یہ کیا کر رہی ہے صبر کر، تُو سچے دین پر ہے، اور اللہ کا نام لے کر اس آگ میں داخل ہو جا یہ آگ تیرے لئے گلزار بن جائے گی، یہ سنتے ہی وہ عورت بچے سمیت آگ میں کود پڑی۔

آگ کے شعلے بھڑک رہے تھے، مؤمنین کو نذرِ آتش کرنے کا تماشا یہ ظالم لوگ کرسیوں پر بیٹھے دیکھ ہی رہے تھے کہ یکایک آگ کے شعلے لپکے اور ان تمام ظالم تماش بینوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، یہ شعلے اتنی تیزی اور قوت کے ساتھ لپکے کہ ان کو بھاگنے کی فرصت ہی نہ ملی اور اُن سب کو جلا کر بھسم کر دیا۔ تمام خندقوں میں یہ آگ اسی طرح لپکی اور سب کو ہلاک کیا۔

حضرت ربیع بن انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں مؤمنین کو آگ میں ڈالتے ہی آگ کے چھونے سے پہلے ہی انکی روح قبض کرلی جاتی تھی اللہ تعالیٰ انکو جنت میں پہنچا دیتے اس لئے ان کو کچھ تکلیف نہیں ہوئی۔

مکافاتِ دنیوی کے متعلق ایک باریک نکتہ

اس قصے میں ایک باریک نکتہ ہے، جس کی طرف حضرت شیخ اکبرؒ اور ان کے متبعین گئے ہیں، وہ یہ کہ بادشاہ کے ہاتھوں اس لڑکے کا قتل ہونا مکافاتِ دنیوی کی وجہ سے تھا (یعنی دنیا میں اپنے عمل کا بدلہ) چونکہ اس نے راہب سے عہد کیا تھا کہ اس کا نام ظاہر نہیں کرے گا پھر اس عہد پر برقرار نہ رہ سکا جس کے نتیجے میں راہب کو قتل کیا گیا تھا، اسی عمل کے بدلے میں بادشاہ نے اس لڑکے کو قتل کیا، ورنہ بادشاہ کبھی بھی اس پر قابو نہ پا سکتا۔

مکافاتِ دنیوی کا الگ نظام ہے، جو مکافاتِ اُخروی سے جُدا ہے، مکافاتِ دنیوی کی ایسی صورتیں اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا باعث نہیں ہوتی یہ محض بدلے کی صورت ہوتی ہے حقیقت میں اللہ کے ہاں یہ سزا ترقی درجات کا ذریعہ ہوتی ہے، چنانچہ سیّد الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اونٹنیوں کے پیٹ چاک کئے تھے اور ان کے جگر نکال کر کباب بنا کر کھائے تھے، اسی سبب سے کفار کو یہ قدرت ہوئی کہ ان کو شہید کیا اور ان کا جگر نکال کر چبایا، (واللہ اعلم)

دوسرا قصہ ملکِ یمن کا

دوسرا قصہ اصحابِ خندق کا ملکِ یمن کے شہر نجران میں واقع ہوا تھا، ایک مسلمان (حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل مقدس کا متبع کہ اس وقت اسلام وہی تھا) ایک آدمی کے ہاں نوکر ہوا وہ انتہائی دیانتدار اور فرماں بردار تھا، ہر وقت مالک کے دروازے کے باہر بیٹھا رہتا کہ جس کام کا حکم ہو فوراً بجا لا سکے، یہ مسلمان انجیل مقدس کا حافظ تھا ہر وقت انجیل کی تلاوت کرتا رہتا تھا، جس کا یہ نوکر تھا اس کی ایک بیٹی تھی اس نے یہ دیکھا کہ جب یہ انجیل پڑھتا ہے تو ایک نورِ عظیم اس کے سینے سے نکلتا ہے اور پورے عالم میں پھیل جاتا ہے، لڑکی نے یہ بات اپنے والد کو بتائی چنانچہ والد نے ایک رات چھپ کر دروازے کی دراڑ سے دیکھا تو اس کو بھی یہ منظر صاف دکھائی دیا، اب وہ اس نوکر کے پیچھے پڑ گیا کہ بتاؤ تم کیا پڑھتے ہو، جس کی یہ تاثیر ہے۔

وہ مسلمان وہاں کے کافر بادشاہ اور عیسائیت دشمن سرداروں کے ڈر سے اس راز کو چھپاتا تھا مگر جب اس کے مالک کا اصرار حد سے بڑھ گیا تو بادلِ نخواستہ اس مسلمان نے یہ بھید ظاہر کر دیا، کہ وہ مسلمان ہے اور جو پڑھتا ہے یہ اللہ کا کلام انجیل مقدس ہے، چنانچہ گھر والا اور اس کی بیٹی اسی وقت مسلمان ہو گئے اور انجیل مقدس کی تلاوت میں مشغول ہو گئے، رفتہ رفتہ شہر تک یہ بات پھیلتی چلی گئی اور ستاسی (۸۷) مرد و عورت مسلمان ہو گئے، (اس دور کے لحاظ سے یہ بہت بڑی تعداد تھی)

جب اس بات کی خبر اس شہر کے بت پرست بادشاہ یوسف زئی بن نواس حمیری تک پہنچی تو اس نے ان نوے (۹۰) مسلمانوں کو اپنے پاس حاضر کرنے کا حکم دیا، اور ایک خندق کھدوائی، اس میں آگ دہکائی، پھر ان مسلمانوں کو اس خندق کے پاس لے جا کر حکم دیا کہ یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین کو چھوڑ دو ورنہ تم سب کو اس آگ میں جھونک دوں گا۔

مسلمانوں کی اس جماعت میں ایک عورت تھی جس نے دودھ پیتا بچہ اُٹھایا ہوا تھا، جب بادشاہ کا یہ حکم آیا تو اس بچے نے بلند آواز سے کہا امّی بسم اللہ اس آگ میں داخل ہو جاؤ اس کا بدلہ ہمیشہ کی جنت ہے۔

جب ان مظلوموں کو دہکتی خندق میں جھونک دیا گیا تو بادشاہ اپنے بت پرست مصاحبوں کے ساتھ خندق کے کنارے کرسیوں پر بیٹھا ظلم کا یہ نظارہ دیکھ رہا تھا کہ اچانک اس آگ کے شعلے لپکے اور ان سب ظالموں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور جلا کر بھسم کر دیا۔

یہ قصہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر اُٹھائے جانے کے تھوڑے عرصہ بعد پیش آیا تھا، اس دن سے نجران کے لوگوں نے عیسائیت کو اختیار کرلیا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک اسی دین پر تھے، چنانچہ نجران کے عیسائیوں کا وفد سید اَیْہَم اور عاقب وغیرہ کی سربراہی میں مدینہ طیبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات کے لئے حاضر ہوا تھا، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق بحث و گفتگو کی تھی اور انہی کے متعلق آیت مباہلہ نازل ہوئی تھی۔

تیسرا قصہ ملکِ ایران کا

ایسا ہی ایک قصہ ملک فارس میں بھی واقع ہوا ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے فرماتے ہیں کہ مجوسی لوگ بھی ایک پیغمبر اور آسمانی کتاب کے پیروکار تھے، ان کے مذہب میں شراب بدن کے نفع کے لئے اس قدر پینا حلال تھی جو بے ہوش نہ کرے، مجوسیوں کے بادشاہ نے ایک دن بہت زیادہ شراب پی لی، اور نشے کی حالت میں اپنی بہن سے بدکاری کر بیٹھا، جب ہوش آیا تو اپنے کئے پر بہت نادم ہوا، اور اسی بہن سے تدبیر پوچھی کہ جو دھبہ ہمارے دامن پر لگ گیا اسے کس طرح دور کیا جائے، بہن نے کہا تم بہن کے حلال ہونے کا دعویٰ کردو اور یہ اعلان کرو کہ حضرت آدم علیہ السلام کی شریعت میں بہن سے نکاح جائز تھا اس لئے میں انہی کے طریقے پر ہوں لہٰذا بہن حلال ہے۔

بادشاہ نے لوگوں کو جمع کرکے اس نئے مسئلے کا اعلان کیا لیکن لوگوں نے قبول کرنے سے انکار کردیا، پھر بادشاہ نے عورت سے پوچھا تو عورت نے کہا ان کو کوڑے مارنے کی سزا دو، چنانچہ بادشاہ نے ان لوگوں کو کوڑے مروائے مگر لوگ پھر بھی اس مسئلے کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہوئے، پھر اس عورت سے کہا کہ کیا کروں لوگ تو نہیں مان رہے اس نے رائے دی کہ ان کی گردنیں مارنے کا حکم دو، چنانچہ اس نے بہت سوں کی گردنیں اُڑا دیں لیکن لوگ تھے کہ کسی صورت اس مسئلے کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہو رہے تھے، اب اس نے پھر اس عورت سے تدبیر پوچھی تو اس نے کہا کہ ان کا ایک ہی علاج ہے کہ خندقیں کھدواؤ اور ان سب کو مجبور کرو کہ یا یہ مسئلہ قبول کریں ورنہ آگ میں جھونک دیئے جائیں گے۔

چنانچہ اس نے خندقیں کھدوائیں ان میں آگ دہکائی اور حکم دیا جو اس مسئلے کا انکار کرے اس کو آگ کی خندق میں پھینک دو۔ چنانچہ اس مسئلے کی پاداش میں بے شمار لوگوں کو جلتی خندقوں میں پھینک دیا گیا اور قدرتِ الٰہی سے عین اسی وقت آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں نے اس بادشاہ کو حواریوں

سمیت جلا کر راکھ کر دیا، تب سے ایرانیوں میں بہن سے نکاح اور آگ کی پرستش شروع ہوگئی۔

چوتھا قصّہ ملکِ حبشہ کا

تفسیر زاہدی میں منقول ہے کہ بنی اسرائیل کے زمانے میں مسلمانوں (عیسائی موحدین) کا ایک شہر تھا اس میں قحط بہت شدید پڑا جس سے گھبرا کر وہ تمام مسلمان قریبی ملک حبشہ میں ہجرت کر گئے، جب بہت بڑی تعداد میں یہ لوگ وہاں پہنچے تو وہاں کے لوگوں نے جو بت پرست تھے اپنے بادشاہ سے کہا کہ ان لوگوں کی وجہ سے یہاں بھی غلّے کی کمی ہو جائے گی اور قحط پڑنے کا اندیشہ ہے، اس پر بادشاہ نے شہر کے دروازے کے باہر ایک خندق کھدوائی اور آگ سے اس کو بھر دیا، پھر ایک بہت بڑا بت ہاتھی کی شکل کا وہاں لاکر کھڑا کیا اور حکم دیا کہ باہر سے آئے ہوئے ان اجنبی لوگوں کو یہاں حاضر کرو اور ان سے کہو کہ اس بُت کو سجدہ کریں جو انکار کرے اس کو آگ کی خندق میں پھینک دو، چنانچہ وہ لوگ حاضر کئے گئے اور ان سے بت کو سجدہ کرنے کا مطالبہ کیا گیا، مگر وہ توحید کے علمبردار سب آگ میں جل گئے، لیکن کوئی ایک بھی ایسا نہ تھا جس نے جان کی خاطر بُت کو سجدہ کر لینا گوارہ کیا ہو۔

ان مسلمانوں میں اتفاق سے ایک مسکین عورت لائی گئی جس نے ایک دودھ پیتا بچہ گود میں اُٹھا رکھا تھا جب اس سے کہنے لگے کہ اس بُت کو سجدہ کرو تو اس نے صاف انکار کر دیا بادشاہ جو اس وقت موجود تھا عورت کے انکار پر غضبناک ہوا اور حکم دیا اس سے بچہ چھین کر آگ میں پھینک دو ظالموں نے اس معصوم کو اپنی ماں سے چھین کر دہکتی ہوئی خندق میں پھینک دیا جس پر عورت بے چینی سے تڑپ اُٹھی تب بچے نے آگ کے اندر سے آواز دی امّی بالکل نہ ڈریں بے دھڑک اس آگ میں کود جائیں حقیقت میں یہ نار نہیں گلزار ہے۔

عورت نے بے ساختہ اللہ کے سامنے دعاء کے لئے ہاتھ پھیلا دیئے بس اتنا کہا الٰہی تُو دیکھ رہا ہے تیرے سامنے یہ سب کچھ ہو رہا ہے بیان کرنے کی ضرورت نہیں، اتنا کہنا تھا کہ آگ کے شعلے خندق سے کود کر باہر آگئے اور یہ شعلے چالیس گز اونچے تھے اور قنات کی طرح ان سب کافروں کو گھیرے میں لے لیا پھر سب کو جلا کر بھسم کر ڈالا۔

جب ان چار قصّوں کی طرف اجمالی اشارہ کر چکے جن کا حاصل یہ ہے کہ ان ظالموں کی تدبیر انہی پر اُلٹ گئی اور فی الفور دنیا میں ہی ان سے ظلم کا بدلہ لے لیا گیا تو اب اس فوری بدلے کی جو کہ خلافِ

عادت ہے وجہ بیان فرماتے ہیں کہ خلاف عادت فوری بدلہ ان سے کیوں لیا گیا، چنانچہ فرمایا:

وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ

اور اُن سے بدلا نہ لیتے تھے مگر اسی بات کا کہ وہ یقین لائے اللہ پر

صیغۂ مستقبل میں نکتہ

مستقبل کا صیغہ یہاں اس وجہ سے لائے کہ کفار ان سے زمانۂ مستقبل میں ایمان چھڑانے چاہتے تھے، ایمان پر ثابت قدم رہنے کی وجہ سے ان کو اذیتیں پہنچاتے تھے، ماضی کے ایمان کو ترک کرانے کے لئے عذاب نہیں دیتے تھے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ان کافروں کی مسلمانوں سے دشمنی صرف ایمان کی وجہ سے تھی، لہٰذا ایمان سے ان کی عداوت تھی، ان کفار کے علاوہ دوسرے کفار بھی مسلمانوں کو اذیتیں دیتے ہیں اور دیتے رہے ہیں اس کے باوجود وہ سالہا سال تک زندہ سلامت رہے ان سے انتقام نہ لیا گیا اس کی وجہ یہی ہے کہ ان کی مسلمانوں کے ساتھ عداوت صرف ایمان کی وجہ سے نہ تھی بلکہ اس کے ساتھ اقتدار و غلبہ اور مال و دولت حاصل کرنے کی طمع بھی اس کے ساتھ ملی ہوئی تھی، مگر یہ کفار خالص ایمان کے دشمن تھے حالانکہ وہی ایمان صحیح تھا کیونکہ جس ذات پر ایمان تھا وہ مندرجہ ذیل صفات سے متصف ہے۔

الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۝ الَّذِىْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط

جو زبردست ہے تعریفوں والا، جس کا راج ہے آسمانوں میں اور زمین میں

تین صفات بیان کی گئی ہیں۔ وہ اللہ غالب ہے، سب خوبیوں پر سراہا گیا ہے، آسمانوں اور زمینوں میں اسی کی بادشاہت ہے۔

ان تین صفات میں سے ہر صفت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ اسی پر ایمان لانا چاہئے، کیونکہ وہ اپنے سب ماسوا پر غالب کسی کی عزت اسکی عزت کے برابر نہیں لہٰذا اس پر ایمان لانا بھی عزت و افتخار کا سبب ہے۔

اور جب وہ محمود ہے تو زبان سے، دل سے اس کا شکر بجالانا واجب اور ایمان کا اظہار لازم ہوا۔

جب زمین و آسمان کی بادشاہت اسی کے لئے ہوئی تو اس کے دشمنوں سے ڈرنا بھی جائز نہیں رہا۔

یہ تینوں صفات جس طرح ایمان کے اظہار کا باعث ہوئیں اسی طرح دشمنوں سے جلد انتقام لینے کا بھی تقاضا کرتی ہیں اس لئے کہ دشمنوں سے بدلہ لینا عزت اور نہ لینا ذلت ہے، محمودیت کا تقاضا بھی دشمنوں سے انتقام لینا ہے کہ دشمنوں سے بدلہ نہ لینا قابل مدح بات نہیں، ہاں معاف کر دینا اور بات ہے مگر کافر کو معاف کرنا جائز نہیں ہے، بادشاہت کا تقاضا بھی انتقام ہے ورنہ دشمن دلیر ہو جائیں گے اور کاروبارِ سلطنت میں خلل واقع ہو سکتا ہے، اگر کوئی بادشاہ ان صفات کے باوجود بدلہ لینا چھوڑ دے تو ضرور رعایا کے حال سے بے خبر ہے کہ دشمنوں کی دشمنی اور دوستوں کی دوستی سے بے خبر ہے اور خدائے بالا و برتر بے خبری کے عیب سے پاک ہے اس لئے کہ:

وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ ۝

اور اللہ کے سامنے ہے ہر چیز

یعنی اللہ ہر چیز سے خبردار ہے، جب کافروں نے ایمان والوں سے ایمان کی وجہ سے عداوت کی اور اللہ تعالیٰ کے انتقام سے غافل ہوئے تو گویا اللہ عزوجل کی عزت، بادشاہت، محمودیت، اور خبرداری سے انکار کیا، سو ان وجوہات کی بنا پر اللہ کی حکمت جلد انتقام کا تقاضا کرتی ہے چنانچہ خندق والوں کے قصوں میں اسی کا ظہور ہوا۔

جب ایک جزی اور خاص فرد میں دلیل صحیح ہوئی تو اس پر کلی کا قیاس کرنا درست ہوا چنانچہ فرماتے ہیں:

اِنَّ الَّذِیْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ

تحقیق جو دین سے بچلائے ایمان والے مردوں کو اور عورتوں کو

یعنی ایمان کے ساتھ عداوت کی وجہ سے ستایا، مؤمن مردوں کو اور ایمان والی عورتوں کو۔ عورتوں کا ایمان مردوں کے ایمان کے مقابلے میں اگرچہ ضعیف ہے کہ ان میں ہوا و ہوس کا غلبہ ہوتا ہے مگر یہ کمی دوسری طرف سے پوری ہو جاتی ہے کہ عورتیں عاجز و بے کس ہیں مدافعت و مقابلہ کی طاقت نہیں رکھتیں۔

ثُمَّ لَمْ يَتُوبُوا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيقِ ○

پھر توبہ نہ کی تو اُن کے لئے عذاب ہے دوزخ کا اور اُن کے لئے عذاب ہے آگ لگنے کا

یعنی فرصت و مہلت ملنے کے باوجود انہوں نے اس ظلم سے توبہ نہ کی اور اسی شغل میں مر گئے، تو ان کے لئے عذاب ہے، اگر یہ توبہ کر لیتے تو حقوق العباد کے لحاظ سے تو ان سے باز پُرس ہوتی، مگر ان کو جو عذاب ہوتا اس میں اتنی شدت نہ ہوتی کیونکہ ایمان سے نفرت و عداوت کے گناہ اور حق اللہ کے ضائع کرنے کے الزام سے چھوٹ جاتے۔

قاتل کی توبہ مقبول ہے

اسی آیت سے استدلال کیا گیا ہے کہ مسلمان کو عمداً قتل کرنے والا توبہ کرے تو اس کی توبہ قبول ہے، لیکن اس استدلال میں تھوڑی سی بحث ہے، کیونکہ مسلمان کا قتلِ عمد اگر کفر کی حالت میں ہوا ہے تو ایمان لانے کے بعد بالاجماع وہ معاف ہو گیا، اس میں کسی کا اختلاف نہیں۔ اور اس آیت میں کافر ہی مراد ہیں جو ایمان کی وجہ سے مسلمانوں کو مارتے تھے۔ (یعنی مسلمان مسلمان کو قتل کر دے تو اس کی توبہ کا یہاں ذکر نہیں ہے)

فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ:۔ ان کے لئے دوزخ کا عذاب ہے جس میں طرح طرح کی تکالیف، سزائیں اور دکھ ہیں۔

عذاب حریق سے کیا مراد ہے

وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيقِ:۔ دوسرے ظالموں کے علاوہ ان کے لئے خاص طور پر جلن کا عذاب ہے جس میں ان کا تن من گرفتار ہو گا جس طرح انہوں نے مسلمانوں پر جور و جفا کر کے ان کے دلوں کو جلایا تھا۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ "عذاب الحریق" سے قبر کا عذاب مراد ہے یہ جہنم کے عذاب سے پہلے قبر میں ان کو پہنچے گا۔

بعض نے اس سے خندق کی وہ آگ جس میں یہ کافر لوگ جل گئے تھے مراد لی ہے۔

جب ان ظالموں کا حال بیان ہوا جو ایمان والوں کو ایذائیں دیتے تھے تو سننے والے کو رنج وصدمے میں اس بات کا اشتیاق پیدا ہوا کہ معلوم نہیں ان مظلوموں کو آخرت میں کیا بدلہ عطا ہوا جن کی جانیں ایمان کی وجہ سے برباد کر دی گئیں، سو اس انتظار و اشتیاق کو دور کرنے کے لئے نئے سرے سے ایمان والوں کا حال بیان کرنا پڑا۔ اور جب یہ ایک نئی بات ہے سامع کی تسکین کے لئے لائی گئی ہے مقصود اصلی کے طور پر اس جگہ نہیں لائی گئی، اس واسطے حرف عطف کو چھوڑ دیا اور فرمایا:

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتٌ

بیشک جو لوگ یقین لائے اور کیں اُنہوں نے بھلائیاں اُن کے لئے باغ ہیں

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: یعنی جو ایمان لائے، اور اس پر ثابت قدم رہے ان ظالموں کی ایذا و تکالیف کے باوجود انہوں نے صبر کیا،

وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ: اور نیک کام کئے، کہ نیک کام ایسے وقت میں بہت بڑی پونجی ہے جیسے مصیبت پر صبر کرنا، اللہ کے فیصلے پر راضی رہنا اور ساری مخلوق سے منہ موڑ کر اللہ کی طرف ہی رجوع کرنا۔

لَهُمْ جَنّٰتٌ: ان کے لئے دنیا کی ان مصیبتوں کے مقابلے میں باغ ملیں گے، سو دنیا کی تکالیف تو ان کے حق میں ایسی ہیں جیسے کسی کو اس کے محبوب کے سامنے محبوب کے ساتھ محبت کی وجہ سے ایذاء دیں یہ ایذاء تو اس کے لئے عین راحت ہوگی۔

تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ط

جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں

وہ طرح طرح کی نہریں شہد، دودھ، شراب اور پانی کی ہوں گی، یہ اس خون و پسینے کا بدلہ ہے جو کافروں کے ظلم کے بسبب بہا تھا۔

ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيْرُ ○

یہ ہے بڑی مراد ملنی

یہ بڑی مراد ہے اس لئے کہ دنیا کی مرادیں فنا ہونے والی ہیں اور یہ باقی رہنے والی ہے کبھی فنا نہیں ہوگی، اور یہ بھی ہے کہ دنیا کے اندر مقاصد حاصل ہو جانے کی صورت میں بھی محبوب حقیقی کی رضامندی

مشکوک ہے یقینی نہیں ہے لیکن آخرت کی ان لذتوں میں اس کی رضا قطعی اور یقینی ہے۔

ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کافروں کی جزا بیان کرتے ہوئے فاء جزائیہ لائے چنانچہ فرمایا "فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ" مگر مسلمانوں کی جزاء بیان کرتے ہوئے اس حرف کو چھوڑ دیا اس میں کیا نکتہ ہے چنانچہ فرمایا "لَهُمْ جَنّٰتٌ"

جواب اس کا یہ ہے کہ آخرت کا ثواب یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل ہے عمل پر موقوف نہیں ہے، جیسے نابالغ لڑکا کہ جس نے کوئی عمل نہیں کیا اس کو بھی ثواب عطا ہوگا، یا کوئی مجنون جو بلوغت سے پہلے ہی جنون کا شکار ہو گیا (عمل کا مکلف ہی نہ ہو سکا) اس کو ثواب عطا ہوگا۔

پہاڑ کی چوٹی پر رہنے والا اسلام سے ناواقف آدمی

یا جیسے وہ شخص جو پہاڑ کی چوٹی پر بالغ ہوا اور اسلام کے طریقہ سے واقف ہی نہ ہو سکا اور عبادت و طاعت کی توفیق بھی نہ پائی اس کو بھی آخرت میں ثواب عطا ہوگا، یہ سب لوگ بغیر عمل کے ثواب پائیں گے۔

بخلاف عذاب کے کہ وہ بغیر فسق یا کفر کے نہیں دیا جائے گا اس لئے کہ عذاب عدل کا تقاضا کرتا ہے اور عدل بغیر سبب کے ہو نہیں سکتا تو ان دو چیزوں "فضل اور عدل" کے درمیان فرق ہونے کی وجہ سے کافروں کی جزا بیان کرتے وقت سبب و تعقیب کی تصریح فرما کر فاء لائے اور یہاں حذف کر دیا۔

وہ ظالم لوگ جو مسلمانوں کو محض ایمان کی وجہ سے ایذاء رسانی کرتے تھے۔ اور وہ مظلوم ان کے جور و جفا پر جو صبر و تحمل کرتے تھے ان دونوں کے ساتھ حق تعالیٰ نے دنیا و آخرت میں جو معاملہ کیا (جس کا ذکر ابھی گذرا) اس سے یہ ثابت ہوا کہ:

اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ ○

بیشک تیرے رب کی پکڑ سخت ہے

رب کی پکڑ اس لئے سخت ہے کہ اوروں کی پکڑ سے تو چھٹکارا ممکن ہے، خواہ طاقت سے ہو، یا منت و زاری سے، یا صبر و تحمل سے یا کسی کی سفارش سے، لیکن اللہ کی پکڑ سے چھٹکارا ممکن نہیں ہے۔

اور یہ وجہ بھی ہے کہ اللہ کے علاوہ کسی اور کی پکڑ کی زیادہ سے زیادہ سختی یہ ہوگی کہ ہلاک کر دے گا، مگر

موت کے بعد عذاب دینے کی اس کو قدرت نہیں ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ کے دستِ قدرت سے تو خاک ہو جانے کے بعد بھی خلاصی ممکن نہیں۔ وہ اس بات پر قادر ہے کہ زندہ کرے اور مار ڈالے پھر زندہ کر کے پھر مار ڈالے، اور اسی طرح ابدالآباد تک عذاب میں گرفتار رکھے، اس لئے کہ :

اِنَّهٗ هُوَ يُبْدِئُ وَ يُعِيْدُ ۝

بیشک وہی کرتا ہے پہلی مرتبہ اور دوسری مرتبہ

یعنی وہی اول مرتبہ پیدا کرتا ہے اور فنا کے بعد دوسری مرتبہ بھی وہی پیدا کرے گا۔

وَهُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ ۝

اور وہی ہے بخشنے والا محبت کرنے والا

یعنی وہ اللہ سخت گیری اور قہاری کی صفت رکھنے کے باوجود اپنے مسلمان بندوں کو بخشنے والا، اور ان سے محبت و دوستی کرنے والا ہے دوستی بھی ایسی شدید کہ اس کی وجہ سے اپنے دوستوں کے گناہوں کو معاف کرتا اور ان کے عیبوں کو چھپاتا ہے، اور دوستوں، دشمنوں کے ساتھ اس کا یہ معاملہ کیوں نہ ہو کہ وہ......

ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدُ ۝

مالک عرش کا بڑی شان والا

یعنی سارے جہاں کی سلطنت کے تخت کا مالک ہے، اس کی بزرگی، عظمت و بڑھائی ازل سے ہے۔

''مجد'' لغت میں خاندانی اور موروثی عظمت و بڑھائی کو کہتے ہیں، اور موروثی عظمت و بڑھائی کے لئے قدامت اور دوام لازم ہے، سو یہاں بھی مراد قدیم و پرانی اور دائمی عظمت و بڑھائی ہے۔

اور قدیم السلطنت (پرانی چلی آنے والی بادشاہت کے) بادشاہوں کی عادت ہے کہ وہ اپنے دوستوں اور دشمنوں کے ساتھ خوشی، ناراضگی کا معاملہ اسی طرح کرتے ہیں ورنہ ان کی سلطنت میں خلل واقع ہو جائے اور اتنے طویل زمانے تک نہ چل سکے، لیکن اللہ تعالیٰ ایسے بادشاہ ہیں کہ کوئی اور بادشاہ ایسا ہونا تصور بھی نہیں کر سکتا اس لئے کہ......

فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ۝

کرڈالنے والا جو چاہے

جب کسی چیز کے متعلق اس کا ارادہ ہو جاتا ہے تو پھر اس کے خلاف ہونے کا امکان ہی نہیں رہتا، یہ بات کسی بادشاہ کو حاصل نہیں یہ بادشاہ کتنی دفعہ کسی کام کا ارادہ کرتے ہیں مگر پھر وہ کام انجام دینے کے وسائل انکو میسر نہیں ہوتے، لہٰذا جس شہنشاہ کی یہ شان ہو تو اس سے ہر وقت ڈرتے رہنا چاہئے اور اس کی رحمت کا امیدوار بھی رہنا چاہئے۔

اللہ کی صفت "فعّال" نکرہ لانے پر اشکال کا جواب

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ کی صفات معرفہ لائی گئیں کہ بعض معرف باللام ہیں جیسے الغفور، الودود، اور بعض معرف باللام کی طرف مضاف ہیں جیسے ذو العرش المجید، مگر "فعّال" کو نکرہ ذکر کیا گیا ہے اس میں کیا نکتہ ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بھی معرفہ کے حکم میں ہے اس لئے "تعریف" کی ضرورت نہیں۔ وہ اس طرح کہ "فعال لما یرید" طالعاً جبلاً کی طرح مشابہ مضاف ہے اور مشابہ مضاف، مضاف کے حکم میں ہوتا ہے۔ لہٰذا تعریف (معرفہ) کی حاجت نہ رہی۔

فائدہ: "فعّال لما یرید" میں مبالغے کا صیغہ لائے ہیں فاعلٌ لما یرید اسم فاعل کا صیغہ ذکر نہیں کیا۔ اسم فاعل کی بجائے مبالغے کے صیغہ کو اختیار کرنے میں نکتہ یہ ہے تاکہ اللہ تعالیٰ کی مرادوں اور مفعولوں کی کثرت کی طرف اشارہ ہو (یعنی وہ بہت زیادہ ارادوں کو پورا کرنے والا اور اس کے افعال بے شمار ہیں)

ان متضاد اور مختلف آثار و نتائج والی صفات کے بیان سے مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ اس مالک سے کوئی بعید نہیں کہ اپنے بندوں کے ساتھ کبھی لطف و مہربانی، مغفرت و محبت کا معاملہ کرے اور کبھی سخت پکڑ میں گرفتار کر لے، بلکہ ایک ہی آدمی یا جماعت پر ایک وقت میں لطف و انعام کرے اور دوسرے وقت میں انتقام و عذاب میں پکڑ لے، لہٰذا اس کے انعام و اکرام سے مغرور نہ ہونا چاہئے اور اس عدل و انصاف والے منتقم سے بے خوف نہیں رہنا چاہئے، چنانچہ فرماتے ہیں:

هَلْ اَتٰکَ حَدِیْثُ الْجُنُوْدِ ۝

کیا پہنچی تجھ کو بات اُن لشکروں کی

یعنی جن پر ایک طویل مدت تک انعام واکرام کا دروازہ کھلا رہا طرح طرح کی نعمتیں ان کو پہنچتی رہیں، پھر کیسا انتقام ان سے لیا گیا، اور ان لشکروں پر عذاب کا سبب بھی وہ کمزور اور تھوڑے سے لوگ ہوئے جن کو یہ لشکروں والے اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کے بل بوتے پر بہت ذلیل کئے ہوئے تھے،

فِرْعَوْنَ وَ ثَمُوْدَ ۝

فرعون اور ثمود کے

فرعونیوں کو ایک مدت تک حکومت ونعمت عطا کئے رکھی، جس کی وجہ سے ان کو بنی اسرائیل پر مکمل تسلط وغلبہ حاصل تھا، چنانچہ وہ ان سے بیگار لیتے اور انتہائی ذلت آمیز سلوک کرتے تھے، پھر چند روز کے اندر وہ تمام مال واسباب، حکومت واقتدار فرعونیوں سے چھین کر بنی اسرائیل کے حوالے کردیا، اور دیکھتے ہی دیکھتے فرعونیوں کو دریائے قلزم میں غرق کردیا۔

قوم ثمود کی مادی ترقی

قوم ثمود کو بھی بہت طاقت وقوت سے نوازا، یہاں تک کہ ان کی ایک ہزار سات سو بستیاں آباد تھیں، جو سب کی سب سنگ تراشی کر کے بنائی گئیں تھیں، وہ حضرت صالح علیہ السلام، کمزور مسلمانوں اور حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کے ساتھ ہتک آمیز رویہ اپنائے ہوئے تھے، جس کے سبب وہ سب کے سب ایک کڑک سے ہلاک کردیئے گئے، اور وہاں کے بدبخت اور شر پسند لوگ حضرت صالح علیہ السلام کی بددعا سے اندھے ہوگئے۔

پس یہ قصے عقلمندوں کی عبرت کے لئے کافی ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ کے انعام پر مغرور نہ ہوں اور اس کے انتقام سے ڈرتے رہیں۔ مگر کافر لوگ عبرت نہیں پکڑتے، وہ غرور وبے خوفی میں گرفتار ہیں۔

بَلِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فِیْ تَکْذِیْبٍ ۝

کوئی نہیں بلکہ منکر جھٹلاتے ہیں

یعنی یہ کافر لوگ ان قصوں سے عبرت پکڑنے کی بجائے ان کو جھٹلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اہلِ

تاریخ نے محض غرابت پیدا کرنے کے لئے یہ قصے گھڑ لئے ہیں، حالآنکہ وہ یہ غور نہیں کرتے کہ فرض کرو یہ قصے حقیقت نہ بھی ہوں تو اللہ کی قدرت تو ہر شخص ہر وقت نمایاں دیکھ رہا ہے کہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے، پھر اگر وہ اپنے وجود کے اندر ہی غور کرلیں تو ان کو اللہ کی قدرتِ معلوم ہو جائے کہ صرف سانس کو ہی دیکھیں جس پر انسان کی زندگی قائم ہے یہ بھی اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہے۔

وَّ اللّٰهُ مِنْ وَّرَآئِهِمْ مُّحِيْطٌ ○

اور اللہ نے اُن کو ہر طرف سے گھیر رکھا ہے

یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کو آگے سے پیچھے سے گھیر رکھا ہے، ان سے پہلے زمانے کے سرکشوں کو اس نے ہلاک کیا، اور ان کے بعد بھی بہت سوں کو ہلاک کرے گا، لہٰذا ایسے واقعات جو ہر وقت نمودار ہوتے رہتے ہیں ان کا انکار کرنا بالکل بے جا ہے۔

لفظ ''وراء'' کی لغوی تحقیق

یہ لفظ اصل لغت میں اس چیز پر بھی بولا جاتا ہے جس کو کوئی دوسری چیز چھپائے، اور اس پر بھی بولا جاتا ہے جو کسی دوسری چیز کو چھپائے، اسی طرح ''آگے'' کے لئے بھی یہ بولا جاتا ہے، جس طرح ''پیچھے'' کے معنی میں آتا ہے، آیت میں اشتراک معنوی، یا عموم مجاز کے طور پر دونوں معنوں کو شامل ہے۔

آگے یہ بیان فرماتے ہیں کہ اوپر کا قصہ صرف اہلِ تاریخ نے ہی بیان نہیں کیا بلکہ یہ قرآنِ قدیم ہے، خارج میں عملی طور پراس قصے کے وقوع سے پہلے یہ لکھا ہوا ہے، چنانچہ فرمایا:

بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ○ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ○

کوئی نہیں یہ قرآن ہے بڑی شان کا　　لکھا ہوا لوح محفوظ میں

لوحِ محفوظ کی تحقیق

یعنی یہ قصہ ایک ایسی تختی پر لکھا گیا ہے، جو انسانوں، جنوں اور شیاطین کے دخل سے محفوظ ہے، اس کے اندر کوئی تصرف نہیں کرسکتا، ایسا ممکن نہیں کہ اس میں کوئی کمی یا زیادتی کرسکے، یا تحریف والحاق کرسکے، لہٰذا ایسی محفوظ چیز کے متعلق جھوٹ یا بناوٹ کا گمان کرنا خلافِ عقل ہے۔

امام بغویؒ نے تفسیر معالم التنزیل میں حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کی سند سے ایک روایت نقل کی ہے کہ ''لوح محفوظ'' ایک سفید موتی کی طرح ہے، جس کی لمبائی اتنی ہے جتنی زمین سے آسمان تک ہے، اور چوڑائی کا فاصلہ اتنا ہے جتنا مشرق ومغرب کے درمیان ہے، اور اس کے کناروں پر یاقوت جڑے ہوئے ہیں، اس کی دونوں دفتیاں (جلد کے گتے) سرخ یاقوت کی ہیں، نور کے قلم سے اس میں کلام قدیم لکھا ہوا ہے، اس کا ایک سرا عرش سے معلّق ہے، نچلا سرا ایک معزز فرشتے کی گود میں ہے اور وہ عرشِ عظیم کی دائیں طرف کھڑا ہے، اس لوح کے سرے پر یہ عبارت لکھی ہوئی ہے

''لا الـه إلا الـلـه وحده دينه الإسلام و محمدٌ عبده و رسوله فمن اٰمن بالله عز و جل و صدق بوعده واتبع رسوله ادخله الجنة'' اللهم اجعلنا منهم

مقدمہ سورۂ طارق

سورۂ طارق مکی ہے، اس میں انتیس (۲۹) آیات، اکسٹھ (۶۱) کلمات، اور دو سو انتالیس (۲۳۹) حروف ہیں۔

سورۂ بُروج کے ساتھ ربط

سورۂ بروج کے ساتھ اس سورت کا ربط کلام کی مناسبت ہے، یعنی دونوں کی ابتداء میں آسمان، بروج اور ستاروں کی قسم ہے، اور دونوں کی انتہا میں غیب کی چیزوں مثلاً لوح محفوظ، آسمان، آدمی کی جان، کے لئے محافظت الٰہی کا ذکر ہے، سو یہ ایسی چیزیں ہیں جو ظاہر ہیں ان کے بیان کی حاجت نہیں۔

وجہ تسمیہ

اس سورت کا نام سورۂ طارق اس لئے رکھا گیا ہے کہ اس میں ''طارق'' کا ذکر آیا ہے۔

طارق کی تحقیق

طارق لغتِ عربی میں اس مہمان کو کہتے ہیں جو رات کے وقت آئے، اسی طرح رات کے وقت پیش آنے والے واقعہ کو بھی ''طارق'' کہہ دیتے ہیں اسی لئے حدیث میں آیا ہے "**نعوذ باللہ من طوارق اللّیل**" ہم اللہ سے رات کو اچانک پیش آنے والے شر سے پناہ مانگتے ہیں۔ کیونکہ ایسے پیش آنے والے شر سے بچنا مشکل ہوتا ہے۔

عرب شعراء نے اپنے اشعار میں معشوق کے خیال کو ''طارق'' سے تعبیر کیا ہے، کیونکہ معشوق کا خیال بھی بار بار آجاتا ہے اور فراغت کے وقت زیادہ آتا ہے، اور خاص طور پر رات کو فراغت زیادہ ملتی ہے اس لئے معشوق کا خیال بھی رات کو زیادہ آتا ہے، اس لئے اس کو انہوں نے طارق کہا ہے۔

حدیث میں بھی یہ لفظ آیا ہے، چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسافر کو ''طروق'' سے منع فرمایا ہے، طروق کا معنی ہے اچانک رات کے وقت گھر آجانا، اس سے منع اس لئے فرمایا تاکہ گھر والی بن سنور لے، صاف ستھری ہو پائے، اچانک جانے کی صورت میں ممکن ہے پراگندہ حالت میں اس کو

دیکھے تو نفرت ہو جائے۔

سورت میں ''طارق'' سے کونسا ستارہ مراد ہے

(۱) اس سورت میں طارق سے مراد آسمان کے تمام تارے ہیں، اس لئے کہ وہ سب دن کو چھپ جاتے ہیں اور رات کو آسمان پر ظاہر ہو جاتے ہیں۔

(۲) بعض علماء نے کہا ہے کہ یہاں طارق سے مراد ''زحل ستارہ'' ہے، جو چوتھے آسمان پر ہے، اور سب سے اونچا ہے، اس کی شعاع ساتوں آسمانوں کی تاریکی کو سوراخ کرتی ہوئی زمین پر آ کر پڑتی ہے، وہ چونکہ سب سے زیادہ روشن ہے اس لئے وہی مراد ہے۔

(۳) بعض نے کہا ہے کہ ''ثریا'' مراد ہے اس لئے کہ وہ بہت سے ستاروں کا مجموعہ ہوتا ہے اس کی روشنی بھی تیز ہوتی ہے۔

(۴) اکثر علماء کی رائے یہ ہے کہ کوئی خاص تارا مراد نہیں بلکہ جنس مراد ہے، ہر ایک ستارہ اس میں داخل ہے۔ اس لئے کہ ہر ستارے میں مندرجہ ذیل تین صفات مشترک پائی جاتی ہیں۔

(۱) ہر ایک ستارہ اپنی روشنی سے تاریکی دور کرتا ہے۔

(۲) ہر ستارے سے انسان کو سمت و اطراف کا پتہ چلتا ہے کوئی مشرق میں ہو یا مغرب میں، سمندر کا سفر کر رہا ہو یا خشکی کا۔

(۳) ان کی وجہ سے آسمان شیاطین کی دخل اندازی سے محفوظ ہیں۔ اور یہ حفاظت دو وجہ سے ہے، ایک تو اِس کی وجہ سے کہ شیاطین دخانی مادے سے پیدا کئے گئے ہیں، اس لئے وہ طبعی طور پر ظلمت و تاریکی کو پسند کرتے اور روشنی سے بھاگتے ہیں۔ چنانچہ تجربہ ہے کہ شیاطین کا غلبہ اندھیرے اور اندھیر مکان میں ہوتا ہے، جس جگہ چراغ و شمع روشن ہوتی ہو وہاں ان کا دخل کم ہوتا ہے، تو جب آسمان کو ان نورانی قندیلوں سے روشن کیا تو ان کی روشنی کی وجہ سے شیاطین بھاگتے ہیں۔

دوسری وجہ ستاروں کے ذریعہ آسمان کی حفاظت کی یہ ہے کہ فرشتے ستاروں کی شعاعوں کی گیندیں بنا کر شیاطین کو مارتے ہیں جیسے توپ کے گولوں سے دشمن مارا جاتا ہے، تو گویا ستاروں کے ذریعہ آسمان کی حفاظت کی مثال ایسی ہوئی جیسے قلعوں کی حفاظت توپوں سے ہوتی ہے کہ توپیں قلعوں کی فصیلوں، اور بُرجوں میں لگائی گئی ہوتی ہیں۔

البتہ دونوں باتوں میں فرق صرف اس قدر ہے کہ اہلِ عرب کی لغت میں تاروں اور انکی شعاعوں سے بنے ہوئے گولوں دونوں کو نجم، کوکب اور ہندی میں تارا کہا جاتا ہے، لیکن توپ کے گولے کو توپ نہیں کہا جاتا۔

روح فنا نہیں ہوتی

ستاروں کے ان فوائد کو جا بجا قرآن کریم میں بیان کیا گیا ہے، اور یہ تینوں وصف جو کہ ہر ستارے کے اندر موجود ہیں وہ اس قَسم میں (جو قَسم سورہ کے شروع میں کھائی گئی ہے) منظور ہیں، اس لئے کہ اس قَسم کے ذریعہ سے جس مضمون کی تاکید فرمائی گئی وہ ہے آدمی کی جان (روح) کا محفوظ ہونا، یعنی اگرچہ انسان کی جان (روح) تکالیف اور شدائد کا شکار ہوتی رہتی ہے مگر اللہ تعالیٰ کی حفاظت کی وجہ سے بالکل ٹوٹ جانے اور فنا ہونے سے محفوظ رہتی ہے، چنانچہ حدیث میں وارد ہے "إنّما خلقتم للأبد"، یعنی آدمی جو نام ہے حقیقت میں روح کا وہ ابدی ہے وہ فنا ہونے والی نہیں ہے۔

عرف میں جو یہ کہا جاتا ہے کہ موت جان کو ہلاک کر دیتی ہے یہ محض مجاز ہے، ورنہ موت کا زیادہ سے زیادہ اثر یہ ہے کہ روح کو بدن سے جُدا کر دیتی ہے اور بدن روح کے بغیر جو کہ بدن کی مربی اور نگہبان ہے بکھر کر رہ جاتا ہے، روح فنا نہیں ہوتی۔

اور روح کے عدمِ فنا پر ہی عالم برزخ کا وجود اور حشر و نشر کا ثبوت موقوف ہے، چنانچہ اس سورت میں بھی معاد کو اسی طریق سے ثابت کیا ہے۔

ثبوتِ معاد پر استدلال

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ انسان دو چیزوں سے مرکب ہے ایک بدن، دوسرے روح، اور روح ہی اس کا جزو اعظم ہے، جو کسی طرح کے تغیر و تبدل کو قبول نہیں کرتی، بدن تو اس کے لباس کی طرح ہے، کہ جب ماں کے پیٹ میں تھا تو کسی اور رنگ پر تھا جب باہر آیا تو بچپن و لڑکپن میں اس کا اور رنگ تھا اور جوانی و بڑھاپے میں اس نے دوسرا ہی رنگ اپنا لیا۔

لہٰذا انسان کا جزو اعظم روح ہی ہے کہ شعور و ادراک اسی کی صفت اور لذت و تکلیف کا احساس کرنا اسی کا خاصہ ہے یہ فنا نہیں ہوتی، اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ نگہبانوں کے ہاتھوں میں مقید رہتی

ہے، جب روح باقی رہتی ہے تو مرنے کے بعد بدن کو دوبارہ روح کے ساتھ جمع کر کے اسی شکل وصورت میں بنا دینے میں کیا تعجب ہے؟ جب کہ انسان کی پیدائش سے لے کر آخر عمر تک یہی معاملہ نظر آتا ہے۔

فائدہ (۱) اور جب نگہبان فرشتوں کے ذریعہ روح کی حفاظت کی دلیل کا ثبوت آسمان کی حفاظت کے ثبوت پر موقوف تھا جو ستاروں کے ذریعہ ہوتی ہے، تو اس لئے پہلے اس بات کو ثابت کرنے کے لئے آسمان وستاروں کی قسم ذکر فرمائی، اور اس سورت کا نام ہی ستارے کے نام پر رکھا کہ اصل مقصود کا ثبوت اسی پر موقوف ہے۔

فائدہ (۲) یہاں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اس سورت کے شانِ نزول سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ''طارق'' سے مراد ٹوٹنے والا تارا ہے جس کو ''شہاب'' کہتے ہیں۔

حقیقت میں یہی شیطانوں کو آسمان پر جانے سے روکتا اور ان کو جلاتا ہے، اگرچہ یہ ستاروں کی شعاع سے توپ کے گولے کی طرح پیدا ہوتا ہے، پس بہتر یہی ہے کہ ''طارق'' سے مراد شہابِ ثاقب لیا جائے۔

شانِ نزول

ایک دن ابوطالب، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر آئے ہوئے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے آگے دودھ اور روٹی رکھی، دونوں کھانے ہی لگے تھے کہ آسمان سے ایک تارا ٹوٹا جو زمین کے اس قدر قریب ہوا کہ سارا گھر روشنی سے جگمگا اُٹھا، ابوطالب کی آنکھیں چندھیا گئیں، گھبرا کر کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ آسمان کا تارا ہے، آسمانوں کی حفاظت کے لئے یہ شیاطین پر پھینکا جاتا ہے، اور یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے، ابوطالب حیران ہو کر خاموش ہوگئے، اتنے میں جبرئیل امین سورۂ طارق لے کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچ گئے۔

اس سورت میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ انسان کو قدرت کی ان نشانیوں کو دیکھتے ہوئے، اسلام کے عقائد حقہ پر مضبوط ہو جانا چاہئے، ان نشانیوں کو محض بے مقصد نہیں سمجھنا چاہئے، اس لئے کہ ایسی نشانیاں انسان کے حشر ونشر اور دوبارہ اُٹھائے جانے کے اوپر بڑی دلیل ہیں۔ اس لئے کہ

آسمان جب اپنی اتنی بلندی وعظمت کے باوجود اللہ کی حفاظت کا محتاج ہے، کہ شیاطین سے حفاظت کے لئے اس میں ستارے گاڑے گئے، تو آدمی کی جان جو نہایت ہی کمزور و ناتواں واقع ہوئی ہے وہ ایسی مصیبتوں اور حادثات کی کشمکش میں اللہ کی حفاظت کے بغیر کیسے سلامت رہ سکتی ہے۔

جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ انسان کی جان اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہے زندگی میں بھی اور موت کے بعد بھی، تو اب یہ سمجھ لینا چاہئے کہ موت کے بعد کی نعمتیں اور تکلیفیں اللہ تعالیٰ کے دستِ قدرت میں ہیں۔ باقی رہا حال بدن کا سو غور وفکر کے بعد اس کے دوبارہ پیدا ہونے کو سمجھ لینا چاہئے۔

تمت المقدمة والحمدلله

تفسیر سورۂ طارق

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ ۝

قسم ہے آسمان کی اور اندھیرے میں آنیوالے کی

یعنی آسمان اور اس کے ستارے کی قسم ہے جو رات کے وقت نمودار ہوتا ہے۔

رات کو دوڑتا ہوا تارہ کیا چیز ہے؟

اس میں لوگوں کو تردد واختلاف ہے کہ رات کو دوڑتا ہوا جو تارا نظر آتا ہے یہ کیا چیز ہے؟ بعض کہتے ہیں کہ اس کی حقیقت یہ ہے کہ زمین سے دھواں اُٹھ کر اوپر جاتا ہے جب کرۂ نار میں پہنچتا ہے تو اس میں تیل کا جو مادہ باقی رہ گیا ہوتا ہے وہ جل اُٹھتا ہے تب یہ شعلہ نظر آتا ہے پھر اگر یہ دھواں لطیف ہو تو جلد بُجھ جاتا ہے، اور اگر گاڑھا ہو تو کئی دنوں تک یہ نیزے کی شکل میں، یا دُمدار ستارے کی شکل میں یا کسی اور صورت میں نظر آتا رہتا ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ فلکِ قمر کے نیچے آگ کا کُرہ ہے اس میں کبھی ستاروں کی شعاعوں کے جمع ہونے کے نتیجے میں تیز حرکت ہوتی ہے اس حرکت کی وجہ سے ایک شعلہ پیدا ہوتا ہے، پھر اس شعلے سے چنگاری کی طرح کوئی چیز نیچے گرتی ہے، اور طبقۂ دخانیہ میں وہ دوڑتی ہوئی چیز معلوم ہوتی ہے، یہ طبقۂ دخانیہ کرۂ آگ اور ہوائے محض کے درمیان واقع ہے، پھر وہ چنگاری جب طبقۂ زمہریر میں پہنچتی ہے تو جم جاتی

ہے اس لئے نظروں سے غائب ہو جاتی ہے۔

ان دونوں باتوں میں بہت کچھ قابلِ تحقیق ہے (یعنی یہ دونوں باتیں محقق نہیں ہیں) اس لئے کہ جو ستارہ دوڑتا ہوا معلوم ہوتا ہے اس کی روشنی بالکل دھوئیں آگ کے شعلے سے نہیں ملتی، بلکہ اس کی روشنی کامل طور پر آسمانی معلوم ہوتی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس ستارے کی حرکت کی سمت اوپر سے نیچے یا نیچے سے اوپر کی طرف نہیں ہوتی، تا کہ یہ کہا جائے کہ زمین سے اوپر جانے والے دھوئیں کا شعلہ ہے یا گرنے والا انگارہ ہے بلکہ اس کی حرکت اکثر اوقات دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں کی طرف ہوتی ہے۔ سو واضح طور پر جو بات معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ اس ستارے کی یہ حرکت اس کی ذاتی نہیں ہے، بلکہ کوئی زبردست ارادے اور اختیار والا اس کو دوڑاتا ہے۔ چنانچہ اسی تردد کو دور کرنے کے لئے سوال و جواب کے انداز میں فرماتے ہیں:

وَمَآ اَدْرٰکَ مَا الطَّارِقُ ؀

اور تو نے کیا سمجھا کیا ہے اندھیرے میں آنے والا

النَّجْمُ الثَّاقِبُ ؀

وہ تارا چمکتا ہوا

وہ ایسا تارا ہے جو شیطانوں کی آنکھ کو چکا چوند کر دیتا ہے، اور کبھی اس سے ایسا شعلہ نکلتا ہے کہ شیطان کو جلا کر رکھ دیتا ہے، جب اس کی شعاع چمکتی ہے تو چمگادڑ کی طرح شیطان کی آنکھیں چُندھیا جاتی ہیں۔

طارق کی حقیقت بیان کرنے کے بعد اب اصل مضمون کو بیان فرماتے ہیں جس پر قسم کھائی تھی۔

چنانچہ فرمایا:

اِنْ کُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَیْهَا حَافِظٌ ؀

کوئی جی نہیں جس پر نہیں ایک نگہبان

یعنی کوئی جان خواہ چھوٹی ہو یا بڑی نیک ہو یا بُری ہر ایک پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نگہبان فرشتہ مقرر ہے جو ہر طرح کی سختی اور صدمے کے وقت اس کی حفاظت کرتا ہے اور اس کو فنا ہونے سے بچاتا ہے۔

انسان کی حفاظت کرنے والے فرشتے

یہاں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ انسان کی روح کو فنا ہونے سے بچانے کے لئے ایک خاص فرشتہ ہے، جس کا تعلق حضرت اسرافیل علیہ السلام کے لشکر سے ہے، روح کی حفاظت کے سلسلے میں اس کا آخری کام یہ ہوگا کہ دونوں نفخوں کی درمیانی مدت کے دوران وہ روح کو صور کے اندر ڈال دے گا۔

اس کے علاوہ انسان کے دیگر کاموں کی نگرانی کرنے والے اور اس کی حفاظت کرنے والے اور بہت سے فرشتے ہیں، جو دن رات کے اوقات میں باری باری انسان کی نگرانی کرتے، اور حفاظت کرتے ہیں، جب تک تقدیر الٰہی انسان کو تکلیف پہنچنے کی طرف متوجہ نہ ہو وہ حفاظت کرتے ہیں، جب تکلیف کا وقت مقدر آجاتا ہے تب وہ فرشتے حفاظت سے ہاتھ کھینچ لیتے ہیں، اور تقدیر غالب آجاتی ہے۔

حدیث میں آتا ہے "وُکِّل بالمؤمنین مائة وستون ملکاً یذبون کما یذب عن قصعة العسل الذباب، ولو وُکّل العبد إلی نفسه طرفة عین، لأختطفتهُ الشیاطین عضواً عضواً"

ترجمہ:۔ ہر مسلمان کی حفاظت کے لئے ایک سو ساٹھ فرشتے مقرر کئے گئے ہیں، جو اس سے شیاطین کو اس طرح دور ہٹاتے ہیں جس طرح مکھی کو شہد کے پیالے سے دور ہانکا جاتا ہے، اگر بندے کو ایک لمحہ کے لئے بھی اس کے نفس کے حوالے کیا جائے تو شیاطین اس کی بوٹی بوٹی اُڑا کر لے جائیں۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مسلمان کی حفاظت کے لئے دیگر انسانوں سے زیادہ فرشتے مقرر ہیں، اس لئے کہ ایمان کی وجہ سے جتنے اس کے دشمن ہیں کافر کے اتنے دشمن نہیں ہیں۔

انسانوں کے متعلق فرشتوں کی ذمہ داریاں

(۱) وہ فرشتے جو ہر انسان خواہ مومن ہو یا کافر کی حفاظت کرتے ہیں ان کا ذکر سورۂ رعد کی اس آیت میں آیا ہے: "له معقبت من بین یدیه و من خلفه یحفظو نه من امر الله" "اس کے پہرے والے ہیں بندہ کے آگے سے اور پیچھے سے، اس کی نگہبانی کرتے ہیں اللہ کے حکم سے" (ترجمہ شیخ الہندؒ)

(۲) ہر انسان کی روح کی حفاظت کرنے والے (اور اس کو قبض کرنے والے) فرشتوں کا ذکر سورۂ

انعام کی اس آیت میں ہے: "**وهو القاهر فوق عباده و يرسل عليكم حفظة ط حتى اذا جاء احدكم الموت توفته رسلنا وهم لا يفرطون**"

"اور وہی غالب ہے اپنے بندوں پر اور بھیجتا ہے تم پر نگہبان یہاں تک کہ جب آپہنچے تم میں سے کسی کو موت تو قبضہ میں لے لیتے ہیں اس کو ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے اور وہ کوتاہی نہیں کرتے" (ترجمہ شیخ الہندؒ)

(۴) انسان کے اچھے بُرے اعمال لکھنے والے فرشتے بھی ہیں ان کا ذکر سورۂ انفطار میں ہے:

"**ان عليكم لحافظين كراما كاتبين**" "بیشک تم پر نگہبان مقرر ہے عزت والے لکھنے والے"

(۵) اور ایک فرشتہ وہ ہے جو انسان کے منہ سے نکلے ہوئے ہر لفظ کو لکھتا ہے اور اسے گن کر رکھتا ہے اس کا ذکر سورۂ "ق" میں ہے: "**ما يلفظ من قول الا لديه رقيب عتيد**" "نہیں بولتا کچھ بات جو نہیں ہوتا راہ دیکھنے والا تیار" (ترجمہ شیخ الہندؒ)

اس سورت میں روح کو فرشتوں کی حفاظت میں فنا ہونے سے بچا کر رکھنا بتانا مقصود ہے، یہ حفاظت سب کے لئے ہے اس میں کوتاہی نہیں ہوتی۔

جب انسان کو معاد کی بحث معلوم ہوگئی، یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اس کی روح ہمیشہ باقی رہے گی فنا نہیں ہوگی، جس طرح موت سے پہلے اس کا بدن اور روح اللہ کے قبضے میں تھا موت کے بعد بھی اس کے قبضے میں رہے گا، تو اب وہ یہ سمجھ گیا کہ انسان کی ذات حقیقت میں صرف روح ہے، بدن تو محض لباس کی طرح ہے، سو روح جب مالکِ حقیقی کے قبضۂ قدرت میں ہے تو اب معاد کے واقع ہونے، حشر ونشر کے حق ہونے کا اعتقاد کرنے میں اس کو کوئی تردد نہ رہا، البتہ اس کے متعلق اس کو استبعاد معلوم ہوتا ہے، یہ بات ذرا مشکل و دشوار ضرور معلوم ہوتی ہے مگر ناممکن معلوم نہیں ہوتی، معاد (مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے) کے بارے میں اس کو استبعاد اس لئے ہوتا ہے کہ وہ سوچتا ہے کہ بدن کے اجزاء مرنے کے بعد منتشر ہو جاتے ہیں کچھ مٹی میں مل کر نیست و نابود ہو جاتے ہیں کچھ حیوانوں کے پیٹ میں چلے جاتے ہیں، پھر حیوانات دور دراز علاقوں میں جا کر مرتے ہیں اور خس و خاشاک بن جاتے ہیں، ان سب متفرق اور بکھرے ہوئے اجزاء کو جمع کرنا اور ایک ایک جزو کے متعلق یہ معلوم کرنا کہ یہ فلاں بدن کا جز ہے یہ کام ظاہر بینِ عقل کو بہت دشوار معلوم ہوتا ہے، اسی لئے کسی کہنے والے نے کہا ہے (ہندی کا دوہہ ہے)۔

پات جھڑتے یوں کہیں سُن رے بنکی رائے
اب کے بچھڑے نا ملیں دور پڑیں گے جائے

انسان کے اس استبعاد و تعجب کو دور کرنے کے لئے ایک اور پہلو سے اس کو دعوتِ فکر دیتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

فَلْيَنظُرِ الْإِنسَانُ مِمَّ خُلِقَ ○

اب دیکھ لے آدمی کا ہے سے بنا ہے

یعنی انسان ذرا یہ تو دیکھے کہ اس کو کس چیز سے بنایا گیا ہے اور اس کے مادّہ کو کہاں کہاں سے جمع کر کے لایا گیا ہے۔

نطفہ کی تخلیق کے طویل ترین مراحل

انسان کا نطفہ خون کا خلاصہ ہے، اور خون غذاء سے حاصل ہوتا ہے، پھر غذا کی دو قسمیں ہیں:

(۱) غذا نباتات سے حاصل کی گئی ہو گی یا (۲) حیوانات سے۔

اگر غذا نباتات سے حاصل کی گئی ہے تو نباتات کی بہت قسمیں ہیں، اناج، ترکاریاں، پھل، میوے، اور گرم و سرد مصالحے وغیرہ۔

اگر غذا حیوانات سے حاصل کی گئی ہے تو اس کی بھی کئی قسمیں ہیں، حیوان کا گوشت، دودھ، گھی، چربی، انڈہ وغیرہ۔

اور علمِ طب میں یہ تحقیق ہو چکی ہے کہ صحت افزاء غذا کھانے کے بعد جب ستر گھنٹے گذر جاتے ہیں تو مَنی پیدا ہوتی ہے، لہٰذا اب انسان اپنی ہر روز کی غذا کے بارے میں غور کر لے مثلاً یہ کہ چاول کہاں سے آئے، زمین کے کون سے علاقے میں پیدا ہوئے، جس کھیت میں اُگائے گئے، وہ کس گاؤں میں ہے اور وہ گاؤں کس تحصیل میں ہے اور وہ تحصیل کس ضلع میں ہے، وہ ضلع کون سے صوبے کا ہے اور وہ صوبہ کس ملک کا ہے جس ملک میں یہ چاول بوئے گئے، پھر کاٹے گئے، وہاں سے انہیں اُٹھایا گیا، صاف کئے گئے، حمل و نقل کے ذرائع حرکت میں آئے، انہیں اُٹھا کر منڈی تک پہنچایا گیا، وہاں سے ان کو دکانوں اور بازاروں تک پہنچایا گیا، کس نے یہ سارے مراحل طے کرانے پر ان لوگوں کو مجبور و تیار کیا

، کہ آخر میں میں نے جا کر دکان سے ان کو خریدا کہ اب وہ پکا کر کھانے کے قابل ہو چکے تھے، اسی طرح انسان دیگر ضروریات کے بارے میں غور و فکر کرے، یہ بھی سوچے کہ اسی طرح میرے والدین کو بھی طرح طرح کی غذائیں دور دراز سے لا کر کھلائی گئیں تھیں، پھر میرا نطفہ ان کے بدن میں پیدا ہوا تھا اور اس سے میں پیدا ہوا۔

لہٰذا جب وہ ذات جو روزانہ کی غذا میں اتنے دور دراز پھیلے اور بکھرے ہوئے اجزا کو جمع کر دیتی ہے، اگر ان سب کو ایک جگہ جمع کیا جائے تو اس کا حجم انسان کے بدن سے ہزاروں گنا بڑا ہو، سو اس قادرِ مطلق ذات کے لئے کیا مشکل ہے کہ چالیس سال کی طویل مدت میں جو دونوں نفخوں کی درمیانی مدت ہے انسانی بدن کے بکھرے ہوئے اجزا جو مقدار میں بھی کم ہیں جمع کر دے اور گوشت پوست چڑھا کر انسانی شکل میں کھڑا کر دے؟

یہاں تک جو مراحل پیش آئے ہیں وہ نطفہ بننے تک کے مراحل ہیں، اس کے بعد مزید اس بات پر بھی غور کیا جائے کہ غذا سے نطفہ بنانے کے بعد نطفہ کو کہاں سے کہاں اور کس طرح پہنچاتے ہیں، نطفہ کے گذرنے والے راستے میں بڑی بڑی سخت ہڈیاں پہاڑوں کی طرح حائل ہیں، مگر اس کے باوجود نطفہ کو دماغ سے کھینچ کر کس طرح عضوِ مخصوص تک پہنچاتے ہیں پھر وہاں سے رحم مادر میں کیسے منتقل ہوتا ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ ۝

بنا ہے ایک اُچھلتے ہوئے پانی سے

یہ اُچھلتا ہوا پانی مرد و عورت کی منی ہے جو رحم میں ایک دوسرے کے ساتھ مل جانے کے بعد ایک ہو جاتی ہیں۔

اُچھلنا اگرچہ مرد کی منی کا خاصہ ہے لیکن مل جانے کے بعد چونکہ دونوں ایک ہو جاتی ہیں اس لئے تغلیباً مرد کی منی کی صفت کا اطلاق دونوں پر کر دیا۔

بعض طبیبوں کی رائے یہ ہے کہ عورت کی منی بھی رحم میں اُچھلتی ہے لیکن رحم کی گہرائی کی وجہ سے اس کا پتہ نہیں چلتا، چنانچہ انزال کے وقت عورت کا تھرتھرا اُٹھنا اس بات کی دلیل ہے۔

اور اس غذا کا ھضم کے درجات طے کرنے کے بعد منی کی صورت اختیار کر لینے کی حقیقت اس بات

کی واضح دلیل ہے کہ حق تعالیٰ کے لئے کسی چیز کو ایک صورت سے بدل کر دوسری صورت میں بنالینا بہت آسان ہے۔

يَّخْرُجُ مِنْۢ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ ۝

جو نکلتا ہے پیٹھ کے بیچ سے اور چھاتی کے بیچ سے

منی کا مرکز اور راستہ

مادۂ منی دماغ سے نزول کرتا ہے، دونوں کانوں کے پیچھے جو دو رگیں ہیں ان سے گذرتا ہوا نخاع میں آتا ہے اور نخاع کا مقام سینے اور پیٹھ کے درمیان ہے، پھر مرد کا مادہ پیٹھ کے منکوں سے گذرتا ہوا گردوں میں پہنچتا ہے، وہاں سے خصیوں میں آ کر جمع ہوتا اور وہاں سے عضوِ مخصوص کی نیچے کی رگ کے راستے رحم میں جا کر گرتا ہے اور عورت کا مادہ بھی سینے سے اسی طرح رحم کے اندر اس کے خصیوں میں آتا ہے، پھر جماع کی حرکت کی وجہ سے رحم کے اندر گرتا ہے، رحم کے اندر یہ دونوں مادے آپس میں مل جاتے ہیں۔

اس آیت سے مادۂ منویہ کے گذرنے کو بیان کرنا مقصود ہے کہ کس طرح ایسی سخت راہ سے اس کو گذارا جاتا ہے کہ دونوں طرف سخت ہڈیاں ہیں مگر اس کے باوجود وہ گذر کر انتہا تک پہنچ جاتا ہے، یہ بتانا مقصود نہیں کہ مادہ منویہ سینے یا پیٹھ کی ہڈیوں میں پیدا ہوتا ہے ورنہ یہ بات اہلِ طب کی تحقیق کے خلاف ہوگی، اس لئے کہ ان کے نزدیک مادۂ منویہ تمام اعضاء سے لیا جاتا ہے اسی وجہ سے اولاد کی مشابہت اپنے والدین کے ساتھ جسم کے تمام اعضاء میں ہوتی ہے۔ تمام اعضاء سے یہ مادہ دماغ میں جمع ہوتا ہے وہاں سے کانوں کے پیچھے کی رگوں کے راستے نیچے نزول کرتا ہے۔

جب انسان کو اپنی روح کے متعلق یہ معلوم ہو گیا کہ اس کی بقا اللہ تعالیٰ کے قبضہ وتصرف میں ہے اور اپنی غذاء کے اجزاء متفرقہ کے جمع ہونے کی کیفیت، اور ابتدائے پیدائش کے وقت انسان کا مادے کی شکل میں ہونا پھر اس مادے کا ایک صورت سے دوسری صورت میں اور ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا بھی ظاہر ہو گیا اس طرح اس نے مبداء ومعاش کو اچھی طرح جان لیا تو پس اگر وہ انہی دو حالتوں (مبداء ومعاش) پر آخرت کو بھی قیاس کرے تو اس کو اس بات کا بھی یقین ہو جائے گا کہ:

اِنَّهٗ عَلٰى رَجْعِهٖ لَقَادِرٌ ۝

بیشک وہ اُس کو پھیر لاسکتا ہے

یعنی وہ اللہ جو مذکورہ طریقے سے، انسان کو پیدا کرنے والا ہے، وہ اس پر طاقت وقدرت رکھتا ہے کہ انسان کو دوبارہ پیدا کردے۔

حدیث میں آتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ مُردوں کو زندہ کرنے کا ارادہ فرمائے گا تو ایک بارش عرش عظیم سے برسائے گا، اس بارش میں انسان کی منی کی خاصیت ہوگی اوراس کے اندر تولید وپیدائش کی قوت ودیعت رکھی ہوگی، تاکہ مُردے کے بدن کے اجزا زندگی قبول کرنے کے لئے تیار ہوسکیں اور ارواح کا تعلق ان سے صحیح ہوسکے۔

لیکن یہ دوبارہ لوٹانا ایک وقت مقررہ پر موقوف ہے جس کو اس آیت میں بیان فرمایا ہے:

يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ ۝

جس دن جانچے جائیں بھید

یعنی جس دن چھپی باتیں ظاہر ہوجائیں گی۔

پوشیدہ باتوں کے ظاہر ہونے کی تحقیق

تحقیق اس مقام کی یہ ہے کہ دنیا میں انسان پر بدن کے احکام غالب ہیں اور روح کے احکام مغلوب ہیں، اسی لئے انسان روح کے اوصاف کو تکلف و بناوٹ سے دنیا میں چھپا سکتا ہے، بدن پر ان کے آثار ظاہر نہیں ہونے دیتا جیسے خوف وگھبراہٹ کے آثار کو چہرے پر ظاہر نہیں ہونے دیتا، مگر قیامت کے دن معاملہ برعکس ہوگا کہ روح کے احکام غالب ہوں گے اسی وجہ سے وہ سیاہی جو روح کے جوہر میں پوشیدہ تھی وہاں چہرے کی سیاہی بن کر ظاہر ہوجائے گی، اور اسی طرح جو رحیں بدن کے اعضاء میں پھیلی ہوئی ہیں وہ قیامت کے دن اعضاء کے افعال پر گواہی دیں گی، الغرض تمام اندرونی پوشیدہ اوصاف ظاہر ہوجائیں گے،

اور جب انسان کو دوبارہ زندہ کرنا جزا کے لئے ہے تو ضروری ہوا کہ وہ اسی وقت پر موقوف ہو ورنہ اس سے پہلے اس کو لوٹانا حکمت کے خلاف ہوگا۔

سرائر کی تحقیق

(۱) لغت میں سرائر چھپی اور پوشیدہ چیزوں کو کہتے ہیں، یہاں پر اس سے مراد تمام عقائدِ باطلہ، فاسد و غلط نیتیں نیز تمام اچھے بُرے اعمال کے وہ آثار جو روح میں اس طرح سما گئے ہیں کہ روح کے اندر اچھے یا بُرے رنگ کی شکل انہوں نے اختیار کر لی ہے یہ سب ہیں۔

(۲) بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ''سرائر'' سے مراد پوشیدہ گناہ، اور وہ مکر و حیلے ہیں جن کو انسان دنیا میں چھپانے کی کوشش کیا کرتا تھا۔

(۳) بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ''سرائر'' سے مراد وہ فرائض ہیں جن کے ادا ہونے یا نہ ہونے کی اطلاع خود کرنے والے کے اظہار پر موقوف ہے، وہ خود خبر نہ دے تو دوسروں کو اس کی اطلاع نہیں ہو سکتی جیسے نماز، روزہ، وضوء، غسل جنابت اور زکوٰۃ وغیرہ واجبات ہیں، جو اللہ اور بندے کے درمیان واقع ہیں ان کا مطالبہ کوئی دوسرا نہیں کرتا نہ ان کی ادائیگی کا تعلق دوسرے کسی سے ہے، مثلاً اگر کوئی شخص روزے سے نہیں ہے مگر ظاہر کرتا ہے کہ وہ روزے سے ہے، یا جُنبی ظاہر کرتا ہے کہ اس نے غسل کر لیا ہے یا بے وضوء کہتا ہے کہ اس نے وضوء کر لیا ہے یا جو شخص زکوٰۃ نہیں دیتا مگر کہتا ہے کہ زکوٰۃ دیتا ہوں تو ایسے کو کہنے دیا جاتا ہے اس سے تحقیق و تعرض نہیں کیا جاتا۔

(۴) اور تحقیق یہ ہے کہ ''سرائر'' کا لفظ ان سب باتوں کو شامل ہے جو مفسرین نے بیان فرمائیں ہیں۔

فَمَا لَهٗ مِنْ قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ ؁

تو کچھ نہ ہوگا اُس کو زور اور نہ کوئی مدد کرنے والا

یعنی اس دن آدمی کو ایسی قوت نہیں ہوگی کہ اپنے رازوں کو چھپا سکے، جیسا کہ دنیا میں اندر کی بات چھپانے کی اس میں قوت تھی، خوف و گھبراہٹ کے وقت اپنے آپ کو تھامتا تھا اور باوجود سخت سزا اور مار پیٹ کے چوری بدکاری کا اقرار نہیں کرتا تھا۔ اور نہ ہی اس کا کوئی مددگار ہوگا جو جرم ظاہر ہو جانے کی صورت میں اس کو سزا سے بچا سکے جس طرح دنیا میں یار دوست ہوا کرتے تھے کہ جرائم پر سزا کے وقت آڑے آجاتے اور سزائیں معاف کروا دیا کرتے تھے۔

دنیا میں سزا سے نجات کے دو ہی طریقے ہیں یا تو پوشیدہ گناہ بالکل چھپا کر رکھے اور کسی طرح بھی

اس کو ثابت نہ ہونے دے پوچھنے پر انکار کر دے، یا پھر جرم ظاہر ہو جانے کی صورت میں دوست احباب کی مدد سے سزا سے اپنے کو بچالے، قیامت کے دن یہ دونوں طریقے بالکل نیست و نابود ہو جائیں گے تاکہ جو سزا کا مستحق ہے وہ سزا سے بچ نہ سکے ورنہ وہ دن بھی دنیا کے دنوں کی طرح درہم برہم ہو جائے گا پھر ''یوم فصل'' کیسے قرار پائے گا۔

گذشتہ دونوں آیتوں میں دو مضمون بیان ہوئے ہیں، ایک یہ کہ انسان کو روح و جسم کے ساتھ دوبارہ پیدا کرنا اللہ تعالیٰ کی قدرت میں ہے اور ایسا ضرور ہوگا، دوسرے یہ کہ قیامت کے دن تمام پوشیدہ اسرار و راز ظاہر ہو جائیں گے کوئی بھید بھید نہیں رہے گا، نہ کوئی حیلہ و تدبیر خفیہ رہ سکے گی۔

اب ان دونوں مضمونوں کو ثابت کرنے کے لئے دو دلیلیں بیان فرماتے ہیں چنانچہ فرمایا:

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ۝

قسم ہے آسمان چکر مارنے والے کی

یعنی آسمان اپنی حرکتِ دوریہ میں ہمیشہ گھوم کر اپنی چھوڑی ہوئی وضع کی طرف لوٹتا ہے، اور رات و دن کے ہر دورے میں اس کا ہر جز اپنی متروکہ وضع کی طرف رجوع کرتا ہے۔ بعض ستارے سال میں اپنی چھوڑی ہوئی وضع کی طرف لوٹتے ہیں، بعض مہینے میں اور بعض اس سے بھی جلدی اپنی وضعِ متروکہ کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔

پس انسانی روح کا سابقہ بدن کی تدبیر کے لئے حیاتِ متروکہ کی طرف لوٹ آنا کیا بعید ہے، اس لئے کہ اسی طرح ہر دن رات کو فلک کی حرکتِ دوریہ نظر آتی ہے۔

وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ ۝

اور زمین پھوٹ نکلنے والی کی

زمین کے پھٹنے سے طرح طرح کی نباتات اس سے ظاہر ہوتی ہیں، اس کے اندر سے چشمے پھوٹتے ہیں، زر و جواہر اس کی کانوں سے نکلتے ہیں۔ (اس پہ ذرا غور کریں تو) قیامت کے دن انسان کے نفس میں چھپے اسرار کے ظاہر ہونے میں کوئی بُعد معلوم نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ زمین کو بھی خزاں کے دنوں میں دیکھئے تو ساری نباتات اس میں پوشیدہ ہوتی ہیں نظر نہیں آتیں، مگر جب بہار کا موسم آتا ہے اس زمین پر

بارش برستی ہے، اس کی مٹی نرم ہوجاتی ہے تو تمام چھپی ہوئی سبزیات ونباتات ظاہر ہوجاتی ہیں۔ پس آخرت میں جب نفس پر روح کا فیضان ہوگا تو اس کا بھی یہی حال ہوگا۔ (دوبارہ تروتازہ ہوجائے گا)

بعض مفسرین نے ''رجع'' سے بارش مراد لی ہے، (بارش میں رجوع کے معنی پائے جاتے ہیں اس لئے کہ) سمندر سے بخارات اوپر کی طرف جاتے ہیں وہ جب طبقۂ زمہریر میں پہنچتے ہیں تو پانی بن کر واپس زمین پر برستے ہیں، اس تفسیر کے مطابق بھی بخارات کے مادّے کا اپنی اصلی ٹھکانے کی طرف لوٹ آنا ثابت ہوا، یہ دلیل ہے انسان کے عالم روحانی کی طرف لوٹ جانے کی کہ وہی اس کا اصلی ٹھکانا تھا، اس تفسیر کی صورت میں پہلا مضمون (انسان کا روح مع الجسد کے ساتھ دوبارہ پیدا کرنا) ثابت ہوگا

اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ۝

بیشک یہ بات ہے دوٹوک

یعنی یہ بات کہ اللہ تعالیٰ انسان کو دوبارہ پیدا کرنے پر قادر ہے اور یہ کہ دوبارہ پیدا کرنا موقوف ہے اسرار کے ظاہر ہونے کے وقت پر اور وہ قیامت کا دن ہے سو یہ (پوری) بات کھلی دوٹوک ہے اس میں کوئی شبہ نہیں ہے۔

وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ ۝

اور نہیں یہ بات ہنسی کی

یہ محض دل لگی کی بات نہیں کہ جو قوی دلیل کی بنیاد پر نہ کہی گئی ہو، یا شعراء کے مبالغوں کی طرح کوئی اصل نہ رکھتی ہو، جس طرح یہ کفار کہتے ہیں کہ پیغمبروں کے جزاوسزا کے متعلق وعدے اور وعیدیں ایسے ہیں جیسے بچوں کو فرضی ناموں سے ڈرایا جاتا ہے تاکہ وہ شرارت نہ کریں، اسی طرح پیغمبر بھی لوگوں کو اس لئے ڈراتے ہیں تاکہ عالم میں شر وفساد نہ پھیلے لوگ بُرے اعمال وافعال سے امنِ عالم خراب نہ کریں، اس لئے وہ اپنی عقل ودانش کی وجہ سے ترغیب وترہیب کے لئے یہ ساری باتیں کرتے ہیں، ورنہ حقیقت میں ان باتوں کی کچھ اصل نہیں ہے (العیاذ باللہ) اور ان باتوں کے محال وناممکن ہونے پر کفار بحثیں کرتے اور شبہے بیان کرتے ہیں، چنانچہ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

اِنَّهُمْ يَكِيدُونَ كَيْدًا ۝

البتہ وہ لگے ہوئے ہیں ایک داؤ کرنے میں

یعنی وہ لوگ قرآن کو قولِ فصل نہیں مانتے ہزل سمجھتے ہیں اور قرآن کے خلاف مکر و سازش کرتے ہیں، یعنی قرآن کے اثر کو زائل کرنے کے لئے شبہات پیدا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ عقل کے خلاف ہے، یہ اس لئے کرتے ہیں تا کہ عام لوگوں کے ذہن میں اس کا ہزل ہونا ثابت ہو جائے۔

وَّاَكِيْدُ كَيْدًا ۝

اور میں لگا ہوا ہوں ایک داؤ کرنے میں

یعنی ان کے داؤ اور مکر کے مقابلے میں میں بھی ایک داؤ میں لگا ہوا ہوں تا کہ اس کلام کا قولِ فصل ہونا مدلل طریقے سے ہر خاص و عام پر واضح ہو جائے اور وہ داؤ یہ ہے کہ جب کفار جزا و سزا، حشر و نشر کے متعلق شبہات بیان کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کے جواب میں حشر و نشر اور جزا و سزا کے معاملے کو عمدہ مثالوں اور مضبوط دلیلوں سے اور زیادہ مضبوط و پختہ کر دیتے ہیں، یہاں تک کہ قرآن کی جو باتیں پہلے مجمل تھیں ان کا مفصل بیان آ گیا اور کسی طرح کا شبہ ان میں باقی نہ رہا، تو ان کے داؤ پیچ جو شبہات کی صورت میں تھے وہی قرآن کے مزید واضح ہونے اور مقصد کے روشن ہونے کا سبب بن گئے اور ان کو خبر تک نہ ہوئی۔

اور ''کید'' کی حقیقت یہی ہوتی ہے کہ بے خبری میں اپنے حریف اور مقابل کو مات دے دی جائے اور اس کے دعویٰ کی نقیض و ضد کو ثابت کر دیا جائے۔

اللہ تعالیٰ کو کافروں کے ساتھ حیلہ و داؤ کی کیا ضرورت پیش آئی

اگرچہ اللہ تعالیٰ اس بات پر بھی قادر ہے کہ کافروں کے ہشیار و باخبر رہنے کی حالت میں حق مقصد کو ثابت کر دے اور وہ اس کا کچھ توڑ نہ کر سکیں، مگر بے خبری اور غفلت کی حالت میں کافروں کی مرضی کے خلاف حق کو ثابت کر دینے میں کافروں کی ذلت و رسوائی کرنا منظور ہے، چونکہ یہ کافر لوگ اللہ کے پیغمبروں کی رسوائی کے درپے ہوتے تھے اس لئے اس کے جواب میں ان کی رسوائی ضروری ہوئی۔

کافروں کو مہلت دینے کی حکمت

جب یہ معلوم ہوا کہ نزولِ وحی کے وقت، اسلام کے ابتدائی دنوں میں کفار موجود تھے، اور وہ طرح طرح سے اسلام کے بارے میں شبہات پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے جس کے جواب میں اسلام کی حقانیت کی دلیلوں میں اضافہ اور ترقی ہوتی تھی، تو جب تک کافر موجود ہوں گے ان کے شبہات کی تردید کرنے کی وجہ سے اسلام کی حقانیت کے دلائل میں ترقی ہوتی رہے گی وہ اگرچہ اس سے بے خبر ہیں، لہٰذا ان کا فوراً ہلاک نہ ہونا عین حکمت ہے، ان کی فوری ہلاکت کے لئے دعاء کرنا مناسب نہ تھا اگرچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان سے تنگ دل ہوتے تھے اور چاہتے تھے ان کا خاتمہ ہو، اسی لئے آپ کو ارشاد فرمایا گیا:

فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ

سو ڈھیل دے منکروں کو

یعنی کافروں کو مہلت دیجئے ان کی ہلاکت کی دعاء کرنے میں جلدی نہ کیجئے اس لئے کہ ان کے شبہات کرنے کی وجہ سے مسلسل وحی اتر رہی ہے، دین وشریعت کے حقائق ومعارف کھول کھول کر بیان کئے جارہے ہیں، حشر ونشر کے حالات کی کما حقہ تحقیق ہوتی چلی جارہی ہے، لہٰذا جب دین کامل طور پر واضح ہوجائے ہر طرح کے شبہہ کا جواب آجائے گا اور کافروں پر حجت پوری ہوجائے گی، تو اس وقت آپ کو جہاد وقتال پر مامور کریں گے اور ان کو آپ کے ہاتھوں ہلاک کریں گے۔

اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا ۝

ڈھیل دے اُن کو تھوڑے دنوں

تھوڑے دن ان کو مہلت دے دیں، یہ تھوڑے دن تقریباً چودہ سال کا عرصہ ہے جو بعثت کی ابتداء سے جہاد کا حکم آنے تک کا ہے، اس عرصے میں انہیں ڈھیل دی گئی کہ جو شبہہ ان کے دل میں گذرتا اس کا جواب دیا جاتا، اور واضح معجزات کے ذریعہ ان کی تسلی کی کوشش کی گئی، مگر جب یہ عرصہ گذر گیا اور حقیقت میں ان کو کوئی شبہہ نہ رہا، محض ضد وعناد کی بنیاد پر شرارت پر اُتر آئے تو اب ضرورت ہوئی کہ سختی کے

ساتھ ان سے نمٹا جائے اوران کو تنبیہ کی جائے۔

جہاد کے حکم میں تاخیر کی حکمت

تقریباً چودہ سال تک ان کو مہلت دینے میں حکمت یہ ہے کہ یہ عرصہ انسان کے سن بلوغ کا ہے، اتنی مدت میں آدمی بالغ ہوجاتا ہے، اس کا جسم اور عقل کامل ہوجاتا ہے اور سختی، سیاست وسزا کے قابل ہوجاتا ہے۔ لہٰذا ابتدائے بعثت کے اس عرصے میں مکہ وعرب کے لوگ گویا بچے کے حکم میں تھے، ان کو رفتہ رفتہ تعلیم دینا، شریعت کی باتوں کو سمجھانا، دین کے دلائل میں غور وفکر کرانا، اور دنیا کی اچھائی برائی سمجھانا منظور تھا، چنانچہ واضح آیات اور کھلے ہوئے معجزات ان کو دکھائے گئے تاکہ وہ حقیقت کو سمجھ لیں، مگر اس مدت میں بھی جب ان میں سے بعض اصلاح پذیر نہ ہوئے تو اب تادیب وتعزیر ضروری ہوئی چنانچہ اس کے بعد جہاد وقتال کا حکم نازل ہوا۔

وللہ الحمد. تمت سورۃ الطارق

مقدمہ سورۂ اعلیٰ

سورۂ اعلیٰ مکی ہے، اس میں انتیس (۲۹) آیات، بہتر (۷۲) کلمات اور دوسوا کہتر (۲۷۱) حروف ہیں۔

سورۂ طارق کے ساتھ ربط کی وجوہ

اس سورت کا ربط سورۂ طارق کے ساتھ چند وجوہ سے ہے۔

(۱) سورۂ طارق میں بیان کیا گیا تھا کہ انسان کے نفس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نگہبان مقرر ہیں، اس سورت میں بھی یہ بیان کیا گیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر اللہ تعالیٰ نگہبان ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس بات سے محفوظ ہیں کہ علومِ غیبی کی وحی فراموش کر دیں۔

(۲) سورۂ طارق میں اس بات کا بیان تھا کہ انسان کی پیدائش کی ابتدائی کیفیت کیا ہوئی، نطفہ کہاں سے آیا اور کہاں کس طرح گیا، تو اس سورت میں انسان کی تخلیق کی انتہاء کا بیان ہے کہ انسان کی تخلیق مکمل ہو جانے کے بعد اس کا کیا بنا۔

(۳) سورۂ طارق میں قرآن کے کچھ اوصاف اس کے کلام معجز ہونے کے سلسلے میں بیان ہوئے تھے، سو، اس سورت میں بھی قرآن کے اوصاف اس نسبت سے بیان ہوئے ہیں کہ اس پر عمل کرنے والے نجات یافتہ ہیں اور اس سے منہ موڑنے والے ہلاکت میں پڑ گئے۔

یہ ربط کی تمام وجوہات ایسی ہیں جو ظاہر ہیں کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔

وجہ تسمیہ

اس سورت کا نام ''اعلیٰ'' اس لئے رکھا گیا ہے کہ اس کے شروع میں اللہ تعالیٰ کا یہ نام آیا ہے۔

سورت کے شروع میں اس نام کے لانے کا نکتہ

اس نام (اعلیٰ) کی حقیقت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ہر کمال کا مرجع اللہ تعالیٰ ہے، خواہ کمال کی ابتداء ہو یا انتہاء، اس لئے کہ مرتبے کا علوّ (عالی ہونا) دو قسموں پر منحصر ہے، ایک علوِ بدایت ہے یعنی کمال وہاں سے شروع ہوتا ہے، دوسرا علوِ نہایت ہے یعنی کمال وہاں انتہا کو پہنچتا ہے، جو اِن دونوں قسموں کو شامل ہو وہ ''اعلیٰ'' ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے ''اعلیٰ'' کا نام ذکر فرمایا تو اس سے یہ

معلوم ہوا کہ اس کے عطا کئے ہوئے کمالات میں کبھی کمی، نقصان واقع نہیں ہوتا ورنہ علوِ مرتبہ میں اس کی ابتداء یا انتہاء میں کمی لازم آئے گی، اس کے شروع میں ذکر کرنے سے فوراً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی ہوگئی اور جو خطرہ دل پر گذر رہا تھا (کہ علوم وحی بھول نہ جاؤں) وہ زائل ہوگیا (کیونکہ معلوم ہوگیا کہ اعلیٰ کے عطا کردہ کمالات میں نقص وکمی واقع نہیں ہوتی)

شانِ نزول

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بڑی بڑی سورتیں نازل ہونا شروع ہوئیں اور بے شمار علوم و معارف جبرئیل کے واسطے سے نازل ہونا شروع ہوئے، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دل پر یہ خدشہ گذرنے لگا کہ میں تو اُمّی محض ہوں، لکھا پڑھا نہیں کہ ان علوم کو لکھ کر محفوظ کردوں ایسا نہ ہو کہ ان علوم میں سے بہت سی باتیں میں بھول جاؤں اور رسالت کے باب میں کوئی کوتاہی واقع ہوجائے، اس موقع پر آپ کی تسلی کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمائی کہ خداوند تعالیٰ نے خود آپ کی تعلیم کی ذمہ داری اُٹھائی ہے، آپ کو سبق بھولنے کا اندیشہ نہیں کرنا چاہئے، حدیث میں آتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ سورت بہت زیادہ عزیز تھی، وتر کی رکعت میں، اور جمعہ کی پہلی رکعت میں اکثر آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ سورت پڑھا کرتے تھے۔

حضرات سلف تہجد کی نماز میں اکثر اس کو پڑھا کرتے اور اس کی برکت کے امیدوار ہوتے تھے۔

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب "فسبح باسم ربک العظیم" نازل ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کو اپنے رکوع کی تسبیح بناؤ، یعنی "سبحان ربی العظیم" کہا کرو، اور جب "سبح اسم ربک الأعلی" نازل ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کو اپنے سجدے کی تسبیح بناؤ، یعنی سجدے میں "سبحان ربی الأعلی" کہا کرو۔ (کشاف میں ہے کہ اس سے قبل رکوع میں لوگ اللّٰھم لک رکعت کہا کرتے تھے اور سجدے میں اللّٰھم لک سجدت)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جو شخص "سبح اسم ربک الأعلی" پڑھے اس کو چاہئے اس کے ساتھ "سبحان ربی الاعلیٰ" کہہ دے تاکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی بجا آوری ہوجائے۔

تمت المقدمة. والحمدلله

تفسیر سورة الاعلی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ○

پاکی بیان کر اپنے رب کے نام کی جو سب سے اوپر ہے

فرمایا اپنے رب کے نام کو پاک سمجھ جو سب اونچوں سے اونچا ہے۔

اکثر مفسرین کے نزدیک نام کا پاک سمجھنا کنایہ ہے ذات کے پاک سمجھنے سے، کیونکہ عرب کا قاعدہ ہے کہ تعظیم وادب کے مقام پر نام بول کر ذات مراد لی جاتی ہے، چنانچہ عرف بھی ہے لوگ بادشاہوں، امیروں اور سرداروں کے دربار میں تعظیماً یوں کہا کرتے ہیں حضور کے نام سے یہ کام ہوا، یا فلاں قلعہ فتح ہوا، اسی لئے اگر بجائے اس کے ”سبح ربک“ فرماتے تو تعظیم وادب کی زیادہ رعایت نہ ہوتی۔

دوسرے، ذاتِ حق تعالیٰ کو، سوائے حق تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا، لہٰذا اس کی ذات کو پاک جاننے کے معنی یہی ہیں کہ اس کی طرف بے ادبی والے ناموں کی نسبت نہ کی جائے، ایسے نام جن میں نقص ہو وہ اس کی طرف منسوب نہ کئے جائیں۔

حق تعالیٰ کو پاک جاننے کے معنی

حق تعالیٰ کو پاک جاننے کے معنی شریعت میں جو وارد ہوئے ہیں وہ اجمالی طور پر یہ ہیں کہ حق تعالیٰ شانہ کی ذات ہمارے وہم، ادراک اور عقل سے برتر ہے کوئی نقص، عیب اور نامناسب صفت اس کے جاہ وجلال کے گرد نہیں پھٹکتی۔

تفصیل سے یوں سمجھئے کہ وہ ذاتِ پاک نہ جوہر ہے نہ عرض ہے، نہ جسم ہے نہ کلیت و جزئیت کی اس میں گنجائش ہے، صورت، جہت، حد، مکان ومجلس کی قیود اس کو ہرگز لاحق نہیں ہوتیں، نہ کوئی چیز اس سے مشابہت رکھتی ہے، اور نہ وہ کسی چیز سے مشابہت رکھتا ہے، مثل، شریک، بیوی، بچوں اور کھانے پینے کی چیزوں سے پاک ہے، وہ تمام چیزیں جن کو حدوث لاحق ہوتا ہے یا جو زوال اور فنا کو قبول کرتی ہیں، ان سب سے حق جل شانہ کی ذات پاک اور مبرا ہے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات کو پاک جاننا فرض ہے، اسی طرح اس کے ناموں کی عزت وتعظیم بھی واجب ہے، اسی واسطے اس آیت میں اللہ کے نام کی پاکی بیان کرنے کا حکم ہوا، اور اللہ تعالیٰ کے نام کی پاکی بیان کرنے یا دوسرے الفاظ میں پاک جاننے کا معنی یہ ہے کہ اس کے نام کو ایسی چیز پر نہ بولا جائے، جو نقص وعیب پر دلالت کرتی ہو، اور اللہ کے نام کا اطلاق غیر اللہ پر نہ کیا جائے، نیز اس کے پاک ناموں کا ذکر نہایت تعظیم، طہارت، حضورِ قلب اور پوری توجہ سے کیا جائے تا کہ دل کی صفائی حاصل ہو اور اچھے ثمرات ظاہر ہوں۔

ترکیب میں ''اعلیٰ'' کس کی صفت ہے؟

ظاہر یہ ہے کہ ''اعلیٰ'' رب کی صفت ہے، ''اسم'' کی صفت نہیں، اس لئے کہ آنے والی صفات مثلاً ''الذی خلق فسویٰ'' وہ سب رب کی ہی صفات ہیں۔

صوفیاء کی تحقیق

بعض صوفیاء کرام نے فرمایا ہے کہ ''اعلیٰ'' اسم کی صفت ہے، دراصل اس سے وہ تصوف کے ایک مسئلے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ وہ مسئلہ یہ ہے کہ اہل تصوف کے نزدیک تمام مخلوقات میں سے ہر مخلوق کے لئے اسمائے الٰہیہ میں سے ایک اسم رب مربی ہوتا ہے، جو اس مخلوق کے تعین کا مبداء اور اس کے کمال کی نہایت کا مرجع اور اس کے سفر کا منتہیٰ ہے، اور روحِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم جو تمام مخلوقات میں اکمل ہے، اسمائے الٰہیہ میں سے اس کا مربی ''اسمِ اعلیٰ'' ہے، جو عبارت ہے ذات مع جمیع الصفات سے اور اس اسم کی تسبیح کے یہ معنی ہوئے کہ حق کے ماسوا سے تجرد اختیار کر، اور اس کے ہر غیر سے نظر پھیر کر اسی کی طرف متوجہ ہو جا، تا کہ تیری ذات پر کمالاتِ حقانیہ کامل طور پر سب کے سب روشن ہو جائیں، اس لئے کہ کمالاتِ الٰہی کو قبول کرنے کی استعدادِ تام ذاتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی مخلوق کو حاصل نہیں۔

اور ہر چیز کی وہ تسبیح جو اس کے ساتھ خاص ہے اور وہ کرتی ہے یہ اسی اسم کی تسبیح ہوتی ہے جو اس کا مربی ہوتا ہے اور اس کے کمال کا مرجع ہوتا ہے۔

حاصل کلام

حاصل کلام یہ ہے کہ ''اسم ربک'' میں اسم کا لفظ لانے کا مقصد یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ

وسلم کو بتا دیں کہ آپ میں جو کمال ظاہر ہوا ہے اس کے بارے میں نہ گھبرائیں کہ شاید اس میں کبھی کوئی نقص یا کمی آ جائے گی، کیونکہ تیرا پروردگار "اعلیٰ" ہے جو ہر کمال کا مبداء اور مرجع ہے اور ہر چیز کو وہ درجۂ کمال تک پہنچا دیتا ہے اور اس کے کام، تکمیل و ترتیب میں ناتمام نہیں رہتے، چنانچہ اسی بات کی شہادت دینے اور یہ بتانے کے لئے کہ اللہ تعالیٰ ہر کمال کا مرجع ہے، تین صفات مزید ذکر فرماتے ہیں:

الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی ○

جس نے بنایا پھر ٹھیک کیا

یعنی تیرا پروردگار وہ ذات ہے جس نے ہر چیز کو پیدا کیا پھر اس کو معتدل بنایا، یعنی ہر چیز کی تخلیق سے جو جو خواص، صفات اور فوائد مطلوب ہیں اس چیز کو ان میں کمال کے درجے تک پہنچایا ہے، اور ایک خاص مزاج کہ جو ان کمالات کو قبول کرے اور اس سے فوائد ظاہر ہوں اس کو عطا کیا ہے۔

چنانچہ اگر انسان اور حیوانات کی مختلف قسموں کے بارے میں غور کیا جائے، ہاتھی سے لے کر مچھر تک، اسی طرح تمام نباتات و معادن میں غور و فکر کیا جائے، تو اچھی طرح معلوم ہو جائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو فوائد حاصل کرنے کے لئے اسباب عنایت فرمائے ہیں۔

وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی ○

اور جس نے ٹھہرادیا پھر راہ بتلائی

یعنی تیرا پروردگار وہ ذات ہے کہ جس نے ہر ایک کے لئے ایک کمال کا اندازہ مقرر کیا ہے، پھر اس کمال کو حاصل کرنے کے لئے راہنمائی کی ہے، یہاں تک کہ بچہ کو اپنی ماں کے پیٹ سے باہر نکلنے کے راستے کا الہام فرماتا ہے، پھر پیٹ سے نکلنے کے ساتھ ہی رونے اور دودھ پینے کا الہام ہوتا ہے، ہر نر کو مادہ پر جست کرنا، پانی میں تیرنا، کنوئیں چشمے کو پہچاننا اور دیگر معاش کے کاموں کی مصلحتیں غیب سے دل و دماغ میں اتاری جاتی ہیں۔ شہد کی مکھی کو دیکھ لیجئے مہندسی (انجینئرنگ) کے فن میں اس کو کیسا کمال عطا فرمایا ہے، کہ کس عجیب و غریب طرز پر وہ چھتہ بناتی اور اس میں شہد نکالتی ہے۔

سانپ کے بارے میں کہتے ہیں کہ سردیوں میں ٹھنڈی ہوا سے اندھا ہو جاتا ہے، اس لئے چھپا رہتا ہے، جب بہار کا موسم آتا ہے تو سونف کے پودے کی طرف جاتا ہے اس کے پتوں کے ساتھ اپنی

آنکھیں ملتا ہے تو فوراً اس کی بینائی بحال ہو جاتی ہے (یہ الہام اس کو کس نے کیا)

اور حیوانات وحشرات کو معاش کے اسباب مہیا کرنے اور توالد و تناسل کے سلسلے میں جو جو امور الہام کئے جاتے ہیں، نہایت ہی عجیب و غریب نوعیت کے ہیں، ان کی تفصیلات کتاب ''عجائب المخلوقات'' میں درج ہیں (حیوٰۃ الحیوان للدّمیری میں بھی مواد ہے)

تقدیر وہدایت کا فلسفہ

حکماء نے کہا ہے کہ ہر مزاج کے اندر ایک خاص قوت کی استعداد ہے اور ہر قوت ایک معیّن کام کے قابل ہوتی ہے، اور تقدیر اسی کا نام ہے کہ جسم کے اجزاء کو اس طرح سے جوڑا جائے کہ وہ جسم ایک قوت قبول کرنے پر مستعد ہو جائے۔

اور ہدایت نام ہے اس قوت کے فیض دینے کا، تاکہ اس کا مصدر ومنبع معیّن ہو جائے، اور ان دونوں تصرفوں (تقدیر وہدایت) سے مصالح عالم کا انتظام ہوتا ہے۔

وَالَّذِیٓ اَخۡرَجَ الۡمَرۡعٰی ٥

اور جس نے نکالا چارا

یعنی تیرا پروردگار وہ پاک ذات ہے، جس نے اپنی قدرت سے ایسی چیز نکالی کہ جانور اس کو چرتے ہیں، جیسے گھاس پھونس وغیرہ، اور طرح طرح کے پھول اُگائے جن سے شہد کی مکھی اور شکر خورے اپنی غذا حاصل کرتے ہیں، اس کے علاوہ مختلف قسم کے پھل اور کھیتیاں اُگائی جن سے انسان اور بعض جانور فائدہ اٹھاتے ہیں۔

فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحۡوٰی ٥

پھر کر ڈالا اُس کو کوڑا سیاہ

یعنی پھر اس کھیتی کو خشک سیاہ کر ڈالا، جاڑے کی خشکی وسردی کی وجہ سے اس کی رطوبت خشک ہو جاتی ہے، اور وہ سیاہ خشک ہو کر ذخیرہ کرنے کے کام آتی ہے کہ نایاب ہونے کی صورت میں کام آئے۔

الذی خلق سے احوٰی تک آیات کے متعلق خاص نکتہ

اب یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ ثابت کرنے کے لئے کہ وہ ہر بلند سے بلند تر ہے اور ہر کمال

کی ابتداء اور انتہا کا مرجع وہی ہے، ان تین صفات کو (جو تین آیات میں بیان ہوئیں) یہاں بیان فرمایا ہے، اور نکتہ اس میں یہ ہے کہ دنیا میں کمال کی تین ہی قسمیں ہیں۔ (۱) کمالِ ذاتی۔ (۲) یا کمال دوسرے کے نفع کے لئے ہوگا (۳) پھر کمالِ ذاتی یا ظاہر کے اعتبار سے ہوگا یا باطن و روح کے اعتبار سے ہوگا۔

سو کمالِ ذاتی جس کا تعلق شئی کے ظاہر و جسم کے ساتھ ہے، اس کے ثابت کرنے کے لئے "اَلَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی" صفت ذکر فرمائی، اس لئے کہ ہر چیز کو پیدا کرتے ہوئے اس کے جسم اور اعضاء کے اعتدال کی رعایت رکھنا کہ ہاتھ ہاتھ کے برابر ہو، کان کان کے اور پاؤں پاؤں کے برابر ہو، یہ کمال خوبصورتی کے ساتھ سامنے ظاہر و موجود ہے۔

اور کمال ذاتی جس کا تعلق باطن و روح کے ساتھ ہے، اس کو ثابت کرنے کے لئے یہ آیت ذکر فرمائی "وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی" کیونکہ ارواح کی استعداد کے اندازے (و مقدار) کو مختلف کرنا، پھر ہر ایک کو اس کی استعداد کے موافق رہنمائی کرنا، تاکہ وہ اپنی استعداد کے لائق کمال حاصل کرے، یہ بھی آنکھوں کے سامنے ہے۔

اور اس کمال کو ثابت کرنے کے لئے جس کا تعلق غیر کے نفع سے ہے یہ آیت لائے ہیں "وَالَّذِیْ اَخْرَجَ الْمَرْعٰی الاٰیۃ" کیونکہ جانوروں کا چارہ پیدا کرنا، انسانوں کی خوراک و غذا پیدا کرنا اور طرح طرح کی خوشبوئیں، دوائیں، غذائیں، سمّیات اور لباس وغیرہ پیدا کرنا اور ایک معین وقت تک ان میں تری و رطوبات بڑھانا ___ پھر ان کے اندر خشکی و ٹھنڈک کے اثرات ڈال کر ان کو خشک کر دینا، تاکہ مدتوں پڑی رہیں لیکن گلیں سڑیں نہیں، یہ قوی دلیل ہے اس کمال کی ابتداء و انتہاء پر۔

جب یہ معلوم ہوگیا کہ حق تعالیٰ ہی "ربِ اعلیٰ" ہے اور ہر کمال کی ابتداء و انتہاء کا وہی مرجع ہے، تو اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو اس کے حضور سے تسبیح پڑھنے کی خاص مناسبت عطا ہوئی ہے، اب آپ اپنے کسی کمال کے اندر نقص و کمی واقع ہونے کا ہرگز اندیشہ نہ کریں اس لئے کہ:

سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى ○

البتہ ہم پڑھائیں گے تجھ کو پھر تُو نہ بھولے گا

یعنی ہم آپ کو قرآن پڑھائیں گے اور بے انتہاء علوم کی تعلیم دیں گے، جو اسی قرآن سے نکلیں

گے، آپ اپنے رب کی تسبیح سے قلب کا تصفیہ کرتے رہئے تا کہ قلب زنگ آلود نہ ہوجائے، "فلا تنسیٰ" تب آپ بالکل نہیں بھولیں گے، اس لئے کہ تصفیۂ قلب کی وجہ سے آپ کی استعداد کمال کو پہنچ جائے گی، اور کوئی زنگ غیب کے فیض کے لئے حجاب نہ بن سکے گا۔

اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ط

مگر جو چاہے اللہ

علوم غیب میں سے جو بھی آپ کی استعداد کے لائق ہے اور میثاق کے دن جو کہ استعدادوں کی تقسیم کا وقت تھا، اس وقت جو بھی آپ کے حصے میں استعداد آئی ہے، اس میں سے آپ کچھ بھی نہیں بھولیں گے مگر ہاں، وہی بھولیں گے جو اللہ نے چاہا۔ یعنی جس کے متعلق اس کی حکمت نے تقاضا کیا کہ اس جہاں میں آپ بھول جائیں تا کہ قیامت کے دن مقامِ محمود حاصل ہونے کے لئے ذخیرہ ہوسکے۔

چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مقامِ محمود میں اللہ تعالیٰ مجھے ایسی حمد وثنا، الہام فرمائیں گے جو اس وقت مجھے یاد نہیں ہے۔

اور اس بات میں کوئی شک وشبہہ نہیں کہ وہ محامد آپ کی استعداد میں پہلے سے موجود ہوں گے اور عالم روحانی میں آپ ان کی طرف اجمالی التفات بھی رکھتے تھے۔ گویا اس دنیا میں ایک حکمت کی وجہ سے ان کو بھلا دیا گیا تھا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کی بعض آیات بھول گئے تھے وہ بھی "ماشاء اللہ" میں داخل ہیں کیونکہ بھلانا بھی ایک طرح کا نسخ ہے چنانچہ سورۂ بقرہ میں ہے: "ما ننسخ من اٰية او ننسها نأت بخير منها او مثلها"

ہر نسیان نسخ کی علامت نہیں

یہاں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی آیت بھلا دیا جانا اس وقت نسخ کی علامت ہے، جب ساری امت کے قاریوں کے دلوں سے وہ آیت مِٹ جائے۔ ورنہ صحیح حدیث میں وارد ہے کہ ایک مرتبہ نماز میں قراءت کے دوران نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک آیت رہ گئی، بعد میں حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اس سورت کی کوئی آیت رہ تو نہیں گئی، حضرت ابی نے

عرض کیا جی ہاں فلاں آیت رہ گئی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو بتائی کیوں نہیں ابی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا میں سمجھا کہ یہ آیت منسوخ ہو گئی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں میں ہی بھول گیا تھا اگر منسوخ ہوئی ہوتی تو تمہیں بتا دیتا (۱)

اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفٰى ۝

وہ جانتا ہے پکارنے کو اور جو چھپا ہوا ہے

یعنی وہ اللہ تعالیٰ ان کمالات کو بھی جانتا ہے جو آپ میں بالکل ظاہر جلوہ گر ہیں کہ ہر ادنیٰ و اعلیٰ انہیں دیکھتا ہے، اور اللہ تعالیٰ آپ کے ان کمالات سے بھی باخبر ہے جو ابھی آپ کی استعداد کی تہہ میں پوشیدہ ہیں اور اپنے وقت پر مصلحت کے مطابق وہ بھی جلوہ افروز ہوں گے۔

قرآن اور دیگر علوم کی حفاظت کا وعدہ

اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کے بھولنے سے محفوظ رہنے کی یہ کہہ کر تسلی دی کہ ہم آپ کے استاد ہیں، یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ آپ کو بھولنے نہیں دیں گے، تاکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کے حفظ کرنے کی فکر سے فارغ ہو جائیں، اور اس پودے کے پھلنے پھولنے کا یقین ہو جائے، اور یہ بات اس طرح کی نہیں کہ جیسے انسانوں میں سے کوئی استاد کسی شاگرد کی تعلیم میں سرگرم ہوتا ہے، مگر اس کے باوجود کسی عارض و رکاوٹ کی وجہ سے شاگرد ناقص رہ جاتا ہے۔

قرآن کو آپ کے سینے میں محفوظ رکھنے کے وعدے کے بعد اب دیگر علوم کی حفاظت کے بارے میں بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دیتے ہیں چنانچہ فرمایا:

وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى ۝

اور سہج سہج پہنچائیں گے ہم تجھ کو آسانی تک

یعنی اللہ تعالیٰ تک پہنچنے والے راستوں میں سب سے نزدیک ترین راستے کو آسان کر دیں گے، اور وہ علوم جن کا تعلق معرفت، عبادت اور ملک و ملت کی سیاست سے ہے، وہ سب آپ کے لئے

---

(۱) بخاری ج ۲ ص ۷۵۳ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو مسجد میں قرآن پڑھتے سنا تو فرمایا اللہ اس پر رحم کرے اس نے مجھے فلاں آیت یاد دلا دی میں تو بھول گیا تھا۔ ۱۲ سفیر احمد

آسان کردیئے جائیں گے، ان تینوں شعبوں (معرفت، عبادت، سیاست) کے متعلق علوم آپ کے دل میں فوارے کی طرح جوش ماریں گے، آپ کو ان علوم کی تحصیل کے لئے محنت و مشقت اٹھانے کی ضرورت نہیں ہوگی اور نہ ہی کسی کتاب، دستور العمل، استاد یا مرشد ہی کی آپ کو ضرورت پیش آئے گی۔ لہٰذا قرآن یا دیگر علوم کو یاد رکھنے کی فکر کی آپ کو ضرورت نہیں ہے، آپ تو دوسروں کی تعلیم، تکمیل اور راہنمائی کے لئے ہیں، آپ اپنی تکمیل کی فکر نہ کریں، یہ ہماری ذمہ داری ہے، آپ امت کی تعلیم و تکمیل میں محنت کریں کہ اسی لئے آپ کو بھیجا گیا ہے، چنانچہ فرمایا:

فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى ۝

سو تو سمجھادے اگر فائدہ کرے سمجھانا

اگر آپ کی نصیحت نفع دے رہی ہے تو نصیحت کیجئے، تا کہ آپ کا کمال دوسروں تک پہنچے اور بے شمار انسان آپ کے رنگ میں رنگ جائیں۔

ایک شبہہ اوراس کے جوابات

یہاں ایک سوال اور شبہہ ہوتا ہے جس کے جواب میں اکثر مفسرین تھک تھک کر رہ گئے ہیں، شبہہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا منصب یہ ہے کہ ہر حال میں وعظ ونصیحت کریں، خواہ کوئی قبول کرے یا نہ کرے، پھر یہاں وعظ وتذکیر کو نفع کے ساتھ مشروط کر دینے کے کیا معنی ہیں؟

بعض حضرات نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہاں تھوڑی سی عبارت محذوف ہے، پوری بات یوں ہے:"ان نفعت الذکری أو لم تنفع" کہ خواہ نصیحت نفع دے یا نہ دے، چنانچہ قرینے کی وجہ سے حذف کی اس طرح کی نظیریں اور بھی قرآن میں موجود ہیں جیسے "رب المشارق" (یہاں "والمغارب" محذوف ہے اور وہ مراد ہے) اسی طرح "وسرابیل تقیکم الحر" (یہاں "والبرد" مراد ہے لیکن محذوف ہے قرینے کی وجہ سے) اس طرح کے اور بھی بعض جوابات دیئے گئے ہیں۔

مصنف علاّم کی تحقیق

لیکن تحقیقِ مقام یہ ہے، کہ یہ شرط اس لئے لگائی کہ تذکیر و وعظ اس وقت لازمی وضروری ہوتی ہے جب مخاطب کی طرف سے اس کو قبول کرنے کا گمان ہو، ورنہ ہر کسی کو وعظ وتذکیر کرنا رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کا منصب نہیں ہے، ہاں تبلیغ وانذار یعنی اللہ کا حکم پہنچانا اور اس کے عذاب سے ڈرانا تاکہ بندوں پر حجت قائم ہو جائے اور کوئی جہالت و ناواقفیت کا عذر نہ کر سکے، اتنا تو ہر شخص کے اعتبار سے کرنا ضروری ہے، مگر یہ وعظ و تذکیر نہیں یہ دعوت و تبلیغ ہے، چنانچہ سورۂ غاشیہ میں اس بات کی صراحت ہے اور وہ یہ ہے کہ "الا من تولی و کفر" کا استثناء کیا گیا ہے "فذکر" سے، اس سے یہی شرط تذکیر کی سمجھ میں آتی ہے۔

اور یہ جواب بھی ہو سکتا ہے کہ یہ شرط تذکیر کی تاکید کے لئے ہو، یعنی اگر کسی کو تذکیر نفع دے رہی ہے تو آپ کو تذکیر کرنی چاہئے، اور یقینی بات ہے کہ دنیا میں کسی نہ کسی کو تو ضرور آپ کی نصیحت فائدہ دے گی، اگرچہ ہر ایک کو نفع نہ دے، پس ایک بات کو معلّق کرنا ایسی چیز پر جس کا وقوع ضروری ہو یہ اس بات کی تاکید کا موجب ہوا۔ (چنانچہ ایسی تعلیق کی نظیر حدیث میں موجود ہے) صحیح حدیث میں آتا ہے "قد کان فیما قبلکم من الأمم محدثون فان یک فی امتی أحد فانه عمر" تم سے پہلی امتوں میں ایسے لوگ ہوا کرتے تھے جن کو الہام ہوتا تھا اگر میری امت میں سے ایسا کوئی ہے تو وہ عمرؓ ہے۔

دوسرا سوال اور اس کا جواب

اسی طرح یہاں پر ایک اور سوال کیا جاتا ہے کہ تذکیر کو معلّق کیا ہے نفع کی شرط کے ساتھ، تو کسی کام کو کسی شرط کے ساتھ تو وہ معلّق کرتا ہے جس کو انجام کی خبر نہ ہو، جبکہ اللہ تعالیٰ تو علام الغیوب ہیں ان کے لئے تعلیق کے کیا معنی ہیں؟

جواب اس کا یہ ہے کہ انبیاء کی دعوت اور ان کی بعثت ظاہر پر مبنی ہوتی ہے، مخفیات و پوشیدہ باتوں پر ان کی دعوت و بعثت کی بنیاد نہیں ہوتی۔ کسی چیز کا مخفی پہلو خواہ کچھ بھی ہو انبیاء کرام کی تعلیمات کا تعلق اس کے ظاہر سے ہی ہوگا، چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر علیہ السلام کے ان افعال پر گرفت فرمائی جو بظاہر شرعاً بُرے تھے اگرچہ در پردہ وہ اچھے تھے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام سے فرمایا "فقولا له قولا لیناً لعله یتذکر او یخشی" "اس سے (فرعون سے) نرم بات کرو شاید نصیحت پکڑے یا ڈر جائے"

حالآنکہ اللہ کے علم میں یہ بات طے شدہ تھی کہ نہ فرعون نصیحت ہی پکڑے گا اور نہ ڈرے گا، مگر اس کے باوجود یہ حکم دیا، اس لئے کہ بظاہر یوں ہی ہوا کرتا ہے کہ نرم بات کرنے سے آدمی بات قبول کرتا

ہے، اسی لئے ان کو اس ظاہری عمل کا پابند بنایا گیا۔ (لہٰذا یہاں تذکیر کو بھی ظاہری طور پر معلق کیا گیا ہے نفع کی شرط کے ساتھ، جس طرح عام طور پر ظاہر کو دیکھتے ہوئے تعلیق کی جاتی ہے)

تیسرا سوال اور اس کا جواب

یہاں تیسرا سوال یہ کیا جاتا ہے کہ وعظ کو تذکیر کا نام کیوں دیا گیا، تذکیر تو لغت عرب میں یاددلانے کو کہتے ہیں، کہ کوئی چیز یاد تھی پھر بھول گئی ہو اس کو دوبارہ یاددلانے کے لئے ''تذکیر'' کا لفظ بولا جاتا ہے۔

جواب اس کا یہ ہے کہ دین کی خوبی، اور اللہ تعالیٰ کی توحید وعبادت، بنی آدم کی جبلت میں پیوستہ کردینے کی وجہ سے انکی عقلوں میں اسکی پرچھائیاں موجود ہیں، چنانچہ فرمایا **"فطرة الله التی فطر الناس علیها"** تو گویا ہر شخص کے نفس کے اندر امور دین کا علم موجود تھا، مگر دنیا میں آکر انسان کے سامنے بہت سے عوارض ومشاغل آئے تو وہ اس کو بھول گیا، لہٰذا اب پیغمبروں کی وعظ ونصیحت اسی بھولی ہوئی بات کو یاددلانے کے لئے ہے (یہی نکتہ ہے وعظ کو تذکیر کا نام دینے میں)

اسی لئے بعض عقلا نے کہا ہے کہ جن باتوں کا جاننا انسان کے لئے ضروری ہے، بنی آدم کی ارواح بدن سے تعلق قائم ہونے سے پہلے ان باتوں کا علم رکھتی ہیں، مگر جب دنیا میں آتی ہیں اور بدن کی تدبیر میں مشغول ہوجاتی ہیں تو ان معلوم شدہ باتوں کو بھول جاتی ہیں۔ جیسے انتہائی بڑھاپے میں پہنچ کر آدمی سابقہ معلومات بھول جاتا ہے، چنانچہ اسی لئے انبیاء کرام وعظ کرتے ہیں تاکہ وہ بھولی ہوئی باتیں ارواح کو یاد آجائیں۔ عقلا کی اس بات کی مہک اس حدیث سے بھی آتی ہے فرمایا:

"الأرواح جنود مجندة ما تعارف منها ائتلف وما تناکر منها اختلف"

ارواح اکھٹے لشکروں کی طرح ہیں جن کا (عالمِ ارواح میں) تعارف ہوجاتا ہے دنیا میں آکر ان کے درمیان الفت پیدا ہوتی ہے اور جو وہاں ایک دوسرے سے اجنبی رہیں، دنیا میں آکر بھی ایک دوسرے سے نامانوس رہتی ہیں۔

حکیم افلاطون سے بھی اسی طرح کی بات منقول ہے، وہ اپنے شاگردوں سے کہا کرتا تھا

"إنی لست أعلمکم ما کنتم تجهلون ولکنی اذکر کم ما کنتم تعلمون" میں تم کو وہ باتیں نہیں سکھاتا جو تم جانتے نہیں ہو، میں تو تم کو وہ باتیں یاددلاتا ہوں جو تم جانتے تھے (مگر بھول چکے ہو)

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرمایا کہ آپ کو لوگوں کے نفع کے لئے تذکیر ونصیحت کرنی چاہئے،

تو اب اس شخص کو بتاتے ہیں جس کو پیغمبر کی نصیحت سے فائدہ ہوگا چنانچہ فرمایا:

سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى ۝

سمجھ جائے گا جس کو ڈر ہوگا

اگر چہ آپ کا فرض تو یہ ہے کہ علی العموم سب کو نصیحت کریں لیکن نفع ہر ایک کو نہیں ہوگا، نفع کے لئے استعداد شرط ہے، اسی لئے کہا گیا ہے۔

اصل استعداد شرط صحبت است
مرد چوں کورست عینک لعبت است

(فرمایا کہ جس میں خوف وڈر ہوگا وہ سمجھ جائے گا تو) اللہ کے خوف کی علامت یہ ہے کہ دل نرم ہو، اپنے آپ کو فضول و بیہودہ باتوں سے آدمی بچاتا ہو تا کہ روح کی صفائی و نورانیت ظلمت و کدرورت سے نہ بدل جائے، اور روح نبوت کی شعاع سے روشنی حاصل کرتی رہے۔

بعض مفسرین نے آیت "فذکر الخ" کے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ بار بار نصیحت کیجئے اگر ایک بار بھی نصیحت نے نفع دیا ہو، کیونکہ جلد وہی شخص کامل نصیحت پکڑے گا جو ایک بار نصیحت کرنے سے خُدا سے ڈرا ہے، اس صورت میں اشکال بھی ختم ہوگیا اور اس شخص کی علامت بھی بیان ہوگئی جس کے لئے نصیحت سودمند ہے، علاوہ ازیں "ذکر" باب تفعیل سے ہے اور باب تفعیل میں تکرار کے معنی پائے جاتے ہیں لہٰذا تکرارِ نصیحت کے معنی مناسب ہوئے۔

جب نصیحت سے فائدہ اٹھانے والوں کے بیان سے فارغ ہوئے تو اب فائدہ نہ اٹھانے والوں کا بیان فرماتے ہیں:

وَ يَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَى ۝

اور یکسو رہے گا اُس سے بڑا بد قسمت

حقیقت میں یہ وہ شخص ہے جو خدا کا خوف نہیں رکھتا اور عناد کے طور پر کفر اختیار کرتا ہے، گویا اصل میں کلام یوں تھا "ویتجنبها من لا یخشی" کہ اس سے وہی دور رہے گا جو ڈرتا نہیں ہے، لیکن یہ بتلانے کیلئے کہ جو خدا کا خوف نہیں رکھتا وہ نہایت ہی بد بخت ہے، "من لا یخشی" کی جگہ "اشقی" لائے ہیں۔

شقی کون ہے

اب یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ آدمی کی شقاوت یہ ہے کہ اس کا عمل اور اعتقاد درست نہ ہو، اور جس کا اعتقاد تو درست ہے مگر عمل درست نہیں وہ بھی شقی ہے لیکن جس کا اعتقاد صحیح نہیں وہ بڑا شقی و بدبخت ہے، پھر اعتقاد کی خرابی اگر جہلِ بسیط کی وجہ سے یا کسی مذہبِ باطل کی تقلید کی وجہ سے ہے تو ایسا شخص ممکن ہے نصیحت سے اور مرشد کی راہنمائی سے سیدھی راہ کی طرف آجائے، لیکن جس کے اعتقاد کی خرابی عناد و ضد ہو، وہ دیدہ دانستہ حق کا انکار کرتا ہو، جس کی وجہ سے ایک حجابِ کثیف اس کی استعداد کے آئینے پر آ گیا ہو، اس کو نہ کسی معلم کی تعلیم فائدہ دے سکتی ہے اور نہ کسی مرشد کی نصیحت و تلقین، یہ بدبختی کی انتہا کو پہنچا ہوا ہے، ایسوں کے بارے میں ہی فرمایا ہے "**وما تغنی الأیات و النذر**" کہ نشانیاں اور ڈرانے والے ان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچاتے۔ اور اس آیت میں شقی سے یہی مراد ہے، جس کا انجام یہ بیان فرمایا:

الَّذِیْ یَصْلَی النَّارَ الْکُبْرٰی ○

وہ جو داخل ہوگا بڑی آگ میں

آتشِ کبریٰ

اس آگ کی صفت سورۂ والیل میں یہ آئی ہے، "**فانذرتکم نارًا تلظی**" یہ آگ جہنم کے ساتویں نچلے طبقے کے اندر ہے، اس آگ میں فرعون، اس امت کے منافق، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مائدہ کے منکرین ہوں گے، یہ آگ دوسرے طبقات کی آگ سے بہت شدید و تیز ہے، اگرچہ حدیث میں ساری جہنم کی آگ کے بارے میں یوں آیا ہے "**نار کم هذه جزء من سبعین جزءً ا من نار جهنم کلهن مثل حرها**" کہ جہنم کی آگ دنیا کی آگ سے ستر گنا زیادہ گرم ہے، چنانچہ اسی لئے حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ "نارِ کبریٰ" جہنم کی آگ ہے اور "نارِ صغریٰ" دنیا کی آگ ہے۔

لیکن جہنم کے اس طبقے میں جو آگ ہے سوزش و گرمی کے اعتبار سے اس کی نسبت جہنم کے دیگر طبقوں کی آگ سے وہی ہے جو جہنم کے عام طبقات کی آگ کی دنیا کی آگ سے ہے، لہٰذا "آتشِ کبریٰ" یہی

آگ ہے۔

جہنم کے اس طبقے کی آگ کی تیزی کا سبب دوسرے طبقات کی آگ کے مقابلے میں اس مثال سے سمجھ آجائے گا، مثلاً دنیا کی آگ سرد ملک میں عین برف پڑنے کے وقت ایسے آدمی کے لئے جو سردی والا کام کررہا ہو جیسے سقہ ہے، ملاح ہے، نیز اس کا مزاج بھی انتہائی سرد ہو اور وہ بوڑھا بھی ہو، ان حالات میں بھی آگ اس کے لئے قابلِ برداشت نہیں ہے، لیکن یہی آگ گرم ملک میں، گرمی کے موسم میں، عین دوپہر کے وقت ایسے آدمی کے لئے جو گرمی کے کام میں مشغول ہو، جیسے نان بائی ہے، پھر وہ جوان اور صفراوی مزاج والا ہو، نیز روزہ دار ہو اس کے ساتھ تپ کا بخار بھی ہو، تو ایسے کے لئے یہ آگ کس قدر ناقابلِ برداشت ہوگی خود ہی اندازہ کرلیجئے، اسی پر جہنم کے اس طبقے کی آگ اور دیگر طبقات کی آگ کے درمیان فرق کو قیاس کرلیجئے۔ **والعیاذ باللہ من کل اصناف النار.**

دنیا میں انسان کو جب کوئی مصیبت پیش آتی ہے، تو اس کی انتہا یہ ہوتی ہے کہ انسان کو موت کے گھاٹ اتار دیتی ہے، اور موت اس مصیبت سے چھٹکارہ بن جاتی ہے، لیکن اس بدبخت کو اس راحت سے بھی محروم رکھا گیا ہے، باوجود ایسی شدید حرارت وگرمی کے وہ ہلاک نہیں ہوگا چنانچہ فرماتے ہیں:

ثُمَّ لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيٰى ۝

پھر نہ مرے گا اُس میں اور نہ جیئے گا

اس شدید عذاب اور طویل زمانے تک جلنے کے باوجود یہ مرے گا نہیں کہ مر کر روح اس کے جسم سے جدا ہو کر اس تکلیف سے نجات پاسکے، اس لئے کہ اس جہان میں بدن کی تعمیر و بنیاد اس طرح نہیں کہ روح اس سے جُدا ہوسکے۔

اس جہان میں موت کے خاتمے کا فلسفہ

راز اس کا یہ ہے کہ اس جہان میں بدن پر روح کے احکام غالب ہوں گے، بدن روح کی خاصیت اختیار کرجائے گا، اور روح کا فنا و معدوم ہونا محال ہے، اسی لئے دنیا میں سخت ترین تکالیف و مشقتیں پیش آتی ہیں مگر روح فنا نہیں ہوتی بلکہ انتہائی بیقراری و دکھ سے بدن چھوڑ کر چلی جاتی ہے، اور وہاں جب بدن روح کے حکم میں ہوجائیں گا تو اس کی ترکیب کا ٹوٹ پھوٹ کر فنا ہونا ناممکن ہوجائے گا۔

"**ولا یحیی**" اور نہ جیئے گا، اس لئے کہ اس کی روح ہمیشہ دکھ و عذاب میں مبتلا ہوگی، یہاں تک کہ وہ

موت کی آرزو کرے گا مگر موت نہ آئے گی، سوایسی زندگی حقیقت میں زندگی نہیں ہے۔

عمر چوں خوش گذرد زندگی خضر کم است

و ربنا خوش گذرد نیم نفس بسیارست

پس جب بدن کا چمڑا جل جائے گا، تو روح کے غلبے کی وجہ سے آناً فاناً چمڑا بدن پر پیدا ہو جائے گا، تب تکلیف وعذاب اور زیادہ شدید ہو جائے گا، اس لئے کہ نئی تازہ چلد کا زود حس ہونا تجربہ شدہ ہے۔

"سیذکر من یخشی" میں اس آدمی کا بیان تھا جس کو پیغمبروں کی نصیحت فائدہ دیتی ہے، مگر نصیحت کی بات سن کر دل میں اللہ کا خوف پیدا ہونا کمال کی ابتداء ہے کمال کی انتہاء یہی نہیں کچھ اور بھی ہے، اس لئے صرف اتنی بات پر کہ دل میں خوف پیدا ہو گیا قناعت کر لینا اور اسی پر اعتماد کر لینا کافی نہیں ہے، اس لئے کہ اگر وعظ ونصیحت کی بات سن کر دل میں خشیت کا خیال پیدا ہو گیا پھر چلا گیا تو یہ خوف کچھ کارآمد نہ ہوا، خوف وہ کارآمد ہے جو دل میں جم جائے، اور ہر ہر عضو پر اس کا اثر ظاہر ہو کہ کوئی عمل اللہ کی مرضی کے خلاف صادر نہ ہو، ایسی حالت جب پیدا ہو جائے تو تب یہ خوف قابلِ اعتماد ہوگا اور باعث فلاح ونجات ہوگا چنانچہ فرماتے ہیں:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ○

بیشک بھلا ہوا اُس کا جو سنورا

یعنی وہ شخص مراد کو پہنچ گیا جو پاک ہوا۔

پاکی کی اقسام ودرجات

پاکی کی کئی قسمیں ہیں۔

(۱) سب سے پہلے دل کو پاک کرنا ہے کفر، شرک، باطل عقائد، بری نیتوں اور برے اخلاق سے جیسے غِلّ یعنی بد باطنی، کینہ، حسد، تکبر، دھوکہ اور اسی طرح کی دیگر بداخلاقیاں ہیں۔

(۲) دوسرے بدن وکپڑوں کو نجاسات سے پاک کرنا ہے، جیسے پیشاب پاخانہ، خون، پیپ، منی اور مذی وغیرہ۔

(۳) تیسرے بدن کو پاک کرنا حدث وجنابت سے، وضوء وغسل کے ذریعہ سے۔

(۴) چوتھے بدن کو زوائد سے پاک کرنا جیسے زیر ناف، بغل کے بالوں کو صاف کرنا، ناخن اور میل کچیل صاف کرنا اور سر و داڑھی کے بڑھے ہوئے بالوں کو ہفتے میں ایک بار سنوارنا، دھونا، کنگھی کرنا اور عطر لگانا سنتِ مؤکدہ ہے۔

(۵) مال کو پاک کرنا زکوٰۃ و صدقات کی ادائیگی کے ذریعہ سے، نیز مال کی پاکی میں یہ بھی داخل ہے کہ اس کو حرام کی ملاوٹ سے بچایا جائے، جیسے سود، جوا کا مال، زنا کی اُجرت، سینگی لگانے کی اجرت، اور وہ مال جو نجس چیزوں کی تجارت سے حاصل ہو جیسے کچے چمڑے اور ذبح کی اجرت اور ان کاموں کی اجرت کہ جن میں ہاتھ نجاست سے آلودہ ہوتے ہوں۔

وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ۝

اور لیا اُس نے نام اپنے رب کا پھر نماز پڑھی

(کامیاب ہوا وہ شخص جس نے) کمالِ طہارت کے بعد اس نے اپنے پروردگار کا نام لیا تکبیر تحریمہ میں، جو نماز کے شروع میں ہوتی ہے، اور قراءت، تسبیح اور تشہد میں بھی اللہ کا ذکر کیا، اور نماز کے دوران حضورِ قلب رہا اور دیگر اوقات میں دل و زبان کے ساتھ ذکر کرتا رہا۔ اس لئے کہ اللہ کے ذکر کی وجہ سے استعداد کے اندر صفائی اور کمالات میں اضافہ ہوتا ہے اور جس قدر ذکر زیادہ کیا جائے گا اسی قدر معرفت کا درخت بڑھتا جائے گا۔

"فصلی" پھر نماز پڑھی، یعنی وہ ذکر جو دل و زبان سے کر رہا ہے اپنے اعضاء و جوارح کے ذریعہ اس کی مجسم شکل بنائے اور دل، زبان اور تمام اعضاء کو اس عمل میں اس طرح موافق کرلے کہ منعم حقیقی کی نعمتوں کا شکر کمال درجے میں ادا ہو۔

آیت سے منازلِ سلوک کی طرف اشارہ

حضرت مولانا یعقوب چرخی صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس میں منازلِ سلوک کی طرف اشارہ ہے، سلوک میں اول توبہ ہے اس کے بعد تزکیہ و تصفیۂ نفس ہے، صفاتِ ذمیمہ کے ازالے اور صفاتِ حمیدہ کے اکتساب کے ذریعہ سے، اس کے بعد ذکر لسانی، قلبی، روح اور سری کا دوام ہے، اس کے بعد سالک مشاہدات کے مقام تک پہنچتا ہے۔ سو "قد افلح من تزکی" سے اشارہ اول مرتبے کی

طرف، "ذکر اسم ربه" سے ذکرِ قلبی کے دوام کی طرف اشارہ ہے اور "فصلی" مشاہدہ کا مرتبہ حاصل ہونے کی طرف اشارہ ہے چنانچہ "الصلوۃ معراج المؤمنین" کے یہی معنی ہیں۔

اس آیت کی تفسیر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ جو کوئی صدقۂ فطر ادا کرے اور عیدگاہ کے راستے میں تکبیریں کہتا ہوا جائے اور عیدگاہ میں پہنچنے کے بعد بھی کہے، پھر عید کی نماز پڑھے تو مجھے امید ہے کہ وہ اس آیت کی بشارت میں داخل ہوگا۔

پس "تزکی" کا لفظ زکوٰۃ سے ماخوذ ہے اور صدقۂ فطر زکوٰۃ کے حکم میں ہے لہٰذا اس لفظ سے صدقۂ فطر کے دینے کی طرف اشارہ ہوا اور "ذکر اسم ربہ" سے عید کی تکبیروں کی طرف اشارہ ہے، اور "فصلی" سے عید کی نماز کی طرف اشارہ ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اس تفسیر سے مقصود یہ ہے کہ قرآن میں ہر جگہ زکوٰۃ کا ذکر نماز کے بعد آیا ہے اور یہاں تو ذکر سے بھی پہلے ہے تو ضرور کوئی خاص صورت مراد ہے جس میں یہ تینوں (زکوٰۃ۔ ذکر۔ نماز) ترتیب سے واقع ہوں سو اس کی صورت شریعت میں اس کے سوا اور کوئی نہیں ہے (جو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بیان فرمائی ہے)

اس آیت کی تفسیر میں فقہاء کا قول

اکثر فقہاء نے ان تینوں سے نماز کے ارکان و شرائط مراد لئے ہیں یعنی "تزکی" سے طہارت کی طرف اشارہ ہے خواہ وضوء ہو، غسل ہو یا تیمم ہو اور "ذکر اسم ربہ" سے تکبیر تحریمہ کی طرف اشارہ ہے اور "فصلی" سے نماز کی طرف اشارہ ہے۔

اس تفسیر کے مطابق حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے اس آیت سے فقہ کے دو مسئلے نکالے ہیں۔

پہلا مسئلہ:۔ یہ کہ تحریمہ کے لئے خاص طور پر "اللہ اکبر" کہنا ضروری نہیں ہے بلکہ اللہ کے کسی بھی ذکر سے تحریمہ کہی جا سکتی ہے (جو مشعرِ تعظیم باری تعالیٰ ہو) جیسے الرحمٰن اعظم، لا الہ الا اللہ یا سبحان اللہ، مگر جو ذکر بندے کی غرض و حاجت سے ملا ہوا اس سے نماز شروع کرنا صحیح نہیں جیسے اللھم اغفرلی، کیونکہ یہ خالص ذکر نہیں ہے۔

دوسرا مسئلہ:۔ یہ کہ تکبیرِ تحریمہ نماز کی شرط تو ہے مگر نماز کا رکن نہیں ہے (رکن، شی میں داخل ہوتا ہے) اس لئے کہ اس آیت میں "ذکر اسم ربہ" پر "فصلی" کا عطف فاء کے ذریعہ سے کیا ہے اور معطوف و معطوف علیہ میں مغائرت ہوتی ہے (اس سے معلوم ہوا کہ تحریمہ نماز میں داخل نہیں ہے)

اسی مسئلہ پر یہ بات تفریع ہوتی ہے کہ نماز کی اکثر شرطیں جیسے طہارت، سترِ عورت، استقبالِ قبلہ اگر تحریمہ کے وقت حاصل نہ ہوں اور تحریمہ کے بعد متصلاً بلافصل حاصل ہو جائیں تو نماز درست ہو جائے گی۔

امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک تکبیر تحریمہ نماز میں داخل ہے اس لئے کہ یہ قیام کی حالت میں واقع ہوئی ہے اور قیام نماز کا رکن ہے اور نماز کے وہ افعال جو بطور فرضیت کے مقرر ہوئے ہیں وہ بھی نماز کے ارکان ہیں لہٰذا ان کے مذہب کے مطابق نماز کی تمام شرائط تکبیر تحریمہ کے وقت ہونا ضروری ہیں۔

جب ان آیات میں یہ بیان فرمایا کہ کمال کا حصول اور عذاب سے خلاصی موقوف ہے تطہیر، ذکر اور نماز پر، جو کہ ثمرہ و نتیجہ ہیں خوف خدا کا تو یہ مقام ایسا تھا کہ کافر لوگ یہ شبہہ کریں کہ ہم باوجود کامل عقل و دانش رکھنے کے ان اعمال و افعال کی خوبی کیوں نہ سمجھ سکے اور ان اعمال کا فلاح کا سبب ہونا ہم سے کیوں پوشیدہ رہا۔ تو جواب میں فرماتے ہیں کہ تم لوگ شقاوتِ ازلی کی وجہ سے ان اعمال کے کمال کو نہیں جانتے، چنانچہ فرمایا:

بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا ○

کوئی نہیں تم بڑھاتے ہو دنیا کے جینے کو

یعنی تم دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دیتے ہو، حالانکہ دنیا ایک سبزہ زار سے بڑھ کر نہیں ہے، اور اس کا انجام سوکھی گھاس کی طرح سیاہ ہو جاتا ہے، تم لوگ دنیا کی نظر آنے والی لذتوں کے حصول، اور جاہ و مرتبہ اور نام و نمود کے حاصل کرنے کو ہی کمال سمجھتے ہو، حالانکہ دنیا کی زندگی ہرگز اس قابل نہیں کہ اس کو آخرت پر ترجیح دی جائے، کیونکہ:

وَالْاٰخِرَةُ خَیْرٌ وَّ اَبْقٰی ○

اور پچھلا گھر بہتر ہے اور باقی رہنے والا

آخرت خیر ہی خیر ہے، بدی کی اس میں کوئی گنجائش نہیں ہے، بخلاف دنیا کی زندگی کے کہ اس میں

اگر چہ نعمتیں ہوں، عزت و مرتبہ ہو لیکن اس سب کے ساتھ رنج و غم، اور مصیبت و پریشانی بھی لازمی ہوتی ہے، اور دنیا کی کوئی نعمت ایسی نظر نہیں آئے گی جس کے ساتھ فکر و غم کا سایہ نہ ہو۔ اور اگر بالفرض دنیا کی زندگی خیر والی ہی ہو کہ شر و بدی کی اس میں گنجائش نہ ہو پھر بھی دنیا اس قابل نہیں کہ اس کو آخرت پر ترجیح دی جائے اس لئے کہ دنیا بالآخر فانی ہے اور آخرت ہمیشہ باقی رہنے والی ہے۔ دنیا کی زندگی کتنی ہی دراز کیوں نہ ہو جائے مگر فنا اس کے پیچھے لگی ہوئی ہے اور آخرت کو فنا کا کھٹکا نہیں ہے، اسی لئے کہا گیا ہے۔

حاصل دنیا زکہن نابنو

چوں گذرندہ است نیرزد بجو

دنیا سے غرض و مقصود یہی ہونا چاہئے کہ اس کو آخرت بنانے کا وسیلہ بنائیں کہ "الدنیا مزرعة الآخرة" دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔

چنانچہ عقلا نے کہا ہے کہ دنیا کو جلتے گھر کی طرح سمجھو جہاں تک ہو سکے اپنے آپ کو اس سے باہر نکالو۔

حافظا عمر عزیزت غنیمت دانش

گوی چیزے کہ توانی بہ براز میدانش

نکتہ فہموں نے کہا ہے کہ اس کلامِ معجز میں باوجود اختصار کے دنیا کو آخرت پر ترجیح دینے کے عمل کے باطل ہونے پر دو قوی دلیلیں پیش کی ہیں، ایک آخرت کا خیر ہونا، دوسرے اس کا باقی رہنا، اس لئے کوئی بھی عاقل ادنیٰ کو اعلیٰ کے بدلے میں اور فانی کو باقی کے بدلے میں اختیار نہیں کرے گا، سو دنیا کو آخرت پر ترجیح دینا تو تاجروں کے عقل کے تقاضے کے بھی خلاف ہے جن کی عقلیں بادشاہوں، امراء، علماء اور حکماء کی عقلوں سے کم درجے کی ہوتی ہیں۔

جب یہ مضمون کہ دنیا کو آخرت پر ترجیح نہیں دینی چاہیے، دنیا سے دل نہیں لگانا چاہئے بنی آدم کے نفس کے تقاضے کے خلاف دیکھا کہ ان کے تو مزاج میں ہی دنیا کی محبت اور آخرت سے اعراض گھسا پڑا ہے اور آخرت کی ترجیح کا وہم و گمان بھی ان کے دلوں میں نہیں ہے تو اس لئے ضروری ہوا کہ اس مقصد کو گذشتہ کتابوں کی سند سے ثابت کیا جائے، جو کتابیں دنیا کے مختلف فرقوں اور خاص طور پر عرب کے باشندوں کے نزدیک مسلم الثبوت ہیں چنانچہ فرمایا:

اِنَّ هٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰی ○

یہ لکھا ہوا ہے پہلے ورقوں میں

یعنی یہ مضمون جو "قد افلح" سے لے کر یہاں تک بیان ہوا پہلی کتابوں میں بھی مذکور ہے، یہ مضمون کبھی بھی منسوخ نہیں ہوا۔

صُحُفِ اِبْرٰهِیْمَ وَ مُوْسٰی ○

صحیفوں میں ابراہیم کے اور موسیٰ کے

یہ شریعت و دین کے ان قواعدِ کلیہ میں سے ہے جو کسی پیغمبر کے زمانے میں نہیں بدلے، اس کا انکار تو گویا علوم نظریہ کا انکار ہے جو سوفسطائیہ کا کام ہے۔

آسمان سے نازل شدہ کتب و صحائف

کشاف میں ہے اور بعض حدیث کی کتابوں میں بھی ضعیف سند کے ساتھ یہ حدیث دیکھنے میں آئی ہے کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کتنی کتابیں نازل ہوئیں ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک سو چار (۱۰۴) کتابیں۔ دس (۱۰) صحیفے حضرت آدم علیہ السلام پر، پچاس (۵۰) صحیفے حضرت شعیب علیہ السلام پر، تیس (۳۰) صحیفے حضرت ادریس علیہ السلام پر، دس (۱۰) صحیفے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر، توریت، زبور، انجیل اور قرآن مجید۔

طیبی نے کشاف کے حاشیے میں ایک سو چودہ کی تعداد ذکر کی ہے، دس صحیفے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر توریت کے علاوہ ذکر کئے ہیں، واللہ اعلم۔ لیکن یہود سے یہ سننے میں نہیں آیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر توریت کے علاوہ دس صحیفے بھی نازل کئے گئے تھے۔

اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحیفے تو موجود ہیں ان میں طرح طرح کی نصائح ہیں چنانچہ ان میں سے ایک یہ ہے:

"ینبغی للعاقل أن یکون حافظا للسانه، عارفا بزمانه مقبلا علی شانه"

عاقل کو چاہئے کہ اپنی زبان پر قابو رکھے، اپنے زمانے کو پہچانے اور اپنے کام میں لگا رہے۔

تم تفسیر سورۃ الأعلیٰ والحمدللہ

مقدمہ سورۃ الغاشیہ

یہ سورت مکی ہے، اس میں سولہ (۱۶) آیات، بہتر (۷۲) کلمے، اور ایک سو اکیانوے (۱۹۱) حروف ہیں۔

صحیح احادیث میں مکرر آیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ سورت جمعہ اور عشاء کی نماز میں ''سورۂ اعلیٰ'' کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔

سورۂ اعلیٰ کے ساتھ ربط کی وجوہات

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے اس کا ربط ''سورۂ اعلیٰ'' سے معلوم ہوگیا، اسی لئے قرآن کی تالیف کے وقت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سورۂ اعلیٰ کے بعد اس کو رکھا ہے، اور غور کرنے سے بہت سی وجوہات ربط کی ظاہر بھی نظر آتی ہیں مثلاً

(۱) اِس سورت میں ہے ''**فَذَكِّرْ** تف **اِنَّمَا اَنْتَ مُذَكِّرٌ** '' اور سورۂ اعلیٰ میں ہے ''**فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى**''

(۲) اِس سورت میں ہے ''**تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً**'' سورۂ اعلیٰ میں فرمایا ''**يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى**''

(۳) سورۂ اعلیٰ کا اختتام اس مضمون پر ہوا تھا کہ دنیا کی زندگی کو ترجیح دینا بہت بُرا ہے اور آخرت ہر صورت میں بہتر ہے۔ اِس سورت میں بھی ان لوگوں کی تفصیل ہے جنہوں نے آخرت کو بھلا دیا، دنیا کی لذتوں میں مشغول ہوگئے، جس کے نتیجے میں آخرت میں ان پر مصائب و عذاب کا ایک سلسلہ ہوگا، اسی طرح ان لوگوں کی تفصیل بھی ہے جنہوں نے آخرت کی زندگی کے لئے دنیا میں تکلیفیں جھلیں۔ نیز آخرت میں ملنے والی نعمتیں اور ہمیشہ باقی رہنے والی لذتوں کا بھی ذکر ہے، اس طرح سے گویا یہ سورت پچھلی سورت کا تتمہ ہوگیا، گو کہ کلام کے نظم ونسق میں مشابہت کم ہے۔

وجہ تسمیہ

اس سورت کا نام ''الغاشیۃ'' اس لئے ہے کہ غاشیہ قیامت کا نام ہے جس کا ذکر اس سورت کے شروع میں آیا ہے، تاکہ قیامت کا خوف پیدا ہو، اور قیامت کے حالات سے ڈرانا قرآن کے اعظم مقاصد میں سے ہے۔

تفسیر سورۃ الغاشیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

هَلْ اَتٰکَ حَدِیْثُ الْغَاشِیَةِ ٥

کچھ پہنچی تجھ کو بات اُس چھپا لینے والی کی

یعنی قیامت کے متعلق آپ کو کچھ معلوم ہے کہ لوگوں کے ساتھ کیا کرے گی، لغت میں ''غاشیہ'' اس چیز کو کہتے ہیں جو چھپا لیتی ہے، اسی لئے زین پوش کو غاشیہ کہتے ہیں۔

قیامت کو غاشیہ کہنے کی وجہ

قیامت کا حادثہ ایسا ہولناک ہوگا کہ بہت سی چیزوں کو اپنے اندر چھپا لے گا۔

(۱) سب سے پہلے تو انسان کے ہوش وحواس کو چھپا دے گا۔

(۲) دوسرے، انسان کے بدن کو چاروں طرف سے عذاب چھپا دے گا۔ چنانچہ دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

''یوم یغشٰھم العذاب من فوقھم و من تحت ارجلھم و یغشیٰ وجوھھم النار'' ''جس دن ان کو عذاب ڈھانپ دے گا ان کے اوپر سے اور نیچے سے اور آگ ان کے چہروں کو چھپا دے گی''

(۳) تیسرے، یہ حادثہ کافر کے نیک اعمال کو چھپا دے گا کہ اس کے تمام نیک اعمال حبط واکارت چلے جائیں گے اور مسلمان کے گناہوں کو چھپا دے گا، یعنی معاف کر دیئے جائیں گے۔

اس پوچھنے سے کہ کیا آپ کو قیامت کی کچھ خبر ہے، غرض یہ ہے کہ اس کے بعد ذکر کی جانے والی بات کی طرف مخاطب متوجہ ہو اور پوری دلجمعی سے اس کو سنے، چنانچہ اس طرح چونکا دینے کے بعد اب اس دن کے لوگوں کے حالات بیان فرماتے ہیں، فرمایا:

وُجُوْهٌ یَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ ٥

کتنے منہ اُس دن ذلیل ہونے والے ہیں

ذلت وخواری چہروں کی نہیں چہرے والوں کی صفت ہوتی ہے مگر ذلت وخواری کے آثار اکثر

چہرے پر ظاہر ہوتے ہیں، اس لئے گویا یہ چہروں کی صفت ہوئی، اور کلامِ عربی کا اسلوب یہ ہے کہ چہرہ، سر، اور گردن بول کر پوری ذات مراد لے لی جاتی ہے، چونکہ یہ اعضاء ایسے ہیں جن کی بقاء میں پورے وجود کی بقاء ہوتی ہے تو اس طرح گویا یہ اعضاء ذات کے قائم مقام ہیں۔

یہ چہرے وہ ہوں گے جنہوں نے دنیا میں دین کی خاطر کبھی ذلت وفروتنی کو پسند نہیں کیا، نہ ہی دین کے لئے رنج ومشقت ہی برداشت کرنا اچھا سمجھا، ہمیشہ دین کے لئے کوئی کلفت اُٹھانے کی بجائے آرام وراحت کی طلب میں رہے، ظاہری آرائش وزیبائش کا شوق، تن پروری وتن آسانی میں مگن، خوشذائقہ ومن پسند کھانوں کے حریص رہے، اور یہی ان کا مقصدِ زندگی رہا، سو آج اس تن پروری کے بدلے میں ذلت وخواری میں گرفتار ہوں گے، اگر دنیا کے اندر دین کی خاطر خوفزدہ حالات سے گذرتے، ذلت وفروتنی گوارا کرتے اور اللہ کی طاعت وعبادت میں مشقتیں اُٹھاتے تو آج ان کو ان تکالیف کے بدلے بڑے بڑے درجات ثواب کے عطا فرمائے جاتے، لیکن دین کے کاموں میں مشقت اٹھانے سے وہ جی چراتے تھے اس لئے آج ان کو سخت ترین مشقتوں سے دوچار کیا جائے گا اور بغیر کسی ثواب کے بے حساب رنج اُٹھائیں گے، چنانچہ فرمایا:

عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ۝

محنت کرنے والے تھکے ہوئے

عاملۃ کے معنی ہیں کام کرنے والے، اس دن یہ مشقت کے کام کریں گے۔

جہنمیوں کے اعمال شاقہ اور عذاب کی مختلف صورتیں

وہ کام جو جہنمی انتہائی ذلت سے کریں گے کچھ یہ ہیں:

(۱) دوزخ کے اندر ذلت کے ساتھ جہنم کے پہاڑوں پر چڑھیں گے۔

(۲) اپنی گردن میں آگ کے طوق اور پاؤں میں آگ کی زنجیریں باندھے گھسٹتے پھریں گے۔

(۳) دوزخ کی آگ کے اندر، آگ کی ایک دلدل ہوگی اس میں اس طرح دھنسیں گے جس طرح اونٹ دلدل میں دھنستا ہے، چنانچہ ان مشقت بھرے اعمال کی تفصیل دوسری آیات میں آئی ہے فرمایا:

”خذوہ فغلوہ ثم الجحیم صلوہ ثم فی سلسلة ذرعها سبعون ذراعاً فاسلکوہ ۝ ویوم یدعون إلی نار جهنم دعا ۝ ویطوفون بینها وبین حمیم اٰن ۝“

(۴) حدیث میں آتا ہے جو لوگ زکوٰۃ نہیں دیتے تھے ان کو جہنم میں یہ سزا دی جائے گی کہ سونے چاندی کی تختیوں کو گرم کر کے ان کی پیشانیوں، پہلو اور پشتوں کو داغا جائے گا۔

(۵) اور جنہوں نے جانور رکھے ہوتے تھے اور اللہ کا واجب حق ان میں کا ادا نہیں کیا ان کو قیامت کے دن چت لٹایا جائے گا اور جانوروں کو حکم ہوگا کہ ان کو روند ڈالیں۔

(۶) تصویر بنانے والوں سے کہا جائے گا کہ ان میں روح ڈالو اور ان کو سخت ترین عذاب دیا جائے گا۔

(۷) وہ لوگ جو جھوٹے خواب بیان کرتے تھے ان کو کہا جائے گا کہ (۲) دو جَو کو گرہ لگاؤ، اس مشقت واذیت میں وہ گرفتار ہوں گے۔

(۸) اور جو لوگ حق بات کہنے سے خاموش رہتے تھے، ان کے منہ میں آگ کی لگام ڈالی جائیں گی، علی ھذا القیاس۔ ''ناصبۃ'' ان کاموں کی وجہ سے دکھ اُٹھانے والے ہوں گے، جب کام نہایت دشوار ہو پھر اس پر ثواب وتحسین بھی نہ ہو تو رنج ہی رنج ہے۔

عاملۃ ناصبۃ کے متعلق دوسرا قول

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ عمل اور رنج ومشقت دونوں دنیا میں ہی ہیں، اور اس سے مراد یہود، نصاریٰ اور ہندو اور دیگر مذاہب باطلہ کے وہ لوگ ہیں جو اللہ کے لئے سخت ترین مجاہدات ریاضتیں اور مشقت کے اعمال کرتے ہیں کہ ان کے چہرے تھکے ماندے ہیں، مگر وقت کے پیغمبر کی نافرمانی وانکار کی وجہ سے ان کے یہ تمام مشقت والے اعمال بے کار چلے گئے، ان کو اس کا کچھ فائدہ نہ ہوگا۔

تیسرا قول

بعض مفسرین نے کہا ہے عمل دنیا کا مراد ہے اور رنج آخرت کا مراد ہے، اور یہ ان لوگوں کے چہرے ہیں جو دنیا میں بڑے عیاش، دولت مند اور عزت ومرتبے والے لوگ تھے، دنیا کے ان مقاصد کے حصول کے لئے انہوں نے بہت محنتیں کیں، مصائب جھیلے تھے، آخرت میں ان کو ان مشقتوں پر کچھ بھی اجر وثواب نہ ملے گا سوائے دکھ ورنج کے۔ بلکہ صرف رنج ہی نہ ہوگا اس پر مزید جو کچھ ہوگا وہ آگے بیان فرماتے ہیں:

تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً ۝

گریں گے دہکتی ہوئی آگ میں

یہ بدلہ ہے ان کو اس بات کا کہ وہ دنیا میں خدا سے غافل ہو کر عالیشان محلات اور ہوادار مکانوں میں رہا کرتے تھے۔

جہنم کی آگ

حدیث میں جہنم کی آگ کے متعلق آیا ہے کہ ایک ہزار سال تک وہ آگ پھونکی گئی تو سفید ہوگئی، پھر ہزار سال تک پھونکی گئی تو سرخ ہوگئی، پھر ہزار سال تک پھونکی گئی تو سیاہ ہوگئی اب وہ سیاہ ہی ہے۔

جب جہنم کی تباہ کن گرمی سے ان کو شدید پیاس لگے گی تو وہ پکاریں گے پیاس پیاس، کہ شاید پانی پینے سے ان کی پیاس مٹ جائے تو اس وقت ان کو کھولتے ہوئے چشمے کا پانی پلایا جائے گا، چنانچہ فرمایا:

تُسْقٰى مِنْ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ ۝

پانی ملے گا ایک چشمے کھولتے ہوئے کا

اس چشمے کا پانی پیتے ہی ان کے ہونٹ کباب بن جائیں گے، آنتیں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر پڑیں گی، پھر فوراً درست ہو جائیں گی اور اسی طرح عذاب میں گرفتار رہیں گے، ان کی یہ خدمت اس بات کے بدلے میں ہے کہ دنیا میں وہ اللہ سے غافل ہو کر قسم قسم کے ٹھنڈے میٹھے مشروبات سے لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔

دوزخ کی گرمی اور کھولتے ہوئے پانی کے پینے کے بعد ان لوگوں کے پیٹ میں بھوک بھڑک اٹھے گی، حدیث میں آتا ہے یہ بھوک ان پر ایسی مسلط ہوگی کہ ایک ہزار سال تک رہے گی، اور جہنمی بھوک کے اس عذاب کو جہنم کے سارے عذابوں پر بھاری سمجھنے لگیں گے، پھر بہت کچھ فریاد و فغاں کے بعد جہنم کے کارندوں سے کہا جائے گا ان کو کچھ کھلاؤ، مگر کیا کھلاؤ؟ ارشاد فرمایا:

لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ ۝

نہیں اُن کے پاس کھانا مگر جھاڑ کانٹوں والا

یہ لوگ جو دنیا میں مرغن، خوشذائقہ، چٹ پٹے موٹا کرنے والے اور رنگ وروپ پیدا کرنے والے

کھانے کھایا کرتے تھے اور صبح سے شام تک اپنے باورچیوں سے فرمائشیں ہی کیا کرتے تھے آج ان کو کھانا نہیں دیا جائے گا مگر ضریع کی قسم کا۔

''ضریع'' ایک گھاس کا نام ہے جو اکثر پانی کے کنارے پیدا ہوتی ہے اور اونٹوں کے چارے کے کام آتی ہے جب تک ہری رہتی ہے تو اس کو ''شبرق'' کہتے ہیں، جب خشک ہو جائے تو اس کو ''ضریع'' کہتے ہیں تب یہ زہر بن جاتی ہے کوئی جانور بھی اس کو نہیں کھاتا۔

حدیث میں آتا ہے کہ وہاں کی ضریع کو یہاں کی ضریع پر قیاس نہ کیا جائے کہ وہ آگ کے اندر پیدا ہونے والی ایک چیز ہے جو کانٹے کی طرح نوک دار، ایلوے سے زیادہ کڑوی، مردار سے زیادہ بدبودار اور آگ سے زیادہ گرم ہے۔

وجہ یہ ہے کہ جس طرح دنیا کے حیوانات ونباتات کی طبیعتوں میں پانی اور مٹی کا جوہر غالب ہے اسی طرح دوزخ کے اندر وہاں کے حیوانات، نباتات کی طبیعتوں پر جوہرِ ناری (آگ کا جوہر) غالب ہوگا وہاں کے حیوانات ونباتات بظاہر دنیا کے حیوانات ونباتات سے مشابہت رکھتے ہیں کہ اسی نام سے انکو پکارا جاتا ہے ورنہ حقیقت میں ان کا مادہ و جوہر آگ کا ہے اور وہاں کی ہر چیز کے اندر سوزش و ناریت موجود ہے۔

کھانا تین ہی مقاصد کے لئے کھایا جاتا ہے، یا لذتِ کام و دہن کے لئے، یا بدن کو موٹا وفربہ کرنے کے لئے، یا بھوک مٹانے کے لئے۔ سو ''ضریع'' کے جو اوصاف حدیث میں بیان ہوئے اس کے مطابق اس میں لذت تو نام کی کوئی چیز نہیں، باقی دو مقصد جو بسا اوقات بدمزہ کھانے سے بھی حاصل ہو جایا کرتے ہیں ان کی بھی نفی کرتے ہیں چنانچہ فرمایا

لَّا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِىْ مِنْ جُوْعٍ ۝

نہ موٹا کرے اور نہ کام آئے بھوک میں

کھانے سے یہ تین ہی مقاصد ہوا کرتے ہیں، جس کھانے میں یہ تینوں باتیں نہیں تو حقیقت میں وہ کھانا ہی نہیں ہے، اگر یہ کھانا ان کے بدن کو موٹا وطاقتور کرتا تو جہنمیوں کو یہی فائدہ ہوتا کہ اس طاقت و قوت سے عذاب کے برداشت میں سہولت ہو جاتی، اور اگر بھوک مٹ جاتی تو یہ بھی بڑا فائدہ تھا کہ بھوک کے عذاب سے نجات مل جاتی مگر اس کھانے میں ایسا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

یہاں دو سوال کئے جاتے ہیں جن کا جواب ذکر کیا جاتا ہے۔

ایک اشکال اور اس کا جواب

اشکال یہ کیا جاتا ہے کہ آگ کے اندر نباتات کا وجود ممکن نہیں۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ دھوپ کی گرمی میں بہت سے درخت جل کر خشک ہو جاتے ہیں، تو آگ میں وہ بھی جہنم کی آگ میں کسی پودے کا ہرا رہنا کیسے ممکن ہے؟

جواب اس کا یہ ہے جب جہنم میں انسان، سانپ، بچھو، بہت سارے جانداروں کا وجود مسلّم ہے تو نباتات کا وجود ماننے میں تعجب کی کون سی بات ہے؟ علاوہ ازیں بعض نباتات ایسے بھی ہیں جو بڑھتے ہی سورج کی شدید گرمی میں ہیں اور ہرے رہتے ہیں، جیسے گوکھرو، جواسا وغیرہ ہیں پھر کیا بعید ہے کہ وہاں کی گرمی میں بھی یہ تاثیر رکھ دی گئی ہو کہ بعض نباتات کو بڑھائے اور سرسبز رکھے، خاص طور پر جب کہ ان نباتات کے اصل جوہر و مادہ میں آگ غالب ہو۔

دوسرا اشکال اور اسکا جواب

دوسرا اشکال یہاں پر یہ ہوتا ہے کہ اس آیت میں دوزخیوں کے کھانے کے متعلق حصر کر کے کہا گیا ہے کہ صرف ''ضریع'' ان کا کھانا ہوگا، حالانکہ دوسری آیات میں دوزخیوں کے لئے اور کھانوں کا بھی ذکر آیا ہے، جیسے ''زقوم'' اور ''غسلین'' ہے چنانچہ فرمایا ''**ان شجرة الزقوم طعام الاثيم**'' اور فرمایا ''**ولا طعام الا من غسلين**''

جواب اس کا یہ ہے کہ دوزخ کے بہت سارے طبقات ہیں، کسی طبقے کے لوگوں کو صرف یہی کھانا دیا جائے گا دوسرا نہ دیا جائے گا، لہٰذا ''**وجوه يومئذ خاشعة**'' سے مراد اسی طبقے کے لوگ ہوں گے۔

دوسرا جواب:۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ''ضریع'' سے خاص ضریع مراد نہیں بلکہ اس کی جنس مراد ہے یعنی اس کی خصوصیات بے مزہ ہونا، موٹا نہ کرنا، بھوک نہ مٹانا یہ جس کھانے میں بھی پائی جائیں گی وہ ضریع ہی کہلائے گا (اس اعتبار سے زقوم و غسلین بھی ضریع میں داخل ہو گئے)۔

یہاں تک کہ بعض مفسرین نے ضریع بروزن فعیل مفعل کے معنی میں لیا ہے، جیسے علیم، اور بدیع ہیں۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ جو کھانا ضراعت کا سبب ہے یعنی ذلت کا اور طبیعت کی بدمزگی کا

سبب ہے وہ ان کو کھلایا جائے گا، (اس صورت میں بھی تمام کھانے اس میں شامل ہو گئے) اور اشکال ختم ہو گیا۔

جب دوزخیوں کے کھانے، پینے اور رہنے کے احوال بیان کرنے سے فارغ ہوئے تو اب جنتیوں کے کھانے پینے اور رہنے سہنے کے تفصیلی حالات بیان کرتے ہیں۔

سورۂ قیامہ میں جہنمیوں کے حالات بیان کرنے کے بعد جب جنتیوں کے حالات بیان فرمائے تو حرف عطف لائے تھے، جب کہ یہاں حرف عطف نہیں لائے، وجہ اس کی یہ ہے سورۂ غاشیہ میں ''حدیث الغاشیۃ'' کے عنوان سے جنتیوں کا اجمالی ذکر پہلے آ گیا تھا اس لئے تفصیل کے وقت عطف نہیں لائے، جبکہ سورۂ قیامہ میں مجمل کی تفصیل نہیں اس لئے وہاں حرف عطف لائے۔

وُجُوهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ ۝

کتنے منہ اُس دن ترو تازہ ہیں

اس دن بہت سے چہرے خوش منظر اور نازک اندام ہوں گے، خوف و دہشت، ذلت و خواری اور رنج و محنت کے آثار ان کے چہروں پر نہیں ہوں گے، اس لئے کہ انہوں نے اس دن کی خاطر دنیا میں بہت مشقتیں اُٹھائی تھیں، وہ اللہ کی خوشنودی کیلئے اپنی جان و تن پر تکلیفیں گوارا کرتے رہے چنانچہ فرماتے ہیں:

لِّسَعْيِهَا رَاضِيَةٌ ۝

اپنی کمائی سے راضی

وہ اس روز خوش و خرم ہوں گے کہ ہماری کوشش ٹھکانے لگی اور اچھا پھل مل گیا۔

فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ۝

اونچے باغ ہیں

اس کے اونچا ہونے کی وجہ سے قیامت کے حوادث اور دیگر موذی چیزوں کا خوف وہاں نہ پہنچے گا، جہنم کے دھوئیں کا بھی وہاں اثر نہ پہنچ سکے گا۔

لَا تَسْمَعُ فِيهَا لَاغِيَةً ۝

نہیں سنتے اُس میں بکواس

وہ وہاں بے ہودہ بات بھی نہ سنیں گے گالی گفتار تو دور کی بات ہے، دوزخیوں کی چیخ و پکار جو محض بے ہودہ ہے وہ بھی وہاں سنائی نہ دے گی تاکہ ان کی خوشی و مسرت میں کوئی تکدّر پیدا نہ ہو، جنتیوں کو یہ نعمت دوزخیوں کے اس عذاب کے بدلے میں دی گئی ہے "تصلیٰ ناراً حامیة" اور کھولتے ہوئے چشمے کے بدلے میں ان کو یہ عطا ہو گا۔

فِيهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ ۝

اُس میں ایک چشمہ بہتا

اس چشمے کا پانی برف سے زیادہ ٹھنڈا اور شہد سے زیادہ میٹھا ہو گا۔

دوزخیوں کی ذلت وخواری کے مقابلے میں ان کو یہ انعام ملے گا:

فِيهَا سُرُرٌ مَّرْفُوعَةٌ ۝

اُس میں تخت ہیں اونچے بچھے ہوئے

تاکہ کمال عزت سے ان پر بیٹھیں۔ اور دوزخیوں کے رنج ولعنت اور نجس کھانے کے مقابلے میں ان کو یہ انعام عطا ہو گا۔

وَّأَكْوَابٌ مَّوْضُوعَةٌ ۝

اور آبخورے سامنے چنے ہوئے

انہیں تختوں پر ترتیب سے آب خورے رکھے ہوں گے تاکہ جب ان کو کھانے، دودھ، شہد یا شراب پینے کی خواہش پیدا ہو تو کسی سے مانگے بغیر اٹھا کر کھائیں گے پئیں گے، تختوں سے نیچے اترنے اور کچھ محنت کرنے کی ضرورت نہ ہو گی۔

وَّنَمَارِقُ مَصْفُوفَةٌ ۝

اور غالیچے برابر بچھے ہوئے

تکیے اور قالینیں بچھی ہوں گی، ترتیب سے برابر، تاکہ جس پر چاہیں تکیہ لگا کر بیٹھیں یا لیٹیں۔

وَّزَرَابِیُّ مَبْثُوْثَةٌ ○

اور مخمل کے نہالچے جگہ جگہ پھیلے ہوئے

جگہ جگہ قالینیں پھیلی پڑی ہوں گی تاکہ جس مکان میں چاہیں بچھوائیں۔

اہل جہنم اور اہل جنت کے احوال پر کافروں کا طعن اور اس کا جواب

جب اس سورت میں جہنمیوں اور جنتیوں کے حالات تفصیل سے بیان ہو چکے تو اب کافروں کے ایک طعن کا جواب دینا چاہتے ہیں جو کافر لوگ ہنسی مذاق اڑاتے ہوئے کیا کرتے تھے، وہ یہ کہ اس پیغمبر کی باتوں میں تضاد ہے، ایک طرف تو دوزخیوں کے عذاب کے ایسے حالات بیان کرتا ہے کہ اس قسم کا عذاب سہہ کر کوئی انسان یا حیوان زندہ نہیں رہ سکتا، لیکن یہ کہتا ہے دوزخی ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے کبھی بھی نہیں مریں گے۔

اور جنتیوں کی تعریف میں بتاتا ہے کہ وہ اونچے اونچے تختوں پر بیٹھے ہوں گے اور انہیں کوئی رنج و تکلیف بھی نہ ہوگی۔ حالانکہ ان تختوں پر چڑھنے اترنے میں بھی تو ایک طرح کی مشقت ہے، اور یہ بھی کہتا ہے کہ ان تختوں پر پانی و شراب کے بھرے کوزے ہوں گے، مندیں اور قالینیں بچھی ہوں گی، بھلا بیٹھنے کے تختوں پر اتنی گنجائش ہی کہاں ہوتی ہے کہ ان پر اتنی ساری چیزیں رکھی جائیں اور بیٹھا بھی جائے، اور اگر بھرے ہوئے آبخورے گر پڑیں تو سارا تخت بھیگ جائے اور بیٹھنے کے قابل ہی نہ رہے۔

حق تعالیٰ نے ان کے اس طعن و ٹھٹھے کے جواب میں اگلی آیات اتاری ہیں۔

جواب کا حاصل یہ ہے کہ جنتیوں اور دوزخیوں کا نمونہ اس جہان میں بھی موجود ہے، اور جنت و جہنم کی صورت یہاں بھی جلوہ گر ہے، تم جنت و دوزخ کے احوال و صفات پر اعتراض اور ان کا انکار کیوں کرتے ہو، اپنے سامنے ان چیزوں پر غور کیوں نہیں کر لیتے کہ تم حیرت و استعجاب کی تاریکیوں سے نکل سکو، سو وہ قابلِ غور چیزیں چار ہیں۔

(۱) جانوروں میں سے اونٹ ہے۔ (۲) بسائطِ علویہ میں سے آسمان ہے۔

(۳) معادن میں سے پہاڑ ہیں۔ (۴) بسائطِ سفلیہ میں سے زمین ہے۔

سب سے پہلے اونٹ کا ذکر فرماتے ہیں چنانچہ فرمایا:

اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ كَیْفَ خُلِقَتْ ○

بھلا کیا نظر نہیں کرتے اونٹوں پر کہ کیسے بنائے ہیں

اونٹ کی پیدائش میں جنتیوں اور جہنمیوں دونوں کے نمونے موجود ہیں۔

اونٹ کے عجیب وغریب اوصاف

اونٹ اپنی ذات و معاش کے اعتبار سے دوزخیوں کے ساتھ مشابہت رکھتا ہے اور اپنے منافع و فوائد کے اعتبار سے جنتیوں کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے۔

اپنی ذات و معاش میں دوزخیوں کے ساتھ اس کی مشابہت اس طرح ہے کہ وہ اپنے اتنے بڑے ڈیل ڈول اور بلند و بالا قد و قامت کے باوجود اس قدر ذلیل و خوار ہے کہ ایک چھوٹا سا بچہ بلکہ ایک چوہا بھی اس کی مہار پکڑ کر جہاں چاہے لیا پھرتا رہے، یہ سب اس کے چہرے کو عاجز و ذلیل کرنے کی وجہ سے ہے کہ اس کی ناک کو چھید کر اس میں نکیل ڈال دیتے ہیں اس وجہ سے وہ ذلیل و فرمانبردار ہو جاتا ہے، یہ اکثر گرم اور ریگستانی علاقوں میں رہتا ہے مسلسل لو چلنے، اور دھوپ کی گرمی کی وجہ سے وہ علاقہ آگ بن جاتا ہے، کئی کئی دن تک یہ پیاسا رہتا ہے، پورے علاقے میں پانی نہیں ملتا کہیں کسی جوہڑ میں ہو بھی تو دھوپ و گرمی کی شدت کی وجہ سے کیچڑ کی طرح ہوتا ہے، اسی سے یہ اپنی پیاس بجھاتا ہے، اس کی خوراک خاردار اور کڑوے درخت ہیں جیسے ضریع وغیرہ، اور ان سب باتوں کے ساتھ بار برداری کی قوت اور سخت ترین کاموں کی طاقت، پہاڑوں اور دشوار گذار علاقوں پر چڑھنے اترنے کی ذلت جو اس جانور کے حصے میں آئی ہے اس کا عشر عشیر بھی کسی دوسرے جانور کو نہیں ملی، اور یہ ہر وقت رنج و مصیبت کے اس طوفان میں گرفتار رہتا ہے۔

فوائد و منافع کے اعتبار سے جنتیوں کے ساتھ اس کی مناسبت یہ ہے کہ اگر اس کی پیٹھ کو دیکھیں تو یوں لگتا ہے چار ستونوں پر رکھا ہوا تخت ہے، اور باوجود اتنا بلند ہونے کے کہ ہاتھ نہیں پہنچتا جب چاہیں بٹھلا کر سوار ہو جائیں جیسے جنت کے تخت ہوں گے چنانچہ ''معالم التنزیل'' میں ہے کہ جنت کے تخت دور سے اونچے نظر آئیں گے، جب جنتی ان پر سوار ہونے چاہیں گے تو وہ نیچے ہو جائیں گے، سوار

ہونے کے بعد وہ پھر بلند ہو جائیں گے۔

اس کے تھنوں کی طرف غور کریں تو گویا دودھ سے بھرے آبخورے رکھے ہیں، اور دودھ کے چشمے ان سے جاری ہیں۔

اس کی پشم سے نمدے، قالینیں، مخمل اور مسندیں بنائی جاتی ہیں اس کا گوشت کھاتے اور دودھ پیتے ہیں، اس کے بالوں سے اوڑھنے پہننے کے سامان تیار کیے جاتے ہیں، جب لاد کر چلو تو گویا کشتی ہے اور بغیر بوجھ کے دوڑاؤ تو گویا تیر ہے۔

اگر اپنے اہل وعیال کے ساتھ اس پر گھر کا تمام ساز وسامان لاد کر سوار ہو جائیں تو گویا پورا گھر چلا جا رہا ہے، دنیا کے جانوروں میں یہ ایک عجیب وغریب جانور ہے مگر رات دن ایک ساتھ رہنے سے عادت ہوگئی، اس لئے کچھ تعجب نہیں لگتا۔

کہا جاتا ہے کہ دنیا کا کوئی جانور ایسا نہیں کہ اس پر بوجھ لادنا چاہیں تو پورا گھر اس پر لد سکے، اور کہیں بھیجنا ہو تو دوڑتا ہوا چلا جائے اور یہ اتنا لمبا سفر کر سکتا ہے کہ کوئی دوسرا جانور اتنی دور نہیں جا سکتا، اور اگر اس کو ذبح کریں تو اس کا گوشت پورے محلے کے لئے کافی ہو جائے، اور اگر اس کا دودھ نکالیں تو پورے گھرانے کے لئے کافی ہو، اسی لئے حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ:

"الإبل عز لأ هلها و الغنم بر كة والخيل معقود بنو اصيه الخير الى يوم القيامة"

اونٹ گھر والوں کی عزت ہے، بکری برکت ہے اور گھوڑے کے ساتھ قیامت تک خیر باندھ دی گئی ہے۔

باوجود اس طاقت وقوت کے اونٹوں کی پوری قطار کو ایک بچہ لئے پھرتا ہے، یہ جانور صابر ایسا ہے کہ دس روز تک بھی پیاسا رہے گا مگر محنت اور کام میں کوتاہی نہیں کرتا۔

اونٹ کے عجائبات میں سے یہ بھی ہے کہ وہ قبلہ رو ہو کر چلتا ہے۔

اس کے بالوں کو جلا کر اس کی راکھ کو بہتے ہوئے خون پر رکھا جائے تو خون بند ہو جائے گا۔

استسقی، تلی اور بواسیر کے بیماروں کے لئے اس کا دودھ اور پیشاب بہت مفید ہے، طبیب حضرات یہ بات جانتے ہیں۔

اونٹ کی کلنی [1] کو اگر عاشق کی آستین پر باندھ دیں تو عشق سے چھٹکارہ مل جائے۔

---

[1] کلنی: چیچڑی ۱۲ فیروز اللغات

اونٹ تمام جانوروں میں باغیرت مشہور ہے، یہ دانستہ طور پر اپنی ماں یا بہن پر جستی نہیں کرتا۔ مستی کے وقت اس میں عشق کے آثار اور جوش جنوں کے ولولے نظر آتے ہیں جو سچے عاشق کی علامات ہیں، اس وقت یہ کھانا پینا چھوڑ دیتا ہے اور اپنی سابقہ عادت سے تین گنا زیادہ بوجھ اٹھاتا ہے۔

اس کی درازیٔ گردن مخلوق کے عجائبات میں سے ہے، بیان کیا جاتا ہے کہ کسی حکیم سے (جو اونٹ کو نہیں جانتا تھا) کسی نے کہا ایک جانور ہے جس کا نام اونٹ ہے اس کو بٹھا کر منوں بوجھ اس پر لاد تے ہیں پھر وہ اپنے زور سے بوجھ لے کر اُٹھ جاتا ہے، اس حکیم نے کہا تب اس کی گردن بہت لمبی ہوگی کہ گردن کے زور سے ہی وہ کھڑا ہوتا ہوگا۔

اگر اونٹ کو اتنی لمبی گردن عطا نہ ہوتی تو اونچے اونچے درختوں کے پتوں سے وہ محروم ہو جاتا، اسی لمبی گردن کی بدولت وہ اونچے درختوں سے پتے چرتا ہے۔

ہاتھی کو بطور عجیب نمونے پیش نہ کرنے کی وجہ

اب یہ معلوم ہوگیا کہ ہاتھی کو کیوں اس مقام پر ذکر نہیں فرمایا، اس لئے کہ ہاتھی میں جنت ودوزخ کے نمونے موجود نہیں، اس لئے کہ ایک تو وہ ایسے مقامات پر رہتا ہے جہاں سبزہ و پانی ہو، اس کی اکثر خوراک کیلے کے پتے یا دیگر فصلیں ہوتی ہیں، کام کاج میں بھی اتنی مشقت نہیں اُٹھا سکتا، پھر ذلیل و فرمانبردار بھی نہیں ہے، بلکہ اس میں تکبر و سرکشی پائی جاتی ہے، اکثر امراء وسلاطین کے فیلخانوں میں عزت وتوقیر سے رکھا جاتا ہے، اس کو جو کچھ خوراک دی جاتی ہے بہت عمدہ ہوتی ہے۔ لہٰذا اس کو دوزخ کے جلنے بھننے سے کیا مناسبت ہوسکتی ہے۔

دوسرے یہ کہ یہ جانور بے فائدہ ہے، نہ دودھ استعمال کیا جائے نہ گوشت قابلِ استعمال نہ پشم وغیرہ، نہ ہر شخص ہر وقت سواری ہی کرسکتا ہے لہٰذا جنت کا نمونہ بھی نہیں بن سکتا، اگرچہ قد وقامت اس کا بڑا ہوتا ہے مگر یہاں قابلِ ذکر نہیں ہے، کہ یہاں ذکر سے کچھ اور ہی مقصد ہے۔

وَاِلَى السَّمَآءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ○

اور آسمانوں پر کہ کیسا اُس کو بلند کیا ہے

آسمان کی بلندی کی طرف نہیں دیکھتے ہو، اگر غور کرو تو جنت کی اور اس کے تختوں کی بلندی میں کوئی

تعجب نہ کرو، اس لئے کہ آسمان اپنی حرکتِ دَوری جو دن رات میں پوری کرتا ہے، اس کے دن رات کے دورے میں اس کا ہر جز نیچے بھی ہو جاتا ہے اس طرح کہ سر کی طرف سے قدموں کی طرف آ جاتا ہے، اور جنت کے اونچے تختوں کا جنتیوں کے قدموں کے نیچے اس بلندی سے آنا اس بلندی و پستی سے سمجھ لینا چاہئے۔

یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ آسمان کے ستارے کوزوں کی طرح رکھے ہوئے اور آسمان کی حرکتِ دَوری سے دوستارے بھی اپنے مرکز سے جنبش نہیں کرتے، جس طرح جنت کے آبخورے گرم وسرد مشروبات سے بھرے ہوں گے اسی طرح آسمان کے یہ کوزے رنگارنگ روشنیوں اور شعاعوں سے بھرے ہوئے ہیں، مثلاً زہرہ کی روشنی مروارید کی سی ہے، مریخ کی شعاع سرخ ہے، مشتری خالص سفید، زحل میں گدلا پن اور نیلگوں رنگ ہے، اسی طرح گرم وسرد ہونے کے اعتبار سے ستاروں کی شعاعیں مختلف ہیں، چاند کے نور میں سردی ہے، سورج میں حرارت ہے، زحل میں خشکی ہے، زہرہ میں رطوبت ہے، اسیطرح دیگر ستارے ہیں۔

یہ بھی ہے کہ آفتاب و ماہتاب کی صورت میں دو چشمے آسمان پر جنت میں جاری نہروں کا نمونہ ہیں۔ ایک سے شراب گلگوں تیز و تند فوارے کی طرح جوش مارتی ہے اور دوسرے سے ٹھنڈے دودھ کے فوارے چھوٹ رہے ہیں۔

اور بُرجوں و منازل میں جو ستارے بکھرے نظر آرہے ہیں یہ غالیچوں کے تکیوں اور رنگارنگ قالینوں کی مانند ہیں، بعض ایسے ہیں کہ صفوں کی طرح برابر بچھا دیئے گئے ہیں اور بعض پھولوں کی طرح بکھرے ہوئے ہیں، پس دنیا میں یہ آسمان، جنت کا نمونہ ہے۔

پھر اس آسمان پر رہنے والے فرشتے جو نورانی چہروں والے ہر وقت اللہ کے ذکر و تسبیح میں مشغول، بے بیہودہ باتوں کو نہیں سنتے ہیں، یہ سب جنت کا نمونہ ہے۔

پھر اسی آسمان کو اگر دوسرے زاویۂ نگاہ سے دیکھیں تو یہ جہنم کا منظر پیش کرتا ہے، وہ اس طرح کہ شیاطین و بدکاروں کی ارواح کو مارنا و ہانکنا ہر وقت آسمان سے جاری رہتا ہے، یہ شیاطین استراقِ سمع کیلئے جب آسمان کی طرف جاتے ہیں تو ان پر آگ کے شعلے اور گُرز مارے جاتے ہیں، اس وقت وہ ملک الموت کی پکڑ سے گھبرا کر نا اُمید ہو کر واپس بھاگتے اور ایک بے مقصد رنج و تکلیف اُٹھاتے ہیں،

آسمان کے دربان کا غصہ شعلوں کی گرمی اور غذا کے بدلے میں دربانوں کی مار دھاڑ یہ سب دوزخیوں کا منظر و مشابہت ہے۔

وَاِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ٥

اور پہاڑوں پر کہ کیسے کھڑے کر دیئے ہیں

اور کیا یہ پہاڑوں کی طرف نہیں دیکھتے کہ کیسے کھڑے کر دیئے گئے ہیں کہ آندھیوں، بارشوں اور زلزلوں سے اوندھے نہیں گرتے، اسی طرح جنت کے آبخوروں کو سمجھ لینا چاہئے۔

بلکہ اگر زیادہ غور کریں تو پہاڑوں کو اس اعتبار سے جنت سے مشابہت ہے کہ ان پر بدبو، موذی جانور، گندے بخارات نہیں جاتے، وہ بلند اور تروتازہ آب و ہوا والے ہیں۔ وہاں دنیا والوں کی بے ہودہ گوئی لڑائی جھگڑے کی آواز نہیں پہنچتی صاف اور میٹھے چشمے جاری ہیں اونچے اور صاف پتھر تختوں کی طرح جگہ جگہ رکھے ہوئے ہیں، سبزہ مسندوں اور قالینوں کی طرح بچھا ہوا ہے۔

اسی طرح ایک دوسرے پہلو سے ان پہاڑوں پر غور کریں تو یہ دوزخ کا منظر بھی پیش کرتے ہیں، کہ وہ بدنصیب لوگ جو ان میں پڑے ہوئے ہیں زندگی کی آسائشوں سے محروم ہیں، پہاڑوں پر اترنے چڑھنے کی مشقت اور دیگر مشکلات، خاردار درخت اور جھاڑیاں جو ضریع و زقوم کا نمونہ ہیں یہاں پر کثرت سے ہیں۔

وَاِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ ٥

اور زمین پر کہ کیسی صاف بچھائی ہے

زمین کو نہیں دیکھتے کیسی بچھائی ہے کہ کسی جگہ رنگارنگ پھول و سبزہ زار ہیں جو بکھرے قالینوں کی طرح ہیں، کسی جگہ صاف مسند کی طرح ہے، یہی زمین اغنیاء و امراء کی بود و باش کے لحاظ سے جنت کا نمونہ ہے کہ وہ کمال عزت و وقار سے باغات اور سیر گاہوں میں مکلف فرشوں پر بیٹھے ہوتے ہیں، کھانے پینے کے قسم قسم کے برتن ان کے سامنے پڑے رہتے ہیں، زر و جواہر کے چشمے ان کے خزانوں سے جاری رہتے ہیں، بلند و بالا تخت بیٹھنے کے لئے اور سواری کے لئے جانور موجود رہتے ہیں۔

اگر اسی زمین کو محتاج و مفلوک الحال انسانوں کے اعتبار سے دیکھیں تو یہ جہنم کا نمونہ ہے، بالخصوص

ان لوگوں کے اعتبار سے جو گرم ملکوں میں رہتے اور عین گرمی کے وقت پا پیادہ بے سروسامانی کے عالم میں کسی منفعت کی توقع کے بغیر محوِ سفر ہیں، رنج و مصیبت کے سارے اسباب موجود ہیں اور راحت و آرام سے محروم ہیں۔

پس یہ چاروں چیزیں عقلمند آدمی کے لئے جنت و جہنم کے احوال کو سمجھنے کے لئے کافی ہیں۔

مذکورہ چار چیزوں کو مثال کے طور پر اختیار کرنے کی وجہ

ان چار چیزوں کو مثال کے لئے اس لئے منتخب کیا کہ اس معجز و بلیغ کلام کے اوّلین مخاطب عرب کے وہ صحرا نشین تھے جو جانوروں کو پالتے تھے بالخصوص زیادہ تر اونٹ پالتے، اس کا دودھ پیتے، گوشت کھاتے اس کے بالوں سے کپڑے، فرش اور خیمے بناتے، باربرداری اور سفر اسی پر کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ اہل تجربہ نے کہا ہے کہ اہلِ عرب کا سارا کاروبار اونٹ پر موقوف ہے، ایران والوں کا خچر پر، تورانیوں کا گھوڑے پر، اور اہل ہند کا بیلوں پر ہے۔ (تو اونٹ کو مثال میں پیش کرنے کی خصوصیت یہ ہوئی)

پھر جنگلوں میں رہنے والے چونکہ جانور زیادہ پالتے ہیں اس لئے ان کے چارے پانی کے لئے وہ بارش کے ہر دم محتاج اور انکی نظر آسمان کی طرف رہتی ہے، ہواؤں کا رُخ دیکھنے اور معلوم کرتے رہتے ہیں کہ کون سی ہوا کس طرف سے چلتی اور بارش برساتی ہے، (تو آسمان کی طرف ان کی توجہ زیادہ رہتی ہے اس لئے اس کو ذکر کیا)

اور ان لوگوں کی اکثر آخری پناہ گاہ پہاڑ ہوتے ہیں، اگر کسی وقت کسی دشمن نے حملہ کرلیا یا میدانی علاقوں میں قحط پڑ گیا تو یہ لوگ پہاڑوں پر چڑھ جاتے ہیں اور فراغت سے بسر اوقات کرتے ہیں، چنانچہ ایک شاعر فخر یہ کہتا ہے۔

لنا جبل لخيله من بخيره

منيع يرد الطرف وهو كليل

ہمارے لئے پہاڑ قلعے ہیں، مانع ہوتے ہیں دشمن کو اس سے جو اختیار کرے ان کو ایسے اونچے کہ پھیرتے ہیں نگاہ کو اور نگاہ کرنے والا عاجز ہے (ترجمہ از حاشیہ ترجمہ قدیم)

(تو پہاڑوں کی مثال عبرت کے لئے اس لئے بیان فرمائی)

پھر زمین ایک ایسی ضرورت ہے کہ بادشاہ سے لے کر فقیر تک سارے ہی اس کے محتاج ہیں رہنا سہنا، کھانا پینا، جینا اور مرنا سب اس کے اندر ہی ہے، پس یہ چاروں چیزیں ہر وقت یہاں کے رہنے والوں کے دل ونگاہ کے سامنے رہتی ہیں اور مثال سے مقصود بھی یہی ہوتا ہے کہ صور خیالیہ کو محسوسات کے ذریعہ سمجھایا جائے، تاکہ ان خیالی صورتوں سے ایک معقول معنیٰ نکل سکے، اور ایسی ہی چیز کا مثال میں بیان کرنا مفید اور کمالِ بلاغت ہے جو جلد سمجھ میں آجائے۔

تمثیلات کے باب میں قرآن کا حکیمانہ طرز

محققین نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اپنی نعمتوں کے بیان کے مقام پر، اپنی ذات و صفات کی وحدانیت کے دلائل اور اپنی ذات کے کمالات کے بیان کے موقع پر تمثیلات کا ایسا طرز اختیار کیا ہے کہ سالک وراہی کے لئے شہوت، لذت، حرص وطمع اور دنیا کی زیب وزینت کی طرف توجہ کا باعث نہ بن جائے، ورنہ تمثیل کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا اور لوگ نفسانی خواہشات ومرغوبات کے مطالعے میں ڈوب جائیں گے، اور اصل مقصد سے بعد المشرقین کے فاصلے پر جا پڑیں گے۔

اسی طرح تمثیلات میں قرآن نے انسانوں کی کاریگری وصناعی کے عجیب وغریب نمونوں کو بھی پیش نہیں کیا کہ یہ بھی مقصد سے دوری کا سبب بن سکتا ہے کہ لوگ کہیں ان عجائب کو انسانوں کے ذاتی اختیار وارادہ کا ثمرہ نہ خیال کر بیٹھیں۔ اس لئے تمثیل کے لئے ایسی چیزوں کو اختیار کیا گیا جو ہر شخص کو ملاحظہ وغور وفکر کے لئے حاصل ہیں، دوسرے وہ اپنے طبعی حسن وجمال کے باوجود کسی طرح کے حرص وطمع کا موجب بھی نہیں بنتیں، قرآن میں جا بجا ایسی ہی مثالیں نظر آئیں گی، کہیں آپ کو نظر نہیں آئے گا کہ یوں کہا ہو بادشاہوں اور امراء کے ساز وسامان میں غور وفکر کرو، یا حسین لڑکوں اور عورتوں میں غور کرو، اور ان کو دیکھ کر صانعِ مطلق کی حکمت وکاریگری معلوم کرو۔

”سطحت“ کے لفظ سے زمین کے چپٹی ہونے کے شبہے کا ازالہ

بعض لوگوں نے ”سطحت“ کے لفظ سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ زمین کرہ کی شکل میں نہیں ہے، لیکن ان کا یہ استدلال نہایت ہی کمزور ہے، اس لئے کہ حقیقت میں کروی شکل میں ہی ہے، لیکن اس کا جسم (ہماری نسبت سے) اتنا عظیم اور بڑا ہے کہ کرہ کی شکل میں نظر نہیں آتی، اور اس کے باہم ملے

ہوئے اور متلاحق اجزاء کی بلندی اور پستی دیکھنے میں ہموار نظر آتی ہے، اور عام انسانوں کے خیال میں یہ مسطح و ہموار ہی ہے اس لئے قرآن نے انہی کے وہم و خیال کے مطابق کلام کیا ہے (کہ قرآن لوگوں کے عرف کے مطابق کلام کرتا ہے)

جنتیوں اور دوزخیوں کے متعلق کفار کے طعن و استبعاد کے جواب سے جب فارغ ہوئے تو گویا مقام اس بات کا ہے کہ کہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کفار کے عناد و سرکشی کی انتہا دیکھتے ہوئے ایسا نہ ہو کہ وعظ و نصیحت سے ہی دست کش ہو جائیں کہ ایسوں کو نصیحت بے سود ہے، اس لئے اس بات کی تاکید اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کی ضرورت ہوئی چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں:

فَذَكِّرْ قف إِنَّمَآ أَنْتَ مُذَكِّرٌ ۝

سو تو سمجھائے جا تیرا کام تو یہی سمجھانا ہے

یعنی جب یہ چاروں چیزیں ہر کس و ناکس کے سامنے ہیں، امورِ آخرت کے ساتھ ان کی مشابہت و مناسبت آپ کو معلوم ہوگئی اور جنت و دوزخ کے حالات پر یہ چیزیں ایک مضبوط دلیل کے طور پر آپ نے سمجھ لی ہیں تو اب ان لوگوں کا اعتراض و انکار محض الفاظ کا گورکھ دھندہ ہے (حقیقت پر مبنی کوئی اعتراض ان کے پاس نہیں ہے لہٰذا) آپ ان سے تنگدل نہ ہوں اور اپنا کام نصیحت کا کرتے رہیے۔

لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ۝

تو نہیں اُن پر داروغہ

آپ ان کے اتالیق و داروغہ نہیں ہیں کہ سیدھی راہ سے ان کو ہٹنے ہی نہ دیں اور زبردستی ان کے دلوں میں حق ڈال دیں، اس لئے کہ یہ کام تو مقلب القلوب کا ہے کسی بشر کے بس کا کام نہیں ہے۔

إِلَّا مَنْ تَوَلّٰى وَكَفَرَ ۝

مگر جس نے منہ موڑا اور منکر ہو گیا

یعنی سب کو بار بار نصیحت کیجئے ہاں سوائے اس آدمی کے جس نے آپ کی نصیحت سننے سے منہ موڑ لیا ہے، کفر پر ہی پختہ ہو گیا ہے اور آپ کی رسالت کا انکار کر لیا ہے اس کو بار بار نصیحت کرنا آپ پر فرض نہیں ہے، اس تک اللہ کے احکام کا ایک مرتبہ پہنچا دینا، اور اللہ کے عذاب سے ڈرانا ضروری تھا سو وہ آپ

کر چکے ہیں اب اس کا معاملہ اور اللہ کا معاملہ ہے۔

فَيُعَذِّبُهُ اللّٰهُ الْعَذَابَ الْاَكْبَرَ ○

تو عذاب کرے گا اُس پر اللہ وہ بڑا عذاب

یعنی دوسرے دوزخیوں سے بڑا عذاب اسکو دیا جائے گا، جنہوں نے کفر نہیں کیا انکو ہمیشہ کا عذاب نہ ہوگا، چاہے انہوں نے کبیرہ گناہ کئے ہوں اور بغیر توبہ کے مر گئے ہوں وہ ہمیشہ کے عذاب سے محفوظ ہوں گے۔

اور اگر یہ عناد کرنے والے کفار اللہ کے عذاب دینے میں تردد کریں کہ حواس سے وہ معلوم نہیں ہوتا انسان کی عقل بھی اس کے ادراک سے قاصر ہے، وہ عذاب کی صرف اسی صورت سے آگاہ ہیں جو مار دھاڑ کی شکل میں انسانوں میں معروف ہے تو ان کا یہ تردد بے جا ہے کیونکہ:

اِنَّ اِلَيْنَآ اِيَابَهُمْ ○

بیشک ہمارے پاس ہے اُن کو پھر آنا

مرنے کے بعد ہر آدمی کی روح حواس کی پہنچ سے باہر ہو جاتی ہے (کوئی آدمی حواس کے ذریعہ معلوم نہیں کر سکتا کہ روح کہاں گئی ہے) اور وہ عالم غیب میں پہنچ جاتی ہے پس لازماً سب نے ایک ایسے عالم کی طرف جانا ہے کہ جس کا مالک اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں ہے۔

ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ ○

پھر بیشک ہمارا ذمہ ہے اُن سے حساب لینا

ان کے چھوٹے بڑے گناہوں اور کفر و عناد کا حساب ہم لیں گے اور جزا و سزا دیں گے، پھر جو کفر و انکار میں سخت ہے اس کو عذاب و تکلیف بھی شدید ہوگی۔ والعیاذ باللہ

"اِنَّ اِلَيْنَآ اِيَابَهُمْ" میں برزخ کے حالات کی طرف اشارہ ہے جو موت کے بعد فوراً سامنے آنے والا عالم ہے، اور "ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ" سے قیامت کے دن کے معاملے کی طرف اشارہ ہے جو موت کے بعد ایک طویل مدت کے بعد پیش آئے گا اسی لئے "ثُمَّ" اس کے شروع میں لائے جو تراخی اور مہلت پر دلالت کرتا ہے۔

الحمدللہ تم تفسیر الغاشیہ

مقدمہ سورۃ الفجر

یہ سورت مکی ہے، اس میں تیس (۳۰) آیات، ایک سو سینتیس (۱۳۷) کلمات اور پانچ سو ستانوے (۵۹۷) حروف ہیں۔

سورۂ غاشیہ کے ساتھ ربط کی وجوہ

(۱) سورۂ غاشیہ میں قیامت، جنت، دوزخ اور ثواب وعذاب کا ذکر تھا، یہ بھی ذکر ہوا کہ انسان دو قسموں میں بٹ جائیں گے، جنتی جن کے چہرے پر بھلائی ظاہر ہوگی، دوسرے جہنمی جن کے چہروں پر برائی کے آثار ظاہر ہوں گے، اِس سورت میں بھی اس مضمون کا ذکر ہے۔

(۲) سورۂ غاشیہ میں بھلائی والوں کے حق میں فرمایا "لسعیھا راضیۃ" اس سورت میں یہی بات یوں ارشاد فرمائی "راضیۃ مرضیۃ"

(۳) اُس سورت میں کافروں کے بارے میں فرمایا "فیعذبہ اللّٰہ العذاب الاکبر" اِس سورت میں یہی بات یوں فرمائیں "فیومئذ لایعذب عذابہ احد" یہ دونوں مضمون قریب قریب ہیں۔

شانِ نزول، ملحدین کے شبہہ کا رد

اس سورت کا شانِ نزول ایک شبہے کا جواب ہے جو اکثر ملحدین وزندیق لوگ کیا کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ انبیاء وواعظ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ اس دنیا کے بعد ایک اور عالم ہوگا جسے عالمِ حشر ونشر کہتے ہیں، وہاں نیکی اور برائی کا بدلہ ملے گا، اللہ تعالیٰ اچھائی کا بدلہ اچھائی اور برائی کی سزا دے گا۔ یہ محض بے اصل باتیں ہیں ان کی کچھ حقیقت نہیں، کیونکہ اگر واقعی اللہ تعالیٰ طاعات ونیکیوں سے خوش ہوتا اور گناہوں سے ناراض ہوتا، تو دنیا میں ہی نیکوکاروں کو نعمتوں سے کیوں نہ نوازتا، اور بدکاروں کو عذاب کیوں نہ دیتا اسے کیا مجبوری ہے کہ جزا وسزا کے لئے قیامت کا انتظار کر رہا ہے، یا تو اسے لوگوں کے نیک اور برے کاموں کی سرے سے خبر ہی نہیں ہے، یا پھر وہ اِس وقت بدلہ دینے کی طاقت وقدرت نہیں رکھتا، اور یہ دونوں باتیں اس کے حق میں تصور بھی نہیں کی جاسکتیں، لہٰذا حقیقت یہی معلوم ہوتی ہے

کہ اچھے یا بُرے اعمال کا بدلہ دینا اللہ تعالیٰ کو منظور ہی نہیں، اس کو اس سے کوئی سروکار نہیں ہے، وہ جو کچھ عطا کرتا ہے یا چھین لیتا ہے وہ اسی دنیا میں ہی ہے اور وہ بغیر کسی غرض یا وجہ کے محض بے نیازی اور بے پرواہی سے کسی کو عزت و دولت سے سرفراز کر دیتا ہے، اور کسی کو مشقت و ذلت سے دوچار کر دیتا ہے۔

جواب

جواب اس شبہے کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کمالِ علم اور کمالِ قدرت کے ساتھ ساتھ حکیم مطلق بھی ہے، اور اس کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کے عمل کی جزا و سزا دینے کے لئے قیامت کا انتظار کیا جائے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ہر آدمی کی تین حالتیں ہیں۔

(۱) پہلا حال اس کا دنیوی زندگی کا ہے یہاں وہ مختلف ضرورتوں اور حاجتوں میں گرفتار ہے، بہت سارے تعلقات مخلوق کے ساتھ رکھتا ہے، رشتہ ناطہ، دوست احباب، اور پڑوسیوں کے حقوق ہیں، اس کے ساتھ طاعات کا بھی مکلف ہے اور آخرت کی پونجی جمع کرنے میں بھی لگا ہوا ہے۔

(۲) دوسرا حال انسان کا برزخ کا ہے، کہ مرنے کے بعد انسان وہاں رہتا ہے، خود تو اگرچہ مشاغلِ دنیویہ سے فارغ ہو چکا مگر اس کے متعلقین دوست احباب، شاگرد و مریدین اس کے کہنے سے یا خود ہی اس کے ایصالِ ثواب کے لئے کچھ اعمال کرتے ہیں جن کا ثواب اس کو پہنچتا ہے اور اس کے اعمال نامے میں لکھا جاتا ہے، اس طرح کسی درجے میں گویا وہ ابھی تک دار العمل میں ہے۔

نیز برزخ میں ان تمام حقداروں کا جمع ہونا جن کے ساتھ دنیا میں اس کا اچھائی یا برائی کا معاملہ رہا یہ بھی ممکن نہیں کیونکہ ہر شخص کی موت اپنے مقررہ وقت پر ہے، اور معاملات میں فیصلہ کرنا بغیر حقدار کی موجودگی کے خلاف عدل و انصاف ہے۔

(۳) تیسرا حال آخرت کا ہے، کہ اب کسی طرح کا کوئی عمل و شغل وہاں نہ ہوگا، دوسروں نے اس کے واسطے جو کچھ کیا وہ بھی سب اس تک پہنچ چکا، اب آئندہ کسی اور چیز کے آنے کی اُمید ختم ہو چکی ہے، اور اس کے تمام بنی نوع تابعدار و آشنا بھی سب وہاں موجود ہوں گے۔

لہٰذا حکمت ہرگز اس بات کا تقاضا نہیں کرتی کہ اس کو دنیا میں ہی سزا دی جائے اس لئے کہ وہ ابھی کام میں مشغول ہے اور اس کی عمر کی کل مدت جو اس کی پونجی کے قائم مقام ہے ابھی تک پوری اُس کے

ہاتھ میں نہیں آئی اور اپنی گذری ہوئی عمر کے جمع خرچ کو برابر نہیں کیا، اگر اس کو اس حالت میں جزاء و سزا میں گرفتار کریں تو وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ ابھی تو مجھے موقعہ دینا چاہئے اس لئے کہ ابھی تو میری عمر باقی ہے جو کچھ کوتاہیاں مجھ سے آج تک سرزد ہوئیں ہیں آخر میں میں ان کی کمی پوری کرلوں گا۔

یہ طریقہ تو تاجروں میں بھی جاری ہے کہ جب وہ اپنے کسی گھومنے والے نمائندے کے ہاتھ سامانِ تجارت دیتے ہیں تو اس کو اس کی رائے کے مطابق لین دین کرنے کا موقع دیتے ہیں، اور اگر کبھی ایک جگہ اس کو گھاٹا ہو جائے تو فوراً گرفتار نہیں کرتے کہ دوسرے معاملے میں اس کمی کو پورا کرلے گا، (لہٰذا دنیا میں ہی اعمال کی جزاء حکمت کے خلاف ہے)

اسی طرح عالم برزخ میں بھی مکمل جزاوسزا حکمت کے خلاف ہے اس لئے کہ اس کے اہل تعلق کے باقی رہنے کی وجہ سے اس کے اعمال کا اس تک پہنچنے کا سلسلہ جاری ہے، گویا اس کی زندگی کا گوشوارہ ابھی مکمل نہیں ہوا جمع خرچ باقی ہے، دوسرے اس سے حق لینے والے یا دینے والے بھی ابھی سب جمع نہیں ہوئے تاکہ معلوم ہو سکے کہ اس پر کس کا حق ہے اور کس پر اس کا حق ہے، کون معاف کرتا ہے اور کون لیتا ہے یہ سب باتیں ابھی ادھوری ہیں، لہٰذا لامحالہ جزاء وسزا کے لئے آخرت کا دن مقرر ہوا، اس وقت کے آنے تک اللہ تعالیٰ نے بندوں کو مہلت دے رکھی ہے وہ ان کے اچھے بُرے اعمال کو دیکھتا ہے، سو یہ ہرگز غفلت نہیں، عین حکمت ہے۔ اسی مضمون کو "ان ربک لبالمرصاد" میں بیان فرمایا ہے۔

وجہ تسمیہ

اس سورت کا نام سورۃ الفجر اس لئے رکھا ہے کہ اس کے شروع میں فجر کی قسم کھائی ہے، اور فجر قیامت سے بہت مشابہت رکھتی ہے کہ قیامت کے انتظار کی طرح لوگ رات بھر فجر کا بھی انتظار کرتے ہیں، جب صبح ہوتی ہے تو نئی چہل پہل شروع ہوتی ہے گویا مردے زندہ ہو گئے اور زندگی حرکت میں آجاتی ہے، بازار اور راستے آباد ہو جاتے ہیں۔

جب ان قسموں میں کاموں کے انجام پانے کے انتظار کا بیان ہے جیسا کہ انسان کی عادت ہے اور فجر اس بات کو ثابت کرنے کی اوّل دلیل ہے اس لئے اس سورت کا نام اسی سے موسوم کیا ہے۔

تمت المقدمة والحمدلله

تفسیر سورۃ الفجر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَالْفَجْرِ ۝

قسم ہے فجر کی

وقتِ فجر کی خاص شان اور روز جزا کے ساتھ اس کی مشابہت

فجر کا وقت ایسا ہے کہ اکثر لوگ اپنے کاموں کی انجام دہی کے لئے اس کا انتظار کرتے ہیں، باوجود اس کے کہ ضرورت ان کی فوری ہوتی ہے مگر فجر تک تاخیر کرتے ہیں، انسانوں تک ہی یہ کیا موقوف ہے، پرندے بھوکے پیٹ اپنے گھونسلوں میں رزق کی تلاش کے لئے فجر کا انتظار کرتے ہین، جانور چرنے کے لئے، درباری دربار میں اپنی عرض پیش کرنے کے لئے، عدالت ومحکمہ کے لوگ جھگڑے نمٹانے کے لئے، اہلِ صنعت وحرفت اپنے کاموں کے لئے، دکاندار وتاجر تجارت کے لئے، کسان ہل جوتنے کے لئے، مسافر چلنے کے لئے اسی کے انتظار میں ہوتے اور وہ سب کام جو اُجالے اور روشنی سے متعلق ہیں وہ سب فجر پر ہی موقوف ہوتے ہیں (تو انتظار کرنا دنیا میں بھی جاری ہے اور انسان اس کا عادی ہے لہٰذا روزِ جزا کے لئے اگر قیامت کا انتظار کیا جائے تو تعجب کیوں ہو)

اور بہت سی فجریں مزید خصوصیات رکھتی ہیں کہ لوگ ان کی انتظار میں اوقات کاٹتے ہیں، جیسے عرفے کی فجر، یوم نحر کی فجر ہے کہ حج کرنے والے لوگ سارا سال اس کی آرزو میں گذارتے ہیں، پھر مہینوں اور برسوں کی مسافت طے کرکے اس دن کے لئے اس متبرک مقام تک پہنچتے ہیں۔

اور فجر کی نماز بھی اسی وقت ہے، وہ فرشتے جو بندوں کی حفاظت ونگرانی کے لئے مقرر ہیں رات و دن دونوں وقتوں کے فرشتے اس وقت میں اکٹھے ہوجاتے ہیں، وہ بھی اس وقت کی نماز کا انتظار کرتے ہیں، اسی لئے حدیث میں آتا ہے:"من صلی صلوٰۃ الفجر فھو فی ذمہ اللہ تعالیٰ" جس نے فجر کی نماز پڑھی وہ اللہ کی حفاظت میں داخل ہوگیا۔

اور سورۂ اسراء میں ارشاد ہے:"ان قراٰن الفجر کان مشھودا" بیشک فجر کی قراءت میں

فرشتے حاضر ہوتے ہیں۔

حدیث میں تفصیل اس طرح فرمائی ہے کہ فجر کی نماز کے وقت رات و دن کے فرشتے حاضر ہوتے ہیں، اوران کی حاضری وموجودگی کی وجہ سے انوار وبرکات میں زیادتی ہوجاتی ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ مخلوق کو اپنے کاروبار زندگی کے لئے فجر کا جتنا انتظار ہوتا ہے وہ ظاہر ہے، تکلیف و بیماری کا شکار انسان ساری رات اس اُمید پر دکھ کے ساتھ گذار دیتا ہے کہ صبح ہوگی تو طبیب وڈاکٹر کو دکھاؤں گا، اور علاج معالجہ کراؤں گا، فقیر ومساکین اس اُمید پر ساری رات بھوکے پیٹ گذار لیتا ہے کہ صبح کو امیروں کے دروازوں پر جاؤں گا کچھ مانگ کر لاؤں گا اور اپنا اور بچوں کا گذارہ ہوسکے گا، اسی طرح سارے انسان اپنی حاجتوں اور ضرورتوں کو صبح نکلنے پر موقوف رکھتے ہیں۔

الغرض جب انسانوں کی عادت یہ معلوم ہوئی کہ وہ کاموں میں تاخیر اوران کے لئے ایک خاص وقت کا انتظار کرتے ہیں جس وقت کو اللہ نے اپنی حکمت سے اسی کام کے لئے مقرر کردیا ہے، حالآنکہ ان کو کام کی فوری ضرورت اوراس کے کرنے کی قدرت بھی ہوتی ہے تو اسی پر جزا وسزا کو قیامت تک مؤخر کرنے، اوراس کے انتظار میں چھوڑے رکھنے کو بھی قیاس کرلینا چاہئے (کہ یہ معاملہ بھی اسی طرح مؤخر ہے اس کا وقتِ مقرر قیامت ہے اس تاخیر میں تعجب کیوں ہو)

وَلَيَالٍ عَشْرٍ ۝

اور دس راتوں کی

یعنی ان دس راتوں کی قسم کھاتا ہوں جو بہت عظمت والی اور متبرک ہیں جن کا سال بھر لوگ انتظار کرتے اوراپنے کام کو ان کے آنے تک موقوف رکھتے ہیں۔

دس مقدس راتیں کون سی ہیں

دس راتیں تین قسم پر ہیں۔ اوّل:۔ ذوالحجہ کی دس راتیں ہیں یعنی شروع کی دس راتیں، ان دس راتوں میں حاجی لوگ اطراف عالم سے خانہ کعبہ اوراس کے اردگرد جمع ہوتے ہیں اور مناسک حج ادا کرتے ہیں۔ پہلی شب کو ان کے جمع ہونے کی ابتداء ہوتی ہے اور دسویں کو انتہا ہوجاتی ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ کوئی دن نیک عمل کے لئے افضل و بہتر ذوالحجہ کے دس دنوں کے مقابلے میں نہیں ہے کہ ان میں ایک دن کا روزہ سال بھر کے روزوں کے برابر اور ان کی ایک رات کی عبادت شب قدر کی عبادت سے دس گنا زیادہ ثواب رکھتی ہے۔

دوسری قسم دس متبرک راتوں کی رمضان المبارک کا آخری عشرہ ہے۔ عبادت گذار لوگ ان آخری دس دنوں کے مسنون اعتکاف وعبادات اور شب قدر کی برکات کے حصول کے لئے پورا سال انتظار کرتے ہیں۔

حدیث میں آتا ہے کہ جب آخری عشرہ داخل ہوتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم گھر چھوڑ کر مسجد میں اعتکاف بیٹھ جاتے اور عبادت کے لئے کمر کس لیتے۔ گھر والوں کو شب بیداری میں شریک کرتے اور انتہائی درجے کی محنت وکوشش عبادت میں کرتے۔

تیسری قسم دس متبرک راتوں کی محرم الحرام کا پہلا عشرہ ہے، یہی عشرہ شہدائے کربلا کی مصیبت و غربت کا ہے، انہوں نے اللہ کے راستے میں جو رنج وصبر اٹھایا اس کا ثواب ان کی مقدس ارواح پر ان دنوں میں اترتا ہے، اور بدعتی لوگ جہالت کی وجہ سے ان دنوں غم والم کی رسومات جیسے سینہ کوبی، کتاب خوانی، تصویر سازی، تازیہ داری کرنے کے لئے پورا سال انتظار کرتے ہیں۔

بعض مفسرین نے کہا کہ یہ دس راتیں پورے سال میں متفرق ہیں، پانچ تو رمضان کے آخری عشرہ کی طاق راتیں ہیں کہ لیلۃ القدر کا گمان ان میں زیادہ ہے، اور باقی پانچ یہ ہیں عید الفطر کی رات، عید الاضحیٰ کی رات، معراج کی رات یعنی ستائیسویں رجب، اور شب براءت یعنی پندرہویں شعبان کی رات۔ واللہ اعلم

”لیال عشر“ کو نکرہ ذکر کرنے کی وجہ

اس سورت میں باقی تمام قسموں کو معرف بالام ذکر فرمایا ہے صرف ”لیال عشر“ کو نکرہ ذکر فرمایا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان دس راتوں کی تعظیم کا سبب مخفی تھا اس لئے ان کو نکرہ لائے تاکہ تنکیر ان کی تعظیم پر دلالت کرے، بخلاف دوسری قَسموں کے، کہ ان کی وجہ عظمت ظاہر ہے، اور دوسرے یہ بھی ہے کہ ”لیال عشر“ میں چار طرح کی راتوں کا احتمال ہے جیسا کہ تفصیل ذکر ہوئی تو ابہام وشیوع پیدا کرنے کے لئے نکرہ لائے تاکہ تمام احتمالات کی گنجائش رہے۔

وَّالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ ۝

اور جفت اور طاق کی

جفت وطاق عدد تمام اعداد کو شامل ہے اس لئے کہ کوئی عدد بھی ان دوقسموں سے باہر نہیں ہے، اور تمام معدودات بلکہ تمام موجودات کو بھی جفت وطاق شامل ہے۔

جفت وطاق عدد کی وسعت واہمیت

جس طرح کاموں کی انجام دہی کے لئے وقت کا انتظار کرنا انسان کی جبلت وفطرت میں داخل ہے اسی طرح اپنے کاموں کے سلسلے میں جفت وطاق عدد کی رعایت کرنا انسان کی فطرت وجبلت میں داخل ہے۔ جیسے حاملہ وضعِ حمل کے لئے نو ماہ انتظار کرتی ہے یہ طاق عدد ہے، بچے کو دودھ چھڑانے کے لئے دو سال کا انتظار کرنا چاہئے کہ یہ جفت عدد ہے، بچے کو مکتب میں بٹھانے کے لئے چار سال کا انتظار کیا جاتا ہے یہ جفت عدد ہے، نماز سکھانے کے لئے سات سال، روزے کی عادت ڈالنے کے لئے دس سال، نکاح شادی کے لئے پندرہ سال کا انتظار کرنا چاہئے، اسی طرح اپنے کام کاج میں مہینوں کی تاریخوں میں جفت یا طاق کا انتظار کرتے ہیں، شمسی سال پورا کرنے کے لئے بارہ برجوں کا، قمری سال کے پورا ہونے کے لئے بارہ مہینوں کا، ہفتہ پورا ہونے کے لئے سات دنوں کا اور مہینہ پورا ہونے کے لئے تیس یا انتیس دنوں کا انتظار کرتے ہیں۔ اسی طرح دو رکعت یا چار رکعت یا تین رکعت کی نماز میں تکبیرِ تحریمہ سے لے کر سلام تک دو یا تین یا چار رکعتوں کا انتظار ہوتا ہے۔ اسی طرح تمام امورِ شرعیہ اور عرفیہ میں جفت و طاق عدد کا انتظار کرنا معمول و مروّج ہے (لہٰذا جب دنیا میں انسانوں کو اپنے ہر کام میں انتظار کا سابقہ پڑتا ہے تو روزِ جزا کے لئے قیامت کے انتظار پر تعجب کیوں ہو)

"شفع" اور "وتر" کی تفسیر میں دوسرا قول

بعض نے کہا "شفع" یعنی جفت سے مراد مخلوق ہے اور "وتر" یعنی طاق سے مراد خالق ہے، اس لئے کہ مخلوق میں سے ہر چیز کو کسی دوسری شریک کے ساتھ جوڑ کر اور ملا کر بولتے ہیں جیسے زمین وآسمان، دن اور رات، اندھیرا اور اُجالا، نر اور مادہ وغیرہ۔ اور طاق سے مراد حق تعالیٰ کی ذات پاک ہے کہ اس کے برابر کوئی چیز نہیں وہ یکتا وتنہا ہے۔

"شفع" و "وتر" کے متعلق تیسرا قول

بعض نے کہا ''شفع'' سے مراد مخلوق کی صفات ہیں جو اپنی اضداد اور متناقض صفات سے ملی ہوئی ہیں، جیسے علم وجہل، قدرت وعجز، حیات وموت، عزت وذلت، اور قوت وضعت وغیرہ۔

اور ''وتر'' سے حق تعالیٰ کی صفات مراد ہیں جو اس طرح نہیں ہیں (گویا وہ یکتا صفات ہیں) جیسے وجود ہے بغیر عدم کے قدرت ہے عجز نہیں، علم ہے جہالت نہیں، حیات ہے موت نہیں، عزت ہے اس کے ساتھ ذلت نہیں، اور قوت ہے اس کے ساتھ ضعف نہیں ہے۔

چوتھا قول

بعض نے کہا ہے ''شفع'' سے دو رکعت والی نماز مراد ہے اور ''وتر'' سے تین رکعت والی نماز مراد ہے، یہ تفسیر حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کی ہے۔

پانچواں قول

بعض نے کہا ہے کہ ''جفت'' سے مراد جنت کے آٹھ دروازے اور درجات ہیں اور ''طاق'' سے جہنم کے سات طبقات اور دروازے مراد ہیں۔

چھٹا قول

بعض نے کہا ہے ''جفت'' سے مراد بارہ بُروج ہیں اور ''طاق'' سے مراد سات سیارے ہیں جو اِن بُروج میں پھرتے ہیں، اور ان کے چکر کی وجہ سے عالم میں طرح طرح کے تغیرات رونما ہوتے ہیں۔

ساتواں قول

بعض نے کہا ہے ''جفت'' سے مراد وہ چاند ہے جو پورے تیس دنوں کا نکلتا ہے اور ''طاق'' سے مراد وہ چاند ہے جو انتیس دنوں کا نکلتا ہے۔

آٹھواں قول

بعض نے کہا ہے کہ ''جفت'' سے مراد ہر رکعت کے دو سجدے ہیں اور ''طاق'' سے ہر رکعت کا رکوع ہے، کہ وہ ایک ہی ہوتا ہے۔

نواں قول

بعض نے کہا ہے کہ ''جفت'' سے مراد وہ بارہ چشمے ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ایک پتھر پر لاٹھی مارنے سے جاری ہو گئے تھے، اور ''طاق'' سے مراد موسیٰ علیہ السلام کے دیگر نو معجزات ہیں جو فرعون کے مقابلے میں آپ کو عطا کئے گئے تھے، جن کی طرف اس آیت میں بھی اشارہ ہے:

"ولقد اٰتینا موسیٰ تسع اٰیات بیّنات"

دسواں قول

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یوں روایت کرتے ہیں کہ ''جفت'' سے مراد بقرہ عید کا دن ہے جو دسویں ذی الحجہ کو ہوتا ہے اور ''طاق'' سے مراد عرفہ کا دن ہے جو نویں ذی الحجہ کو ہوتا ہے، اور یہ تفسیر "لیالِ عشر" کے ساتھ بہت مناسبت رکھتی ہے۔

وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ ○

اور اس رات کی جب رات کو چلی

یہ وقت بھی ایسا ہے کہ لوگ اس کا انتظار کرتے ہیں، جو اپنے کاموں کو پوشیدہ طریقے سے کرنا چاہتے ہیں، خواہ وہ پردے میں کئے جانے والے کام نیک ہوں جیسے شب بیداروں کا عبادت کرنا، اور عقدِ نکاح وغیرہ کرنا، یا وہ کام بُرے ہوں جیسے چوروں کا چوری کرنا، ناچنے والوں کا ناچنا، عیاشیاں کرنے والوں کا رنگ رلیاں منانا، جادوگروں کا جادو کرنا، شعبدہ بازوں کا شعبدہ بازیاں کرنا۔

جزا و سزا میں تاخیر حکمت کے مطابق ہے

اِن پانچ قسموں سے یہ ثابت ہوا کہ باوجود کام کی خواہش و ارادہ ہونے اور اسباب کے مہیا ہونے کے وقت کا انتظار کیا جاتا ہے اور از روئے حکمت یہ بات انسان کی جبلت کے موافق ہے کہ وہ ہر نیک یا بدکام کے لئے وقت کی رعایت کرتا ہے، سو کوئی صاحب عقل تھوڑا سا غور و فکر کرے تو اس کو جزا و سزا کے قیامت تک مؤخر کرنے کی حکمتیں بھی معلوم ہو جائیں گی، کہ وہ کیا کیا ہیں۔ اسی لئے ارشاد فرمایا

هَلْ فِیْ ذٰلِکَ قَسَمٌ لِّذِیْ حِجْرٍ ○

ہے اُن چیزوں کی قسم پوری عقلمندوں کے واسطے

یعنی کیا ان قَسموں میں سے کوئی قَسم کسی عقل والے کے لئے کافی ہے گویا ان میں سے ہر قسم یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر نیک و بد کو جزا وسزا دینے کے لئے قیامت کے منتظر ہیں۔

اور اگر کسی کم فہم کو یہ شبہہ پیدا ہو کہ اس دن اگلے پچھلے سب جمع ہوں گے ایک ہی دن میں اس جمِ غفیر میں سے ہر ہر شخص کو جزا وسزا دینا بڑا مشکل کام ہے، اس لئے کہ حشر بپا کئے ہوئے یہ مخلوقِ خدا اگر بگڑ جائے اور مقابلے پر اُتر آئے تو اس وقت ان سب کو سزا دینا ممکن نہ ہو سکے گا، اسی وجہ سے بادشاہوں کی یہ حکمتِ عملی رہی ہے کہ کسی بڑے جمِ غفیر کو اجتماعی حالت میں تنبیہ وسزا نہیں دیتے، پہلے حیلے و تدبیر سے ان کی جمعیت کو منتشر کرتے ہیں جب ان کی قوت ٹوٹ جاتی ہے تب اپنی مرضی سے انکو ایک ایک کر کے سزائیں دیتے ہیں، لہٰذا جزا وسزا کا معاملہ بھی اگر ہر ایک کے ساتھ جدا جدا ہوتا تو یہ خدشہ باقی نہ رہتا۔

سو حق تعالیٰ شانہ نے ان قسموں کے درمیان اور جس مضمون پر یہ قسمیں کھائی گئی ہیں یعنی :

''ان ربک لبالمرصاد'' اس کے درمیان جملہ معترضہ کے طور پر تین قصے جزا وسزا کے ایسے بیان کئے ہیں جو اسی دنیا میں واقع ہو چکے ہیں (جن سے کم فہموں کے شبہے کا ازالہ ہو جاتا ہے)

ان واقعات میں بتایا ہے کہ اللہ نے انتہائی طاقت وقوت والے لوگوں کو بہت معمولی اسباب سے ہلاک کر کے نیست و نابود کر دیا، لہٰذا اس کی طاقت وقدرت کے لئے بڑی سے بڑی اور زور آور مخلوق کو سزا دینا کچھ مشکل کام نہیں ہے، اور نہ ہی اللہ کی طاقت وقدرت کو طاقت وقوت والے بادشاہوں کی طاقت پر قیاس کرنا چاہئے کہ ان کو اس سے کوئی نسبت نہیں ہے۔

اور تین قصوں کو یہاں ذکر کرنے میں حکمت یہ ہے کہ ایک بار اگر کوئی کام کسی سے خلاف قیاس رونما ہو جائے تو لوگ اس کو محض اتفاق سمجھتے ہیں، اور جب دوبار، تین بار وہی کام اس سے سرزد ہو تو یہ باور کر لیا جاتا ہے کہ یہ کام اس کے لئے نہایت آسان وسہل ہے۔

''یسر'' کی لغوی تحقیق، اخفش کا قول اور مصنفؒ کا نقد

(وَالَّیْلِ اِذَا یَسْرِ) یَسْرِ اصل میں ''یَسْرِیْ'' تھا یاء کو حذف کر دیا اور راء پر کسرہ اس بات کی

علامت کے طور پر باقی رہنے دیا کہ یہاں سے یاء گری ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ایک آدمی نے اخفش نحوی سے ''یسر'' کی یاء گرنے کی وجہ پوچھی تو اخفش نے اس سے کہا اگر ایک سال تک میری خدمت کرو تو میں تمہیں اس کی وجہ بتاؤں گا، وہ آدمی ایک سال تک اخفش کی خدمت کرتا رہا، سال بعد اخفش نے یوں وجہ بیان کی کہ ''یسری'' ''سری'' سے مشتق ہے اور ''سری'' کے معنی ہے رات کو چلنا، اور یہ رات کی صفت نہیں چلنے والوں کی صفت ہے مگر مجازاً اس کو (لیل) رات کی صفت بنا دیا (یعنی والیل اذا یسر میں یسر کی نسبت لیل کی طرف ہے یہی معنی ہے صفت بنانے کا) اور کلام عرب میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ فعل کی اسناد مجازاً ظرف زمان یا ظرف مکان کی طرف کر دیتے ہیں چنانچہ کہا جاتا ہے ''لیلہ قائم'' نهارہ صائم'' (حالانکہ حقیقت میں لیل قائم نہیں ہوتی شخص رات کے وقت میں کھڑا ہوتا ہے تو مجازاً فعلِ قیام کی نسبت لیل جو اس کا ظرف ہے اس کی طرف کر دی اسی طرح نہار قائم ہے میں مجاز ہے)

تو جب ''یسری'' کے معنی میں تغیر واقع ہوا تو اس کے لفظ میں بھی تغیر کر دیا (یاء گرا دی) تاکہ لفظ معنی کے مطابق ہو جائے۔

یہ وہ بات ہے جو اخفش سے منقول ہے، لیکن اس کا درست ماننا دو مقدموں پر موقوف ہے، ایک تو یہ کہ ''یسری'' ''سری'' سے مشتق ہے، حالانکہ یہ ضروری نہیں بلکہ ظاہر تو یہ ہے کہ یہ مشتق ہے ''سرایة'' سے تاکہ ان آیات سے اس آیت کی مطابقت ہو جائے ''والیل إذا سجی'' والیل إذا یغشی'' (کہ ان آیات میں سجاوۃ اور غشاوۃ حقیقت میں رات کی صفات ہیں یہاں بھی ایسا معنی کرنا چاہئے سو وہ ''سرایت'' ہے کہ یہ حقیقت میں رات کی ہی صفت ہے کسی اور کی نہیں)

دوسرا مقدمہ یہ کہ ''یسری'' ''سری'' سے مشتق ماننے کی صورت میں یہ رات کے وقت چلنے والوں کی صفت واقع ہوگی رات کی صفت نہیں ہو سکتی یہ بھی تسلیم نہیں ہے اس لئے کہ ایسا ہونا لازمی نہیں ہے بلکہ ظاہر یہ ہے کہ ''یسری'' سے شب روی کے معنی کی تجرید کر کے مطلق چلنا مراد لیا جائے (یعنی یسر کا معنی ''رات کے وقت چلنا'' نہ کیا جائے مطلق ''چلنا'' کیا جائے یعنی یوں معنی کیا جائے قسم ہے رات کی جب وہ چلتی ہے) چنانچہ ''والیل اذا ادبر'' میں اسی طرح ہے۔

تب یوں کہا جا سکتا ہے کہ ''رات جب چلتی ہے'' یہ استعارہ ہے رات کے گذر جانے سے اور چلے

جانے سے (یعنی چلنے سے رات کا حسی پاؤں پر چلنا مراد نہیں اس کا گذر جانا مراد ہے) اس لئے کہ رات کا چلنا اور رات کے وقت میں چلنا دونوں باتیں ایک دوسرے کے مناسب ہیں۔

اور اگر اچھی طرح غور وفکر کیجئے تو شب روی یعنی رات کا چلنا خود رات کی صفت ہو سکتی ہے، اس لئے کہ حقیقت میں رات نام ہے زمین کے مخروطی سائے کا جو آفتاب کے مخالف سمت حرکت کرتا ہے، اور بسبب اس مخروط کے قاعدے کے منطبق ہو جانے کے آفاقِ شب میں سے کسی اُفق پر وہ اُفق آ جاتی ہے اور وہ مخروط ہمیشہ حرکت میں ہے لیکن ہر اُفق کی بنسبت اس کی حرکت رات کو اس اُفق کے ساتھ ہوتی ہے (۱)

اولیٰ اور بہتر یہی ہے کہ یہ کہا جائے کہ "یسر" کی یاء دوسری آیات کے ساتھ مشاکلت ومشابہت کی رعایت کی وجہ سے گر گئی ہے اور کوئی وجہ نہیں ہے۔

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ

تو نے نہ دیکھا کیسا کیا تیرے رب نے

یہاں پر دیکھنا جاننے کے معنی میں ہے، (یعنی کیا آپ کو معلوم نہیں) اس لئے کہ یہ قصہ اس قدر معروف ومشہور تھا کہ گویا اس کا جاننا دیکھنا ہے۔

لفظ "ربّ" اللہ تعالیٰ کے نام کی جگہ اس سورہ میں اور دیگر سورتوں میں بہت مرتبہ استعمال ہوا ہے، اس لفظ کو اختیار کرنے کی وجہ یہ ہے کہ (ربک میں) ربوبیت کو جلیل القدر پیغمبر کی طرف مضاف کر کے یہ بتایا کہ جو ربوبیت آپ کی طرف مضاف ہے وہ جامع ہے اور ربوبیتِ جامع بلاشبہ عدل وانصاف کے قیام کا تقاضا کرتی ہے، اور عدل وانصاف تب ہی قائم ہوگا کہ ظالموں اور سرکشوں کو ہلاک وبرباد کیا جائے۔

بِعَادٍ ○ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ○

عاد کے ساتھ، وہ جو آرام میں تھی بڑی ستونوں والی

ان لوگوں کا تعلق قوم عاد سے تھا، ارم بستی کے رہنے والے تھے اور وہ بستی بڑے بڑے ستونوں والی

(۱) حاصل کلام یہ ہے کہ رات دراصل زمین کے سائے کا نام ہے، زمین کے چوبیس گھنٹے کے چکر کے دوران اس کا جو حصہ سورج سے اوجھل اور مخالف سمت میں ہوتا ہے وہاں رات ہوتی ہے اور زمین کی حرکت کی وجہ سے وہ سایہ بھی حرکت میں رہتا ہے لہٰذا رات کا چلنا اور حرکت کرنا ثابت ہو گیا۔ واللہ اعلم۔ ۱۲ اسفیر احمد ثاقب

تھی۔ عماد جمع ہے عمد کی، جیسے جبال جمع ہے جبل کی۔

عادِ قدیمہ اور عادِ ثانیہ کے حالات

عاد کے نام سے دو قومیں گزری ہیں ایک کو عادِ اولیٰ، عادِ قدیمہ اور عادِ ارم کہتے ہیں یہ عاد بن عوض بن ارم بن سام بن نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے، ان کے دادا ارم کی طرف منسوب کر کے ان کو عادِ ارم بھی کہا جاتا ہے، اپنے شہر کا نام بھی دادا کے نام پر ارم رکھا تھا، ان کا وطن عدن کے متصل تھا۔

دوسرے عادِ ثانی یہ ایک اور آدمی تھا جو عادِ قدیمہ کی نسل سے ہی بچ گیا تھا اس نے حضر موت کے قریب احقاف کو اپنا وطن بنایا وہاں اس کی اولاد بہت پھیلی اور ترقی کی، ان کا قصہ ان کی طرف مبعوث کئے گئے پیغمبر حضرت صالح علیہ السلام کے ساتھ قرآن میں کئی جگہ مذکور ہے، لیکن عادِ اولیٰ/ قدیمہ کا قصہ صرف دو جگہ پر آیا ہے، ایک تو اسی سورت میں ہے، دوسرے سورۂ نجم کی اس آیت میں اس کی طرف اشارہ ہے "اھلک عاد الأولیٰ"

عادِ قدیمہ کا قصہ

آیت کی تفسیر کے لئے اس قصے کی جتنی ضرورت ہے اس کے مطابق یہاں ان کا قصہ نقل کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس قوم کو غیر معمولی قد و قامت اور قوت عطا فرمائی تھی ان میں ہر شخص کا قد کم از کم بارہ گز ہوتا تھا طاقت کا یہ حال تھا کہ بڑے سے بڑا پتھر جس کو کئی آدمی مل کر اُٹھا نہ سکیں اس کو ان کا ایک آدمی ایک ہاتھ سے اُٹھا کر پھینک دیتا تھا یہ لوگ طاقت و قوت کے بل بوتے پر پورے یمن پر قابض ہو گئے تھے اور دو بادشاہ خاص طور پر ان میں بہت جاہ و جلال والے ہوئے وہ دونوں بھائی تھے، ایک کا نام شدید تھا جو بڑا تھا، دوسرے کا نام شداد تھا جو اس کے بعد صاحب تخت ہوا، یہ دونوں پوری دنیا پر غالب آ گئے تھے، اور بے شمار لشکر و خزانے انہوں نے جمع کئے تھے۔

شدّاد نے اپنے بھائی شدید کے مر جانے کے بعد سلطنت کی رونق و کمال کو عروج تک پہنچایا، دنیا کے چار سو اور کچھ بادشاہ اس کے باجگذار تھے، روئے زمین پر کسی بادشاہ کی طاقت نہیں تھی کہ اس کا مقابلہ کر سکے، اس تسلط و غلبے نے اس کو اتنے غرور و تکبر میں مبتلا کر دیا کہ اس نے خدائی کا دعویٰ کر دیا۔

اس وقت کے علماء و واعظین نے جو سابقہ انبیاء کے علوم کے وارث تھے اس ملعون کو سمجھایا اور اللہ

تعالیٰ کے عذاب سے ڈرایا اور خدائی کے دعویٰ کی بجائے حق جل شانہ کی عبادت کی ترغیب دی تو وہ کہنے لگا، جو حکومت، دولت اور عزت اس کو اب حاصل ہے اس سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے سے کیا حاصل ہوگا، جو کوئی کسی کی خدمت واطاعت کرتا ہے یا تو عزت ومنصب کی ترقی کے لئے کرتا ہے یا دولت کے لئے کرتا ہے مجھے تو یہ سب کچھ حاصل ہے مجھے کیا پروا کہ میں کسی کی عبادت کروں، انہوں نے کہا یہ حکومت و دولت دنیا کی فانی ہے، اللہ کی عبادت کروگے تو ثواب میں اللہ تعالیٰ تمہیں جنت عطا فرمائیں گے جو ساری دنیا سے بہتر ہے، اس نے پوچھا جنت کیسی ہوتی ہے اس کی تعریف وخوبی بتاؤ، چنانچہ نصیحت کرنے والوں نے جنت کی وہ صفات جو انبیاء کرام کی تعلیمات کے ذریعہ ان کو معلوم تھیں اس کے سامنے بیان کیں، تو اس نے کہا مجھے اس جنت کی ضرورت نہیں ویسی جنت تو میں دنیا میں ہی بنا سکتا ہوں۔

شدّاد کی جنت

چنانچہ اس نے اپنے افسروں میں سے معتبر سو (۱۰۰) افسروں کو بلایا ہر ایک کو ایک ہزار آدمی پر مقرر کیا کہ جس طرح یہ کہیں وہ لوگ کام کریں اور تعمیر کے کام کے سلسلے میں ہر افسر کو اپنا اپنا کام سمجھا دیا، اس کے بعد پوری دنیا میں یہ حکمنامہ بھیجا کہ سونے چاندی کی کانوں سے گنگا جمنی اینٹیں بنوا کر بھیجو، اور جتنے گڑے ہوئے خزانے ہیں تلاش کر کے نکال کر بھیجو، اور کوہِ عدن کے متصل ایک مربع شہر (جنت) جو دس کوس چوڑا اور دس کوس لمبا ہو بنانے کا حکم دے دیا۔ اس کی بنیادیں اتنی گہری کھدوائیں کہ پانی کے قریب پہنچا دیں، پھر ان بنیادوں کو سنگ سلیمانی سے بھروا دیا جب بنیادیں بھر کر زمین کے برابر ہوگئیں تو ان پر سونے چاندی کی اینٹوں کی دیواریں چنی گئیں، ان دیواروں کی بلندی اس زمانے کے گز کے اعتبار سے پانچ سو گز مقرر کی گئی، جب سورج نکلتا تو اس کی چمک سے دیواروں پر نگاہ نہیں ٹھہرتی تھی۔ یہ شہر کی چار دیواری بنوائی گئی، اس کے بعد چار دیواری کے اندر ایک ہزار محل تعمیر کئے گئے، ہر محل ایک ہزار ستونوں والا تھا اور ہر ستون جواہرات سے جڑاؤ کیا ہوا تھا۔

پھر شہر کے درمیان میں ایک نہر بنائی گئی اور ہر محل میں اس نہر سے چھوٹی چھوٹی نہریں لے جائی گئیں، اور ہر محل میں حوض اور فوارے بنائے گئے، ان نہروں کی دیواریں اور فرش یاقوت، زمرد، مرجان اور نیلم سے بھر دیئے گئے، نہروں کے کناروں پر ایسے مصنوعی درخت بنائے گے جن کی جڑیں سونے کی، شاخیں اور پتے زمرد کے، اور ان کے پھل پھول موتی و یاقوت اور دوسرے جواہرات کے

بنا کر اُن سے ٹانک دیئے گئے۔

شہر کی دکانوں، اور دیواروں کو مشک وزعفران، اور عنبر وگلاب سے سہگل کیا گیا، یاقوت وجواہرات کے خوبصورت پرندے چاندی کی اینٹوں کے بنوائے گئے جن پر پہرے دار اپنی اپنی باری پر آ کر پہرے کے لئے بیٹھتے تھے۔ جب تعمیر مکمل ہوگئی تو حکم دیا کہ سارے شہر میں ریشم وزردوزی کی قالینیں بچھادی جائیں اور شہر کے تمام محلات میں سونے چاندی کے برتن چُن دیئے جائیں۔

پھر نہروں میں سے کسی کے اندر میٹھا پانی، کسی میں شراب، کسی میں دودھ اور کسی میں شہد وشربت جاری کر دیا گیا۔

بازاروں اور دکانوں کو کمخواب وزربفت کے پردوں سے آراستہ کر دیا گیا، اور ہر پیشہ وہنر والے کو حکم ہوا کہ اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہو جائیں، اور حکم دیا کہ اس شہر کے تمام باسیوں کے لئے ہر وقت ہر نوع وقسم کے پھل میوے پہنچا کریں۔

بارہ سال کی مدت میں یہ شہر جب اس سجاوٹ کے ساتھ تیار ہو گیا تو تمام امراء وارکانِ دولت کو حکم دیا کہ سب اسی میں آباد ہو جائیں پھر خود بھی اپنے لاؤلشکر کے ہمراہ انتہائی تکبر وغرور کے ساتھ اس شہر کی طرف روانہ ہوا، ان واعظ لوگوں میں سے بھی کچھ کو ساتھ لیا اور راستے میں ٹھٹھہ اور تمسخر کرتے ہوئے ان سے کہہ رہا تھا اسی جنت کے لئے تم مجھے کسی اور کے آگے جھکنے اور ذلیل ہونے کا کہہ رہے تھے، میری قدرت ودولت تم نے دیکھ لی ہے؟

جب شہر کے قریب پہنچا تو تمام شہر والے اس کے استقبال کے لئے شہر کے دروازے سے باہر آ گئے اور اس پر زر وجواہرات نچھاور کرنے لگے اسی ناز وادا میں چلتے ہوئے جب شہر کے دروازے پر پہنچا، اور اس نے ایک قدم اندر رکھا اور دوسرا ابھی باہر ہی تھا کہ آسمان سے ایسی خوفناک کڑک کی آواز آئی کہ وہ ساری مخلوق شداد سمیت شہر کے دروازے پر ہی ڈھیر ہوگئی، جس شہر کو اتنی محنت ومشقت سے تعمیر کروایا تھا اس کے دیکھنے کی حسرت دل ہی میں لے کر دنیا سے چلا گیا۔

وہ دو آدمی جن کی روح نکالتے ہوئے ملک الموت کو رحم آیا

بعض کتابوں میں نظر سے گذرا کہ اللہ تعالیٰ نے ملک الموت سے پوچھا کہ تمہیں کبھی کسی بندے کی

روح نکالتے ہوئے رحم بھی آیا ہے، تو ملک الموت نے عرض کیا دو آدمیوں کی روح قبض کرتے ہوئے مجھے رحم آیا اگر جناب باری تعالیٰ کا حکم نہ ہوتا تو میں ان کی روح قبض نہ کرتا۔ پوچھا کہ وہ کون سے دو آدمی ہیں تو ملک الموت نے عرض کیا ایک تو اس عورت کی روح قبض کرتے ہوئے ترس آیا جس کے ابھی ابھی بچہ پیدا ہوا تھا اور وہ دونوں ایک کشتی کے تختے پر رہ گئے تھے، مجھے اس عورت کی روح قبض کرتے ہوئے اس بچے پر ترس آیا کہ اس کا کیا بنے گا۔

دوسرا ایک بادشاہ تھا جس نے ایک شہر بڑی آرزوؤں کے ساتھ بنایا تھا مگر اس نے جب اس کو دیکھنے کے لئے ابھی اس کے دروازے پر ہی قدم رکھا تھا کہ اس کی روح قبض کرنے کا حکم ہوا، افسوس ہوا کہ یہ کتنی حسرتیں دل میں لئے چلا گیا۔ ملک الموت کے اس کہنے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ارشاد ہوا کہ یہ بادشاہ وہی لڑکا تھا، اس کو ہم نے بغیر ماں کے پرورش کیا، اور اس مقام ومرتبے تک پہنچایا، یہاں پہنچ کر اس نے ہماری اطاعت وفرمانبرداری سے منہ موڑا اور تکبر اختیار کیا، سو اپنے انجام تک پہنچ گیا۔

شدّاد کا پس منظر

کہتے ہیں کہ وہ کشتی کا تختہ جس پر یہ بچہ رہ گیا تھا بہتا ہوا دھوبیوں کے گاؤں کے قریب دریا کے کنارے آلگا، دھوبیوں نے اس کی ماں کا جنازہ دفن کر دیا اور بچے کو اپنے سردار کے پاس لے آئے، سردار اس بچے کے حسن وجمال کو دیکھ کر اس پر عاشق ہو گیا، اس کے اولاد بھی نہیں تھی اس لئے اس نے اس کو بیٹا بنالیا، اور اس کی پرورش کرنے لگا، ابھی سات برس کا ہی ہوا تھا کہ اسکی عقل ودانائی اور چالاکی غیر معمولی نظر آتی تھی۔

ایک دن گاؤں سے باہر بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا کہ اچانک شور ہوا کہ بادشاہ کی سواری آرہی ہے سارے لڑکے بھاگ گئے مگر یہ شوخ ایک ٹیلے پر چڑھ گیا اور بادشاہ کی سواری اور اس کے لشکر کا تماشا دیکھنے لگا یہاں تک کہ سارا لشکر گذر گیا، لشکر کے پیچھے چند پیادے جو لشکر کی گری ہوئی چیزوں کے اُٹھوانے کے کام پر ہوتے ہیں آئے، ان میں سے ایک کو وہاں سے ایک پوٹلی گری ہوئی ملی کھولی تو اس میں سرمہ دانی اور سلائی تھی، ساتھیوں سے کہا اگر تمہارا مشورہ ہو تو یہ سرمہ آنکھوں میں لگا کر دیکھوں یوں بھی میری آنکھیں خراب ہو رہی ہیں شاید اس سے کچھ فائدہ ہو جائے۔ انہوں نے کہا ایسے مناسب نہیں جب تک تجربہ نہ ہو جائے کہ مفید ہے کہ نہیں، اس آدمی نے جو دیکھا تو ٹیلے پر کھڑا یہ لڑکا نظر آیا اس کو بلایا

کہ اس پر تجربہ کر کے دیکھ لیں، لڑکے سے کہا آؤ ہم تمہیں سرمہ لگاتے ہیں، تمہاری آنکھیں خوبصورت لگیں گی۔ لڑکے نے خود ہی سرمہ دانی اور سلائی لی اور آنکھوں میں سرمہ لگایا، سرمہ لگتے ہی زمین کے اندر کے تمام خزانے اس کو نظر آنے لگے، لڑکے نے انتہائی چالاکی وہشیاری کی کہ فوراً چیخنے لگا ظالمو تم نے میری آنکھیں پھوڑ دیں، وہ پیادے سرمہ اسی کے ہاتھ میں چھوڑ کر وہاں سے بھاگ گے، وہ سرمہ لے کر اپنے منہ بولے باپ کے پاس پہنچا اور زمین کے خزانے نظر آنے کا سارا واقعہ سنایا، دھوبیوں کے سردار نے اس سے کہا یہ اپنے گدھے اور خچر رات کو کچھ مزدوروں کے ساتھ لے جایا کرو جہاں جہاں خزانے نظر آئیں کھود کر خچروں پر لاد کر لے آیا کرو، چنانچہ اس نے راتوں کو یہ سلسلہ شروع کر دیا، اور بہت سارا خزانہ جمع کر دیا، اس کے بل بوتے پر گاؤں کے لوگوں کو اپنے ساتھ ملایا اور گاؤں کے سردار کو قتل کر کے خود گاؤں کا سردار بن گیا جب اس کی خبر بڑے سرداروں اور حاکموں کو پہنچی تو انہوں نے اس کی سرکوبی کی کوشش کی مگر اس نے بھی اپنی فوج بنالی اور ان کے ساتھ مقابلہ کیا یہاں تک کہ بڑھتے بڑھتے اس نے اپنی قوت بہت بڑھادی، اور ملک کا بادشاہ جوں ہی مرا اس نے فوج کشی کر کے ملک پر قبضہ کر لیا اس طرح وہ بادشاہ بن گیا اور وہاں سے بڑھتے بڑھتے سارے بادشاہوں کو اپنا تابعدار و فرمانبردار بنالیا۔

شدّاد کی ہلاکت کے بعد اس شہر کا انجام

معتبر تفسیروں میں لکھا ہے کہ بادشاہ اور اس کے لشکر کے ہلاک ہونے کے بعد وہ شہر بھی لوگوں کی نگاہ سے اوجھل کر دیا گیا، مگر کبھی کبھی رات کے وقت عدن اور اس کے اردگرد کے لوگوں کو اس کی کچھ روشنی اور جھلک اس جگہ نظر آجاتی ہے، یہ روشنی اس شہر کی دیواروں کی ہے۔

حضرت عبداللہ بن قلابہ رضی اللہ عنہ جو صحابی ہیں اتفاق سے ادھر کو چلے گئے، اچانک آپ کا ایک اونٹ بھاگ گیا، آپ اس کو تلاش کرتے کرتے اس شہر کے پاس پہنچ گئے جب اس کے میناروں اور دیواروں پر نظر پڑی تو آپ بیہوش ہو کر گر پڑے، جب ہوش آیا تو سوچنے لگے کہ اس شہر کی صورتحال تو ویسی ہی نظر آتی ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے جنت کی بیان فرمائی ہے، میں خواب دیکھ رہا ہوں یا کیا معاملہ ہے، اسی حال میں اُٹھ کر شہر کے اندر گئے اس کے اندر محلات، اور نہریں اور درخت بھی جنت کی طرح کے دیکھے، لیکن کوئی انسان وہاں نہیں تھا، وہاں پڑے ہوئے کچھ جواہرات اُٹھائے اور

واپس چل دیئے، وہاں سے سیدھے دمشق میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس آئے ان سے اس کے سارے حالات بیان کئے، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا وہ شہر آپ نے بیداری میں دیکھا کہ خواب میں، انہوں نے بتایا بالکل بیداری میں دیکھا ہے پھر اس کی ساری نشانیاں بتائیں کہ عدن کے پہاڑ سے فلاں جانب، اتنے فاصلے پر ہے، ایک طرف فلاں درخت اور دوسری طرف ایسا کنواں ہے، اور یہ جواہرات و یاقوت نشانی کے طور پر وہاں سے اٹھالایا ہوں، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ یہ ماجرا سننے کے بعد نہایت حیران ہوئے، اور اہل علم سے معلومات کی گئیں کیا دنیا میں ایسا شہر بھی کبھی بسایا گیا ہے جس کی اینٹیں سونے چاندی کی ہوں تو علماء نے بتایا کہ ہاں قرآن میں بھی اس کا ذکر آیا ہے اس آیت میں "اِرَمَ ذات العماد" مگر اللہ تعالیٰ نے اس کو لوگوں کی نگاہوں سے چھپادیا ہے، اور علماء نے بتایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میری اُمت میں سے ایک آدمی اس میں جائے گا جو چھوٹے قد، سُرخ رنگ کا ہوگا، اس کے ابرو اور گردن پر دو تل ہوں گے وہ اپنے اونٹ کو ڈھونڈتا ہوا اس شہر میں پہنچے گا اور وہاں کے عجائبات دیکھے گا، جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے یہ ساری نشانیاں ان میں دیکھیں تو پوری پائیں فرمایا واللہ یہ وہی شخص ہے، الغرض اس شہر کی اس سے زیادہ کیا تعریف ہوسکتی ہے کہ خود رب العزت باوجود تمام معلومات کا احاطہ رکھنے کے اس شہر کے متعلق فرماتے ہیں

الَّتِیۡ لَمۡ یُخۡلَقۡ مِثۡلُهَا فِی الۡبِلَادِ ۝

کہ بنی نہیں ویسی سارے شہروں میں

وَثَمُوۡدَ الَّذِیۡنَ جَابُوا الصَّخۡرَ بِالۡوَادِ ۝

اور ثمود کے ساتھ جنہوں نے تراشا پتھروں کو وادی میں

یعنی کیا آپ کو معلوم نہیں آپ کے رب نے قوم ثمود کے ساتھ کیا کیا جو وادی القریٰ میں بڑے بڑے پتھر تراشتے تھے۔

ثمود کے لوگ قوم عاد کے چچازاد تھے، قومِ عاد کے ہلاک ہوجانے کے بعد یہ لوگ حجاز اور شام کے درمیانی علاقے میں آباد ہوگئے تھے حجر سے لے کر وادی القریٰ تک ایک ہزار بستیاں ان کی تھیں۔ یہ

بستیاں بڑے بڑے محلات پر مشتمل تھیں جن کی تعمیر میں بڑے بڑے پتھر تراشے گئے تھے، دروازے اور کھڑکیاں تراشے ہوئے پتھروں کی تھیں، ان پتھروں پر طرح طرح کے نقش ونگار تراش کر بنائے تھے۔ ہر طرح کی عیش وعشرت کے ساتھ بت پرستی میں مبتلاء تھے، یہاں تک کہ حضرت صالح علیہ السلام کو ان کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا جن کا قصہ ''سورۂ والشمس'' کی تفسیر میں آرہا ہے۔

وادی القریٰ کا محل وقوع

وادی القریٰ ایک شہر کا نام ہے جس کا طول وعرض مکہ معظمہ کے برابر ہے، اس میں کھجوروں کے باغات اور چشمے کثرت سے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خیبر فتح کر لینے کے بعد وادی القریٰ پر اس کے تمام متعلقات کے ساتھ قابض ہو گئے تھے۔

اگرچہ قوم ثمود کی بہت سی بستیاں، جائدادیں اور باغات حجر اور اس کے گردونواح میں بھی پھیلی ہوئی تھیں لیکن آیت میں خاص طور پر ''وادی القریٰ'' کا اس لئے ذکر فرمایا کہ یہ حجاز کی سرحد کے ساتھ متصل علاقہ تھا اور ابھی تک آباد تھا، جبکہ حجر شام کے علاقے کے ساتھ لگتا ہے، وہ حجاز سے دور بھی ہے اور حجاز کے لوگ اس کے حالات سے صحیح طور پر واقف بھی نہیں ہیں اس کے ساتھ ویران وغیر آباد پڑا ہوا تھا۔

حجر کا طولِ نجومی ستر (۷۰) درجے تیس (۳۰) دقیقے ہے، اور ''وادی القریٰ'' کا طول بہتر (۷۲) درجے اور طول حجر کے برابر ہی ہے۔

وَفِرْعَوْنَ ذِى الْاَوْتَادِ ۝

اور فرعون کے ساتھ وہ میخوں والا

یعنی کیا کیا اس فرعون کے ساتھ جو لوگوں کو میخیں ٹھونک کر مارا کرتا تھا، چنانچہ کئی مسلمانوں کو جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے تھے چومیخا کر کے اس نے مارا۔

جزئیل نامی ایک شخص اس کے خزانے کے نگران تھے وہ خفیہ طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئے جب فرعون کو اس کی خبر ہوئی تو ان کو اسی طرح ہاتھ پاؤں میں میخیں گاڑ کر شہید کیا، جزئیل کی بیوی جو فرعون کی اہلیہ کی خادمہ تھیں وہ بھی مسلمان ہوگئیں تھیں ان کو بھی اسی طرح شہید کیا۔

خود فرعون کی بیوی حضرت آسیہ رضی اللہ عنہا بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئیں تھیں،

جب فرعون ان کے ساتھ سختی کرنے کا ارادہ کرتا تو وہ لائق خاتون اس ظالم کو سمجھا بجھا کر روک دیتیں، آخر کار ایک دن اس کو نہایت ہی غصہ آ گیا اور حکم دیا کہ ان کو زمین پر لیٹا کر چاروں ہاتھوں پاؤں میں میخیں گاڑی دی جائیں اور ان کے سینے پر چکی کا پاٹ رکھ دیا جائے، وہ دن گرمی کا تھا دھوپ چلچلا رہی تھی اس حالت میں ان کو تپتی ہوئی ریت پر میخیں ٹھونک کر سینے پر چکی کا پتھر رکھ دیا گیا، حضرت آسیہ نے اللہ تعالیٰ سے دعاء کی کہ میرے لئے جنت میں گھر بنایئے اور ان ظالموں سے مجھے نجات دے دیجئے، اسی وقت عزائیل اللہ کے حکم سے ان کی روح جنت میں لے آئے جہاں ان کے لئے موتی کا شاندار محل تیار تھا، فرعون آیا دیکھا کہ جان نکل گئی ہے، مایوس ہو کر واپس چلا گیا۔

میخوں کے متعلق دوسرا قول

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ''میخوں'' سے مراد لشکر کی میخیں ہیں جو خیمے گاڑنے کے لئے ہوتی ہیں۔ بلکہ لشکر کا سارا کام ہی میخوں پر موقوف ہوتا ہے، خیمے، قناتیں گاڑنا، جانوروں کو باندھنا جیسے اونٹ، خچر، ہاتھی اور گھوڑے ہیں۔ اسی لئے لشکر کے لوگ جتنا بخل میخ دینے میں کرتے ہیں شہری لوگ اتنا بخل روپیہ پیسہ دینے میں بھی نہیں کرتے۔

تو ''میخوں والا'' کہنے سے اس کے لشکر کی کثرت کی طرف اشارہ ہے، چنانچہ فرعون کا لشکر، عظیم ترین لشکر تھا، اس کے لشکر کے مختلف گروہوں اور جماعتوں (یونٹ، پلٹن، کمپنی) کو ایک دوسرے سے ممتاز کرنے کے لئے طریقہ یہ تھا کہ گھوڑوں کے رنگوں پر ان جماعتوں کا نام رکھا جاتا تھا، مثلاً کیت گھوڑوں والی جماعت، مشکی گھوڑوں والا گروہ، اور ابلق گھوڑوں والی جماعت وغیرہ، اور ابلق رنگ گھوڑوں میں دوسرے رنگوں کی بنسبت کم ہوتا ہے اس کے باوجود اس رنگ کے گھوڑوں کی تعداد اس کے لشکر میں ستر ہزار تھی، جو ہراول دستہ کے طور پر تمام لشکر سے آگے رہتے تھے۔ اس سے اس کے باقی لشکر کی تعداد کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ کیا کچھ ہوا ہوگا۔

یہ تین قصے جو یہاں بیان ہوئے ان سے یہ راہنمائی ملتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی سرکشی اور انتہائی طاقت وقوت کے باوجود آنِ واحد میں اس دنیا میں ہی ان سب کو ہلاک کر کے ان سے بدلہ لے لیا حالانکہ دنیا جزا وسزا کا محل بھی نہیں ہے (لہٰذا کسی قوت والے سے بدلہ لینا اس کے لئے کچھ مشکل نہیں ہے)

اس سے فارغ ہو کر اب یہ بیان فرماتے ہیں کہ ان لوگوں کو ہلاک کرنے کا مقصد کچھ ان کا ملک و

مال حاصل کرنا نہیں تھا جیسا کہ دنیا کے بادشاہوں کے مطمح نظر یہی چیز ہوتی ہے، بلکہ مقصد یہ تھا کہ دنیا کو ان کے ظلم وفساد سے پاک کیا جائے، اس لئے کہ ان کا حال یہ ہو گیا تھا۔

الَّذِيْنَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ ۝

یہ سب تھے جنہوں نے سر اُٹھایا ملکوں میں

انہوں نے شہروں میں سرکشی کی، شہروں کا خاص طور پر اس لئے ذکر فرمایا کہ اکثر امن وامان یہیں ہوتا ہے، اور ہر طرح کے لوگ یہاں آباد ہوتے ہیں، اور اگرچہ حکمران بہت سے ظالم ہوا کرتے ہیں مگر اپنے ملک وشہروں میں انصاف کیا کرتے ہیں، ظلم وتعدی کا زیادہ عمل اپنے قلمرو سے باہر کیا کرتے ہیں، لیکن یہ ایسے ظالم لوگ تھے کہ اپنے ہی شہروں، اور لشکروں میں ظلم وستم کیا کرتے تھے۔

فَاَكْثَرُوْا فِيْهَا الْفَسَادَ ۝

پھر بہت ڈالی اُن میں خرابی

بہت زیادہ فساد یہ تھا کہ شہر والوں کے جان ومال کے ساتھ ان کے دین وعقیدے میں بھی خرابی پیدا کرتے، کہ بُری رسمیں ایجاد کرتے، اور ہر طرح کا ظلم اس کے ساتھ جاری رکھتے، جبکہ عام طور پر ظالم لوگ صرف جان ومال پر ہی ظلم کرتے ہیں۔

فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ ۝

پھر پھینکا اُن پر تیرے رب نے کوڑا عذاب کا

فرمایا تیرے رب نے ان پر برسایا، "ربّ" ایسا کہ اس کی ربوبیت عام اور جامع ہے، جیسے وہ ان مفسدین کا رب ہے اسی طرح ان مظلوموں کا بھی رب ہے، سو اس کی ربوبیت کا تقاضا ہے کہ ان مظلوموں کا بدلہ ان ظالموں سے وہ پورا پورا لے۔

"سَوْطَ عَذَابٍ"

کوڑے کے لفظ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ تمام شدید ترین عذاب جو بارش کی طرح ان تینوں گروہوں پر نازل ہوا اس کی نسبت اس عذاب سے جو ان لوگوں کے لئے آخرت میں تیار رکھا

گیا ہے ایسی ہے جیسے کوڑے کو تلوار سے ہے، (یعنی آخرت کا عذاب گویا تلوار ہے اور یہ دنیا کا باوجود اس شدت کے محض کوڑا ہے)

ایک جملے میں عذاب کے لئے دو استعارے

''صب'' اور ''سوط'' کے مجموعے سے یہ معلوم ہوا کہ یہاں ایک ہی جملے میں عذاب کے لئے دو استعارے استعمال کئے گئے ہیں۔

(۱) ایک تو اسکو بارش سے تشبیہ دی گئی ہے جس پر لفظ ''صب'' دلالت کرتا ہے (یہ استعارہ ترشیحیہ ہے)

(۲) دوسرا اس کو کوڑے سے تشبیہ دی گئی ہے جس پر لفظ ''سوط'' صراحتاً دلالت کر رہا ہے (یہ استعارہ تصریحیہ ہے)

اس طرح ایک ہی عبارت میں دو استعاروں کو جمع کرنا صرف کلام اللہ کی شان ہے بشر کے کلام میں ایسا نہیں پایا جاتا۔ چنانچہ اس آیت میں بھی دو استعارے جمع فرمائے گئے ہیں۔

"فاذا قهم الله لباس الجوع والخوف"

مذکورہ تین قصوں کی تخصیص میں نکتہ

ان تین قصوں کو خاص طور پر ذکر کرنے میں نکتہ یہ ہے کہ کسی بڑی جماعت اور لوگوں کی بڑی تعداد سے بدلہ لینے میں مشکل و دشواری کے تین ہی سبب عام لوگوں کے ذہن میں ہوتے ہیں۔

(۱) یا تو بدلہ وانتقام لینا اس لئے مشکل معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ انتہائی طاقت وقوت والے ہیں ان کے مقابلے کی کسی میں سکت نہیں سو اس استبعاد کو دفع کرنے کے لئے شدّادو عاد کا قصہ ذکر فرمایا۔

(۲) یا کسی قوم سے انتقام لینے کے مشکل ہونے کے لئے یہ شبہ ہوتا ہے کہ وہ لوگ بہت مضبوط قلعوں اور محفوظ مقامات میں ہوتے ہیں، اس شبہ کے ازالے کے لئے قوم ثمود کا قصہ ذکر فرمایا۔

(۳) یا انتقام و بدلہ لینے میں دشواری کے لئے یہ شبہ ہو سکتا ہے کوئی قوم بہت بڑی تعداد میں ہو، اس کا لاؤ لشکر بے شمار ہو، سو اس کے ازالے کے لئے فرعون کا قصہ ذکر فرمایا۔

اب اصل اس مضمون کو بیان فرماتے ہیں جس کی تمہید کے لئے پانچ قسمیں اور یہ تین قصے بیان فرمائے ہیں، چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں:

اِنَّ رَبَّکَ لَبِالْمِرْصَادِ ۝

بیشک تیرا رب لگا ہے گھات میں

جیسے کوئی آدمی چھپ کر سرِ راہ بیٹھ جائے اور گذرنے والوں کے حالات کی تحقیق کرنے لگے کہ فلاں یہاں سے کس حالت میں اور کیا کرتا ہوا گذرا اور فلاں گذرتے ہوئے کیا لیتا ہوا گیا ہے، تاکہ جب کبھی بدلے کا موقع آئے تو ہر ایک کے عمل کے موافق اس کو بدلہ دیا جائے، پس اللہ تعالیٰ بھی فوری اس لئے انتقام نہیں لے رہے تاکہ بنی آدم کی اچھائی یا برائی مکمل ہو جائے، اور انسانوں کے اچھے یا بُرے اعمال کی تکمیل اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک نوعِ انسانی مکمل فنا نہیں ہو جاتی، ایسا نہیں کہ وہ انسانوں کے اچھے یا بُرے اعمال سے غافل ہے، یا محض لاپرواہی سے بدلہ لینا منظور ہی نہیں ہے، پس یہ امہال ہے اہمال نہیں۔ یعنی مہلت اور ڈھیل ہے مہمل و بے کار چھوڑنا نہیں ہے۔

اور اللہ کی گھات و انتظار اگر چہ بندوں کو عزت و نعمت اور مال و دولت دینے یا نہ دینے کے سبب سے ہوتی ہے، تاکہ یہ معلوم ہو کہ مال و دولت، اور عزت و مرتبہ دینے کی صورت میں شکر کرتا ہے، اور حدود کے اندر ہی رہتا ہے، یا تکبر، فخر اور سرکشی اختیار کرتا ہے؟ اور مال و دولت، عزت و مرتبہ نہ دے کر اللہ یہ دیکھتا ہے کہ آیا یہ ناشکری، شکوہ و شکایت اور جزع فزع کرتا ہے یا صبر اختیار کرتا ہے، اور اللہ کے فیصلے پر راضی رہتا ہے؟ لیکن اس گھات و انتظار کو سوائے اللہ تعالیٰ کے، اس کے پیغمبروں، صدیقین، اولیاء اور علمائے ربانی کے کوئی نہیں جانتا۔

انسان غیب کے معاملے کی کیفیت سے غافل ہیں وہ ہرگز اس راز کو نہیں جانتے، وہ تو ظاہری مال و دولت پر ہی فریفتہ اور ظاہری فقر و افلاس پر شکوہ و شکایت شروع کر دیتے ہیں اور نا اُمید ہو جاتے ہیں۔

چنانچہ فرماتے ہیں:

فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ

سو آدمی جو ہے جب جانچے اُس کو رب اُس کا پھر اُس کو عزت دی اور اُس کو نعمت دی

فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ ۝

تو کہے میرے رب نے مجھ کو عزت دی

یعنی آدمی اس پوشیدہ معاملے سے بے خبر ہے اور دلیل اس کی یہ ہے کہ جب گھات میں لگا ہوا اس کا

رب اس کو آزماتا ہے کہ اس کو مال دے کر عزت دیتا ہے اور اس کو نعمت دیتا ہے کہ مال سے ہر طرح کی نعمت حاصل ہو جاتی ہے تو وہ بغیر سوچ سمجھے یہ کہتا پھرتا ہے میرے رب نے مجھے عزت دی، حالآنکہ وہ نہیں جانتا کہ یہ سب آزمائش ہے اور اللہ کی پکڑ سے بے خوف نہیں ہو جانا چاہئے، ضروری نہیں کہ ایک بار اگر مال وعزت مل گئی تو یہ اسی طرح رہے گی، اس لئے کہ معاملہ ہنوز پردے میں ہی ہے دیکھئے کیا ہو؟

وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ ۵

اور وہ جس وقت اُس کو جانچے پھر کھینچ کرے اُس پر روزی کی

فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ ۝

تو کہے میرے رب نے مجھے ذلیل کیا

اور جب آدمی کو اللہ تعالیٰ فقر وفاقہ سے آزماتا ہے کہ اس پر روزی تنگ کر دیتا ہے اگر چہ اتنی میسر ہو جس پر زندگی کی بقا ہے تو وہ بے سوچ سمجھے یہ کہنے لگتا ہے میرے رب نے مجھے ذلیل کر دیا حالآنکہ وہ یہ نہیں جانتا کہ اس سے میرے صبر کی آزمائش ہے، عزت و ذلت کا معاملہ تو پوشیدہ ہے معلوم نہیں (حقیقت میں کسے عزت ملے کسے نہ ملے) اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دنیا کا فقر آخرت کی عزت کا سبب ہوا، اور دنیا کا مال وعزت آخرت کی ذلت واہانت کا سبب ہو گئے، سو دنیا کے پہلے حال پر ہی دھوکہ کھا جانا اور نعمت ومصیبت دونوں صورتوں میں غیب کے معاملے کو یعنی امتحان وآزمائش کو نہ سوچنا اس آیت ''اِنَّ رَبَّکَ لَبِالْمِرْصَادِ'' کے مضمون سے بہت بڑی غفلت ہے۔

چند اشکلات اور ان کے جوابات

باقی یہاں چند سوالات ہیں جن کے جوابات ضروری ہیں ان کو ذکر کیا جاتا ہے۔

پہلا اشکال:۔ پہلا سوال یہ ہے کہ (فَاَمَّا الْاِنْسَانُ کے اندر) فاء اور اَمَّا لائے ہیں، فاء تفریع کے لئے آتی ہے اور ''اَمَّا'' لغتِ عرب میں کسی سابق مجمل کلام کی تفصیل کے لئے آیا کرتا ہے، سو تفریع کس چیز کی ہو رہی ہے اور کلام سابق میں مجمل کیا ہے جس کی تفصیل کی جا رہی ہے۔

جواب:۔ یہ ہے کہ وہ مجمل کلام ''اِنَّ رَبَّکَ لَبِالْمِرْصَادِ'' کا مضمون ہے، اس لئے کہ اس مضمون سے یہ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے امتحان وآزمائش کے درپے ہے، اس بات کا تقاضا تو یہ تھا کہ

بندے بھی خوف وڈر اور ہشیاری اختیار کرتے غفلت میں نہ پڑتے لیکن واقعہ یہ ہے کہ بندے غفلت کا شکار ہیں سو عزت و ذلت اور فقر و دولت ان دونوں صورتوں میں ان کی غفلت کا بیان اس اجمال کی تفصیل ہوئی اور اسی تفصیل و تفریع کے لئے فاء بھی داخل ہوئی ہے۔

دوسرا اشکال:۔ دولت و نعمت کی صورت میں جو آزمائش بیان ہوئی وہاں "فاکرم" خود بھی فرمایا اور بندے کی زبانی بھی "فاکرمن" نقل فرمایا ہے، لیکن فقر کی آزمائش بیان کرتے ہوئے خود "فاھانہ" نہیں فرمایا صرف بندے کی زبانی "فاھانن" نقل کیا ہے اس میں کیا نکتہ ہے؟

جواب:۔ اس کا یہ ہے کہ حقیقت میں فقر اہانت کا سبب نہیں ہے اس کو اہانت و ذلت کا سبب سمجھنا نادان بندے کا کام ہے، بلکہ اکثر یہ ظاہری فقر دنیا و آخرت کی اصلاح کا سبب ہو جاتا ہے بلکہ عزت و مرتبہ کا سبب بھی ہو جاتا ہے چنانچہ بہت سے اولیاء اللہ کے حالات سے ظاہر ہے کہ فقر میں ان کو اللہ تعالیٰ نے بادشاہوں سے زیادہ عزت عطا فرمائی (اس لئے اس موقعہ پر خود اہانہ نہیں فرمایا صرف بندے کا قول نقل فرمادیا)

اور مال و دولت حقیقت میں اکثر ظاہری عزت کا سبب ہوتا ہے گو کہ آخرت کی عزت کا سبب نہ ہو، بہرحال رزق کی فراخی دنیا میں بہتر ہے اس نکتے کی وجہ سے اس موقعہ پر خود بھی فرمایا "فاکرمہ"

تیسرا اشکال:۔ یہ ہے کہ اصل کلام (معنی کے اعتبار سے) یوں معلوم ہوتا ہے۔

"فاما الانسان فیقول ربی اکرمن اذا ماابتلہ فاکرمہ و اما ھو فیقول ربی اھانن اذا ماابتلہ فقدر علیہ رزقہ"

پس دونوں جگہوں میں "یقول" مبتداء (الانسان، ھو) کی خبر ہے، اور "اذا ماابتلہ" "یقول" کا ظرف ہے۔

مگر کلام مجید میں "اما" کو پہلے جملے میں "انسان" پر داخل کیا اور دوسرے جملے میں "اذا ماابتلہ" پر داخل کیا جو "یقول" کا ظرف ہے، اس تعبیر میں کیا نکتہ ہے؟

جواب:۔ حقیقت میں "اما" ظرف پر داخل ہے اس لئے کہ "اما" کا لفظ لا کر انسان کی تفصیل بیان کرنا مقصود نہیں بلکہ اس کی آزمائش جو دولت اور فقر کے ذریعہ ہوتی ہے اس کی تفصیل کرنی مقصود ہے۔

اور پہلے جملے میں "اما" کے متصل لفظ "انسان" آگے آنے والی ضمائر کے مرجع کی تعیین کے لئے

آ گیا ہے، کہ اس سے پہلے اس مرجع کا ذکر نہیں ہوا، سو اصل معنی کے اعتبار سے کلام کو یوں سمجھنا چاہئے

ان ربک لبالمرصاد والانسان غافل من ذلک فی کلتا الحالتین فأما إذا ما ابتله ربه فاکرمه و نعمه فیقول ربی اکرمن و اما إذا ما ابتله فقدر علیه رزقه فیقول ربی أهانن

بلکہ اگر گہرائی سے غور وفکر کریں تو معلوم ہوگا کہ یہاں دو تفصیلیں کرنی منظور ہیں۔

(۱) پہلی تفصیل: "**أما الانسان فهو غافل عن کون ربه لبالمرصاد فی کلتا الحالتین**"

(۲) دوسری تفصیل: "**أما فی حالة الابتلاء بالنعمة و المال فلا یتلقی النعمة الشکر واما فی حالة الابتلاء بالفقر والضیق فلا یتلقی بالصبر ولا یدری ان ربه مترقب لمجازاته علی معاملته**"

اور چونکہ پہلی تفصیل مقصود بالذات نہیں تھی اس لئے اس کی طرف ''الانسان'' کا لفظ ''اما'' کے بعد بڑھا کر اشارہ کر دیا اور دوسری تفصیل کو اشباع (بھرپور) کے طور لائے ہیں اس لئے کہ یہی تفصیل مقصود بالذات تھی۔

چوتھا اشکال:۔ انسان کے قول "اکرمن" اور "اھانن" کو نقل کرنے سے جو مذمت اس کے اس کہنے کی سمجھ آتی ہے، یہ کس وجہ سے ہے۔ حالانکہ بظاہر وہ اس کہنے میں سچا ہے، چنانچہ اکرام کے مقام پر تو خود بھی ''اکرمہ'' فرمایا ہے، پھر یہی بات اگر انسان کہے تو برائی کیا ہے؟

اور ''اہانت'' کے بیان میں اگرچہ خود نہیں فرمایا "اھانہ" مگر انسان کا کہنا واقع کے مطابق ہے کہ اکثر ظاہر بینوں کی نظر میں فقر و معاش کی تنگی ذلت وحقارت کا سبب ہوتی ہے چنانچہ کہا جاتا ہے:

"**عزة الدنیا بالمال و عزة الآخرة بالأعمال**"

جواب:۔ انسان کے اس کہنے پر — "ربی اکرمن، ربی اھانن" اس وجہ سے نکیر ومذمت نہیں ہو رہی کہ یہ واقع کے مطابق نہیں بلکہ اس وجہ سے ہے کہ بندہ تو بس دنیا کے اکرام و ذلت کو ہی سب کچھ سمجھ بیٹھا ہے، اور وہ اکرام واہانت جو اس آزمائش کے پردے میں پوشیدہ ہے اس سے غافل ہے، اور اکرام واہانت کی جو حقیقت قیامت کے دن کھلے گی اس سے بے خبر ہے، اور دنیا کی عزت وذلت کے سوا وہ کسی عزت وذلت کا تصور ہی نہیں رکھتا، سو انسان بے وقوف ہے، اس کی اسی بے وقوفی پر یہ جھڑکیاں

اس کو سنائی جارہی ہیں کہ وہ حقیقت کو چھوڑ کر ظاہر پر ریجھ رہا ہے۔

پانچواں اشکال:۔ عرف کے مطابق فقر و تنگدستی میں ابتلاء و آزمائش کے معنی تو سمجھ آتے ہیں مگر دولت و عزت کی حالت میں ابتلاء کا کیا معنی ہے؟

جواب:۔ یہ ہے کہ لغت میں ابتلاء کے معنی آزمائش و امتحان کے آتے ہیں اور امتحان و آزمائش جس طرح فقر و تنگدستی میں ہوسکتا ہے کہ صبر و رضا اختیار کرتا ہے یا نہیں، اسی طرح عزت و دولت میں بھی اس بات کی آزمائش ہوتی ہے کہ شکر کرتا ہے یا نہیں۔

بادہ نوشیدن و ہشیار نشستن سہل است

گر بدولت برسی مست نگردی مردی

پس ابتلاء کے یہاں لغوی معنی مراد ہیں، عرفی معنی مراد نہیں ہیں۔

جب انسان کی دو حالتیں مالداری اور تنگدستی کی تفصیل بیان کرنے سے فارغ ہوئے تو اب تونگری کے لوازمات و حقوق کی ادائیگی میں انسان جو کوتاہی کرتا ہے، اس پر ڈانٹ ڈپٹ کرتے ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں

كَلَّا بَل لَّا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ ○

کوئی نہیں پر تم عزت سے نہیں رکھتے یتیم کو

"کَلَّا" ہرگز بات یوں نہیں کہ عزت و مال حاصل ہونے کی صورت میں اللہ کے ہاں بھی اپنی عزت سمجھو، اور فخر و غرور میں مبتلاء ہو کر اس کی دی ہوئی نعمتوں کو اس کی مرضی کے خلاف استعمال کرو، جیسا کہ عام لوگوں کا طریقہ یہی ہے، بلکہ تم لوگ یتیم کی عزت نہیں کرتے ہو، حالانکہ تم کو عزت و مرتبہ اس لئے عطا ہوا تھا کہ بے عزت لوگوں کی عزت کرو، اور خاص طور پر یتیم کا کوئی پُرسانِ حال نہیں ہوتا ہر طرف سے اس کے ساتھ بے عزتی کا معاملہ ہوتا ہے اس کی عزت ضروری تھی مگر تم نہیں کرتے، اور تمہیں بہت سا مال اس لئے دیا گیا تا کہ تم محتاجوں اور فقیروں پر خرچ کرو مگر تم ایسا بھی نہیں کرتے۔

وَلَا تَحَاضُّونَ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ ○

اور تاکید نہیں کرتے آپس میں محتاج کے کھلانے کی

تمہارا یہ حال ہے کہ اپنے مال سے تو خرچ کرنا رہا ایک طرف تم تو دوسروں کا مال جو تمہیں بلا محنت و

مشقت کے مل جاتا ہے اس میں سے بھی خرچ نہیں کرتے ہو، خود ہی چٹ کر جاتے ہو، چنانچہ فرمایا:

وَتَأْكُلُونَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا ۝

اور کھا جاتے ہو مُردے کا مال سمیٹ کر سارا

یعنی تمہیں اپنے باپ دادا کی جو میراث ملتی ہے اسے بھی غلط طریقے سے کھا جاتے ہو، اس میں اس بات کا خیال نہیں رکھتے کہ حلال کھاؤ جو صرف تمہارا اپنا حق ہے، اور حرام نہ کھاؤ جو تمہارے دوسرے شریکوں کا حق ہے، تم سب بلا سوچے سمجھے سمیٹ کر کھا جاتے ہو، تمہاری سمجھ بوجھ تو جانوروں کی سمجھ سے بھی کمتر ہوئی کہ جانور بھی اپنا گھاس کھانے سے پہلے سونگھ لیتے ہیں، اگر کھانے کے قابل ہو تو کھا لیتے ہیں ورنہ چھوڑ دیتے ہیں۔

اور اگر کوئی یہ کہے کہ میرے پاس نہ تو اپنا ہی مال ہے کہ یتیم و مسکین کو اس میں سے دوں، اور نہ ہی باپ دادا کی میراث ملی ہے کہ شریکوں کے حق کھانے کا اندیشہ ہو، اس کے جواب میں فرماتے ہیں:

وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ۝

اور پیار کرتے ہو مال کو جی بھر کر

اگرچہ تم مالدار نہیں ہو لیکن مال کی محبت تمہارے دلوں میں بھری پڑی ہے، اگر تمہارے ہاتھ میں مال آجائے تو تم بھی وہی کرو جو دوسرے کرتے ہیں۔

مطلقاً مال کی محبت مذموم نہیں

''جما'' کے لفظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مال کی فی الجملہ محبت اور اس کے ساتھ تعلق جو حاجتِ ضروری کے موافق ہو معیوب نہیں ہے کیونکہ دنیا کے انتظام کی بقا اسی پر موقوف ہے، اور وہ محبت جو بری ہے وہ ہے جو ضرورت و حاجت سے زیادہ کے لئے ہو۔

كَلَّآ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا ۝

کوئی نہیں جب پست کر دیجائے زمین کوٹ کوٹ کر

''کلا'' ہرگز یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے نیک و بُرے اعمال سے بے خبر ہے، یا نیک و

بُرے اعمال کا بدلہ دینا اس کو منظور ہی نہیں ہے، نہیں ایسا نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ گھات وانتظار میں بیٹھا ہے ایک خاص وقت کے آنے کا، جو اس نے اپنی حکمت سے جزاوسزا کے لئے مقرر کر رکھا ہے، اور وہ جب آئے گا جب زمین کوٹ کوٹ کر برابر کردی جائے گی، اس میں کوئی پہاڑ، ٹیلہ اور اونچی جگہ باقی نہ رہے گی سب ہموار میدان ہو جائے گا۔

زمین کی یہ حالت قیامت کے زلزلے سے ہوگی جو صور پھونکنے سے برپا ہوگا، اسی وقت تمام مردے اپنی قبروں سے نکل پڑیں گے اور روحیں اپنے اپنے بدنوں سے مل جائیں گی۔

وَّجَآءَ رَبُّکَ وَالْمَلَکُ صَفًّا صَفًّا ۝

اور آئے تیرا رب اور فرشتے آئیں قطار قطار

تب تیرا پروردگار جلال وقہر کی صفت کے ساتھ تجلّی فرمائے گا اور بندوں کی جزاوسزا کی طرف متوجہ ہوگا، اور فرشتے صف باندھے آئیں گے، ساتوں آسمانوں کے فرشتوں کی سات صفیں ہوں گی، حاملانِ عرش کی الگ صف ہوگی اس طرح فرشتوں کی مختلف صفیں ہوں گی۔

وَجِآئَ یَوْمَئِذٍ بِجَھَنَّمَ ۵

اور لائی جائے اُس دن دوزخ

یعنی اس دن جہنم ظاہر کردی جائے گی چنانچہ دوسری آیت میں فرمایا ہے "وبرزت الجحیم لمن یری" بعض روایات میں آتا ہے کہ اس روز ستر ہزار فرشتے، جہنم کی ستر ہزار باگوں کو پکڑے کھینچتے ہوئے عرش معلیٰ کے بائیں طرف لائیں گے، جب جہنم میدان حشر سے دوسو برس کی مسافت پر پہنچے گی تو اس کی چنگاریاں اور لپٹیں اُڑیں گی، اور اس کے جوش وخروش کی آواز کو اتنی دور سے اہل محشر سنیں گے، اور اس وقت ان پر انتہائی خوف ودہشت طاری ہو جائے گی کہ پیغمبر کرسیوں سے اتر پڑیں گے اور سارے لوگ گھٹنوں کے بل بیٹھ جائیں گے اور نفسی نفسی پکارنے لگیں گے۔

یَوْمَئِذٍ یَّتَذَکَّرُ الْاِنْسَانُ

اُس دن سوچے گا آدمی

اس دن انسان سوچے گا انبیاء کرام اور نصیحت کرنے والے جو کہا کرتے تھے کہ اچھے بُرے عمل کا

بدلہ ضرور ہوگا یہ حق ہے، اور اس کام کے لئے قیامت کا دن مقرر ہے، سو وہ سچ تھا، اس لئے کہ جزا وسزا کا سارا ساز وسامان سامنے دیکھے گا، قید خانہ جہنم کی صورت میں سزا دینے والے فرشتے بے شمار موجود، اور حاکم حق تعالیٰ شانہ جو قہر وجلال کے ساتھ جلوہ گر ہے، اور زمین جو رہنے سہنے کی جگہ تھی آج ٹوٹ پھوٹ کر چٹیل میدان بن چکی کہ بھاگ کر اس میں کہیں سر چھپانے کی جگہ نہیں۔ نہ ٹیلہ، نہ پہاڑ، نہ غار نہ کوئی کھائی، کوئی جائے تو کدھر جائے، لیکن اس دن یہ سوچنا کچھ فائدہ نہ دے گا چنانچہ فرماتے ہیں:

وَ اَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى ○

اور کہاں ملے اُس کو سوچنا

اس دن سوچنا کچھ فائدہ نہیں دے گا کہ وہ دن سوچنے کا نہیں جزا وسزا کا ہے، ہاں آج دنیا میں اس کے بارے میں سوچ لے تو یہ سوچنا مفید ہو سکتا ہے ورنہ تو حسرت وافسوس ہی ہے کہ یہ بھی بڑا عذاب ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِىْ قَدَّمْتُ لِحَيَاتِىْ ○

کہے کیا اچھا ہوتا جو میں کچھ آگے بھیج دیتا اپنی زندگی میں

اس دن انسان حسرت سے کہے گا کاش میں نے اپنی زندگی کے لئے کچھ مال اور نیک اعمال میں سے آگے بھیجا ہوتا، اس حسرت وافسوس کی اذیت جسمانی عذاب سے بھی سخت ہوگی۔

فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُعَذِّبُ عَذَابَهٗٓ اَحَدٌ ○

پھر اُس دن عذاب نہ دے اُس کا سا کوئی

اس دن ایسا عذاب اس کو ہوگا کہ کوئی عذاب اتنا اذیتناک نہ ہوگا نہ جہنم کی آگ، نہ وہاں کے سانپ وبچھو کا عذاب، اس لئے کہ یہ جسمانی عذاب ہیں، اور اللہ تعالیٰ مجرم کی روح کو حسرت وافسوس کا عذاب دیں گے، لہٰذا روحانی عذاب کے مقابلے میں جسمانی عذاب کی کوئی حیثیت نہیں۔

وَّلَا يُوْثِقُ وَثَاقَهٗٓ اَحَدٌ ○

اور نہ باندھ کر رکھے اُس کا سا باندھنا کوئی

اس کا سا باندھنا کوئی باندھ نہ سکے، اس لئے کہ اگر چہ جہنم کے داروغے دوزخیوں کے گلوں میں

طوق اور پاؤں میں زنجیریں ڈال کر جکڑیں گے اور دوزخ کے دروازے سے بند کر کے اوپر سے سرپوش بند کر دیں گے، مگر (یہ سب جسم پر ہوگا) فکر و خیال کی بندش نہیں کر سکیں گے، اور عقل و خیال کی یہ عادت ہے کہ اس کی توجہ بہت سی باتوں کی طرف ہو جاتی ہے۔ ایسے میں بعض باتیں دوسری بعض باتوں کے لئے جواب بن جاتی ہیں یہی وجہ ہے کہ عین قید و بند کی حالت میں انسان کو کامل درجے کی وسعتِ خیالی حاصل ہوتی ہے۔ لیکن اس کے مقابلے میں اگر اللہ تعالیٰ کسی آدمی کے عقل و خیال کو ہی ادھر ادھر متوجہ ہونے سے روک دے اور ایک درد و دکھ کی طرف ہی اس کو مرکوز کر دے تو ایسی قید ہزار درجے بدنی قید سے سخت ہے۔ (یہاں یہی بندش و قید مراد ہے) چنانچہ مجنون و سودائی قسم کے لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ باغ و بہار کی سیر کی حالت میں ایسی گھبراہٹ اور خفگی محسوس کرتے ہیں کہ بڑے بڑے باغات بلکہ جنگل بھی ان کو تنگ معلوم ہونے لگتے ہیں یہ سب انکے وہم و خیال کے تنگ ہو جانے سے ہوتا ہے۔

مذکورہ دونوں آیات میں دوسری قراءت

بعض معتبر قرّاء حضرات نے دونوں آیات (لا یعذب الخ) کو مجہول پڑھا ہے، اس صورت میں معنی ظاہر ہے کہ یوں ہوگا ''اور عذاب نہیں دیا جائے کسی کو اس غافل کی طرح، اور کوئی بند نہ کیا جائے اس غافل کے بند کرنے کی طرح'' کیونکہ دوسرے گنہگاروں نے بھی اگرچہ گناہ کئے تھے لیکن وہ اس کی طرح اس دن سے غافل نہیں تھے کبھی کبھی ان کو اس دن کا خوف آتا تھا، سو وہ گنہگار جب اس دن کو دیکھیں گے تو اتنے دہشت زدہ اور حواس باختہ نہ ہوں گے جس طرح اس کے ہوش و حواس ہی مختل ہوں گے، کیونکہ اس کو پہلے سے اس بلائے ناگہانی کی خبر ہی نہیں تھی، لیکن پہلے سے کچھ خوف رکھنے والوں کے لئے بالکل ہی ناگہانی آفت نہ ہوگی اور یوں بھی منکرین کے مقابلے میں ان کے عذاب و قید میں تخفیف ہوگی۔

ویسے اول مرتبہ تو اس دن کی ہولناکی اور دہشت سے نیک و بد سب ہی متاثر و پریشان ہوں گے مگر پھر نیکوں اور فرمانبرداروں کو تسلی دی جائے گی اور ایک پکارنے والا پکار کر کہے گا:

يٰۤاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝

اے وہ جی جس نے چین پکڑ لیا

اے وہ نفس جس نے حق کے ساتھ سکون و چین پکڑ لیا کہ تُو سوائے حق کے کسی اور کی طرف توجہ نہیں

رکھتا تھا تجھ کو زمین کے ملیا میٹ ہو جانے، فرشتوں کی حیرت میں ڈالنے والی صفوں کے دیکھنے اور جہنم کے خوفناک آواز سننے کے باوجود کیا پراوہ ہے۔

ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّکِ

پھر چل اپنے رب کی طرف

کہ تو اسی کے حضور میں مستغرق رہتا تھا اور اس کے سوا کسی کی طرف توجہ نہیں کرتا تھا۔

رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً ۝

تُو اُس سے راضی وہ تجھ سے راضی

یعنی ایسی حالت میں چل کہ جمال حق کی تجلی سے تُو مسرور ہونے والا ہے اور تُو جمیل مطلق کے آثار جمال کے ظہور کے لئے پسند کر لیا گیا ہے۔

فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ ۝ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ ۝

پھر شامل ہو میرے بندوں میں اور داخل ہو میری بہشت میں

یعنی میرے مقربین کے گروہ میں شامل ہو جا جو مقام دیدار میں رہتے رہے ہیں یہ تیری سعادت روحانی کا مرتبہ ہے، اور میری جنت میں داخل ہو جا کہ یہ لذت جسمانی کے مزے اُٹھانے کا مقام ہے۔ رزقنا اللّٰہ الفوز بالسعادتین امین

نفس امّارہ، لوّامہ اور مطمئنہ

قرآنِ مجید میں نفس کی تین صفات ذکر کی گئی ہیں۔ امّارہ، لوّامہ، اور مطمئنہ۔

امّارہ:۔ کافروں اور فاسقوں کے نفس کی صفت ہے جو کفر و فسق سے ہٹتے ہی نہیں اور ان کا نفس ہر وقت ان کو انہی کاموں کی طرف رغبت دلاتا ہے۔

لوّامہ: گنہگاروں کے نفس کی صفت ہے جو گناہ اور برائی پر شرمسار ہوتے ہیں اور ان کو ان کا نفس ملامت کرتا ہے کہ یہ کام بہت بُرا تھا تم نے کیوں کر دیا۔

مطمئنہ:۔ انبیاء، صحابہ اور اولیاء کے نفس کی صفت ہے جو ایمان، اطاعت اور اللہ کے ذکر و فکر کے اندر اطمینان رکھتے ہیں اور خواہشات کی کشمکش اور گناہوں کے خطرات سے ان کے حالات و اوقات

مکدّر نہیں ہوتے۔

بعض نے کہا ہے (یہ نفس کی تین الگ الگ قسمیں نہیں ہیں بلکہ ایک ہی نفس کی مختلف صفات ہیں چنانچہ) امّارگی ہر نفس کی ذاتی صفت ہے جو شہوت وغضب کے وقت عقل وشرع کے حکم پر غلبہ کرتی ہے۔

لوّامہ ہونا بھی ہر نفس کی صفت ہے جس وقت وہ عقل وشرع کی طرف توجہ کرتا ہے اور خیر وشر کے درمیان فرق و پہچان کرتا ہے۔

اور اطمینان بھی ہر نفس کی صفت ہے مگر یہ اس وقت حاصل ہوتی ہے جب ذکر کا نور بدن کے تمام اجزاء پر غالب ہو جاتا ہے۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا قیامت کے دن تمام نفس لوّامہ ہو جائیں گے، اپنے آپ کو ملامت کریں گے اطاعت زیادہ کیوں نہ کی اور گناہ کیوں کئے۔

نفس مطمئنہ کو نداء کب دی جاتی ہے

اگرچہ اس نداء کا اصل وقت فزع اکبر ہے جو قیامت کے دن ہوگا مگر اس کا ایک نمونہ ہر مومن کی موت کا وقت بھی ہے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب مؤمن کی موت کا وقت آتا ہے تو اس کے سرہانے خوبصورت فرشتے معطر لباس میں آ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور اس مؤمن کی روح سے کہتے ہیں اے جان بحق آرامیدہ خوشی وسہولت سے نکل آ کہ تیرا پروردگار تجھ سے خوش ہے یہ سن کر مؤمن کی روح خوشی سے نکل آتی ہے اور اس کی خوشبو سے ایک جہاں معطر ہو جاتا ہے، فرشتے اس کو ریشمی معطر کپڑوں میں لپیٹ کر اوپر لے جاتے ہیں، آسمان کے دروازے کھل جاتے ہیں اور فرشتے اس کے لئے مرحبا کہتے ہوئے استقبال کرتے ہیں، اس کی بخشش کی دعاء کرتے ہیں اور اس کو عرش معلّٰی کے نیچے لے جاتے ہیں تاکہ وہ اللہ کو سجدہ کرے، پھر حضرت میکائیل علیہ السلام کو حکم ہوتا ہے کہ اس کو نیک مسلمانوں کی ارواح کے مقام میں داخل کردو، اور اس کی قبر کو کشادہ کردو تاکہ آرام وراحت اس کو پہنچتی رہے، اور اس سے کہہ دو اس طرح سو جائے جس طرح دلہن سوتی ہے کہ کوئی اس کو بیدار نہیں کرتا۔ اور کافروں کی ارواح کے ساتھ اس کے برعکس معاملہ ہوتا ہے۔

الحمدللہ

مقدمہ سورۃ البلد

یہ سورت مکی ہے، اس میں بائیس (۲۲) آیات، بیاسی (۸۲) کلمات اور تین سو اکتیس (۳۳۱) حروف ہیں۔

وجہ تسمیہ

اس سورت کے شروع میں شہر مکہ معظمہ کی قسم کھائی گئی ہے، اور لغت میں ''بلد'' شہر کو کہتے ہیں اس مناسبت سے اس کا نام ''سورہ بلد'' رکھا گیا ہے۔

انسان کے لئے مشقت کے بغیر چارہ نہیں

جس پسِ منظر میں اس شہر کی قسم کھائی جا رہی ہے (یعنی یہ مقدس شہر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تنگی و مشقت کا گہوارہ بنا ہوا ہے) اس کو دیکھئے تو یہ بات واضح طور پر سمجھ آ جاتی ہے کہ انسان کے لئے دنیا و آخرت میں رنج و مشقت اُٹھائے بغیر چارہ نہیں ہے، کیونکہ جب اتنا مقدس شہر ایسی ایسی مشقتوں کا مرکز بنا ہوا ہے تو دوسرے شہر تو اور زیادہ مشکلات و مصائب کے ٹھکانے ہوں گے، اور انسان چونکہ مدنی الطبع ہے یعنی اس کی طبیعت میں شہر کی محبت بسی ہوئی ہے کہ بغیر شہر کے رہ نہیں سکتا اور کوئی شہر راحت کا مقام ہے نہیں۔

ہیچ گنجے بے دود بے رام نیست

لہٰذا انسان کو مشقت و رنج کے بغیر چارہ بھی نہیں۔

مکہ کی عظمت کی وجوہات

مکہ معظمہ کی عظمت بہت سی وجہوں سے ہے، مثلاً وہ حرمِ الٰہی ہے، مقامِ امن ہے، انسانوں کے بار بار لوٹ کر جانے کا مقام ہے کہ ہر سال ہزاروں لاکھوں انسان دور دراز شہروں مُلکوں سے وہاں کا سفر کرتے ہیں، بہترین عبادت جو حج و عمرہ کی صورت میں ہے اس کا مقام ہے، مقامِ ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی وہیں ہے اور سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ جناب نبی کریم سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی جائے

ولادت ہے۔اور یہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نزول وحی کی ابتداء ہوئی۔

سورۂ فجر کے ساتھ ربط کی وجوہ

(۱) سورۂ فجر کے ساتھ اس کے ربط کی وجوہات میں سے یہ ہے کہ سورۂ فجر میں یتیم کی عزت و حرمت کرنے کی تاکید، مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب اور مال کی محبت کی مذمت بیان کی گئی تھی، یہی مضمون اس سورت میں بھی بیان کیا جارہا ہے۔

(۲) اسی طرح سورۂ فجر میں عاد، ثمود، اور فرعون جیسے بڑے بڑے جابر و سرکش کافروں کو گناہوں کی وجہ سے ہلاک کرنا بیان ہوا ہے اور اِس سورت میں بھی ایسے ہی کافر کو جو اپنی قوت پر اتراتا اور کسی کو خاطر میں نہیں لاتا ہے جھڑکا گیا ہے اور سرزنش کی گئی ہے۔

شانِ نزول

قریش میں سے ابوالاسد کلدہ بن اسید بہت بڑا پہلوان اور طاقتور کافر تھا، اس کی طاقت وقوت کا یہ حال تھا کہ گائے کا چمڑا پاؤں کے نیچے دبالیتا اور لوگوں سے کہتا کھینچ کر نکالو، لوگ اس کو کھینچتے، چمڑا پرزے پرزے ہوجاتا لیکن پاؤں کے نیچے سے کوئی نکال نہیں سکتا تھا۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اسلام کی دعوت دی تو تکبر میں آکر اس نے بہت ناشائستہ گفتگو کی، کہنے لگا تم مجھے ایک قید خانہ (جہنم) کے انیس چوکیداروں سے ڈراتے ہو جو میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہیں، کون ہے جو میرے ساتھ مقابلہ کرسکتا ہے، اور ایک باغ (جنت) پر پھسلانا چاہتے ہو، جبکہ میں نے اپنی شادیوں پر اتنا خرچ کیا ہے کہ اس مال کو شمار کیا جائے تو تمہارے باغ کی ساری نہریں اور نعمتیں اس کے سامنے بے حقیقت ہوجائیں۔

اس کی ان باتوں کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمائی اور مضمون وحاصل اس سورت کا یہ ہے کہ انسان کو اپنی قوت، مال اور مرتبے پر مغرور نہیں ہونا چاہئے، غور کرنا چاہئے کہ پیدائش سے موت تک انسان کو کیا کیا مشقتیں اور سختیاں درپیش ہیں کہ اللہ کی مدد کے بغیر ان کو اٹھانے کی کسی میں طاقت نہیں ہے، اور مال تب نعمت ہے کہ آخرت کی سختیوں میں کام آئے ورنہ دنیا کا نام ونمود سراب، اور نقش برآب کی طرح بے حقیقت ہے۔

تمت المقدمة والحمدلله

تفسیر سورۃ البلد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۝

قسم کھاتا ہوں میں اس شہر کی

"لا" نفی کے لئے آتا ہے، مگر یہاں قَسم کی تاکید کے لئے آیا ہے اور کلامِ عرب میں اس معنی میں اس کا استعمال کثرت سے ہے۔

قَسم کی تاکید "لا" کے ذریعہ اس طرح ہوتی ہے کہ قسم ایسی بات پر کھائی جاتی ہے جس کا کوئی منکر ہو، پس پہلے یہ لفظ "لا" لا کر انکار کی نفی کی، پھر قَسم کے ذریعہ دعوے کا اثبات کیا، گویا اب مدّعا دو وجہ سے ثابت ہو گیا، ایک ابطالِ نقیض سے (جو "لا" سے ہوا) دوسرے عینِ مدعا کے اثبات سے (جو قسم کے ذریعہ ہوا) اگر صرف قسم کو ذکر کرتے تو مطلب و مدعا صرف ایک ہی طریقے سے ثابت ہوتا، اس لئے "لا" کلمۂ نفی کا اضافہ کیا تا کہ تاکید میں زیادتی ہو۔

کلمۂ نفی "لا" کے بارے میں دوسرا قول

بعض علماء نے کہا ہے "لا" سے قسم کی نفی مراد ہے، مطلب یہ ہے کہ اس مقصد پر قَسم کھانے کی ضرورت نہیں کہ وہ خود ہی ظاہر ہے۔

"لا" کے بارے میں تیسرا قول

بعض علماء نے کہا ہے کہ یہ کلمہ "مقسم بہ" کی عظمت پر دلالت کرتا ہے یعنی یوں کہ اس چیز کا رتبہ اس سے بلند و برتر ہے کہ ایسی چھوٹی سی بات پر اس کی قسم کھائی جائے۔

بہر حال ان دونوں قولوں کی صورت میں مطلب و مدعا کے ظاہر ہونے یا اس کے اثبات کا اشارہ ہے، اور اس صورت میں بھی تاکید ثابت ہوتی ہے۔

رنج و مشقت اور شہرِ مکہ کے درمیان مناسبت

جب قَسم کھانے کا مقصد یہ ہے کہ انسان حقیقت میں ابتداء سے انتہاء تک رنج و مشقت میں گرفتار

ہے اس مناسبت سے شہر مکہ کی قسم نہایت موزوں ہے، کیونکہ مکہ ہی زمین کا پہلا وہ نقطہ ہے جو پانی پر ابھرا تھا، پھر وہاں سے زمین کو پھیلایا گیا، اور زمین انسان کے مادے کی اصل ہے، سو جس کی اصل الاصول ہی رنج ومشقت کا محل ہو وہ کیسے توقع کر سکتا ہے کہ اسے رنج ومشقت سے چھٹکارہ مل سکے گا۔

اب ہم شہر مکہ کے مقام رنج ومشقت ہونے کی کچھ تفصیل بیان کرتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ زمین کا یہ حصہ سنگلاخ وریگستانی واقع ہوا ہے، زراعت وکاشتکاری کے قابل نہیں، پانی بھی کھاری وہ بھی زمین کی گہرائی میں واقع ہے، پھر سنگلاخ ہونے کی وجہ سے کنواں کھ‍ ‍نا دشوار، اس طرح یہاں کے رہنے والوں کے لئے غلہ پانی کا قحط ہر وقت موجود رہتا ہے۔

اس شہر کا محل وقوع ایسا ہے کہ گرمیوں کے دو مہینوں میں آفتاب اس کے سمت الرأس کے متصل ہوتا ہے جس کی وجہ سے گرمی بہت شدید ہو جاتی ہے، چنانچہ اس شہر کے پہاڑ رات کو بھی تپش دیتے ہیں، گرم ہواؤں کی ہلاکت آفرینی عیاش مزاج لوگوں کو یہاں رہنے سے روکتی ہے یہی وجہ ہے کہ پرانے زمانوں سے بڑے بڑے بادشاہوں نے اس علاقے کو فتح کرنے اور اپنے قلمرو میں شامل کرنے کا ارادہ نہیں کیا کہ ان کے لئے اس میں کوئی کشش نہیں تھی۔ اب بھی اس علاقے کے سفر کا ارادہ صرف مقامات کی زیارت کے لئے کیا جاتا ہے، پھر اس مقدس ومعظم مقام کی زیارت کے لئے بری وبحری سفر میں جو مشقتیں اُٹھانا پڑتی ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔

اور یہ ساری مشقتیں جو ذکر ہوئیں یہاں پر نبی کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے پہلے موجود تھیں۔ پھر جب آپ مبعوث کئے گئے تو ایک اور گل کھلا، ایک نئی دینی مشقت نہایت ہی شدید پیدا ہو گئی کہ اس شہر والوں میں سے ایک گروہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا گرویدہ ہوا آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا، آباء واجداد کے باطل مذہبوں کو چھوڑتے ہوئے بتوں کی عبادت سے کنارہ کشی اختیار کی اور صرف اللہ کی عبادت اختیار کی تو ان کی مخالفت میں کافروں کا بھی ایک گروہ کھڑا ہو گیا، ہر گھر میں اختلاف، جھگڑا اور لڑائی کا ماحول بن گیا، اور کفار نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذاء دینے، آپ کی جماعت کو تکلیفیں پہنچانے کے لئے کمر باندھ لی، اس طرح اس واقعہ کی وجہ سے اس شہر والوں کے اوقات نہایت رنج ومشقت میں گذرنے لگے، اور دن رات یہی لڑائی بھڑائی جاری رہنے لگی، چنانچہ اس نئے رنج ومشقت کی طرف اشارہ کرنے کے لئے ارشاد فرماتے ہیں:

وَاَنْتَ حِلٌّ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۝

اور تجھ پر قید نہیں رہے گی اس شہر میں

اس وقت میں اس شہر کی قَسم کھا رہا ہوں کہ جس وقت آپ اس شہر میں آئے، اس لئے کہ آپ کی روح کے یہاں نازل ہونے کے بعد اس شہر کی عظمت و بزرگی میں اضافہ ہوا، کہ ''شرف المکان بالمکین'' اور دینی رنج و مشقت کے اسباب بھی بڑھ گئے، اس شہر کے رہنے والے اکبر الکبائر کے مرتکب ہوئے یعنی اللہ تعالیٰ کی بہترین مخلوق کو ایذاء دینے اور قتل کرنے میں یہ لوگ مشغول ہوئے، اور حرم شریف کی حُرمت جو اس درجہ ان کے دلوں میں تھی کہ حرم کے موذی جانور، اور خار دار درخت بھی نہ کاٹتے تھے اب یک قلم اس سے پھر گئے اور ایسے ظلم و ستم پر اتر آئے کہ اس مقدس مقام پر حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آج تک ایسے ظلم نہیں ہوئے تھے۔

پس ''وانت حل بھذا البلد'' کی قید کے اضافے سے قَسم اپنے مقصد (از ابتداء تا انتہاء انسان رنج و مشقت میں ہے) کے ساتھ مزید پیوستہ ہوگئی، (یعنی اس قید کے اضافے سے وہ مقصد جس پر قَسم کھائی گئی ہے مزید واضح اور قریب الفہم ہوگیا)

لیکن قَسم کے ساتھ اسکے مطلب و مدعا کی مناسبت معلوم کرنا چونکہ کچھ مخفی اور پوشیدہ بات تھی اذکیاء کے علاوہ ہر ایک اس مناسبت کو معلوم نہیں کر سکتا تھا اسلئے اب ایک دوسری قَسم جو عام فہم ہے وہ ذکر فرمائی ہے۔

وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ ۝

اور قسم ہے جننے کی اور جو اُس نے جنا

جننے والی اور جس کو جنا گیا دونوں انتہائی مشقت میں ہیں، جننے والی حمل کی مشقت اُٹھاتی ہے، اس کی طبیعت بدمزہ رہتی ہے اور پھر جننے کی مشقت سے دوچار ہوتی ہے، اس کے بعد بچے کی پرورش کی سختیاں اور مشقتیں اس کو اُٹھانا پڑتی ہیں۔

اور جس کو جنتی ہے اس کی مصیبتیں یہ ہیں کہ پیدائش سے پہلے ماں کے پیٹ بچہ دانی کے قید خانے میں عجز و ناتوانی کی حالت میں رہتا ہے، پیدائش کے بعد دنیا کے سرائے فانی میں طرح طرح کے روحانی و جسمانی مصائب جھیلنا اس کا مقدر ہوتا ہے، اسی لئے کہا جاتا ہے کہ پیدا ہوتے ہی بچے کا رونا اس بات کا

اشارہ ہوتا ہے کہ اس عالم فانی میں رودھو کے ہی زندگی کاٹے گا۔اور کسی نے کیا ہی خوب کہا ہے۔

لما توزن الدنیا من صروفھا
یکون بکاء الطفل ساعة یولد
وإلا فما یبکیه منها فإنها
لأوسع مما کان فیه وأرغد

ترجمہ:۔ جب دنیا اپنے تغیرات کی خبر دیتی ہے تو بچہ ولادت کے وقت روتا ہے، ورنہ وہ اس وقت نہ روتا اس لئے کہ اب تو سابقہ جگہ سے زیادہ کشادہ مقام میں آ گیا ہے۔

والد و ولد کی تفسیر میں دوسرا قول

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ''والد'' سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں کہ کس طرح ان کو جنت سے نکالا گیا اور دیکھی بھالی، کھائی پی نعمتیں ان سے چھینی گئیں، اور ''ولد'' سے ان کی اولاد مراد ہے جس نے ساری عمر سوائے اس محنت و مشقت کے گھر کے کچھ نہ دیکھا اور اپنے اصلی وطن (جنت) کی تعریفیں ہی حسرت وافسوس کے ساتھ سنیں ہیں۔

اور ان دونوں جنس (والد، ولد) کی قسم سے یہ بات ثابت ہوئی کہ انسان کی اصلِ ترابی بھی مشقت ورنج کا محل ہے اور اس کی اصل آبی بھی رنج ومشقت کا محل ہے، (اصل ترابی سے مراد خاک آدم اور اصلِ آبی سے مراد نطفہ ہے)

اب اس دلیل پر مدلول کو متفرع کر کے فرماتے ہیں:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ ؁

تحقیق ہم نے بنایا آدمی کو محنت میں

فرمایا ہم نے انسان کو رنج ومشقت میں پیدا کیا اس لئے کہ عالم خاک میں اس کی اصل مکہ ہے، اور عالم آب میں اس کی اصل آدم علیہ السلام کا نطفہ ہے اور یہ دونوں ہی رنج ومشقت میں گرفتار ہیں۔

''کبد'' یہاں باء کے فتحہ کے ساتھ ہے جس کے معنی ہیں مشقت، باء کے کسرہ کے ساتھ ہو تو اس کے معنی ہیں جگر، اور ''کبد'' بھی اسی سے مشتق ہے، چونکہ جگر بھی مشقت کا عمل کرتا ہے کہ بدن کا

باورچی ہے غذا کو ہضم کرنے، اور تقسیم کرنے میں وہ بڑی مشقتیں اُٹھاتا ہے جبکہ دوسرے اعضاء اتنی مشقت نہیں اُٹھاتے اس مناسبت سے اس کو "کبد" بکسر الباء کہتے ہیں۔

انسان کی مشقتوں کی کچھ تفصیل

اگر انسان کو درپیش مشقتوں کی تفصیل بیان کی جائے تو اس کے لئے بڑا دفتر چاہئے، اختصار سے کچھ یہاں بیان کیا جاتا ہے۔

(۱) انسان کی تخلیق چار اضداد سے ہے، حرارت، برودت، رطوبت اور یبوست، اور یہ چاروں انسان کے مزاج میں غلبہ کرنا چاہتی ہیں اور اس کے اعتدالِ طبیعت کو خراب کرنے کے درپے رہتی ہیں۔

پیوستہ درکشاکشِ ایں چار اژدہاست

(۲) ماں کے پیٹ میں بچہ دانی کے تنگ قید خانے میں کئی دنوں تک پڑا رہتا ہے۔

(۳) پیدائش کے بعد نہایت عاجزی و بےبسی سے ایک عرصہ تک جھولے میں پڑا رہنا، نہ تو زبان ہے کہ دل کا حال بیان کر سکے، نہ ہاتھ پاؤں ایسے کہ اپنی خواہش ان کے ذریعہ پوری کر سکے۔

(۴) پھر کئی دنوں تک دانت نکلنے اور دودھ چھڑانے کی مشقت میں گرفتار رہتا ہے۔

(۵) جب مکتب میں بٹھانے کے قابل ہوا تو استاد کی مار دھاڑ کی مشقتیں اُٹھانی پڑتی ہیں۔

(۶) پھر جب عقل و بلوغ کے پنجے میں گرفتار ہوا تو طرح طرح کی کشاکش اور رنج و ملال میں مبتلا ہو گیا۔

(۷) اس کی طبیعت شہوت کا غلبہ کر کے کبھی اس کو چوپائے کی طرح ذلیل بنا دیتی ہے، کبھی حرص و لالچ میں گرفتار کر دیتی ہے کہ دو پیسے کی مزدوری کی خاطر سارا سارا دن اس سے پتھر ڈھلاتی ہے، کبھی سارا سارا دن آگ و دھوئیں کی مشقت جھیلتا ہے، چند پیسوں کی خاطر دوکان کا قیدی بنا رہتا ہے، اس کی طبیعت مٹھی بھر غلّے کی لالچ میں اسے بیلوں کے پیچھے بھگاتی پھرتی ہے، کبھی اس کی طبیعت اس کی قوتِ غضبیہ کو بھڑکا کر اس کو درندوں سے ملا دیتی ہے، اور وہ بھیڑیئے اور چیتے کی طرح مخلوق کو ایذاء و تکلیف پہنچاتا ہے، تب سب لوگوں کا لعن طعن اور سب کی پھٹکار اس کا نصیب بن جاتا ہے۔

(۸) اس سب پر طُرفہ یہ کہ وہ طبیعت کا بھی قیدی ہے اور شریعت کا مامور بھی، شریعت طبیعت کے

خلاف راستہ بتاتی ہے جب کہ طبیعت نفس کے موافق کرتی ہے اور عبادت سے اس کو روکتی ہے اور یہ عبادت کرنے پر مامور ہے، بغیر عبادت کے اس کی نجات نہیں۔

(۹) اور گناہوں کے اسباب موجود ہونے کے باوجود اس کو گناہوں سے باز رہنے کا حکم ہے۔

اور عالم میں اس سے زیادہ رنج و مشقت کی کوئی بات نہیں کہ اضداد کو جمع کیا جائے اور باہم مخالف چیزوں کو راضی وخوش رکھا جائے اور یہ تو وہ مشقتیں ہیں جن کا تعلق ہر انسان کی اپنی ذات کی حد تک ہے، اور وہ مشقتیں جو دوسروں سے تعلق رکھتی ہیں وہ اس سے زیادہ اور سخت تر ہیں مثلاً

(۱۰) رعایا ہمیشہ بادشاہ کی اطاعت میں گرفتار و مجبور ہے اور بادشاہ رعایا کے ساتھ عدل وانصاف کرنے پر مجبور ہے۔

(۱۱) اولاد ماں باپ کی خدمت پر اور ماں باپ اولاد کی محبت میں مجبور ہیں۔

(۱۲) اسی طرح خاوند کے لئے بیوی کے حقوق ادا کرنا اور بیوی کے لئے خاوند کے حقوق ادا کرنا دونوں کی مجبوری ہے۔

(۱۳) پڑوسی، پڑوسی کے حقوق کی رعایت کا پابند ہے۔

(۱۵) الغرض کوئی شخص اس طرح کی مشقت سے خالی نہیں اور ان ساری مشقتوں کے علاوہ جان کنی کی مشقت ہے۔

(۱۶) مال واولاد کی جدائی کی مشقت ہے۔

(۱۷) قبر کی تنگی، اس کا اندھیرا اور وہاں تنہا رہنے کی اور منکر نکیر کے سوال وجواب کی مشقت ہے۔

(۱۸) قیامت کے ہولناک منظر اور صور پھونکنے کی دہشت کی مشقت ہے۔

(۱۹) اعمال کے وزن وحساب کے وقت اوّلین وآخرین کے سامنے رسوا ہونے کا خوف ہے۔

(۲۰) رب العزت کے سامنے کھڑا ہونے کا خوف، اور اللہ بچائے اگر ان مشقتوں کے ساتھ دوزخ کی مصیبت بھی نصیب ہوگئی تو ہمیشہ کی ذلت وخسارہ نصیب ہوا، اور ایسے کی مصیبت ومشقت کی تو کوئی انتہا نہیں رہی۔

سو غور کرنا چاہئے جو آدمی پیدائش سے انتہاء تک ایسی مصیبتوں اور مشقتوں میں گھرا ہوا ہو اس کے لئے یہ بات بالکل زیبا نہیں دیتی کہ وہ اپنی قوت پر فخر وناز کرے یا مال خرچ کرنے پر اِترائے چنانچہ

فرماتے ہیں:

اَیَحْسَبُ اَنْ لَّنْ یَّقْدِرَ عَلَیْهِ اَحَدٌ ۝

کیا خیال رکھتا ہے وہ کہ اُس پر بس نہ چلے گا کسی کا

ان مشقتوں کے باوجود کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ اس پر کسی کو قدرت نہیں جو اس کو اچھے بُرے اعمال کا بدلہ دے سکے، حالانکہ وہ ہر لحہ اللہ کی قدرت میں بے بس و تابع ہے، بلکہ وہ تو اللہ تعالیٰ کی ضعیف مخلوق مکھی مچھر سے بھی عہدہ برآ نہیں ہوسکتا۔

چونکہ انسان کو زیادہ فخر کثرت سے مال خرچ کرنے پر تھا اور اس کا یہ دعویٰ کہ اس پر کوئی قدرت نہیں پاسکتا یہ بھی اسی اعتماد پر تھا کہ اس نے بہت مال خرچ کر کے بڑی عزت و مرتبہ حاصل کیا ہے، اور جو کثرت سے مال خرچ کرتا ہے لوگوں کی نظروں میں معزز ہو جاتا ہے اور عام طور پر اس کا مقابلہ اور سامنا کرنے سے لوگ کتراتے ہیں، لہٰذا اب اس کے اس غرور کی تردید میں فرماتے ہیں:

یَقُوْلُ اَهْلَکْتُ مَالًا لُّبَدًا ۝

کہتا ہے میں نے خرچ کر ڈالا مال ڈھیروں

مقامِ فخر جتلانے اور یہ ثابت کرنے کے لئے کہ مجھ پر کوئی غالب نہیں آسکتا یہ کہتا ہے کہ میں نے ڈھیروں مال خرچ کیا ہے، اور بہت عمدہ اور بڑے بڑے کاموں میں مَیں نے مال خرچ کیا ہے، جس کی وجہ سے میری عزت و بڑائی لوگوں کے دلوں میں قائم ہوگئی ہے، سو کسی کی جراءت نہیں کہ میرے خلاف پیش قدمی کر سکے۔

اَیَحْسَبُ اَنْ لَّمْ یَرَهٗۤ اَحَدٌ ۝

کیا خیال رکھتا ہے کہ دیکھا نہیں اُس کو کسی نے

کیا اس وقت اس کو کسی نے نہیں دیکھا جب وہ ماں کے پیٹ سے بھوکا ننگا پیدا ہوا تھا، اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا، پھر جب مال کمایا تو کسی کو معلوم نہیں کہ کس طرح کمایا؟ حلال طریقے سے یا حرام طریقے سے، اور جہاں خرچ کیا وہ مصرف صحیح تھا کہ نہیں، پھر اس خرچ میں نیت کیا تھی، اللہ کی رضا مقصود تھی یا فخر و ریا کی نیت سے خرچ کیا، سو ایسا مال جو اس کے ہاتھ میں محض عاریت ہے، کمایا بھی حرام طریقے سے،

پھر خرچ بھی غلط جگہ پر غلط نیت سے کیا ہے اس پر فخر و بڑائی کرنا کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے۔

ہاں اگر وہ اس پر فخر و بڑائی ایسے کے سامنے کرتا جو اس کی ابتداء سے، اس کی کمائی، اور باطنی نیت سے واقف نہ ہوتا تو البتہ کچھ گنجائش تھی، لیکن یہ تو اس کی کمال درجے کی بے حیائی ہے کہ اس نے زبانِ فخر رب الارباب کے سامنے کھولی جو عالم السر والخفیات ہے، جو حال و مستقبل کی خبر جاننے والا ہے۔

اور اگر وہ جہالت و کفر کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے دیکھنے کا انکار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے جواب میں فرماتے ہیں:

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ ○

بھلا ہم نے نہیں دیں اُس کو دو آنکھیں

یعنی چیزوں کے دیکھنے کے لئے کیا ہم نے اس کو دو آنکھیں نہیں دیں، اور ذرا غور کرو کہ جو دوسروں کو بینائی بخشتا ہے وہ خود دیکھنے میں کیسے کوتاہی کر سکتا ہے۔

اور اگر انسان اللہ کے دیکھنے کو تو تسلیم کرتا ہے مگر یہ کہتا ہے کہ میرے دل کی پوشیدہ نیتوں کو کوئی نہیں جان سکتا تو اس کے جواب میں فرماتے ہیں:

وَلِسَانًا وَّ شَفَتَيْنِ ○

اور زبان اور دو ہونٹ

یعنی کیا انسان کو اپنے دل کے بھیدوں کو ظاہر کرنے کے لئے زبان اور دو ہونٹ نہیں دیئے، سو جس نے دوسروں کو اپنے دلوں کے بھیدوں کو ظاہر کرنے کی طاقت و قدرت بخشی ہے اس کے لئے کیا مشکل ہے کہ وہ خود دوسروں کے بھیدوں پر مطلع ہو جائے۔

زبان کا فائدہ ظاہر ہے کہ اس کے ذریعہ انسان بات چیت کرتا ہے، اور دل میں گذرنے والے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بھی زبان ہی ہے۔

ہونٹوں کے فوائد

ہونٹوں کے بہت سے فوائد ہیں:

(۱) چوسنے کا عمل ہونٹوں کے ذریعہ ہوتا ہے، جیسے دودھ کا چوسنا، پھلوں کا چوسنا وغیرہ۔

(۲) منہ کے اندرونی حصے کے لئے گرد و غبار وغیرہ۔ سے حفاظت کرتے ہیں۔

(۳) دانتوں کو چھپاتے ہیں، اگر ہر وقت دانت کھلے رہیں تو بہت ہی بدزیب معلوم ہوں گے۔

(۴) بات کرنے میں زبان کی مدد کرتے ہیں، بہت سے حروف ہونٹوں سے ہی نکلتے ہیں جیسے باء، واؤ تو ہونٹوں کے بغیر نکلتے ہی نہیں۔

(۵) کھانا کھانے، پانی پینے، چبانے، نگلنے اور گٹھلی چلکا وغیرہ پھینکنے میں مدد دیتے ہیں۔

(۶) پھونکنے کا کام بھی انہی سے انجام پاتا ہے۔

آنکھیں دو اور زبان ایک ہونے میں حکمت اور زبان کی حفاظت کا بیان

دقیقہ شناس علماء نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دو آنکھیں اور ایک زبان عطا کر کے اس طرف اشارہ فرمایا کہ انسان دیکھنے کے مقابلے میں کم بولے، دیکھنے میں تو خیر و شر دونوں ہی نظر آئیں گے مگر بولنا اس کو صرف خیر و بھلائی کی بات ہی چاہیے، اسی لئے زبان پر دو نگہبان ہونٹوں کی صورت میں مقرر کئے ہیں تا کہ اس بات کا دھیان رہے کہ زبان کو لگام میں رکھنا چاہیے، چنانچہ حق تعالیٰ شانہ نے دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

"ما یلفظ من قولٍ الا لدیه رقیب عتید"

"انسان کوئی بات نہیں بولتا مگر ایک نگران تیار اس کے آگے رہتا ہے"

صحیح حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے اس کو چاہیے اچھی بات کہے ورنہ خاموش رہے"

سنن ترمذی میں حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے پوچھا نجات کس چیز میں ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنی زبان کو بند رکھ، گھر میں بیٹھا رہ اور اپنے گناہوں پر روتے رہو۔

سلف نے فرمایا زبان ایک مہلک اژدھا ہے اس کا سوراخ منہ ہے، اور کسی نے کیا خوب کہا ۔

إحفظ لسانك أيها الانسان

لا يلدغنك فإنه ثعبان

ترجمہ:۔ اے انسان اپنی زبان کی نگرانی کرتا رہ، کہیں تجھے کاٹ نہ لے اس لئے کہ یہ ایک اژدھا ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، جب آدمی بات کرنا چاہے تو پہلے سوچ لینا چاہئے، اور دل سے مشورہ کر لینا چاہئے، اگر خیال ہو کہ بات کرنے میں ہی سراسر مصلحت ہے اس میں دین و دنیا کی کوئی مضرت نہیں ہے تو بات کرنی چاہئے، ورنہ اگر مضرت کا شک بھی ہو تو بات کرنا صحیح نہیں ہے۔ اس سے اندازہ لگائیں کہ جس بات میں مضرت کا گمان ہو یا یقین ہو ایسی بات کے لئے کیا جواز ہو سکتا ہے؟

حدیث میں یہ بھی آتا ہے کہ ہر روز جب صبح آدمی اُٹھتا ہے تو تمام اعضاء زبان کے سامنے عاجزی، منت وزاری کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے ظالم انصاف کر ہم سب تیری اچھائی، بُرائی پر متعلق ہیں اگر تو سیدھی رہی تو ہم بھی نجات پائیں گے ورنہ تیرے کئے کی سزا میں ہم بھی گرفتار ہو جائیں گے۔

آیت میں آنکھ، زبان اور ہونٹ کی تخصیص کی ایک اور وجہ

آیت میں ان تین نعمتوں کو خاص طور پر ذکر کرنے کی ایک اور بھی وجہ ہے، اور وہ یہ کہ انسان جب پیدا ہوتا ہے تو بھوکا ہوتا ہے، اور دنیا کی سب سے پہلی چیز جس سے وہ قوت حاصل کرتا اور بھوک مٹاتا ہے وہ دودھ ہوتا ہے، اور دودھ کے پینے میں یہ تینوں اعضاء ضروری ہیں، تاکہ دودھ پلانے والی کو دیکھے پھر پستان کو ہونٹوں سے چوسے اور زبان سے دودھ کو چکھ کر حلق سے نیچے اتارے۔ پس جو شخص اپنی سب سے پہلی کمائی پر خود قادر نہیں جس پر زندگی کی بقا موقوف ہے، تو اس کے لئے اپنے دوسرے مکسوبات پر اترانا بالکل بے جا ہے، کہ وہ ہماری مدد کے بغیر کیسے کما سکتا ہے؟

اگر کافر یہ کہے کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کے ظاہر و باطن کو جانتا ہے، لیکن میں نے جس جگہ مال خرچ کیا اور جس نیت سے کیا اس میں میں معذور تھا اس لئے کہ مجھے وہی جگہ اور وہی نیت بہتر معلوم ہوئی، اس کے علاوہ بہتر جگہ اور نیت میں جانتا ہی نہیں تھا۔ اس کے جواب میں فرماتے ہیں:

وَ هَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ۝

اور دکھلا دیں اُس کو دو گھاٹیاں

یعنی خیر و شر کے دونوں راستے اس کو ہم نے دکھلا دیئے، اس کا لاعلمی اور ناسمجھی کا دعویٰ جھوٹا ہے، خیر و شر کی پہچان کے لئے اوّل تو ہم نے اس کو عقل دی، پھر انبیاء، علماء اور واعظین کے ذریعہ اس کے کان میں اچھے اور بُرے راستے کی علامات و نشانیاں پہنچائیں، اور دونوں راستوں کو واضح طور پر جدا جدا

کر کے اس کو دکھلا دیا، مگر اس نے بُرے راستے کو ہی اختیار کیا، نیک راستہ چھوڑ دیا اور اپنا مال نیک جگہ پر خرچ نہیں کیا چنانچہ فرماتے ہیں:

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ○

سو نہ دھمک سکا گھاٹی پر

یعنی کافر سے نہ ہو سکا کہ وہ سخت گھاٹی سے گذرتا، نیک راستے کی علامت میں سے ایک اس کا سخت ودشوار ہونا بھی ہے، کہ بُرا راستہ دشوار نہیں ہوتا وہ نفس کی خواہش کے مطابق ہونے کی وجہ سے آسان و دلچسپ معلوم ہوتا ہے، اسی لئے خواہشات میں اور لذتوں کے اُڑانے میں مال خرچ کرنا نہایت آسان معلوم ہوتا ہے، مشکل تو وہاں ہوتا ہے جہاں نفس کو کوئی لذت نہیں حاصل ہوتی محض اللہ کی رضا مقصود ہوتی ہے، وہاں خرچ کرنا دشوار ہوتا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

وَمَآ اَدْرٰکَ مَا الْعَقَبَةُ ○

اور تو کیا سمجھا کیا ہے وہ گھاٹی

وہ سخت گھاٹی جہاں مال خرچ کرنا نفس وطبیعت پر گراں گذرتا ہے اس کو تم کیا جانو کہ کیا ہے وہ؟

فَکُّ رَقَبَةٍ ○

چھڑانا گردن کا

گردن چھڑانے کی اقسام

وہ سخت گھاٹی گردن کا چھڑانا ہے، پھر اس کی کئی قسمیں ہیں

(۱) غلام یا لونڈی کو آزاد کرنا۔

(۲) کسی کو قصاص سے بچا لینا اس کی طرف سے خون بہا ادا کر کے۔

(۳) قرضدار کو قرض خواہوں کے ہاتھ سے چھڑانا، کہ اس کا قرض ادا کر دیا جائے۔

(۴) کسی کافر یا ظالم کے ہاتھوں گرفتار کسی قیدی کو فدیہ دے کر چھڑانا

(۵) ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا عرض کیا یا رسول اللہ! مجھے ایسا عمل

بتائیے جس کی وجہ سے میں جنت میں داخل ہو جاؤں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، غلام آزاد کر دیا گردن چھڑاؤ، اس نے عرض کیا، یارسول اللہ! کیا یہ دونوں ایک ہی چیز نہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں غلام آزاد کرنا تو یہ ہے کہ تُو اس کو آقا کی غلامی سے آزاد کردے اور گردن چھڑانا یہ ہے کہ تُو ایسے شخص کی مدد کرے جس پر کوئی تاوان ہے یا خون بہا لازم ہے۔

گردن چھڑانے میں خرچ کرنا صدقے سے افضل ہے

حضرت امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ نے "فک رقبة" کی تقدیم "اطعام مسکین" پر سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ اس مصرف پر خرچ کرنا صدقہ کے طور پر خرچ کرنے سے افضل ہے۔

بعض علماء اس کے عکس کے افضل ہونے کے قائل ہیں، یعنی صدقے میں خرچ کرنا ان کے نزدیک افضل ہے، کیونکہ صدقے کی وجہ سے ایک جان ہلاک ہونے سے بچتی ہے کہ غذاء سے ہی بدن کی صحت و بقاء ہے جب کہ غلام آزاد کرنا، یا کسی کو قید سے چھڑانا، دونوں صورتوں میں قید سے نجات دلائی جاتی ہے اور قید ایسی چیز نہیں جس سے جان جانے کا خوف ہو

اَوْ اِطْعٰمٌ فِیْ یَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَةٍ ۝

یا کھلانا بھوک کے دن میں

جیسے قحط کے زمانے میں کھانا کھلانا ہیرے موتیوں سے بھی زیادہ عزیز ہوتا ہے۔

یَّتِیْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۝

یتیم کو جو قرابت والا ہے

جیسے بھتیجا، چچازاد، خالہ زاد وغیرہ۔

یوں تو کھانا کھلانا ہر وقت عبادت ہے کہ کھانا کھانے والا بھوکا ہی ہوگا بغیر بھوک کے کوئی کھا نہیں سکتا، لہٰذا غنی وفقیر ہر شخص کھانے کے وقت محتاج ہی ہوتا ہے اور کھانا کھانے سے اس کی روح میں تازگی آجاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ اسلام کا سب سے بہتر عمل کون سا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کھانا کھلانا، ہر ایک کو سلام کرنا، راتوں کو جب لوگ سو رہے ہوں اس وقت نماز پڑھنا۔

پھر جب کھانا قحط کے زمانے میں ہو تو اس کا اجر بہت ہی بڑھ جائے گا، کیونکہ باقی دنوں میں اگر بھوک لگنے سے کسی کو تکلیف پہنچے گی تو تھوڑی دیر میں کہیں نہ کہیں کھانے کو کچھ مل جائے گا اور وہ اذیت دور ہو جانے گی جان جانے کا خوف نہیں ہے۔ مگر قحط کے زمانے میں تو جان جانے کا خوف ہے، اور پھر قحط کے زمانے میں بھی وہ لوگ جو تلاش معاش پر قادر ہیں یا جن کے والی وارث ہیں وہ ایک دو روز کی تکلیف اُٹھانے کے بعد کچھ نہ کچھ کھانے کے لئے پالیتے ہیں۔ مگر یتیم کے لئے ایسی کوئی سہولت میسر نہیں اس کی ہلاکت یقینی اور اس کی احتیاج بہت بڑھی ہوئی ہے۔ اور پھر اگر یتیم رشتہ دار بھی ہے تو اس کو کھلانے میں صدقہ بھی ہے اور صلہ رحمی بھی جو اضافی نیکی ہے۔

یہاں پر یتیم کے ساتھ قرابت داری کی قید اس لئے لگائی کہ ایسے یتیم کو کھلانے میں اخلاص زیادہ ہے، اس لئے کہ اس سے کوئی نفع متوقع نہیں سوائے آخرت کے ثواب کے، ایک تو وہ بچہ ہے وہ کیا نفع پہنچائے گا، تعریف و مدح کی بھی توقع نہیں، اور اس کو کھلاتے ہوئے کوئی دوسرا دیکھے تو وہ بھی یوں سمجھے گا کہ رشتہ داری کی وجہ سے کھلا رہا ہے لہٰذا ریا و فخر کا دروازہ بالکل بند ہے خلوص ہی خلوص ہے، (لہٰذا یہ دشوار گھاٹی ہے)

اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ؀

یا محتاج کو جو خاک میں رُل رہا ہے

یا ایسے مسکین کو کھانا کھلانا (دشوار گھاٹی سے گذرنا ہے) جو خاک آلود ہوا ہے، خاک آلود ہونے کی قید اس لئے لگائی کہ مسکین کبھی اس محتاج کو بھی کہہ دیتے ہیں کہ جس کا خرچ اس کی آمدن سے بڑھا ہوا ہو چنانچہ سورۂ کہف میں ہے:" واما السفينة فكانت لمساكين يعملون فی البحر"

لیکن یہ مسکین احتیاج و مسکنت میں اس درجے تک نہیں پہنچا ہوتا کہ اس کی جان جانے کا خوف ہو۔ لہٰذا ایسا مسکین جو خاک آلود ہو گیا ہے اس کو کھلانے میں بھی کسی دنیوی نفع کی توقع نہیں ہوتی اس پر خرچ کرنا محض اللہ کی رضا کے لئے ہوتا ہے (اس لئے یہ بھی بہت بڑا عمل ہے گویا دشوار گھاٹی سے گذرنا ہے)

مال کے خرچ کرنے کے تین مصرف خیر جو مذکور ہوئے ہیں ان تین مصارف میں بسا اوقات کافر و بدعقیدہ لوگ بھی انسانیت کی جبلی نرمی اور رحم دلی کے تقاضے کی وجہ سے خرچ کر دیتے ہیں مگر آخرت کے اعتبار سے ان کا یہ مال محض رائیگاں ہے، اس لئے ان لوگوں سے احتراز کے لئے اس خرچ کے مقبول

ہونے کے لئے ایک اور قید کا اضافہ فرماتے ہیں:

ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْ

پھر ہووے ایمان والوں میں

یعنی ان نیک اعمال کے ساتھ پھر وہ اہلِ ایمان میں سے بھی ہو، دین، شریعت اور وقت کے پیغمبر کی اس نے تصدیق کی ہو، تاکہ اس کا یہ نیک عمل آخرت میں کفر اور پیغمبر کی تکذیب کی وجہ سے برباد نہ ہو جائے۔

یہاں "ثمّ" تاخیر بیان کے لئے ہے یا تاخیر وقوع کے لئے

اگرچہ "ثم" کا لفظ مذکورہ اعمال خیر سے ایمان کی تاخیر پر دلالت کرتا ہے حالانکہ ایمان تمام طاعات کی قبولیت کے لئے شرط ہے اور شرط مشروط پر مقدم ہوتی ہے، لیکن تاخیر سے یہاں مراد بیان میں تاخیر ہے وقوع میں تاخیر مراد نہیں ہے، یہ بات اس مثال سے واضح ہوگی جیسے یوں کہتے ہیں نماز اس وقت مقبول ہوتی ہے جب ابتدائے تکبیر سے سلام تک تمام ارکان ترتیب سے ادا کئے ہوں پھر وضوء بھی کیا ہو۔ حالانکہ وضوء نماز کی شرط ہے واقع میں وہ پہلے ہوتا ہے البتہ بیان میں اس کو آخر میں ذکر کر دیا کہ بیان میں شرط کا مرتبہ مشروط کے بعد ہوتا ہے، یہاں بھی یہی بات بتانے کے لئے "ثم" کا لفظ لائے ہیں، اگر شروع میں ہی ایمان کو بھی ذکر فرما دیتے تو یہ گمان ہوتا کہ ایمان بھی "عقبہ مالی" کے ارکان میں شامل ہے حالانکہ واقعہ ایسا نہیں ہے، (تاخیرِ بیان کا حاصل یہ ہے کہ گویا یوں فرمایا کہ ان سب باتوں کے ذکر کرنے کے بعد میں یہ بھی کہتا ہوں کہ یہ اعمال کرنے والا ایماندار بھی ہونا چاہئے)

بعض علماء نے کہا ہے کہ "ثمّ" یہاں تاخیر وقوع کے لئے ہے، یعنی کفار کے اعمالِ خیر توقف میں رہتے ہیں اگر یہ لوگ آخر میں ایمان لے آئیں تو یہ اعمال قبول ہو جاتے ہیں ورنہ بے کار و رائیگاں چلے جاتے ہیں، چنانچہ صحیح حدیث میں ہے کہ حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ جو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بھتیجے تھے اُنہوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ میں نے حالتِ کفر میں بہت سے نیک اعمال کئے تھے ان کا کیا ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہارے اسلام کی وجہ سے تمہارے وہ سب اعمال مقبول ہو گئے۔

اس صورت میں مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ جس نے مذکورہ مصارف خیر میں خرچ کیا اس کے بعد

ایمان کی توفیق بھی پائی تو وہ سخت گھاٹی سے گذر گیا۔

"فلا اقتحم" کی ترکیب میں اشکال اور اس کا جواب

اس آیت میں علماء عربیت کا مشہور اشکال ہے کہ کلامِ عرب میں فعل ماضی منفی پر "لا" دو ہی صورتوں میں آتا ہے ایک دعا میں جیسے "لا بارک اللہ فی سھل" دوسرے جب ماضی کے صیغے میں تکرار ہو جیسے "فلا صدق ولا صلی" لیکن آیت میں "فلا اقتحم" نہ دعا ہے نہ اس میں صیغے کا تکرار ہے پھر اس پر "لا" کیسے آ گیا؟

جواب: یہ ہے کہ عقبہ کو جب کئی چیزوں کے ساتھ بیان کیا تو معنوی اعتبار سے ماضی میں تکرار پیدا ہو گیا گویا یوں فرمایا "فلا فک رقبة ولا اطعم فی یوم ذی مسغبة ولا کان من الذین امنوا" اور کلام میں لفظ سے زیادہ معنیٰ کا اعتبار ہوتا ہے۔

علاوہ ازیں قرآن کی لغت خود حجت و دلیل ہے (اس کی کسی بات کو قواعد کے مطابق درست ثابت کرنے کے لئے باہر سے) دلیل لانے کی ضرورت نہیں ہے (یہ ہوسکتا ہے کہ قاعدہ کلیہ نہ ہو)

عقبہ کی تفصیل بیان کرتے ہوئے جب مال خرچ کرنے کا درجۂ کمال بیان ہو چکا تو اب اس باب میں مرتبۂ تکمیل بیان فرماتے ہیں کہ تکمیل کے بغیر کمال کا کچھ اعتبار نہیں ہوتا چنانچہ فرماتے ہیں:

وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ

جو تاکید کرتے ہیں آپس میں تحمل کی

صبر کی اہمیت وفضیلت

(۱) صبر تمام نیک اخلاق کا مجموعہ ہے، قرآن میں تیس سے زائد مرتبہ اس کی تاکید آئی ہے اور حق تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو اس کا حکم دیا ہے فرمایا "فاصبر کما صبر اولوا العزم من الرسل"

(۲) صبر کی عظمت اسی سے معلوم ہو جانی چاہئے کہ قرآن میں نماز کے ساتھ جب اس کا ذکر آیا تو اس کو نماز پر مقدم کیا، فرمایا "استعینوا بالصبر والصلوٰة"

(۳) اور اللہ تعالیٰ نے اپنی رفاقت ومعیت صبر والوں کے ساتھ خاص کی ہے چنانچہ فرمایا "ان اللہ مع الصابرین" اس کے بجائے کہیں بھی "ان اللہ مع المصلین" یا "ان اللہ مع الصائمین" یا "مع المتصدقین" نہیں فرمایا۔

(۴) ہر عمل کے لئے ایک اجر مقرر کیا ہے مگر صبر کے لئے بے حساب اجر کا وعدہ فرمایا ہے ''انما یوفی الصابرون اجرھم بغیر حساب''

(۵) دین کی قیادت و امامت کو صبر کے ساتھ متعلق فرمایا ہے چنانچہ فرمایا ''وجعلنا منھم ائمة یھدون بامرنا لما صبروا''

(۶) بنی اسرائیل کو صبر کی بدولت دین و دنیا کی عزت عطا فرمائی تھی چنانچہ فرمایا ''تمت کلمة ربک الحسنیٰ علی بنی اسرائیل بما صبروا''

صبر کی حقیقت اور اس کی اقسام

اب صبر کی حقیقت کو سمجھ لینا چاہئے تا کہ یہ معلوم ہو کہ صبر کی وصیت کرنا تمام کمالات کی وصیت کرنا ہے۔

صبر کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی طمع اور نفس کی کش مکش کے وقت دین پر ثابت قدم رہے اور کش مکش سے بے پرواہ ہو جائے۔

(۱) پھر یہ استقلال و ثابت قدمی کبھی جسم سے ہوتی ہے پھر اس کی دو قسمیں ہیں (۱) دشوار عبادات کی ادائیگی میں سستی و کسل مندی نہ کرنا اور دل نہ چرانا۔ (۲) مصیبت و تکلیف کے آجانے سے ہراساں نہ ہونا اور اپنی دینی وضع کو نہ چھوڑنا۔

(۲) اور کبھی یہ ثابت قدمی و استقلال نفس کے ساتھ ہوتا ہے یعنی اگر اس کا نفس شہوت بطن (پیٹ کی خواہش) اور شہوت فرج (جنسی خواہش) کی وجہ سے نہیں بھٹکا اور دین کے خلاف اس سے کوئی حرکت سرزد نہ ہوئی تو اس کو عفت کہتے ہیں اور اس کی مخالف صفت کو فجور کہتے ہیں۔

(۳) نفس و طبیعت کی مخالف اور ناپسندیدہ باتوں پر تحمل کرنا اور انہیں استقلال سے برداشت کرنا صبر مطلق کہلاتا ہے، اور اس کی ضد کو اضطرار و بے باکی کہتے ہیں۔

(۴) مالداری و دولتمندی کی حالت میں نفس کو شریعت کے حکم کا پابند رکھنا، تکبر، فخر، بڑائی اور خود پسندی سے اپنے کو بچانا اس کو حوصلے کی وسعت کہتے ہیں، اور اس کی ضد کم حوصلگی کہلاتی ہے۔

(۵) لڑائی میں بھاگنے سے اپنے آپ کو روکنا اور سستی کرنے سے بچانا شجاعت کہلاتا ہے، اس کی ضد (مخالف صفت) نامردی اور بزدلی ہے۔

(۶) غصے کے وقت مضبوطی سے غصہ پی جانا، حلم کہلاتا ہے اور اس کی ضد (مخالف صفت) طیش ہے۔

(۷) مہموں کے سرانجام دینے میں تنگدل نہ ہونا حوصلے کی وسعت اور دل کی کشادگی ہے، اس کی ضد تنگدلی ہے۔

(۸) راز رکھنے میں بے صبری نہ کرنا کتمان کہلاتا ہے، اس کی ضد اظہار ہے۔

(۹) حقوق کی حفاظت کرنا جیسے امانت اور قرض ہے اس میں احتیاط امانت کہلاتی ہے اور اس کی ضد خیانت ہے۔

(۱۰) دنیا کی لذتوں میں رغبت نہ کرنا، ضرورت پر اکتفا کرنا اس کو زُہد وقناعت کہتے ہیں، اس کی ضد حرص ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ ایمان کے اکثر اخلاق صبر ہیں اسی لئے صحیح حدیث میں آیا ہے

"الصبر نصف الإیمان" صبر نصف ایمان ہے۔

صبر کا حکم اور اس کی کچھ مزید اقسام و درجات

حرام سے صبر کرنا فرض ہے، اور مکروہ سے مستحب ہے۔

صبر سے بڑی کوئی چیز دین میں نہیں ہے، اس لئے کہ عبادت کی بنیاد بھی صبر پر ہے، کہ عبادت شروع کرنا نفس کی مرضی کے خلاف ہے، پھر عبادت کو مکمل کرنا بھی نفس پر دشوار ہے اگر صبر نہ کیا جائے تو کوئی عبادت مکمل نہ ہو سکے، نیز دنیا مشقتوں اور مصیبتوں کا گھر ہے اگر صبر نہ ہو تو دنیا کی مصیبتیں انسان کو جزع فزع میں ہی گرفتار رکھیں، اور کبھی عبادت کے لئے فارغ نہ ہو سکے، یہاں سے صبر کو نماز پر مقدم کرنے کی وجہ بھی معلوم ہوگئی۔

صبر کے مختلف درجات ہیں، اور شریعت میں وہ ہر رنگ میں مطلوب ہے۔

(۱) وہ صبر جو دنیوی لذتوں اور بے ہودہ کاموں کے مقابلے میں مطلوب ہے یہ ہے کہ ان کی طرف میلان وتوجہ نہ کی جائے حق تعالیٰ کی طرف توجہ رہے۔

(۲) طاعات میں جو صبر مطلوب ہے وہ یہ ہے کہ نیت میں ریا نہ ہو اخلاق سے منافی باتوں سے بچنا، عبادت کو فاسد ہونے اور باطل ہونے سے بچانا، اس کے ثواب کو ضائع ہونے سے بچانا، عبادت کی ادائیگی میں سستی نہ کرنا، اس کی تمام شرائط وآداب اور اوقات کی حفاظت کرنا۔

(۳) گناہوں کے مقابلے میں جو صبر مطلوب ہے یہ ہے کہ محنت وریاضت کر کے نفس کو گناہوں

سے روکا جائے، اور ورع اختیار کیا جائے، ورع کہتے ہیں گناہ کے اسباب و وسائل سے پرہیز کرنا۔

(۴) جو صبر مصیبت میں ہوتا ہے اس کی دو قسمیں ہیں اس لئے کہ مصیبت کی دو قسمیں ہیں اوّل ایسی مصیبت و تکلیف کہ اس کا بدلہ وانتقام لینا بندے کی قدرت واختیار میں ہو، اس مصیبت پر صبر یہ ہے کہ آدمی تحمل و برداشت کرے اور بدلہ نہ لے، نہ ہاتھ سے نہ زبان سے، اس معاملے میں سلف کا یہاں تک اہتمام تھا کہ وہ ظالم پر بددعاء بھی نہیں کرتے تھے اور اس کو صبر کے خلاف سمجھتے تھے۔

چنانچہ صحیح حدیث میں ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ایک چور کو بد عا دینے لگیں جوان کا سامان چُرا کرلے گیا تھا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہہ کر منع فرایا کہ کیا تم یہ چاہتی ہو اس پر عذاب کم ہو اور تیرا اجر بھی کم ہو جائے، اس پر بددعا نہ کرو تا کہ اس پر وبال بھی سخت ہو اور تمہارے اجر میں بھی اضافہ ہو۔

(۵) دوسری مصیبت وہ ہے جس کے تدارک پر بندہ قادر نہ ہو، اس پر صبر یہ ہے کہ بندہ شکوہ شکایت نہ کرے، نہ قولاً نہ فعلاً۔

وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ۝

اور تاکید کرتے ہیں رحم کھانے کی

ایک دوسرے کو اللہ کی مخلوق پر رحم کرنے اور شفقت کرنے کی وصیت کرتے ہیں۔

مخلوق پر شفقت ورحم کی فضیلت

مخلوق پر رحم وشفقت کرنا حضرت الوہیّت کے اخلاق میں سے ہے جس پر "الرحمن الرحیم" دلالت کرتا ہے، اور نبوت کی اعلیٰ صفات میں سے بھی ہے، چنانچہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو "بالمؤمنین رؤف رحیم" فرمایا گیا۔

یہ خُلق بہت سے اخلاقِ حسنہ کا سرچشمہ ہے، عفو، کرم، لطف، اور حلم اسی خلق سے پیدا ہوتے ہیں، اور صحیح حدیث میں ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"الراحمون یرحمھم الرحمن ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء"

ترجمہ:۔ رحم کرنے والوں پر رحمٰن رحم کرتا ہے، زمین والوں پر تم رحم کرو آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔

ابو یعلیٰ طبرانی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا اللہ تعالیٰ صرف رحم کرنے والوں پر رحمت نازل کرتا ہے، صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم سے ہر شخص کے دل میں رحم ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا رحیم وہ نہیں جو اپنی جان اور اپنے رشتہ داروں پر رحم کرے، رحیم وہ ہے جو عام مسلمانوں پر مہربان ہو ان کے بڑے کو والد کے برابر اور برابر والے کو بھائی کے اور چھوٹے کو اولاد کی طرح سمجھے۔

ابن عدی نے کامل میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حق تعالیٰ شانہ فرماتے ہیں، اگر تم میری رحمت چاہتے ہو تو میری مخلوق پر رحم کرو۔

طبرانی کی روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مسلمانوں کو چاہیئے کہ آپس میں شفقت، دوستی اور حسن سلوک کے ساتھ رہیں اور ایک جسم کی مانند ہو جائیں کہ جسم کا اگر ایک حصہ تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے تو پورا بدن بے چین ہو جاتا ہے۔

طبرانی اس روایت کو نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں میں نے ایک رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا اور اس حدیث کے متعلق پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دستِ مبارک سے اشارہ کر کے فرمایا صحیح، صحیح، صحیح۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک دن ان کا ایک گورنر آیا اس نے دیکھا آپ چت لیٹے ہوئے ہیں، غریبوں کے بچے آپ کے سینے پر چڑھ رہے اور کھیل رہے ہیں، اس نے کہا یہ بات خلافت کی شان کے خلاف ہے، آپ نے اس سے پوچھا تم اپنی رعایا کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرتے ہو؟ اس نے کہا میں جب دربار میں بیٹھتا ہوں تو میرے سامنے بڑے بڑے سرداروں کو دم مارنے کی جراءت نہیں ہوتی، چہ جائیکہ کہ غریبوں کے بچے میرے پیٹ و گردن کو پھلانگتے پھریں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ سن کر فرمایا تم ہمارے کام کے نہیں ہو آج سے تم معزول ہو ہمیں ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت پر رحم و شفقت کرنے والے ہوں، ایسوں کی کوئی ضرورت نہیں جو حکومت و ریاست کی ہیبت و شوکت دکھاتے پھریں۔

بعض روایاتِ حدیث میں آیا ہے کہ میری اُمت کے ابدال کو یہ منصب اعمال کی وجہ سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ نفس کی سخاوت سینے کی صفائی اور اللہ کی مخلوق پر رحم کرنے کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے۔

عبادت مالی کی تکمیل کے لئے صبر ورحمت کی تخصیص کی وجہ

یہاں یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ عبادت مالی کی تکمیل کے باب میں ان دو وصفوں صبر ورحمت کو خاص طور پر اس لئے ذکر فرمایا کہ نیکی وخیر کے مصارف میں مال خرچ کرنا ان دو اوصاف کے بغیر متصور نہیں ہوسکتا، اس لئے کہ سب سے پہلے آدمی حرام مال سے صبر کرے گا اور نفس کو جائز لذتوں سے بھی روکے گا پھر طبعی شفقت ورحمت کی وجہ سے اس مال کو مسکینوں، یتیموں اور محتاجوں پر خرچ کرے گا تو صبر کی حیثیت یہاں موانع کو دور کرنے والے کی ہوئی اس لئے کہ لالچ مال خرچ کرنے سے روکتی ہے اور صبر کی وجہ سے وہ زائل ہوتی ہے اس طرح صبر نے خرچ کرنے کے اس مانع ورکاوٹ کو دور کیا، اور رحم وشفقت کی حیثیت وجودِ مقتضی (محرک، اور تقاضا کرنے والا) کی ہوئی اس لئے کہ یہ صفت حضرت ربوبیت کے اخلاق میں سے ہے اور ربوبیت احسان و پرورش کا تقاضا کرتی ہے۔ اور رفع مانع کا وجود مقتضی کے وجود پر مقدم ہوتا ہے اس لئے ذکر میں بھی صبر کو رحمت پر مقدم فرمایا ہے۔

مصیبت پر طبعی پریشانی خلافِ صبر نہیں

یہاں یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ اکثر جاہلوں کو قساوتِ قلبی اور صبر کے درمیان اشتباہ ہو جاتا ہے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ کی مخلوق کا مصیبت کے وقت پریشان و بے تاب ہو جانا صبر کے منافی ہے، اور اسی خیالِ فاسد کی وجہ سے ایسے موقعوں پر وہ اپنے اقرباء اور دوسرے لوگوں کی مدد واعانت کرنے سے محروم رہتے ہیں۔

اسی وہم کو دور کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہاں رحم وشفقت کی وصیت کو صبر کی وصیت کے ساتھ ملا کر ذکر فرمایا ہے تاکہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ کسی کی مصیبت پر اپنی جگہ پر ثابت قدم اور استقلال کے ساتھ رہنا وہاں پسندیدہ ہے جہاں اس ثبات کے نتیجے میں اللہ کی کسی مخلوق کو ضرر پہنچنے کا اندیشہ نہ ہو ورنہ اس بیت کے مطابق محمود نہیں ہے۔

اگر بینم کہ نابیناؤ چاہ ست
وگر خاموش بنشینم گناہ ست

اسی بارے میں عرب کے عقلا کی کیا عمدہ مثالیں ہیں کہا: "**صبرک فی مصیبتک خیر من جزعک، وجزعک فی مصیبۃ اخیک خیر من صبرک**" یعنی تیرا اپنی مصیبت پر صبر کرنا

تیری جزع فزع سے بہتر ہے، اور اپنے بھائی کی مصیبت پر تیرا جزع فزع کرنا تیرے صبر سے بہتر ہے۔

اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ الْمَیْمَنَةِ ○

وہ لوگ ہیں بڑے نصیب والے

جو لوگ اس طرح کی آپس میں وصیتیں کرتے اور اس کے مطابق عمل کرتے ہیں یہی لوگ یُمن و برکت والے ہیں۔

یُمن و برکت کے معنی ہیں کسی چیز سے بہت زیادہ نفع ہمیشہ حاصل ہوتا رہے، اور یہ لوگ بھی ایسے ہیں کہ ان کی وصیتوں کی وجہ سے لوگ قیامت تک ان پر عمل کرتے رہیں گے، فقراء، مساکین اور یتیموں پر احسان ہوتا رہے گا، اس طرح ان کی وجہ سے مخلوق کو بہت زیادہ نفع پہنچا ہے، اور ان کی وصیت کے مطابق قیامت تک جتنے احسانات ہوں گے وہ سب ان کے اعمالنامے میں لکھے جائیں گے۔

المیمنہ کی تفسیر میں دوسرا قول

بعض مفسرین نے ''میمنہ'' کا معنی سیدھی جانب سے کیا ہے، اس لئے کہ اہل عرب کے عرف میں سیدھی جانب کو مبارک و میمون سمجھا جاتا تھا چنانچہ یہی وجہ ہے کہ وہ ''شارح'' [1] کو متبرک سمجھتے تھے اور الٹی جانب کو منحوس سمجھتے تھے اسی وجہ سے وہ ''بارح'' [2] سے بدشگونی لیتے تھے۔

اور اہل نجات کو میثاق کے دن حضرت آدم علیہ السلام کی پیٹھ سے سیدھی جانب سے نکالا تھا، قیامت کے دن اعمالنامے ان کو سیدھے ہاتھ میں دیئے جائیں گے، اور جب ان کو جنت میں داخل کیا جائے گا تو اس وقت جنت عرش عظیم کی سیدھی جانب ہوگی۔

سو اس معنی کے لحاظ سے بھی اصحاب المیمنة یہی بزرگ لوگ ہیں۔

وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِاٰیٰتِنَا

اور جو منکر ہوئے ہماری آیتوں سے

جنہوں نے ہمارے احکام کا انکار کیا چاہے اُنہوں نے اپنی دنیوی فاسد اغراض، یا بتوں کی

(۱) تاج العروس میں شارح کے معنی کھیتی کی حفاظت کرنے والا لکھا ہے۔ ج ۲/۱۷۱، البتہ ''سانح'' کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ وہ شکار ہوتا تھا جو آدمی کے بائیں سے دائیں نکل جائے اسے وہ متبرک سمجھتے تھے۔ سفیر احمد

(۲) بارح وہ شکار جو دائیں سے بائیں نکل جائے: تاج العروس ج ۲ ص ۱۲۳۔ سفیر احمد

خوشنودی حاصل کرنے کے لئے غلام آزاد کئے اور گردنیں چھڑائیں اور یتیموں مسکینوں کو کھانا کھلایا ہو اور آپس میں صبر ورحم کی بھی وصیت کی ہو مگر کفر کی نحوست کی وجہ سے آخرت میں کوئی چیز ان کے کام نہیں آئے گی بلکہ:

هُمْ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ

وہ ہیں کمبختی والے

نحوست و بدبختی والے تو یہی ہیں جن کو ایک کلمۂ کفر کہنے کی وجہ سے ایسا دائمی ضرر نصیب ہوا کہ ان کی تمام نیکیاں برباد چلی گئیں۔

تمام عبادات مالیہ (جو پیچھے مذکور ہوئیں) کے مقابلے میں کفر کو ذکر کرنے سے یہ معلوم ہوا کہ کفر کے ساتھ جو عمل ملا ہوا ہو سب بیکار ورائیگاں ہے کچھ فخر کے لائق نہیں ہے۔

اور کفار جیسے بدبخت و منحوس ہیں اسی طرح میثاق کے دن حضرت آدم علیہ السلام کی پیٹھ کی بائیں طرف سے نکالے گئے، قیامت کے دن اعمالنامے ان کو بائیں ہاتھ میں دیئے جائیں گے، اور عرشِ عظیم کی بائیں طرف سے جہنم کے راستے پر جائیں گے، لہذا "مشئمة" کے معنی "بائیں" کے کئے جائیں تب بھی درست ہے۔

یہاں تک یہ بیان فرمایا کہ کافر کو کسی عمل پر فخر و بڑائی کرنا بہت بے جا ہے کیونکہ اس کی تذلیل و توہین کے لئے اس کا کفر کافی ہے، اب یہ بیان فرماتے ہیں اس کی تذلیل و توہین کے لئے اسی پر اکتفا نہیں بلکہ:

عَلَيْهِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَةٌ ۝

اُنہی کو آگ میں موند دیا ہے

ان پر ایسی آگ مسلط ہوگی کہ اس کو اوپر سے بند کردیا گیا ہوگا تا کہ نہ بھاپ باہر نکلے اور نہ باہر کی ٹھنڈی ہوا اندر آسکے کہ دونوں صورتوں میں عذاب میں کچھ تخفیف ہوسکتی ہے، مقصد یہ ہے کہ ان کو تکلیف و عذاب انتہائی درجے کا ہوگا۔ نعوذ باللہ من اهل النار

الحمدلله اولا و اخرا

مقدمہ سورۃ الشمس

تعداد آیات وکلمات وحروف اور ربط

یہ سورت مکی ہے اس میں پندرہ (۱۵) آیات، چون (۵۴) کلمات اور دو سو چھیالیس (۲۴۶) حروف ہیں۔

سورۂ بلد کے ساتھ اس کی مناسبت و ربط یہ ہے کہ سورۂ بلد میں خیر وشر کے راستوں کی راہنمائی کے متعلق فرمایا تھا "وھدینا ہ النجدین" سورۂ شمس میں بھی فجور وتقویٰ کے الہام کا ذکر ہے، دوسرے سورۂ بلد میں اصحاب میمنہ اور اصحاب مشئمہ کا ذکر ہوا تھا اِس میں بھی دو طرح کے لوگوں کا ذکر ہے ایک نفس کو پاک کرنے والے دوسرے نفس کو ذلیل کرنے والے، سو یہ دونوں مضمون قریب قریب ہیں۔

وجہ تسمیہ

اللہ کے راستے میں چلنے والے کے لئے سب سے عمدہ وافضل چیز آفتاب نبوت کا نور ہے، اس کی بدولت آدمی کی نگاہ ایسی روشن ہوتی ہے کہ وہ راہِ نجات اور راہِ ہلاکت کے درمیان تمیز کر لیتا ہے اور آفتاب نبوت کے ساتھ پوری پوری مشابہت ومناسبت انوارِ حسیہ کے عالم میں اس ظاہری آفتاب کو ہے جس کو لغت عربی میں شمس کہتے ہیں (اسی شمس کا ذکر سورت کے شروع میں ہے اس لئے اس کا نام الشمس ہوا)

دنیا وآخرت کی کھیتی کی ضروریات

اس مقام کی تشریح یہ ہے کہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے اس میں انسان کی مثال کسان کی ہے جس کو معرفتِ الٰہیہ کا بیج دے کر قویٰ واعضاء کی صورت میں تخم ریزی کے اسباب عطا کر کے اس کھیتی میں بھیجا گیا ہے، اور ہر کاشتکار کیلئے چھ چیزیں ضروری ہوتی ہیں انکے بغیر وہ کاشتکاری نہیں کر سکتا، اور وہ یہ ہیں:

(۱) سورج:۔ اس کی دھوپ وگرمی کی وجہ سے زمین میں کاشت کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے، اگر گہرائی سے غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سورج کی گرمی زمین کے لئے ایسی ہی ہے جیسے حیوانات میں حرارتِ غریزی ہوتی ہے، اس لئے کہ بیج کو جب زمین کے اندر ڈالتے ہیں تو مٹی، ہوا اور پانی کے ملنے

سے اس میں حیاتِ نباتی کی استعداد پیدا ہوتی ہے، مگر اس کو پکانے کے لئے اور اس میں سے سرانڈ اور بدبو دور کرنے کے لئے ایک اور حرارت کی ضرورت ہوتی ہے، سو اگر وہ حرارت آگ کے عنصر سے لی جاتی تو بیج جل جاتا، اس لئے حکمت الٰہیہ نے چاہا کہ سورج کی گرمی اس پر مسلط کر دی جائے تا کہ آگ کا فائدہ بھی حاصل ہو جائے اور نقصان بھی نہ ہو۔

نیز موسموں کا بدلنا، بہار وخزاں کا آنا یہ بھی سورج کی گردش کی وجہ سے ہوتا ہے اور یہ چیز بھی کھیتی کی ضروریات میں سے ہے (لہٰذا کھیتی کے لئے پہلی لازمی چیز سورج ہوا)

(۲) چاند:۔ کھیتی وزراعت کے لئے دوسری ضروری چیز چاند کا وجود ہے، فن زراعت کو جاننے والے جانتے ہیں کہ کھیتی میں دانے پڑنے، درختوں پر پھل لگنے اور فصل کو زمین سے اُبھرنے بڑھنے کے وقت زمین کے پانی کی رطوبت کافی نہیں ہوتی، اس کے لئے اوپر کی اضافی رطوبت کی ضرورت ہوتی ہے اسی رطوبت کی وجہ سے دانہ وزنی اور پھل بڑا ہوتا ہے، اور یہ رطوبت چاند کی تاثیر سے کھیتی میں پیدا ہوتی ہے۔

(۳) دن:۔ زراعت کے لئے تیسری ضروری چیز دِن کا ہونا ہے کہ یہ ہل چلانے، محنت کرنے، پانی سے کھیتی سینچنے اور دوسرے مشکل کاموں کا وقت ہے۔

(۴) رات:۔ چوتھی چیز رات کا وجود ہے اگر رات نہ آئے تو انسان اور بیل آرام نہ حاصل کر سکیں اور آٹھ پہر کی مسلسل دھوپ، پھل دار درختوں اور کھیتی کو جُھلسا کر رکھ دے، اور رات کو شبنم بھی گرتی ہے جو سرسبزی وتازگی پیدا کرتی ہے۔

(۵) آسمان:۔ پانچویں چیز آسمان ہے جہاں سے بارش برستی اور ہواؤں کا چلنا ہے جو ضرورت کے مطابق ہر وقت وہیں سے ہے۔

(۶) زمین:۔ چھٹی چیز زراعت کے لئے ضروری زمین ہے جو وسیع وکشادہ ہونے کے ساتھ ساتھ پتھریلی اور کھاری نہ ہو۔

آخرت کی کھیتی کے لئے چھ ضروریات

پس جب انسان کو آخرت کی کھیتی کیلئے دنیا میں بھیجا گیا ہے تو اسکے لئے بھی یہ چھ چیزیں لازمی ہیں۔

(۱) آفتاب:۔ اس کے لئے آفتاب نبوت ہے جس کی شعاعیں دور و نزدیک سے اس تک پہنچتی ہیں۔

(۲) چاند:۔ اس کے لئے چاند، صاحب طریقت کا نورِ ولایت ہے اور جس طرح ظاہری چاند آفتاب کا نائب و خلیفہ ہے اسی طرح نورِ ولایت بھی نورِ نبوت کا قائمقام اور اس کا خلیفہ ہے، بلکہ حقیقت میں یہ وہی نور ہے صرف دوسری کیفیت میں ہے۔

نورِ نبوت اور نورِ ولایت میں فرق

اگر دونوں کے درمیان فرق معلوم کرنے کی دلچسپی ہو تو فرق یہ ہے کہ نورِ نبوت قہر و سیاست کی آمیزش کے ساتھ ہوتا ہے اسی لئے انبیاء کرام کی حیثیت اپنی اُمت کے لئے بادشاہ کی سی ہوتی ہے جن کی طرف وہ بھیجے گئے ہیں ان سب پر اُن کی اطاعت فرض ہوتی ہے، اور مخالفت کرنے والوں کی دنیا و آخرت برباد ہوتی ہے۔ وہ معجزات قاہرہ دکھاتے اور ان پر جہاد و قتال فرض کیا جاتا ہے۔

نورِ ولایت جمال والفت، کشش و نرمی لئے ہوئے ہوتا ہے اور یہ چیزیں نبوت میں ضروری نہیں ہیں۔

آن بادۂ شعلہ گوں کہ دارد خورشید

در کاسۂ ماہ چوں شدہ شیر شود

ایک فرق یہ بھی ہے کہ ان میں ایک نور اصل ہے اور دوسرا اس کا عکس ہے، جیسے آفتاب کا نور ذاتی ہے اور چاند کا نور اس کی صفائی کی وجہ سے آفتاب کے نور کا ہی عکس ہے جو چاند نے قبول کیا ہے، اسی طرح نورِ نبوت اصل ہے اور نورِ ولایت اس کا عکس ہے۔

(۳) آخرت کی کھیتی کرنے والے سالک طریقت کے لئے ''دن'' کی جگہ اس کی ریاضت کا وقت ہے جس میں وہ محنت و مجاہدہ اور رنج و مشقت اٹھا کر نورِ نبوت اور نورِ ولایت سے استفادہ کرتا ہے۔

(۴) اس کے لئے ''رات'' کی جگہ اس کے آرام و راحت اور نفس کی ضرورتوں میں مشغول ہونے، اہل و عیال اور دیگر کے حقوق پورا کرنے کے لئے مشغولیت کا وقت ہے (یعنی ان مشاغل کا وقت اس کے لئے رات کی طرح ہے) اگر ان مشاغل کی صورت میں اس کے لئے یہ رات نہ ہوتی تو نورِ ولایت و نورِ نبوت اس کے دل پر اتنا اثر انداز ہو جاتا کہ وہ دنیا کے کسی کام کا نہ رہتا، اور انسانیت کے مرتبے سے نکل کر کہیں سے کہیں پہنچ جاتا۔

(۵) اس کے لئے آسمان کی جگہ آسمان شریعت ہے، جو بندے کے تمام اعمال، اخلاق، احوال، مقامات اور عقائد کو گھیرے ہوئے ہے (جو کوئی شریعت سے باہر ہو کر یہ کھیتی کرنے چاہے گویا آسمان سے باہر نکلنے کا ارادہ کرتا ہے جو کہ محال ہے) اسی آسمانِ شریعت سے رحمتِ الٰہی کے فیض کی بارش برستی ہے، یہیں سے جذب وشوق کی ہوائیں چلتی اور اس کو نئے نئے احوال و مراتب کی طرف جھکاتی رہتی ہیں تاکہ بندہ کمال تک پہنچ سکے۔

(۶) زمین۔ اس کی وہ استعداد ہے کہ جس قدر اس میں وسعت وفراخی اور صفائی و پاکیزگی زیادہ ہوگی اسی بقدر احوال و مقامات کا نشو ونما اس میں ہوگا۔

لیکن ان چھ امور میں سب کی اصل بنیاد اور جڑ نورِ نبوت ہے اور آفتاب اپنی روشنی کے اعتبار سے اس نور کے ساتھ پوری مناسبت رکھتا ہے اس لئے اس سورت کو سورج کے ذکر سے ہی شروع کیا اور اسی نام سے اس کا نام رکھا۔

یہ سورت سلوکِ طریقت کے لوازمات اور کمالِ معرفت کے بیان سے پُر ہے۔

تمت المقدمة والحمدلله

تفسیر سورۃ الشمس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَالشَّمۡسِ وَضُحٰهَا ۝

قسم سورج کی اور اُس کی دھوپ چڑھنے کی

فرمایا قسم کھاتا ہوں سورج کی جو اپنے وقت کے پیغمبر کے دل کی طرح (روشن) ہے، اور قسم کھاتا ہوں اس کی روشنی کی کہ اس کی روشنی نورِ نبوت کی روشنی کی مانند ہے۔

وَالۡقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا ۝

اور چاند کی جب آئے سورج کے پیچھے

اور چاند کی قسم ہے جو استاد و معلم اور طریقت کے مرشد کی طرح ہے اور پیغمبر کے مرجانے یا دور چلے

جانے کے بعد اس کا نائب اور خلیفہ ہے۔

"اِذَا تَلٰهَا" جب سورج کے پیچھے چلے، یہ پیچھے چلنے کی شرط اس لئے لائے ہیں کہ مرشد کی حرمت نورِ نبوت کی پیروی کے ساتھ مشروط ہے، کامل درجے کی اتباع و پیروی کی وجہ سے ہی مرشد کو خلافت کا منصب عطا ہوا ہے (جو مرشد اتباع سنت کا تارک ہو جائے وہ اس منصب کا اہل نہیں)

چاند پانچ طرح سے سورج کی پیروی کرتا ہے

(۱) روشنی حاصل کرنے میں۔

(۲) غروب میں، کہ سورج کے غروب ہوتے ہی چاند نمودار ہو جاتا ہے۔ یہ شروع مہینے میں چودھویں پندرہویں تک ہوتا ہے۔

(۳) طلوع میں اس کی پیروی کرنا اور یہ مہینے کے درمیان میں ہوتی ہے۔

(۴) بظاہر دیکھنے کے اعتبار سے جسامت میں، یعنی گو کہ بعض ستارے جسامت میں چاند سے بھی بڑے ہوں اور بُعدِ مسافت کی وجہ سے چھوٹے نظر آتے ہوں مگر حسنِ ظاہر کے اعتبار سے سورج کے برابر چاند کے علاوہ کوئی اور ستارہ نظر نہیں آتا۔

(۵) اس کائنات کی مصالح ان دونوں کی حرکات پر موقوف ہیں (یعنی اس سلسلے میں چاند بھی سورج کے پیچھے پیچھے ہے) بڑے بڑے کام سورج کی گردش کے ساتھ متعلق ہیں جیسے موسموں کا بدلنا، سالوں کا حساب وغیرہ، اور قمری مہینوں کے حسابات چاند سے متعلق ہیں، اسی طرح مادہ بیماریوں کا بڑھنا جیسے خارش، جاندار کی آنتوں میں رطوبت کا زیادہ ہونا، ہڈیوں میں مغز پیدا ہونا، دودھ والے جانوروں کا دودھ زیادہ ہونا، بدن میں خون کا جوش مارنا اور سمندر کے اندر مدّ و جزر کا پیدا ہونا یہ سب چاند کی روشنی کے زیادہ ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے۔

وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا ۝

اور دن کی جب اس کو روشن کرلے

یعنی میں قسم کھاتا ہوں دن کی جب وہ سورج کو روشن کرے، کہ (وہ دن) سالک کی ریاضت کے وقت کی طرح ہے۔

ہر مجاہدہ وریاضت مقدس نہیں ہے

یہاں پر بھی ایک شرط کا اضافہ کیا ہے (یعنی جب روشن کرے) اس لئے تا کہ اشارہ ہو جائے اس بات کی طرف کہ ریاضت کا وقت جبھی عظمت وحرمت حاصل کرے گا جب اس ریاضت کے نتیجے میں سالک کے دل پر نورِ نبوت کی تجلی پڑے اور حجاب اُٹھ جائے، ورنہ باطل قسم کی ریاضتیں جیسے جوگی اور دوسرے باطل مذاہب والے کرتے ہیں جن کے نتیجے میں آدمی کا دل نورِ نبوت سے روشن نہیں ہوتا اور نہ ہی درمیان سے حجاب دور ہوتا ہے سوایسی ریاضتیں کچھ عظمت وحرمت نہیں رکھتیں۔

"جَلّٰهَا" کی ضمیر کے مرجع کی تحقیق اور ایک شبہے کا ازالہ

یہاں اکثر مفسرین ایک شبہہ ذکر کرتے ہیں وہ یہ کہ سورج دن کو روشن کرتا ہے، دن سورج کو روشن نہیں کرتا لیکن آیت میں روشن کرنے کی نسبت دن کی طرف کی گئی ہے جو بظاہر خلاف واقعہ ہے اسکی کیا وجہ ہے؟

بعض نے اس شبہے کو قوی جانتے ہوئے یہ کہہ دیا کہ "جَلّٰهَا" کی ضمیر "الشمس" کی طرف نہیں لوٹتی بلکہ "زمین" کی طرف یا دنیا کی طرف لوٹتی ہے، پھر اضمار قبل الذکر کے الزام سے بچنے کے لئے اپنے بیان کردہ مرجع کے لئے کوئی قرینہ بیان کر دیا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس تکلف کی ضرورت نہیں، اس لئے کہ اس صورت میں ضمائر میں انتشار وتفریق لازم آتی ہے کہ "ضحٰها" اور "تلٰها" کی ضمیریں بلاشبہ "الشمس" کی طرف لوٹتی ہیں، دوسرے یہ بھی ہے کہ مرجع جب موجود ہو تو مقدر ماننا اچھا نہیں ہے، لہٰذا درست یہی ہے کہ ضمیر سورج کی طرف لوٹ رہی ہے، البتہ یہ اسناد جو خلاف واقع معلوم ہوتی ہے اس کی وجہ سمجھ لینی چاہئے۔

سو وجہ یہ ہے کہ وہم کی عادت ہے کہ جب وہ بار بار کسی چیز کو ایک مقررہ وقت میں دیکھتا ہے تو اس وقت کو اس چیز کا سبب سمجھنے لگتا ہے (لہٰذا وہم کے مطابق دن سورج کے روشن ہونے کا سبب ہوا اس لئے اس کی طرف نسبت کر دی گئی) اور عقلی قاعدہ بھی یہی ہے کہ اثر کا وجود مؤثر کے وجود کی دلیل ہوا کرتا ہے (چنانچہ دن سورج کا اثر ہے اس سے سورج کے وجود کا علم ہوتا ہے لہٰذا اس اعتبار سے دن سورج کو ظاہر و روشن کرتا ہے) جیسا کہ برھان اِنّی کی بحث میں یہ بات طے ہو چکی ہے، لہٰذا ان دونوں وجہوں (وہمی اور عقلی) کے لحاظ سے دن کا وقت سورج کو روشن کرتا ہے یعنی جب دن ہوتا ہے تب ہی سورج روشن ہوتا

ہے اس لئے سورج کو روشن کرنے کی نسبت دن کی طرف کردی گئی۔

(بہرحال یہ نسبت مجازاً ہے) اور اس مجاز کو اس جگہ ممثل کی حقیقت کے لحاظ سے استعمال کیا ہے، ممثل ریاضت کا وقت ہے جو نورِ نبوت کے (سالک کے دل پر) روشن ہونے کا سبب ہے اس لحاظ سے یہ حقیقت کے استعمال سے بہتر ہوا۔

اور یہ بھی احتمال ہے کہ "جَلّٰهَا" کے معنی یہ ہوں کہ اس دن (جس کی قسم کھائی ہے) بادل و گرد و غبار نہ ہو، اس صورت میں روشنی کی نسبت دن کی طرف بے تکلف درست ہو جاتی ہے۔

وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰهَا ۝

اور رات کی جب اُس کو ڈھانک لیوے

اوقات غفلت کا فائدہ وفضیلت

رات کا سورج کو چھپا لینا سالک کے اس وقت کی طرح ہے جس میں وہ آرام اور اہل وعیال کے حقوق کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور نورِ نبوت سے اس کو غفلت وحجاب ہو جاتا ہے، آخرت کی کھیتی کرنے والے اور سالک کے لئے یہ بھی ضروری ہے ورنہ دنیا کا نظام درہم برہم ہو جائے اور بہت سی وہ عبادات جو حقوق العباد سے متعلق ہیں جیسے بیماروں کی عیادت، رشتہ داروں سے ملاقات، اہلِ وعیال کے لئے کمانا اور دیگر ایسے امور ہیں ان سے آدمی محروم ہو جائے اس طرح اس کی آخرت کی کھیتی میں نقصان واقع ہو جائے۔

صحیح حدیث میں ہے ایک دن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس سے گھر تشریف لے جا رہے تھے اچانک حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ سے آمنا سامنا ہوا، حنظلہؓ پکارے حنظلہؓ منافق ہو گیا، حضرت ابوبکرؓ نے پوچھا کیا حال ہے؟ کہنے لگے میں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں ہوتا ہوں تو عالم غیب اس طرح منکشف ہوتا ہے گویا آنکھوں سے دیکھتا ہوں، جب گھر آتا ہوں بیوی بچوں کے ساتھ مشغول ہوتا ہوں تو وہ کیفیت باقی نہیں رہتی، ابوبکرؓ نے فرمایا سب کا یہی حال ہے چلو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھتے ہیں، چنانچہ دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے وہاں پہنچتے ہی حنظلہؓ پکارے حنظلہؓ منافق ہو گیا جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

کیا ماجرا ہے؟ حضرت حنظلہؓ نے سارا حال عرض کر دیا، اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اگر تم لوگ ہر وقت اسی حالت پر رہو جس پر میری مجلس میں ہوتے ہو تو تم کبھی اپنی عورتوں سے لطف اندوز نہ ہو سکو اور چلاتے ہوئے جنگلوں کی طرف بھاگ جاؤ اور فرشتے تم سے مصافحہ کریں، لیکن اے حنظلہؓ یہ حالت کسی کو ہمیشہ نہیں رہتی بلکہ کبھی یہ حالت ہوتی ہے اور کبھی غفلت ہوتی ہے" تا کہ توجہ بحق اور توجہ بخلق آپس میں ملی رہیں۔

یہیں سے یہ معلوم ہوگیا کہ غفلت و راحت کے اوقات بھی ایک لحاظ سے فضیلت رکھتے ہیں کہ آئندہ ریاضت و مجاہدہ کے لئے معین و مددگار ہوتے ہیں اور ان عبادات کے ثواب کا ذریعہ ہوتے ہیں جن کا تعلق حقوق العباد سے ہے، چنانچہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے تھے:

"إنی لأحتسب نومتی کما احتسب قومتی" "یعنی میں سونے میں بھی اسی طرح اجر و ثواب کی اُمید رکھتا ہوں جس طرح تہجد پڑھنے میں اجر کی اُمید رکھتا ہوں"

اس لئے کہ تہجد میں اگر اللہ کا حق ادا ہوتا ہے تو سونے میں نفس کا حق ادا ہوتا ہے، اور یہ دونوں حق، اللہ نے ہی واجب کئے ہیں۔

مگر وہ غفلت جو طاعت کے لئے مددگار نہ ہو اور نہ ہی شریعت کے مطابق اور اللہ کے حکم کی فرمانبرداری کی نیت سے ہو ایسی غفلت کی فضیلت نہیں، بلکہ فضیلت کیا ہوتی حرام مطلق ہے۔

یہیں سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ یہ چاروں قسمیں سورج کے متعلق ہیں اسی وجہ سے اس سورت کا نام سورج کے نام پر رکھا ہے۔

وَالسَّمَآءِ وَ مَا بَنٰهَا ۝

اور آسمان کی اور جیسا کہ اُس کو بنایا

یعنی قسم کھاتا ہوں آسمان کی اور اس حکمت الٰہی کی کہ اس نے آسمان کو ان تمام چیزوں پر محیط بنایا جو اس کے درمیان ہیں، یہی مثال شریعت کی بھی ہے کہ وہ مکلفین کے تمام اعمال اور ان کے احکام کو محیط ہے۔

آسمانِ شریعت کے بارہ بُرج

شریعت، آسمان کی طرح بارہ بُرج رکھتی ہے، یہ بُروج چار مثلثات کے ضمن میں پائے جاتے ہیں۔

پہلا مثلثہ (تین کا مجموعہ) اعتقاد کا ہے اس میں تین بُرج ہیں:

(۱) ذات وصفات کا بُرج

(۲) انبیاء، ملائکہ اور کتابوں کا بُرج

(۳) معاد کا بُرج

دوسرا مثلثہ عبادت کا ہے یہ بھی تین بُروج سے بنایا گیا ہے

(۱) بدنی عبادات کا بُرج، جیسے نماز، روزہ، ذکر تلاوت وغیرہ۔

(۲) مالی عبادات کا بُرج، جیسے زکوٰۃ، صدقات، وقف، مساجد و مدارس، خانقاہیں اور مسافر خانوں کی تعمیر وغیرہ۔

(۳) مال و بدن سے مرکب عبادات کا بُرج جیسے حج، عمرہ، جہاد، نماز عیدین۔

تیسرا مثلثہ معاملات کا ہے یہ بھی تین بُروج سے مرکب ہے

(۱) پہلے بُرج میں دو معاملے ہیں ایک حیثیت سے عبادت بھی ہیں، جیسے نکاح، والدین کی خدمت، اولاد کی پرورش اور غلام لونڈی، پڑوسی، مہمان، ساتھی وغیرہ کے حقوق کی رعایت۔

(۲) اس بُرج میں وہ معاملات ہیں جو محض معاملات ہیں عبادت کا معنی ان کے اندر نہیں پایا جاتا۔ جیسے خرید و فروخت، شرکت، رہن، اجارہ، وکالت، کفالت وغیرہ۔

(۳) تیسرے بُرج میں وہ معاملات ہیں جو من وجہِ تبرع و احسان بھی ہیں جیسے ہبہ، قرض، اقراض، مضاربت وغیرہ۔

چوتھا مثلثہ سیاست کا ہے، یہ بھی تین بُروج سے مرکب ہے۔

(۱) پہلا بُرج ان کفارات کا ہے جن میں سیاست کے معنی کے ساتھ عبادت کا معنی بھی پایا جاتا ہے جیسے قسم کا کفارہ، قتلِ نفس کا کفارہ، روزہ توڑنے کا کفارہ، حالت حیض میں جماع کا کفارہ وغیرہ۔

(۲) دوسرا بُرج ان حدود و تعزیرات کا ہے جو محض سیاست ہیں، جیسے شراب پینے کی حد، زنا کی حد، چوری کی حد، ڈاکہ زنی کی حد، گالی دینے کی تعزیر وغیرہ۔

(۳) تیسرا بُرج دیات و ضمانات کا ہے، اس میں سیاست کے ساتھ من وجہ معاملے کے معنی بھی پائے جاتے ہیں۔

آسمانِ شریعت کے ستارے

شریعتِ مطہرہ کا آسمان اپنے ستارے بھی رکھتا ہے اور وہ احکام کے دلائل ہیں، پھر ان ستاروں میں سات سیارے بھی ہیں کہ احکام کے سلسلے میں وہ گردش میں رہتے ہیں اور وہ یہ ہیں:

(۱) کتاب اللہ (۲) سنت رسول اللہ (۳) اجماع (۴) قیاس

(۵) تعامل (۶) استصحاب (۷) اباحتِ اصلیہ

باقی ستارے ثابت ہیں اپنی اپنی جگہ ٹھہرے ہوئے ہیں جیسے مصالحِ جزئیہ کہ ہر ہر فرد میں پائے جاتے ہیں۔

آسمانِ شریعت کی بارش

یہ آسمان جو شریعت سے عبارت ہے اس کو اس طرح سے بنایا گیا ہے کہ جب مکلّفین شریعت کی مرضی کے پابند ہو جائیں تو ان کے نیک اعمال اوپر قبولیت کے مقام کی طرف چڑھیں، پھر وہاں سے یہ قبولیت رحمت و ہدایت کی بارش بن کر برس پڑے، جیسے زمین سے بخارات آسمان کی طرف اُٹھتے ہیں اور واپس بارش بن کر زمین پر برستے اور اس کو سرسبز و شاداب کرتے ہیں۔

وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا ○

اور زمین کی اور جیسا کہ اُس کو پھیلایا

فرمایا قسم کھاتا ہوں زمین کی اور اس حکمت کی جس نے اس کو ایسا کشادہ و چوڑا کر کے بچھایا ہے۔ زمین کی یہ وسعت نفسِ انسانی کی استعداد کی نظیر ہے کہ وہ بھی اپنی وسعت کی وجہ سے معرفتِ الٰہیہ کی تخم ریزی کے قابل ہے، اور چونکہ عالم جس میں تعلیم میں نفس انسانی کے مشابہ کوئی نہیں جس کی قسم کھائی جاتی اس لئے اسی نفس کی قسم کھاتے ہیں:

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا ○

اور جی کی اور جیسا کہ اُس کو ٹھیک بنایا

یعنی میں قسم کھاتا ہوں اس نفس کی جس میں دو باتیں ہیں:

(۱) وہ کمال حاصل کرنے کی قابلیت رکھتا ہے۔

(۲) بالفعل اس کے اندر کمال نہیں ان دو چیزوں کی وجہ سے اسے معرفتِ الٰہی کی تخم ریزی میسر آتی ہے اور یہ انسان کے نفس کی خصوصیت ہے اس لئے کہ فرشتوں کو بالفعل کمالات حاصل ہیں۔ انہیں کمالات کے طلب کی حاجت نہیں ہوتی اور حیوانی نفس کمالات حاصل کرنے کی قابلیت ہی نہیں رکھتے اس لئے ان کے اندر معرفت کی تخم ریزی ممکن ہی نہیں۔

نفس کو نکرہ لانے میں نکتہ

اسی نکتہ کی وجہ سے نفس کو نکرہ لائے ہیں تاکہ نفس کی انواع میں سے ایک نوع پر دلالت ہو، اور دوسری قسموں کو معرفہ لائے ہیں اس لئے کہ وہ سب چیزیں (جن کی قسم کھائی گئی ہے) یک رنگی ہیں ان میں تعددِ نوعی متصور نہیں جیسے سورج، چاند، آسمان اور زمین یہ سب کلیات فردِ واحد میں منحصر ہیں، اور دن رات اگرچہ عقل کی نظر میں جدا جدا معلوم ہوتے ہیں لیکن نظرِ عرفی ان کے بار بار لوٹ کر آنے کی وجہ سے ان پر ایک ہی چیز ہونے کا حکم لگاتی ہے ان کے متعدد اور جدا جدا ہونے پر یقین نہیں رکھتی۔

”وَّمَا سَوّٰھَا“

یعنی قسم ہے اس حکمتِ الٰہی کی جس نے اس نفس کو درست بنایا اس کے مزاج کو اعتدال بخشا، قویٰ طبعیہ، حیوانیہ اور نفسانیہ دیئے تاکہ وہ تعلیم و تفہیم کے قابل ہو سکے اور اس کے اندر مشکلات پر صبر و تحمل اور ثابت قدم رہنے کی صلاحیت پیدا ہو جس کی بنیاد پر وہ اپنے اندر معرفتِ الٰہی کا بیج بو سکے۔

چھ قسموں کی تخصیص کی وجہ میں بعض مفسرین کا کلام

بعض مفسرین نے ”نفس انسانی“ کے علاوہ باقی چھ قسموں کی تخصیص کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ حق تعالیٰ کا مقصود اس جگہ نفسِ انسانی کا حال، تقویٰ و فجور کے الہام کو قبول کرنے میں اس کا مختلف ہونا اور اس کی وسعت و فراخی کو بیان کرنا ہے تاکہ وہ قوتِ علمیہ کے موافق پورے جہاں کا نمونہ بن جائے اور سارا عالم اپنے وجودِ ظلی کے ساتھ اس میں سما جائے، اور تاکہ قوتِ علمیہ کے مطابق حضرتِ ربوبیت کا خلیفہ بن کر مخلوقات میں سے ہر چیز کو اپنے مقصد میں استعمال کرے اور ہر فن و ہنر میں کمال پیدا کر کے دنیا کی ہر چیز سے بھرپور نفع اُٹھانے کا ارادہ کر سکے۔

پس کلام کی ابتداء میں اُن چھ چیزوں کی قسم کھائی ہے جو عموم و وسعت میں حضرت الوہیت کا (بلا تشبیہ) نمونہ ہیں۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے دو چیزوں کو اس جہاں میں ایسی وسعت عطا فرمائی ہے کہ اتنی وسعت کسی اور چیز کو نہیں دی، ان میں سے ایک ''زمان'' ہے اور دوسرا ''مکان'' ہے، لیکن ہر ایک کی وسعت الگ الگ رنگ رکھتی ہے۔

''مکان'' کی وسعت کا یہ حال ہے کہ آنِ واحد میں عرش سے لے کر فرش تک بے شمار مخلوقات کو اپنے گھیرے میں لے رکھا ہے اور جگہ دی ہوئی ہے اور خود ایک حال پر ثابت و قائم ہے، اور اس کے اندر جو مخلوقات ہیں وہ ثابت و قائم نہیں بلکہ گذر رہی ہیں ان کا آنا جانا لگا ہوا ہے۔ ع

یکے میرود دیگر آمد بجائے

''زمان'' کی وسعت و عموم اس انداز کا ہے کہ خود چل رہا ہے اور اس کے اندر جو چیزیں ہیں وہ ثابت و قائم ہیں، زمانہ ایک لحہ کے لئے بھی ان چیزوں کے ساتھ قرار نہیں پکڑتا مگر اس بے ثباتی کے ساتھ وہ اپنے اندر بے شمار چیزوں کو گھیرے میں لئے ہوئے ہے۔

سو عموم کی ان دونوعوں کے ذکر کی خاطر (مکان کی نوع میں سے) زمین و آسمان کی قسم کھائی جو امکنہ میں عمدہ مکان ہیں، اور (زمان کی نوع کے لئے) دن رات کی قسم کھائی جو زمانے کے اجزاء ہونے کے ساتھ ساتھ واضح امتیاز و اختلاف رکھتے اور باوجود تھوڑی مدت کے تغیر و تبدل کو قبول کرتے ہیں۔

یہاں ایک اور نوع (عموم کی) ہے جس کے نور کا فیضان عام ہے، اس کے نور کا فیض گھٹیا و شریف، غنی و فقیر، مسلمان اور کافر اور صالح و فاسق کے درمیان فرق کئے بغیر سب کو شامل ہے، اور یہ نوع افاضۂ وجود اور لوازم صور نوعیہ کے فیضان میں حضرت الوہیت کے ساتھ کمال مشابہت رکھتی ہے، سو واضح رہے کہ چاند سورج کے تذکرے کے اندر اذکیاء کے دماغ میں اسی نوع کی مہک آتی ہے۔

باقی رہی یہ بات کہ عموم کی ان تین نوعوں میں دو دو چیزوں کی قسم کیوں کھائی گئی ہے؟

تو جواب اس کا یہ ہے کہ ان چیزوں کا عموم کے لئے مفید ہونے کے ساتھ ان کا کمال و نقصان، نورانیت و ظلمانیت اور اصلیت و تبعیت میں مختلف ہونا بتلانا بھی مقصود ہے، تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ نفوسِ انسانی ان صفات میں تصرف کا عموم رکھنے کے باوجود مختلف ہیں (ان صفات میں سب یکساں نہیں

ہیں) اس واسطے ضروری ہوا کہ عموم کی ان تین قسموں میں دو دو چیزوں کو ذکر کیا جائے۔

بیان اس کا یہ ہے کہ آفتاب عالمِ انوار میں اصل ہے اور ماہتاب اس کا عکس، دن زمانے کے اجزاء میں نورانی ہے اور رات ظلمانی (اندھیری) آسمان بلند و محیط (گھیرنے والا) ہے اور زمین پست و محاط (گھری ہوئی)

اور جب نفسِ انسانی کے عموم کو ان چیزوں کے عموم پر قیاس کریں تو اس کی دورنگی بھی ظاہر ہو جائے گی چنانچہ فرماتے ہیں:

فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوٰهَا ○

پھر سمجھ دی اُس کو ڈھٹائی کی اور بچ کر چلنے کی

الہام کی حقیقت

لغت میں الہام کہتے ہیں کسی کے حلق میں کھانا اس طرح ڈالنا کہ اس آدمی کو دانت و ہونٹ نہ ہلانے پڑیں۔

قرآن کے عرف میں الہام عمل کے اس داعیہ کو کہتے ہیں جو پہلے سے کسی فکر کی پیداوار نہ ہو، اور انسانوں کے اعمالِ خیر و شر چونکہ داعیہ و ارادہ کے ہی تابع ہوتے ہیں اس لئے سر رشتہ نیک و بد کا اسی ارادے و داعیے سے بندھا ہوا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اس سر رشتہ کو اپنے دست قدرت میں رکھا ہے کسی دوسرے کو مثلاً نفس و شیطان اور مشیروں وغیرہ کے حوالے نہیں کیا، ہاں البتہ یہ چیزیں (نفس و شیطان وغیرہ) عالم غیب سے نیک یا بد داعیے کے فیضان کا سبب و معین ضرور ہوتی ہیں۔ اسی وجہ سے عتاب و ملامت کا محل بنتی ہیں، اور صحیح حدیث میں وارد ہے

"إن قلوب بنی ادم بين اصبعين من اصابع الرحمن يقلبها كيف يشاء"

بنی آدم کے قلوب اللہ تعالیٰ کی انگلیوں کے درمیان ہیں جس طرف وہ چاہتا ہے ان کو پھیرتا ہے۔

جبر کا شبہہ اور اس کا جواب

یہاں اگر کسی کو شبہہ ہو کہ جب خیر و بدی کے داعیے کا دل میں ڈالنا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوا تو انسان مجبور و بے اختیار ہوا پھر جزا و سزا کا سارا نظام، وعظ و نصیحت، ترہیب و ترغیب، پیغمبروں کا بھیجنا،

قیامت قائم کرنا، حشر و نشر، حساب کتاب یہ سب بے کار و بے فائدہ کھیل ہوا؟

جواب اس کا یہ ہے کہ جبر جب لازم آتا ہے جب انسان کا ارادہ و اختیار درمیان میں نہ ہوتا جب یہ بات ثابت ہے کہ جو کچھ کراتے ہیں آدمی کے ارادے و اختیار سے ہی کراتے ہیں تو پھر جبر کیسے لازم آیا، ہر آدمی اپنے اچھے یا بُرے کام اپنے اختیار وارادے سے کرتا ہے، اور اختیاری حرکت اور جمادات کی غیر اختیاری حرکت کے درمیان فرق ظاہر ہے جیسے پانی کا بہنا، پتھر کا پڑا رہنا وغیرہ سو جبر یہ ہے، انسان کے افعال میں جبر نہیں ہے۔

جزاء وغیرہ دینے کے لئے اختیار کا وجود کافی ہے، یہ ضروری نہیں کہ اختیار بھی بندے کے ہاتھ میں دے دیا جائے، کیونکہ جب بندے کی ذات کا خمیر و وجود ہی دوسری جگہ سے لیا گیا ہے تو اختیار کیسے اس کی ذات کا اپنا ہوسکتا ہے کہ صفت کا مرتبہ موصوف سے کمتر ہوا کرتا ہے۔

فجور کے معنی کی تحقیق

اللہ تعالیٰ نے انسان کو تین قوتیں عطا کیں ہیں۔

(۱) قوتِ عقل، اس کے ذریعہ سے انسان اچھائی اور برائی کے درمیان پہچان کرتا ہے۔

(۲) قوتِ شہوت، اس کی وجہ سے چیزوں کو خواہش کرتا اور اپنی مرغوبات ولذتوں کو حاصل کرتا ہے۔

(۳) قوتِ غضب، اس کی وجہ سے اپنے مخالف اور رکاوٹوں کو دور کرتا ہے۔

سو جب آدمی قوت شہوت وقوت غضب کو عقل کے تابع کردے عقل جس چیز کا حکم کرے یہ دونوں قوتیں وہ کریں، جس چیز سے منع کرے اس سے رُک جائیں اور اس کے ساتھ قوت عقل کو شریعت کے نور سے روشن کرے اور انبیاء کے طریقے پر چلتے ہوئے نیکی اور برائی کی پہچان کے ساتھ ان دونوں قوتوں سے کام لے تو تب اس کو تقویٰ کا مرتبہ حاصل ہوتا ہے۔

اور اگر خدانخواستہ اس کی قوتِ عقلیہ نورِ شریعت سے منور نہ ہوئی اور بدی کو اچھا اور نیکی کو بُرا سمجھا، یا قوت عقلی نور شریعت سے منور تو ہوئی مگر یہ دونوں قوتیں اس کی تابع اور اس کے حکم کے مطابق نہ چلیں بلکہ ان قوتوں نے قوت عقلی کو اپنا تابعدار بنا لیا اور جو خواہش پیدا ہوئی اسی طرف جھک گئے اور جس سے جا ہا لڑ پڑے، تو یہ ''فجور'' کا مرتبہ ہے، تو فجور کی حقیقت یہ ہوئی کہ قوت شہویہ اور غضبیہ قوتِ عقلیہ پر غالب آجائے، اور تقویٰ کی حقیقت یہ ہے کہ قوت عقلیہ کو ان دونوں قوتوں پر غالب کردیا جائے (اور

قوتِ عقلیہ شرع کے تابع ہو)

قَسم سے فراغت کے بعد اب اس مضمون کو ذکر فرماتے ہیں جس پر قَسم کھائی گئی تھی، چنانچہ فرماتے ہیں:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ٥

تحقیق مُراد کو پہنچا جس نے اُس کو سنوار لیا

نفس کے پاک کرنے کا طریقہ

نفس کے پاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ قوتِ شہوت و قوتِ غضب کو عقل کے تابع کرے اور عقل کو شریعت کا پابند و تابع کرے تا کہ روح و دل دونوں تجلّی الٰہی کے نور سے منور ہوں تب اس کا مرتبہ فرشتوں کے مرتبے سے بڑھ جائے گا اس لئے کہ فرشتوں میں قوتِ عقلیہ تو ہوتی ہے قوتِ شہویہ وغضبیہ نہیں ہوتیں، اور انسان بڑے مجاہدوں اور محنتوں کے بعد قوت شہویہ وغضبیہ کو عقل کے تابع بناتا اور عقل کو شریعت کا تابعدار و فرمانبردار بناتا ہے، یہ بات فرشتوں کو حاصل نہیں ہوسکتی۔

اسی طرح قوتِ شہویہ، غضبیہ اور عقلیہ کو بندہ جب شریعت کے تابع کر دیتا ہے تو اس کے نتیجے میں ذوق وشوق کی عجیب وغریب حالتیں اس کو نصیب ہوتی ہیں، اور دین کے دشمنوں سے اس کا مقابلہ رہتا ہے، یہ مقامات و مرتبے فرشتوں کو کہاں نصیب ہو سکتے ہیں۔

نفس کے تزکیہ اور صفائی کے لئے طریقت کے بزرگوں نے مستقل کتابیں تالیف فرمائی ہیں جیسے ''قوت القلوب'' ''إحیاء العلوم'' ''تعریف'' اور ''عوارف المعارف'' وغیرہ ہیں ان کے علاوہ بھی اس موضوع پر بہت سی کتب ہیں۔

اور اس سلسلے میں جو بات قرآن سے معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ بیس آیات میں بعض اعمال خیر پر فلاح کا لفظ بولا گیا ہے اور یہاں اس آیت میں ''فلاح'' کو ''تزکیہ'' کے ساتھ مربوط کیا ہے، لہٰذا اس اشارے کی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ اُن اعمال خیر کا بجالانا تزکیہ نفس کے لئے کافی ہے۔

حقیقت میں طریقت کے بزرگوں کی کتابیں اور رسالے وہ انہی بیس آیات کی شرح ہیں، اور اُن آیات میں سے ایک اہم آیت سورۂ بقرہ کی ابتدائی آیت ہے۔

''هدى للمتقين ٥ الذين يؤمنون بالغيب'' سے ''اُولٰئک هم المفلحون'' تک اور

سورۂ مومنون کی ابتداء "قد افلح المؤمنون" سے "هم فیها خالدون" تک۔

اسی طرح سورۂ روم، سورۂ توبہ، اور دیگر سورتوں میں یہ آیات پھیلی ہوئی ہیں۔

وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ۝

اور نامُراد ہوا جس نے اُس کو خاک میں ملا چھوڑا

یعنی جس نے نفس کو خاک میں ملایا اور گمنام کیا وہ ناکام ہوگیا، نفس کو گمنام و خاک میں ملانے کا مطلب یہ ہے کہ اس پر تجلیٔ الٰہی کا نور نہیں پڑا، اس وجہ سے کہ اس انسان نے قوت شہویہ وغضبیہ کے مقتضیات کو تابع شریعت عقل کے مقتضیات پر غالب رکھا، سو جب وہ اس نور سے محروم رہا تو اس کا درجہ حیوان سے بھی نیچے گر گیا، اس لئے کہ حیوان کو تو اس نور کے حاصل کرنے کے اسباب ہی نہیں دیئے گئے تھے اور اس نے اسباب ہونے کے باوجود اس نور کو حاصل نہیں کیا، بلکہ ان اسباب کو مغلوب کر کے ایک بھاری پردہ اپنے دل پر ڈال دیا کہ جس کا اُٹھانا دشوار ہے۔

عقل وشرع کے مقابلے میں شہوت وغضب کی حکمرانی

چونکہ عوام الناس کے نزدیک عقل وشرع کے تقاضے کے مطابق عمل کرنے کی بجائے شہوت و غضب کے مقتضیات پر عمل کرنا کوئی نقصان یا محرومی کی بات نہیں ہے بلکہ اس طرح کے کاموں پر جراءت کو وہ لائق تعریف سمجھتے ہیں کہ اس سے دنیا میں نام ونمود اور منصب ملتے ہیں، چنانچہ عقلاء نے بھی اسی وجہ سے کہا ہے۔

من راقب الناس مات حمّیً
وفاز باللذات الجسور

یعنی جس نے لوگوں کا خوف کیا وہ جل جل کر مرا اور لذتوں سے شاد کام تو دلیر ہی ہوتے ہیں۔

اور اسی بات کو بعض نے یوں بیان کیا ہے: "الرزق یخطی باب عاقل قومه و بیّت بوّا با بباب الأحمق"، یعنی رزق قوم کے عاقل کے دروازے سے چوک جاتا ہے اور دربان بن کر احمق کے دروازے پر رات گذارتا ہے۔

(تو جب شہوت وغضب کے غلبے کی برائی عام لوگوں کے ذہن میں نہیں) اس لئے ضروری ہوا کہ

"قد خاب الایۃ" کے مضمون پر بطور تمثیل وشاہد کے ایک قصہ بیان کیا جائے جس کے مضمون سے خود بخود یہ ظاہر ہو کہ عقل وشرع کو غضب وشہوت کا محکوم وتابعدار بنانے کے نتیجے میں رفتہ رفتہ دین کے انکارو تکذیب کی نوبت آجاتی ہے جو ہمیشہ کی ہلاکت وبربادی ہے، بلکہ بسا اوقات دنیا میں ہی اس روش کا نتیجہ ذلت ورسوائی ہوتی ہے، چنانچہ اب اس قصے کی طرف اشارہ فرماتے ہیں:

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰهَآ ○

جھٹلایا ثمود نے اپنی شرارت سے

یعنی قوم ثمود نے شہوت وغضب کی خواہشات کو عقل وشرع پر ترجیح دی، عقل وشرع کو ان کا تابع و محکوم بنادیا یہی سبب ہوا ان کے انکار وتکذیب کا۔

طغویٰ کے لفظ میں ایک اشکال اوراس کا جواب

"طغویٰ" کے لفظ میں ایک مشہور اشکال ہوتا ہے کہ یہ مشتق ہے "طغیان" سے لہٰذا قاعدے کے موافق "طغیا" ہونا چاہئے یاء کو واؤ سے کیوں تبدیل کردیا گیا ہے؟

علمائے صرف اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ "فعلیٰ" کی دو قسمیں ہیں، فعلیٰ اسمی، فعلیٰ صفتی، تو اسمی اور صفتی کے درمیان فرق کرنے کے لئے فعلیٰ اسمی میں یاء کو واؤ سے تبدیل کردیتے ہیں جیسے یہاں ہوا، اور فعلیٰ صفتی میں یاء کو اصلی حالت میں رہنے دیتے ہیں، چنانچہ کہا جاتا ہے "امرأۃ صدیا و خزیا" پیاسی ورسوا عورت۔

قوم ثمود کا کچھ تعارف

ثمود ایک آدمی کا نام ہے جو حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے تھا، اس کا نسب یوں ہے "ثمود بن عامر بن ارم ابن سام بن نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام" چوتھی پشت میں حضرت نوح علیہ السلام سے جا ملتا ہے۔

اس شخص کی اولاد قوم عاد کے ہلاک ہونے کے بعد شام وحجاز کے درمیان عرب علاقوں میں پھیلی، دوشہروں میں ان کی آبادی تھی، ایک حجر جو شام کے قریب تھا دوسرا وادی القریٰ جو حجاز کے قریب تھا، ان دونوں شہروں میں چھوٹی بڑی ان کی تقریباً ایک ہزار سات سو بستیاں آباد تھیں، ان کی عمارتیں سنگ

تراشی کا نمونہ تھیں، یہاں یہ کھیتی باڑی کرتے، کنویں اور تالاب کھودتے تھے، پانی اس جگہ کم تھا پھر زمین پتھریلی اس لئے کنویں اور تالاب کھودنا بہت دشوار کام ہوتا تھا مگر یہ سخت جان لوگ اس کے باوجود یہ کام کرتے، اور ان کا مال اکثر عمارتیں بنانے، کنویں و تالاب کھودنے میں خرچ ہوتا تھا، پہاڑ کھودنے کے مشغلے نے رفتہ رفتہ ان میں سنگ تراشی کے فن کی صورت اختیار کر لی، چنانچہ پتھروں، چٹانوں پر عجیب عجیب قسم کا نقش ونگار اور صورت گری کرنے لگے اور پھر انہی ہاتھ سے تراشے ہوئے منقش پتھروں کی پوجا شروع کر دی یہ رسمِ بد اُن میں اس قدر رائج ہو گئی کہ بت پرستی ان میں پھیل گئی اور اللہ تعالیٰ سے بالکل غافل و بے خبر ہو گئے۔

حضرت صالح علیہ السلام کی جدوجہد اور قوم کا ردِ عمل

تب اللہ تعالیٰ نے حضرت صالح بن عبید علیہ السلام کو ان کی طرف اپنا پیغمبر بنا کر بھیجا، حضرت صالح علیہ السلام انہی میں سے تھے بہت اچھے حسب ونسب والے، بہت خوبصورت اور بچپن سے سعادت اور عمدہ صلاحیت کی علامات ان میں نمایاں تھیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنا رسول بنایا اور ان کی طرف وحی بھیجی کہ اپنی قوم کو بت پرستی سے روکو، اور انہیں سمجھاؤ کہ یہ ساری نعمتیں جو تمہارے پاس ہیں یہ اللہ کی دی ہوئی ہیں اسی کا شکر کرو، اسی کی عبادت کرو، اس کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق ہے اور نہ مشکل کشا و کارساز، چنانچہ حضرت صالح علیہ السلام نے قوم کو اسلام کی دعوت اور احکام کی تبلیغ شروع کر دی، مگر قوم نے سرکشی اختیار کی اور اپنے ہی طریقے پر اصرار جاری رکھا اور حضرت صالح علیہ السلام بھی اپنی دعوت پر اسی طرح قائم رہے تو قوم نے ان سے معجزہ کا مطالبہ کر دیا، حضرت صالح علیہ السلام نے فرمایا اگر تمہارے مطالبے سے اللہ نے کوئی معجزہ دکھا دیا اور اس کے بعد بھی تم ایمان نہ لائے تو سب اللہ کے عذاب میں گرفتار ہو جاؤ گے، اس لئے پہلے سوچ لو، وہ لوگ نہ مانے اور اپنی ہی بات دہراتے رہے اور کہا کہ ہم سال میں فلاں تاریخ کو شہر سے باہر فلاں جگہ جمع ہوتے ہیں ہر طرح کے عمدہ لباس وزیورات سے آراستہ کر کے اپنے بتوں کو وہاں لے جاتے اور ان سے سال بھر کی حاجتیں مانگتے ہیں اور وہ ہماری سال بھر کی حاجتیں ہم کو دیتے ہیں۔

تو تم بھی چلو اور اپنے خُدا سے مانگو ہم دیکھتے ہیں کہ تمہارا خُدا تمہیں کیا دیتا ہے؟

حضرت صالح علیہ السلام نے اس بات کو قبول کر لیا اور طے شدہ دن اور جگہ میں پہنچ گئے، اپنے

ساتھ ان تھوڑے سے لوگوں کو بھی لے آئے جو آپ پر ایمان لائے تھے۔

اس میلے کے میدان میں دیکھا کہ ان لوگوں نے بتوں کو زیب و زینت سے خوب آراستہ کر کے تختوں پر رکھا ہے اور ساری قوم ان کے سامنے باادب باملاحظہ کھڑی اپنی حاجتیں مانگ رہی ہے۔

حضرت صالح علیہ السلام نے فرمایا کہ کوئی انوکھی اور عجیب چیز مانگوتا کہ ہم بھی دیکھیں کہ تمہارے یہ بت کیسی قدرت رکھتے ہیں، اُنہوں نے کہا ٹھیک ہے، اب اُنہوں نے انوکھی چیزیں مانگنی شروع کر دیں، ایسا نالہ وفریاد، اور ایسی چیخ وپکار شروع ہوئی کہ آسمان سر پر اُٹھالیا مگر ادھر ٹس سے مس نہیں، سب فریاد و فغاں بے کار و بے فائدہ، عاجز و شرمندہ ہو کر خاموش ہو گئے۔

تب حضرت صالح علیہ السلام نے فرمایا اب اگر تم کہو تو میں اپنے قادر مطلق مالک الملک ربّ سے مانگتا ہوں اس کی قدرت کو بھی دیکھو کہ وہ کس طرح اپنے بندے کی فریادرسی کرتا اور جو مانگے وہ دیتا ہے، اس موقعہ پر ان لوگوں کے ایک سردار جندع بن عمرو نے لوگوں سے کہا کہ ان سے ایسی چیز مانگنے کا مطالبہ کرو جو بالکل محال ہو تا کہ وہ اس کو پورا نہ کر سکیں اور ہمارے بتوں کی آبرو بھی باقی رہ جائے ورنہ بڑی رسوائی کا اندیشہ ہے۔ لوگوں نے کہا آپ ہی دانا، عقلمند اور ہمارے سردار ہیں، آپ ہی کوئی ایسی چیز ان سے کہیے۔

چنانچہ جندع بن عمرو نے حضرت صالح علیہ السلام سے کہا کہ یہ ہمارے میدان کے سامنے جو پہاڑ ہے اس کی پشت سے ہمارے لئے ایسی اونٹنی نکال لایئے جس کی پیشانی سیاہ اور باقی جسم سفید ہو، بال بڑے اور نرم ہوں، اس کے دس ماہ کا حمل بھی ہو اور جسامت اتنی بڑی ہو کہ دیکھنے والے کو ٹیلہ معلوم ہو، پتھر سے نکلنے کے بعد ہمارے سامنے وہ ایک بچہ جنے جو ڈیل ڈول میں ایسا ہی بڑا ہو۔

حضرت صالح علیہ السلام نے ان سے کہا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے ایسی اونٹنی اس پہاڑ سے نکال دی تو کیا تم ایمان لاؤ گے، اللہ کی نافرمانی چھوڑ دو گے، ان سب نے اقرار کیا کہ ہم ایمان لائیں گے، حضرت صالح علیہ السلام ان سے یہ قول و قرار اچھی طرح مضبوط کرنے کے بعد مسلمانوں کو لے کر اس چٹان کے قریب چلے گئے، وہاں پہنچ کر آپ نے دو رکعت نماز ادا کی، اس کے بعد دعاء میں مشغول ہو گئے، مؤمنین آپ کے پیچھے کھڑے آمین کہتے رہے، اور قوم ثمود کے تمام سردار اپنے اپنے لشکروں سمیت آپ کے اردگرد کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے، کہ دیکھئے کیا ہوتا ہے؟

چنانچہ تھوڑی دیر بعد اچانک پہاڑ سے جانور کی ایسی آواز آنے لگی جیسی آواز بچہ جننے کے وقت اس کی ہوتی ہے۔اور دیکھتے ہی دیکھتے چٹان پھٹی اور ویسی ہی اونٹنی باہر نکل آئی جیسی اُنہوں نے مانگی تھی۔ اور جنگل میں چرنے پھرنے لگی، پھر کچھ دیر بعد اس نے بھی اپنی قد وقامت کے برابر بچہ جَن دیا، یہ عجیب وغریب ماجرا دیکھ کر لوگ پکار اُٹھے کہ صالح کا معبود بڑی طاقت وقدرت والا ہے ہم اسی پر ایمان لاتے ہیں۔ چنانچہ جندع بن عمرو چھ ہزار آدمیوں کے ساتھ ایمان لایا اور آکر حضرت صالح علیہ السلام کے قدموں میں گر پڑا اور اپنی گذشتہ کوتاہیوں کی معافی مانگی۔

مگر دوسرے بہت سے سردار اب بھی نفس کی سرکشی کی وجہ سے ایمان نہ لائے بلکہ اسے جادو قرار دیا اور اپنے پیرو کاروں کو بھی ایمان لانے سے باز رکھا اور اپنے باپ دادا کے طریقے پر قائم رہنے پر اُبھارنے لگے، چنانچہ بہت سے لوگ اپنے ان سرداروں کے بہکاوے میں آکر کفریہ کلمات کہنے لگے اس طرح وہ ایمان لانے سے پھر گئے، حضرت صالح علیہ السلام نے جب ان کا یہ حال دیکھا تو بہت افسوس ہوا اور فرمایا تم لوگوں نے عہد کی خلاف ورزی کی ہے معجزہ دیکھنے کے باوجود ایمان نہیں لائے ہو، اب تمہارے بچاؤ کی صورت صرف یہ ہے کہ اس اونٹنی کا احترام کرو اس کو کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچانا، جب تک یہ اونٹنی اور اس کا بچہ موجود ہے اللہ کا عذاب رُکا رہے گا، اور اگر اس کو کوئی برائی پہنچی تو فوراً عذاب میں گرفتار ہو جاؤ گے۔

چٹان سے اونٹنی کی پیدائش میں حکمت

یہاں یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ اس معجزے میں خاص حکمت تھی، وہ قوم پتھر تراشنے، اس میں طرح طرح کے نقش ونگار اور فن کاری میں بہت مہارت رکھتی تھی ایسے میں چٹان سے زندہ اونٹنی کے نکالنے کے معجزہ کی حکمت یہ ہے کہ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تم لوگ پتھر کی کاریگری میں اگرچہ بڑی جدت طرازیاں کرتے ہو مگر ان میں تم جان نہیں ڈال سکتے، اور ہماری قدرت یہ ہے کہ پتھر سے ایسا زندہ جاندار نکال سکتے ہیں جو تمہارے ملک میں عام پایا جاتا ہے۔

کافران از بت بے جان چہ توقع دارید
بارے آن بت پرستید کہ جانے دارد

اور اس میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ چاہے تو اس کی ہدایت سے پتھروں کے

دل نرم ہو سکتے اور اس میں روح کے اوصاف پیدا ہو سکتے ہیں۔

اونٹنی کی سرگذشت

وہ اونٹنی قد و قامت کے لحاظ سے غیر معمولی بڑی تھی چنانچہ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں ثمود کے شہر حجر میں گیا وہاں اس اونٹنی کے بیٹھنے کی جگہ قدیم سے مشہور ہے، لوگ اس جگہ کو دیکھنے آتے ہیں میں بھی گیا اور اس جگہ کو ناپا تو ساٹھ گز کا احاطہ بنتا تھا۔

اس اونٹنی کی عجیب خصوصیت ایک یہ تھی کہ تمام جانور گھریلو اور جنگلی اس کو دیکھ کر بھاگ جاتے تھے، جس جنگل میں وہ چرتی تھی کوئی دوسرا جانور وہاں قدم نہیں رکھتا تھا، جس کنویں، تالاب یا ندی میں پانی پینے جاتی تو سارا پانی پی جاتی، یہی حال چرنے کا تھا جہاں منہ پھرا یا گھاس کا نام ونشان مٹ جاتا۔ شام کے وقت شہر میں آتی، تمام شہر والے اپنے اپنے برتن لاتے اور اس کا دودھ نکال کر لے جاتے، پورے شہر کو اس کا دودھ کافی ہو جاتا، ایک عرصے تک سلسلہ اسی طرح چلتا رہا لیکن لوگوں کے جانور اس کی وجہ سے چرنے، پھرنے سے گویا محروم ہو گئے، لوگوں نے تنگ آ کر حضرت صالح علیہ السلام سے شکایت کی تو آپ نے اس تنگی کا حل یہ نکالا کہ اونٹنی اور ان لوگوں کے جانوروں کے درمیان چرنے اور پانی پینے کے لئے باری مقرر کردی، کہ ایک دن اونٹنی کھلی رہے گی وہ چرے گی اور پانی پیئے گی، اور دوسرے جانوروں کو لوگ اس دن باندھ رکھیں گے، اور ایک دن ہم اس اونٹنی کو گھر میں روک رکھیں گے لوگوں کے جانور چریں پھریں اور پانی پئیں۔

یہ سلسلہ بھی ایک عرصے تک چلتا رہا مگر لوگ مال مویشی کے شوقین تھے زیادہ سے زیادہ جانور پالنا ان کا شوق تھا اس صورت میں ان کے ذوق کی تسکین نہیں ہوتی تھی، یہ باری بھی ان پر دشوار گذار رہتی تھی لیکن معاہدے کی خلاف ورزی نہیں کرتے تھے، چاہتے تھے کہ کسی طرح اس مصیبت سے جان چھوٹے تاکہ ہمارے جانور خوب فراغت سے کھائیں پئیں۔

قذار بن سالف کا ظلم اور اس کی وجہ

اسی دوران اس قوم کا ایک نہایت ہی بدکردار اور فسادی نوجوان قِذار بن سالف جو والدین کو تکلیف دینے والا اور زبان دراز قسم کا تھا وہ ایک فاحشہ عورت پر عاشق ہو گیا جس کا نام عنیترہ تھا، یہ

عورت حسن و جمال، عشوہ و ناز میں مشہور تھی، آٹھ بدمعاش اس کے خاص یار تھے جو اس کے گھر شراب و کباب میں مست ہو کر رنگ رلیاں منایا کرتے، ان میں قذار بھی شامل ہو گیا، ایک دن قِذار نے اس فاحشہ سے کہا کب تک یوں چوری چھپے یہ آشنائی رہے گی کیوں نہ ہم دونوں شادی کر لیں تاکہ پھر عمر بھر ہنسی خوشی سے گذاریں؟

اس فاحشہ کے بہت سے مویشی و جانور بھی تھے، اونٹنی کی طرف سے پہلے ہی بھُنی ہوئی بیٹھی تھی، قذار کی آرزو سن کر اس نے کہا میری بھی ایک خواہش ہے اگر تم اسکو پوری کر دو تو یہ گھر، میرے سارے غلام و باندیاں، مال مویشی اور خود میں تمہاری بن جاؤں گی، وہ یہ ہے کہ اس اونٹنی سے جان چھڑاؤ اس نے ہمارا جینا دوبھر کر دیا ہے، اس کو ٹھکانے لگا دو تو میں تمہاری ہر خواہش پوری کرنے کو تیار ہوں۔

اس بدبخت نے اس خسیس و ذلیل کام کی خاطر اتنے بڑے گناہ کے لئے آمادگی ظاہر کر دی، اور اونٹنی کے قتل کی تدبیر میں لگ گیا۔ اس نے اپنے دوستوں کو بھی اس سلسلے میں تعاون کے لئے تیار کیا اور ایک دِن طے کر کے اونٹنی کے راستے میں ایک تنگ گلی میں گھات لگا کر بیٹھ گیا، دوستوں کو بھی ادھر ادھر گھات میں بٹھا دیا، اونٹنی وقت کے مطابق چراگاہ سے واپس آئی جب اس جگہ پہنچی تو ان میں سے ایک نے تاک کر اس کو تیر مارا باقی سب تلواریں لے کر اس پر کود پڑے مگر اونٹنی زخمی ہونے کے باوجود کسی کو قریب نہیں آنے دے رہی تھی، آخر موقعہ پا کر بدبخت قِذار نے پیچھے سے اس پر حملہ کیا اور کونچیں کاٹ ڈالیں، کونچیں کٹتے ہی اونٹنی زمین پر گر پڑی، اس کے گرتے ہی سب نے تلواروں سے اس کے پُرزے پُرزے کر ڈالے۔

شہر والوں کو جب خبر ہوئی تو سب خوش ہوئے، اونٹنی کا گوشت تقسیم کیا گیا سب لوگ اس کا گوشت لے گئے، اونٹنی کے پیچھے جب اس کا بچہ وہاں پہنچا تو ماں کی یہ حالت دیکھ کر بھاگ گیا اور اسی پہاڑ کی پشت پر جا کر کھڑا ہو گیا۔

جب حضرت صالح علیہ السلام کو اس دردناک واقعے کی خبر ہوئی تو بہت افسوس کیا اور شہر والوں سے فرمایا تم لوگوں نے اللہ کے عذاب کو دعوت دی ہے، اب بھی بچاؤ کی ایک صورت ہے وہ یہ کہ سب میرے ساتھ چلو اور اس بچے کو واپس شہر میں لے آؤ، تاکہ اس کی وجہ سے اللہ کا عذاب رُک جائے لیکن بدبخت قِذار اور دوسرے کفار نے اس بات کو تسلیم نہیں کیا، تب حضرت صالح علیہ السلام مسلمانوں کو ہی

ساتھ لے کر اس بچے کی طرف گئے، جوں ہی بچے نے حضرت صالح علیہ السلام کو دیکھا تو اس نے تین مرتبہ آواز نکالی اس کے بعد پہاڑ پھٹا اور بچہ اس کے اندر چلا گیا۔

تب حضرت صالح علیہ السلام افسوس کرتے ہوئے وہاں سے واپس ہوئے اور فرما رہے تھے اے لوگو! تم پر افسوس کہ تم نے اپنی بربادی کا سامان اپنے ہاتھوں سے کیا ہے۔

اونٹنی کے قتل کے بعد قوم ثمود کا انجام

حضرت صالح علیہ السلام نے فرمایا اس بچے کے تین بار آواز نکالنے کی تعبیر یہ ہے کہ تم لوگوں کو اللہ کے عذاب سے صرف تین دن کی مہلت ہے، پہلے دن تمہارے چہرے زرد ہو جائیں گے دوسرے دن سرخ ہو جائیں گے، اور تیسرے دن سیاہ ہو جائیں گے۔

یہ واقعہ بدھ کو ہوا تھا جمعرات کو جب صبح یہ لوگ اُٹھے تو ان کے چہرے زرد ہو چکے تھے، اس وقت ان کو یقین ہو گیا کہ حضرت صالح علیہ السلام نے ان سے جو کہا تھا وہ سب سچ ہے مگر بدبختی مقدر تھی اس وقت بھی بجائے اس کے کہ توبہ کریں ان کے غیظ و غضب نے جوش مارا عقل مغلوب ہو گئی اور قِذار نے اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر قسم کھائی کہ تیسرا دن آنے سے پہلے حضرت صالح علیہ السلام کا کام تمام کرنا ہے، چنانچہ اسی ارادے سے وہ اپنے آٹھ ساتھیوں کے ساتھ حضرت صالح علیہ السلام کی مسجد کی طرف گیا، آپ اس وقت اپنی مسجد میں تھے، مسجد میں ایک درخت تھا وہ پکارا قِذار اپنے ساتھیوں کے ساتھ آپ کو قتل کرنے آرہا ہے آپ اپنے گھر تشریف لے جائیے، آپ وہاں سے اُٹھے سیدھے گھر چلے گئے اور دروازہ بند کر کے بیٹھ گئے، قِذار مسجد میں آیا جب وہاں آپ کو نہ پایا تو آپ کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا، مکان پر پہنچا تو دروازہ بند پایا، دروازہ توڑ کر اندر گھسنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ اللہ کے حکم سے فرشتے پہنچ گئے، اور ان بدبختوں کو ایسے تھپڑ مارے کہ وہ ادھر ادھر جا کر ٹکرائے، وہاں سے بھاگے، بھاگتے ہوئے ہی کوئی دیواروں سے ٹکرا کر کوئی گر کر سب مر گئے۔

دوسرے دن شہر والے اُٹھے تو ان کے چہرے سُرخ ہو چکے تھے، قِذار کے وارثوں نے اس کی تلاش کی تو اس کی لاش حضرت صالح علیہ السلام کے گھر کے قریب پڑی ہوئی ملی اور باقیوں کی لاشیں بھی وہیں پڑی ہوئی تھیں۔ یہ صورتحال لوگوں نے اپنے کافر سرداروں سے بیان کی تو وہ سردار سارا شہر لے کر

حضرت صالح علیہ السلام کے مکان پر چڑھ دوڑے، گھر کا محاصرہ کرلیا، اور یہ مطالبہ کر رہے تھے کہ صالح نے اپنی اونٹنی کے بدلے ہمارے نو آدمی قتل کرڈالے ہیں ہم اپنے آدمیوں کے بدلے میں صالح کو اس کے گھر والوں سمیت قتل کریں گے، حضرت صالح علیہ السلام ان سے کہہ رہے تھے کہ ہم نے انکو نہیں مارا وہ ہمارے گھر پر حملہ آور ہوئے غیب سے ان کو سزا دی گئی اس میں ہمارا کیا قصور ہے، یہی سوال و جواب کا سلسلہ چل رہا تھا کہ حضرت جندع بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ شہر کے سردار (حضرت صالح علیہ السلام کے صحابی) اپنے لشکر کے ساتھ جو سب مسلمان تھے حضرت صالح علیہ السلام کی مدد کے لئے پہنچ گئے، بات زبردست مقابلے ومعرکے تک پہنچ گئی تب چند آدمی بیچ میں پڑے اور اُنہوں نے اس پر مصالحت کروائی کہ حضرت صالح علیہ السلام یہ شہر چھوڑ کر چلے جائیں۔

حضرت صالح علیہ السلام نے اس کو غنیمت سمجھا اور جندع بن عمروؓ سمیت تمام مسلمانوں کو لے کر شہر سے باہر چلے گئے۔

تیسرا دن سنیچر کا تھا جب شہر کے لوگ صبح اُٹھے تو سب کے چہرے سیاہ ہو چکے تھے، اب ان کو بہت تشویش ہوئی کہ کیا ہونے والا ہے، پھر سب نے یہ طے کیا کہ جب اللہ کا عذاب آئے تو سب چٹانوں کو تراش کر بنائے گئے مکانوں میں گھس جائیں وہ بہت مضبوط ہیں ان کے اندر ہم محفوظ ہو جائیں گے، ان کا خیال یہ تھا کہ عذاب آسمان سے پانی، یا پتھر کی بارش کی صورت میں ہوگا یا زلزلہ آئے گا ہر صورت میں وہ سنگین مکانات محفوظ ہیں، لیکن وہ اس بات کو بھول گئے کہ اللہ کے غضب سے کوئی چیز نہیں بچا سکتی۔

چنانچہ جمعرات کے دن صبح کے وقت حضرت جبرئیل امین زمین و آسمان کے درمیان ایک ہیبت ناک صورت میں ظاہر ہوئے اور ایسی سخت اور خوفناک آواز نکالی کہ زمین پر زلزلہ برپا ہو گیا، ہوائیں آندھیوں کی شکل میں موجزن ہو گئیں، سب شہر والے خوفزدہ ہو کر اپنے انہی سنگین مکانوں میں جا گھسے، پھر تھوڑی دیر بعد جبرئیل نے پہلے سے زیادہ سخت چیخ ماری کہ سب کے پتے پھٹ گئے اور منہ کے بل زمین پر گر کر جہنم واصل ہو گئے۔ العیاذ باللہ

حضرت صالح علیہ السلام نے شہر والوں کے متعلق تحقیق کے بعد مسلمانوں سے فرمایا یہ شہر اب رہنے کے لائق نہیں رہا اس میں اللہ کا غضب نازل ہو چکا ہے، اس کو چھوڑو، احرام باندھو اور حرم مکہ کی طرف چلو وہیں رہائش اختیار کرو، چنانچہ سب مسلمان حضرت صالح علیہ السلام کے فرمان کے مطابق یہیں آ کر رہ

پڑے اور دارین کی فلاح پائی۔

"اللھم ارزقنا اتباع نبیک محمد صلی اللہ علیہ وسلم"

عذاب کی جگہ سے گذرنے کا ادب

صحیح حدیث میں ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک کے سفر کے دوران مقام حجر پر پہنچے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے فرمایا یہاں کوئی ٹھہرے نہ کوئی پانی پیئے، یہاں سے روتے ہوئے گذرو اس لئے کہ یہ ایسی جگہ ہے جہاں اللہ کا عذاب نازل ہوا تھا اور کفار کی روحیں آج تک اس شہر میں عذاب الٰہی میں گرفتار ہیں۔

ثمود کے ایک باقی ماندہ شخص کا واقعہ

یہ بھی حدیث میں آتا ہے کہ قوم ثمود تمام ہلاک ہوگئی تھی صرف ایک آدمی جس کا نام "ابورغال" تھا وہ کسی کام سے مکہ معظمہ گیا ہوا تھا وہ بچ گیا تھا، لیکن جب تک وہ حرم کی حدود کے اندر رہا وہ بچا رہا جوں ہی حرم کی حدود سے اس نے قدم باہر رکھا تو اسی عذاب میں وہ بھی پکڑا گیا، طائف کے راستے میں اس کی قبر ہے۔

چنانچہ طائف کی مہم کے سفر کے دوران نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب اس کی قبر پر پہنچے تو وہاں کے لوگوں کی یہ عادت دیکھی کہ جب اس کی قبر کے پاس آتے تو اس کو سنگسار کرتے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے پوچھا جانتے ہو یہ کس کی قبر ہے، صحابہؓ نے لاعلمی ظاہر کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آدمی کا قصہ بیان فرمایا، اور فرمایا میری اس بات کے سچ ہونے کی نشانی یہ ہے کہ اس آدمی کی سونے کی چھڑی بھی اس کے ساتھ دفن کی گئی ہے، کوئی چاہے تو نکال کر دیکھ سکتا ہے، صحابہؓ نے اس کی قبر کھودی تو واقعی اندر سے سونے کی چھڑی نکل آئی، اور اس کی قبر کو دوبارہ بند کردیا۔

یہ تھا قوم ثمود کا قصہ جو بیان ہوا یہاں اس سورت میں حسب ضرورت مختصر بیان کیا گیا ہے دوسری سورتوں میں اس سے زیادہ اس کی تفصیلات آئی ہیں۔

قومِ ثمود نے غضب و شہوت کو عقل و شرع پر حکمران بنایا جس کی وجہ سے انہوں نے پیغمبر کی تکذیب و انکار کیا اور برباد ہوئے۔

اِذِ انۢبَعَثَ اَشۡقٰهَا ۝

جب اُٹھ کھڑا ہوا اُن میں کا بڑا بد بخت

یعنی جب اس قوم کا بد بخت قِدار بن سالف اِتراتا ہوا اُٹھا اور عقل و شرع پر اپنی شہوت و غضب کو ترجیح دیتے ہوئے اونٹنی کی کونچیں کاٹیں اور حضرت صالح علیہ السلام کے قتل کے لئے بھی آمادہ ہوا۔

فَقَالَ لَهُمۡ رَسُوۡلُ اللّٰهِ

پھر کہا اُن کو اللہ کے رسول نے

رسول اللہ سے مراد حضرت صالح علیہ السلام ہیں، نام کی بجائے رسول اللہ کہنے میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام نے ان سے جو کچھ کہا اپنی طرف سے نہیں کہا تھا اللہ کی طرف سے کہا تھا، اس لئے کہ رسول و قاصد کی بات اسی کی ہوتی ہے جس کی طرف سے وہ بھیجا گیا ہوتا ہے، تو گویا رسول کا حکم مالک کا حکم ہے، اگر حضرت صالح علیہ السلام کا نام ذکر کیا جاتا تو یہ فائدہ سمجھ میں نہ آتا۔

نَاقَةَ اللّٰهِ

خبردار ہو اللہ کی اونٹنی سے

یعنی اللہ کی اونٹنی کو چھوڑ دو، اسے مت ہانکو، جہاں چاہے اسے چرنے پھرنے دو، جو پانی چاہے پینے دو، اس کو کوئی تکلیف نہ پہنچاؤ اور اس کی ہلاکت کے درپے نہ رہو، اس لئے کہ اتنی بات کو تو ایک گنوار اور جاہل کسان بھی سمجھتا ہے کہ کسی بڑے سردار یا حاکم کے جانوروں کو چارے، پانی سے نہیں ہانکنا چاہئے ورنہ وہ اپنی طاقت و قوت کے ذریعہ سخت انتقام لے سکتا ہے، تو اللہ تعالیٰ جو تمام حاکموں کا حاکم اور ہر طاقت کا سرچشمہ ہے اس کے جانور کو اگر بلاوجہ تکلیف پہنچائی جائے تو وہ کیوں سزا نہ دے سکے گا، لہٰذا اس کے جانور کو اذیت دینے سے زیادہ ڈرنا چاہئے، لیکن اس کی بجائے گنواروں کی عقل کے برابر بھی نہ سمجھنا انتہائی درجے کی بے وقوفی ہے، اور یہ حماقت کی ساری مصیبت عقل پر شہوت کو غالب کرنے سے سر پر پڑتی ہے۔

اونٹنی کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنے کی وجہ

اونٹنی کی نسبت اللہ کی طرف اس وجہ سے ہوئی کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کی مِلک میں وہ نہیں تھی، اور

یہ وجہ بھی ہے کہ بغیر ماں باپ کے واسطے کے پتھر سے پیدا ہوئی اس میں اللہ تعالیٰ کی بڑی قدرت کا ظہور تھا، اور یہ قیامت قائم ہونے اور مُردوں کے اپنی قبروں سے اُٹھنے پر زندہ دلیل تھی، ان بہت سی باتوں کی وجہ سے اس کو ایک بلند مقام و مرتبہ حاصل ہوا جو دوسرے جانوروں کو حاصل نہیں اس لئے اس کے اس مرتبے کی بلندی کی وجہ سے اس کو اللہ کی اونٹنی قرار دیا جیسے بیت اللہ کو جو مقام حاصل ہے وہ دنیا کے کسی اور گھر کو حاصل نہیں تو اس کی تعظیم کے لئے اسے بیت اللہ کہا جاتا ہے۔

وَ سُقْيٰهَا ○

اور اُس کی پانی پینے کی باری سے

جو پانی پینے کی باری اس کے لئے مقرر کی ہے وہ اسی کے لئے رہنے دو اس میں اپنے جانوروں کو شریک نہ کرو، اس لئے کہ تم نے باری کی تقسیم کا عہد کیا ہوا ہے اور عہد و پیمان کو توڑنا ہر دین و شریعت میں حرام ہے اور شہوت و غضب کو عقل پر غالب کر کے عہد توڑنا کمال بے دینی ہے۔

فَكَذَّبُوْهُ

پھر اُنہوں نے جھٹلایا (اس کو)

ساری قوم نے حضرت صالح علیہ السلام کو جھٹلایا اور حضرت صالح علیہ السلام کی نصیحت اور سمجھانے کو جو اس آیت کا مضمون تھا "**لا تمسوها بسوء فيأخذكم عذاب اليم**" تسلیم نہیں کیا۔

فَعَقَرُوْهَا ۵

پھر پاؤں کاٹ ڈالے اُس کے

اگر چہ اونٹنی کی کونچیں قذار بن سالف نے اپنے آٹھ ساتھیوں کے ہمراہ کاٹی تھیں، مگر قوم کی مرضی بھی یہی تھی اور وہ اس پر خوش ہوئی تھی اس لئے یہاں کونچیں کاٹنے کی نسبت ان سب کی طرف کر دی گئی اسی لئے کوئی ایک شخص جب ایک گروہ کے مشورے و تدبیر سے کوئی کام کرتا ہے تو اس شعر کے مطابق وہ کام اس پورے گروہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔

چو از قومے یکے بیدانشی کرد
نہ کہ را منزلت ماند نہ مہ را

اور سورۂ قمر میں جو فرمایا ہے "تعاطیٰ فعقر" تو وہ نفس فعل کے اعتبار سے ہے (مباشرۂ نفس فعل قذار کا ہی تھا ساری قوم کا نہیں تھا لہٰذا اس اعتبار سے سورۂ قمر میں عقر کی نسبت اس کی طرف کی گئی) لہٰذا دونوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ

پھر اُلٹ مارا اُن پر اُن کے رب نے بسبب اُن کے گناہوں کے

اللہ تعالیٰ نے ان کو قوتِ غضبیہ وشہویہ اس لئے عطا کی تھی کہ اس کو عقل کا تابع رکھیں، اور عقل اس لئے دی تھی کہ اس کو شریعت کے تابع رکھ کر کام لیں، لیکن اُنہوں نے اس کا الٹ کیا کہ شریعت وعقل کو غضب وشہوت کے تابع کر دیا ان کے اسی گناہ کی وجہ سے اللہ نے ان پر زمانے کو الٹ دیا، گناہ حکمت الٰہی کی ترتیب کو اُلٹنے اور اس کی ضد پر عمل کرنے کا نام ہے جیسے کوئی آدمی اپنے غلام کو تلوار دے کر حکم دے جا کر میرے دشمن کو قتل کر آؤ، وہ جا کر اس کے بیٹوں کو قتل کر دے۔

فَسَوّٰىهَا ۝

پھر برابر کر دیا سب کو

سب کو مٹی میں اسلئے ملا دیا کہ وہ سب دل سے اونٹنی کو قتل کرنے میں شریک تھے (اسلئے سب مجرم تھے)

حدیث میں آتا ہے اگر ایک شخص گناہ کی مجلس میں ہوتے ہوئے اس کو دل سے بُرا جان رہا ہو اور اس سے سخت بیزار ہو (اور اس کے روکنے کی طاقت نہ رکھتا ہو) تو اس گناہ کی بُرائی سے وہ شخص محفوظ ہے لیکن ایک آدمی اس مجلس سے دور ہو اور دل سے اس گناہ کو اچھا جان رہا ہو اور اس پر راضی ہو تو وہ ایسا ہے جیسا اس مجلس میں شریک ہے۔

وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا ۝

اور نہیں ڈرتا پیچھا کرنے سے

اللہ تعالیٰ انجام سے نہیں ڈرتا، اس لئے کہ انجام سے تو وہ ڈرے جس کو یہ معلوم نہ ہو کہ انجام کیا ہوگا اچھا یا بُرا، یا وہ ڈرے کہ انجام کا سنبھالنا اس کے لئے مشکل ہو کہ کوئی خرابی یا مفسدہ پیدا ہو جائے تو اس کا تدارک نہ کر سکے، سو اللہ تعالیٰ نقص وعیب کی ان ساری باتوں سے پاک ہے، وہ علاّم الغیوب بھی ہے

اور لامحدود طاقت وقدرت کا مالک بھی اور بے انتہاء غنی و بے نیازی بھی رکھتا ہے، اس کو کوئی پرواہ نہیں کہ مخلوق میں سے ایک فرقہ اگر کم ہو گیا تو ہو جائے، اس کو اس پر کوئی افسوس نہیں کہ مدتوں جن لوگوں کی پرورش کی اور جس مقصد کے لئے پیدا کیا وہ سب کچھ بے کار گیا۔ ہرگز نہیں اس کے ہاں کسی بات پر پچھتاوا نہیں ہے۔

قذار بن سالف اور حضرت علیؓ کے قاتل کے درمیان مناسبت اور ان دونوں کا سب سے بڑا بد بخت ہونے کی وجہ

اب یہاں پر یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ ایک صحیح حدیث جو مسند احمد اور دیگر معتبر کتابوں میں آتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی بار حضرت علیؓ سے فرمایا کیا تمہیں معلوم ہے کہ پہلی اُمتوں میں سب سے بڑا بد بخت کون ہوا اور اس اُمت میں سب سے بڑا بد بخت کون ہوگا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا نہیں معلوم، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پہلی اُمتوں میں تو سب سے بڑا بد بخت وہ شخص ہے جس نے اللہ تعالیٰ کی اونٹنی کی کونچیں کاٹیں، اور اس اُمت کا سب سے بڑا بد بخت وہ شخص ہوگا جو تیرے سر پر تلوار مار کر تیری ڈاڑھی کو رنگین کرے گا اور اسی ضرب سے تُو شہید ہوگا۔

تو قذار بن سالف اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قاتل کے سب سے بڑا بد بخت ہونے کی وجہ معلوم ہونی چاہیئے، سو یہ موقوف ہے چند مقدمات کی تمہید پر۔

پہلا مقدمہ:۔ شہوتوں میں سب سے ذلیل وخسیس اور بدتر شہوت فرج کی شہوت ہے، اس لئے کہ اس شہوت کے وقت آدمی جانوروں کی حرکات کرنے لگتا ہے اور عقل سے بہت دور ہو جاتا ہے، اور اس کا محل بھی گندگی وغلاظت کی جگہ ہے، یہ بھی ہے کہ اس شہوت کیلئے ستر کا کھلنا ضروری ہے، حالانکہ انسان فطری طور پر ستر کو چھپاتا اور محفل میں کھل کر اس کا ذکر نہیں کرتا، ضرورت ہو تو اشارے کنائے سے کام لیتا ہے۔

دوسرا مقدمہ:۔ شہوت وخواہش کوئی سی بھی ہو خواہ جنسی خواہش ہو یا اس کا تعلق کھانے پینے، پہننے اور سیر وتفریح، زیب وزینت، گانے بجانے کے سننے یا عطر وخوشبویات کے سونگھنے لگانے سے ہو یہ سب غیرت وغضب سے کمتر وخسیس خواہش سمجھی جاتی ہیں، چنانچہ عرف میں ان خواہشات سے مغلوب آدمی

کو اس آدمی کے مقابلے میں ذلیل و کمتر سمجھا جاتا ہے جو غیرت و غضب سے مغلوب ہو، جیسے عیاش بادشاہ کو ظالم و سفاک بادشاہ کے مقابلے میں ذلیل و گھٹیا سمجھا جاتا ہے۔

راز اس کا یہ ہے کہ قوتِ غصبیہ قہر و غلبہ اور سیاست کا باعث ہے جبکہ دوسری نفسانی شہوات، تملق و خوشامد اور چاپلوسی کا باعث ہوتی ہیں، اور سب لوگوں کے نزدیک قوتِ فاعلیہ بہتر و پسندیدہ ہوتی ہے قوتِ منفعلہ کے مقابلے میں کہ پہلی غالب ہوتی ہے دوسری مغلوب (و متاثر)

تیسرا مقدمہ:۔ شہوت و غضب کی وجہ سے جب حقوق واجبہ تلف ہونے لگیں تو ایسا آدمی لوگوں کی نظروں میں معیوب و مطعون ہو جاتا ہے پھر جس قدر تلف ہونے والے حقوق عظیم ہوں گے اسی مناسبت سے اس پر طعن و تشنیع اور ملامت بھی زیادہ ہوگی۔

اب پہلا بد بخت تو وہ آدمی ہے جو غضب و شہوت کا شکار ہو کر اپنے نفس کے حق کو ضائع کرے، اس سے بڑھ کر بد بخت وہ ہے جو اس وجہ سے کسی دوسرے کا حق تلف کرے، اور ان دونوں سے بڑھ کر بد بخت وہ ہے جو شہوت کی لذتوں اور غضب کا غلام بن کر دوسرے بہت سے لوگوں کے حقوق تلف کرے، پھر حقوق بھی مختلف قسم کے ہیں، جیسے دنیا کا حق ہے اسکی تلافی آسان ہے مگر آخرت کے حق کی تلافی بہت مشکل ہے،

چوتھا مقدمہ:۔ یہ ہے کہ آدمی پر تین قسم کے بڑے حقوق ہیں۔

(۱) پہلا حق اللہ تعالیٰ کا ہے وہی انسان کو پیدا کرنے والا، نعمتیں عطا کرنے والا، اور بندے کے سارے کام درست کرنے والا ہے، کسی وقت بھی بندہ اس کے احسان سے باہر نہیں ہوسکتا، ہر حال اور ہر کام میں بندہ اس کا محتاج ہے، اس لئے اس کے حق کے مقابلے میں کسی دوسرے کا حق نہیں ہوسکتا۔

(۲) دوسرا حق انسان پر اپنی قوم و برادری کا ہے، کہ زندگی موت میں اپنی قوم کی مدد کا محتاج ہے۔

(۳) انسان پر تیسرا حق اپنے نفس کا ہے، یہ ظاہر ہے اس کے بیان کی ضرورت نہیں ہے۔

پس تمام بد بختوں میں سب سے بڑا بد بخت وہ شخص ہے جو ان تینوں طرح کے حقوق کو ایک ذلیل و خسیس شہوت کی وجہ سے ضائع کرے اور تلف کرے، سو یہ صفت پہلی اُمتوں میں قِدار بن سالف کے اندر تھی اس نے اس خسیس و ذلیل خواہش کی وجہ سے ان تینوں حقوق کو پامال کیا، اپنے نفس کے حق کو تلف کیا کہ کافر مرا اور دوزخ کا ایندھن بن کر برباد ہوا، اپنی قوم کا حق پامال کیا کہ اسی کی وجہ سے ساری

قوم اللہ کے عذاب میں گرفتار ہو کر ہلاک ہوئی، اور اللہ تعالیٰ کے حق کو تلف کیا اس طرح کہ وہ اونٹنی جو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب تھی، اس کی طرف سے ہدایت کا ذریعہ اور اس کی رحمت و فضل کے نزول کا سبب اور بیت اللہ کی طرح عظمت رکھتی تھی اس کو قتل کر ڈالا۔

اور اس اُمت میں اس وصف کا مالک عبدالرحمٰن بن ملجم حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قاتل ہے۔

توضیح المقام

اس مقام کی توضیح و تشریح یہ ہے کہ جس طرح وہ اونٹنی حضرت صالح علیہ السلام کے کمال کا نمونہ، ان کی نبوت کی حقانیت پر سچا گواہ تھی اور قومِ ثمود کی ہدایت کے لئے اللہ کی جو عنایت ان کی طرف متوجہ ہوئی اور حضرت صالح علیہ السلام کو رسالت کا مرتبہ عطا فرما کر ان کی طرف مبعوث فرمایا تھا وہی ہدایت ان لوگوں کے سوال کی وجہ سے ناقہ کی شکل میں رونما ہوئی، یہاں تک کہ اس کی تعظیم و حقوق کی ادائیگی گویا حضرت صالح علیہ السلام کی شریعت کو قبول کرنا ٹھہرا، اور عذاب سے بچنے کے لئے بھی اس کی رعایت و تعظیم دین قبول کرنے کے قائمقام ہوئی (یعنی جس طرح اللہ کے عذاب سے بچنے کی صورت یہ تھی کہ حضرت صالح علیہ السلام کے دین کو قبول کرلیا جائے اسی طرح دوسری صورت یہ تھی کہ کم از کم اونٹنی کی رعایت و تعظیم کی جائے) گویا حضرت صالح علیہ السلام کی ولایت کا نور اس طریقے سے جلوہ گر ہوا اور یہ اونٹنی ان کے لئے اللہ کے ہاں بلند مقام و مرتبے کی دلیل اور دعا کی قبولیت کے ظہور کا نمونہ تھی۔

بالکل یہی مثال حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ہے۔ آپؓ پر خلافت حقہ کا خاتمہ ہوا، آپ کا وجود اپنے وقت میں ولایت نبوت کے کمال کی صورت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے نور کا مظہر تھا۔ اپنے دور میں نبوت کی خلافت و نیابت صرف آپ کے اندر ہی منحصر تھی اسی لئے حدیث میں جس طرح کعبہ اور قرآن کے بارے میں یہ ارشاد ہوا کہ "النظر إلى الكعبة عبادة" اور "النظر إلى المصحف عبادة" کعبہ کو دیکھنا عبادت ہے، قرآن کو دیکھنا عبادت ہے، اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں بھی ارشاد ہے "النظر إلى وجه عليٍّ عبادة" علیؓ کے چہرے کو دیکھنا عبادت ہے۔

تو اس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ کا وجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود کے قائمقام تھا، وہی ایک چشمۂ صافی تھا جس سے تشنگانِ علوم نبوت ہر طرح کی سیرابی حاصل کرتے تھے کہ تمام صفات کمال

بشری کی وہ ذات جامع تھی، ایسے وقت میں اس مقدس ہستی کو شہید کر دینا گویا شمع ہدایت کو گل کرنا ہے۔

اس بد بخت ترین شخص نے ان کو شہید کر کے اللہ کے حق کو اور اُمت کے حق کو بھی پامال کیا کہ ایسی پاک و مقدس ہستی کا سایہ چھین کر ساری اُمت کو بے لگام و بے سہارا کر کے منتشر و پریشان کر کے رکھ دیا، اور اپنے نفس کے حق کو بھی ضائع کیا کہ جہنم کا کندہ بنا اور اپنی زندگی برباد کر ڈالی۔

ابنِ ملجم کا ظلم اور اس کی اصلی وجہ

اس بد بخت کے لئے اس عظیم بلا و مصیبت کا سبب بھی یہی خسیس شہوت بنی، چنانچہ صحیح روایات میں ہے کہ عبدالرحمٰن بن ملجم خارجی کوفے میں آیا، اچانک اس کی نظر ایک عورت جس کا نام ''قطام'' تھا پر پڑی، دل و جان سے اس پر فریفتہ ہو گیا وہ عورت بھی خارجی تھی اس بد کردار نے اس عورت سے راہ و رسم پیدا کرنے کے لئے کوششیں شروع کیں، درمیان میں کچھ لوگوں کو ڈالا، اور نکاح کی خواہش ظاہر کی، اس عورت کے باپ اور بھائی نہروان کی لڑائی میں حضرت علیؓ کے لشکر کے ہاتھوں جہنم واصل ہو چکے تھے، اس نے جواب میں کہا میرا ایک کام ہے اگر تم وہ پورا کر سکتے ہو تو نکاح کے لئے تیار ہوں وہ یہ کہ تم علیؓ کو قتل کر دو۔

اس ملعون نے شہوت سے مغلوب ہو کر یہ شرط قبول کر لی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قتل کی تدبیر و تیاری شروع کر دی۔ تلوار کو زہر کے پانی میں بجھایا، اور دوستوں سے مشورہ کیا، دوستوں نے اس کو بتایا کہ یہ کام کچھ مشکل نہیں اس لئے کہ وہ اپنے ساتھ کوئی حفاظتی دستہ نہیں رکھتے، اکیلے رات کو مسجد میں آتے جاتے ہیں تم کسی دن راستے میں چھپ کر بیٹھ جاؤ، اور موقع پا کر اپنا کام کر جاؤ۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مشہد و مدفن

چنانچہ انیسویں رمضان المبارک ۴۰ ھ کو صبح صادق کے وقت آپؓ حسب معمول گھر سے مسجد کی طرف آئے، آپ کی عادت مبارکہ یہ تھی کہ زور سے اللہ اکبر کہتے تا کہ مسجد کے پاس سونے والے بیدار ہو جائیں اور نماز کی تیاری کریں، اور ابن ملجم ملعون مسجد کے ایک ستون کے پیچھے چھپا کھڑا تھا، جب آپ لوگوں کو بیدار کرنے کے ارادے سے آگے بڑھے تو اس ملعون نے پیچھے سے تلوار کا وار آپ کے سر پر کیا اور بھاگ کھڑا ہوا، لوگوں نے اس کو گھیر لیا اور بھاگنے نہ دیا پکڑ کر لے آئے، زخم اتنا کاری نہیں

تھا لیکن زہر کی وجہ سے آپؓ جانبر نہ ہوسکے اور اس خاکدانِ ظلمانی سے فردوسِ بریں کی طرف منتقل ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

تجہیز وتکفین کے بعد رمضان المبارک کی اکیسویں تاریخ کو رات کے وقت آپ کے جسد مبارک کو ''نجف الحیرہ'' کے مقام پر جو جامع کوفہ سے ایک فرسنگ کے فاصلے پر ''حیرۃ النعمان'' کے راستے میں ہے دفن کیا گیا۔

اس علاقے میں خارجی بہت پھیلے ہوئے تھے اس لئے آپ کی قبر کو مخفی رکھنے کے لئے قبر کو بلند نہیں رکھا گیا زمین کے برابر ہی رکھا تاکہ ایسا نہ ہو کہ خارجی کسی قسم کی بے حرمتی کریں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا تأثر

یہ ۴۰ ہجری کا واقعہ ہے آپ کی شہادت پر خلافتِ نبوت کا خاتمہ ہوگیا اب کوئی اس مقام کا نہیں رہا تھا، اسی وجہ سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کو بہت افسوس ہوا تھا، جب آپ کی شہادت کی خبر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا تک پہنچی تو اُنہوں نے فرمایا ''اب عرب جو چاہیں کریں، اب ایسا کوئی نہیں رہا جو ان کو کسی بُرے کام سے روک سکے''

یہاں یہ ذہن میں رہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد صحابہ کرام میں بہت سے علماء اور واعظ حضرات تھے جو لوگوں کو بے باک طریقے سے بُرے کاموں سے روکتے اور بنو اُمیہ کے بادشاہوں یا دوسرے حکام کی پرواہ کئے بغیر حق بات کہنے میں کبھی تأمل نہیں کرتے تھے، مگر ان کا یہ امر ونہی علماء و اولیاء کا وعظ وتلقین تھا، اس میں وہ پیغمبرانہ شان نہیں تھی جو نبی کے خلیفہ میں ہوتی ہے جس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ میں تھی، اسی وجہ سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ نے وہ حکیمانہ وعارفانہ جملہ ارشاد فرمایا۔

اس سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قاتل کے ''اشقی'' (سب سے بڑا بد بخت) ہونے کی وجہ مزید واضح ہوگئی کہ اُس وقت وہ ولایت جو قائم مقام نبوت ہے اس کے تمام کمالات کے تنہا وارث حضرت علیؓ تھے کوئی دوسرا موجود نہیں تھا، جبکہ ان سے پہلے خلفاء کے دور میں خلفاء کے علاوہ دوسرے بھی اس اہلیت کے موجود ہوا کرتے تھے اسی وجہ سے ایک کے اُٹھنے کے بعد دوسرا ذمہ داری کو سنبھال لیتا تھا اور دین میں خلل پیدا نہیں ہوا، مگر حضرت علیؓ خاتم الخلفاء تھے ان کا قتل گویا شمع ہدایت کا گل کرنا اور اللہ کے نور کو بجھا دینا ہے چنانچہ اس سانحہ کے بعد دین میں ایسی خرابی پیدا ہوئی کہ پھر اس کا تدارک نہ ہوسکا۔

ایک شبہے کا ازالہ

یہاں اگر کسی کو یہ شبہہ ہو کہ قوم ثمود کے بدبخت آدمی کی حرکت کے نتیجے میں پوری قوم ہلاک ہوئی تھی مگر اس اُمت کے بدبخت ترین آدمی کے اس بدبختی والے فعل کی وجہ سے اُمت کو کچھ بھی نہیں ہوا اسکی کیا وجہ ہے؟

تو جواب یہ ہے کہ دونوں واقعات میں دو وجہ سے فرق ہے۔ ایک فرق تو یہ ہے کہ قوم ثمود قذار کے اس فعل پر راضی تھی، جبکہ اس اُمت کی غالب اکثریت ابن ملجم ملعون کے فعل پر راضی نہیں ہوئی بلکہ ہمیشہ بہت لعن طعن اور اظہار نفرت اس پر کرتی رہی ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اونٹنی کے قتل ہونے کے بعد اس کا بچہ بھی غائب ہو گیا تھا اس اونٹنی کا نام ونشان ہی مٹ گیا تھا جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قتل کے بعد آپ کا نام ونشان نہیں مٹا آپ کی اولاد و امجاد باقی رہی اور آپ کی ولایت کا نور نسلاً بعد نسلٍ آگے منتقل ہوتا رہا، اگر چہ وہ اجتماعی ہیئت ختم ہو گئی مگر وہ نورِ ولایت متفرق و منتشر طور پر اہل خیر کے ہر فرقے میں اپنی اپنی استعداد کے موافق موجود رہا ہے۔ اس وجہ سے یہ اُمت اُس عذاب سے محفوظ رہی۔ الحمد للہ

تم تفسير سورة الشمس والحمدلله

مقدمہ سورۃ الیل

یہ سورت مکی ہے، اس میں اکیس (۲۱) آیات، اکہتر (۷۱) کلمات اور تین سو دس (۳۱۰) حروف ہیں۔

سورۂ شمس کے ساتھ ربط کی وجوہ

سورۂ شمس اور اس سورت کے درمیان مناسبت و ربط مختلف وجوہ سے ہے، مثلاً

(۱) دونوں میں یہ مناسبت ہے کہ دونوں کی ابتداء قسم سے ہوتی ہے۔

(۲) سورۂ شمس میں انسانی نفوس کا مختلف ہونا بیان ہوا تھا کہ بعض کے دل میں تقویٰ و نیکی کا الہام ہوتا ہے اور بعض کے دل میں بُرائی ڈالی جاتی ہے، اور یہ کہ بعض لوگ نفس کی پاکیزگی میں مشغول ہیں اور بعض شہوت و غضب کی پیروی کرتے ہوئے اپنے نفس کو ذلیل و خوار کرنے میں مشغول ہیں۔

اور اس سورت میں انسان کے اعمال و افعال کا اختلاف بیان کیا گیا ہے، کہ بعض کو سعادت و نیک بختی کے اعمال کی توفیق دی گئی ہے اور بعض بدبختی کے اعمال کرتے ہیں اور بُرائی کے راستے ان کے لئے آسان کر دیئے گئے ہیں (تو دونوں سورتوں میں بیانِ اختلاف کی مناسبت ہوئی)

(۳) دونوں سورتوں میں مخصوص بدبختوں کا حال بھی بیان ہوا ہے چنانچہ سورۂ شمس میں قذار بن سالف کا حال بیان ہوا اور اس سورت میں ایک اور بڑے بدبخت کا حال بیان ہوا جو اس اُمت کے ابتدائی دور میں تھا، یعنی امیہ بن خلف، یہ ظالم شخص حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو سخت ترین اذیتیں دیا کرتا تھا، اور حضرت بلالؓ جو صحبت و فیض نبوی کی وجہ سے اس عظیم مقام تک پہنچ گئے تھے گویا حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کے مشابہ تھے۔

وجہ تسمیہ

''لیل'' لغت میں رات کو کہتے ہیں، اور اس سورت میں لوگوں کے اعمال کا مختلف ہونا نیکی و برائی کے اعتبار سے بیان کرنا مقصود ہے (کہ بعض لوگ نیک اعمال کرتے ہیں اور بعض بُرے اعمال کرتے ہیں) اور لوگوں کے مختلف اعمال کا صدور و وقوع کا بہترین وقت رات ہے، رات کے وقت نیک و عبادت گذار عبادت میں مشغول ہوتے ہیں اور برائی، حرام کاری کرنے والے بھی رات کو اپنے کاموں

میں مشغول ہوتے ہیں۔ الغرض لوگوں کے اعمال کے مختلف رنگوں کا اظہار رات کو اچھی طرح ہوتا ہے، بعض اپنے محبوب کی جدائی میں تڑپ تڑپ کر رات گذار دیتے ہیں۔ ع

شب تنور گذشت و شب سمور گذشت

اگرچہ دن کے وقت بھی لوگوں کے اعمال وافعال مختلف رنگ کے ہوتے رہتے ہیں مگر چونکہ یہ روشنی کا وقت ہے جو کچھ ہوتا ہے سب دیکھتے ہیں اس لئے اصلی رنگ میں اس وقت افعال کم ہی نظر آئیں گے، اکثر تکلف و بناوٹ ہوتی ہے چنانچہ چور عابد کی صورت میں اور فاسق صالح کے لباس میں اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے، جب کہ رات کو تاریکی ہوتی ہے، بغیر کسی حیا و شرم کے ہر شخص اپنی خواہش کے مطابق اپنے کام میں مشغول ہو جاتا ہے اور کسی قسم کا تکلف یا بناوٹ نہیں رہتی۔

شانِ نزول

مکہ میں دو سردار بڑے مالدار تھے، ایک حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، دوسرا امیہ بن خلف، لیکن مال خرچ کرنے کے معاملے میں دونوں میں بہت فرق تھا۔

امیہ نے بارہ غلاموں کو تربیت دے کر مال کمانے میں لگا رکھا تھا، کچھ کو کھیتی باڑی کے کاموں پر نگران بنا رکھا تھا، کچھ کو باغات پر مامور کر رکھا تھا، ایک کو مال مویشی کی دیکھ بھال کے لئے مقرر کر رکھا تھا اور ایک کو کپڑوں کی تجارت کا ذمہ دار بنایا تھا جو شام و یمن تک تجارتی اسفار کرتا اور کاروبار کو وسعت دے رہا تھا وعلی ھذا القیاس۔ اس طرح امیہ نے بہت مال و اسباب جمع کر لیا تھا اور مزید بڑھا رہا تھا، مگر اس کے ساتھ اس کے بخل کا یہ حال تھا کہ پھوٹی کوڑی کسی فقیر و محتاج کو دینے کا روادار نہ ہوتا تھا۔

غلاموں میں سے کوئی ایسی سخاوت کر جاتا تو اس کی جان کو آ جاتا، اور اگر کوئی اس کو نصیحت کرتا کہ اللہ کے راستے میں بھی خرچ کرنا چاہئے، (ایمان کے ساتھ) اللہ کے راستے میں خرچ کیا ہوا آخرت میں کام آئے گا، تو وہ کہتا میاں آخرت ہے کہاں؟ اور بالفرض اگر ہوئی بھی تو میں نے اتنا کچھ جمع کر لیا ہے کہ مجھے جنت کی نعمتوں کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم، جن نعمتوں کا لالچ دے کر فقیروں محتاجوں کو پھانس رہا ہے مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے۔

اُمیّہ کا ظلم اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی استقامت

امیّہ بن خلف کے غلاموں میں بلالؓ بھی تھے اس نے ان کو اپنے خزانے اور بت خانے کا نگران بنا رکھا تھا، جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تو آپ کے فیض صحبت سے ان اعلیٰ مقامات تک پہنچے کہ معراج کی رات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنے آگے آگے جنت میں پایا، اور فرمایا کہ (لوگ جنت کے مشتاق ہیں) اور جنت بلالؓ کی مشتاق ہے۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ پوشیدہ طور پر ایمان لائے تھے جب امیّہ کو آپ کے اسلام لانے کی خبر ہوئی تو فوراً خزانے اور بتخانے کی نگرانی سے معزول کر کے اپنے سامنے بلایا اور پوچھا تم کس کی عبادت کرتے ہو، بلالؓ نے کہا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خُدا کی عبادت کرتا ہوں، اس نے کہا اس دین کو چھوڑ دو ورنہ میں بہت بُرا پیش آؤں گا، مارتے مارتے جان نکال دوں گا، حضرت بلالؓ نے کہا اس دین کو کبھی نہیں چھوڑ سکتا باقی میں تمہارا غلام ہوں تمہاری جو مرضی ہے کرو۔

اس ازلی بدبخت نے اپنے غلاموں کو حکم دیا کہ روزانہ دن چڑھتے ہی اس کے بدن پر ببول کے کانٹے چھباؤ، جب دھوپ خوب تیز ہو جائے تو گرم ریت پر لیٹا کر اس کے سینے پر بھاری پتھر رکھ دو تا کہ ہل نہ سکے اور اردگرد آگ جلا دو، اور شام تک اسی طرح رہنے دو، پھر رات کو ہاتھ پیر باندھ کر اندھیرے کمرے میں باری باری اس کو کوڑے مارو، صبح تک یہ سلسلہ برابر جاری رہے جب تک یہ اس دین سے باز نہیں آتا اس کی یہ سزا جاری رہنی چاہئے۔

کئی دنوں تک حضرت بلالؓ اس عذاب و مصیبت میں اسی طرح گرفتار رہے اور آپ پکار پکار کر کہتے تھے اَحد، اَحد، یعنی میرا معبود صرف ایک ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی قربانی

ایک مرتبہ رات کے وقت ادھر سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا گذر ہوا تو آپ نے کسی کی سخت چیخ و پکار سنی پوچھا یہ کیا ہے تو کسی نے بتایا کہ یہ امیّہ کا غلام بلالؓ ہے جس کو روزانہ اسی طرح مارا جاتا ہے تا کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کو چھوڑ دے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو یہ سن کر بہت ہی صدمہ ہوا، صبح ہوئی تو امیّہ کے گھر گئے اور اس کو نصیحت کرنے لگے کہ اس بے چارے پر ظلم نہ کرو، یہ صحیح

دین پر ہے تمہارے لئے بھی آخرت کا ذخیرہ بن سکتا ہے، اس نے کہا آخرت کہاں ہے، اگر بالفرض ہوئی بھی تو تمہیں پتہ ہے میرے پاس کسی چیز کی کمی نہیں، میرے لئے یہی جنت ہے۔ پھر کہنے لگا اگر تمہیں زیادہ ہی ترس آرہا ہے اور تم آخرت کا اعتقاد بھی رکھتے ہو تو آخرت کے ثواب کے لئے اس کو مجھ سے خرید کیوں نہیں لیتے، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی دلی تمنا یہی تھی اس لئے فرمایا بہت بہتر ہے قیمت لگاؤ میں خریدتا ہوں، امیہ بن خلف نے کہا آپ اس کو نہیں خرید سکتے، اگر واقعی شوق ہے تو اس کی قیمت آپ کا غلام ''نطاس رومی'' ہے وہ مجھے دے دو اسے لے جاؤ۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا یہ رومی غلام بہت لائق و قابل تھا تجارت میں اس کو بہت مہارت تھی، دو ہزار دینار کے قریب اس نے پونجی جمع کی تھی، امیہ سمجھتا تھا کہ ابو بکر اس پر راضی نہ ہوسکیں گے، مگر وہ ابو بکر صدیقؓ تھے جو اللہ کی رضا کے لئے جان دینے کے لئے تیار رہتے تھے یہ تو غلام تھا۔ چنانچہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے قبول کر لیا بلکہ اپنی طرف سے کچھ مزید اضافہ بھی دیا اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو قید خانے سے نکال کر لے آئے۔

امیہ آپ کے اس معاملے پر آپ کا مذاق اُڑاتا رہا کہ اس عقلمند آدمی نے بہت بڑی حماقت کا کام کیا ہے کہ ایسا غلام جو کوڑی بھر قیمت نہیں رکھتا تھا اس کو اتنے اعلیٰ اور قیمتی غلام کے بدلے میں خرید لیا، جب یہ بات حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تک پہنچی تو آپ نے فرمایا اس کو اس غلام کی قیمت کا کیا پتہ اگر وہ اس غلام کے بدلے میں سلطنت بھی مانگتا تو میں خریدنے کے لئے تیار تھا۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو لے کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، سارا قصہ عرض کرنے کے بعد فرمایا آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) گواہ رہئے میں نے اس کو اللہ کے لئے آزاد کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہت خوش ہوئے۔

وہ غلام و باندیاں جو حضرتِ صدیق رضی اللہ عنہ نے خرید کر آزاد کئے

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ابتدائے اسلام سے ہی اپنا مال دین کے لئے وقف کر لیا تھا، حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو خرید کر آزاد کیا ش اور ان کے علاوہ مزید مندرجہ ذیل مسلمان غلام و باندیوں کو قریش کے سرداروں سے خرید کر آزاد کیا۔

عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ

یہ بنی جدعان کے غلام تھے، ان کو ایک رطل سونے کے عوض حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خرید کر آزاد کیا، ہجرت کے سفر میں یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، بہت ہی بڑے برگزیدہ اور اولیاء اللہ میں سے تھے، بیر معونہ کے دن شہید ہوئے۔

زُبیرہ رضی اللہ عنہا

یہ بڑی کامل ایمان والی خاتون تھیں ان کو بھی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خرید کر آزاد کیا، اتفاق سے آزادی کے بعد ان کی بینائی جاتی رہی ان کے سابق کافر مالکوں نے طعنہ دیا کہ لات وعزیٰ نے اندھا کر دیا ہے اس پر اُنہوں نے کہا لات وعزیٰ کی کیا حیثیت ہے کہ وہ کسی کو نقصان پہنچائیں میرا رب ہی بینائی دیتا اور لیتا ہے، اسی وقت ان کی بینائی ٹھیک ہوگئی۔

مہدیہ رضی اللہ عنہا

مہدیہ رضی اللہ عنہا اور ان کی ماں یہ دونوں اُم عبدالدار کی باندیاں تھیں، دونوں مسلمان ہوگئیں تھیں، ان کی مالکن ان کو بہت ستاتی اور اذیتیں دیا کرتی تھیں، جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو پتہ چلا تو آپ اس کے پاس گئے اور اس سے کہا ان مظلوموں کو نہ ستاؤ اور جو قیمت چاہو مجھ سے لے لو اور میرے ہاتھ فروخت کر دو، چنانچہ اس کی خواہش کے مطابق قیمت ادا کر کے آپ نے ان کو خرید لیا، اور خریدتے ہی ان کو آزاد کر دیا۔ اس وقت ان میں سے ایک آٹا پیس رہی تھی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس سے کہا اللہ نے تم پر احسان کیا ہے میں نے تم دونوں کو خرید کر آزاد کر دیا ہے، اُٹھو اور آٹا چھوڑ دو، اس ایماندار عورت نے کہا کافی عرصہ ہم انکے پاس رہیں، ان کا نمک کھایا ہے، لہٰذا مناسب نہیں کہ کام ادھورا چھوڑ کر جائیں، پورا کر لیتے ہیں پھر چلتے ہیں، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس کے حسن معاملہ پر بہت خوش ہوئے۔

بنی مؤمل کی باندی رضی اللہ عنہا

بنی مؤمل بنی عدی کی ایک شاخ ہے جس سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ تھے، قبول اسلام سے پہلے حضرت عمرؓ بنی مؤمل کی ایک باندی کو جو مسلمان ہوگئی تھی بہت سزا دیا کرتے تھے، اس کو بھی حضرت ابوبکر

صدیق رضی اللہ عنہ نے خرید کر آزاد کیا۔

اُم عبیدہ رضی اللہ عنہا

اسی طرح ایک مسلمان باندی اُم عبیدہ رضی اللہ عنہا تھیں جن کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خرید کر آزاد کیا، اوراس کے علاوہ بہت سے غلام و باندیوں کو خرید کر آزاد کیا۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی مالی قربانیاں اور زبانِ نبوت کا اعتراف

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنا مال دین کے لئے اور مسلمانوں کے لئے اس طرح خرچ کیا کہ آپ کے پاس چالیس ہزار درہم کا سرمایہ بچا تھا، جو تیرہ سال مکہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق خرچ کرتے رہے، جن میں سے چھ ہزار درہم بچے، ان میں سے کچھ ہجرت کے سفر میں خرچ ہوئے اور کچھ مسجد نبوی کی زمین خریدنے اور کچھ دوسرے کاموں میں خرچ ہوئے، چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بارہا اپنی زبان مبارک سے فرمایا "**ما نفعني مال أحد قط ما نفعني مال ابی بکرؓ**'' مجھے کسی کے مال نے اتنا نفع نہیں دیا جتنا ابوبکرؓ کے مال نے نفع دیا

مال تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اور ابو طالب نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بہت خرچ کیا مگران کا مال زیادہ تر کھانے پینے، اور صلہ رحمی کے مصارف میں خرچ ہوا، جبکہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا مال اسلام کے غلبے، اس کی شوکت و دبدبہ قائم کرنے اور کمزور مسلمانوں کی مدد کے لئے خرچ ہوا ہے، ظاہر ہے دونوں مصرفوں میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا مقام

الغرض حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنا سب مال اللہ کی رضا کے لئے اسلام کے راستے میں خرچ کر ڈالا، اور یہاں تک نوبت پہنچی کہ بدن کے کپڑے بھی قربان کر دیئے، اور ایک دن اس حال میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں حاضر ہوئے کہ قمیص کی بجائے ٹاٹ کا کمبل اوڑھے ہوئے، بٹن کی جگہ کانٹوں کے تکمے لگائے ہوئے تھے، اسی وقت جبرئیل بھی نازل ہو گئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا، ابوبکرؓ تو بڑے مالدار ہوتے تھے یہ کیا ہوا فقیروں کے لباس میں ہیں، رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم نے فرمایا اس نے اپنا سب مال مجھ پر خرچ کر ڈالا ہے، جبرئیل نے عرض کی، اللہ تعالیٰ ابوبکر کو سلام کہتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ کیا ابوبکر اس فقیری میں مجھ سے راضی ہیں، جب یہ بات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر کو بتلائی تو ان پر عجیب حال طاری ہوگیا، عرض کرنے لگے میں اپنے رب سے کیسے کدورت رکھ سکتا ہوں اور بار بار کہنے لگے "أنا عن ربی راض، أنا عن ربی راض" میں اپنے رب سے راضی ہوں، میں اپنے رب سے راضی ہوں۔

حق تعالیٰ نے اس سورت میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور امیہ کی دو مختلف حالتوں، اور دونوں کے جدا جدا معاملہ وطرز زندگی کو بیان فرمایا ہے، انہی دونوں حالتوں پر تمام نیکیوں، برائیوں اور لوگوں کی مختلف ہمتوں اور کوششوں کو قیاس کر لینا چاہئے (کہ کس کی کوشش وہمت کس سمت میں لگی ہوئی ہے)

تمت المقدمه والحمدلله

تفسیر سورۃ الیل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَالَّیْلِ اِذَا یَغْشٰی ۝

قسم ہے رات کی جب چھا جائے

رات کا سورج کے نور وروشنی کو چھپا لینا اور ساری دنیا کو تاریکی میں لپیٹ لینا یہ نمونہ ہے عملِ بد کا، کہ بُرے عمل کی سیاہی بھی اسی طرح روح ودل کے نور کو چھپا لیتی ہے۔

رات چھپاؤ اور پردہ پوشی کا بھی وقت ہے اور جو کام پردے وحیا سے تعلق رکھتے ہیں وہ بھی لوگ اسی میں انجام دیتے ہیں، جیسے راز کی بات کسی کو پہچانا، کسی سے چھپ کر بھاگنا، چوری، زنا، جادو اور اکثر شیطانی تصرفات رات کو ہی کئے جاتے ہیں۔

وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰی ۝

اور دن کی جب روشن ہو

سورج کا نکلنا اور دن کا گرد وغبار اور بادل سے صاف ہونا نمونہ ہے نیک عمل کا کہ وہ دل وروح کو

منور کرتا ہے۔

جو کام دن کی روشنی کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں اور بے پردہ کئے جاتے ہیں وہ اسی وقت ہوتے ہیں، جیسے تلاش معاش کے لئے محنت کرنا، لوگوں کا آپس میں ملاقات کرنا، افادہ اور استفادہ جیسے پڑھنا پڑھانا، سیکھنا سکھانا وغیرہ۔

وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنْثٰى ۝

اور اُس کی جو اُس نے پیدا کئے نر اور مادہ

یعنی قسم کھاتا ہوں اس حکمتِ الٰہی کی جس نے نر و مادہ کو پیدا کیا تاکہ ان کے ملاپ سے نسل بڑھے، اور دیگر فوائد مثلاً دودھ، گھی وغیرہ حاصل ہوں۔

نر و مادہ کی پیدائش اعمال میں خیر و شر کے اختلاط کا اور اعمال میں کمال و نقصان کے پائے جانے کا نمونہ ہے۔ اور نر و مادہ دونوں کی پیدائش بہت سے ایسے نتائج و ثمرات کا سبب و ذریعہ ہے کہ (اگر یہ دونہ ہوتے، بقاء نسل کے لئے) کوئی ایک ہی ہوتا (صرف نر ہوتا یا صرف مادہ) تو وہ ثمرات حاصل نہ ہوتے جو ان دو کی صورت میں ہیں کہ اچھائی یا برائی میں کمال حاصل کرنا یا ناقص رہ جانا، (یہ چیز اکیلے میں ظاہر نہ ہو سکتی کہ اس میں ان دونوں کا دخل ہے) اب جس مضمون پر یہ تینوں قسمیں کھائی ہیں وہ ارشاد فرماتے ہیں:

اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى ۝

تمہاری کمائی طرح طرح پر ہے

یعنی تمہارے اعمال اور تمہارے مشغلے اور کوششیں مختلف اور الگ الگ رنگ پر ہیں، جیسے ایمان و کفر، صلاح و فسق، سخاوت و بخل اور دیگر اعمال ہیں۔

لوگوں کے اعمال کی بنیادی تین قسمیں

یوں تو انسانوں کے اچھے بُرے اعمال اتنے مختلف اور زیادہ ہیں کہ ان کو شمار نہیں کیا جا سکتا مگر ان کی بنیاد اور جڑ تین طرح کے اعمال ہیں کوئی عمل ان سے باہر نہیں ہے۔

(۱) پہلی قسم وہ اعمال ہیں جو خیرِ محض ہیں ان میں شر کی کچھ آمیزش و ملاوٹ نہیں۔

(۲) دوسری قسم وہ اعمال جو شرِ محض ہیں ان میں خیر کی آمیزش نہیں۔

(۳) تیسری قسم وہ اعمال جن میں کچھ خیر اور کچھ شر ہے، یعنی دونوں کی ملاوٹ ہے۔

چنانچہ سورت میں تینوں قسموں میں انہی تین اقسام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

مذکورہ تینوں قسم کے اعمال کی تعریف وشرائط

اب جاننا چاہئے کہ اعمال میں خیر محض صرف وہ ہیں جو ظاہراً باطناً نیک ہوں اور ان کے خیر ہونے کے لئے تین شرطیں ہیں۔

(۱) ان کی صورت شریعت کے موافق ہو (۲) نیت خالص ہو (۳) اعتقاد صحیح اور یقین کامل سے کیا ہو۔

اور شرِ محض وہ اعمال ہیں جن میں یہ تینوں شرطیں نہ پائی جائیں۔ یعنی ان کی صورت خلاف شریعت ہو، نیت بھی بُری ہو، اور بد اعتقادی سے اس کو کیا ہو۔

اور وہ اعمال جن میں خیر وشر دونوں کی آمیزش ہو ان کی بھی کئی قسمیں ہیں۔

(۱) عمل کی صورت تو شریعت کے موافق ہو مگر نیت درست نہ ہو جیسے نماز دکھاوے کی نیت سے پڑھنا۔

(۲) نیت ٹھیک ہو لیکن عمل کی صورت خلافِ شریعت ہو جیسے کربلا کے شہداء کے غم میں ماتم کرنا، رونا پیٹنا، اور جیسے موسیقی اس نیت سے سننا کہ حق تعالیٰ کا ذوق وشوق زیادہ ہو۔

(۳) عمل کی صورت خلاف شریعت نہ ہو اور نیت بھی درست ہو مگر اعتقاد درست نہ ہو، کافروں کا اللہ کی رضا کے لئے صدقہ خیرات کرنا۔

غور وفکر کیا جائے تو ان تین قسموں میں مزید بہت سی قسمیں نکل سکتیں ہیں، مگر مرجع سب کا یہی تین قسمیں ہیں، ان تین قسموں کے اختلاف کی وجہ سے جزا وسزا میں اختلاف واقع ہوتا ہے، چنانچہ اس اختلاف کی تفصیل مال خرچ کرنے کے سلسلے میں بیان کی جاتی ہے کہ اس سورت میں اسی کا بیان مقصود ہے۔

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ○

سو جس نے دیا اور ڈرتا رہا

یعنی جس نے مال دیا اور اس بات سے ڈرتا رہا کہ دکھاوا یا شہرت ہو اور دوسرے گناہوں سے بھی

بچا جیسے بدعات اور گناہ کے کاموں میں مالی تعاون کرنے سے گریز کیا اور نیز مال خرچ کرنے کا احسان رکھنے سے اور بدلہ چاہنے سے بھی بچا۔

وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۝

اور سچ جانا بھلی بات کو

یعنی اس نے پیغمبر کی شریعت کو سچا جانا اور آخرت میں اچھی جزا کا امیدوار بھی ہے، سو ایسے شخص کا عمل ہر اعتبار سے اچھا ہے ظاہراً بھی کہ مال کا خرچ کرنا ہر دین و شریعت میں اچھا کام شمار ہوتا ہے اور باطناً بھی کہ تقویٰ ہے اسکے دل میں جس کی وجہ سے دکھاوے اور شہرت سے بچتا ہے اور صحیح نیت سے خرچ کرتا ہے۔

سو جب اس کے عمل کی صورت بھی شریعت کے موافق ہے اور اعتقاد و نیت بھی درست ہے کہ پیغمبر کی شریعت کو سچا جانتا اور آخرت کے ثواب کی امید رکھتا ہے اور اسی امید پر مال خرچ کر رہا ہے تو یہ مستحق ہے کہ اس کو اچھی جزاء عطا کی جائے چنانچہ فرماتے ہیں:

فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ۝

تو اُس کو ہم سہج سہج پہنچا دیں گے آسانی میں

یعنی دنیا میں ہم اس کو ان سب نیک کاموں اور عبادت کی توفیق دیں گے جو آخرت میں اس کے کام آئیں گی، تا کہ اس توفیق کی وجہ سے اس کے لئے عبادات اور نیک اعمال آسان ہو جائیں اور دل و جان سے وہ انہی اعمال میں مشغول رہے، اس لئے کہ نیک عمل کی خاصیت یہ ہے کہ جب آدمی ہمیشہ اس کو کرتا رہے تو اس کے نفس میں ایک نورانی قوت پیدا ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے نیک عمل کرنا اور نیکی کے راستے پر چلتے رہنا اس آدمی کے لئے آسان ہو جاتا ہے، بلکہ ظاہری مشقت جو نیک عمل کرنے میں ہوتی ہے وہ عادت بن جاتی ہے، اور عادت کے متعلق حکماء کا قول ہے "العادة طبيعة ثانية"

کہ عادت ایک دوسری طبیعت ہے (یعنی جس کام کی عادت ہو جائے تو وہ طبیعت و مزاج کی طرح ہو جاتا ہے) لہٰذا اس کو اعمال کرنے میں کچھ مشقت محسوس نہیں ہوتی بلکہ نہ کرنے کی صورت میں ایک مشقت اور دل پر بوجھ ہوتا ہے، پھر جب اس کی موت آتی ہے اور اس جہان سے جُدائی کا وقت آتا ہے

تو اس کو بڑی سہولت و خوشی محسوس ہوتی ہے گویا قید خانے سے چھوٹ رہا ہے، اس کے بعد منکر نکیر کے جوابات، حشر ونشر کی ہولناکیاں، حساب و کتاب کا خوف اور میزان و پلصراط کے خدشات سب اس کے لئے آسان ہو جاتے ہیں ان شدائد کی پریشانیاں اس کو معلوم ہی نہیں ہوتیں۔

وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ○

اور جس نے نہ دیا اور بے پروا رہا

یعنی جس نے بخل کیا اور مال اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کیا اور اسی مال کی وجہ سے اس نے آخرت کی نعمتوں سے بے پرواہی کی

وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ○

اور جھوٹ جانا بھلی بات کو

اس نے پیغمبر کی شریعت اور آخرت کی اچھی جزا کو جھٹلایا یہ ایسا عمل ہے جو ہر طرح سے بُرا ہے، اس لئے کہ بخل ہر دین میں بُرا ہے، اور مال کے گھمنڈ میں آخرت کے ثواب سے بے پرواہی کرنا اچھی نیت کا درہم برہم ہونا ہے، اور پیغمبر کی شریعت کی تکذیب سے اعتقاد بھی فاسد ہو گیا، لہٰذا اس میں اچھائی کا کوئی پہلو نہیں ہے، ظاہری اعتبار سے بخل ہے، باطن میں آخرت سے بے پرواہی اور مال کا گھمنڈ، اور اعتقاد بھی فاسد، جب یہ سب برائیاں ہوئیں تو ان کی جزا بھی بری ہوگی، چنانچہ فرماتے ہیں:

فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ○

سو اُس کو ہم سہج سہج پہنچا دیں گے سختی میں

تاکہ وہ غلط راہوں پر چلے، اور بداعمالیوں میں مشقتیں اُٹھائے مگر دو رکعت نماز پڑھنے میں بھی سستی محسوس کرے، چنانچہ ایسے لوگوں کے بارے میں ایک جگہ فرمایا ہے ''اذا قاموا الی الصلوٰۃ قاموا کسالی'' کہ نماز کے لئے سستی سے کھڑے ہوتے ہیں، اور دوسری جگہ فرمایا ''انها لكبيرة الا علی الخاشعين'' کہ نماز بہت بھاری ہے سوائے خاشعین کے۔

پھر جب اس کو موت آتی ہے تو نہایت تنگی و پریشانی سے یہاں سے جاتا ہے گویا باغ سے نکل کر قید خانے میں جا رہا ہے، اس کے بعد منکر نکیر کے جوابات، حشر ونشر کی ہولناکیاں، حساب و میزان کی سختیاں

اُٹھاتا ہے اور آخر میں دوزخ کے عذاب میں جا پڑتا ہے۔ اعوذ باللہ منہا

اور جس مال کو جوڑ جوڑ کر رکھا تھا کہ مشکل کے وقت کام آئے گا وہ اب ورثاء کے ہاتھ لگا اور انہوں نے "مالِ مفت دلِ بے رحم" کے مطابق تقسیم کر کے قصہ برابر کر دیا، چنانچہ فرماتے ہیں:

وَمَا يُغْنِىْ عَنْهُ مَالُهٗۤ اِذَا تَرَدّٰى ۝

اور کام نہ آئے گا اُس کے مال اُس کا جب گڑھے میں گرے گا

یعنی جب قبر کے گڑھے میں گرے گا تو اس کا مال کچھ کام نہ آئے گا سوائے کفن کے کچھ بھی ساتھ نہیں جائے گا۔

عمل مخلوط کی جزاء اور حکم

شروع میں ذکر ہوا کہ انسانوں کے اعمال کی تین قسمیں ہیں، مگر جزاء کے بیان میں دو ہی عملوں کی جزا بیان فرمائی گئی یعنی خیر محض، اور شرِ محض کی جزا بیان ہوئی، اور وہ عمل جو خیر و شر دونوں سے مخلوط ہو اس کی جزاء بیان نہیں ہوئی۔

بات یہ ہے کہ اس کی جزا الگ سے بیان کرنے کی ضرورت نہیں عاقل کے لئے یہ بات مخفی نہیں کہ "النتیجة تتبع الأخس والارذل" کہ نتیجہ ارزل کے تابع ہوتا ہے تو معلوم ہوا کہ مخلوط میں شر کا حکم غالب ہوگا اور خیر کا مغلوب ہوگا۔ چنانچہ شریعت میں طے شدہ ہے کہ حیوانات میں جو بچہ حلال جانور اور حرام جانور کے ملاپ سے پیدا ہو وہ حرام ہوگا جیسے گدھے اور گھوڑی کے ملاپ سے خچر پیدا ہوتی ہے، اسی طرح جو مال حلال و حرام میں مخلوط ہو گیا ہو جیسے اپنا دودھ غصب کے دودھ میں مل گیا، یا اپنی مٹھائی غصب کے پانی میں مل کر شربت بن گئی، تو یہ سب حرام ہیں ان کا کھانا جائز نہیں ہے۔

اسی پر اس عمل کو قیاس کر لینا چاہئے جس میں شر اور خیر دونوں مخلوط ہو گئے ہوں کہ وہ شر کے حکم میں ہی ہوگا خیر نہیں کہلائے گا۔ واللہ اعلم

تین قسموں کی وجہ تخصیص میں بعض مفسرین کا کلام

بعض مفسرین نے ان تین قسموں کی تخصیص کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ مقصود یہاں یہ بیان کرنا ہے کہ بنی آدم کے اعمال طرح طرح کے اور مختلف رنگ و نوعیت کے ہیں، اس اختلاف کے

بیان کے لئے سب سے پہلے دن، رات کی قسم ذکر فرمائی، دن و رات انسانوں کے اعمال واشغال کے اختلاف کا زمانہ ہے، جیسے چوروں کی رات اور عبادت گذاروں کی رات، بدکاری کرنے والوں کی رات اور نیک اعمال کرنے والوں کی رات دونوں میں واضح فرق واختلاف ہے، اسی طرح دن بھی ہے۔

اس کے بعد بنی آدم کی اصل الاصول ''نر اور مادہ'' کو ذکر فرمایا کہ ان دونوں کا اعمال، افعال اور ہمت وشوق میں آپس میں بہت اختلاف ہے، مردوں کی ہمت ورغبت اور طرح کی ہے اور عورتوں کی ہمت ورغبت اور طرح کی، مردوں کی ہمت بلند مرتبہ اور نام کمانے میں مصروف ہوتی ہے جبکہ عورتوں کی ہمت ورغبت زیب وزینت، عمدہ لباس و پوشاک، اور زیور و آرائش اور اس طرح کی پست چیزوں کی طرف ہوتی ہے۔

پس! انسان کی اس اصل کو ذکر فرمایا تا کہ انسان کے اعمال کے اختلاف اور اس کے عزائم و ارادوں کی بوقلمونیوں پر دلیل ہوسکے، کہ اصل کا حکم فرع پر جاری ہوتا ہے اسی وجہ سے کہا گیا ہے ''الولد سرٌّ لأبیه'' بیٹا اپنے باپ کا راز ہوتا ہے۔

اور حضرت امیر خسرو قدس سرّہ فرماتے ہیں

در جوانمردی و مردی ہر کہ کارے پیش بُرد
ناجوانمردی بود کہ برزباں آرد سخن
آنکہ او کرد و نگفت اورا شمر مردِ تمام
و آنکہ او کرد و بگفت اوزن بود بے ہیچ ظن

یعنی جوانمردی کا کام اگر کسی نے کیا ہو تو اس کا زبان پر لانا نامردی ہے وہ شخص جس نے جواں مردی کا کوئی کام کیا ہو اور اظہار نہ کرے تو اس کو کامل مرد شمار کرو، اور جس نے کچھ کیا اور زبان سے کہہ بھی دیا وہ بے شک عورت ہے، اور جس نے نہ کچھ کیا اور نہ کہا وہ آدھا مرد ہے اور جس نے کیا کچھ نہیں لیکن زبان سے کہتا ہے وہ آدمی عورت ہے۔

زمانہ بھی (لوگوں کے اعمال واخلاق کے اختلاف پر) اثر انداز ہوتا ہے، چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے: ''الناس بزمانھم أشبه منھم بآبائھم'' لوگ اپنے باپ دادا سے زیادہ اپنے زمانے

کے مشابہ ہوتے ہیں۔

تقدیر اور انسان کے اعمال

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں ایک جنازے کے ساتھ ہم لوگ گئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ساتھ تھے ابھی قبر تیار ہو رہی تھی، اس کے انتظار میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھ گئے، آپؐ کے ارد گرد صحابہ کرامؓ بھی بیٹھ گئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تم میں سے ہر ایک کا ٹھکانا جنت یا جہنم میں مقرر ہو چکا ہے، لوح محفوظ میں لکھا جا چکا ہے اب اس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا، ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ! تو پھر ہم تقدیر پر بھروسہ کر کے نہ بیٹھ جائیں اور اعمال چھوڑ نہ دیں؟ جب سب کچھ لکھا ہوا ہے اور اس کے خلاف ممکن نہیں تو اعمال کے لئے کوشش کرنا سب بے کار ہے؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا عمل کرتے رہو، ہر شخص کو اسی عمل کی توفیق دی جاتی ہے جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے، اگر اہل سعادت میں سے ہے تو سعادت مندوں کے اعمال کی توفیق اس کو دی جاتی ہے، اور اگر بد بخت و اہل شقاوت میں سے ہے تو ویسے ہی اعمال اس سے سرزد ہوں گے جس طرح ہر شخص کا جنت یا دوزخ میں مقام لکھ دیا گیا ہے اسی طرح ہر شخص کے اعمال بھی لکھ دیئے گئے ہیں کہ نیک یا بُرے کیسے اعمال کرے گا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت "فاما من اعطی" آخر تک پڑھی، لیکن اس مقام پر اس آیت کا معنی ایک اور لحاظ سے سمجھا جاتا ہے، یعنی تمہارے اعمال علمِ الٰہی میں مختلف اور رنگا رنگ ہیں اس لئے کہ تقدیر میں کسی کو صالح اور کسی کو فاسق لکھا ہے پھر اسی کے مطابق ہر ایک سے اعمال سرزد ہوتے ہیں۔ تو "فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ○ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى" سے مراد یہ ہے کہ ان اعمال کا اس سے صادر ہونا علم الٰہی میں مقدر ہو چکا ہے سو وہ خواہ مخواہ یہ اعمال کرے گا اور "فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى" سے مراد یہ ہے کہ ان اعمال کی توفیق وہ ضرور دنیا میں پائے گا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اعمال کا جس مرتبے میں لحاظ کیجئے خواہ علمِ الٰہی میں ہونے کے مرتبے میں لحاظ کریں یا دنیا میں سرزد ہونے کے بعد ان کو ملاحظہ کیجئے بہر صورت اعمال ایک ثمرہ رکھتے ہیں۔

علمِ الٰہی کے مرتبے میں ان کا لحاظ کریں کہ تمام اعمالِ خیر و شر مقدر ہیں تو ان کا ثمرہ یہ ہے کہ دنیا میں اعمال خیر کی توفیق نصیب ہوتی اور اعمال شر کے ارتکاب کی ذلت میسر آتی ہے، اس لئے کہ دنیا عالمِ

تقدیر کا ظل اور سایہ ہے اور اس کی نسبت عالم تقدیر سے بالکل ایسی ہے جیسی ڈھلی ہوئی چیز کی نسبت سانچے کے ساتھ ہوتی ہے کہ وہ چیز سانچے سے کم یا زیادہ نہیں ہوسکتی۔

اور اگر اعمال کو دنیا میں صدور کے بعد ملاحظہ کریں تو ان کا ثمرہ آخرت کی جزاء ہے اس لئے کہ آخرت اس کھیتی کے کٹنے کا وقت ہے جس کو دنیا میں بویا گیا تھا چنانچہ کسی شاعر نے کہا ہے۔

از مکافات عمل غافل مشو
گندم از گندم بروید جوز جو

ایں چنیں گفتہ است پیر معنوی
کای برادر ہرچہ کاری بدروی

یعنی اعمال کے بدلے سے غافل نہ ہو جاؤ گندم بونے سے گندم ہی اُگتی ہے اور جو بونے سے جو ہی اُگتے ہیں، یہ بات پیر معنوی نے کہی ہے کہ اے بھائی جیسا بوؤ گے وہی کاٹو گے۔

تقدیر کے مسئلے میں شبہے کا جواب

اس مسئلے میں یہ شبہہ ہوا کہ جب نیکی بدی کی توفیق اللہ کی طرف سے ہی ہے تو پھر سب کو زبردستی نیکی کے ہی راستے پر کیوں نہیں لگا دیتے، اس شبہے کے جواب میں دو باتیں ارشاد فرمائی ہیں پہلی بات یہ فرماتے ہیں:

إِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدَىٰ ۝

ہمارا ذمہ ہے راہ سمجھا دینا

یعنی بیشک ہدایت اور نیکی بدی کی راہ دکھلانا ہماری ذمہ داری ہے اور سب کے لئے ہم نے اس کا بندوبست کیا ہے، سب سے پہلے تو ہم نے سب کو حواسِ خمسہ ظاہرہ (یعنی سننے کی قوت، دیکھنے کی قوت، چھونے کی قوت، چکھنے کی قوت، اور سونگھنے کی قوت) اور حواس خمسہ باطنہ (حسِ مشترک، خیال، وہم، حافظہ اور متصرفہ) اور عقل دی ان کے ذریعہ سے انسان اچھائی، برائی کے درمیان فرق و امتیاز کرسکتا ہے۔

اس کے بعد انبیاء کرام اور آسمانی کتابوں کے ذریعہ شریعت کے احکام کے بیان کرنے اور جنت کی نعمتوں اور جہنم کی سختیوں کے بیان سے دونوں راستوں کے درمیان فرق واضح کیا، اسی طرح انبیاء کے بعد

ان کے وارثین علماء و مرشدین کے وعظ و نصیحت کے ذریعہ نیز دیگر بہت سے اسباب تنبیہ کے ذریعہ ہم نے سب کو صحیح اور غلط راہ کے درمیان فرق بتلا دیا ہے، اب یہ سب کچھ کرنے کے بعد ہمارے ذمے یہ نہیں ہے کہ زبردستی کسی کو نیک راستے پر لگائیں اور برائی سے پکڑ کر ہٹائیں، بلکہ ہم نے دونوں راستوں میں سے ایک کو اختیار کرنا اور اس پر چلنا مکلف کے اختیار و ارادے سے وابستہ کر دیا ہے، جس پر وہ چاہے چلے۔

اگر ایسا نہ ہو تو آزمائش و اختیار ہی باقی نہ رہا، پھر فرمانبردار اور نافرمان میں کیسے فرق کیا جائے گا، اس لئے کہ اس صورت میں تو سب سیدھے راستے پر چلنے پر مجبور ہوں گے، نیک بخت و سعادت مند کی بدبخت پر کیا فوقیت و فضیلت رہ جائے گی، بلکہ ہدایت و گمراہی کے معنی ہی کچھ نہ رہے، پھر تو انسان بھی آسمان، ہوا، پانی، مٹی وغیرہ کی طرح مجبورِ محض اور بے بس ہو جاتا اور انسان کی تخلیق کی جو خصوصیات ہیں جو اس کو ان تمام مخلوقات سے امتیاز بخشتی ہیں وہ سب بیکار و معطل ہو جاتیں۔

دوسری بات شبہے کے جواب میں یہ ارشاد فرمائی

وَإِنَّ لَنَا لَلْآخِرَةَ وَالْأُولَىٰ ۝

اور ہمارے ہاتھ میں ہے آخرت اور دنیا

دنیا و آخرت دونوں ہمارے تصرف میں ہیں، سو جو ہم سے آخرت چاہتا ہے ہم اس کو آخرت دیتے ہیں اور جو دنیا چاہتا ہے ہم اسکو دنیا دیتے ہیں اور جو دونوں چاہتا ہے ہم اسکو دونوں سے سرفراز کرتے ہیں۔

اگر سب کو زبردستی ایک ہی راہ پر چلاتے تو دنیا کا کارکانہ بے کار ہو جاتا اس کی رونقیں ختم ہو جاتیں اور کوئی اس کو حاصل کرنے کی خواہش نہ رکھتا ایسے میں تو یہ ایک ویرانہ اور اذیت ناک قید خانہ بن جاتا اس لئے دو جہاں کو آباد رکھنے کے لئے انسانوں میں مختلف قسم کے ارادے اور طرح طرح کی خواہشیں پیدا کر دی ہیں۔ اور ہر شخص کے دل میں ایسے کام کی محبت و خواہش رکھ دی ہے جس سے دونوں جہاں میں سے کسی ایک کی آبادی و تعمیر مطلوب ہے۔ **ونعم ماقیل۔**

ہر کسے را بہر کارے ساختند
میلِ او را در دلش انداختند

یعنی ہر ایک کو ایک کام کے لئے پیدا کیا ہے اور اس کام کی محبت اس کے دل میں ڈال دی ہے۔

جو سختیاں اور مصائب بدکاروں کو پیش آنے والی ہیں ان کا اجمالی ذکر اس جملے میں فرمایا تھا "فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى" اب ان مصائب میں جو سخت ترین ہیں ان کو ذکر کر کے ڈراتے ہیں:

فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰى ○

سو میں نے سُنا دی تم کو خبر ایک بھڑکتی ہوئی آگ کی

یہ آگ دو سو برس کے فاصلۂ مسافت سے لپک کر کافر کو اپنے اندر کھینچ لے گی اور یہ آگ مخصوص ہے کافروں کے لئے چنانچہ فرماتے ہیں:

لَا يَصْلٰهَآ اِلَّا الْاَشْقَى ○

اُس میں وہی گرے گا جو بڑا بد بخت ہے

اہل شقاوت کی اقسام

جاننا چاہیے کہ بدبختی کی چند انواع ہیں، کسی کو دنیوی امور میں بد بخت بنا دیتے ہیں کہ طرح طرح کے جسمانی امراض میں مبتلا ہے اور ہر کسب و دھندے میں مال کمانے سے محروم رہتا ہے یہاں تک کہ لوگوں کی نظروں میں گر جاتا ہے اور ذلیل و خوار سمجھا جاتا ہے، اور کسی کو آخرت کے امور میں بد بخت بنا دیتے ہیں، پھر اس میں مختلف درجات ہیں، کوئی صغیرہ گناہوں پر اصرار اور عبادت میں سستی کرنے میں مبتلا ہو جاتا ہے، کوئی گناہ کبیرہ کا مرتکب ہو کر توبہ کی توفیق سے محروم رہتا ہے، اور کوئی شرک و کفر میں مبتلا ہوتا ہے اور یہ سب سے بڑی بدبختی ہے۔

اور چونکہ دنیا تو چند روزہ ہے فنا ہونے والی ہے اس لئے یہاں کی بدبختی اللہ کے ہاں چنداں وقعت نہیں رکھتی، اصل بدبختی آخرت کی بدبختی ہے، اور آخرت کی بدبختی کے اعتبار سے پھر لوگوں کی دو قسمیں ہیں۔

ایک قسم ان بدبختوں کی ہے جو عالم برزخ کی سختیاں حشر و نشر، حساب و میزان اور میدانِ حشر کی مشقتیں اور عذاب سہنے اور انبیاء و اولیاء کی شفاعت کی وجہ سے بدبختی کا اثر ان سے زائل ہو جائے گا، جیسے صغیرہ گناہوں پر اصرار کرنے والے یا کبیرہ گناہ کر کے بغیر توبہ کے مرنے والے ہیں۔

دوسری قسم ان بدبختوں کی ہے کہ کسی حال میں ان سے بدبختی جدا نہیں ہوگی کسی کی شفاعت بھی ان

کو فائدہ نہیں دے گی یہ لوگ کافر و مشرک ہوں گے۔

سو جو پہلی قسم کی بدبختی کا شکار ہیں وہ ''شقی'' ہیں اور دوسری قسم کی بدبختی میں جو گرفتار ہیں وہ ''اشقیٰ'' ہیں اسی لئے ''اشقیٰ'' کی تفسیر میں یہ ارشاد فرمایا:

الَّذِیْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ○

جس نے جھٹلایا اور منہ پھیرا

یعنی سب سے بڑا بدبخت وہ ہے جس نے دین کو جھٹلایا اور اللہ کے حکم سے منہ موڑا، یہ بات صرف کافر پر صادق آتی ہے، مسلمان کیسا ہی گنہگار کیوں نہ ہو اس کے دل سے تصدیق ختم نہیں ہوتی اور نہ ہی وہ اللہ کے احکام کے بارے میں یہ کہہ سکتا ہے کہ جھوٹے ہیں، وہ ان کو برحق ہی مانتا ہے البتہ نفس کی شامت سے عملی کوتاہی اس سے ہوتی ہے۔

ایک اشکال اور اس کا جواب

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر "اشقی" سے مراد کافر ہے تو پھر آیت "لا یصلٰھا الخ" کے مدلول کے مطابق جہنم میں صرف کافر ہی جائیں گے، حالانکہ مسلمان گنہگار کا جہنم میں جانا بھی ثابت ہے۔

جواب اس کا یہ ہے کہ پہلے بیان کر دیا ہے کہ اس آیت میں مخصوص آگ مراد ہے جو دو سو برس کی مسافت کے فاصلے سے کفار کو اپنے اندر کھینچ لے گی، یہ کافروں کے لئے ہی خاص ہوگی اس میں مسلمان گنہگار داخل نہیں ہوں گے، مسلمان گنہگار اپنے گناہوں کی بقدر جس آگ میں داخل ہوں گے وہ اور آگ ہوگی، لہٰذا آیت میں حصر درست ہوئی۔

بعض مفسرین نے اس کا جواب یوں دیا ہے کہ مسلمان کا آگ میں داخل ہونا تو محض معمولی تادیب وصفائی کے لئے ہوگا گویا یہ آگ میں جانا، جانا ہی نہیں ہے، اس میں جانا تو یہ ہے کہ پھر نکلنا نہ ہو سو ایسا جانا صرف کافر کے لئے ہے تو حصر ایسے ہی دخول کے متعلق ہے، مطلق داخل ہونے کے متعلق حصر نہیں ہے، چنانچہ یوں کہا جاتا ہے لڑا تو صرف زید ہے، یعنی لڑے اور بھی ہیں مگر لڑائی کا جس طرح حق ہے وہ صرف زید نے ادا کیا ہے۔

آگے آنے والی آیت "سیجنبھا الاتقی" میں حصر نہیں اس لئے وہاں یہ شبہ وارد نہیں ہوتا۔

ایک اور شبہہ اور اس کا جواب

البتہ ایک اور شبہہ ہوتا ہے کہ "نـاراً تـلـظّـی" سے جب وہ آگ مراد ہوئی جو کافروں کے لئے مخصوص ہے تو اس سے تو سارے ہی مومنین محفوظ ہوں گے تو "سیجنبھا الاتقی" کے مطابق صرف اتقیٰ کو کیوں خاص طور پر اس سے محفوظ بتلایا گیا۔

جواب اس کا یہ ہے کہ اس آگ سے دوری بھی کئی طرح سے ہوگی، انتہائی درجے کی دوری صرف "اتـقـیٰ" کو حاصل ہوگی ایسی دوری دوسرے مومنین کو حاصل نہ ہوگی (اس لئے اس خاص دوری کو بتلانے کے لئے اتقیٰ کو ذکر فرمایا ہے)

یہ بھی احتمال ہے کہ "سیـجـنـبھـا" کی ضمیر مطلق آگ کی طرف راجع ہو جو مذکور مقید آگ کے قرینے سے سمجھ آ رہی ہے تو مطلق آگ سے صرف متقی ہی محفوظ ہوں گے (اس صورت میں اتـقـیٰ کی تخصیص درست ہوئی)

وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ۝

اور بچا دیں گے اُس سے بڑے ڈرنے والے کو

اہلِ شرع کی اصطلاح میں متقی وہ ہے جو کفر سے اور صغیرہ کبیرہ ہر طرح کے گناہوں سے بچا رہے، اگر غلطی سے کبھی کوئی گناہ ہو جائے تو فوراً نادم ہو کر توبہ کرے تاکہ گناہ کا اثر دل پر باقی نہ رہے اور گناہ دل میں گھر نہ کر سکے۔

اور "اتقیٰ" کا مرتبہ اس سے بھی بہت بلند ہے، اتقیٰ وہ ہوتا ہے جس سے شریعت وطریقت کے آداب بھی نہ چھوٹنے پائیں، دل میں گناہ کا خطرہ اور بُری نیت کا خیال تک نہ آنے دے، اپنا ظاہر و باطن یکساں رکھے، سو ایسے لوگ بہت ہی نادر و کمیاب ہیں، اللہ ہی کے فضل سے جسے چاہے یہ مرتبہ نصیب فرمائے۔ (اللھم جلعنا منھم)

آیت میں "اتقی" کا مصداق ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں

تمام مفسرین کے نزدیک آیت میں اتقیٰ سے مراد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں، یہ سورت ہی ان کی شان میں نازل ہوئی ہے "اشقیٰ" سے مراد امیہ بن خلف ہے، اور "اتقیٰ" سے مراد صدیق اکبرؓ ہیں۔

انبیاء کرام کے بعد سب سے افضل ابوبکرؓ ہیں

اہل سنت والجماعت اس بات پر متفق ہیں کہ انبیاء کرام کے بعد سب لوگوں میں حضرت ابوبکر صدیق افضل و بزرگ تر ہیں، اور یہی آیت ان کی دلیل ہے، استدلال اس طرح کرتے ہیں کہ اس آیت میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کو "اتقی" کہا گیا ہے، اور دوسری آیت میں فرمایا ہے: "ان اکرمکم عند الله اتقاکم" تم میں سے اللہ کے نزدیک سب سے افضل وہ ہے جو تم میں اتقی ہو۔

دونوں آیتوں کے ملانے سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ابوبکر صدیقؓ کے نزدیک سب سے افضل ہیں۔

فرقۂ تفضیلیہ کا شبہہ اور اس کا جواب

اہل سنت کے مذکور استدلال کی تردید میں فرقۂ تفضیلیہ یہ کہتا ہے کہ یہاں "اتقی" سے مراد صرف متقی ہونا ہے یہ معنی نہیں کہ وہ سب سے زیادہ تقویٰ والا ہے، اس لئے کہ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ ابوبکر صدیقؓ تقویٰ میں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے کمتر تھے لہٰذا "اتقی" کا لفظ ان پر سب سے زیادہ متقی ہونے والے معنی کے اعتبار سے صادق نہیں آیا، اس معنی کے اعتبار سے یہ لفظ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر صادق آتا ہے، پس حضرت ابوبکرؓ کا افضل ہونا اس آیت سے ثابت نہ ہو سکا۔

اہل سنت والجماعت ان کے جواب میں کہتے ہیں کہ "اتقی" کو متقی کے معنی میں لینا لغت عربی کے خلاف ہے، اور اللہ کے کلام کو جو خالص عربی میں ہے ایسے معنوں میں ڈھالنا جو عربی محاورے کے خلاف ہو بالکل درست نہیں ہے۔

اور جس ضرورت کی بنا پر انہوں نے یہ معنی مراد لئے ہیں وہ ضرورت ہی سرے سے نہیں ہے اس لئے کہ گفتگو انبیاء و رُسل کے علاوہ باقی انسانوں کے بارے میں ہو رہی ہے۔ انبیاء کے متعلق تو شریعت کا طے شدہ ضابطہ ہے کہ وہ اللہ کے بعد ساری کائنات سے افضل ہیں، نہ ان کو کسی دوسرے انسان پر قیاس کیا جا سکتا ہے اور نہ کسی دوسرے انسان کو اُن پر قیاس کیا جا سکتا ہے، اس لئے فضیلت و مدح کے مقام پر جب ایسے الفاظ بولے جاتے ہیں تو شریعت کے عرف میں ان سے مراد اُمت ہوتی ہے، پیغمبر ہرگز مراد نہیں ہوتے، اور عرف کی تخصیص، ذکر کرنے کی تخصیص سے قوی ہوتی ہے، جیسا کہ کوئی کہے کہ

گندم کی روٹی دوسری روٹیوں سے اچھی ہوتی ہے، اس کلام سے ہرگز یہ بات نہیں سمجھی جاتی کہ گندم کی روٹی بادام کی روٹی سے بھی اچھی ہوتی ہے، حالآنکہ بادام کی بھی روٹی ہوتی ہے، وجہ یہ ہے عرف میں ایسے کلام سے وہ خارج سمجھی جاتی ہے، اس لئے کہ عرف میں اس بات سے وہ روٹی مراد ہوتی ہے جو غلے کی ہو، وہ مراد نہیں ہوتی جو میوے وغیرہ سے بنائی گئی ہو۔

اہلِ سنت کے بعض بزرگوں کے بارے میں سنا گیا ہے کہ وہ کہتے تھے کہ ''اتقٰی'' یہاں اپنے اصلی (اسم تفضیل والے) معنی میں ہے، یعنی وہ شخص جو تقوے میں سب سے بڑھا ہوا ہو، سب میں پیغمبر بھی شامل ہوگئے اور اُمتی بھی، البتہ یہ فضیلت خاص زندہ لوگوں کی نسبت سے ہے (یعنی زندوں میں خواہ جو بھی ہوں وہ تقویٰ میں سب سے بڑھا ہوا ہے) اس لحاظ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد ابوبکر صدیقؓ اپنے دور خلافت میں ''اتقٰی'' کے مصداق ہو سکتے ہیں، یعنی اس وقت کے اعتبار سے ابوبکر صدیقؓ اتقٰی ہیں (کوئی پیغمبر دنیا میں اس وقت زندہ نہیں ہے جو ابوبکرؓ کے لئے اتقٰی کا مصداق بننے سے مانع ہے) حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمانوں پر ہونے کی وجہ سے دنیا والوں کے نزدیک مردوں کے حکم میں ہیں۔

اور ''اتقٰی'' کے مصداق کے لئے لازم نہیں کہ وہ ہر زمانے میں اور ہر شخص سے خواہ وہ زندہ ہو یا مردہ تقویٰ میں بڑھا ہوا ہو، اس لحاظ سے تو کسی کو متقی کہنا بھی درست نہیں ہوگا (چہ جائیکہ کوئی اتقٰی ہو) اس لئے کہ لڑکپن میں کوئی متقی نہیں ہوتا بلکہ شریعت میں جو بھی منصب و مرتبہ محمود ہے اس میں آخری عمر کا اعتبار کیا جاتا ہے، جیسے صالح ہونا، غوث ہونا، قطب ہونا، ولی ہونا اور نبی ہونا ان مراتب پر جو بھی آخری عمر میں پہنچے اس کو ان القاب سے یاد کیا جاتا ہے، اگرچہ لڑکپن میں ان کو یہ مرتبہ حاصل نہ ہوا ہو۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ ''اتقی'' وہی ہے جو اپنی آخری عمر میں زندہ لوگوں میں تقویٰ میں سب سے زیادہ بڑھا ہوا ہو، کہ اعمال میں آخری عمر کا ہی اعتبار کیا جاتا ہے، پس! اس تقریر سے بغیر کسی تاویل و تکلف کے اپنا مطلب و مدعا ثابت ہوگیا، وللہ الحمد

جب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ''اتقی'' فرمایا تو اب ان کے اعمال کا ذکر کرتے ہیں جو اس سورت کے نزول کے وقت بارگاہِ الٰہی میں مقبول ہوئے تھے۔

الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَكّٰى ○

جو دیتا ہے اپنا مال دل پاک کرنے کو

یعنی وہ ایسا متقی اور ڈرنے والا ہے کہ اپنے مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہے چنانچہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ اور بہت سے غلام باندیوں کو جو مسلمان تھے اور کفار ان کو تکلیفیں پہنچاتے تھے خرید کر آزاد کیا۔ اس کے علاوہ اپنا مال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر مکہ میں، ہجرت کے سفر میں اور ہجرت کے بعد خرچ کیا جسکی کچھ تفصیل پیچھے گذر گئی ہے، اور اس مال کے خرچ کرنے میں غرض کیا تھی فرماتے ہیں:

یَتَزَكّٰى :۔ تاکہ اپنے آپ کو پاک کرے، اس نیت سے دن بدن مال دینے میں وہ اور اضافہ وترقی کر رہے ہیں تاکہ ان کے اندر کمال کا جو پودا پھوٹا ہے وہ مال خرچ کرنے کے اس عمل سے (جو پودے کیلئے ہوا و پانی کی طرح ہے) روز بروز ترقی کرتا جائے۔

زکوٰۃ کے لفظ میں دو معنی پائے جاتے ہیں: (۱) طہارت (۲) زیادتی

یہ دونوں باتیں ان کو حاصل ہیں۔

وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى ○

اور نہیں کسی کا اُس پر احسان جس کا بدلا دے

اگرچہ کسی کے احسان کے بدلے میں مال دینا بھی اچھا عمل ہے مگر چونکہ اس میں اپنی ناموری بھی مقصود ہوتی ہے اس لئے کامل اخلاص اس میں نہیں ہوتا۔

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اخلاص کی گواہی زبانِ نبوت سے

صحیح حدیث میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دنیا میں کوئی ایسا نہیں جس کے احسانات کا بدلہ میں نے چکا نہ لیا ہو سوائے ابوبکر صدیقؓ کے کہ ان کے احسانات کا بدلہ میں نہیں چکا سکا، قیامت کے دن اللہ تعالیٰ خود ان کے احسانات کا بدلہ ان کو عطا فرمائیں گے۔

اس سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ثواب اور مرتبے کے کمال کو سمجھنا چاہئے کہ کس درجے کا ہے، ذلک فضل الله یوتیه من یشاء، اگر اس کے باوجود کسی کو ان کے مقام ومرتبے میں شک وشبہہ ہو تو سمجھ لے کہ ایمان کی پرچھائیاں بھی اس کے دل پر نہیں پڑیں۔

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم
چشمۂ آفتاب راچہ گناہ

ایک اور صحیح حدیث میں ہے کہ وفات سے کچھ روز پہلے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا اس میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بہت تعریف کی اور فرمایا جتنے احسانات ابوبکرؓ کے مجھے پر ہیں اتنے اور کسی کے نہیں ہیں۔ اپنی بیٹی میرے نکاح میں دی اور مہر نہیں لیا، بلال کو اپنے مال سے خرید کر آزاد کیا، ہجرت کے سفر کا سارا بندوبست ابوبکرؓ نے کیا اور ہمیشہ اپنی جان و مال کے ذریعہ میری غمخواری کرتا رہا، سواب مسجد کی طرف کھلنے والے سب دروازے بند کر دو صرف ابوبکر کا دروازہ کھلا رہے۔

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے کمال کا مرتبہ اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ خود علاّم الغیوب ان کے اخلاص کی گواہی دیتا ہے، چنانچہ فرمایا:

اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ۝

مگر واسطے چاہنے مرضی اپنے رب کی جو سب سے برتر ہے

یعنی مال کے خرچ کرنے میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی نفسانیت کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا، محض اللہ کی رضا مقصود ہوتی بلکہ اس میں ثواب کی لالچ اور عذاب کے بچنے کی غرض بھی شامل نہیں ہوتی تھی، چنانچہ صحیح حدیث میں ہے کہ جب ابوبکر صدیقؓ نے بہت سے غلام و باندیاں خرید کر آزاد کئے تو آپ کے والد ابوقحافہ نے آپ سے کہا اگر تم نے غلام باندیاں خرید کر آزاد کرنے ہی ہیں تو اچھے، کام کے چاق وچوبند قسم کے خرید کر آزاد کرو جو تمہارے بھی کسی کام کے ہوں، ایسے جو کسی کام کے نہیں ہیں پھر آزاد کر کے ان کے کھانے کپڑے کی بھی ذمہ داری اُٹھاتے ہو اس سے کیا فائدہ، تو اس وقت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے یہی جواب دیا تھا کہ مجھے ان کے آزاد کرنے میں اللہ کی رضامندی کے علاوہ اور کوئی چیز مقصود نہیں ہے۔

جامع عبدالرزاق میں صحیح طریق سے یہ روایت آئی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مسلمانوں میں سے کسی کے مال نے مجھے اتنا نفع نہیں پہنچایا جتنا ابوبکرؓ کے مال نے نفع پہنچایا، راوی کہتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابوبکرؓ کے مال کو یوں خرچ کرتے تھے جیسے کوئی اپنا مال خرچ کر رہا ہو، اپنے اور ابوبکرؓ کے مال کے درمیان کوئی فرق نہیں سمجھتے تھے، سنن ابن ماجہ میں ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا مجھے جتنا ابو بکرؓ کے مال سے فائدہ پہنچا اتنا کسی کے مال سے فائدہ نہیں ہوا، ابو بکر صدیق بھی وہاں موجود تھے رَو پڑے اور عرض کرنے لگے یا رسول اللہ! میں بھی آپ کا ہوں اور میرا مال بھی آپ کا ہے۔

امام احمدؒ نے بھی اپنی مسند میں اس قصے کو نقل کیا ہے۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ایک خاص منقبت

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مرتبے کی بلندی اور اعلیٰ درجے کے کمال کی یہ بھی دلیل ہے کہ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دلجوئی اور خاطر داری کے لئے اللہ تعالیٰ نے سورۂ والضحیٰ میں ان سے یہ وعدہ کیا "ولسوف یعطیک ربک فترضی" اسی طرح حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے اس سورت میں یہ وعدہ فرمایا:

وَلَسَوْفَ يَرْضٰى ۝

اور آگے وہ راضی ہوگا

یعنی ابو بکرؓ راضی ہوگا، یا اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہوگا۔ اس لئے کہ "یرضیٰ" کی ضمیر میں دو احتمال ہیں، یہ بھی کہ وہ حضرت ابو بکرؓ کی طرف راجع ہو، اور یہ بھی احتمال ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ رہی ہو، بہر حال دونوں صورتوں میں مقصد حاصل ہے۔ ولنعم ما قیل ۔

بخت اگر مدد کند دامنش آورم بکف
گر بکشم زہے طرب ور بکشد زہے شرف

یعنی قسمت اگر ساتھ دے کہ محبوب کا دامن ہاتھ آجائے پھر اگر میں اس کو کھینچوں تو واہ کیا کہنے اور اگر وہ کھینچے تو زہے عزت اور کیا چاہئے۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے کچھ مزید فضائل ومناقب

حضرت جابر بن عبد اللہ سے روایت ہے فرماتے ہیں ایک دن ہم لوگ جن میں بہت سے مہاجرین وانصار تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کے پاس بیٹھے لوگوں کے فضائل کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے، دورانِ گفتگو ہماری آوازیں بلند ہوئیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے، فرمایا کس میں مشغول ہو ہم نے عرض کیا لوگوں کے فضائل کے سلسلے میں گفت وشنید ہو رہی ہے، تب آپ

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر اس طرح کی بات ہو رہی ہے تو سنو! ابو بکرؓ سے بڑا کسی کو نہ سمجھنا وہ تم سب سے افضل ہے دنیا و آخرت میں۔

دار قطنی میں صحیح سند سے روایت ہے حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایک دن میں راستے میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے آگے آگے چل رہا تھا کہ اچانک سامنے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے فرمانے لگے تم اس شخص کے آگے چل رہے ہو جو دنیا و آخرت میں تم سے بہتر ہے، خدا کی قسم انبیاء و مرسلین کے بعد سورج کسی ایسے شخص پر طلوع و غروب نہیں ہوا جو ابو بکرؓ سے بہتر ہو۔

ابن السمان نے "کتاب الموافقة" میں صحیح سند کے ساتھ امام جعفر صادق رحمہ اللہ کی روایت نقل کی ہے وہ اپنے والد امام باقر رحمہ اللہ سے روایت کرتے ہیں وہ اپنے والد امام زین العابدین رحمہ اللہ سے روایت کرتے ہیں، وہ اپنے والد ماجد شہیدِ کربلا حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں اور وہ اپنے والدِ ماجد حضرت امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سُنا کہ انبیاء و مرسلین کے بعد سورج کسی ایسے شخص پر طلوع و غروب نہیں ہوا جو ابو بکرؓ سے بہتر ہو۔

حافظ خطیب بغدادی رحمہ اللہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کرتے ہیں کہ ایک دن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابھی ایک ایسا شخص آئے گا کہ اللہ تعالیٰ نے میرے بعد اس سے بہتر کسی کو پیدا نہیں کیا، قیامت کے دن انبیاء کی طرح اس کی شفاعت قبول کی جائے گی، جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں تھوڑی دیر گذری تھی ابو بکر رضی اللہ عنہ تشریف لائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو گئے، بغلگیر ہوئے اور ان کی پیشانی کا بوسہ لیا۔

معلوم ہوا جس طرح اُمت کی شفاعت کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا مندی ضروری ہے اسی طرح ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی رضا مندی بھی ضروری ہے، اس لئے کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی رضا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا میں فنا ہو چکی تھی۔

واللہ اعلم بالصواب والیہ المرجع والمآب

تم تفسیر سورۃ الیل والحمدللہ

مقدمہ سورۃ الضحیٰ

یہ سورت مکی ہے، اس میں گیارہ (۱۱) آیات، چالیس (۴۰) کلمات اور ایک سو بانوے (۱۹۲) حروف ہیں۔

وجہ تسمیہ

اس کا نام ''الضحیٰ'' اس لئے ہے کہ اس کے شروع میں ضحیٰ کی قسم کھائی گئی ہے۔

ضحیٰ وہ وقت ہے جب دن چڑھ جاتا ہے اور سورج خوب بلند ہو جاتا ہے، رات کی تاریکی کے بعد ہر روز اس وقت کا آنا وحی کے بار بار آنے کی دلیل ہے، اور یہ سورت نازل ہی یہ بتانے کے لئے ہوئی کہ وحی کا نزول مسلسل ہوگا۔

شانِ نزول

چنانچہ اس سورت کے نزول کا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعثت کے بعد مکہ میں اسلام کی دعوت شروع کی تو مکہ والوں نے مدینہ کے یہودیوں کے پاس آدمی بھیجا کہ ہمارے اندر ایک آدمی نبوت کا دعویٰ لے کر کھڑا ہوا ہے اس کی سچائی کو آزمانے کے لئے ہمیں کوئی تدبیر بتاؤ، تم لوگ اہلِ کتاب ہو، تمہارے پاس علم ہے اور پیغمبروں کی علامات سے تم لوگ واقف ہو، کوئی ایسی بات بتاؤ جس سے ہم اس شخص کا امتحان کر سکیں۔

چنانچہ یہودیوں نے ان کو بتایا کہ تم لوگ ان سے تین سوال پوچھو:

(۱) سکندر ذوالقرنین کے حالات پوچھو

(۲) اصحاب کہف کا قصہ پوچھو

(۳) روح کی کیفیت دریافت کرو

''ان شاء اللہ'' کے ترک پر وحی کی بندش

مشرکین مکہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے آکر یہ تین سوال پوچھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں کل ان کا جواب تم لوگوں کو دوں گا، اس موقعہ پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ''ان شاء اللہ'' نہ کہہ سکے،

اس لئے کئی دنوں تک وحی نہ آئی، بعض کہتے ہیں دس دن تک وحی رُکی رہی، بعض چالیس دن کہتے ہیں۔

وحی کے رُک جانے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شدید غم ہوا، ادھر دشمن طعنے دینے لگے، ابولہب برسرِ مجلس کہتا پھر رہا تھا "إن محمدا أو دعه ربه وقلي" محمد کے ربّ نے محمد کو چھوڑ دیا اور اس سے ناراض ہو گیا ہے۔ ابولہب کی بیویوں میں سے ایک نے نہایت بے حیائی سے آ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا "ما أریٰ شطیانک إلا قد ترکک" میں سمجھتی ہوں تیرے پاس جو شیطان آیا کرتا تھا اس نے تجھے چھوڑ دیا ہے۔

ان وحشت انگیز باتوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غم و پریشانی میں اور اضافہ ہوتا، ایک دن اسی غم میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے اسی کا ذکر کر رہے تھے کہ اسی حالت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہونا شروع ہو گئی، اس وقت یہ پوری سورت نازل ہوئی۔

اس سورت کے شروع میں دن کی روشنی اور رات کی تاریکی کے آنے جانے کا ذکر اور اس عالم کے کبھی روشن ہو جانے اور کبھی تاریک ہو جانے کا تذکرہ فرما کر اس بات کی طرف اشارہ فرما دیا کہ عالم دنیا کی حالت یکساں نہیں رہتی، کبھی دن کی روشنی ہے تو کبھی رات کی تاریکی، اُجالے کے پیچھے تاریکیاں ہیں اور تاریکیوں کے بعد اُجالے، سدا کوئی چیز نہیں، اسی طرح وحی کے آنے اور کبھی بند ہو جانے کو سمجھنا چاہئے، اگر کبھی وحی آنا بند ہو جائے تو تنگ دل نہ ہونا چاہئے کہ اس میں بھی بڑی حکمتیں ہیں، جس طرح رات کی تاریکی میں حکمتیں ہیں۔

تمت المقدمة والحمدلله

تفسیر سورة الضحیٰ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَالضُّحٰى ۝

قسم دھوپ چڑھتے وقت کی

چاشت کا وقت سورج کے بلند ہونے اور اس کی بادشاہی کے ظہور کا وقت ہے، اس لئے کہ سورج

دن رات میں دو حرکتیں کرتا ہے ایک حرکت اس کی صعودی (اوپر چڑھنے کی) ہوتی ہے جو نصف شب سے شروع ہو کر دن کے نصف تک رہتی ہے، دوسری حرکت ہبوطی (نیچے اترنے کی) ہوتی ہے جو زوال کے بعد شروع ہو کر نصف شب تک رہتی ہے۔

چاشت کا وقت سورج کی پہلی حرکت کی انتہا کا وقت ہے اور اس وقت کی مشابہت نزول وحی کے وقت کے ساتھ بہت زیادہ ہے (کہ جس طرح اس وقت سورج اپنے کمال شباب مین پورے عالم پر ضیا پاشیاں کرتا ہے اسی طرح) وحی کا وقت حقائق الٰہیہ وکونیہ کے ظہور کا وقت ہوتا ہے۔

چاشت کے وقت کی خصوصیات

چاشت کا وقت بہت سی خصوصیات رکھتا ہے۔

(۱) روزی ومعاش کے لئے محنت کرنے اور علم وہنر حاصل کرنے کا اکثر یہی وقت ہوتا ہے۔

(۲) یہ وقت فرض نماز سے خالی ہونے کی وجہ سے نوافل کے لئے فارغ ہے۔

(۳) یہی وقت ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا تھا۔

(۴) اسی وقت فرعون کے جادوگر موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ دیکھ کر ایمان لائے تھے، اور سجدہ کیا تھا پس یہ وقت باطل کے اندھیرے پر نور حق کے غالب ہونے کا وقت ہے۔

(۵) یہ صلوٰۃ الضحیٰ کا وقت ہے جسکی کم سے کم چار رکعتیں اور زیادہ سے زیادہ بارہ رکعتیں ہیں، اس نماز کے بہت سے فضائل احادیث میں آئے ہیں اور اہل تجربہ کا کہنا ہے کہ جو کوئی فقر وتنگدستی سے ڈرتا ہو اس کو چاشت کی نماز پڑھتے رہنا چاہئے، اور جو قبر کی تاریکی سے گھبراتا ہو اسکو چاہئے کہ تہجد کی نماز پڑھا کرے۔

"مشائخ کے اوراد میں ہے کہ چاشت کی چار رکعتوں میں مندرجہ ذیل چار سوتیں پڑھتے ہیں، سورۃ الشمس، سورۃ الیل، سورۃ الضحیٰ، سورۃ الم نشرح"

وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى ۝

اور رات کی جب چھا جائے

رات کا ڈھانپنا اس وقت ہوتا ہے جب نہ چاند ہو نہ شمع نہ چراغ اور نہ کوئی اور روشنی کا ذریعہ (ایسے

میں سیاہ گھپ اندھیرا ہوتا ہے) اس طرح کی رات زمانہ جاہلیت کا پورا پورا نمونہ ہے، اور چاشت کا وقت چونکہ کامل روشنی کا وقت ہے اس لئے وہ نزول وحی کے وقت کا نمونہ ہے۔

نائبان رسول اور اولیاءِ اُمت کی مثال

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت سے جب وحی کا سلسلہ منقطع ہوگیا تو گویا (آفتاب کے غروب کے بعد) رات آگئی، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفاء راشدینؓ باقی تھے اس لئے یہ ایسی رات تھی جس میں چاند کی چاندنی موجود تھی، جس طرح چاند سورج کا نائب وخلیفہ ہے کہ اس کے غروب کے بعد اس کی روشنی کو اپنے سینے میں سمیٹ کر پورے عالم کو روشن کرنے کے لئے جلوہ گر ہوتا ہے، اسی طرح حضرات خلفاء راشدینؓ نے انوارِ نبوت سے مستفاد ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد دنیا کو روشن کیے رکھا، خلافت راشدہ کا دور گذرنے کے بعد رات کی گھٹا ٹوپ تاریکیوں نے ہجوم کیا تو اہلِ حق میں سے ہر گروہ نے اپنی اپنی بساط کے مطابق کسی نے چراغ، کسی نے شمع اور کسی نے مشعل جلائے رکھی اور تاریکی کو دور کرنے کی کوشش کرتے رہے، یہی وجہ ہے کہ ائمہ مجتہدین کے مذاہب اور اولیاء اللہ کے مختلف طریقے اس نور کے فیضان پہنچانے میں جدا جدا اور مختلف ہوئے ہیں۔

پس چاشت کا وقت مثال ہے اس وقت کی جس وقت قلب محمدی صلی اللہ علیہ وسلم پر نورِ الٰہی کی تجلی و اشراق ہوتا تھا اور رات ظلمتِ بشری کی مثال ہے جو ارواح ونفوس پر چھا کر ہر چیز کو نظروں سے پوشیدہ کر دیتی ہے۔

ایک بحث

یہاں ایک بحث ہے وہ یہ کہ سورۂ واللیل میں پہلے رات کی قَسم کھائی اور پھر دن کی اور سورہ ضحیٰ میں پہلے دن کی قَسم کھائی پھر رات کی قَسم کھائی، اس کی کیا وجہ ہے؟

مفسرین فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے رات ودن میں سے ہر ایک کی اپنی اپنی فضیلت وخصوصیت رکھی ہے، رات اگر آرام، سکون، پردہ پوشی کا وقت ہے تو دن بھی تلاش معاش وغیرہ دیگر فوائد کے حصول کا وقت ہے، تو قَسم کھانے میں کبھی دن کو مقدم کیا اور کبھی رات کو تاکہ تقدیم کی فضیلت دونوں کو حاصل ہو۔

یہاں سے اسد طوسی کی غفلت بھی معلوم ہوئی، کہ اس نے دن رات کے مناظرے کے سلسلے میں جو اشعار کہے ہیں اس میں اس نے کہا ہے اللہ تعالیٰ نے رات سے پہلے دن کی قسم کھائی ہے، تو سورۂ والیل سے وہ غافل رہا اس لئے یہ کہہ گیا ورنہ سورۂ والیل میں رات کی قسم پہلے کھائی گئی ہے، اب اسد طوسی کے وہ تمام ابیات جو فارسی میں ہیں ذکر کئے جاتے ہیں۔

بشنو از مبحث گفتار و روز بہم سرگذشتیکہ زدل دور کند شدتِ غم
ہر دو راخاست جدا از سبب بیشی فضل درمیان رفت فراوان سخن از مدحت و ذم
گفت شب فضل من از روز فزوں آمد زانکہ روز را کرد زشب باز خداوندِ قدم
نزد یزدان زہر ستندۂ از عابد روز ساجد و عابد شب راست فزوں قدر و قیم
قوم راسوئے مناجات بشب برد کلیم ہم بشب گشت جدا لوط زبیدا دوستم
قمر چرخ بشب کرد محمد بدو نیم سوئے معراج بشب رفت ہم از بیت حرم
ہست در روز سہ اوقات منع است نماز در نماز ہمہ شب فخر نبی بود و امم
آسمان از تو بود ہمچو یکے فرشِ کبود و زمن آراستہ برمثلِ یکے باغِ ارم
ہر ماہ و سال عرب راعدد از ماہِ من ست نیز از ماہِ من ست از پے جبریل رقم
روز کین قصہ شنیدہ شدہ آشفتہ و گفت خامشی کن چہ در آئی بسخن بس محکم
روز راعیب بطعنہ چہ کنی کا یزد عرش روز را پیش زتو کرد ستائش بقسم
روزۂ خلق کہ دارند بروزست ہمہ بہ حرم حج بروز ست ہم ازبیتِ حرم
روز خواہد کہ بود خاستن خلق بحشر روز شد نیز وجود ہمہ مردم زعدم
روی آفاق زمن خوب نما یدز توزشت دیدۂ خلق زمن نور افزاید زتونم
مرمرا گونۂ اسلام و ترا گونۂ کفر مرمرا جامۂ شادی و ترا جامۂ غم
سپہ و خیل توچہ باشند کہ پاک بگر یزند چو خورشید من افراخت علم
گرزِماہ تو شناسند مہ و سال عرب زآفتابم ہمہ دانند مہ و سال عجم
ماہِ تو از ضو خورشیدِ من افزاید نور از پے خدمتِ خورشید کند پشت نجم

از فریضہ سہ نمازست بروز و دو بشب
زاں نمازِ تو کم آمد زمن ہستی کم

سورۂ لیل میں رات کی قَسم اور والضحٰی میں دن کی قَسم کو مقدم کرنے میں نکتہ

اب ہم اپنے مطلب کی طرف آتے ہیں کہ سورۂ لیل میں رات کی قَسم اور سورۂ ضحٰی میں دن کی قَسم کو مقدم کرنے کی کیا وجہ ہے؟

سو وجہ یہ ہے کہ سورۂ لیل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شان میں نازل ہوئی ہے اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو نورِ اسلام سے پہلے کفر کی تاریکی لاحق تھی (اس لئے ان کے مناسب یہ ہوا کہ ان کی شان میں نازل ہونے والی سورت میں پہلے رات کی پھر دن کی قَسم کھائی جائے)

اور سورۂ ضحٰی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں نازل ہوئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ابتداء سے ہی نورِ عصمت حاصل تھا اس لئے والضحٰی کو ''دن'' کے ذکر سے شروع کیا کہ دن روشن ہونے میں نورِ ایمان کی طرح ہے۔

ایک اور لطیف نکتہ

اس جگہ ایک اور لطیفہ ہے کہ اگر رات کے ذکر سے ابتدا کریں جو ابوبکر صدیق کے حال کے مناسب ہے اس کے بعد ترقی کرکے اوپر جائیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پائیں گے جو دن کے مانند ہیں، کہ رات کے بعد دن آتا ہے، اور اگر بات دن کے ذکر سے شروع کریں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشابہ ہے پھر اس سے نزول کریں تو بلا فاصلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ابوبکر صدیق کو پائیں گے جیسے دن کے بعد متصلاً بلا فاصلہ رات آتی ہے، یہ لطیفہ ان کی رفاقت و دوستی کی بہترین تمثیل ہے کہ زندگی میں غار کے واقعے میں اور دیگر صحبتوں میں ان دونوں کا ایک ساتھ رہنا اور انتقال کے بعد مدفن میں ایک ساتھ ہونا سب کے سامنے ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ سورت کے شروع میں دن و رات کی قَسم کھا کر اس طرف اشارہ فرمایا کہ ہم کبھی دن کو بڑھا دیتے ہیں اور رات کو گھٹا دیتے ہیں اور کبھی رات کو بڑھا دیتے ہیں اور دن کو گھٹا دیتے ہیں، سو اس گھٹانے بڑھانے میں کسی کی محبت یا عداوت کسی سے رضامندی یا ناراضی کا دخل نہیں بلکہ اس میں سراسر حکمت و مصلحت ہوتی ہے، اسی طرح رسالت و وحی کے نزول کے معاملے کو بھی سمجھنا چاہئے، کہ کبھی اس سلسلے میں کچھ وقفہ و تاخیر ہوتی ہے اور کبھی مسلسل فیضان جاری ہو جاتا ہے، اس میں بھی مصلحت ہوتی

ہے (وقفہ وتاخیر کسی ناراضگی کی وجہ سے نہیں ہے جیسا کہ یہ جاہل مشرکین اعتراض کرتے ہیں)

دن، رات کی قسم میں مزید نکات ولطائف

(۱) یہاں ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ جب کفار نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر الزام لگایا کہ تجھے تیرے پروردگار نے چھوڑ دیا ہے وہ تجھ سے ناراض ہوگیا ہے تو یہ ان کا ایک دعوٰی تھا جس کے وہ مدعی تھے، اور مدعی پر شاہد لانا ضروری ہوتا ہے اور منکر کے ذمے قَسم ہوتی ہے، سو جب وہ لوگ اپنے دعوے پر شاہد نہیں لا سکے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو ان کے اس دعوے کے منکر تھے اُنہوں نے قَسم کھائی اور ان کے دعوے کا انکار کیا اور اللہ تعالیٰ نے ان سے دن رات کی قَسم کھِلائی)

(۲) اور دن رات کی قَسم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے یہ اشارہ ہے کہ گھٹنا بڑھنا تو دن رات میں بھی لگا ہوا ہے اس لئے مخلوق کی زبان سے بھی آپ کو ایک ہی چیز (مدح وتعریف) کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔

(۳) اور یہ بھی نکتہ ہے دن رات کی قَسم میں کہ چونکہ رات تنہائی اور وحشت کا وقت ہے اور دن لوگوں سے ملنے جلنے اور کام کاج کا وقت ہوتا ہے تو گویا یوں ارشاد فرمایا کہ خوش ہو جایئے انقطاع وحی کی وحشت کے بعد فرشتوں سے مل بیٹھنا آپ کو میسر آئے گا۔

(۴) یہ نکتہ بھی ہے کہ دن عیش ومسرت کا وقت ہوتا ہے اور رات غم و وحشت کا، تو دن رات کی قَسم کھانے میں دن کے صرف چاشت کے وقت کی قَسم کھائی جو دن کا بہترین حصہ ہوتا ہے اور رات پوری کی قَسم کھائی (اس کے کسی مخصوص کی قَسم نہیں کھائی) اس سے اشارہ فرمادیا اس بات کی طرف کہ دنیا کے غم اس کی خوشی سے بہت زیادہ ہیں۔

ضحیٰ ولیل کی مراد میں مفسرین کے اقوال

(۱) بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ ''ضحیٰ'' سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کا دن ہے اور ''لیل'' سے مراد معراج کی رات ہے۔

(۲) بعض کہتے ہیں کہ ''ضحیٰ'' سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ انور ہے اور ''لیل'' سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زلفوں کی سیاہی ہے۔

(۳) بعض کہتے ہیں کہ ''ضحیٰ'' سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا دن ہے اور ''لیل'' سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کی رات ہے۔

(۴) بعض کہتے ہیں کہ ''ضحیٰ'' سے مراد وہ نورِ علم ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا ہوا تھا جس کے بسبب عالمِ غیب کے اسرار آپ پر منکشف ہوئے، اور ''لیل'' سے مراد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عفوو بخشش کے وہ اخلاق ہیں جن کی وجہ سے اُمت کے عیوب کو چھپالیا۔

(۵) بعض کہتے ہیں ''ضحیٰ'' سے مراد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ ظاہری حالات ہیں جن سے لوگ آگاہ ہوسکے اور ''لیل'' سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ باطنی اور پوشیدہ احوال مراد ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی مطلع نہ ہوسکا۔

(۶) بعض کہتے ہیں ''ضحیٰ'' سے مراد اسلام کی ترقی وعروج کا زمانہ ہے اور ''لیل'' سے اسلام کا وہ زمانہ مراد ہے جس میں اسلام کمزور واجنبی ہوجائے گا چنانچہ حدیث میں ہے: ''بدأ الإسلام غريبا و سيعود غريباً'' اسلام کی ابتدا اجنبی ہونے کی حالت میں ہوئی تھی عنقریب اسلام پھر اجنبی ہوجائے گا۔

(۷) بعض کہتے ہیں ''ضحیٰ'' سے مراد زندگی کا زمانہ ہے اور ''لیل'' سے مراد قبر میں جانے کا وقت ہے، اور یہ سب باتیں ہوسکتی ہیں (سب کے مراد ہونے میں کوئی تعارض نہیں ہے)

مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى ۝

نہ رخصت کردیا تجھ کو تیرے رب نے اور نہ بیزار ہوا

یعنی جتنے عرصے تک جو وحی بند رہی نہ تو اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ کی تربیت میں کچھ قصور ہے اور نہ اس وجہ سے کہ آپ کی صفاتِ کمال میں کچھ نقص یا کمی واقع ہوئی ہے، بلکہ یہ سب اس کی حکمت کے مطابق ہوا ہے، اور عنقریب اسی طرح وحی کا سلسلہ جاری ہوجائے گا جیسے رات کے بعد دن آتا ہے، اور اگر کبھی ظلمتِ بشریت کے درآنے کی وجہ سے انقطاعِ وحی کے آثار معلوم ہوں تو آپ فکرمند نہ ہوں آخرکار نورِ حق غالب ہوکر رہے گا اور ظلمت بشریت مٹ جائے گی اور آپ کو ایسا وصال نصیب ہوگا کہ جس کے بعد جدائی نہ ہوگی، چنانچہ فرماتے ہیں:

وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى ○

اور البتہ پچھلی بہتر ہے تجھ کو پہلی سے

یہاں تک کہ تیری بشریت مغلوب ہو جائے گی اور ہمیشہ تجھ پہ نورِ حق کا غلبہ رہا کرے گا۔(۱)

اور آخرت سے دارِ آخرت مراد لینا بھی صحیح ہے کہ آخرت کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عزت وسرداری کا وہ مرتبہ ومقام عطا ہوگا کہ سارے انسان انہی کے جھنڈے تلے جمع ہوں گے، سب لوگ ان کی شفاعت کے محتاج ہوں گے، حوضِ کوثر سے سیرابی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ذریعہ ہوگی، پھر اللہ کی اجازت سے لوگوں کو مقامات ومرتبے تقسیم کرکے دیں گے، جو جس مرتبے کے لائق ہوگا اس کو وہ عطا کریں گے۔

''ربّک'' کے لفظ میں عظیم تسلّی

یعنی یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ جس مالک نے آپ کی ہر طرح سے پرورش کی اور خاص انداز سے تربیت کی یہاں تک کہ اس مقام تک پہنچایا کہ بغیر کسی مرشد یا پیغمبر کے واسطے کے آپ کی روح مبارک پر اپنے نور کی تجلی فرمائی وہ آپ کو چھوڑ دے، یہ بات تو مجازی آقا و مالک سے بھی بعید ہے چنانچہ مشہور ہے ''نواختہ را نباید انداخت'' کہ اپنے نوازے ہوئے کو گرایا نہیں کرتے، چہ جائیکہ کہ مالکِ حقیقی ایسا کرے جو ہر چیز کو پیدا کرنے سے پہلے اس کی استعداد وصلاحیت اور کردار کو جانتا ہے اور اسی کے مطابق کسی کو خاص مقام ومنصب کے لئے منتخب کرتا ہے۔ اور کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

چوں بعلم ازل مرا دیدی
دیدی آنکہ بعیب بگزیدی

من بعیب آن و تو بعلم ہماں
رد مکن اُنچہ خود پسندیدی

ترجمہ:۔ جس وقت تو نے مجھے علم ازل کے ساتھ دیکھا، دیکھا اور عیب کے ساتھ اس گھڑی پر چیدہ کیا، میں اسی عیب کے ساتھ ہوں اور تو بھی اسی علم کے ساتھ وہی ہے، اپنی پسند کی ہوئی چیز کو رد نہ کر۔

(۱) بشریت کے مغلوب ہونے سے مراد بشری تقاضے ہیں، کہ وہ اللہ کے قرب کے انوار سے اس طرح مغلوب ہو جائیں گے کہ ان کے خلاف کرنے میں آپ کو ادنیٰ تکلف نہ ہوگا۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔ سفیر احمد

اب یہ سمجھنا چاہئے کہ جس طرح دنیا والوں میں یہ دستور ہے کہ جب کوئی مہربان مالک اپنے کسی خادم کو کسی خاص خدمت پر مامور کرتا ہے اور وہ خادم پورے استقلال و کمال سے اس خدمت میں مشغول ہو جاتا ہے تو اس کے حاسدین بے اصل اور جھوٹی باتیں مشہور کرنا شروع کر دیتے ہیں، کہ اس کو مالک نے معزول کر دیا ہے، اس سے مالک ناراض ہو گیا ہے وغیرہ وغیرہ، ایسے وقت میں اس کا مالک ان غلط افواہوں کو بے اثر کرنے کے لئے اس خادم پر خصوصی الطاف وعنایات اور تسلی و خاطر داری کا معاملہ کرتا ہے، تاکہ ان جھوٹی باتوں کی وجہ سے اس کو جو کچھ گرانی و تکلیف ہوئی ہے اس کا تدارک ہو سکے، چنانچہ اس کے عہدے و منصب میں ترقی دینے کا اعلان کرتا ہے، سو آنے والا کلام بھی اسی نوعیت کا ہے۔

وَلَسَوۡفَ يُعۡطِيۡكَ رَبُّكَ فَتَرۡضٰى ؈

اور آگے دے گا تجھ کو تیرا رب پھر تو راضی ہوگا

بے انداز عنایات کا وعدہ

یعنی تیرا رب اتنا کچھ تجھے دے گا کہ تیری استعداد کا جام لبریز ہو جائے گا، پھر تیری کوئی آرزو یا خواہش باقی نہیں رہے گی۔

یہ وعدہ اپنے اندر عطا و بخشش کے اعتبار سے اتنی وسعت رکھتا ہے کہ اندازہ کرنا مشکل ہے، اس لئے کہ اس وعدہ کے مخاطب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظیم ہستی ہے، ان کے حوصلے و استعداد کے لحاظ سے دیکھیں تو خیال کیا جا سکتا ہے کہ آخر وہ کس قدر عنایات و بخششیں ہوں گی جن سے یہ عظیم و وسیع ظرف بھر جائے گا۔

حدیث میں ہے جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے فرمایا میں تو اس وقت تک راضی نہ ہوں گا جب تک اپنی اُمت میں سے ہر شخص کو جنت میں داخل نہیں کر لوں گا۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر جو کچھ عنایات آپ کی روح کی پیدائش سے لے کر جنت میں داخل ہونے تک ہوتی رہیں اور رہیں گی، وہ احاطۂ شمار سے باہر ہیں البتہ ان کا کچھ اجمالی بیان کیا جائے گا۔

پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ انسانوں میں بھی جب کوئی اپنے اہل تعلق میں سے کسی کو اپنا پیارا اور محبوب بناتا ہے تو اس کو لباس، سواری اور بیٹھنے کی جگہ اور ہر اعتبار سے ایک امتیازی مقام دیتا ہے تا کہ عام وخاص کی نظروں میں اس کا محبوب ہونا ظاہر ہو جائے۔

دربارِ خداوندی سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کی گئی خصوصیات

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دربارِ خداوندی سے دو قسم کی خصوصیات عطا فرمائی گئی ہیں۔

پہلی قسم تو وہ خصوصیات ہیں جس میں دوسرے انبیاء کرام بھی آپ کے ساتھ شریک ہیں، البتہ آپ کو ان خصوصیات میں دوسرے پیغمبروں سے ممتاز فرمایا ہے کہ جس مقام تک ان خصوصیات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچایا دوسرا کوئی وہاں تک نہیں پہنچ سکا۔

دوسری قسم ان خصوصیات کی ہے کہ جو صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہی خاصہ ہے ان میں دوسرا کوئی شریک نہیں ہے۔

ہم ان دونوں قسموں سے اختصار کے ساتھ یہاں کچھ ملی جلی خصوصیات کا ذکر کرتے ہیں تا کہ اس آیت کو پڑھنے سننے والے اچھی طرح سے سمجھ سکیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی خصوصیات

(۱) حضور صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح سامنے دیکھتے تھے اسی طرح اپنے پیچھے بھی دیکھتے تھے۔

(۲) رات کی تاریکی میں ایسا ہی دیکھتے تھے جیسے دن کی روشنی میں دیکھتے تھے۔

(۳) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا لعاب مبارک کھاری پانی کو میٹھا کر دیتا تھا نیز شیر خوار بچوں کے منہ میں اس کا ایک قطرہ ڈال دینے سے بھی وہ سارے دن کے لئے سیر ہو جاتے تھے چنانچہ عاشورہ کے دن اہل بیت کے بچوں میں اس کا تجربہ ہوا تھا۔

(۴) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بغلیں نہایت سفید، نہایت اجلی اور شفاف تھیں ان میں بال نہیں تھے۔

(۵) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز اتنی دور جاتی تھی کہ دوسرے کی اسکے دسویں حصے تک نہ جاتی تھی۔

(۶) اور اتنی دور سے آواز سن لیتے تھے کہ دوسرا اتنی دور سے نہیں سن سکتا تھا۔

(۷) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھیں سوتی تھیں مگر دل بیدار رہتا تھا۔

(۸) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی جمائی نہیں آتی تھی۔

(۹) کبھی احتلام نہیں ہوا تھا۔

(۱۰) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا پسینہ مشک سے زیادہ خوشبودار تھا جس راستے سے گذر جاتے اس کی فضاؤں میں مہکتی ہوئی خوشبو سے لوگ معلوم کر لیتے تھے آپ ادھر سے گذرے ہیں۔

(۱۱) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فضلات کو کبھی کسی نے زمین پر نہیں دیکھا، ان کو زمین نگل لیتی تھی اور وہاں سے مشک کی خوشبو مہکتی تھی۔

(۱۲) آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب پیدا ہوئے تو ختنہ کیے ہوئے ناف کٹے ہوئے اور پورا جسم ہر طرح کی آلودگی سے پاک صاف تھا، زمین پر سجدہ کرتے ہوئے اور انگلی آسمان کی طرف اُٹھائے ہوئے تھے۔

(۱۳) جب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) پیدا ہوئے تو ایسا نور چمکا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی والدہ کو اس سے شام کے شہر نظر آئے۔

(۱۴) فرشتے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جھولا جھولاتے تھے۔

(۱۵) چاند جھولے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے باتیں کرتا تھا، آپ جب اس کی طرف اشارہ کرتے تو آپ کی طرف جھکتا تھا۔

(۱۶) بادل آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر سایہ کیا کرتا تھا۔

(۱۷) درخت کے نیچے آتے تو اس کا سایہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہو جاتا، آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا سایہ زمین پر نہیں گرتا تھا۔

(۱۸) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کپڑوں پر کبھی مکھی نہیں بیٹھتی تھی۔

(۱۹) جس جانور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سوار ہوتے، آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سوار ہونے کی حالت میں وہ لید اور پیشاب نہیں کرتا تھا۔

(۲۰) عالم ارواح میں سب سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پیدا کیے گئے۔

(۲۱) "الست بربکم" کے جواب میں سب سے پہلے "بلیٰ" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا۔

(۲۲) معراج صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوا۔

(۲۳) براق سواری صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہے۔

(۲۴) "قاب قوسین" تک پہنچنا اور دیدارِ الٰہی سے مشرف ہونا آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خصوصیت ہے۔

(۲۵) یہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہے کہ فرشتوں کے لشکر آپ کے ہمراہ لڑے۔

(۲۶) چاند کے دو ٹکڑے کرنا بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی خصوصیت ہے۔

(۲۷) قیامت کے دن جو کچھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کیا جائے گا اتنا اور کسی کو عطا نہ ہوگا۔

(۲۸) قبر سے سب سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اُٹھیں گے۔

(۲۹) صور پھونکے جانے کے بعد سب سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہوش میں آئیں گے۔

(۳۰) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو براق پر میدان حشر میں لایا جائے گا اس طرح کہ ستر ہزار فرشتے آپ کے دائیں بائیں ہوں گے اور عرشِ عظیم کے دائیں طرف کرسی پر بٹھائے جائیں گے۔

(۳۱) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مقامِ محمود سے سرفراز کیا جائے گا۔

(۳۲) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں لواءِ حمد (حمد کا پرچم) دیا جائے گا، حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر تمام بنی آدم اُس پرچم تلے جمع ہوں گے، تمام انبیاء بھی اپنی اُمتوں سمیت آپ کے پیچھے چلیں گے۔

(۳۳) دیدارِ الٰہی کی ابتداء آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوگی۔

(۳۴) شفاعتِ کبریٰ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا ہوگی۔

(۳۵) پلصراط سے سب سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم گذریں گے، نیز سارے محشر والوں کو حکم ہوگا کہ نگاہیں نیچی کرو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہا پلصراط سے گذرنے والی ہیں۔

(۳۶) سب سے پہلے جنت کا دروازہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھولیں گے۔

(۳۷) قیامت کے دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مقامِ وسیلہ سے مشرف کیا جائے گا۔ وسیلہ ایک انتہائی اعلیٰ و بلند مرتبہ ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ اور کسی کو عطا نہ ہوگا، اور حقیقت اس کی یہ ہے کہ قیامت کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ قرب کا ایسا درجہ حاصل ہوگا جیسے وزیر کو بادشاہ سے ہوتا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کی خصوصیات

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کو دیگر شریعتوں کے مقابلے میں جو خصوصیات عطا کی گئی وہ بھی بے شمار ہیں چند ایک یہ ہیں:۔

(۱) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت میں مالِ غنیمت حلال کیا گیا۔

(۲) ساری زمین آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مسجد بنادی گئی جہاں چاہیں نماز ادا کر سکتے ہیں۔

(۳) زمین کی مٹی کو پانی کی طرح پاک کرنے والی بنادیا گیا (یعنی تیمم کی اجازت دی گئی)

(۴) پانچ وقت کی نماز، وضوء کا مخصوص طریقہ

(۵) اذان (۶) اقامت (۷) سورۂ فاتحہ (۸) جمعہ

(۹) جمعے کے دن کی خاص قبولیت کی گھڑی (۱۰) امین (۱۱) رمضان شریف

(۱۲) لیلۃ القدر

یہ سب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کی خصوصیات ہیں۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ خصوصیات ہیں جو ظاہر ہیں۔ اور آپ کی وہ خصوصیات جو باطنی ہیں اور وہ انوار وتجلیات جو مسلسل بڑھتے رہے، اسی طرح آپ کی اتباع وفرمانبرداری کی بدولت آپ کے اُمتیوں کو جو احوال ومقامات اور جو علوم ومعارف حاصل ہوئے ہیں، آئندہ قیامت تک حاصل ہوں گے وہ سب حدوحساب سے باہر ہیں، اور آیت "لسوف" میں ان سب نعمتوں کی طرف اشارہ فرمادیا ہے، اسی لئے کسی خاص نعمت اور اس کی خاص کیفیت وکیت کو ذکر نہیں فرمایا۔

وعدے کی پختگی پر بطور دلیل کے گذشتہ نعمتوں کا ذکر

جب مستقبل میں کسی کو کوئی نعمت دینے کا وعدہ کیا جائے تو ایسے موقعے پر اس وعدے کے سچا ہونے اور مضبوط و پختہ ہونا باور کرانے کے لئے گذشتہ نعمتوں کو ذکر کردیا جاتا ہے تاکہ سننے والا آئندہ کی نعمتوں کے حصول کو گذشتہ نعمتوں پر قیاس کر کے یقینی سمجھے اور اس کی تسلی خاطر ہو۔

چنانچہ اسی لئے یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آئندہ کی نعمتوں کے وعدے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کی گئیں کچھ ان گذشتہ نعمتوں کا ذکر کرتے ہیں جن کے بارے میں کسی کو معلوم نہیں

کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کس خدمت کے عوض یہ نعمتیں عطا فرمائی گئی تھیں، چنانچہ فرماتے ہیں:

اَلَمْ یَجِدْكَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی ۝

بھلا نہیں پایا تجھ کو یتیم پھر جگہ دی

یتیمی میں ٹھکانے دینے کی نعمت کا بیان یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ابھی بطنِ مادر میں ہی تھے کہ آپ کے والد حضرت عبداللہ وفات پاگئے، پھر جب آپؑ چھ سال کے ہوئے تو والدہ انتقال کر گئیں، اور دو برس کے بعد دادا بھی فوت ہو گئے، ماں، باپ اور دادا تینوں کے فوت ہو جانے سے گویا آپ تین طرح کی یتیمی کا شکار ہوئے۔

ایسی حالت میں اندیشہ تھا کہ یہ بچہ ضائع ہو جائے گا، مگر اللہ تعالیٰ نے شروع سے آپ کی پرورش کی یہ صورت پیدا فرمائی کہ والد کے انتقال کی صورت میں دادا اور ماں کے دل میں آپ کی ایسی محبت ڈالی کہ شفقت پدری کی کمی پوری ہوگئی، اور دادا آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق کی حد تک پیار کرتے کسی لمحے آپ سے بے فکر نہ ہوتے تھے، پھر دادا کی وفات کے بعد ان کی وصیت کے مطابق آپ کے چچا ابو طالب نے آپ کو اپنی پرورش میں لیا، اور اُنہوں نے والد کی وصیت کے مطابق زندگی بھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دیکھ بھال میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم سن بلوغت کو پہنچے، پھر سارے کمالات کے جامع بن کر ساری قوم کو فخر و عزت سے سرفراز کیا۔

وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰی ۝

اور پایا تجھ کو بھٹکتا پھر راہ سجھائی

اس آیت میں ہدایت و ضلالت کے معنی کی تحقیق

بات اصل میں یہ ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالغ ہوئے اس کے بعد عقل و دانائی کے کمال تک پہنچے تو آپ اچھی طرح سمجھ گئے کہ یہ بتوں کی پوجا پاٹ، اور کفر و جاہلیت کی یہ تمام رسوم بالکل بے اصل اور انتہائی بے ہودہ کام ہیں یہ اصل دین نہیں ہے، چنانچہ آپ کو اصل دین کی جستجو پیدا ہوئی، بڑے بوڑھوں سے سنا کہ ہمارا اصل دین دینِ ابرہیمی ہے، اب آپ کو یہ فکر سوار ہوگئی کہ میں بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین کے مطابق اللہ کی عبادت کروں اور جو اللہ کی مرضی ہے اس کے

مطابق زندگی گذاروں مگر نہ تو دینِ ابراہیمی کی پوری تفصیلات کسی کو یاد تھیں اور نہ وہ کسی کتاب میں لکھا ہوا مدوّن تھا، اور لکھا ہوا ہوتا بھی تو آپ پڑھنا نہیں جانتے تھے، چنانچہ آپ کی بے چینی و بے قراری بڑھتی چلی گئی اور اسی بے چینی کے عالم میں دینِ ابراہیمی کی جو چند باتیں دھندلی سی لوگوں میں یاد چلی آتی تھیں مثلاً ذکر و تسبیح کے کلمات، اعتکاف، جنابت کا غسل، حج کے کچھ مناسک اور خلوت و گوشہ نشینی وغیرہ آپ نے انہی پر عمل شروع کر دیا مگر مکمل طور پر بے قراری ختم نہ ہوئی، اسی اثناء میں اللہ تعالیٰ نے آپ پر وحی بھیجی، کچھ اصول کی وحی ہوئی پھر فروعی احکام کی تفصیلات رفتہ رفتہ نازل ہونا شروع ہوئیں تب آپ کی وہ بیقراری دور ہوئی جو دینِ حق کی تلاش میں آپ پر اس طرح سوار ہوگئی تھی گویا آپ کی کوئی چیز کھوگئی ہے، اور جس راستے پر آپؐ چلنے چاہتے ہیں گویا وہ آپ کو سجھائی نہیں دے رہا ہے سو اسی وجہ سے اس بے قراری کو یہاں ''ضالًا'' سے تعبیر فرما دیا۔

مفسرین کے دور از کار اقوال

مفسرین اصل بات نہیں سمجھ سکے اس لئے ''ضالًا'' کی تفسیر میں وہ بہت دور دراز تک چلے گئے جس کی ضرورت نہیں تھی۔

(۱) بعض نے کہا کہ ''ضالًا'' سے مراد حقیقت میں راستہ بھٹکنا ہے چنانچہ بچپن میں ایک مرتبہ آپؐ مکہ میں راستہ بھول گئے تھے، اتفاق سے ابوجہل اپنی اونٹنی پر سوار ادھر آ نکلا وہ آپ کو ساتھ بٹھا کر عبدالمطلب کے پاس لایا، اور کہنے لگا معلوم نہیں ہم کو اس لڑکے سے آئندہ کیا پیش آنے والا ہے، عبدالمطلب نے پوچھا کیوں؟ تو کہنے لگا یہ ایک درّے میں بھٹکتا ہوا پھر رہا تھا میں نے دیکھا تو اپنے پیچھے سوار کیا مگر اونٹنی بیٹھ جاتی، پھر مجبور ہو کر سوچا آگے بٹھا کر دیکھوں، آگے بٹھایا تو اونٹنی چلنا شروع ہوگئی، یہ عجیب بات اس کی میں نے دیکھی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے فرعون کے گھر میں پرورش پانے کے مشابہ ہے کہ فرعون دشمن کے ہاتھوں موسیٰ کی پرورش ہوئی اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن ابوجہل نے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو گھر تک پہنچایا۔

(۲) بعض آپؐ کے راستہ بھولنے کا ایک اور واقعہ بیان کرتے ہیں اور (ضالًا کی تفسیر قرار دیتے ہیں) وہ یہ کہ ایک مرتبہ دائی حلیمہ رضی اللہ عنہا آپ کو آپ کے دادا عبدالمطلب کے گھر پہنچانے لائیں،

مکہ معظمہ کے دروازے پر پہنچیں تو اچانک آپ گم ہو گئے، وہ پریشان ہو کر بھاگتی ''ہبل'' بت کے پاس پہنچیں اور رونے لگیں، آپ کی بازیابی کے لئے بتوں سے فریاد کرتے ہوئے جب حلیمہ نے آپ کا نام لیا تو تمام بت منہ کے بل گر گئے اور (اللہ کی قدرت سے) ان کے اندر سے آواز آنے لگی کہ یہ کس کا نام لے رہی ہو اسی کے ذریعہ تو ہماری تباہی و بربادی آئے گی۔

ادھر حضرت جبرئیل علیہ السلام ہاتھ سے پکڑ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دادا عبدالمطلب کے پاس پہنچا کر آ گئے، دائی حلیمہ یہاں سے مایوس ہو کر عبدالمطلب کو خبر دینے جب ‏ؒہاں پہنچیں تو دیکھا کہ آپ دادا کے پاس بیٹھے ہوئے ہیں، دائی خوشی کے ساتھ حیرت میں چلی گئیں، یہ حضرات کہتے ہیں ''ووجدک ضالا فھدیٰ'' میں اس قصے کی طرف اشارہ ہے۔

(۳) بعض نے کہا ہے کہ راہ گم کرنے سے مراد ہجرت کا رُخ ہے، کہ آپ کو اشتباہ ہو گیا تھا کہ کس طرف چلنا چاہئے، پھر معلوم ہو گیا۔

(۴) یا راہ گم کرنے سے سمت قبلہ مراد ہے۔

(۵) یا راہ گم کرنے سے مراد جبرئیل کا پہلی ملاقات میں نہ پہچاننا ہے۔

(۶) یا راہ گم کرنے سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دنیوی معاملات سے بے خبری ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ ان معاملات کا اشتغال نہیں رکھتے تھے اس لئے آپ ان کو نہیں جانتے تھے۔

(۷) یا راہ گم کرے سے مراد آسمان کے راستے ہیں کہ معراج سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے گم ہی تھے آپ ان کو نہیں جانتے تھے۔

(۸) بعض نے کہا کہ ''ضلال'' اختلاط اور گھل مل جانے کے معنی میں ہے چنانچہ کہا جاتا ہے:

''ضل الماء فی اللبن'' کہ پانی دودھ میں مل گیا، کہ اب فرق امتیاز نہیں ہو سکتا، اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی کفار میں گھلے ملے رہتے تھے اس طرح کہ کوئی فرق و امتیاز نہیں ہوتا تھا جس سے آپ کو کوئی ممتاز سمجھ سکے۔

(۹) بعض نے کہا ہے کہ ''ضلال'' کے معنی عشق و محبت کا مرتبہ ہے (گویا معنی یہ ہوا کہ ہم نے آپ کو محبت والا پایا پس ہدایت دی) اور ''ضلال'' عشق کے معنی میں قرآن میں دوسری جگہ استعمال ہوا ہے،

چنانچہ یعقوب علیہ السلام کو یوسف علیہ السلام سے عشق تھا اس کو آپ کے بیٹوں نے ''ضلال'' کے لفظ سے ہی تعبیر کیا ہے، چنانچہ انہوں نے یعقوب علیہ السلام سے کہا تھا:

''انک لفی ضلالک القدیم'' یعنی آپ پُرانے عشق میں ہی گرفتار ہیں۔

اور ہدایت کے معنی اس صورت میں یہ بیان کرتے ہیں کہ ہم نے تجھے اپنے محبوب سے ملنے کی راہ بتلا دی۔

الغرض مفسرین کی باتیں اسی طرز کی ہیں (جو کچھ دقیع نہیں ہیں۔ صحیح معنی وہی ہے جو شروع میں بیان ہوا)

انبیاء کرام نبوت سے پہلے بھی معصوم ہوتے ہیں

البتہ یہاں اتنا سمجھ لینا چاہئے کہ انبیاء کرام نبوت سے پہلے اور نبوت کے بعد بھی ہر طرح کی گمراہی اور طبعی کفر سے معصوم ہوتے ہیں، بلکہ جان بوجھ کر گناہ کرنے سے بھی معصوم ہوتے ہیں۔

چنانچہ حدیث میں آتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں نے جاہلیت کے کاموں میں کبھی دلچسپی نہیں لی صرف دو مرتبہ ایسا ہوا مگر اللہ تعالیٰ نے اپنی حفاظت میں رکھا اور ارادے کے باوجود جاہلیت کے کاموں میں شریک نہ ہو سکا۔ واقعہ اس طرح ہے کہ ایک مرتبہ بچپن میں مکہ سے باہر بکریاں چرا رہا تھا میرا ایک اور ساتھی بھی تھا، اس دن مکہ شہر میں ایک جگہ کچھ نوجوان قصّے کہانیاں سنانے جمع ہوئے تھے، میں نے ساتھی سے کہا تم آج کی رات میری بکریاں بھی لے جانا میں آج رات فلاں جگہ کہانیاں سننے جاؤں گا، چنانچہ میں چلا گیا، ابھی شہر میں ایک مکان کے پاس سے گذرا کہ کچھ گانے بجانے کی آواز سنائی دی میں نے کسی سے پوچھا یہاں کیا ہو رہا ہے، بتایا گیا کہ شادی ہے میں نے سوچا چلو یہ تماشا بھی دیکھ لوں، مجلس میں چلا گیا اور بیٹھتے ہی اللہ تعالیٰ نے مجھ پر ایسی نیند مسلط کی کہ جب بیدار ہوا تو مجلس برخاست ہو چکی تھی۔

اسی طرح کے تماشے میں جانے کا ایک اور مرتبہ ارادہ کیا تھا مگر نیند نے کچھ دیکھنے سننے نہیں دیا، اس طرح اللہ تعالیٰ نے مجھے ان چیزوں سے محفوظ رکھا یہاں تک کہ پھر نبوت کی ذمہ داریاں ڈالی گئیں۔

البتہ شریعت کے احکام معلوم نہ ہونے کی وجہ سے بے قراری و بے چینی انبیاء کو نبوت سے پہلے ہوتی ہے، اور فطری طور پر وہ دینِ حق کی تلاش و فکر میں سرگرداں رہتے ہیں۔

وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَأَغْنٰى ۝

اور پایا تجھ کو مفلس پھر بے پروا کر دیا

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے سر و سامانِ غنیٰ کی فراہمی

یہ وہ نعمت ہے جس کا بندوبست قدرت نے کچھ یوں کیا کہ سب سے پہلے آپ کے دادا عبد المطلب کے مال سے آپ کو مستفید کیا، دادا آپ کو بیٹوں سے زیادہ پیار کرتے تھے، اس کے بعد آپ کے چچا ابو طالب کا مال آپ کی ضرورتوں کا کفیل ہو گیا، ابو طالب بھی والد کی وصیت کی وجہ سے آپ سے بہت پیار کرتے تھے، اور یوں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ان کے دل میں ایسی ڈال دی گئی تھی کہ وہ اپنا سب کچھ ان کے لئے قربان کرنے پر تیار رہتے تھے، اس کے بعد جب آپ پچیس سال کے ہوئے تو حضرتِ خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آ گئیں، یہ وہ خاتون تھیں کہ مکہ کے بڑے بڑے رئیس ان سے نکاح کی خواہش رکھتے تھے مگر قدرت کی طرف سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی محبت ان کے دل میں ڈال دی گئی کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے خود نکاح کی خواہش کی، اور پھر اپنی تمام دولت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے وقف کر دی، بلکہ قریش کے لوگوں سے کہہ بھی دیا کہ میرا سارا مال اب ان کا ہے چاہے خرچ کر ڈالیں چاہے رکھ لیں ان کی مرضی ہے۔

جب حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا جنت سدھار گئیں تو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مال سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو فارغ البال کر دیا، ابو بکر صدیقؓ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور مرضی میں فنا ہو چکے تھے، انہوں نے چالیس ہزار درہم آپ پر خرچ کئے پھر ہجرت کے بعد انصارؓ کے مال کو اللہ تعالیٰ نے آپ کی خدمت میں ڈال دیا، اس کے بعد جب جہاد شروع ہوا غنیمت کے مال سے آپ کو مالا مال کر دیا، اگرچہ ان میں سے بعض باتیں اس سورت کے نازل ہونے کے بعد پیش آئی ہیں لیکن جو چیز علمِ الٰہی میں ہو وہ ایسی ہی ہے گویا واقع ہو چکی ہے اس لئے احسانات کے ذکر میں اس کو بھی بیان کر دیا۔

غِنیٰ کے ان ظاہری اسباب کے علاوہ آپ کو جو باطنی غنیٰ و بے نیازی عطا فرمائی گئی تھی جسے قناعت کہتے ہیں وہ ایسی تھی کہ اس کا تصور بھی ممکن نہیں ہے، اہلِ سیر بالاتفاق لکھتے ہیں "کان یستوی عندہ الحجر والذھب" (آپ کی دنیا سے بے رغبتی کا یہ عالم تھا کہ) آپ کے نزدیک پتھر و سونا برابر تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یتیمی و مفلسی میں حکمتیں

(۱) اہل تحقیق نے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس لئے یتیم کیا گیا تا کہ لوگ یتیموں کو حقیر نہ جانیں جب کسی یتیم کو دیکھیں تو سوچ لیا کریں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی یتیم تھے۔

(۲) اور یہ وجہ بھی ہے کہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یتیموں کی قدر پہچانیں، ان کے ساتھ خصوصی شفقت کا معاملہ کریں کہ خود یتیمی سہہ چکے ہوں گے۔

(۳) یہ بھی حکمت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخلوق سے بے سہارا کر کے شروع سے ہی صرف اللہ کے سہارے پر جینے کی عادت ڈالی جائے تا کہ آپ کا توکل سب سے اعلیٰ توکل ہو۔

(۴) یہ بھی ہے کہ عام طور پر یتیم ہو جانے اور سرپرست نہ ہونے کی وجہ سے لڑکوں کے اخلاق و عادات خراب ہو جاتے ہیں، آپ کو یتیم بنا کر بھی اعلیٰ اخلاق کا نمونہ بنانا آپ کی نبوت کی دلیل اور معجزہ ہے۔

(۵) اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو فقر و مسکینی میں رکھ کر دوسروں کو آپ کی مالی خدمت میں لگا دینے میں حکمت یہ ہے کہ آپ کے اندر مالداروں کے اخلاق پیدا نہ ہوں، مالداری کی فطرت یہ ہے کہ اس سے آدمی میں بڑائی، خود پسندی وغیرہ عیوب پیدا ہو جاتے ہیں، سنت اللہ یہی ہے، اگر ایسا ہو جاتا تو آپ کی نشست و برخاست مالداروں کے ساتھ ہوتی، تواضع، انکساری، ملنساری اور اللہ کی طرف ہر وقت التجاء وتوجہ اور مسکینی کی لذت آپ کو معلوم نہ ہوتی۔

(۶) یہ بھی ہے کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم مالدار ہوتے تو مخالفین آپ کے ماننے والوں پر الزام لگا سکتے تھے کہ یہ سب مال و پیسے کے کرشمے ہیں، یہ لوگ مال کی لالچ میں اس کے ساتھ ہیں، اس صورت میں ایمان واخلاص کا پتہ نہ چلتا، اس لئے آپ کو فقیر بے مایہ کر کے لوگوں کے لئے آپ کی محبت میں ایسی کشش پیدا کر دی کہ لوگ ایسے گرویدہ ہوئے کہ اپنی جان و مال آپ پر قربان کرنے کیلئے ہر وقت آمادہ رہتے تھے، یہ بات آپ کے کمال پر دلیل تھی کہ لوگ بغیر کسی ظاہری لالچ کے آپ کے گرویدہ اور آپ پر نثار ہیں۔

ایک نکتہ، مال عزت کا سبب ہے نہ افلاس ذلت کا سبب

یہاں ایک نکتہ سمجھ لینا چاہئے کہ ہر آدمی خواہ فقیر ہو یا غنی جب پیدا ہوتا ہے تو خالی ہاتھ ہی ہوتا ہے،

دوسروں کے مال سے فائدہ اُٹھاتا ہے، لیکن اگر ایک آدمی مال کی لالچ کرتا ہے اور لوگوں سے مانگتا پھرتا ہے تو سب کی نظروں میں ذلیل ہو جاتا ہے اور اگر ایک دوسرا آدمی چالاکی اور تدبیر سے لوگوں کو اپنا تابع بنا کر مال حاصل کرتا ہے تو اس کی بڑی عزت ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ بادشاہ باوجود اس کے کہ رعایا کے مال سے مالدار ہوتا ہے اس کی عزت ہوتی ہے، مگر فقیر جو بادشاہ سے بہت ہی کم لوگوں سے مانگتا ہے اس کے باوجود ذلیل ہوتا ہے، تو معلوم ہوا کہ مال کا ہونا عزت کا سبب ہے نہ مال کا نہ ہونا ذلت کا سبب ہے۔ (بلکہ عزت و ذلت میں نفس کے لالچ واستغنیٰ کا دخل ہے)

ہاں یہ سچ ہے کہ وہ مال جو بغیر لالچ اور غِنائے نفس یعنی بے نیازی وقناعت کے ساتھ حاصل ہو وہ عزت کا سبب ہے اور جو فقیر مال کی طمع ولالچ اور اس کی دوڑ دھوپ میں مصروف۔ ہو اس کے لئے مال ذلت کا سبب ہے۔

اور چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دوسروں کے اموال سے عزت، حرمت اور غلبے کے طور پر مستفید کیا گیا اس لئے اس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جاہ وجلال میں اضافہ ہی ہوا کبھی کوئی ننگ و عار کا معاملہ پیش نہیں آیا۔ ان تین نعمتوں کے بیان سے فارغ ہو کر شکر کی تعلیم کے طور پر فرمایا:

فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ○

سو جو یتیم ہو اُس کو مت دبا

یتیم کو دبایئے بھی نہیں، مال بھی تلف نہ کیجئے اور بات کرنے میں بھی تندی نہ کیجئے، کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی یتیم رہ چکے ہیں اور یتیمی کی بے بسی ولاچاری سے بخوبی واقف ہیں، آپ جانتے ہیں کہ یتیم معمولی سی بات سے شکستہ دل وآزردہ خاطر ہو جاتا ہے۔

یہ شکر اس نعمت کے بدلے میں ہے جس کو اس آیت میں بیان کیا تھا "الم یجدک یتیما فاوی"

وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ○

اور جو مانگتا ہو اُس کو مت جھڑک

اس لئے کہ کبھی آپؐ بھی تنگ دست رہ چکے ہیں اور فقر وافلاس کے درد سے آپؐ بخوبی واقف ہیں۔

اور یہ اس نعمت کے بدلے میں شکر ہے جو اس آیت میں بیان ہوئی تھی "ووجدک عائلا فاغنی"

وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ○

اور جو احسان ہے تیرے رب کا سو بیان کر

علوم و معارف کی صورت میں آپ کو جو نعمتیں عطا کی گئیں ہیں ان کا شکر، یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو بیان کریں تا کہ دوسرے لوگ بھی ان سے مستفید ہوسکیں۔

ایک دقیق بحث

یہاں ایک لطیف بات ہے وہ یہ کہ احسانات اور نعمتوں کے شمار کرتے ہوئے دین کی نعمت جو کہ ہدایت ہے اس کو دنیوی نعمت مالداری سے پہلے ذکر فرمایا تھا (ووجد ضالا فھدیٰ" پہلے ہے اور "ووجد عائلا فاغنی" بعد میں ہے)

لیکن ان کے مقابل کو جب ذکر فرمایا تو جو دنیوی نعمت کا مقابل تھا (اما الیتیم فلا تقھر) اس کو پہلے ذکر فرمایا اور جو دینی نعمت کا مقابل تھا (واما بنعمة ربک فحدث) اس کو بعد میں ذکر فرمایا۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ دنیوی نعمت کے مقابلے میں بطور شکر کے جس عمل کی تلقین فرمائی گئی ہے (یتیم کے ساتھ شفقت کرنا) اس میں مقصود یہ ہے کہ مخلوق کے ساتھ شفقت کا معاملہ کیا جائے اور دینی نعمت کے مقابلے میں جو عمل بطور شکر کے بتایا گیا (تحدیث نعمت) اس میں باطنی نعمتوں کی تحصیل پر راہنمائی مقصود ہے، اور مخلوق پر (مادی لحاظ سے) شفقت و مہربانی کرنا دینی راہنمائی سے مقدم ہے اس لئے کہ جب تک گذر اوقات کا انتظام ٹھیک طرح سے نہ ہو اس وقت تک دینی احکام پر عمل کے لئے جمعیت خاطر اور یکسوئی حاصل نہیں ہوتی۔

اور (اس تقدیم و تاخیر یا مناسبت کے بارے میں) یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ یتیم کو سائل کے ساتھ پوری پوری مناسبت ہے (دونوں محتاج ہیں) اس لئے جس شکر کے عمل کا تعلق سائل کے ساتھ تھا اس کو یتیم کے ساتھ ملا کر ذکر کردیا، (اما الیتیم فلا تقھر واما السائل فلا تنھر) اور نعمتوں کے شمار کرتے ہوئے دینی نعمت ہدایت کو مالداری کی نعمت پر اس لئے مقدم کیا کہ مال اس وقت نعمت ہے جب اس کو صحیح مصرف پر خرچ کیا جائے اور مصرف کا صحیح ہونا اسی کو معلوم ہوگا جو ہدایت یافتہ ہوگا، (گویا مال اس وقت نعمت بنے گا جب اس سے پہلے ہدایت مل چکی ہو اس لئے ہدایت کو مقدم کیا)

تینوں نعمتوں اوران پر شکر گذاری کے اعمال کے درمیان مناسبت

ان تینوں نعمتوں (ہدایت، ٹھکانہ، غنی) کے شکر کے طور پر جن تین باتوں کی تلقین فرمائی گئی ہے ان کے درمیان ایک مناسبت تو ذکر کردی گئی ہے، ایک اور مناسبت ہے جو ظاہر نہیں اس میں کچھ خفا ہے۔

وہ یہ کہ شکر گذاری کی یہ تینوں باتیں (یتیم کو نہ جھڑکنا، سائل کو نہ ڈانٹنا، تحدیث نعمت) قیامت کے دن اُمت کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کی دلیل ہیں۔

اس طرح سے کہ یتیم تمام کمزوروں میں سب سے زیادہ کمزور ہے تو اس کی مدد و تعاون کے لئے کوشش کرنا کمال لطف ومہربانی اور شفقت ورحمت کی دلیل ہے (سو ایسی شفیق وکریم ہستی قیامت کے دن ضرور اپنی پریشان اُمت کی شفاعت کرے گی)

اور سائل اکثر اوقات بے موقعہ چاپلوسی کرتا، منتیں کرتا اور مانگتا ہے جس سے سخت اذیت ہوتی ہے تو اس کی اذیت اور ستانے پر صبر کر کے احسان کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اُمت کے گناہوں سے درگذر کروائیں گے۔

اور اللہ کی نعمتوں کو بیان کرنا بھی سر درد اور مشقت کا کام ہے تو امت کے فائدے کے لئے یہ مشقت برداشت کرنی، اللہ کے حضور اُمت کے لئے التجا و فریاد اور ان کو عذاب سے چھڑانے کی دلیل ہے۔

تحدیث نعمت بعض کے لئے مستحب ہے

"اما بنعمة ربک فحدث" یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی کو یا اس کے متعلقین کو جو نعمتیں عطا فرمائی ہوں ان کو بیان کرنا مستحب ہے، لیکن شرط یہ ہے نیت میں خلوص ہو مقصد صرف اللہ کی نعمت کا اظہار ہو، اگر کسی کو بیان کرنے کی صورت میں عجب وکبر کا اندیشہ ہو تو وہ بیان نہ کرے اس کے لئے چھپانا ہی افضل ہے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اپنی شب بیداری کے حالات لوگوں سے بیان کیا کرتے تھے کہ آج میں نے اتنا قرآن رات کو پڑھا ہے، بعض ناسمجھوں نے اس پر اعتراض کیا کہ یہ تو ریاء ہے تو اُنہوں نے فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں "اما بنعمة ربک فحدث" اور میرے نزدیک اس سے بڑی نعمت اور کوئی نہیں کہ اس نے مجھے عبادت کی توفیق عنایت فرمائی ہے، تو پھر میں کیوں اس نعمت کو ظاہر نہ کروں، اور شکر گذاری سے محروم کیوں رہوں۔

شکر گذاری کے تین کاموں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حال

اس سورت میں شکرِ نعمت کے طور پر اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تین باتوں کی تاکید فرمائی ہے۔

(۱) یتیم کے حقوق کی رعایت کرنا۔ (۲) سائل کا خیال رکھنا۔ (۳) اللہ کی نعمتوں کو بیان کرنا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس تاکید کی وجہ سے ان تینوں باتوں کا بہت اہتمام و کوشش فرماتے تھے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و اطوار سے واقف کاروں کو اس کی تفصیلات معلوم ہیں۔

صحیح حدیث میں ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یتیم کی پرورش کرنے والا اور میں قیامت کے دن اس طرح ہوں گے جس طرح دو انگلیاں ملی ہوئی ہیں (یعنی اس طرح وہ میرے قریب ہوگا)

روایت میں آتا ہے ایک آدمی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا کہنے لگا میرا دل بہت سخت ہے کچھ علاج فرمائیے، فرمایا یتیم کے ساتھ شفقت کیا کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا کر تیرے دل کی سختی دور ہوجائے گی۔

یہ بھی فرمایا جو یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرے اس کے ہاتھ کے نیچے جتنے بال آئیں گے ہر بال کے بدلے میں اس کو نیکی ملے گی۔

سلف کے بزرگوں کا قول ہے جب یتیم روتا ہے تو عرش کانپ اُٹھتا ہے، اور جو یتیم کی دلداری کر کے خاموش کرے گا گویا اس نے ہلتے ہوئے عرش کو ٹھہرادیا۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مانگنے والوں کے لئے داد و دہش کا یہ عالم تھا کہ کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے "لا" (نہیں) نہیں نکلا، چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی کے سوال کے جواب میں "لا" (نہیں) نہیں فرمایا۔

فرزدق شاعر نے اسی بات کو مبالغہ آمیز طریقے سے کہا ہے

ما قال لا قط إلا في تشهده

لولا التشهد كانت لاؤه نعم

ترجمہ:۔ اُنہوں نے کبھی لا نہیں کہا سوائے تشہد کے، اگر تشہد نہ ہوتا تو ان کا "لا"، نعم ہی ہوتا۔

ترمذی کی روایت ہے ایک مرتبہ بحرین سے نوّے ہزار درہم آئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد کی چٹائیوں پر ڈھیر کروا دیئے، اور نمازِ فجر کے بعد جوان کو تقسیم کرنے بیٹھے تو ظہر تک ہاتھ جھاڑ کر اُٹھے، ایک درہم بھی باقی نہیں بچا، فارغ ہونے کے بعد اتفاق سے ایک سائل آ گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اب تو میرے پاس کچھ نہیں بچا، البتہ تم بازار میں چلے جاؤ جو چیزیں ضرورت ہیں دکانداروں سے میرے نام پر لے لو، جب میرے پاس مال آئے گا تو میں ادا کر دوں گا، اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو اللہ تعالیٰ نے آپ کی طاقت سے زیادہ کا مکلف نہیں بنایا پھر کیا ضرورت ہے کہ آپ اپنے اوپر قرض اُٹھاتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عمرؓ کی یہ بات اچھی نہ لگی تو ایک انصاری بول پڑے "انفق و لا تخش من ذی العرش إقلالا" یعنی خرچ کرتے جایئے اور عرش والے مالک سے تنگی کا خوف نہ کیجئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انصاری کے اس کہنے پر مسکرائے اور خوشی سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ انور کھِل گیا، پھر فرمانے لگے مجھے اسی طرح حکم دیا گیا ہے۔

الغرض حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بخشش وعطا کا یہ عالم تھا کہ خود اللہ تعالیٰ نے آپ کو میانہ روی کرنے اور حد سے زیادہ خرچ نہ کرنے کا حکم دیا، چنانچہ ایک دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے ایک لڑکا حاضر ہوا کہنے لگا میری ماں ایک کرتہ مانگتی ہے پہننے کے لئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ذرا ٹھہر کر آ جاؤ، وہ چلا گیا واپس آ کر کہتا ہے میری ماں کہتی ہے جو کرتہ آپ نے پہن رکھا ہے وہی دے دیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اُٹھ کر گھر میں تشریف لے گئے کرتہ اتار کر لڑکے کو دیا اور خود چونکہ پہننے کے لئے کچھ نہیں تھا اس لئے گھر کے اندر ہی بیٹھ گئے، صحابہ کرام انتظار میں تھے کہ آپ باہر تشریف لائیں گے، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نہ آئے تو وہ لوگ انتظار کر کے چلے گئے اس موقعہ پر یہ آیت نازل ہوئی "ولا تبسطها کل البسط"

یعنی آپ ہاتھ بالکل ہی کھلا نہ رکھیں کہ خود برہنہ ہو کر گھر میں بیٹھنا پڑ جائے اور صحابہ آپ کی صحبت سے محروم ہو جائیں۔

صحیح بخاری میں ہے ایک عورت نے ایک چادر اپنے ہاتھ سے سی کر اس کے خوبصورت کنارے لگا کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجی کہ اسے اوڑھیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ضرورت

تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اوڑھ لی، مجلس میں ایک شخص آ گیا اس نے جو چادر دیکھی تو مانگنے لگا یارسول اللہ! یہ کیسی خوبصورت چادر ہے مجھے دے دیجئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ چادر اتاری اور اس کو دیدی، مجلس کے بعد لوگوں نے اسے بُرا بھلا کہا کہ یہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ضرورت تھی تم نے اچھا نہیں کیا، تمہیں پتہ بھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مانگنے والے کو انکار نہیں کرتے پھر تم نے کیوں مانگی، وہ صاحب کہنے لگے بھئی میں نے اوڑھنے کے لئے نہیں لی میں نے اپنے کفن کے لئے لی ہے اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بہت پسند تھی۔

اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا بیان واظہار جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بارش کی طرح برستی تھیں، سو وہ دن رات جاری رہتا تھا، اور کتب احادیث (جو انہی علوم کے مجموعے ہیں) جاننے والے لوگوں سے مخفی نہیں ہیں۔

سورۂ ضحیٰ کی ایک مجرّب خاصیت

اس مبارک سورہ کی ایک مجرب خاصیت یہ ہے کہ گمشدہ چیز کی بازیابی کے لئے یہ سورت سات مرتبہ پڑھی جائے اور پھر شہادت کی انگلی سر کے چاروں طرف گھوما کر سات مرتبہ یہ پڑھے

أصبحت فی امان الله و أمسیت فی جوار الله امسیت فی أمان وا صبحت فی جوار الله"

پھر دستک دے تو گمشدہ مال پھر ہاتھ آ جائے گا۔ واللہ اعلم بالصواب

تم تفسیر سورة الضحیٰ والحمدلله

مقدمہ سورۃ الانشراح

یہ سورت مکی ہے، اس میں آٹھ (۸) آیات، اٹھائیس (۲۸) کلمات اور ایک سوتیس (۱۳۰) حروف ہیں۔

سورۂ ضحیٰ کے ساتھ ربط

اس سورت کو سورۂ ضحیٰ سے پوری پوری مناسبت ہے کہ دونوں میں مقصود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کئے گئے خاص احسانات وانعامات کا بیان کرنا ہے، اور دونوں سورتوں کے الفاظ وعبارت اتنی ملتی جلتی ہے کہ روافض نے تو دونوں کو ایک ہی سورت قرار دے دیا ہے، چنانچہ وہ ان کے درمیان بسم اللہ نہیں پڑھتے، اور ایک رکعت میں دونوں سورتوں کو ملا کر ایک سورت کی طرح پڑھتے ہیں۔

دونوں سورتوں میں فرق اور روافض کے مغالطے کا ازالہ

لیکن اگر اچھی طرح غور کیا جائے تو دونوں سورتوں میں ایک باریک فرق معلوم ہو جائے گا، لہٰذا ان دونوں کو ایک قرار دینا نہ الفاظ کے اعتبار سے درست ہے نہ معنی کے اعتبار سے درست ہے۔

الفاظ کے اعتبار سے ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ سورۂ ضحیٰ میں استفہام غائب کے صیغوں کے ساتھ ہے جیسے ''الم یجدک الخ'' جبکہ اس سورت میں متکلم کے صیغے استعمال ہوئے ہیں جیسا کہ ظاہر ہے۔

اور اگر صرف اس وجہ سے ان دونوں کو ایک قرار دے کر ان کے درمیان سے بسم اللہ کو نکال دیا جائے کہ دونوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کئے گئے احسانات وانعامات کا ذکر ہے تو یہ وجہ غلط ہے اس لئے کہ ایسی مناسبت تو بہت سی سورتوں میں پائی جاتی ہے، بلکہ سچ پوچھیں تو پورا قرآن ایک ہی کلام ہے پھر تو پورے قرآن سے ہی بسم اللہ کو نکال دینا پڑے گا۔

اور معنی کے اعتبار سے دونوں میں فرق یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جو نعمتیں عطا فرمائی گئی ہیں وہ دو قسم کی ہیں:

(۱) وہ نعمتیں جو ظاہری ہیں ان کو ہر خاص وعام جانتا ہے۔

(۲) وہ نعمتیں جو باطنی اور پوشیدہ ہیں ان کو عوام تو کیا خواص بھی نہیں جانتے۔

تو پہلی قسم کی نعمتیں سورۂ ضحیٰ میں بیان ہوئیں اور دوسری قسم کی نعمتیں اِس سورت میں بیان ہوئیں تا کہ دونوں علیحدہ علیحدہ بیان ہو جائیں ان میں کوئی اشتباہ نہ رہے لہٰذا یہ دو الگ الگ سورتیں ہیں ایک نہیں ہے۔

اسی بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ سورۂ ضحیٰ میں ظاہری نعمتوں کا بیان ہوا اور اس سورت میں باطنی نعمتوں کا بیان ہوا اور ظاہر و باطن میں فرق اظہر من الشمس ہے لہٰذا دونوں ایک نہیں الگ الگ سورتیں ہیں۔

شانِ نزول

بعض مفسرین نے اس سورت کے شانِ نزول کے بارے میں کہا ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے حضور عرض کیا اے اللہ! تُو نے حضرت ابراہیم کو خلّت کے مرتبے پر فائز کیا، حضرت موسیٰ کو مقامِ کلیمی سے نوازا، حضرت داؤد کے ہاتھ میں لوہا اور پہاڑ مسخر کر کے ان کو عزت بخشی، اور حضرت سلیمان کو انسانوں، جنوں، پانی، آگ اور ہوا پر حکومت سے سرفراز کیا، تو میرے لئے اس طرح کی امتیازی خصوصیت کیا مقرر فرمائی گئی ہے؟ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ سورت نازل فرمائی گئی۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ، معراج سے پہلے کا ہوگا، اس لئے کہ معراج کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایسی ایسی نعمتیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر مبذول فرمائیں کہ دوسرے انبیاء کو ان کا عشرِ عشیر بھی عطا نہیں ہوا۔

سورۂ الم نشرح کا ایک نکتہ

سورۂ الم نشرح کے نکتوں میں سے ایک نکتہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ''شرح صدر'' کا مرتبہ بغیر طلب کے عطا فرمایا ہے، جبکہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کے باوجود طلب کے اس درجے کا شرحِ صدر عطا نہ ہوا، چنانچہ حضرت ہارون علیہ السلام کی ڈاڑھی پکڑ کر کھینچنے کے واقعے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے، اور اس کی (یعنی اس واقعے کے شرحِ صدر کے اس مرتبے کے خلاف ہونے کی) تفصیل ان شاء اللہ آئندہ آئے گی، تو اللہ تعالیٰ نے بن مانگے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ مرتبۂ علیا عطا فرمایا تا کہ یہ معلوم ہو کہ بن مانگے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عنایت ہو اس کا درجہ و رتبہ اس سے بڑھ کر

ہے جو مانگ کر حاصل کی جائے۔ چنانچہ اردو کا مصرعہ ہے ع

بن مانگے موتی ملیں مانگے ملے نہ بھیک

وجہ تسمیہ

اس سورت کا نام ''الم نشرح'' اس وجہ سے رکھا گیا ہے کہ اس سورت کا مضمون بہت ہی تاکیدی انداز سے کمالِ محمدی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کے منشاء (جڑ، بنیاد) پر دلالت کرتا ہے، اس لئے کہ اس کمال کی حقیقت یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا صدرِ معنوی (جس کی تفصیل تفسیر میں آ رہی ہے) تجلیاتِ الٰہیہ کے انوار سے وسیع وکشادہ ہو گیا۔

اس سورت کی خاصیت

اس سورت کے خواص میں سے یہ ہے کہ سوتے وقت جو آدمی اس سورت کو سترہ مرتبہ پڑھ کر سینے پر دم کرے گا وہ شیطانی خطرات وتشویشات سے محفوظ ہو جائے گا، اور معاملات کی تدبیر میں خطا ولغزش سے بچا رہے گا۔

تمت المقدمة والحمدلله

تفسیر سورۃ الانشراح

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ ۝

کیا ہم نے نہیں کھول دیا تیرا سینہ

تا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سینہ وحی کا بوجھ برداشت کر سکے اور اس میں اسرارِ الٰہی، اُمت کو دعوت وتبلیغ کرنے کے غم، دین ودنیا اور آخرت کے غم سما سکیں، اور تا کہ اس سے مَیل وکدورت کینہ ودشمنی اور سارے ہی بُرے اخلاق وعادات نکل جائیں اور اس میں علم اور ایمان وحکمت کے انوار بھر جائیں۔

''لک''

''لک'' کے لفظ کو اس لئے اضافہ کیا کہ معنی یہ ہوئے کہ تیرے سینے کو کھولا تیرے ہی نفع کے لئے،

تا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پورا پورا کمال حاصل کرسکیں، اگر اس لفظ کا اضافہ نہ ہوتا تو یہ معنی سمجھ نہ آتے۔

''صدر'' کی تحقیق

لغت میں صدر سینے کو کہتے ہیں، اور اہلِ طریقت کی اصطلاح میں قلب کے دو دروازے ہیں، ایک دروازہ نفس کی سمت ہے ''صدر'' اسی کا نام ہے، اور دوسرا دروازہ روح کی جانب ہے اس کا نام ''قلب'' ہے، یہ صدر کے مقابلے میں بہت زیادہ وسیع وکشادہ ہوتا ہے، اس کی نسبت سے صدر تنگ ہے پس جب یہ دروازہ جو تنگ ہوتا ہے (صدر) وسیع وکشادہ کردیا گیا تو ظاہر ہے دوسرا اس سے زیادہ وسیع وکشادہ ہوگیا ہوگا، یہی وجہ ہے کہ یہاں ''صدر'' (کی وسعت وشرح) کو ذکر کیا ہے، ''قلب'' کا لفظ ذکر نہیں فرمایا، چونکہ صدر قلب کے لئے قلعے کی طرح ہے، اور صدر کی طرف سے ہی شیطان حرص وہوس اور خواہشات دنیوی سے لیس ہوکر حملہ آور ہوتا اور قلب میں تنگی پیدا کرتا ہے جس کی وجہ سے عبادت و ایمان کی لذت وحلاوت کا مزہ بھی کم ہوجاتا ہے۔

تو جب قلب کی اس جانب کی تنگی دور ہوگئی اس میں وسعت وکشادگی پیدا ہوگئی تو اب پوری بشاشت وخوشی کے ساتھ عبادت کرنا میسر آئے گا۔

شرحِ صدر کا معنی، ایک عجیب وغریب تمثیل

شرح صدر کہتے ہیں حوصلے کی وسعت وفراخی کو، اور ہر شخص کے حوصلے کی فراخی و وسعت اس کی استعداد اور اس کے کمال ومرتبہ کی بقدر ہوتی ہے، (جس کی جتنی استعداد ہوگی اور جس درجے کا کمال ہوگا اسی درجے کا اس میں حوصلہ ہوگا اور اس میں وسعت ہوگی)

اور کسی بھی مرتبے وکمال کی وسعتِ حوصلہ (شرح صدر) اس وقت تک معلوم نہیں ہوسکتی جب تک اس مرتبے تک آدمی خود پہنچ نہ جائے، چنانچہ اسی لئے کہا جاتا ہے: ''**لا یعرف الولیّ إلا الولی ولا یعرف النبیّ الا النبی**'' کہ ولی کو ولی ہی پہچان سکتا ہے اور نبی کو نبی ہی پہچان سکتا ہے۔

فارسی کی ضرب المثل بھی ہے ''والی راہ ولی می شناسد''

اور خاص طور پر شرح صدر مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقت معلوم کرنا تو کسی بشر کے لئے ممکن ہی نہیں ہے، اس لئے کہ آپ کا رتبۂ کمال نبوت کا خاتمہ ہے جو کسی اور کو حاصل نہیں اس لئے اس کی پہچان

بھی کسی کو حاصل نہیں، اور کیا ہی خوب کسی نے کہا ہے۔

یا صاحب الجمال یا سیّد البشر

من وجهک المنیر لقد نور القمر

لا یمکن الثناء کما کان حقہٗ

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

البتہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جو ظاہری و باطنی شرحِ صدر عطا ہوا اس کا تمثیلی انداز میں کچھ اجمالی سا بیان کیا جاتا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معنوی شرحِ صدر کو یوں سمجھنا چاہئے کہ گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سینۂ مبارک ایک بہت ہی بڑا وسیع میدان ہے، اس میدان میں ایک بہت ہی عظیم الشان عمارت ہے، اس عمارت میں (اس کے بارہ کمروں میں) بارہ مجلسیں قائم ہیں، بعض مجالس دنیوی اُمور سے متعلق ہیں، بعض آخرت کے اُمور سے اور بعض میں دنیا و آخرت دونوں سے متعلق باتیں ہیں۔

(۱) ایک مجلس کو یوں تصور کریں کہ اس میں ایک عظیم الشان بادشاہ بیٹھا ہے اور ساری دنیا کے تمام بادشاہ اس کے پاس حاضر ہیں اور اس سے اُمورِ سلطنت اور دستور و آئین جہاں بانی معلوم کر رہے ہیں، اور امورِ سلطنت پر لکھی گئیں دستاویزات جیسے توقیعات کسریٰ، تزکِ تیموری، کلمات طیبات عالمگیری، واقعاتِ بابری، آئین اکبری اور دیگر اس طرح کی تحریرات کی اس کے سامنے جانچ پڑتال کر رہے ہیں کہ ان میں جو قوانین وضوابط لکھے ہیں وہ صحیح ہیں یا کہ نہیں، اس طرح وہ سب بادشاہ اس سے انتظام مملکت اور امورِ سیاست کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

(۲) دوسری مجلس میں ایک بہت بڑا ماہر حکیم و دانا بیٹھا ہے جو خانگی امور کی تدابیر سے لے کر اخلاق و اعمال کی اصلاح تک کے اصول و قواعد بیان کر رہا ہے، اور زمانے کے بڑے بڑے حکیم و دانشور اس سے یہ قواعد سیکھ رہے ہیں، اور وہ جو اصول و قواعد بیان کر رہا ہے اُن قواعد سے بڑے بڑے حکیم و عقلاء جیسے ارسطو، نصیر طوسی، ابن مسکویہ، ابنِ سینا وغیرہ بہت سے علوم کا استخراج کرتے ہیں اور اپنے اپنے فنون میں ان کو کام میں لاتے ہیں۔

(۳) تیسری مجلس میں ایک قاضی مسندِ عدالت پر بیٹھا ہے اور لوگوں کے تنازعات اور جھگڑوں کے

فیصلے کر رہا ہے اور ساری دنیا کے قاضی اس کے فیصلوں کو اپنا دستور العمل جانتے ہوئے بڑی احتیاط سے لکھ رہے ہیں۔

(۴) چوتھی مجلس میں ایک علامۂ دہر مفتی، مسندِ افتاء پر بیٹھا ہے اور فتووں کا دریا اس کی زبان سے جوش مار رہا ہے، ہر جدید مسئلے کا حکم اصول فقہ کے قواعد کے مطابق قرآن وسنت سے نکال کر بیان کر رہا ہے، اور دنیا بھر کے روایات جمع کرنے والے اور فرائض لکھنے والے اس کے اردگرد جمع ہیں اور اس کے ایک ایک لفظ کو لکھ رہے ہیں اور ضرورت کے وقت اس کے مطابق عمل کرتے ہیں۔

(۵) پانچویں مجلس میں ایک محتسب بیٹھا حکم چلا رہا ہے، اس کے سامنے جلاّد (پولیس والے) کھڑے ہیں، فساق وفجار اور مجرموں کو اس کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے، جرم کی نوعیت کے مطابق ہر ایک کے بارے میں سزا نافذ کر رہا ہے کسی کو کوڑے لگواتا، کسی کو قید خانے میں بھیج رہا ہے اور کسی پر کوئی اور تعزیر نافذ کر رہا ہے اس کے ساتھ اس شعبے سے متعلق لوگ اس سے احتساب کے قواعد، حدود و تعزیرات کے قیام کے اصول سیکھ رہے ہیں، اور وہ تمام جرائم کے سدِ باب اور روک تھام کے لئے بھرپور کوشش کر رہا ہے۔

(۶) چھٹی مجلس میں ایک خوش الحان قاری قرآن کی تعلیم میں مصروف ہے جو ساتوں قراءتوں کا تمام وجوہ وروایات کے ساتھ حافظ ہے، دنیا بھر کے قاری اس کے پاس جمع ہیں وہ کسی سے ادغام کا قاعدہ بیان کر رہا ہے، کسی کو ہمزے کی تخفیف کی بحث سمجھا رہا ہے، کسی کو یرملون کا قاعدہ اور کسی سے اظہار واخفاء کا قاعدہ بیان کر رہا ہے، اس طرح ہر ایک کی تعلیم ہو رہی ہے۔

(۷) ساتویں مجلس میں ایک عابد اَوراد و وظائف اور نوافل میں ایسا مشغول ہے کہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہے، صبح سے شام تک اور شام سے لے کر صبح تک وہ تلاوت، اذکار امام نووی، حصنِ حصین جزری، حزب اعظم ملاّ علی قاری، اور اوراد شیخ الشیوخ کے پڑھنے میں مشغول ہے، اذکار وانوار کی کثرت کی وجہ سے زمین وآسمان کے فرشتوں کا اس کی مجلس میں ہجوم ہے جن کی وجہ سے اس کو نہایت ہی انس ولذت حاصل ہوتی ہے کہ وہ دنیا کی ہر چیز کو بھول گیا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ اس کے کام کے ساتھ دلچسپی رکھنے والے لوگ بھی اس کے پاس حاضر ہو کر (حسب موقعہ) اس سلسلے میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں، چنانچہ وہ کسی کو دن رات میں نوافل کی کیفیت کی

تعلیم دے رہا ہے کسی کو دعائیں بتا رہا ہے، جیسے نئے کپڑے پہننے کی دعاء، چاند دیکھنے کی، پانی پینے، کھانا کھانے کی دعاء وغیرہ اور لوگ اس کی ہدایت کے مطابق ذکر اذکار اور دعاؤں سے اپنے اوقات کو معمور رکھتے ہیں۔

(۸) آٹھویں مجلس میں ایک عارفِ کامل بیٹھا ذات وصفاتِ الٰہی اور افعالِ الٰہی کے اسرار بیان کررہا ہے، اس کے علاوہ بے شمار علوم یوں بیان کررہا ہے گویا اس کے منہ سے موتی جھڑ رہے ہیں، اور ان علوم کا شوق رکھنے والے لوگ ''فتوحاتِ مکّیہ'' اور ''فصوص الحکم'' وغیرہ کے مضامین اس کی زبان سے سن کر لذت اندوز ہورہے اور لکھ رہے ہیں۔

(۹) نویں مجلس میں ایک واعظ ممبر پر بیٹھا ہوا ہے سامنے لوگوں کا مجمع ہے اور وہ وعظ کہہ رہا ہے جس سے دل تڑپ رہے ہیں اور روحیں بے چین ہوئی جارہی ہیں، کسی کو ثواب عظیم کی رغبت دلا کر اور کسی کو عذاب الیم سے ڈرا کر سیدھے راستے پر لاتا اور توبہ کراتا ہے، وعظ میں قبر و برزخ، حشر و نشر، حساب و میزان، پلصراط اور دوزخ کے حالات و واقعات بیان کررہا ہے، اور جنت کے اعلیٰ مراتب و مقامات کے بیان کے ساتھ ان اعمال کی بھی نشان دہی کررہا ہے جو وہاں نفع مند ہوسکتے ہیں یا ضرر رساں ہوسکتے ہیں تاکہ کسی طرح کا شبہ کسی کے دل میں باقی نہ رہے، سو اس کی مجلس میں کافر زنار توڑ رہے ہیں، فاسق وفاجر توبہ کررہے ہیں، سخت دل موم ہورہے اور حق ناشناس حق شناس ہورہے ہیں۔

(۱۰) دسویں مجلس میں ایک اولوالعزم رسول بیٹھا ہے جو اُمت کو ہدایت پر لانے کے لئے طرح طرح کی تدابیر روبعمل لارہا ہے اور جن لوگوں کو اس کام کے لئے اپنے ساتھ رکھا ہوا ہے ان میں سے ہر ایک کو اس کی استعداد کے مطابق دعوت وتبلیغ کے لئے چاروں طرف بھیج رہا ہے، اور ہر قوم کا معاملہ اپنے نمائندوں سے سن کر اپنی عقل وفکر صائب کے ذریعہ اس کا بندوبست کرتا ہے۔

(۱۱) گیارہویں مجلس میں ایک صاحب طریقت مرشدِ کامل بیٹھا ہے، ہزاروں طالبانِ حق اس پر ہجوم کررہے ہیں اور اس سے اپنی مشکلات حل کروارہے ہیں، وہ ہر ایک کی استعداد کے مطابق اس سے وہ حجاب وپردے (جو معرفت کے درمیان حائل ہیں) دور کرنے کی کوشش کررہا ہے اور وصول کے طریق کی نشان دہی کررہا ہے، اس کے ساتھ احوال ومقامات، مناصب ومراتب کی راہنمائی اور طالبین ومستفیدین کے باطن میں اپنی توجہ سے طرح طرح کی تاثیرات پہنچا کر کارخانہ ارشاد وتزکیہ کو رونق بخش رہا ہے۔

(۱۲) بارہویں مجلس میں ایک محبوب، نازنین و دلربا چاند کا ٹکڑا بیٹھا ہے کہ کعبے کی طرح اللہ کے جمال کی تجلی نے اس گلبدن کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے، طُور کی طرح حسنِ ازلی کے انوار سے جگمگا رہا ہے اور خدا کی محبوبیت کی شان اس میں جلوہ گر ہے، اپنی محبت کی کشش سے لوگوں کے دلوں کو شکار کر رہا ہے، اور اس حسنِ ازلی کے لاکھوں عاشق دور دراز سے کسی نفع یا کمال کے حصول کی غرض کے بغیر صرف اس کے دیدار کیلئے پروانہ وار چلے آرہے ہیں، اور صرف اس کی ایک جھلک کی خاطر اس کے آستانے پر سجدہ ریز ہیں۔

یہ وہ مقام و مرتبہ ہے جو کسی فردِ بشر کو (سوائے خدا کے اس محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے) حاصل نہیں ہوسکا، البتہ اسی محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل سے اس کی اُمت کے بعض اولیاء کو اللہ کی محبوبیت کا کچھ تھوڑا سا حصہ ملا ہے، اسی وجہ سے وہ تمام دلوں کے محبوب اور مرجع خلائق ہو گئے۔ جیسے حضرت غوث الاعظم اور سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء قدس اسرا ہما ہیں۔

اگر کسی کو ان بارہ مجالس کی تمثیل کے متعلق دل میں کچھ شبہ گذرے تو وہ ان مجالس کے عنوان سے بیان کئے گئے امور و اشغال میں غور کرلے، اور یہ سوچ کہ ان تمام چیزوں کی اصل (بنیاد، جڑ) کہاں ہے؟ جب اس پر غور کرے گا تو یقیناً اس کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ تمام اُمور کمالِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کا پرتَو ہیں، جس طرح دریا سے نکالی گئیں مختلف نہریں ہوتی ہیں (ان کی اصل، بنیاد دریا ہوتا ہے) اسی طرح یہ تمام علوم وفنون (جو ان مجالس کی صورت میں بیان ہوئے) آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے نکلے اور آگے ان کی الگ الگ شاخیں اور شعبے بن گئے، اور ہر شعبے کے ماہرین کی الگ الگ جماعت بن گئی جو دوسرے لوگوں سے ممتاز شمار ہونے لگے۔

حقیقت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سینۂ مبارک بہیئتِ مجموعی ان تمام کمالات کا منبع و سرچشمہ تھا کہ دن رات ان کی تعلیم و بیان میں جوش مارتا رہتا تھا، چنانچہ تاریخ و سیرت سے واقفیت رکھنے والے لوگ اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں۔

اور حکمت کا یہ قاعدہ ہے کہ افعال کا ہمیشہ ایک ہی نظم و نسق سے صادر ہونا ان افعال کے اندر ملکہ حاصل ہوئے بغیر محال ہے، اور ان افعال کے انتظام میں جتنا کمال ہوگا اس سے ان افعال کے ملکہ کے کمال کا پتہ چلے گا، (اور یہ تمام اشغال علی وجہ الکمال ہمیشہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے صادر ہوتے رہے

جو دلیل ہے اس بات کی آپ کو ان میں ملکۂ راسخہ حاصل تھا لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سینۂ مبارک ہی ان تمام کمالات کا مرکز اور سرچشمہ ثابت ہوا)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حسّی شرح صدر کی تحقیق اور چار مرتبہ اس کے وقوع کی تفصیل

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حسّی وظاہری شرح صدر سمجھنے کے لئے ایک مقدمہ ضروری ہے، جس کے بغیر اس کا سمجھنا مشکل ہے، وہ مقدمہ یہ ہے کہ عالم غیب کی نسبت اس ظاہری وحسّی عالم سے ایسی ہی ہے جیسے اصل کی نسبت فرع سے اور آدمی کی نسبت اس کے سائے سے ہوتی ہے۔

سو عالمِ ظاہر میں جو چیز ہے اگر عالمِ غیب میں اس کی کچھ اصل ہے تو ٹھیک ہے ورنہ اس کی حیثیت سراب اور محض خیالِ غلط سے زیادہ کچھ نہیں، اور جس چیز کا وجود عالم غیب میں پایا جاتا ہے مگر عالمِ حسّی میں اس کی کوئی صورت یا مثال نہیں ہے، تو ایسے ہی ہے جیسے بغیر پھل کے درخت ہو یا بے دلیل کے مدلول ہو، اسی لئے کہا جاتا ہے کہ عالم ارواح اور عالم غیب میں جو کچھ ہے اس کی حیثیت مصدر و جڑ کی ہے اور جو کچھ عالم اجسام اور عالم حسّی ظاہری میں ہے اس کی حیثیت اس کے مظہر و شاخ کی ہے۔

اب یہ سمجھئے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معنوی شرح صدر عالم غیب میں ثابت ہوا تو عالمِ حسّی ظاہری میں اس کا وقوع چار مرتبہ ہوا جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

عالم حسّی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے شرح صدر کا پہلا واقعہ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم ابھی ماں کے پیٹ میں ہی تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے والد فوت ہو گئے، پیدائش کے بعد عرب کے دستور کے مطابق آپ کی والدہ نے چاہا کہ کوئی دائی پرورش کے لئے آپ کو لے جائے، قبیلہ بنو سعد کی بہت سی دائیاں اس غرض سے طائف سے مکہ آئی ہوئی تھیں مگر آپ کی یتیمی کو دیکھ کر اس لئے کسی نے نہ لیا کہ یہاں سے کیا ملے گا، حلیمہ سعدیہ بھی آئی ہوئی تھیں وہ بیچاری بھی مفلس تھیں اس لئے مکہ کے امراء نے ان کو کوئی بچہ نہ دیا، خالی واپس جانا بھی انہوں نے باعثِ عار سمجھا اس لئے مجبور ہو کر بغیر کسی لالچ کے سوچا اسی یتیم کو لے جاؤں، چنانچہ آپ کو لے گئیں، جس سواری پر آئی تھیں وہ بہت کمزور، چلنے میں سست رفتار تھی مگر اب جب اس دُرِ یتیم کو لے کر سوار ہوئیں تو وہ غیر معمولی طور پر قوت سے تیز چلنے لگی یہاں تک کہ آپ سب سے پیچھے تھیں مگر اب قافلے سے آگے نکل گئیں،

قافلے والوں کو بھی تعجب ہوا، پھر جب گھر جا کر پہنچیں تو پہلے ان کی بکریاں کمزور ہونے کی وجہ سے بہت کم دودھ دیتی تھیں اب جو دیکھا تو ان کے تھن دودھ سے لبریز تھے اور بہت زیادہ دودھ دینے لگیں، وہ سمجھ گئیں کہ یہ سب برکات اس بچے کی ہیں، اس لئے آپ کی پرورش خاص شفقت و پیار سے کرنے لگیں۔

ابھی آپؐ چار سال کے تھے کہ حلیمہؓ کے بیٹوں کے ساتھ بکریاں چرانے جنگل گئے، دوسرے لڑکے آپ کو چھوڑ کر دن کا کھانا لینے گھر آئے، آپ وہاں بکریوں کے پاس اکیلے تھے کہ اچانک دو پرندے گدھ جیسے آپہنچے، ایک نے دوسرے سے پوچھا یہ وہی ہے دوسرے نے کہا ہاں یہی ہے، یہ کہہ کر وہ آپ کی طرف بڑھے آپ گھبرا کر بھاگے مگر انہوں نے آپ کو پکڑ لیا، اور زمین پر چت لٹا دیا ایک نے اپنی چونچ سے آپ کے سینے کو چیرا اور اس سے دل کو نکالا، اس کو بھی چیرا اور دل کے اندر سے جما ہوا خون نکال کر پھینک دیا اور کہا یہ شیطان کا حصہ ہوتا ہے جو ہر آدمی کے دل میں ہوتا ہے، آپ کے دل سے اس لئے نکال دیا تا کہ شیطان کا وسوسہ آپ کے دل پر اثر انداز نہ ہو سکے۔

پھر دوسرے سے برف کا پانی منگوایا اس سے آپ کے سینے کو دھویا پھر اولے کا پانی منگوایا اس سے آپ کے دل کو دھویا پھر سکینہ منگوایا، سکینہ چھڑکنے کی کوئی چیز تھی، اس کو آپ کے دل میں چھڑکا پھر ایک نے دوسرے سے کہا اب اس کو سی دو اس نے دل کو سی دیا، اور اوپر مہر نبوت لگا دی، اس کے بعد آپ کے سینہ کو بھی سی کر برابر کر دیا۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سلائی کے نشان میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سینۂ مبارک پر دیکھے تھے۔

الغرض اتنے میں آپ کے رضاعی بھائی پہنچ گئے انہوں نے جو یہ منظر دیکھا واپس بھاگ گئے، اور اپنی والدہ کو واقعہ بتایا وہ گھبرائی ہوئی اپنے خاوند کو لے کر آپہنچیں، دیکھا آپؐ خوف زدہ کھڑے ہیں، رنگ زرد ہو چکا ہے، حلیمہ نے پوچھا کیا ہوا تو آپؐ نے سارا واقعہ بیان کر دیا، حلیمہ نے آپ کو شفقت سے دلاسا دیا، پیار کیا اور تسلی دی کہ گھبراؤ نہیں کوئی بات نہیں، تب سے حلیمہ آپ کی بہت زیادہ نگرانی کرنے لگیں، تنہا گھر سے باہر بھی جانے نہیں دیتی تھیں، ایک دن ان کے خاوند نے ان سے کہا یہ لڑکا کچھ عجیب وغریب قسم کا ہے، اس کے ساتھ ایسے معاملے پیش آتے ہیں جو ہماری عقل وسمجھ سے بالاتر ہیں، کہیں اس کو کچھ ہو نہ جائے، اس لئے مناسب ہے کہ اس کو اس کے دادا کے پاس پہنچا آؤ، چنانچہ حلیمہؓ

نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپؐ کے دادا عبدالمطلب کے پاس پہنچا دیا۔

بچپن میں شرح صدر کی حکمت

اس عمر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے شرحِ صدر میں حکمت یہ تھی کہ اس عمر کے لڑکوں میں کھیل کود، فضول ولایعنی کاموں کی جو دلچسپی ہوتی ہے وہ آپ میں نہ رہے، چنانچہ آپ کو بچپن سے ہی کھیل کود اور لڑکوں والے نامناسب کاموں کے ساتھ کوئی رغبت نہیں رہی تھی، آپ کا اٹھنا بیٹھنا، چال ڈھال شروع سے ہی بہت وقار والی تھی۔

عالم حسّی میں شرح صدر کا دوسرا واقعہ

ابن حبانؒ، حاکمؒ، ابونعیمؒ، ابن عساکرؒ، ضیا مقدسیؒ اور عبداللہ بن احمدؒ نے مسند کی زوائد میں صحیح سند سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنا واقعہ اس وقت کا بتاتے ہیں جب دس سال کے تھے اور ایک جنگل میں تھے، فرماتے ہیں کہ وہاں میں نے دو آدمیوں کو دیکھا جو نہایت نورانی شکل کے خوبصورت تھے ایسے نورانی چہرے میں نے کبھی نہیں دیکھے تھے ان سے ایسی خوشبو مہک رہی تھی جو میں نے پہلے کبھی نہیں سونگھی تھی، اُن کے کپڑے ایسے نفیس، صاف برّاق تھے کہ کبھی میں نے نہیں دیکھے تھے، وہ ایک جبرئیل تھے دوسرے میکائیل، ان دونوں نے بہت نرمی سے مجھے بازوؤں سے پکڑا، پھر نہایت احتیاط سے پشت کے بل مجھے لٹایا کہ مجھے کچھ مشقت معلوم نہیں ہوئی، پھر اُنہوں نے میرا پیٹ چاک کیا لیکن نہ تو مجھے تکلیف ہوئی اور نہ ہی خون نکلا، پھر ان میں سے ایک سونے کی طشت بھر کر پانی لایا دوسرے نے میرے پیٹ کو اندر سے دھویا، پھر ایک نے کہا ان کے دل کو چاک کر کے اس سے کینہ و بدخواہی نکال دو، چنانچہ اس نے دل کو چیر کر اس سے جما ہوا خون نکال کر باہر پھینک دیا، پھر اس نے کہا شفقت و مہربانی ان کے دل میں ڈال دو تو اس نے ایک چیز چاندی کے بتل کی طرح کی میرے دل میں ڈال دی پھر ذرور کی طرح کی کوئی چیز چھڑک کر (سب بند کر دیا اور) میرا انگوٹھا پکڑ کر کہا جاؤ ہمیشہ خوش رہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اس وقت سے میں اپنے دل میں ہر چھوٹے بڑے کے لئے شفقت و رحمت پاتا ہوں۔

دوسری مرتبہ کے شقِ صدر (شرحِ صدر) میں حکمت

اس مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا شقِ صدر اس وقت ہوا جب آپ سن بلوغ کے قریب تھے، اور جوانی کے لوازمات میں سے ہے کہ شہوت کی طرف میلان ہوتا ہے، اور غضب جوش مارتا ہے سو ان گناہوں سے معصوم رکھنے کے لئے جوان دوصفات سے تعلق رکھتے ہیں آپ کا دوسری بار شقِ صدر کیا گیا۔

تیسری مرتبہ شرح صدر کا واقعہ

تیسری مرتبہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا زمانہ اور آپؐ کے دل پر نزولِ وحی کا وقت قریب آیا تو آپؐ کے قلب مبارک کی صفائی اور اس کی تقویت کے لئے پھر آپ کا سینہ چاک کیا گیا۔

اس واقعہ کو بیہقی اور ابونعیم نے دلائل میں، ابوداؤد طیاسی اور حارث بن حسامہ نے اپنی مسانید میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ ایک مہینے کے اعتکاف کی نذر مانی، اس اعتکاف میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک تھیں، اتفاق سے وہ مہینہ رمضان کا تھا، دونوں اعتکاف کے لئے غار میں بیٹھے ہوئے تھے، رات کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وقت معلوم کرنے باہر نکل کر ستاروں کو دیکھنے لگے کہ اچانک آپؐ نے آواز سنی "السلام علیک" آپ فرماتے ہیں میں نے سوچا یہ آواز جنوں کی جھپٹ کی سی ہے شاید کسی جن کا ادھر سے گذر ہوا ہے، یہ سوچ کر جلدی سے غار کے اندر چلا گیا اور حضرت خدیجہؓ سے ذکر کیا، حضرت خدیجہؓ نے فرمایا یہ تو خوشخبری کی آواز ہے اس لئے کہ سلام علیک کا لفظ امن و سلامتی اور موانست کی علامت ہے، لہٰذا اس سے گھبرانے کی ضرورت نہیں، آپؐ پھر باہر نکلے تو کیا دیکھتے ہیں کہ جبرئیل علیہ السلام ایک تخت پر بیٹھے ہیں جو آفتاب کی طرح چمک رہا ہے، اور ان کا ایک پَر مغرب میں اور دوسرا مشرق میں ہے فرماتے ہیں یہ منظر دیکھ کر مجھے گھبراہٹ ہوئی اور چاہا کہ واپس غار کے اندر بھاگ جاؤں مگر جبرئیل نے اتنی مہلت ہی نہ دی وہ جھٹ غار کے دروازے پر آگئے، ان کو دیکھنے اور ان کی باتیں سننے سے میری وحشت دور ہوگئی اور اُنس محسوس ہونے لگا، تب جبرئیل علیہ السلام نے مجھ سے وعدہ لیا کہ فلاں وقت اکیلے آنا، میں نے وعدہ کرلیا، اور اسی وقت اکیلے آیا اور آکر انتظار کرتا رہا، جب دیر زیادہ ہوگئی تو واپسی کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ دیکھا جبرئیل و میکائیل دونوں بڑی شان

سے زمین و آسمان کے درمیان سے آ رہے ہیں، میرے پاس پہنچے تو مجھے پکڑ کر لٹا دیا اور میرے سینے کو چاک کیا، پھر دل کو نکال کر سونے کے طشت میں زمزم کے پانی سے دھویا اور کوئی چیز اس سے نکالی جو مجھے معلوم نہیں کیا تھی پھر سینے کو درست کر دیا پھر دونوں نے میرے پاؤں پکڑ کر یوں اُلٹا کیا جیسے برتن کے اندر سے کوئی چیز گرانے کے لئے اس کو اوندھا کرتے ہیں، اس کے بعد ایک مہر میری پیٹھ پر لگائی جس کا دباؤ میں نے دل پر محسوس کیا۔

چوتھی مرتبہ عالم حسّی میں شق صدر کا واقعہ

چوتھی مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا شق صدر معراج کی رات ہوا، اور معراج کا واقعہ مشہور و معروف ہے اپنی جگہ گذرا ہے اس کے ذکر کرنے کی یہاں ضرورت نہیں اور اِس مرتبہ شقِ صدر کی وجہ حکمت آپ کے دل کو ایمان و حکمت سے لبریز کرنے کے علاوہ یہ بھی تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب میں عالمِ ملکوت کی سیر کی قوت و طاقت پیدا کی جا سکے، اور ان انوار و تجلّیات کے مشاہدہ کی قوت پیدا ہو سکے جن کو دیکھنے سے انسان کو وحشت (وخوف) ہوتی ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا شقِ صدر، معنوی شرح صدر کا نمونہ ہے، اور دنیا میں بار بار اس کے واقع ہونے کی وجہ ہر واقعہ کے ساتھ بیان کر دی گئی ہے۔

پہلی نعمت جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کی گئی یہی تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سینہ مبارک اس قدر کشادہ کر دیا گیا کہ اس میں بے شمار کمالات کی گنجائش پیدا ہو گئی چنانچہ اسی لئے اس نعمت کو اس سورت کے شروع میں استفہام انکاری کے طور پر ذکر فرمایا کہ قاعدہ ہے "نفی النفی اثبات" نفی کا صیغہ ہے جس کا معنی ہے نہیں کھولا، جب اس پر ہمزہ استفہامِ انکاری کا داخل ہوا اُلم نشرح، تو اب پہلی نفی کی نفی ہو گئی کیا ہم نے نہیں کھولا، یعنی ہم نے کھولا ہے اور یہی مقصود ہے۔

شرح صدر کی نعمت کو بیان کرنے کے بعد اب دو ایسی نعمتوں کو بطور تنبیہ کے بیان کرتے ہیں جو اسی نعمت کے نتائج و آثار میں سے ہیں سو پہلی نعمت ان دو میں سے یہ بیان فرمائی:

وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ۝

اور اُتار رکھا ہم نے تجھ پر سے بوجھ تیرا

یعنی حوصلے کی وسعت و کشادگی کی وجہ سے ہم نے تیرے بوجھ کو تجھ سے اتار لیا، بات اصل میں یہ

ہے کہ آدمی کی روح میں جس چیز کی استعداد رکھی گئی ہوتی ہے وہ آدمی جبلّت کے تقاضے کے مطابق اس چیز کے حصول کی طرف میلان ورغبت رکھتا ہے، مگر اس کے قوی وجوارح جب اس چیز کے حصول میں پیش آنے والی مشقتوں کا تحمل نہیں کرسکتے تو وہ چیز اس کے لئے بھاری اور بوجھل ہوجاتی ہے جیسے کوئی بلند ہمت انسان جس میں بادشاہی وسرداری کی استعداد موجود ہے جب استعداد کے موافق اس کی طبیعت ان چیزوں کی خواہش کرتی ہے تو ظاہر ہے بادشاہی حاصل کرنے کے لئے بہت سامال، بہت بڑی فوج اور طرح طرح کی جسمانی وروحانی محنتیں اور مشقتیں اُٹھانا پڑتی ہیں، سو جب یہ مشکلات اس کے سامنے آتی ہیں تو ایک بہت بڑا بوجھ اس پر آجاتا ہے۔

لیکن اگر حوصلے کی فراخی عطا ہوگئی تو پھر کسی بھی کمال کے حصول میں جو چیزیں مزاحم وسدِ راہ ہوں گی ان کے مقابلے سے وہ دل تنگ نہیں ہوگا، اس بوجھ کا اثر جلد دل سے دور ہوکر دل کو نہایت سبکی وسہولت حاصل ہوجائے گی۔

الَّذِیٓ اَنۡقَضَ ظَهۡرَكَ ۝

جس نے جھکا دی تھی پیٹھ تیری

یعنی وہ بوجھ جس نے آپ کی کمر کو تقریباً توڑ ہی دیا تھا، وجہ یہ تھی کہ آپ کی ہمت تمام کمالات کو حاصل کرنے چاہتی تھی مگر نفسانی تشویشات کی وجہ سے آپ کے دل میں تنگی پیدا ہوتی تھی سو ہم نے آپ کی شرح صدر کرکے یہ ساری تشویشات وپریشانیاں آسان کردیں۔

''وِزۡر'' کی تفسیر میں مفسرین کے اقوال

''وِزۡر'' کی تفسیر میں مفسرین نے دائیں بائیں ہاتھ مارے ہیں لیکن حقیقت تک ان کی فکر کو رسائی نہ ہوسکی، (حقیقت وہی ہے جو ابھی بیان کردی گئی ہے)

(۱) بعض نے کہا ''وِزۡر'' سے مراد مکہ معظمہ سے نکلنے کا غم تھا، جو مدینے میں پہنچا دینے سے جاتا رہا۔

(۲) بعض نے کہا وہ کافروں کی شرارت اور انکے ظلم وستم کا غم تھا جو اسلام کے غلبے سے دور کردیا گیا۔

(۳) بعض نے کہا کہ وہ غم دینِ حنیف کے احکام نہ پانے کا تھا (کہ بعثت سے قبل آپ صلی اللہ

علیہ وسلم کو اس کی جستجو پیدا ہوگئی تھی) سو قرآن کریم کے نزول اور احکام کی وحی سے وہ غم دور ہوگیا۔

(۴) بعض نے کہا وہ غم امت کا تھا، سو شفاعت کا مقام عطا فرما کر اس غم کو ختم کردیا گیا۔

(۵) بعض نے کہا وہ رسالت کی ذمہ داری کا غم تھا، تو جانثار اصحاب عطا فرما کر اس غم کو دور کردیا گیا، جیسے ابوبکر صدیق، عمر فاروق، عثمان ذی النورین اور علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہم اجمعین۔

بہرحال ان حضرات نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ اس دریا کا ایک قطرہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شرح صدر کی دوسری نشانی یہ ہے:

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۝

اور بلند کیا ہم نے مذکور تیرا

یعنی جب کمالات میں جامعیت کا مرتبہ آپ کو حاصل ہوا کہ مرتبۂ الوہیت کا آپ گویا ظِل ہوئے، اور اس جامعیت میں آپ منفرد و یگانۂ روزگار ہوئے۔ تو (ہم نے آپ کے تذکرے کو سربلندی عطا فرمادی اس طرح کہ) آپؐ کے ذکر کو اللہ تعالیٰ کے ذکر کے ساتھ کرتے ہیں، جیسے کہا جاتا ہے "اللہ اور اس کا رسول خوب جانتے ہیں" یا یوں کہتے ہیں "اللہ اور رسول کے حکم کی فرماں برداری واجب ہے" وغیرہ وغیرہ۔

حدیث میں آتا ہے ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل امین سے پوچھا میرے ذکر کو کس طرح بلند کیا گیا ہے تو حضرت جبرئیل نے فرمایا آپؐ کے ذکر کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ذکر کے ساتھ ملا یا ہے، اذان میں، اقامت میں، التحیات میں، خطبے میں، کلمۂ طیبہ میں، کلمۂ شہادت میں اور اطاعت کا حکم دینے میں جیسے فرمایا "اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول" اسی طرح نافرمانی کے حرام ہونے میں فرمایا: "ومن یعص اللہ ورسولہ فان لہ نار جھنم خالدًا فیھا ابدا"

تین جگہ اللہ کے ذکر کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر نہیں کیا جاتا

معلوم ہونا چاہئے کہ تین جگہیں ایسی ہیں کہ وہاں اللہ تعالیٰ کے ذکر کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر نہیں کیا جائے گا:

(۱) اذان کے آخر میں صرف "لا الہ الا اللہ" کہا جاتا ہے۔

(۲) چھینک کے جواب میں صرف ''الحمد للہ'' کہا جاتا ہے۔

(۳) ذبح کے وقت صرف ''بسم اللہ اللہ اکبر'' کہا جاتا ہے۔

ان تین جگہوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر نہ کرنے کی وجہ اپنی جگہ بیان ہوگی۔

جب تینوں نعمتوں کو بیان فرمایا جن میں سے ایک اصلی اور دو فرعی تھیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک کمال (شرح صدر) میں دوسرے انبیاء کے مقابلے میں جو خصوصیت عطا فرمائی گئی تھی وہ ثابت ہوگئی۔

اب آگے یہ بیان فرماتے ہیں کہ یہ سب صبر کی برکت ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سختیوں اور تکلیفوں پر کیا اور ہماری راہ میں دُکھ و رنج اُٹھائے۔

فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ○

سو البتہ مشکل کے ساتھ آسانی ہے

یعنی ہر مشکل کے ساتھ آسانی ہے جو عین سختی و مشکل کے وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوتی ہے، سو اس آسانی کی وجہ سے اس مشکل و تنگی کا تحمل و برداشت آسان ہو جاتا ہے، ورنہ اگر اس مشکل و مصیبت کے گذرنے کے بعد یا پہلے اس کا تصور کریں تو اپنے اندر اس کو برداشت کرنے کا حوصلہ و قوت نہ پائیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شرح صدر کی وجہ سے کمالات کے حصول کے لئے ایسی آسانیاں عطا فرمائی گئی تھیں تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں کدورت و تنگی پیدا نہ ہو اور باوجود سخت موانع کے ہر کمال کی انتہاء تک تحصیل کر لیں۔

إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ○

البتہ مشکل کے ساتھ آسانی ہے

یعنی اسی مشکل کے ساتھ دوسری آسانی بھی ہے، اور یہ دوسری آسانی مراتب و درجات کی بلندی ہے، اس لئے کہ مصیبت پر صبر اگر اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے ہے تو یہ صبر اللہ تعالیٰ کے ہاں درجات کی بلندی کا ذریعہ ہے اور اگر لوگوں کے لئے مصائب پر صبر و تحمل ہو رہا ہے تو تب بھی یہ صبر اس کے لئے

لوگوں پر حق خدمت وحق شفقت ثابت کرنے کا سبب ہے (یعنی اس کے نتیجے میں لوگوں کی نظروں میں اس کی حیثیت ومقام بڑھ جائے گا لوگ اس کے احسان مند ہوں گے اور اس کی خدمت واطاعت اس کا حق سمجھیں گے)

تو مرتبہ ومنصب کی ترقی کی طرف نظر کرتے ہوئے وہ سختی ومصیبت بالکل آسان ہو جاتی ہے، چنانچہ اس کا تجربہ ومشاہدہ ہے کہ لوگ منصب کے حصول کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دیتے ہیں اور اس سلسلے میں پیش آنے والے مصائب پر آہ تک نہیں کرتے۔

ایک مشہور اعتراض اور اس کا جواب

اس تقریر سے وہ اعتراض جو اس مقام پر مشہور ہے خود بخود رفع ہو گیا، اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ ''مع'' کا لفظ لغت میں مقارنت یعنی ملنے اور ایک ساتھ ہونے کے معنی میں آتا ہے، اس کا تقاضا تو یہ ہے کہ سختی اور آسانی دونوں ایک ہی وقت میں ایک ساتھ ہوں، اور یہ ممکن نہیں اس لئے کہ اس سے لازم آتا ہے دو ضدیں ایک ساتھ جمع ہوں ''والضدان لا یجتمعان'' اور یہ عقلی مسلّمہ قاعدہ ہے کہ دو ضدیں ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتیں۔

تو اعتراض کے جواب کی وضاحت عقلی قواعد کے مطابق یہ ہے کہ دو ضدوں کا اجتماع دو مختلف اعتباروں اور حیثیتوں سے ممکن ہے، مثلاً کہا جاتا ہے کہ مسافر کے لئے روزہ رکھنا اگرچہ مشقت کا کام ہے مگر سب مسلمان چونکہ روزہ سے ہوتے ہیں ان کی موافقت کے اعتبار سے آسان ہو جاتا ہے، اسی طرح مصیبت زدہ انسان کو اگرچہ دکھ ہے مگر اس حیثیت سے کہ اس پر بہت بڑا اجر وثواب عطا ہونے والا ہے اور یہ مصیبت اللہ کی خوشنودی کا ذریعہ ہے یہ مصیبت آسان لگنے لگتی ہے، اور اس کے تحمل میں سہولت پیدا ہو جاتی ہے، اسی طرح فقر وتنگدستی دنیا کی ایک مشقت ہے مگر اگر اس اعتبار سے دیکھیں کہ آخرت کے حساب وکتاب سے نجات ہے، نیز دنیا میں بھی چوروں ڈاکوؤں کے خوف سے محفوظ ہے، اور ظالمانہ ٹیکس وتاوان کے بکھیڑوں وپریشانیوں سے جان چھوٹی ہوئی ہے۔ تو یہ آسان ہے۔

لہٰذا یہ ہو سکتا ہے کہ ایک ہی چیز ایک ہی وقت میں ایک اعتبار سے مصیبت ہو اور دوسرے اعتبار سے آسان وراحت ہو۔

بعض مفسرین نے اس اعتراض کے جواب میں کہا ہے کہ ''مع'' کا لفظ اگرچہ مقارنت ومصاحبت

کے لئے آتا ہے مگر یہ ایسی جگہ بھی بول لیا جاتا ہے جہاں ایک چیز کے بعد دوسری چیز جلدی حاصل ہونے والی ہو، تو اس چیز کے قرب ونزدیکی بتانے کے لئے اس لفظ کا استعمال کیا جاتا ہے یہ مقام بھی ایسا ہی ہے اس لئے کہ دنیا کی مصیبت چاہے کتنی ہی دراز کیوں نہ ہو مگر دنیا کے ساتھ آخرت متصل ہے، دونوں میں جدائی نہیں اس قرب کو بتانے کے لئے ''مع'' کا لفظ یہاں لائے ہیں (کہ دنیا کی تنگی کے ساتھ آخرت کی فراخی ملی ہوئی ہے جو ہر شخص کی موت کے ساتھ ہی اس کو میسر آئے گی)

عسر و یسر کومکرر لانے کی وجہ

اس آیت کو مکرر لانے کی دو وجہیں ہیں، پہلی وجہ تو یہ ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسکراتے ہوئے گھر سے باہر تشریف لائے، اور صحابہؓ سے فرمانے لگے خوش ہو جاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کی ہر سختی کے بعد دو آسانیوں کا وعدہ فرمایا ہے، ایک آسانی دنیا کی، اور دوسری آخرت میں عطا ہوگی، اور اسی مضمون کی طرف بعض متفنن طبع لوگوں نے اس شعر میں اشارہ کیا ہے ۔

إذا اشتدت بک البلوىٰ ففکر فی الم نشرح

فعسر بین یسرین إذا فکرتہ فافرح

ترجمہ:۔ یعنی جب مصائب تجھ پر بہت زیادہ ہو جائیں تو سورۂ الم نشرح کے مضمون پر غور کر لیا کرو، جب غور کرو گے تو خوش ہو جاؤ گے (کہ اس میں وعدہ ہے ایک تنگی پر دو آسانیوں کا)

صحیح حدیث میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لن یغلب عسر یسرین'' یعنی ایک تنگی دو آسانیوں پر غالب نہیں آسکتی۔

ایک شبہے کا جواب اور بلاغت کا قاعدہ

اگر کسی کو شبہہ ہو کہ جس طرح دو ''یُسر'' ذکر کی گئیں ہیں اسی طرح دو ''عسر'' بھی تو ذکر کی گئیں، پھر یہ کیا وجہ ہے کہ ''عسر'' تو ایک ہی مراد لی جائے اور ''یُسر'' سے دو مراد لی جاتی ہیں۔

جواب اس کا یہ ہے کہ اہل عربیّت (کلام عرب کے ماہرین) کہتے ہیں کہ اگر نکرہ مکرر ذکر کیا جائے تو دوسرا نکرہ پہلے نکرہ کے مغائر اور الگ ہوتا ہے، اور اگر نکرہ کو معرفہ یا معرفہ کو مکرر ذکر کیا جائے تو دوسرا معرفہ پہلے کا عین ہوتا ہے یعنی وہ پہلا ہی ہوتا ہے الگ کوئی دوسری چیز نہیں ہوتا۔

پہلی صورت کی مثال جیسے "جاء نی رجل فقال رجل" اس میں دوسرا رجل پہلے کے علاوہ کوئی اور ہے، اور دوسری صورت کی مثال جیسے "وارسلنا الی فرعون رسولاً فعصیٰ فرعون الرسول" اس میں رسول کو دوسری مرتبہ معرفہ لایا گیا ہے لہٰذا اس سے پہلا ہی مراد ہے۔

اس قاعدے کے مطابق اب ملاحظہ فرمائیں کہ یہاں دونوں مرتبہ "عسر" کو معرفہ لائے ہیں اس لئے اس سے ایک ہی عسر مراد ہے، دوسری عسر پہلے کے علاوہ نئی نہیں ہے، اور "یسر" کو دونوں مرتبہ نکرہ لائے ہیں لہٰذا دوسری یسر، پہلی کے علاوہ اور ہے، لہٰذا دو آسانیاں ہوئیں۔

دوسری وجہ اس آیت کو مکرر لانے کی یہ ہے کہ یہ تکرار تاکید کے لئے ہے یعنی مصیبت میں آسانی کی امید ختم ہو جاتی ہے اس موقعہ پر گمان یہ تھا کہ مصیبت میں پھنسا ہوا شخص مصیبت کے بعد آسانی کا یقین ہی نہ کرے گا اس لئے اس کو یقین دلانے کے لئے تاکید کے طور پر اس کو تکرار سے ذکر کر دیا (نتیجہ اس کا بھی یہی ہے کہ تنگی کے بعد آسانی ضرور ملتی ہے)

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کئے گئے انعامات واحسانات کے بیان سے فارغ ہوئے تو اب ان احسانات کے شکر کی تعلیم فرماتے ہیں:

فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ○

پھر جب تو فارغ ہو تو محنت کر

جو مراتب ومناصب ہم نے آپ کو عطا کئے ہیں جیسے نبوت، رسالت، ہدایت، معرفت، خلافت کبریٰ، قضاء، افتاء اور تعبد وولایت وغیرہ جب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ان مراتب کے حقوق ادا کرنے سے فارغ ہو جائیں تو پھر خوب رنج ومشقت اُٹھائیں اللہ کی یاد میں۔

وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ ○

اور اپنے رب کی طرف دل لگا

اس پروردگار سے دل لگایئے جس نے آپ کو کس کس طرح پرورش کیا، اور ایسے ایسے کمالات عطا فرمائے جو بنی آدم میں سے کسی کو میسر نہ آئے پس اس کے علاوہ آپ کی نظروں میں کوئی بھی نہ سمائے۔

بعض مفسرین نے اس کے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرض نماز سے فارغ

ہوں تو دعاء کے لئے ہاتھ اُٹھائیں۔

بعض نے کہا کہ جب ''التحیات'' سے فارغ ہوں تو اپنی دنیا وآخرت کے لئے دعاء فرمائیے۔

ایک سوال اور اس کا جواب

اب رہا یہ سوال کہ ''الم نشرح'' مضارع کا صیغہ ہے اور اس کے معطوفات جیسے ''ووضعنا، ورفعنا'' یہ ماضی کے صیغے ہیں سو معطوف علیہ اور معطوفات میں اس فرق کی کیا وجہ ہے؟

آیت کی تفسیر کے دوران اس جواب کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے، وہ یہ کہ شرح صدر جو اوّل نعمت ہے بلکہ تمام کمالات کی اصل اور بنیاد ہے، اس کی نفی پر استفہامِ انکاری داخل کر کے اس کو صیغۂ مضارع میں اس لئے ذکر کیا تا کہ ''شرح صدر'' کے تجدّد ودوام پر دلالت ہو اور ''وضع'' (ووضعنا عنک وزرک) اور ''رفع'' (ورفعنا لک ذکرک) دونوں چونکہ فرعی نعمتیں ہیں شرح صدر کی وجہ سے ہی وہ حاصل ہوئیں ہیں اس لئے ان کو ایسے صیغے سے بیان کیا جو استمرار پر دلالت نہ کرے اور اس ترکیب (اندازِ کلام) میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہوگیا کہ شرح صدر کے ساتھ ہم وضع، رفع سے بھی فارغ ہو گئے گویا جب شرح صدر ہوگئی تو یہ دونوں کام بھی ساتھ ہو گئے، اس لئے کہ یہ دونوں شرح صدر کا ہی ثمرہ ونتیجہ ہیں۔

واللہ اعلم بالصواب

الحمدللہ تم تفسیر سورۃ الم نشرح

مقدمہ سورۂ والتین

یہ سورت مکی ہے، اس میں آٹھ (۸) آیات، چونتیس (۳۴) کلمات اور ڈیڑھ سو (۱۵۰) حروف ہیں۔

وجہ تسمیہ

"والتین" اس سورت کا نام اس لئے رکھا ہے کہ "التین" لغت میں انجیر کو کہتے ہیں اور انجیر فوائد کے لحاظ سے تمام پھلوں میں جامع پھل ہے، جیسے انسان کا بدن تمام ابدان میں سب سے جامع ہے، اور وہ اسی جامعیت کی وجہ سے فیضانِ روحی کا مستحق قرار دیا گیا، پس یہ قرآن کے الفاظ کے مشابہ ہے کہ قرآن کے الفاظ بے شمار اسرار کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ سورت میں "تیـــــن، زیتون، طور سینین اور بلدامین" چار چیزوں کی قسم مذکور ہے مگر ان چاروں میں سے خاص طور پر سورت کا نام "التیـــن" کے ساتھ موسوم کیا ہے وجہ یہ ہے کہ اس میں ایسی جامعیت ہے جو قرآن کے الفاظ کے مشابہ ہے۔

اس سورت میں شرع و معاد کا اثبات کمال تاکید سے کرنا ہے اس لئے اس سورت کی ابتداء میں چار قسمیں مذکور ہیں۔

تفسیر سورۃ التین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَالتِّيْنِ

قسم انجیر کی

انجیر کے ظاہری فوائد و خصوصیات

انجیر ایسا پھل ہے کہ اس کی کچھ ظاہری خصوصیات ہیں اور کچھ باطنی خصوصیات ہیں جو اس کو دوسرے پھلوں سے ممتاز کرتی ہیں۔ ظاہری خصوصیت یہ ہے کہ یہ غذاء بھی ہے دواء بھی ہے اور پھل بھی ہے، اس لئے کہ یہ ایسی لطیف چیز ہے کہ زود ہضم ہے، اور بدن کے اندر سے گندے مواد کو پسینے کے

ذریعہ باہر نکال دیتی ہے، اسی لئے باوجود گرم ہونے کے تپ کے مرض میں مفید ہے، اسی طرح یہ بلغم کو تحلیل کرتا ہے، گردے ومثانے کی پتھری ختم کرتا ہے، بدن کو موٹا اور مسامات کھولتا ہے، خاص طور پر جگر وتلی (طحال) کے مسامات کھولنے میں بے نظیر ہے۔

اس کی عجیب باتوں میں سے یہ ہے کہ یہ سارا ہی کھایا جاتا ہے اس میں سے کوئی چیز پھینکنے کے قابل نہیں ہوتی، نہ چھلکا ایسا کہ کھایا نہ جائے نہ ہی گٹھلی کہ پھینکی جائے، گویا قرآن کی طرح مغز ہی مغز ہے۔

حدیث میں آتا ہے ایک آدمی طباق بھر کر انجیروں کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لایا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی تناول فرمائے اور صحابہ کرامؓ سے فرمایا کھاؤ یہ ایسا پھل ہے کہ اس میں گٹھلی نہیں ہوتی جنت کے پھل بھی ایسے ہیں، سو یہ کھاؤ اس لئے کہ بواسیر کا مواد دور کرتا اور نقرس کے درد کے لئے مفید ہے۔

امام علی موسیٰ رضا رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ انجیر ہمیشہ استعمال کرنے سے منہ کی بدبُو ختم ہوتی ہے، بالوں کو بڑھاتا ہے اور فالج سے حفاظت میں رکھتا ہے۔

اور اس کی ایک عجیب بات یہ بھی ہے کہ پورے لقمے کے برابر ہے، نہ چھوٹا نہ بڑا، تاکہ کھانے والے کو کسی طرح کی مشقت نہ ہو۔

انجیر کی باطنی خصوصیات ودیگر عجائبات

اس کی باطنی خصوصیات میں سے یہ ہے کہ یہ اہل کمال کے ساتھ کامل مشابہت رکھتا ہے، کہ جس طرح اہلِ کمال کا ظاہر وباطن ایک جیسا ہوتا ہے اسی طرح اس کا بھی ظاہر وباطن یکساں ہے، کہ سارا ہی کھایا جاتا ہے۔ جب کہ دوسرے پھلوں میں بعض کا چھلکا کھانے کے قابل نہیں ہوتا اور بعض کے اندر گٹھلی ہوتی ہے۔

انجیر کے درخت کی ایک عجیب بات یہ بھی ہے کہ یہ کمال کا دعویٰ کرنے سے پہلے ہی اپنے کمال کا اظہار کر دیتا ہے، یعنی یہ پہلے پھل لاتا ہے بعد میں پھولتا ہے، جب کہ دوسرے درخت پہلے پھولتے ہیں پھر پھلتے ہیں، گویا اس درخت کے اندر ایثار کی صفت پائی جاتی ہے، کہ پہلے دوسروں کو نفع پہنچاتا ہے، پھر اپنی آراستگی کی تدبیر کرتا ہے، جبکہ دوسرے درخت دنیا داروں کی طرح پہلے اپنا بھلا کر لیتے ہیں پھر دوسروں کو فائدہ پہنچاتے ہیں۔

اس کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ دوسرے پھلوں کے مقابلے میں اس کا فیض زیادہ ہے، کہ یہ سال میں کئی بار پھلتا ہے۔

ان سب باتوں کے ساتھ انجیر کو ایک خاص مناسبت ہے انسان کے ساتھ، وہ یہ کہ جنت میں جب حضرت آدم علیہ السلام سے لغزش کی وجہ سے جنتی لباس اُتر گیا تو پردے کیلئے پتے لینے کے لئے جس درخت کے قریب جاتے وہ درخت اونچا ہو جاتا تو پتے نہ لے سکتے، جب انجیر کے درخت کے پاس گئے تو یہ بلند نہ ہوا اس لئے اس کے پتے توڑ کر حضرت آدم علیہ السلام نے پردہ کیا۔

ایک شبہے کا ازالہ

بعض کسان پیشہ لوگ یہ شبہ کرتے ہیں کہ درختوں میں کامل درخت وہ ہوتا ہے جس میں دس خصوصیات پائی جائیں۔

(۱) جڑ (۲) ڈالیاں (۳) پتے (۴) پھول (۵) پھل

(۶) گٹھلی (۷) گوند (۸) چھال (۹) چھلکا (۱۰) شیرہ

جیسے کھجور کا درخت ہے، جس درخت میں ان دس چیزوں میں سے کوئی چیز کم ہو وہ ناقص شمار ہوتا ہے۔ لہٰذا انجیر میں بھی گٹھلی نہیں ہوتی اس لئے یہ بھی ناقص ہونا چاہئے۔

جواب اس کا یہ ہے کہ یہی نقص عین کمال ہے، اس لئے کہ گٹھلی کوئی کھانے کی چیز نہیں ہوتی وہ پھینک دی جاتی ہے، اس لئے اس کا نہ ہونا ہی بہتر ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اس پھل کے نفع بخش اور بے ضرر ہونے کی جامعیت کے پیش نظر قسم کھائی، اور اس کو انسان کی جامعیت کے ساتھ جو مناسبت ہے اس کی رعایت فرمائی ہے۔

وَالزَّيْتُوْنِ ○

اور زیتون کی

زیتون درخت کو بھی کہتے ہیں اور اس کے پھل کو بھی کہتے ہیں، یہ بھی جامع ہے، ظاہری فوائد بھی اس کے بہت سے ہیں اور باطنی فوائد بھی رکھتا ہے، ظاہری فوائد یہ ہیں:

(۱) زیتون کے سرکے میں اچار بنا کر استعمال کرنا معدے کے لئے مقوی اور بھوک بڑھاتا ہے۔

(۲) زیتون کا پکا ہوا پھل کھانے سے سیری ہوتی ہے، بدن کو موٹا کرتا ہے اور قوت باہ بڑھاتا ہے۔

(۳) زیتون کی گٹھلی کی گری چربی اور آٹے میں ملا کر کوڑھی کے بدن پر ملنے سے کوڑھ ختم ہوتا ہے۔

(۴) زیتون کا شیرہ سیلانِ رحم کے لئے مفید ہے۔

(۵) پانی میں زیتون کا پھل اور نمک ملا کر کلی کرنے سے دانتوں کی جڑیں مضبوط ہوتی ہیں۔

(۶) الغرض انجیر کی طرح یہ بھی غذاء بھی ہے، دواء بھی ہے اور پھل بھی ہے اور اس کے انجیر کے مقابلے میں کچھ مزید فوائد بھی ہیں جو حسب ذیل ہیں:

(۱) زیتون کا فائدہ سالہا سال تک باقی رہتا ہے اس طرح کہ کچے زیتون کا چراغوں میں جلانے کا تیل بنتا ہے اس کو ''زیت الانفاق'' کہتے ہیں، اس کی روشنی نہایت لطیف وشفاف ہوتی ہے، ایسی روشنی کسی اور تیل کی نہیں ہوتی۔

(۲) پکے ہوئے زیتون کا تیل بھی بنتا ہے اس کو ''زیت الطیب'' کہتے ہیں یہ خوشبودار ہوتا ہے اور اس کے بہت سے فوائد ہیں، قولنج کے مرض، اور اسہال کے لئے ارنڈی کے تیل کا اثر رکھتا ہے، مالش اور لیپ کرنے (ضماد) میں روغنِ گل کی خاصیت رکھتا ہے، اور شری، جمرہ، قوبا، صداع، بور، نقرس، وجع المفاصل، سبل، بالوں کو سیاہ کرنے اور آنکھ کی غلیظ رطوبت جو کناروں پر جم جاتی ہے ان سب کے لئے مفید ہے۔

(۳) بچھو کے کاٹے پر لگانا بھی مفید ہے۔

زیتون کی باطنی خصوصیات و دیگر عجائبات

(۱) اس کی باطنی خصوصیات میں سے یہ ہے کہ تیل بننے کے بعد اس میں اعلیٰ درجے کی نورانیت اور چمک پیدا ہو جاتی ہے، (تیل اس کے باطن سے نکلتا ہے اس لئے یہ اس کی باطنی خصوصیت شمار ہوئی) اسی باطنی خصوصیت کی وجہ سے اہلِ کمال کے ساتھ اس کی خاص مناسبت ہے، اس طرح کہ جب وہ لوگ اپنے ثمرۂ حیات کو ریاضت کی گھڑیا (برتن) میں پگھلا کر روح کو لطیف کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اس میں نرمی ولطافت پیدا کرتے ہیں تو تب ان کی روح میں عظیم نورانیت اور چمک پیدا ہو جاتی ہے، (جس طرح اس تیل کی روشنی ہوتی ہے)

(۲) اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ اس کی روشنی دھوئیں کی سیاہی سے بالکل صاف ہوتی ہے، جس طرح ارواحِ کاملہ کی نورانیت (ظلمت سے پاک) ہوتی ہے، اس کے مقابلے میں دوسرے تیلوں کی روشنی میں دھوئیں کی سیاہی اس طرح ملی ہوتی ہے جس طرح ریاضتِ باطلہ کرنے والوں کی ریاضت (میں ظلمت) ہوتی ہے۔

(۳) نیز اہلِ فکر و استدلال کے ساتھ بھی اس کی مناسبت ہے، اس طرح کہ وہ لوگ اپنی معلومات کو قوتِ فکریہ میں ڈال کر رگڑتے اور پگھلاتے ہیں تاکہ یہ معلومات حقائقِ اشیاء کے مطالعہ کے لئے ایسی نورانیت و روشنی کا موجب ہو جائیں جیسے چراغ کی روشنی (آنکھوں کے لئے) ہوتی ہے، (گویا اہل فکر اس کے تیل کی طرح اپنی معلومات کا تیل نکال کر اس کی روشنی میں اشیاء کی حقائق دریافت کرتے ہیں)

(۴) اور نیز اس کی قرآن کے الفاظ کے ساتھ بھی کامل مناسبت ہے، وہ اس طرح کہ جب قرآن کے معانی کو الفاظ کے ''لباس'' سے الگ کر دیا جائے تو حقائقِ الٰہی کے نور کی تابانی و چمک جلوہ افروز ہو جاتی ہے (جیسے اس تیل کو جب پھل سے جُدا کرتے ہیں تو اس میں روشنی کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے اور صلاحیت اتنی قوی ہے گویا آگ سلگانے سے پہلے ہی وہ روشن ہے)

(۵) زیتون کے درخت کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ تمام درختوں میں اس کی عمر سب سے زیادہ لمبی ہوتی ہے، چنانچہ فلسطین جو ملک شام کا ایک شہر ہے اس میں یہ درخت یونانیوں کے ہاتھوں لگائے ہوئے ہیں جو سکندر کے ساتھ اس طرف آئے تھے، اس زمانے سے لے کر آج (حضرت مصنفؒ کے زمانے) تک تقریباً دو ہزار سال کا عرصہ بنتا ہے۔

یہ بھی ہے کہ یہ درخت زیادہ تر شام کے علاقے میں ہوتے ہیں جو انبیاء کرام علیہم السلام اور اولیاء کا مسکن و مدفن ہے۔

(۷) یہ بھی ہے کہ قرآن میں اس درخت کو شجرۂ مبارکہ کہا گیا ہے۔

(۸) یہ بھی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس درخت کے لئے برکت کی دعاء مانگی تھی۔

(۹) اہل تعبیر نے لکھا ہے کہ اگر کوئی خواب میں دیکھے کہ اس نے زیتون کے پتے ہاتھ میں لئے ہیں تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ اس کے ہاتھ میں عروۃ الوثقیٰ یعنی شریعت کی سیدھی راہ آئے گی۔

(۱۰) ایک آدمی نے حضرت امام ابن سیرین رحمہ اللہ سے اپنا خواب بیان کیا کہ مجھے بتایا گیا ہے

کہ تم دونوں "لا" میں سے کھاؤ، تو انہوں نے تعبیر دی کہ زیتون کا پھل کھاؤ اس لئے کہ قرآن میں اس کے بارے میں آیا ہے " لا شرقیہ ولا غربیۃ"

حدیث میں آتا ہے "کلوا من الذیت وادھنوا بہ فإنہ من شجرۃ مبارکۃ" زیتون کا تیل کھاؤ اور جسم پر ملو اس لئے کہ وہ بابرکت درخت کا تیل ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اس قَسم میں پہلی قَسم سے ترقی ہے، کہ پہلی قَسم میں انجیر کو ذکر کیا تھا جس میں ظاہری فوائد (اور کچھ باطنی فوائد) تو ہیں مگر اس میں باطن کی نورانیت نہیں ہے، اور اس قَسم میں زیتون کو ذکر فرمایا جس میں ظاہری فوائد کے ساتھ باطن کی نورانیت بھی ہے، لہٰذا اس کی مناسبت کمالِ انسانی کے ساتھ بہت زیادہ ہوئی۔

وَ طُوْرِ سِيْنِيْنَ ○

اور طور سینین کی

"طور" لغت میں پہاڑ کو کہتے ہیں، اور پہاڑ کی دو قسمیں ہیں

پہاڑوں کی خصوصیات اور کوہِ طور کی جامعیت

ایک قسم پہاڑوں کی وہ ہوتی ہے جس میں پانی کے چشمے ہوتے ہیں اس وجہ سے ایسے پہاڑ میں درخت خوب ہوتے ہیں جیسے اخروٹ، چرونجی، انجیر، زیتون، سال، ساگوان اور دیگر خودرَو درخت ہوتے ہیں، اور اس میں ہر طرح کی جڑی بوٹیاں، دوائیں بھی ہوتی ہیں جیسے عقاقیر، اور گرم مصالحہ جات، جیسے لونگ، الائچی، نربسی وغیرہ ہیں۔

ایسے پہاڑ پر جانور بھی بکثرت پائے جاتے ہیں جیسے پہاڑی بکرے، وہ ہرن جس سے مشک نکلتا ہے، مرغ زرّیں اور دیگر عجیب وغریب قسم کے جانور ہوتے ہیں۔

اس میں قیمتی پتھر کی کانیں بھی ہوتی ہیں جیسے بلور، یشب وغیرہ ہیں اور اس نوعیت کی اور بھی چیزیں اس میں پیدا ہوتی ہیں۔

ایسے پہاڑ میں جنّوں کی انواع میں سے دیو پری وغیرہ بھی پائے جاتے ہیں اور فوائد ومنافع کثیرہ کی وجہ سے انسان بھی ایسے پہاڑ پر آباد ہوتے ہیں۔

پس ایسے پہاڑ میں اعلیٰ درجے کی جامعیت ہے کہ اس میں نباتات بھی ہیں، حیوانات بھی ہیں اور جناتی ارواح بھی ہیں۔ جتنے عجائبات قدرت اس کے اندر جمع ہیں اس کا عشرِ عشیر بھی کسی دوسرے پہاڑ میں نہیں پایا جاتا، مگر اس جامعیت کے باوجود ایسا ہر پہاڑ تجلّی الٰہی سے خالی ہے، جب ایسے پہاڑ پر تجلّی الٰہی بھی پڑگئی تو تب اس کی جامعیت اُتم واکمل صورت میں حاصل ہوگئی۔

سو اس طرح کا پہاڑ "مدین" و "مصر" کے درمیان واقع ہے جس کو "کوہِ فلسطین" (کوہِ طور) کہتے ہیں۔

یہ ایسا مبارک پہاڑ ہے کہ حضرت موسیٰ وعلیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام اس پہاڑ پر تجلّی الٰہی سے سرفراز کیئے گئے، اور اللہ کی طرف سے ان کو یوں آواز دی گئی "انی انا اللہ رب العالمین" اس طرح ان کو کلیمی کا مرتبہ عطا کیا گیا، اس واقعے کے بعد بھی موسیٰ علیہ السلام اس پہاڑ پر جاکر اللہ سے مناجات کرتے رہے، چلّے کاٹے، اور عبادتیں کرتے رہے، اسی پہاڑ پر آپ کو توریت کی تختیاں دی گئیں، اس طرح سے یہ پہاڑ اپنی ظاہری جامعیت کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے روحانی اسرار، اور ان کی عبادت کے انوار کا بھی جامع ہوا۔

جس نور نے اس پہاڑ پر تجلّی کی تھی اور موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہوئے تھے اس نور کا اثر اتنا قوی، دیرپا اور باقی رہنے والا تھا کہ زمانے گذر جانے کے باوجود موسیٰ علیہ السلام کے متبعین کے لئے قرب حاصل کرنے اور احکام شریعت کی بقاء کے لئے معاون رہا، (کہ اس کے اثرات کی وجہ سے دینِ موسوی لوگوں میں باقی رہا) پس انوار موسوی کہ جن کی بدولت تمام بنی اسرائیل متورومہذب ہوئے ان کا مبداء ومنتہا یہی مبارک پہاڑ ہے، اسی وجہ سے (کہ یہ پہاڑ نورِ الٰہی کا مظہر ہوا) اس قسم میں پہلی قسم سے بھی ترقی فرمائی ہے، کہ اس سے پہلی قسم جس نور کی تھی یعنی زیتون کی تو وہ نورِ عنصری تھا، اور جس نور نے اس پہاڑ پر تجلّی فرمائی تھی اور اس کو ریزہ ریزہ کرڈالا تھا وہ نورِ الٰہی تھا کہ باوجود زمانہائے دراز گذر جانے کہ اس کی تاثیر باقی ہے اور تاابد اس کی وجہ سے کمالات موسوی تروتازہ رہیں گے۔

پہاڑ کی دوسری قسم وہ ہے جو خشک ہوتے ہیں ان میں پانی نہیں ہوتا اس وجہ سے ان میں درخت بھی نہیں ہوتے، سو ان کی مثال مردہ اور لاش کی سی ہے کہ دیکھنے میں تو انسانی شکل ہے لیکن حقیقت میں اس کے اندر کوئی انسانی کیفیت نہیں ہوتی، اس لئے یہ صِنف قسم کھانے کے قابل نہیں تھی، اس سے احتراز کرنے کے لئے "سینین" کا لفظ بڑھایا۔

''سینین'' کی تحقیق

لغت میں سینین ہریالی والے پہاڑ کو کہتے ہیں، لیکن عرف میں یہ لفظ مخصوص ہو گیا ہے اس پہاڑ کے لئے جس پر تجلیٔ الٰہی ہوئی تھی۔ یہ لفظ قبطی قوم کی زبان کا ہے جو شام کے ملک میں زراعت پیشہ لوگ تھے، عربی میں اس کا استعمال کئی طرح سے ہے، کبھی ''سینین'' کہتے ہیں، کبھی سین کے فتح کے ساتھ ''سَیْنا'' کہتے ہیں، چنانچہ سورۂ مومنون میں سین کے فتحہ کے ساتھ ہی ہے (تخرج من طور سَیْنا'') اور ابو عمرو، نافع اور ابنِ کثیر کسرہ کے ساتھ پڑھتے ہیں۔

''التین'' اور ''الزیتون'' میں دیگر اقوال

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ ''التین'' یعنی انجیر سے مراد اصحاب کہف کی مسجد ہے، (اور اس کو انجیر کہنے کی وجہ مناسبت یہ ہے) کہ اس کے اردگرد انجیر کے درخت کثرت سے ہیں، اور ''زیتون'' سے مراد بیت المقدس کی مسجد ہے کہ یہ درخت بیت المقدس کے اردگرد کثرت سے پائے جاتے ہیں۔

بعض نے کہا کہ ''زیتون'' سے مراد کوہِ زیتا ہے جو بیت المقدس سے مشرق کی جانب مسجد اقصیٰ سے بلند ہے۔

روایت میں آتا ہے کہ اُم المؤمنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا جب بیت المقدس تشریف لے گئیں تو مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھنے کے بعد کوہِ زیتا پر تشریف لے گئیں وہاں بھی نماز پڑھی، پھر اس پہاڑ کے کنارے پر کھڑے ہو کر فرمانے لگیں اسی جگہ سے لوگ قیامت کے دن ادھر ادھر تقسیم ہوں گے، کچھ جنت میں جائیں گے اور کچھ دوزخ میں بھیجے جائیں گے، اور یہی وہ مقام ہے جہاں سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر اُٹھائے گئے۔

عیسائی اس جگہ کی تعظیم کرتے ہیں، اس پہاڑ کی چوٹی پر ایک فرنگی عورت نے جس کا نام ''ہیلانہ'' تھا ایک کنیسہ بنوایا تھا اس کے اندر ایک قبہ بنایا جس کو مصعدِ عیسیٰ کہا جاتا تھا یعنی حضرت عیسیٰ کے آسمان پر چڑھنے کی جگہ، وہ کنیسہ تو منہدم ہو گیا ہے فی الحال اس پہاڑ پر ''حزنوب نبطی'' کا ایک درخت ہے اس کے قریب ایک مسجد بنائی گئی ہے، اس مسجد کی پائیں میں ایک صاف ستھرا غار ہے لوگ اس جگہ کی زیارت کے لئے آتے ہیں اس درخت کو ''حزنوبۃ العشرہ'' کہتے ہیں۔

جب سلطان صلاح الدین ایوبی رحمہ اللہ تعالیٰ نے بیت المقدس فتح کیا تو کوہ زیتا کا پورا علاقہ ''شیخ احمد حکاری'' اور ''شیخ علی حکاری'' کے درمیان نصف نصف تقسیم کر کے وقف کر دیا، یہ واقعہ سترہ ذی الحجہ ۵۸۴ھ کا ہے، وہ زمین اب تک ان دو بزرگوں کی اولاد کے پاس ہے۔

تین مقدس مقامات کی قسمیں

اس سورت میں سب سے پہلے اس مقام کی قَسم کھائی ہے کہ جو اصحاب کہف کے انوار کا مقام ہے (والتین) یہ اولیاء اللہ کا پہلا گروہ تھا جو راہِ فنا پر گامزن ہوا۔اس کے بعد اس مقام کی قَسم کھائی جو انوارِ عیسوی کا مقام ہے (والزیتون)۔اس کے بعد اس مقام کی قَسم کھائی جو انوارِ موسوی کا مقام ہے (وطور سینین)

وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ۝

اور اُس شہر امن والے کی

مکہ کی جامعیت

اس شہر سے مراد مکہ معظمہ ہے جس کی جامعیت انتہا کو پہنچی ہوئی ہے، اس لئے کہ ہر شہر میں مختلف قسم کے لوگ ہوتے ہیں جیسے سپاہی، تاجر، اصحاب صنعت و حرفت، مالدار، فقیر، مرد، عورتیں، بادشاہ، حاکم وغیرہ، اور ہر شہر مختلف قسم کی تعمیرات و مقامات کو بھی جامع ہوتا ہے، جیسے مقدس مقامات، یعنی شہداء کے مدفن، اولیاء و انبیاء کے مقبرے، عبادت خانے اور مساجد وغیرہ، اسی طرح ہر طرح کی جڑی بوٹیاں، انواع و اقسام کے جانور، چرند پرند بھی اس میں پرورش پاتے ہیں، لیکن ایسا شہر جس میں بیت اللہ ہو ہمیشہ جس پر تجلّیات الٰہیہ کا سایہ ہو، اور ساری مخلوق کا قبلہ ہو سوائے مکہ معظمہ کے اور کوئی نہیں ہے، یہ شرف و بزرگی صرف اسی کو نصیب ہے، اسی وجہ سے اس کو کامل جامعیت حاصل ہوئی ہے، اور ان ساری صفات کے ساتھ اس کو خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی جائے پیدائش اور بعثت کا مقام ہونے کا شرف بھی حاصل ہے، لہٰذا وہ وحی محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے اسرار کا جامع ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و ولایت کا نور اس میں جگمگا رہا ہے۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و ولایت دوسری نبوتوں اور ولایتوں کے مقابلے میں بہت جامع ترین ہے۔پس اس قَسم میں پہلی قَسموں سے زیادہ ترقی ہوئی ہے (کہ اس قسم میں جو جامعیت

مدنظر ہے پہلے ذکر کردہ ہر جامعیت سے بڑھ کر ہے) یہ ایسی جامعیت ہے گویا کہ اس نے عالمِ اسفل و عالَم اعلیٰ کے تمام اسرار و بھیدوں کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے اور خالق و مخلوق کے درمیان گویا آمیختگی پیدا کردی ہے۔

مکہ شہر کی حدودِ اربعہ اور کچھ جغرافیائی احوال

مکہ شہر ہے اور اس کی لمبائی چوڑائی سے زیادہ ہے، اس کے اردگرد قلعے کی طرح پہاڑ ہیں، پہاڑوں کے باوجود اس کے تین طرف شہر پناہ کے طور پر دیوار بندی بھی کی گئی ہے جو دیوار اس کے مشرق کی طرف ہے وہ ''سور باب المعلات'' کے نام سے مشہور ہے، معلاۃ مکہ کے قبرستان کا نام ہے، اور جو دیوار شمال مغرب کی طرف مدینہ منورہ کے مقابل ہے اس کا نام ''سور الشبیکہ'' اور یمن کی جانب والی دیوار کو ''سور باب الیمن اور باب الماجن'' کہتے ہیں۔

ان دیواروں کی تعمیر ۸۱۶ھ کو شریف مکہ سیّد حسن بن عجلان کے حکم سے ہوئی تھی۔

اس کی لمبائی چوڑائی کی مقدار یہ ہے کہ باب معلاۃ سے باب ماجن تک چار ہزار چار سو بہتر (۴۴۷۲) گز ہے، اور باب معلاۃ سے باب شبیکہ تک چار ہزار چھ سو بانوے (۴۶۹۲) گز ہے، اس کے اردگرد دو پہاڑ ہیں آمنے سامنے، ایک کا نام ''ابوقبیس'' ہے دوسرا جو سرخ پتھروں کا ہے اس کا نام ''قیقعان'' ہے، ان دونوں پہاڑوں کو ''اَخشبینِ مکہ'' بھی کہتے ہیں، ''ابوقبیس'' کو اخشب شرقی، اور ''قیقعان'' کو اخشب غربی کہتے ہیں۔

مکہ میں عمارتیں بھی بہت ہیں، چشمے ہیں، کنوئیں ہیں، وقف حوض ہیں اور بہت سے حمام ہیں، چنانچہ مؤرخ ''فاکہی'' کے زمانے میں سولہ گرم حمام ہوتے تھے۔

یہ شہر دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، ایک حصہ معلات (بالائی مکہ) ہے، دوسرا مسفلہ (زیریں مکہ) دارالخیزران ہے، کوہ صفا کی طرف جو مکہ کے دائیں طرف ہے معلات (بالائی مکہ) کا علاقہ ہے، اور دارالعجلہ سے جو مکہ کے بائیں طرف ہے یہ مسفلہ (زیریں مکہ) کا علاقہ ہے۔

یہ مکرم و معظم شہر صوبہ حجاز میں واقع ہے، اور حجاز، شام، عراق اور یمن کے درمیان واقع ہے، اس صوبے میں کئی شہر ہیں، ایک تو یہی ہے، دوسرا مدینہ منورہ اور تیسرا یمامہ ہے، پھر ان تینوں شہروں کے ساتھ بہت سے اضلاع لگتے ہیں۔

مکہ کی عملداری بعض اطراف سے دس منزل کے فاصلے تک ہے خصوصاً وہ سرحد جو یمن کی طرف ہے جس کا نام ''فنکان'' ہے وہ مکہ معظمہ سے دس دن کی مسافت پر ہے، اور بعض اطراف سے اس سے کم فاصلہ ہے جیسے مدینہ منورہ کی سرحد، ''جنازہ بن صیفی'' گاؤں ہے ایک اور گاؤں ''عسفان اور مرکہ'' کے درمیان ڈیڑھ منزل پر واقع ہے، عراق کی طرف ایک گاؤں ہے جس کا نام ''عمیر'' ہے وہ بھی اتنا ہی ہے۔

حدودِ حرم کی پیمائش

مکہ معظمہ کے اردگرد حرم کی حد ہے، جہاں شکار کرنا اور درخت کاٹنا جائز نہیں، اگر اتفاقاً کسی نے درخت کاٹ لیا یا شکار کرلیا تو اس پر کفارہ آتا ہے۔

حدود حرم کی تفصیل یہ ہے کہ مسجد حرام کے مشہور دروازے ''باب بنی شیبہ'' سے لے کر عرفے کی طرف جو دو مینار حرم کی حد پر کھڑے ہیں ان تک سینتیس ہزار دو سو دس گز (۳۷۲۱۰) ہے، اور باب معلات سے اِنہی دو میناروں تک پینتیس ہزار تراسی (۳۵۰۸۳) گز ہے۔

اور عراق کی سمت حدود حرم ان دو میناروں تک جو وادیٔ نخلہ کے راستے پر بنائے گئے ہیں ستائیں ہزار ایک سو باون (۲۷۱۵۲) گز ہے، اور باب معلات سے انہی دو میناروں تک پچیس ہزار پچیس (۲۵۰۲۵) گز ہے۔

اور تنعیم کی طرف جو کہ مدینہ منورہ کی سمت واقع ہے حرم کی حد بارہ ہزار چار سو بیس (۱۲۴۲۰) گز ہے۔

یمن کی طرف باب ابراہیم کی دیوار سے لے کر حرم کی حد کی علامت تک چوبیس ہزار پانچ سو نو (۲۴۵۰۹) گز ہے، اور باب الماجن کی دیوار سے حرم کی حد کے نشان تک بائیس ہزار آٹھ سو چھہتر (۲۲۸۷۶) گز ہے۔ حساب کی رُو سے حرم کے دور کو سینتیس (۳۷) کوس لکھا گیا ہے۔ واللہ اعلم

حرم کی عجیب وغریب خصوصیات

حرم کی خصوصیات کچھ ابھی پہلے مذکور ہوئی ہیں کہ شکاری جانوروں کا نہ وہاں شکار جائز ہے اور نہ ہی سائے میں ٹھہرنے سے یا پانی پر سے ان کا ہانکنا جائز ہے وہاں کے درخت، گھاس، سبزہ وغیرہ کاٹنا بھی جائز نہیں ہے، البتہ اذخر گھاس کا کاٹنا اور دوائی کی ضرورت کے لئے ''سنا'' حاصل کرنا جائز ہے۔

حرم کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ وہاں گناہ کے ارادے پر بھی پکڑ ہوتی ہے جبکہ دوسرے مقامات میں

ایسا نہیں ہوتا، اسی طرح یہاں کی نیکی بھی دوسرے مقامات سے بدرجہا زیادہ ثواب رکھتی ہے، چنانچہ حضرت حسن بصریؒ سے منقول ہے کہ مکہ معظمہ کا ایک روزہ لاکھوں روزوں کے برابر ہے، اور ایک درہم صدقہ کرنا لاکھوں درہموں کے برابر ہے۔

حاکم نے مستدرک میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے:

"حسنات الحرم کل حسنة بمائة الف حسنة"

حرم کی ہر نیکی لاکھ نیکیوں کے برابر ہے۔

مکہ مکرمہ میں موت بہت شرف وفضیلت کی بات ہے چنانچہ حدیث میں آتا ہے:

"من مات بمکة بعثه الله فی الآمنین یوم القیٰمة" یعنی جو مکہ میں مرا قیامت کے دن امن والوں میں اُٹھایا جائے گا۔

یہ بھی حضرت ابن عمرؓ سے منقول ہے کہ: **"من مات بمکة فکانما مات فی سماء الدنیا"** کہ جو مکہ میں مرا گویا وہ آسمانِ دنیا میں مرا۔

حرم کی عجیب وغریب باتوں میں سے یہ ہے کہ اگر کوئی درندہ چیتا، بھیڑیا وغیرہ کسی جانور کے پیچھے بھاگتا ہے تو جب وہ جانور حرم کی حدود میں داخل ہو جاتا ہے تو درندہ واپس چلا جاتا ہے، حدود حرم میں اس کا پیچھا نہیں کرتا۔

بہت سے لوگوں نے حدودِ حرم کے اندر درندوں اور دوسرے جانوروں کو اکٹھے دیکھا ہے۔

اُڑتے ہوئے پرندوں کو دیکھا گیا ہے کہ جب وہ بیت اللہ کے قریب پہنچتے ہیں تو ادھر ادھر چھٹ جاتے ہیں بیت اللہ کے اوپر سے اُڑتے ہوئے نہیں گذرتے، یہ بات ہمیشہ لوگ دیکھتے ہیں۔

یہ بھی ایک خاص بات ہے کہ زمزم کا پانی شب برات کو اتنا جوش مارتا ہے کنویں کے منہ کے قریب تک آجاتا ہے۔

زمزم کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں غذائیت ہے اس کے پینے سے ایسی سیری ہوتی ہے جس طرح کھانا کھانے سے سیری ہوتی ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ یہ شہر کمال جامعیت کی وجہ سے شرف وفضیلت کے انتہائی اعلیٰ مقام تک پہنچا ہوا ہے اسی لئے قسموں کے سلسلے کو اسی شہر کی قسم پر ختم فرما کر اب اصل مقصد کو بیان فرماتے ہیں۔

لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ ۝

ہم نے بنایا آدمی خوب سے اندازے پر

انسان کا ظاہری حسن وجمال

یعنی ان چاروں چیزوں کی قَسم ہے کہ ہم نے انسان کو بہت اچھی صورت و بناوٹ میں بنایا ہے، اس لئے کہ اس کے ظاہر کو دیکھئے تو حسن و جمال کا مرقّع ہے، سیدھی قد وقامت ہے، تمام اعضاء متناسب ہیں، گردن ہی دیکھ لیجئے نہ اتنی لمبی کہ اونٹ جیسی ہو نہ اتنی چھوٹی کہ کچھوے کی سی ہو، ناک کو دیکھو نہ اتنی لمبی جیسے ہاتھی کی سونڈ ہوتی ہے نہ ہی چوپاؤں کی طرح بالکل ہی پچکی ہوئی، الغرض تمام ہی اعضاء کو غور سے دیکھو تو حسن و جمال کا اس سے بہتر نمونہ نہ ملے گا۔

اسی وجہ سے حضرت امام شافعی رحمہ اللہ کے زمانے میں ایک شخص نے اپنی بیوی سے یہ کہہ دیا تھا "إن لم تكوني أحسن من القمر فانت طالق" کہ اگر تُو چاند سے زیادہ خوبصورت نہیں ہے تو تجھے طلاق ہے، جب یہ مسئلہ علماء کے سامنے پیش ہوا تو اُنہوں نے کہا طلاق واقع ہوگئی ہے، مگر جب یہ استفتاء امام شافعیؒ کے سامنے آیا تو اُنہوں نے جواب دیا طلاق واقع نہیں ہوئی، اور وجہ یہ بیان فرمائی کہ عورت انسان ہے اور انسان کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اس کو سب سے اچھی صورت پر بنایا ہے، اگر چاند کی صورت انسان سے اچھی ہوتی تو انسان کی تعریف میں "احسن تقویم" نہ کہا جاتا۔

ما أنت ماد حها يا من يشبهها
بالشمس والبدر لا بل أنت هاجيها
من أين للشمس خال فوق وجنتها
ومضحك من نظام الدر فيها
من أين للبدر أجفان مكحلة
بالسر والفتح يجري في حواشيها

یعنی اے وہ شخص جو اس کو (محبوبہ/انسان) سورج و چاند کے ساتھ تشبیہ دیتا ہے اس کی تعریف نہیں کررہا بلکہ ہجو کررہا ہے، سورج کے لئے وہ تل کہاں ہے جو اس کے رخسار پر ہے اور ہنستے وقت اس کے

منہ میں موتیوں کی لڑی کہاں ہے، چاند کے لئے وہ سرگیں جادو بھری پلکیں کہاں ہیں۔
ظاہر ہے چاند انسان سے زیادہ خوبصورت کیسے ہوسکتا ہے کہ اس میں سوائے روشنی وچمک کے اور کیا ہے، جب کہ حسن وجمال کا یہ پیکر نقش ونگار کی نزاکتوں سے پُر ہے، چنانچہ کہا گیا ہے۔

من ماہ ندیدہ ام کلہ دار

من سَرو ندیدہ ام قبا پوش

اور اس وجہ سے بھی انسان کی صورت تمام صورتوں سے بہتر ہے کہ انسان کی ساخت ایسی ہے کہ وہ قیام، رکوع اور سجدہ ہر انداز سے عبادت کرسکتا ہے جبکہ مخلوق میں سے کوئی اور یہ سب عبادات ادا نہیں کرسکتا۔

انسان کے حسن کو اگر تفصیل سے بیان کیا جائے تو اس کے لئے دفتر چاہئیں، اس لئے خاموش رہنا اور اسی پر قلم کو روک لینا ہی بہتر ہے۔

انسان کی باطنی خوبیاں

اگر انسان کے باطن کی حقیقت پر غور کریں تو یہ نسخۂ جامع اپنے اندر چار عالم لپیٹے ہوئے ہے، عالم شہوت، عالم غضب، عالم وہم اور عالم خیال۔ پھر یہ چاروں عالم ایک حاکم غیبی جس کو عقل کہتے ہیں کے حکم کے آگے مسخر وتابعدار ہیں، اور اس حاکم غیبی کو شریعت کی نورانی مشعل عطا کی گئی ہے تاکہ اس کی روشنی میں بھلے بُرے کے درمیان تمیز کرسکے، جب ان چاروں پر اس حاکم کا حکم غالب رہتا ہے تو انسان انتہائی اعلیٰ مقامات تک پہنچ جاتا ہے۔

اور وہ بات جو ان چاروں عوالم (جمع عالم) میں سے کسی ایک سے تنہا ہونے کی صورت میں حاصل ہونے کی توقع نہیں کی جاسکتی وہ اس نسخۂ جامعہ (انسان) سے حاصل ہوجاتی ہے، جیسے معجونِ مرکب ہوتا ہے کہ مرکب ہونے کی صورت میں اس کی جو خاصیت ہوتی ہے (مجموعے کی وجہ سے) وہ اس کے مفردات سے متفرق طور پر حاصل نہیں ہوسکتی۔

اور حاکمِ غیبی (عقل) کا غلبہ غیبی مدد اور اللہ کی توفیق سے ہی حاصل ہوتا ہے اسی لئے ہر ایک کو یہ میسر نہیں ہوتا چنانچہ فرماتے ہیں:

ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ ۝

پھر پھینک دیا اُس کو نیچوں سے نیچے

یعنی یہ عجیب مخلوق جس کو ہم نے اتنا نوازا تھا جب اس کی عقل اور عقل کی رعایا شہوت، غضب اور وہم وخیال نے کارخانے کے انتظام میں کوتاہی کی تو ہم نے اس کو اتنا نیچے گرادیا کہ وہ چوپایوں کے مرتبے سے بھی گذر گیا، وہ شہوت وغصے کے جال میں اور وہم وخیال کے پھندے میں ایسا پھنسا کہ مخلوق میں سب سے زیادہ نکمّی اور ذلیل مخلوق سے بھی زیادہ ذلیل ہوگیا، اس لئے کہ دوسری مخلوقات کو تو کمالات کے حاصل کرنے کی استعداد ہی عطا نہیں کی گئی لہٰذا ان کی پکڑ بھی نہ ہوگی، مگر اس مخلوق (انسان) کو تو کمالات حاصل کرنے کی استعداد عطا کی گئی ہے اگر یہ پھر بھی محروم و بے نصیب رہے تو ہمیشہ کی پکڑ اور سدا رہنے والا عذاب اس کو دیا جائے گا۔ (العیاذ باللہ)

اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

مگر جو یقین لائے اور عمل کئے اچھے

مگر جو لوگ ایمان لائے یعنی عقل کو وہم وخیال پر غالب کیا اور نیک اعمال کئے، یعنی شہوت وغضب پر عقل کو غالب کیا اور خوب محنت وکوشش کی

فَلَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ ۝

سو اُن کے لئے ثواب ہے بے انتہا

عمل منقطع ہوجانے کے باوجود ثواب غیر منقطع ہونے کا فلسفہ

اگر چہ بیماری، بڑھاپے یا موت کی وجہ سے عمل تو ختم ہوجاتا ہے لیکن نیک عمل پر زبردست استقامت کی وجہ سے اس آدمی کی روح کو جو ایک کیفیت (اس عمل کی) حاصل ہوئی ہے وہ مسلسل ہر لحہ ترقی پر ہے، اور اسی کی ترقی کے مقابلے میں ادھر سے مسلسل عمل کے ثواب میں اضافہ کیا جارہا ہے، چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ جو مسلمان بندہ کسی اچھے عمل پر کاربند ہوتا ہے پھر جب سفر، بیماری یا بڑھاپے کی وجہ سے وہ عمل اس سے چھوٹ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ نیکیاں لکھنے والے فرشتے سے فرماتے ہیں

کہ اس کے نامۂ اعمال میں اس کے اس عمل کا ثواب جسطرح پہلے لکھا کرتے تھے اسی طرح لکھتے رہو، بلکہ بعض روایات میں تو یہاں تک آتا ہے کہ (نیک بندے) کے مرنے کے بعد اللہ تعالیٰ فرشتوں کو حکم کرتے ہیں کہ وہ اس کی قبر کے پاس تسبیح، تحمید، اور تکبیر کرتے رہیں اور ثواب اس کا اس بندے کیلئے لکھا جاتا رہے تا کہ قیامت کے دن جب وہ اُٹھے تو ان بے انتہا خزانوں سے فائدہ اُٹھا سکے۔

ثُمَّ رَدَدْنٰهُ الخ کی تفسیر میں دوسرا قول

بعض مفسرین نے اس کو بڑھاپے اور سٹھیا جانے کی حالت پر محمول کیا ہے کہ اس عمر میں پہنچ کر آدمی کی صورت بدل جاتی ہے، تمام جوڑ بند ڈھیلے پڑ جاتے ہیں، کمر جھک کر کمان بن جاتی ہے، چہرے پر جھریاں پڑ کر بدنما ہو جاتا ہے، بال برص کے داغوں کی طرح سفید ہو جاتے ہیں، دانت اکھڑ کر منہ کھنڈر بن جاتا ہے۔

لیکن یہ معنی مراد لینے سے "اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا الخ" کا استثناء اس سے مناسب نہیں ہے، ہاں البتہ استثناء منقطع مراد لیا جاسکتا ہے مگر اس میں بڑا تکلف ہے۔

دین کی حقیقت

ان آیات سے معلوم ہوا کہ دین کی حقیقت یہ ہے کہ عقل کو دوسری قوتوں شہوت، غضب، وہم اور خیال پر غالب کرنا اور عقل کو شریعت کے نور سے روشن کرنا (یعنی شریعت کی روشنی میں عقل سے کام لینا اور اس کو شریعت کے تابع رکھنا) لہٰذا دین کی تکذیب کی کوئی وجہ باقی نہیں رہی، اس لئے کہ انسان کی معنوی خوبصورتی عین دین ہے، اور معنوی خوبصورتی سب کو ہی مرغوب و مطلوب ہے، اسی لئے دین کی تکذیب کے رد میں فرماتے ہیں:

فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّيْنِ ۝

پھر تو اُس کے پیچھے کیوں جھٹلائے بدلا ملنے کو

(یا اس کے بعد کون آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قیامت کے معاملے میں جھٹلا سکتا ہے)

یعنی اے انسان دین کے متعلق ایسی واضح باتیں جو اوپر بیان ہوئیں موجود ہونے کے باوجود کس چیز نے تجھے دین کی تکذیب پر آمادہ کیا، حاصل یہ ہے کہ تعجب ہے تُو نے اپنی صورتِ معنوی کی حقیقت

معلوم کرلی اور یہ بھی جان لیا کہ صورت معنوی کا حُسن موقوف ہے اس بات پر کہ پہلے عقل کو شریعت کے نور سے روشن کیا جائے پھر عقل کو تمام باطنی قوتوں پر حاکم و غالب بنایا جائے، تو اب کوئی وجہ باقی نہیں رہتی کہ دین کی تکذیب کی جائے، اس لئے کہ جس نور سے عقل راہ پاتی ہے وہ نور دین کا ہی تو ہے، عقل کی مثال تو نظر و بینائی کی ہے اور دین کے نور کی مثال سورج کی شعاع کی ہے، اگر سورج کی شعاع نہ ہو تو بینائی کچھ کام نہیں دے سکتی (سورج کی روشنی کی مدد سے بینائی دیکھنے کے قابل ہوتی ہے، اندھیرے میں نگاہ موجود ہونے کے باوجود کوئی چیز نظر نہیں آتی لہٰذا اگر دین کا نور نہ ہو تو عقل کچھ کام نہیں دے سکتی) لہٰذا دین کا نور انسان کی صورت معنوی کے کمال کے لئے ضروری و لازمی ہے۔

جس طرح انسان کی ظاہری صورت میں اگر کچھ خلل واقع ہو جائے اور بگڑ جائے تو انسان حیوانوں کی طرح مسخ ہو جاتا ہے اور انسانیت سے نکل جاتا ہے، اسی طرح اگر اس کی معنوی صورت میں کوئی خلل پڑ جائے تو وہ مسخ معنوی میں مبتلا ہو جائے گا، اور ایسا نادان کون ہے کہ جو انسانیت سے نکل کر حیوانیت میں چلا جانا پسند کرے، اور اگر کسی کے مزاج میں ہی فساد پیدا ہو گیا ہو اور وہ حیوانی صورت کی طرف رغبت کرنے لگا ہو تو ایسے کے لئے فرماتے ہیں:

اَلَیْسَ اللّٰہُ بِاَحْکَمِ الْحٰکِمِیْنَ ٥

کیا نہیں ہے اللہ سب حاکموں سے بڑا حاکم

جیسے دوسرے حاکم اپنی رعایا کے بارے میں نہیں چاہتے کہ ایک گروہ سے نکل کر دوسرے گروہ میں مل جائیں، یا اعلیٰ مرتبے سے نیچے کی طرف آ جائیں تو حق تعالیٰ کیسے پسند کریں گے، اس لئے کہ یہ حکمت کے خلاف ہے۔

''دین'' کو جزا کے معنی میں لینا بھی درست ہے

یہ بھی احتمال ہے کہ ''فَمَا یُکَذِّبُکَ بَعْدُ بِالدِّیْنِ'' میں دین کو جزا کے معنی میں لیا جائے، اس صورت میں ان آیات کا ربط گذشتہ آیات سے یوں سمجھنا چاہئے کہ جب حق تعالیٰ کو احوال کی تبدیلی پر قدرت ہے کہ اس نے انسان کو نطفہ سے پیدا کیا اور بہترین و معتدل صورت بخشی، پھر معنوی حسن و جمال کے لئے شریعت کے نور سے منور عقل بخشی، پھر اچانک بعض کو ذلیل ترین درجے تک گرادیا، سو

ایسی ذات کے لئے کیا بعید ہے کہ قیامت کے دن مُردوں کو زندہ کردے، اور حالات میں اس طرح تبدیلی کردے کہ جو یہاں سرکش تھے ان کو وہاں ذلیل کردے اور جو یہاں ذلیل تھے ان کو وہاں سربلند کردے، (لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ جزا کی تکذیب کی جائے)

یہ جتنی بات ذکر کی گئی ہے حق تعالیٰ کی قدرت کی طرف نظر کرتے ہوئے جزا کے وقوع کے ممکن ہونے کے لئے کافی ہے، اور اگر اس کی حکمت وعدالت کے اعتبار سے دیکھیں اور یہ جان لیں کہ نیکی اور بُرائی کا بدلہ دینا اور نیکوکار و بدکار کے درمیان فرق کرنا از روئے حکمت وعدالت واجب ہے تو جزاء کا وجوب بھی ثابت ہوگیا، چنانچہ ''اَلَیْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِیْنَ'' میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے۔

اب یہ جان لیجئے کہ جزا باعتبار حق تعالیٰ کی قدرت کے ممکن ہے اور باعتبار حکمت وعدالت کے واجب ہے۔

اس سورت کے اختتام وقراءت کا ادب

حدیث میں آتا ہے جو سورۂ والتین کی قراءت میں ''اَلَیْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِیْنَ'' پر پہنچے تو اس کو یوں کہنا چاہئے ''بلیٰ وأنا علیٰ ذلک من الشاھدین''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سورت کو اکثر عشاء کی نماز میں پڑھا کرتے تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اکثر فرض نماز میں کعبہ کے سامنے یہ سورت پڑھا کرتے تھے، تاکہ حرم کی فضیلت کی طرف اشارہ ہو کہ اس سورت میں اس کی قسم کھائی گئی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

الحمدللہ اولا وآخرًا

مقدمہ سورۂ اقراء

یہ سورت مکی ہے، اس میں انیس (۱۹) آیات، بہتر (۷۲) کلمات اور ایک سو اسی (۱۸۰) حروف ہیں۔

اس سورت کو سورۂ علق بھی کہتے ہیں، اس لئے کہ اس سورت میں ذکر کیا گیا ہے کہ آدمی کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا گیا ہے، اور یہ بات دلالت کرتی ہے اس پر کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ذلیل کو عزت والا کر دیتا ہے، جس طرح خون کی یہ بوند نہایت ذلیل تھی اسکو انسان کی صورت میں بنا کر اور اس میں روح پھونک کر اس کو بہت بڑی عزت بخش دی، اسی طرح انسان بھی انتہائی محتاج و ذلیل تھا اس پر قرآن نازل کر کے وحی کے علوم عطا فرما کر عزت سے سرفراز کیا۔

سب سے پہلے کون سی سورت نازل ہوئی متعارض اقوال کے درمیان تطبیق

اکثر مفسرین کی رائے یہ ہے کہ سب سے پہلے سورۂ علق کی ابتدائی پانچ آیتیں نازل ہوئیں ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سب سے پہلے سورۂ فاتحہ نازل ہوئی، اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سب سے پہلے سورۂ مدثر نازل ہوئی، بظاہر ان تینوں اقوال میں اختلاف و تعارض ہے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے، ان اقوال میں تطبیق یہ ہے کہ نزول میں حقیقی اولیت تو انہی پانچ آیات کو حاصل ہے، پھر نماز کی تعلیم کے لئے سب سے پہلے سورۂ فاتحہ نازل ہوئی، اور وحی کے رُک جانے کے بعد سب سے پہلے سورۂ مدثر نازل ہوئی، اس کے بعد پھر مسلسل قرآن کا نزول شروع ہو گیا۔

پس جنہوں نے سورۂ مدثر کے بارے میں کہا ہے کہ وہ سب سے پہلے نازل ہوئی ہے تو گویا انہوں نے مسلسل نزول کے اعتبار سے کہا ہے کہ قرآن کا مسلسل نزول سورۂ مدثر کے بعد ہی شروع ہوا ہے، اور اس سورت (اقراء) کو گویا انہوں نے باقی قرآن کے نزول کی تمہید قرار دیا ہے، اور سورۂ فاتحہ کے نزول کو دعاء و مناجات کی تعلیم کے لئے قرار دیا ہے، احکام کی تبلیغ کی ابتداء سورۂ مدثر کے نزول سے ہوئی ہے۔

اور جنہوں نے سورۂ فاتحہ کو نزول کے اعتبار سے اوّل کہا ہے تو انہوں نے اس اعتبار سے کہا ہے کہ سب سے پہلے جس کا پڑھنا تقرب وعبادت کے طور پر کیا گیا وہ سورۂ فاتحہ ہی ہے اور سورۂ اقراء تو صرف پڑھنے کا طریقہ سکھانے اور عادت ڈالنے کے لئے نازل ہوئی تھی (یعنی اگرچہ وہ نازل پہلے ہوئی مگر اس کی غرض دوسری تھی تعبد وتقرب کی غرض سے سورۂ فاتحہ سب سے پہلے نازل ہوئی ہے)

شانِ نزول

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کی علامات وآثار میں سے سب سے پہلے جس چیز کا ظہور ہوا وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے خواب تھے، جو کچھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خواب میں دیکھتے ہو بہو عالم بیداری میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آتا، اس کے بعد خلوت وگوشہ نشینی آپ کو بہت محبوب ہوگئی، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم غارِ حرا میں تنہا جاکر اللہ کے ذکر میں مشغول رہتے، ایک ایک ہفتے تک کے لئے کھانے پینے کا سامان لے کر جاتے پھر جب وہ ختم ہوتا تو گھر تشریف لاتے اور مزید کھانا لے کر وہیں چلے جاتے، اس غار میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قیام اکثر ایک مہینے سے کم رہا، اتفاقاً کبھی مہینہ بھی ٹھہرے ہیں۔

ایک دن غار سے باہر ہاتھ منہ دھونے کے لئے آپ کھڑے تھے کہ اچانک جبرئیل علیہ السلام نے پکارا اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آپؐ نے اوپر کی طرف دیکھا مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ نظر نہ آیا، پھر دوسری اور تیسری بار بھی یہی آواز آئی تو آپؐ حیران ہوکر اِدھر اُدھر دیکھنے لگے، اچانک ایک آفتاب کی طرح چمکتا ہوا نورانی چہرہ انسانی شکل میں سر پر نور کا تاج سجائے اور سبز لباس میں آپؐ کے سامنے نمودار ہوا، اور آپؐ سے کہنے لگا پڑھیئے! بعض روایات میں آتا ہے کہ اس کے ہاتھ میں سبز ریشمی کپڑا تھا اس پر کچھ لکھا ہوا تھا وہ آپؐ کے سامنے کرتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ پڑھیئے، جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں پڑھا ہوا نہیں ہوں، اس بزرگ نے پھر کہا پڑھیئے! اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سینے سے لگا کر اس زور سے بھینچا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شدید تکلیف محسوس ہوئی اور پسینے سے شرابور ہوگئے، اسی طرح تین مرتبہ اس نے کیا اور چوتھی بار اس نے بھینچنے کے بعد کہا:

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ ○ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ○ اِقْرَأْ وَ رَبُّکَ الْاَکْرَمُ ○

الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ ۝

یہ پانچوں آیتیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذہن میں بیٹھ گئیں اور یاد ہو گئیں۔

غار حرا میں وضوء، غسل، اور نماز کی اجمالی تعلیم

بعض روایات میں آتا ہے کہ اسی موقعہ پر ان آیات کی تعلیم کے بعد جبرئیل علیہ السلام نے اپنا ایک پَر زمین پر مارا جس سے پانی نکل آیا، تب حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وضوء، غسل اور استنجاء کا طریقہ سکھایا پھر سورۂ فاتحہ سکھائی اور دو رکعت نماز بھی پڑھائی۔

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس صدمے کے خوف سے کانپتے ہوئے گھر تشریف لائے، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا مجھے کمبل اوڑھایئے، اُنہوں نے کمبل اوڑھایا، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کپکپی کی کیفیت دور ہوئی تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا کیا حال ہے، تو پورا واقعہ بیان فرمایا، اور فرمانے لگے مجھے اپنی جان پر خوف ہے، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی، کہ آپ ہرگز کوئی خوف نہ کریں اللہ آپ کو رسوا نہیں کرے گا اس لئے کہ آپ کمزوروں پر رحم کھاتے ہیں، رشتہ داروں سے حسن سلوک کرتے ہیں، مہمانوں کی ضیافت کرتے ہیں اور ہر حادثے میں لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے چچا زاد ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں جو نصرانی ہو گئے تھے اور عیسائیت کے بہت بڑے عالم تھے توریت وانجیل سے خوب واقف تھے اور عربی میں ان کا ترجمہ بھی کرتے تھے، ان سے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے کہا اپنے بھتیجے کے حالات ذرا سنیں، جب ورقہ نے پورا واقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا تو اس نے کہا یہ وہی ناموسِ اکبر ہے جو اللہ کی طرف سے پیغمبروں کے پاس وحی لے کر آیا کرتا ہے، ناموسِ اکبر اہلِ کتاب کی اصطلاح میں جبرئیل کو کہتے ہیں۔

ورقہ نے کہا یہی ناموسِ اکبر حضرت موسیٰ کے پاس بھی آیا کرتا تھا، اس لئے آپؐ خوش ہو جائیں گھبرائیں نہیں، مگر تمہاری قوم اس نعمت کی قدر نہیں کرے گی تمہیں تکلیف پہنچائے گی، یہاں تک کہ تمہیں اس شہر سے نکال دے گی، کاش! اس وقت تک میں زندہ ہوتا اور آپ کی مدد کر کے دونوں جہاں کی سعادت حاصل کرتا۔

اس واقعہ کے چند روز بعد ورقہ کا انتقال ہو گیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں اس کو سفید لباس میں دیکھا، اس کی تعبیر یہ فرمائی کہ وہ بہشتی ہے۔

چند عجیب نکات

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ابتدائے وحی کی جو صورت حال بیان ہوئی ہے اس میں چند نکات ہیں جن کو جان لینا چاہئے۔

پہلا نکتہ

بنی آدم کی فطرت یہ ہے کہ ان کی تربیت بتدریج ہوتی ہے، سو اس کا تقاضا یہ تھا کہ اگر پہلے ہی مرحلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کی وحی سے مشرف کیا جاتا تو آپ اس کا تحمل نہ فرما سکتے، اس لئے ترتیب یہ رکھی گئی کہ سب سے پہلے خواب کی حالت میں جو کہ اس عالم سے غفلت کی حالت ہے جزوی طور پر علوم کا اِلقاء شروع ہوا تا کہ رفتہ رفتہ علوم غیبیہ کی تعلیم کی عادت پڑ سکے۔

اس کے بعد چاہا کہ عالم بیداری وہشیاری میں آپ کو گھر بار بیوی بچوں سے مکمل انقطاع وبے تعلقی پیدا ہو، تا کہ آپؐ کامل طور پر عالم غیب کی طرف متوجہ ہو جائیں، تب آپؐ کے دل پر خلوت وگوشہ نشینی کی محبت ڈال دی گئی، اور آپؐ ایسی جگہ پہنچا دیئے گئے جہاں بشر کی ذات نہیں تھی تا کہ نزول وحی کے بعد کسی کے دل میں کسی انسان سے سیکھنے کا شبہ بھی نہ ہو۔

دوسرا نکتہ

پھر وحی کے نزول کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر تھرتھراہٹ طاری کر دی گئی، آپ کے دل میں وحشت وخوف ڈال دیا گیا تا کہ کسی کو اس واقعہ کے بارے میں بناوٹ کا شبہ نہ گذرے۔

تیسرا نکتہ

جبرئیل علیہ السلام سے (حکمتِ الٰہیہ نے) بھینچنے کا عمل اس لئے کرایا تا کہ جبرئیل کی تاثیر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارک میں انتہائی کمال کے درجے تک راسخ ہو جائے، اس لئے کہ کاملین کی تاثیر جس کو اہلِ طریقت توجہ کہتے ہیں اس کی چار قسمیں ہیں۔

توجہ کی اقسام

(۱) تاثیر انعکاسی

اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی آدمی خوب عطر لگا کر مجلس میں آجائے جس کی خوشبو اور مہک سے مجلس کے ہر آدمی کا دماغ معطر ہو جائے، توجہ کی قسموں میں یہ سب سے ضعیف قسم ہے اس لئے کہ اس کا اثر اسی وقت تک رہتا ہے جب تک آدمی اس کامل کی صحبت و مجلس میں رہے، اس کے بعد اس کا اثر نہیں رہتا۔

(۲) تاثیر القائی

اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی آدمی پیالے، کٹورے میں تیل اور بتی رکھ کر، ایسے شخص کے پاس آیا جس کے پاس آگ تھی اس نے بتی میں آگ سلگا دی وہ روشن ہو کر چراغ بن گیا، یہ تاثیر و توجہ پہلی قسم سے قوی ہوتی ہے کہ مجلس کے بعد بھی اس کا اثر باقی رہتا ہے لیکن اگر کوئی صدمہ و مانع آجائے تو جاتی رہتی ہے، جیسے مذکورہ چراغ روشن تو ہو گیا لیکن اچانک آندھی یا بارش آجائے تو فوراً بجھ جائے گا، تو یہ تاثیر نفس و لطائف کی تہذیب و اصلاح نہیں کر سکتی۔

(۳) تاثیر اصلاحی

تاثیر اصلاحی یہ ہے کہ مرشد اپنی روحانی طاقت سے مرید کے باطن کی اصلاح کر دے، اور لطائف جاری ہو جائیں، اس کی مثال ایسی ہے، جیسے کوئی دریا یا کنویں سے پانی لا کر ایک جگہ ذخیرہ کرے اس ذخیرہ سے ایک حوض تک جس میں فوارہ ہے پانی کی نالیاں بنائی گئی ہیں، وہ آدمی ان نالیوں کو کوڑے کرکٹ سے خوب اچھی طرح صاف کر کے، پوری قوت (پریشر) سے پانی چھوڑے کہ فوارے سے جوش و خروش کے ساتھ پانی اُبلنے لگے۔

تاثیر کی یہ قسم پہلی قسموں سے زیادہ قوی ہے کہ اس سے نفس کی اصلاح اور لطائف کی تہذیب ہو جاتی ہے لیکن اس کا فیضان خزانے کی استعداد اور نالیوں کی وسعت و صفائی کی بقدر ہوتا ہے، دریا یا کنویں کی استعداد کے بقدر نہیں ہوتا۔ لیکن باوجود اس کے اگر کبھی خزانے پر ہی کوئی آفت یا فتور واقع ہو جائے تو تاثیر کے فیضان میں نقصان واقع ہو جاتا ہے۔

(۴) تاثیر اتحادی

تاثیر اتحادی یہ ہے کہ مرشد کامل اپنی روحانی قوت سے مرید کو اپنے ضمن میں لے کر اپنی روح کو اس کی روح کے ساتھ اس طرح ملا لے کہ اپنی روح کے کمالات اس کی روح میں منتقل کر دے۔

توجہ و تاثیر کی یہ قسم سب سے قوی تر ہے اس میں پھر بار بار استفادہ کی حاجت باقی نہیں رہتی۔

ایک نان بائی کو خواجہ باقی باللہ کے توجہ دینے کی حکایت

اولیاء اللہ میں یہ تاثیر دینے کا عمل بہت کم پایا گیا ہے، چنانچہ حضرت خواجہ باقی باللہ رحمہ اللہ کا ایک واقعہ ہے ایک دن ایسے وقت میں آپ کے پاس مہمان آ گئے کہ آپ کے پاس پیش کرنے کے لئے کچھ بھی نہیں تھا، آپ کے پڑوس میں ایک نانبائی کی دکان تھی اس کو جب یہ خبر ہوئی تو وہ فوراً روٹیوں کا ایک بہت بڑا خوان بھر کر اور عمدہ سالن لئے ہوئے حاضر خدمت ہو گیا، کہ یہ مہمانوں کے لئے حاضر ہے۔

حضرت خواجہؒ اس کے اچانک اتنے اچھے برتاؤ سے بہت زیادہ خوش ہو گئے اور جوش میں آ کر فرمایا مانگ کیا مانگتا ہے، اس نے عرض کیا حضرت بس اپنے جیسا بنا لیجئے، آپ نے فرمایا اس کا تحمل نہ کر سکو گے اور کچھ مانگو، لیکن وہ یہی کہتا رہا، جب اس کا اصرار بہت ہی بڑھ گیا تو حضرت خواجہ اس کو لے کر حجرے کے اندر چلے گئے اور اس پر تاثیرِ اتحادی ڈالی، اب جو دونوں باہر نکلے تو دونوں کی شکل و صورت میں بھی فرق نہیں رہا تھا، صرف اس بات سے دونوں کے درمیان لوگ فرق کر رہے تھے کہ حضرت خواجہ صاحب ہوش و حواس میں تھے اور نانبائی بالکل مدہوش تھا، پھر چند دنوں کے بعد یہ نانبائی اسی حالتِ سُکر میں انتقال کر گیا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ جبرئیل علیہ السلام کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھینچنا تاثیرِ اتحادی کے لئے تھا، اُنہوں نے اپنی روحِ لطیف کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بدن کے مسامات سے اندر داخل کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح کے ساتھ اس طرح ملا دیا، جس طرح دودھ اور چینی ایک ہو جاتے ہیں، اس تاثیر سے ملکیت اور بشریت کے درمیان ایک عجیب حالت پیدا ہو گئی، جس کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔

چوتھا نکتہ

ورقہ بن نوفل جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نزولِ وحی کی

گواہی دی، جبرئیل کو پہچانا اور آپ کی مدد و نصرت کا وعدہ کیا تھا اس کو جلد ہی دنیا سے اُٹھا لیا گیا تا کہ کسی کو یہ گمان نہ ہو کہ پہلی اُمتوں کے جو واقعات آپ صلی اللہ علیہ وسلم بتلاتے ہیں یہ ورقہ ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سکھاتا ہے تو آپ کو اس واقعہ کے بعد اس سے ملاقات کا موقعہ ہی نہیں ملا کہ اس طرح کے کسی شبہہ کی گنجائش باقی رہتی۔

اور اس میں یہ بھی حکمت تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دین کے بارے میں اہلِ کتاب کی کوئی تائید و نصرت حاصل نہ ہو جو کچھ ہو آپ اپنی مدد آپ کریں۔

الحمدللہ تمت مقدمة سورة إقراء

تفسیر سورۂ اِقراء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝

پڑھ اپنے رب کے نام سے

یعنی اپنے رب کا کلام اسی کے نام کی مدد سے پڑھیئے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے کلام قدیم کو کوئی انسان اس کی مدد کے بغیر خود سے نہیں پڑھ سکتا۔

''رب'' کے لفظ کو خاص طور پر یہاں ذکر کرنے سے اس بات کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی جو پرورش کی ہے وہ ظاہر ہے اور ساری مخلوق میں آپ کی تربیت ممتاز مقام کی ہے، پھر اللہ تعالیٰ کے انہی ناموں میں سے جو آپ کی تربیت میں مصروف ہیں کلامِ قدیم پڑھنے میں مدد مانگیئے (اسمائے باری تعالیٰ میں سے ہر اسم مخلوق میں سے کسی نہ کسی چیز کا مربی ہے، کما مر عن الصوفیاء)

اور اگر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دل میں یہ شبہہ گذرے کہ میں کلامِ قدیم کو کیسے پڑھ سکتا ہوں کہ وہ تو کلام قدیم ہے اور ہمارا پڑھنا فعلِ حادث ہے (تو قدیم حادث کے ساتھ کیسے متصف ہو سکتا ہے) تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو چاہئے کہ اپنے ربّ کی ایک اور صفت ملاحظہ فرمائیں، چنانچہ فرمایا:

الَّذِیْ خَلَقَ ۝

جو سب کا بنانے والا

یعنی وہ رب جس نے اپنے اسماء کی صورتوں پر اشیاء کو پیدا کیا، پھر ایسے ربّ سے کیا بعید ہے کہ وہ کلامِ قدیم کو الفاظ و حروف کے قالب میں ڈھال کر پہلے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دل ودماغ میں ڈالے پھر ان کو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبان پر جاری کردے، اس لئے کہ تمام اشیاء کی پیدائش اسی طرح ہوئی ہے کہ اسماء قدیمہ کو صورِ حادثہ کی شکل میں جلوہ گر کردیا ہے۔

اور اگر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دل میں یہ شبہہ گذرے کہ کلام الٰہی جو کہ ازلی و قدیم ہے وہ نہایت ہی عظیم المرتبت عزت والا ہے اور انسان نہایت ذلیل ومحتاج مخلوق ہے، لٰہذا بات بعید معلوم ہوتی ہے کہ اتنے بلند تر کلام کو اتنے پست ترین مقام تک اتارا جائے، تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اپنے ربّ کی ایک اور صفت کو ملاحظہ کرلینا چاہئے (اس کے ملاحظہ سے یہ شبہہ جاتا رہے گا) وہ یہ ہے کہ:

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اِقْرَاْ

بنایا آدمی کو جمے ہوئے لہو سے۔ پڑھ

یعنی جس نے انسان کو پیدا کیا اور اس طرح اسکو عزت دی کہ ایسی روح سے اسکو سرفراز کیا جو اسرارِ الٰہی کی حامل ہے، ایسے اعضاء بخشے کہ ان سے اسماءِ الٰہی کا ظہور ہوتا ہے (یعنی اعضاء سے افعال کا صدور ہوتا ہے اور ہر فعل کا منشاء کوئی نہ کوئی اسمِ الٰہی ہے، واللہ اعلم) اور پھر روح وجسم کا آپس میں ایسا ربط و جوڑ پیدا کیا کہ روح کی لطافتیں اپنی جگہ پر قائم ہیں اور جسم کی کثافت بھی اپنی جگہ موجود، نہ تو روح جسم کی کثافتوں سے آلودہ ہو کر متغیر ہوئی اور نہ جسم روح کی لطافتوں سے بکھرتا ہے، اور یہ انسان کا سارا ڈھانچہ جمے ہوئے خون سے بنا ہے جو شریعت وعقل دونوں کی نظر میں نجس اور ذلیل ہے، پھر اس بات میں کیا تعجب ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پاکیزہ، ازلی اور قدیم کلام کو متخیلہ میں حادث الفاظ کے قالب میں ڈھال کر اور ترتیب دیکر آلاتِ نطق وگویائی پر جاری کردے، اور اس کے باوجود وہ کلام اپنی پاکیزگی پر قائم رہے اور اس میں کوئی تغیر پیدا نہ ہو۔

انسان کے تخلیقی مواد میں سے علقہ کی تخصیص کی وجہ

یہاں یہ جان لینا چاہئے کہ ماں کے پیٹ سے ولادت کی صورت میں انسان کی تخلیق جمے ہوئے خون سے ہونا تو ظاہر ہے، کہ جب نطفہ رحم میں ٹھہر جاتا ہے تو قوتِ جاذبہ کے ذریعہ سے جو اس کے اندر رکھ دی گئی ہے ماں کے پورے جسم سے بہت سا خون کھینچ لیتا ہے، پھر قوتِ عاقدہ کے ذریعہ جو اس میں رکھ دی گئی ہے اس خون کو منجمد کر دیتا ہے، اس کے بعد یہ جما ہوا خون رفتہ رفتہ گوشت پوست اور ہڈیوں کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

اور انسان کی پیدائش کی ایک صورت ولادت کے علاوہ دوسری بھی ہے (یعنی ماں باپ کے واسطے کے بغیر) جیسے حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش ہوئی، اس صورت میں جمے ہوئے خون سے انسان کی پیدائش کے معنی یہ ہیں کہ انسان کے اعضاء کی تخلیق (بقاء، ترقی اور تندرستی) غذاء کے اس حصے کی وجہ سے ہے جو ہضم ہونے کے بعد ان اعضاء میں تحلیل ہوتا رہتا ہے، (وہ غذاء سے پیدا شدہ جما ہوا خون ہی ہوتا ہے جس کی وجہ سے انسانی اعضاء کی تخلیق یعنی، ترقی و تندرستی جاری رہتی ہے)

غذا ہضم کے مراتب طے کرنے کے بعد جما ہوا خون بن کر اعضاء کی صورت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

بلکہ ولادت کی عادی صورت میں بھی جبکہ بچہ ماں کے پیٹ سے نکل آئے ہر انسان کی تخلیق اسی طریقے پر ہوتی ہے۔

اسی لئے انسان کے تخلیقی مواد میں سے علقہ (جما ہوا خون) کو ذکر فرمایا کہ یہ مادّہ ہر وقت اسی صورت میں درکار ہوتا ہے بخلاف مٹی اور نطفہ وغیرہ کے کہ ابتدائے پیدائش میں ان کی ضرورت ہوتی ہے مگر بقا کے لئے وہ درکار نہیں ہوتے۔

یہاں پر یہ غور کرنے کی بات ہے کہ، جما ہوا خون، یہ ایک ہی مادّہ ہے جو روح میں ڈھل کر قوائے مدرکہ ومحرکہ (سمجھنے والی اور حرکت دینے والی قوتوں) کا حامل بن جاتا ہے، یہی اعضاء کی صورت اختیار کر کے ہڈی، مغز اور گوشت پوست بھی بن جاتا ہے، پھر روح جو کہ ایک مجرّد لطیف چیز ہے اعضاء کی جنسِ کثیف سے پیدا نہیں ہوتی اس کے باوجود اعضاء کے ساتھ اس کا کیسا اتحاد ہو جاتا ہے (کہ دونوں ایک دوسرے میں حلول کئے ہوئے ہوتے ہیں)

(قدرت کی اس عجیب کاریگری کو دیکھتے ہوئے) یہیں سے ذات وصفات کے معانی (وحقائق) کا نزول انسان کے دل ودماغ پر اور آلاتِ نطق وگویائی پر سمجھ لینا چاہئے (یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ نے جمے ہوئے خون کو ہڈی گوشت کی شکل میں ڈھال دیا، اور اعضاء وروح کے درمیان اتحاد پیدا کیا جبکہ ان کی ماہیت میں تضاد ہے، اسی طرح بشریت کو ملاءِ اعلیٰ سے مناسبت عطا فرما کر انسانی قلب وزبان پر اپنا قدیم وازلی کلام جاری فرما دیا۔ واللہ اعلم)

لفظ "اِقراء" اور "قل" قرآن میں۔ ایک شبہے کا ازالہ

بعض عام لوگوں کو شبہہ ہوتا ہے "اِقراء" تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن پڑھنے کے لئے فرمایا گیا تھا، لہٰذا قرآن کے اندر اس کو کیوں لکھ دیا گیا، یہی شبہہ "قل" کے بارے میں بھی ہے جو پانچ سورتوں کے شروع میں آتا ہے، "قل اوحی" "قل یا أیھا الکافرون" "قل ھو اللہ" "قل اعوذ برب الفلق" "قل اعوذ برب الناس" چنانچہ بعض صحابہ کرامؓ بھی معوذتین سے "قل" کو چھوڑتے تھے۔

جواب اس شبہے کا یہ ہے کہ "اقراء" اور "قل" سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب اور حکم ہے، جس طرح قرآن میں دیگر اوامر ونہی کے صیغے قرآن کا حصہ ہیں اسی طرح یہ بھی قرآن کا حصہ ہے، اس کی مثال یہ ہے جیسے خط کے شروع میں یوں لکھتے ہیں "باید شناخت" (اردو میں "بعد از سلام واضح ہو کہ") یا جیسے شاہی فرمان کی ابتداء میں یوں لکھتے ہیں "بدانند" اور "بشناسند" خط اور فرمان کے شروع کے یہ الفاظ بھی اسی خط، اور فرمان کا حصہ شمار ہوتے ہیں۔

جب وہ فرمان یا خط سنایا جائے گا تو یہ الفاظ بھی ضرور پڑھے جائیں گے، اسی طرح جب قرآن بھی پڑھا جائے گا تو یہ الفاظ بھی پڑھنے ضروری ہوں گے۔

ایک شبہہ اور اس کا جواب

یہاں یہ خدشہ بھی ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو اُمّی محض تھے لکھے پڑھے نہیں تھے پھر ان سے یہ کہنا کہ پڑھیئے ایسا ہی ہے جیسے اندھے سے کہا جائے کہ دیکھو، یا اپاہج سے کہا جائے کہ چلو، تو یہ تکلیف مالا یطاق ہے اور بندے میں جس کام کی طاقت نہ ہو اس کا مکلف بنانا درست نہیں چنانچہ خود قرآن میں ہے "لا یکلف اللہ نفسا إلا وسعھا"

جواب اس خدشے کا یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم تکلیفی نہیں بلکہ تلقینی ہے، جیسے وہ بچہ جو پہلے دن مکتب میں جاتا ہے تو استاد اس سے کہتا ہے پڑھ، تو استاد کے یہ کہنے سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ جیسے میں پڑھوں ویسے میرے ساتھ ساتھ سن کر تُو بھی پڑھ، اسی طرح یہاں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو تلقین کی گئی کہ جبرئیل کا سُن کر ویسے ہی آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی پڑھیئے۔

"اِقراء" کے تکرار کی وجہ میں مختلف اقوال

(۱) جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو "اِقراء" کا لفظ سن کر تعجب ہوا کہ میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں کیسے پڑھ سکوں گا، تو تاکید کے لئے دوسری بار فرمایا "اِقراء"

(۲) بعض مفسرین نے کہا ہے کہ پہلی مرتبہ "اِقراء" سے مراد یہ ہے کہ اُمت تک پہچانے کے لئے پڑھیئے، اس لئے کہ اُمت تک پہنچانا بھی نبی کے لئے ضروری ہے۔

(۳) بعض نے کہا کہ پہلا "اِقراء" نماز میں پڑھنے کے لئے ہے اور دوسرا "اِقراء" نماز سے باہر پڑھنے کے لئے ہے۔

(۴) بعض نے کہا ہے کہ پہلے 'اِقراء' سے مراد یہ ہے کہ آپ قاری یعنی پڑھنے والے بنیئے بغیر اس کے کہ پڑھنے کے لئے کوئی چیز معیّن کریں، (یعنی مطلق قاری ہونا مراد ہے) اور دوسرا "اِقراء" "اسم ربّک" جو پہلے گذرا ہے اس سے متعلق ہے، یعنی اپنے پروردگار کا نام پڑھیئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں بار بار جو یہ خدشہ گذرتا تھا کہ میں اُمّی ہوں اور اُمّیت تحصیل علم کے لئے مانع ہے تو مجھے اللہ کی ذات وصفات کے متعلق اور احکام کے متعلق علم کیسے حاصل ہوگا تو اس خدشہ کے ازالے کے لئے مزید ارشاد فرماتے ہیں:

وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ ○

اور تیرا رب بڑا کریم ہے

یعنی تیرا رب ایسا کریم ہے کہ اس کے لئے اُمّی کو دانا کر دینا، جاہل کو عالم بنا دینا بہت آسان ہے، کیونکہ اُمّی کے لئے حصول علم سے اگر کوئی چیز مانع ہے تو یہی ہے کہ وہ اسباب علم نہیں رکھتا، سو اس طرح کے موانع تو بعض علوم کی نسبت سے سب کے لئے موجود ہوتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ بعض اسباب کے ذریعہ

سے ان علوم سے واقف کرادیتے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں:

الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝

جس نے علم سکھایا قلم سے

علوم وفنون کے وسائل میں قلم کا مقام

یعنی تمہارا پروردگار ایسا ہے جس نے انسان کو ان چیزوں کا علم قلم کے ذریعہ سکھایا، جن کا علم عقل و حواس کے ذریعہ حاصل نہیں ہوسکتا تھا، اس لئے کہ یا تو وہ ایسی معلومات ہیں جن کا زمانہ بعید اور پرانا ہے، جیسے پہلی اُمتوں کے حالات، گذشتہ انبیاء، اولیاء اور بادشاہوں کے حالات وغیرہ، یا حواس کے ذریعہ ان معلومات کے حاصل نہ ہونے کی وجہ بُعدِ مکان ہے (جگہ کی دوری) جیسے دور دراز کے ملکوں اور علاقوں کے حالات ہیں، بلکہ بادشاہوں کی تو یہ عادت ہے کہ اپنے ملازمین وغیرہ کو زبانی بالمشافہہ کچھ کہنے کی بجائے تحریری طور پر مطلع کرتے اور حکم دیتے ہیں، اور چونکہ دنیوی بادشاہت کا کارخانہ، کارخانۂ الوہیت کا ظل (اور نمونہ) ہے اس لئے اس کے ذریعہ کارخانۂ الوہیّت کو سمجھ لینا چاہئے (کہ دنیا کے کارخانۂ بادشاہت میں قلم بنیادی اہمیت کا حامل ہے)

مثلاً شاہی محل کی اسامیوں کا علم نظارت کے قلم سے ہوگا، رہائش گاہوں، باغات اور قلعوں کی تعداد کا علم (محکمہ) بیوتات کے قلم سے ہوتا ہے، ملازمین کی تعداد اور ان کے مناصب کا علم (محکمہ) بخشی گری کے قلم سے ہوتا ہے، مستحقین کے لئے اور خیر کے مصارف پر جو رقوم مختص کی گئیں ہیں ان کا علم (محکمہ) صدارت کے قلم سے ہوسکے گا، ملک کا طول وعرض جریبوں کی تعداد، بستیوں کی آبادی وویرانی، اور ملک کے کل دریاؤں اور تالابوں کی تعداد کا علم (محکمہ) تقسیم کے قلم سے ہوگا، جاگیروں اور خالصہ جات کا علم (محکمہ) وزارت کے قلم سے ہوتا ہے، قیدیوں کی تعداد اور پھر ان میں سزا یافتہ لوگوں کی نوعیت کے لحاظ سے تعداد کہ کتنے سزائے موت کے مستحق ہیں، کتنوں پر تعزیر واجب ہے، پھر سزا کی کیا نوعیت ہے ان تفصیلات کا علم کوتوالی اور قید خانہ کے قلم سے ہوتا ہے، اور ملک کے خزانوں اور کارخانوں کی تعداد کا علم میر سامان کے دفتر کا قلم بتائے گا، وعلی ھذا القیاس۔

اور چونکہ انسانوں کو اپنی اپنی استعداد کے موافق قدرت کے کارخانے پر مطلع کرنا مقصود تھا اس لئے

قلم کے ذریعہ لکھنے کا فن انسانوں کو سکھایا، پھر قدرت نے اپنے بے انتہا کارخانوں میں سے کسی ایک کارخانے کی تفصیلات ضبط وتحریر میں لانے کا شوق کسی ایک گروہ کے دل میں ڈال دیا تاکہ دوسرے لوگوں کو اس کی معلومات حاصل ہوسکیں۔

اس طرح کسی دوسرے گروہ کے دل میں کسی اور کارخانے کی تفصیلات ضبط میں لانے کا شوق ڈال دیا تاکہ ان کے قلم کے ذریعہ اس کارخانے کی معلومات دوسروں کو حاصل ہوسکیں، اس عجیب تدبیر کے ذریعہ سے ہر انسان کو یہ معلومات فراہم کی گئیں۔

جس طرح معاش کے معاملے میں ایک دوسرے کی مدد وتعاون کرنا انسانوں کی خاصیت ہے، اور یہ مدد وتعاون قلم کے ذریعہ کے بغیر ممکن نہیں ہے، اس لئے کہ بہت سے لوگ سینکڑوں برس پہلے گذرے ہیں سوائے انکے علوم پر اطلاع صرف قلم کے ذریعہ ہی ہوسکتی ہے۔ اسی طرح بعض لوگ ایک ملک میں رہتے ہیں اور دوسرے بعض کسی اور دور دراز کے ملک میں رہتے ہیں تو ان دونوں کو ایک دوسرے کی معلومات پر اطلاع کا ذریعہ صرف قلم ہی ہے، چنانچہ حضرت سلیمان علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے جنوں سے منہ سے نکلی ہوئی بات کی فضیلت کے بارے میں پوچھا تو جنوں نے کہا حضرت منہ سے نکلی ہوئی بات تو ایک ہَوا ہے جو منہ سے نکلی اور فنا ہوگئی، پھر حضرت سلیمان علیہ السلام نے پوچھا کہ اس کے باقی رکھنے کی کیا تدبیر ہے تو انہوں نے عرض کیا کہ لکھ لینا۔

پس قلم علوم کا صیاد، ہر بات کے حاصل کرنے کا ذریعہ اور بہت بڑی نعمت ہے، چنانچہ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''**لو لا القلم لما قام الدین و لا صلح العیش**'' اگر قلم نہ ہوتا نہ دین قائم رہتا نہ ہی زندگی درست ہوتی۔

اس لئے کہ دین کی کتابیں قلم سے لکھی جاتی ہیں اور حساب کی باریکیاں معلوم کرنا اور حقداروں کے حقوق قائم رکھنے کیلئے حسابات کے رجسٹر لکھنا اور دیگر علوم ومالی معاملات کا ریکارڈ قلم کی وجہ سے ہی قائم ہے۔

اگر نظر میں تھوڑی وسعت دے کر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اللہ کی بادشاہت بہت سی ولایتیں (ماتحت ریاستیں) رکھتی ہے ان ولایتوں میں سب سے چھوٹی ولایت وریاست یہ عالم شہادت ہے (یعنی یہ کائنات) اور یہ ولایت بہت سے کارخانوں پر مشتمل ہے، چنانچہ ان کارخانوں میں سے ایک کارخانہ عمارات وباغات کا ہے، اس کی تفصیلات جاننے کے لئے بہت سے علوم کی ضرورت ہے۔

(۱) علم ہیئت ہے، اس علم میں آسمانوں کی ہیئت اور ان کی ترتیب وغیرہ مذکور ہوتی ہے۔

(۲) دوسرا علم جغرافیہ ہے، اس میں زمین کی ہیئت وصورت اس کے ملکوں کے جغرافیائی حالات، دریاؤں اور پہاڑوں کا ذکر ہوتا ہے۔

(۳) تیسرا علم مسالک وممالک ہے، کہ اس میں راستوں، شہروں، دیہاتوں، پہاڑوں اور نہروں کی تفصیلات ہوتی ہیں۔

(۴) چوتھا علم ابعاد واجرام ہے، اس میں ملکوں کا زمینی وآسمانی طول وعرض بیان کیا جاتا ہے اور اس کو دلیل سے ثابت کیا جاتا ہے۔

ان کارخانوں میں سے ایک روشنی ومشعل خانے کا ہے، وہ ستاروں کی صورتوں کے علم سے معلوم کیا جاتا ہے، علم اشعہ (شعاعوں کو دریافت کرنے کا فن) بھی اسی میں آتا ہے۔

پرندوں اور حیوانات کے کارخانہ کی تفصیلات ''کتاب حیواۃ الحیوان'' میں درج ہیں (اس کے علاوہ علم الحیوان کے موضوع پر جو تصنیفات ہیں ان سے اس موضوع کی تفصیلات) معلوم کی جاسکتی ہیں۔

ادویات کے کارخانے کی تفصیلات (اس موضوع پر لکھی جانے والی کتب) مثلاً ابن بیطار کی ''مفردات'' بغدادی کی ''جامع'' اور دیگر بڑی کتب سے معلوم کرنی چاہئیں۔

انہی کارخانوں میں سے جواہرات کا کارخانہ بھی ہے اس کی تفصیلات علم المعادن والأحجار کے موضوع پر لکھی جانے والی کتب سے معلوم کی جاسکتی ہیں۔ ٹکسال اور خزانۂ عامرہ کی تفصیلات علم اجساد ومتطرفہ اور علم صنعت کے موضوع پر لکھی جانے والی کتب میں موجود ہیں۔

اور انہی کارخانوں میں سے ہر ملک کے ملازمین، صنعت کار، جاگیردار اور تاجروں کا ہے ان کی تفصیلات ہر ملک کے اس دفتر سے معلوم کی جاسکتی ہیں جو خاص اس شعبے کے لئے ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ جو کچھ اب تک ذکر کیا گیا یہ قلم کے علم کی وسعت کا ایک نمونہ ہے۔

قلم کے ذریعہ حاصل ہونے والے علوم کا فیض

قلم کے ذریعہ جو علوم حاصل ہوئے ان کا فیض دیکھو کہ روایات نقل کرنے والے (فقہی، حدیثی روایات) اور مفتیوں کا قلم معاملات اور عبادات میں احکامِ الٰہی معلوم کرنے کا ذریعہ ہے۔ علم الفرائض

کے ماہرین کے قلم سے ہر میت کے ورثاء کے حصے معلوم ہوتے ہیں، مؤرخین کا قلم گذشتہ زمانوں کا گویا عرضِ حال اور گویا حق تعالیٰ کا وقائع نامہ ہے اور تقدیر کے قلم کی طرف اگر خیال دوڑائیں اور اس کے علوم کا فیض ملاحظہ کریں جو زمین و آسمان والوں کو پہنچا ہے تو عقل خیرہ اور وہم دنگ رہ جاتا ہے۔

قلم کی افادۂ علم میں وحی کے ساتھ مشابہت

قلم کے ذریعہ سے تعلیم (وافادہ) کی صورت یہ ہے کہ سب سے پہلے معانی ذہن میں متعین ہوتے ہیں، پھر خیال میں مناسب الفاظ کا لباس پہنتے ہیں اس کے بعد قلم کی مدد سے وہ الفاظ نقوشِ خطیہ کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں، اب ہر پڑھنے والا ان سے استفادہ کر سکتا ہے۔

یہ صورت نزول قرآن اور وحی کے بالکل مشابہ ہے، اس لئے کہ وحی میں بھی سب سے پہلے کلام قدسی نے لوح محفوظ میں الفاظ کی صورت اختیار کی، پھر جبرئیل علیہ السلام کے واسطے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صفحۂ خیال میں منتقش ہوئی اس کے بعد آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبان مبارک سے ہر خاص و عام تک وہ پہنچی۔

لہٰذا اس نعمت (تعلیم بالقلم) کو وحی کے امکان کے اثبات میں لانا اسی مناسبت کی بنیاد پر ہے (اور گویا اس بات کی وضاحت فرمادی گئی) کہ جس طرح وہ علوم جن کا حصول قوتِ بشری کے ذریعہ قلم کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا قلم کے ذریعہ ان کا حصول ممکن ہوا اسی طرح علم وحی کے ذریعہ سے وہ علوم و معلومات جن کا حصول ناممکن ہوتا ہے وہ حاصل ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ○

سکھلایا آدمی کو جو وہ نہ جانتا تھا

انسان کو عطا کردہ ذرائع علم اور عقلی ادراک کے تین طریقے

انسان کی ذات میں علم حاصل کرنے کے تین اسباب ہیں:

پہلا ذریعہ حواس:۔

صحیح و تندرست ظاہری، باطنی حواس۔ ان کے ذریعہ انسان کو اپنے اندر پیدا ہونے والی بعض

کیفیات و حالتوں کا علم ہوتا ہے جیسے بھوک، پیاس، خوشی، غصہ، خوف اور امن وغیرہ اور اپنی ذات سے باہر مگر قریب کی چیزوں کا علم حاصل ہوتا ہے، جیسے رنگ، بو، مزہ، آواز، گرمی، سردی وغیرہ۔

دوسرا ذریعہ عقل:۔

علم کا دوسرا سبب عقل ہے، اسکے ذریعہ ان چیزوں کا علم حاصل ہوتا ہے جو حواس سے غائب ہوتی ہیں۔

عقلی ادراک کے طریقے:

اور عقلی ادراک (عقل کے ذریعہ کسی چیز کو پہچاننے) کے صرف تین طریقے ہیں۔

(۱) اس لئے کہ جس چیز کو معلوم کرنا منظور ہے انسان اس کو یا تو حواس کے ذریعہ معلوم کرے گا تب برہانِ لِمّی کو ترتیب دے گا۔(۱)

مثلاً اگر گھر میں دھواں معلوم کرنا چاہتا ہے تو اس نے معلوم کیا کہ آگ جل رہی ہے، اس سے اس کو دھوئیں کی موجودگی کا علم ہو گیا اس لئے کہ آگ دھوئیں کا سبب ہے اور سبب بغیر مسبب کے نہیں پایا جاتا (لہٰذا ثابت ہوا کہ دھواں بھی ہے)

(۲) یا مسبب کو معلوم کر کے اس کے ذریعے مطلوب پر حکم لگائے گا تو یہ طریقہ دلیلِ اِنّی کہلاتا ہے(۲)

مثلاً دھوئیں کو دیکھ کر آگ کو بھی معلوم کر لیا کیونکہ آگ کے بغیر دھواں نہیں ہوتا۔

(۳) تیسرا طریقہ ''لِم'' اور ''اِن'' سے مرکب ہے، یعنی ایک مسبب سے دوسرے مسبب کی طرف

---

(۱) دلیلِ لمی کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی حکم کو اس کی علتِ واقعہ سے ثابت کرنا۔

(۲) دلیلِ اِنّی کا حاصل یہ ہے کہ کسی حکم کو اس کی علامت سے ثابت کرنا، مثلاً آگ علت ہے دھویں کی اور دھواں آگ کی علامت ہے۔

اگر تم نے آگ بھٹی میں جلتی دیکھی جس کا دھواں نل کے ذریعہ سے نکل رہا ہے اور تم نے اس دھویں کو نہیں دیکھا اور یوں کہا کہ آگ موجود ہے اور جب آگ موجود ہوگی دھواں موجود ہوگا پس یہاں بھی دھواں موجود ہے یہ دلیلِ لمی ہے، اگر تم نے نل کے سرے سے دھواں نکلتا ہوا دیکھا اور آگ نہیں دیکھی اور یوں کہا دھواں موجود ہے اور جب دھواں موجود ہوگا تو آگ بھی موجود ہوگی، پس یہاں بھی آگ موجود ہے، یہ دلیل اِنّی ہے۔۱۲ حاشیہ تیسیر المنطق از حضرت تھانویؒ ص ۴۱، ۴۲

ذہنی طور پر آدمی منتقل ہوگا، اس برہان کو لِم اور اِنْ دونوں سے مرکب کر کے درست کرے گا، کیونکہ مسبب کا وجود سبب کے بغیر محال ہے، اور سبب (ایسا ہے کہ اس) کا وجود دوسرے مسبب کا (بھی) باعث ہے، مثلاً ایک جگہ دھواں دیکھا، اس کو دیکھتے ہی جان لیا کہ آگ بھی ہے اس کے ساتھ آگ کی گرمی کی طرف بھی ذہن منتقل ہوگیا، تو دھواں دیکھ کر اس جگہ آگ کی گرمی کا بھی علم ہوگیا، کہ یقیناً وہ جگہ گرم ہوگی اس لئے کہ دھواں آگ کے بغیر نہیں ہوتا اور جہاں آگ ہوتی ہے وہ جگہ ضرور گرم ہوتی ہے (اس طرح دھواں دیکھ کر دور سے ہی عقل نے آگ اور گرمی کا پتہ لگا لیا)

(لیکن انسان کو جو علم کے یہ دو سبب یعنی حواس اور عقل دیئے گئے ہیں) ان دونوں اسباب میں ایک نقص وقصور ہے وہ یہ کہ ہر شخص کے حواس ایسے نہیں ہوتے، کہ پتہ لگانے میں مطلوب تک رسائی حاصل کرلیں، اسی طرح لوگوں کی عقل بھی ایک جیسی نہیں اس میں بھی تفاوت ہوتا ہے، پھر ان سب باتوں کے ساتھ بڑی مشکل یہ ہے کہ کتنی ہی چیزیں ہیں جن کے اسباب، یا مسببات خود عقل سے مخفی اور پوشیدہ ہوتے ہیں تو ایسی چیزوں کا علم عقل کے ذریعہ ناممکن ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کو علم کا ایک اور ذریعہ بھی عطا فرمایا۔

علم کا تیسرا ذریعہ

اور وہ ہے ''سچی خبر'' جو آدمی کے اپنے بنی نوع کی دیکھی اور معلوم کی ہوئی ہے ان سے سن کر یقین کرے اور اپنے مقاصد کے معلوم کرنے میں اس کو اختیار کرے۔

لیکن خبر دینے والا بھی اسی کا بنی نوع ہے یعنی انسان ہے وہ بھی حواس وعقل کے دام میں گرفتار ہے تو جو چیزیں حواس وعقل سے بالاتر ہیں ان کی خبر یہ کیسے دے سکتا ہے، اس لئے اُن معلومات کے فراہم کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک چوتھا ذریعہ علم کا عطا فرمایا۔

علم کا چوتھا ذریعہ

اور وہ ہے وحیِ الٰہی، وہ معلومات جو عقل وحواس سے بالاتر ہیں ان کی تعلیم وحی کے ذریعہ کی گئی اور وحی بہت اعلیٰ مراتب والے فرشتوں کے ذریعہ انسانوں تک پہنچائی گئی ہے۔

اور ''الہام'' ''کشف'' ہاتفِ غیبی کی خبر، وغیرہ ذرائع علم جو انبیاء کرام کی اتباع کی بدولت اولیاء

کرام اور عارفینِ عظام کو حاصل ہوتے ہیں وہ سب وحی کے توابع ہیں (اس لئے ان کو مستقل ذریعہ علم شمار نہیں کیا گیا، دوسری بات یہ بھی ہے یہ علم یقینی کا فائدہ نہیں دیتے، ظن کا فائدہ دیتے ہیں)

"مَالَمْ يَعْلَمْ" کے زائد ہونے کے شبہے کا ازالہ

ہم نے "مَالَمْ يَعْلَمْ" کے یہ معنی کئے ہیں کہ وہ باتیں جن کو معلوم کرنا قوتِ بشری میں ممکن نہیں تھا، اس سے یہ شبہہ زائل ہو گیا کہ "مَالَمْ يَعْلَمْ" زائد ہے، اس لئے کہ تعلیم اسی چیز کی ہوتی ہے جو معلوم نہ ہو لہٰذا "مَالَمْ يَعْلَمْ" کہنے کی کیا ضرورت تھی؟

"كَلَّا" کا لغوی معنی اور اس مقام کے ساتھ اس کی مناسبت

لغت میں "كَلَّا" کا لفظ زجر و توبیخ کے معنی میں آتا ہے، یعنی ڈانٹنے جھڑکنے اور اظہار خفگی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، اور یہ لفظ ذکر کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ کوئی ایسی بات ذکر کی گئی ہو جس پر جھڑکا جائے اور ڈانٹا جائے مگر یہاں اس سے پہلے بظاہر ایسا کلام ذکر نہیں کیا گیا، اسی لئے بعض علماء نے کہا ہے کہ یہاں "كَلَّا" "حقًا" کے معنی میں ہے، اس لئے کہ زجر کے معنی لینے کی صورت میں بھی حاصل یہ ہوتا ہے کہ جس بات پر زجر کی گئی، اسکے خلاف کو "كَلَّا" کے ذریعہ پوری تاکید و تقریر کے ساتھ ثابت کیا جاتا ہے۔

حاصل یہ ہوا کہ اس لفظ کا مفہوم دو باتوں پر مشتمل ہے ایک سابقہ مضمون کا ابطال دوسرے تحقیق بالحق، (یعنی حق بات کا اثبات) اور اگر تجرید ("كَلَّا" کو زجر کے معنی سے خالی کرنے) کی وجہ سے صرف تحقیق کے معنی میں استعمال کریں تو یہ بھی درست ہے۔

لیکن حق بات یہ ہے کہ یہاں بھی اس سے پہلے ایک پوشیدہ کلام ہے جس کی طرف ہر شخص کا ذہن نہیں جاتا "كَلَّا" کے ذریعے اسی کلام کا ابطال مقصود ہے، اور اسی پر ڈانٹا جارہا ہے۔

اس ابہام کی وضاحت یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنی اکرمیت بندوں کی نسبت سے بیان فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ اس کا بے انتہا کرم بندوں کی ہر طرح کی تکمیل و تربیت کی طرف متوجہ ہے، یہاں تک کہ ان چیزوں کی تعلیم قلم کے ذریعہ عطا فرمائی جن کا علم حاصل کرنا ان کی قدرت سے باہر تھا، اس تدبیر سے ان کو کارخانہائے الوہیت سے آگاہ کیا تا کہ خلافتِ کبریٰ کے طور پر (اللہ تعالیٰ کا نائب ہونے کی

حیثیت سے) انسان افعالِ ربوبیت کی اقتداء کرتے ہوئے مخلوقات میں تصرف کرے، اور اس طرح انسان کے تصرفات کا تصرف الٰہی کا ظِل ہونا ثابت ہو جائے۔

اب یہ ایسا مقام ہے کہ سننے والے کے دل میں یہ شبہہ پیدا ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ جب انسان اللہ تعالیٰ کے نزدیک اتنا مکرّم و عزیز ہے تو پھر اس کو اتنی احتیاجوں کے جال میں کیوں اُلجھا کر رکھا ہوا ہے؟ ہر مخلوق کی طرف اسے محتاج کر رکھا ہے، دوسری کوئی مخلوق اتنی محتاج نہیں بنا رکھی، چنانچہ اپنے کھانے میں یہ آگ، چکّی اور دیگر آلات و اسباب کا محتاج ہے، بیماری میں دواؤں، حکیموں، ڈاکٹروں، دواء سازوں اور بہت سی چیزوں کا محتاج ہے، اپنے لباس و پوشاک، گھربار، اور چلنے پھرنے میں اس کی جو احتیاجیں ہیں ظاہر ہیں۔ دوسرے حیوانوں کو ان چیزوں میں سے کسی کی بھی احتیاج نہیں ہوتی، عزت و فضیلت کا تقاضا تو یہ ہے کہ ایسی کوئی احتیاج اس کو نہ ہو، اگر اس کو عزت و بڑائی سے سرفراز کرنا ہی تھا تو پھر ضروری تھا کہ ایسی احتیاجوں سے اسے دور رکھتے اور مقرب فرشتوں کی طرح اسے کسی چیز کا محتاج نہ بناتے۔

اور اگر خلافت کے اسباب کے حصول اور مخلوق میں تصرف کرنے کے لئے اس کو ان چیزوں کی احتیاج دینا ضروری تھا تو پھر یہ بھی ضروری تھا کہ اس کو بہت سامال اور خزانے دیئے جاتے تاکہ اس کے لئے وہ محتاج نہ ہوتا اور ہر ایک کے سامنے ذلیل نہ ہوتا۔

سو، اس شبہے اور اعتراض کو ردّ کرنے کے لئے "کَلَّا" لائے ہیں۔

قرآن میں لفظ "کَلَّا" کی دو خصوصیات

قرآن میں اس لفظ کی دو خصوصیتیں ہیں، ایک یہ ہے کہ جس آیت میں یہ لفظ آیا ہو اس کے بارے میں یقین کر لینا چاہئے کہ وہ مکی ہے، مدنی آیات میں یہ لفظ نازل نہیں ہوا، راز اس میں یہ ہے کہ یہ لفظ غضب و غصے پر دلالت کرتا ہے، اور اہلِ مدینہ (اکثر) اہلِ ایمان تھے ان کا اعتقاد صحیح تھا اگر غلطی سے کبھی کوئی گناہ ہو بھی جاتا تو وہ فوراً توبہ کر کے اس کا تدارک کر لیتے تھے، نصیحت کی بات کو بہت نرم دلی سے قبول کر لیتے تھے ان میں غضب و غصہ، اور بغض و کینہ نہیں تھا، ان کے مقابلے میں مکے والوں میں اکثریت کافر، جھگڑالو، دشمن اور نافرمان تھے، لہٰذا ان کے ساتھ کلام کرتے ہوئے غضب و غصہ ہی مناسب رہا۔

دوسری خصوصیت اس کی یہ ہے کہ یہ لفظ قرآن کے نصفِ اوّل میں نہیں ہے، صرف دوسرے نصف میں ہے، اور خاص طور پر آخری پانچ پاروں میں یہ لفظ کثرت سے استعمال ہوا ہے۔ اس ترتیب میں بھی راز یہ ہے کہ پہلے نرمی سے سمجھانا مقصود ہے، جب کوئی آدھا قرآن پڑھ چکا، اور اس کے باوجود سیدھے طریقے کی طرف نہیں آرہا تو وہ اسی لائق ہے کہ اسے جھڑکا اور ڈانٹا جائے، اور پھر خاص طور پر وہ آدمی جو پورا قرآن پڑھ کر بھی قرآن کی نصیحتوں سے فائدہ نہیں اُٹھا رہا تو وہ زیادہ ہی ڈانٹنے کا مستحق ہے، چنانچہ اسی وجہ سے آخری پانچ پاروں میں یہ لفظ زیادہ آیا ہے۔

عام دستور بھی تعلیم وتربیت کا یہی ہے کہ بری باتوں اور ناشائستہ حرکتوں سے روکنے کے لئے پہلے نرمی سے نصیحت کی جاتی ہے اگر پھر بھی باز نہ آئے تو سزا دی جاتی ہے۔

مفسرین نے ان دونوں خصوصیتوں کو ایک شعر میں بیان کیا ہے۔

وما نزلت کلا بیثرب فاعلمن

ولا جاء فی القرآن فی نصفه الأعلیٰ

آمدم برسرِ مطلب

جب یہ تمہید مکمل ہوئی تو اب اس آیت کی تفسیر شروع کی جاتی ہے، فرمایا:

كَلَّآ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَيَطۡغٰٓى ○

کوئی نہیں آدمی سر چڑھتا ہے اس سے

یعنی ہرگز ایسا نہیں جیسا تم سمجھ رہے ہو کہ انسان کا فقر واحتیاج اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم میں قصور کی وجہ سے ہے، ہرگز نہیں، اس کی محتاجی وفقر کا دوسرا سبب ہے، وہ یہ کہ یہ اللہ کی نافرمانی اور بندوں پر سرکشی کرتا ہے۔

اَنۡ رَّاٰهُ اسۡتَغۡنٰى ○

کہ دیکھے اپنے آپ کو بے پروا

جب وہ اپنے آپ کو مال وجاہ، صحت وقوت اور دوسرے اسباب کی وجہ سے بے نیاز وبے پرواہ پاتا ہے تو سرکشی پر اتر آتا ہے، اگر وہ اس طرح تمام چیزوں کا محتاج نہ ہو تو اس کی سرکشی ونافرمانی حد سے

بڑھ جائے اور اصلاح کی کوئی صورت نہ رہے، یہ تو اس کریم کا بہت ہی فضل و کرم ہے کہ اس نے انسان کو ہر طرح کی احتیاج میں گرفتار کر کے سرکشی و نافرمانی سے روک رکھا ہے، چنانچہ حق تعالیٰ ایک دوسرے مقام پر خود فرماتے ہیں:

"ولو بسط الله الرزق لعباده لبغوا فی الارض" "اگر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر رزق کشادہ کر دیتا تو ظلم کرتے، حد سے بڑھتے ہوئے زمین میں فساد مچا دیتے"

سو انسان کا ایسا خیال کہ وہ بے نیاز و بے پرواہ ہے سراسر غلط ہے اس لئے کہ انسان کسی حال میں بھی اللہ سے بے نیاز نہیں ہو سکتا بلکہ اس کو تو ہر حال میں اللہ کی طرف ہی رجوع کرنا ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

اِنَّ اِلٰی رَبِّکَ الرُّجۡعٰی ٥

بیشک تیرے رب کی طرف پھر جانا ہے

انسان کی ہر حال میں اللہ کی طرف احتیاج و رجوع کی تمثیلی وضاحت

اس بات کو ہم ایک مثال سے واضح کرتے ہیں تا کہ کوئی پوشیدگی نہ رہے، جیسے ایک آدمی ہے اس کو پسندیدہ اور مرغوب کھانا ملا، اس نے یہ سمجھا کہ آج میں بھوک کی فکر سے بے نیاز و بے پرواہ ہو گیا ہوں، اب اس سے پوچھا جائے کہ تجھے کھانا کھانے، اس کو چبانے کی قوت کون دے گا، پھر کھانے کے بعد الٹی اور قے ہو جانے سے کون روکے گا، پھر ہضم کی قوت دے کر اصل غذاء کو تمام اعضاء میں خون کی صورت میں تقسیم کون کرے گا، اور اس کے فضلات کو پیشاب و پاخانے کے راستے سے کون نکالے گا، پھر اس بات سے حفاظت کون کرے گا کہ غذاء بدن میں زہر نہ بن جائے، یا بدہضمی وغیرہ سے بدن میں کوئی خرابی پیدا نہ ہو جائے۔

یہ سب وہ باتیں ہیں کہ باوجود نعمت اور غنیٰ حاصل ہونے کے آدمی ان کی طرف محتاج ہے، (لہٰذا ہر نعمت کے وقت انسان دیگر بے شمار احتیاجوں میں گھرا رہتا ہے) پھر جب روح جسم سے الگ ہو جائے گی تو اس کے بعد آخرت میں ایک اور رجوع و احتیاج (اللہ کی طرف) ہوگی تب اس سرکشی و نافرمانی کے متعلق باز پرس ہوگی اور انتقام لیا جائے گا، اس وقت کی محتاجی ایسی ہے کہ جس کی کوئی انتہاء نہیں ہے۔

مالدار زیادہ محتاج ہیں

بلکہ عقل والے لوگ انصاف سے اگر اچھی طرح غور کریں تو ان کو معلوم ہوگا کہ مالدار لوگ مالداری کی حالت میں اللہ تعالیٰ کے زیادہ محتاج ہیں، اس لئے کہ فقیر و مفلس کی اتنی سی تمنا ہوتی ہے کہ جان سلامت رہے، صحت رہے اور دو وقت کا کھانا مل جائے اور بس، جبکہ مالدار کو اپنی جان وصحت کی سلامتی کے علاوہ مال اپنے مرتبے اور عزت اور اہل وعیال کی سلامتی کی بھی فکر رہتی ہے۔

کیا ہر حال میں مال سرکشی کا سبب ہے

یہاں اکثر لوگوں کو ایک شبہہ ہوتا ہے کہ اگر مال سرکشی و نافرمانی کا سبب ہوتا تو بڑے بڑے صحابہ کرام بھی مالدار تھے، جیسے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ تھے، وہ سرکشی میں مبتلاء کیوں نہ ہوئے۔ بلکہ حضرت سلیمان علیہ وعلیٰ نبینا الصلوٰۃ والسلام پر دنیا کی ایسی وسعت فرمائی گئی تھی کہ بیت المقدس کے در و دیوار کو سونے اور جواہرات سے جڑاؤ کروایا تھا۔

اس شبہے کا حل یہ ہے کہ اس آیت میں مال کو سرکشی کا سبب بالکل قرار نہیں دیا گیا، مال سرکشی کا سبب نہیں ہے بلکہ سرکشی و نافرمانی کا سبب یہ ہے کہ آدمی مال کی وجہ سے اپنے آپ کو بے پرواہ، مستغنی و بے نیاز سمجھنے لگتا ہے، ہر لحہ اللہ کے سامنے اس کی جو احتیاج ہے وہ اس سے غافل ہو جاتا ہے، مال ہاتھ آنے کو اللہ کا فضل و کرم جاننے کی بجائے اپنی محنت، کوشش اور صلاحیت کا نتیجہ سمجھتا ہے (تو سرکشی کا سبب انسان کا یہ طرز عمل و طرز فکر ہے نہ کہ مال)، حضرت سلیمان علیہ السلام اور کبار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مالدار تھے لیکن وہ اس برے طرزِ فکر اور اعتقاد سے پاک تھے، ان کے حالات کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ جتنی انہوں نے غریبوں اور مسکینوں کی خدمت اور خبر گیری کی اور خیر کے مصارف میں جتنا انہوں نے خرچ کیا ایسا کسی نے نہیں کیا، وہ کثرت مال کو زہر سمجھتے تھے اور اللہ کے راستے میں خرچ کرنا اس کا تریاق جانتے تھے اسی لئے خرچ کرنے میں بہت کوشش کرتے تھے، چنانچہ حدیث میں ہے:

"نعم المال الصالح للرجل الصالح"

یعنی اچھا مال نیک آدمی کے لئے بہت اچھا ہے، کہ وہ نیک کام میں خرچ کرتا ہے۔

جب یہ ثابت کیا کہ انسان کو بہت زیادہ محتاج رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ بے احتیاجی کی صورت میں

سرکشی و نافرمانی کرتا ہے، اپنے منعم حقیقی سے غافل ہو کر نعمتوں میں ہی مستغرق رہتا ہے، تو اس جگہ اس بات کا گمان تھا کہ کوئی پوچھ لے کہ مثال کے طور پر ایسے کسی بے پرواہ ہو جانے والے کا حال بیان کیا جائے کہ مال و دولت کے بل بوتے پر استغنا و بے پرواہی کی وجہ سے اس کی سرکشی کس نوعیت کی تھی، چنانچہ اس کی مثال بیان فرماتے ہیں:

اَرَءَيْتَ الَّذِىْ يَنْهٰى ○ عَبْدًا اِذَا صَلّٰى ○

تو نے دیکھا اُس کو جو منع کرتا ہے، ایک بندہ کو جب وہ نماز پڑھے

بندہ تو وہ ہے جو اپنے رب کی دل سے، زبان سے، ہاتھ اور پاؤں سے عبادت کرے، اور ایسی عبادت جو ان سب باتوں کو جامع ہو وہ صرف نماز ہے، اور خدا تعالیٰ کا حق یہ ہے کہ ہر عبادت کا معبود وہی ہے، (یعنی ہر عبادت اسی کی کی جانی چاہئے) لہٰذا جس نے نماز سے منع کیا اس نے بندے کا حق بھی تلف کیا اور اللہ کا حق بھی تلف کیا، تو اس کی نافرمانی و سرکشی اللہ تعالیٰ سے اور بندوں پر بھی ثابت ہوئی۔

اس آیت کا مصداقِ اوّل

یہ آدمی جس کی بُرائی اس آیت میں بیان کی گئی ہے یہ ابوجہل تھا، جس نے کئی بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مسجد حرام میں نماز پڑھنے سے منع کیا تھا، بلکہ اس نے کہا تھا کہ اگر میں نے کبھی دیکھا کہ تم نے اپنی پیشانی ٹکائی ہوئی ہے تو گردن جُدا کر دوں گا۔

اگرچہ یہ آیت اس لعین کے بارے میں نازل ہوئی تھی لیکن جو بھی اللہ کی عبادت سے روکے گا وہ اس وعید میں داخل ہے۔

کسی شرعی وجہ سے عبادت سے منع کرنا اور نماز کے مکروہ اوقات

(کسی شرعی وجہ سے عبادت سے منع کرنا اس وعید میں داخل نہیں جیسے) فقہاء نے مسئلہ لکھا ہے غصب کی زمین پر نماز نہ پڑھی جائے، اور مکروہ اوقات میں بھی نماز پڑھنے سے منع کیا گیا ہے۔

مکروہ اوقات پانچ ہیں:

(۱) سورج نکلنے کا وقت۔

(۲) سورج غروب ہونے کا وقت۔

(۳) استوائے شمس کا وقت۔

(۴) عصر کی نماز کے بعد سے مغرب تک (نوافل کے لئے)۔

(۵) طلوع فجر سے سورج نکلنے تک فجر کی سنتوں کے علاوہ نوافل مکروہ ہیں۔

اسی طرح غلام و باندی کو تہجد کی نماز سے اس لئے روکنا کہ رات جاگنے کی وجہ سے دن کو خدمت نہیں کر سکیں گے، جائز ہے۔ اسی طرح خاوند کا بیوی کو نفل نماز اور اعتکاف سے منع کرنا بھی جائز ہے کہ خاوند کے بہت سے حقوق و منافع فوت ہو سکتے ہیں، مذکورہ تمام صورتوں میں نماز وغیرہ سے منع کرنا شریعت کے حکم کے مطابق ہے لہٰذا حقیقت میں منع کرنا نہ ہوا بلکہ ایک عبادت سے ہٹا کر دوسری عبادت کی طرف لگانا ہوا۔

اسلاف اور دین کا ادب

بعض اکابر اسلاف نے ادب کی رعایت کرتے ہوئے منع کرنے کی شرعی گنجائش ہونے کے باوجود بعض ایسے مواقع پر نماز سے منع کرنے سے احتیاط فرمائی ہے، چنانچہ روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نماز عید کے لئے عید گاہ تشریف لے گئے، دیکھا کہ کچھ لوگ نماز عید سے پہلے نوافل پڑھ رہے ہیں، آپ نے فرمایا ان لوگوں سے کہہ دو کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عید گاہ میں نماز عید سے پہلے نفل پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا، مگر ان لوگوں نے نفل جاری رکھے، لوگوں نے آپ سے کہا کہ اگر حکم ہو تو زبردستی ان کو روک دیتے ہیں، اگر نہ مانیں تو سزا دیں گے، اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں اس آیت کے مضمون سے ڈرتا ہوں "اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يَنْهٰى ۝ عَبْدًا اِذَا صَلّٰى ۝" اس لئے میں ایسا سخت حکم نہیں دے سکتا۔

لیکن ادب کی رعایت کرنا وہاں مناسب ہے جہاں صریح ممانعت نہ آئی ہو، جیسے یہ موقع تھا کہ صریح ممانعت نہیں آئی تھی اس لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سختی نہیں فرمائی، ورنہ "الأمر فوق الأدب" کے مطابق ادب کے مقابلے میں حکم کو ترجیح ہے، اور جب تک بس میں ہو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر واجب ہے۔

جب انسانوں کی سرکشی جو استغنا و بے پروائی کے سبب سے ہوتی ہے کی مثال بیان فرما چکے تو اب اس بیماری کے علاج کے طور پر ارشاد فرماتے ہیں:

اَرَءَیْتَ اِنْ كَانَ عَلَى الْهُدٰى ۝

اَوْ اَمَرَ بِالتَّقْوٰى ۝

بھلا دیکھ تو اگر ہوتا نیک راہ پر، یا سکھلاتا ڈر کے کام

یعنی اگر اپنی سرکشی کا علاج کرتا اور روحانی صحت مندی حاصل کر لیتا تو اس مرتبے سے مزید ترقی کرتا ہوا تکمیل وارشاد کے مرتبے تک پہنچ جاتا تب بجائے اس کے کہ نماز سے منع کرتا لوگوں کو تقویٰ و پرہیز گاری کا حکم کرتا اور ان کی اصلاح کرتا۔

اَرَءَیْتَ اِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ۝

بھلا دیکھ تو اگر جھٹلایا اور منہ موڑا

یعنی کیا تو نے اس سرکش کو دیکھا ہے کہ اگر اس نے پیغمبر کے دین کو جھٹلایا ہے اور منہ موڑا ہے سیدھی و سچی راہ سے تو ان دونوں حالتوں میں وہ اپنے کئے کا بدلہ پائے گا لیکن پہلی حالت (جبکہ ہدایت اختیار کر لیتا اور تقویٰ کا حکم کرتا) میں اچھا بدلہ پائے گا اور دوسری حالت میں بُری جزاء پائے گا، اور جزاء کا لحاظ رکھنا بھی سرکشی وطغیان کا علاج ہے۔

اگر کسی کو جزاء کے واقع ہونے میں کچھ شک وشبہ ہو تو اس کو سمجھانے کیلئے اس قدر بتا دینا کافی ہے کہ:

اَلَمْ یَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ یَرٰى ۝

یہ نہ جانا کہ اللہ دیکھتا ہے

ایسی ذات کا دیکھنا جو بدلہ دینے پر قادر ہے اور اس کی حکمت کائنات کے ذرے ذرے میں اظہر من الشمس ہے جزاء کے اعتقاد کے لئے کافی ہے، اس لئے کہ (جب اس کی قدرت بھی معلوم اور اس کی حکمت بھی ظاہر ہے تو) قدرت کا تقاضا یہ ہے کہ جزاء دینا جائز (وممکن) ہے اور حکمت وعدالت کا تقاضا یہ ہے کہ جزاء دینا واجب ہے، اور خیر وشر میں سے ہر عمل کو اس کا دیکھنا محسن ومسی (نیک اور بُرے) کے درمیان فرق وامتیاز کرنے کے لئے کافی ہے، اور جو کوئی دیکھنے اور جاننے کے باوجود اچھے بُرے عمل کے درمیان فرق نہ کر سکے اور باوجود قدرت کے ہر ایک کو اس کے کئے کے مطابق بدلہ نہ دے سکے تو وہ

اس قابل بھی نہیں کہ ایک گھر کی سربراہی اس کو دی جائے خدائی تو دور کی بات ہے۔

اس مالک الملک کی قدرت وحکمت تو ہر کس وناکس پر ظاہر ہے البتہ خِفا اس بات میں ہو جاتا ہے کہ اس کو بنی آدم کے ہر عمل کی خبر ہے اس لئے کہ انسان کی بصیرت کی آنکھ پر شہوت، غضب اور جہل مرکب کے پردے حائل ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے انسان اس بات سے غافل ہو جاتا ہے کہ وہ اس کے ہر اچھے اور بُرے عمل سے بخوبی آگاہ ہے، اس لئے ضرورت ہوئی کہ انسان کو اسی بات کی اطلاع دی جائے، چنانچہ اسی پر اکتفاء کی گئی۔ (یعنی یہ فرمایا کہ الم یعلم الخ)

كَلَّا لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ ۵ لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ ۝

کوئی نہیں اگر باز نہ آئے گا ہم گھسیٹیں گے چوٹی پکڑ کر

ہرگز ایسا نہیں کہ اس سرکش کو یوں ہی بیکار چھوڑ دیا جائے گا، اور اس کی دنیوی عزت کے لحاظ سے اس کی نافرمانی وسرکشی کے بارے میں پوچھ نہ ہوگی، بلکہ اگر وہ ان دھمکیوں سے اور سرکشی سے باز نہ آیا تو اس کو چوٹی سے پکڑ کر گھسیٹیں گے، پیشانی انسانی جسم میں سب سے زیادہ عزت والا عضو ہے، پیشانی وسر کی تعظیم ہونے کی وجہ سے ہی بادشاہوں اور امراء کے سروں کی قسمیں کھانے کا رواج ہے، تو پیشانی کے گھسیٹے جانے میں انتہائی ذلت وحقارت ہے، اور پیشانی کو خاص طور پر ذکر کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے نافرمانی وسرکشی کا مرکز یہی عضو ہے اس لئے کہ غرور وتکبر کی جو جڑ ہے وہم وخیال اور حواس خمسہ وہ سب اس کے اندر یا اس کے قریب واقع ہیں۔ خود یہ لفظ ''سرکشی'' اس عضو کی شرارت پر دلالت کرتا ہے، اس لئے اس جرم (تکبر وسرکشی) کی سزا اس عضو پر جاری کرنا ہی مناسب ہوا، جیسے چوری کا جرم ہاتھ سے سرزد ہوتا ہے اس لئے سزا کے طور پر ہاتھ ہی کاٹا جاتا ہے۔

نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ۝

کیسی چوٹی جھوٹی گنہگار

یعنی سرکشی کی حالت میں اس پیشانی کے ذریعہ اور ان قوتوں کے ذریعہ سے جو اس پیشانی (سر) کے اندر رکھی گئیں ہیں، شیخیاں بگھارتا پھرتا تھا اور گناہ کے کام بڑی بے پرواہی سے کرتا تھا، چنانچہ کبھی غریبوں اور مسکینوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا، کبھی اپنی مرضی کے خلاف کوئی بات ہو جاتی تو پیشانی پر

شکن ڈال کر ترش روئی ظاہر کرتا، اور کبھی تمسخر وحقارت کے ساتھ گردن جھٹک دیتا تھا، تو یہ پیشانی اسی لائق ہے کہ اس کو ذلیل وخوار کیا جائے، اور اس کی پیشانی یعنی چوٹی کے وہ بال جنہیں بہت دھوتا، تیل لگاتا اور ہمیشہ کنگھی دیا کرتا تھا وہ اس قابل ہیں کہ انہیں گھسیٹ کر خاک آلود کیا جائے۔

خاطی اور مخطی میں فرق

مفسرین نے لکھا ہے کہ خاطی، مخطی سے بدتر ہوتا ہے، اس لئے کہ لغتِ عرب میں خاطی اس کو کہتے ہیں جو جان بوجھ کر اپنے ارادے سے گناہ کرے اور مخطی وہ ہوتا ہے جس سے بغیر ارادے کے نادانستہ طور پر گناہ سرزد ہوجائے اسی لئے خاطی کے لئے قرآن میں سخت عذاب کی وعید آئی ہے، یعنی ''غسلین'' کھانے کی وعید ہے، اور ''غسلین'' اس خون و پیپ کا نام ہے جو جہنمیوں کے بدن سے آگ میں جلنے کی وجہ سے نکل کر بہے گا، چنانچہ فرمایا

''من غسلین لا یأکله الا الخاطئون'' اور مخطی کے لئے معافی کا وعدہ فرمایا گیا ہے چنانچہ قرآن کے الفاظ ہیں ''ربنا لا تؤاخذنا ان نسینا او اخطأنا''

یعنی حق تعالیٰ نے فرمایا کہ یوں دعاء مانگو اے ہمارے رب ہماری بھول چوک پر ہماری پکڑ نہ فرما۔

ابوجہل کے چیلنج کا جواب

حدیث میں آتا ہے جب یہ آیات نازل ہوئیں تو رفتہ رفتہ ابوجہل تک بھی ان کی خبر پہنچی وہ ملعون غصے میں بھرا ہوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور انتہائی گستاخانہ اور متکبرانہ گفتگو کی، کہنے لگا ارے نادان تجھے پتہ ہے تو کس کو ڈرا رہا ہے، میں چاہوں تو اس میدان کو سواروں اور پیادوں سے بھر دوں، مگر کس کے لئے ایسا کروں؟ تیری حقیقت ہی کیا ہے؟ تیرے لئے اور تیری قوم کے لئے تو وہی لوگ کافی ہیں جو صبح شام میری مجلس اور دربار میں حاضر رہتے ہیں، اگر صرف ان کو ہی بلالوں تو تجھے اپنی حقیقت معلوم ہوجائے۔

اس ملعون کے اس متکبرانہ چیلنج کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

فَلْيَدْعُ نَادِيَهُ ۝ سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ۝

اب بلالیوے اپنی مجلس والوں کو ہم بھی بلاتے ہیں پیادے سیاست کرنے کو

جو لوگ صبح شام اس کی مجلس میں حاضر رہتے ہیں ان کو اپنی موت روکنے اور روح قبض کرنے والے

کے مقابلے کے لئے بلالے، بلکہ جن افواج کی دھمکیاں دے رہا ہے ان سب کو بلالے، ہم بھی اپنے بندوں کو بھیجیں گے۔

زبانیہ کی تحقیق

زبانیہ اصل لغت میں قید خانے کے ان پولیس والوں کو کہتے ہیں جو قیدیوں کی مشکیں باندھ کر ان کو بند کرتے ہیں، اور یہاں وہ فرشتے مراد ہیں جو دوزخ پر مقرر ہیں اور لوگوں کے ہاتھ پاؤں باندھ کر دوزخ میں ڈالیں گے۔ زبانیہ کے لفظ کی تحقیق میں اختلاف ہے بعض کہتے ہیں یہ ایسی جمع ہے جس کا مفرد نہیں ہے اور بعض کہتے ہیں اس کا مفرد زبنیت بروزن عفریت ہے یہ زبن سے مشتق ہے جس کے معنی دفع کرنے کے ہیں اور زبنیت ہر سرکش وشریر کو کہتے ہیں خواہ جن ہو یا انسان ہو۔

سو ابوجہل کا حال بھی یہی ہوا بدر کے دن مارا گیا، پھر صحابہ کرامؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے اس کے کانوں میں سوراخ کر کے انہیں رسی ڈال کر اس کی لاش گھسیٹ کر ایک ناپاک کنویں تک لے گئے، پھر اس کو چوٹی کے بالوں سے کھینچ کر کنویں کے اندر ڈال دیا، ادھر روح کو جہنم کے فرشتوں نے بدن سے جدا ہوتے ہی عذاب میں گرفتار کر لیا، مگر اس وقت اس کے رفقاء اور اہلِ مجلس میں سے کوئی بھی اس کے کام نہ آیا۔

زبانیہ جہنم کی تعداد اور شکل وصورت

زبانیہ جو جہنم کے فرشتے ہیں ان کی تعداد قرآن میں دوسری جگہ انیس آئی ہے، جو کافروں کو پکڑ کر جہنم میں ڈالیں گے، انیس کی تعداد مقرر کرنے کی وجہ سورۂ مدثر کی تفسیر میں بیان کر دی گئی ہے۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ وہ اتنے دراز قد ہیں جیسے پاؤں زمین پر ہوں اور سر آسمان کو چھو رہا ہو، ان کے سردار (افسر) کا نام مالک ہے، اٹھارہ باقی اس کے ماتحت ہیں، ان کی آنکھیں بجلی کی طرح چمکتی ہیں، دانت بارہ سنگے کے سینگوں کی طرح اینٹھے ہوئے ہیں، بال اتنے لمبے کہ زمین پر گھسٹتے ہیں، ان کے موہنوں سے آگ کے شعلے نکلتے ہیں، ان کے ایک کندھے سے دوسرے کندھے تک ایک برس کی مسافت کے برابر فاصلہ ہے، ان کے ہاتھ کی ہتھیلی ستر ہزار آدمیوں کی گنجائش رکھتی ہے۔

جب ان کافروں کے حالات بیان کرنے سے فارغ ہوئے تو اب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو

ابو جہل کی مخالفت کرنے پر حوصلہ افزائی اور دلیری دے رہے ہیں، چنانچہ فرمایا:

كَلَّا ط لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ○

کوئی نہیں مت مان اُس کا کہا اور سجدہ کر اور نزدیک ہو

یعنی ہرگز آپ اس سے مت ڈریئے، اس کی دھمکیوں کو کچھ شمار میں نہ لایئے، اس کا کہنا مت مانیئے، اور سجدوں کے ذریعہ اپنے رب کا قرب حاصل کرتے رہیئے۔

اگرچہ وہ مردود نماز پڑھنے سے منع کرتا تھا لیکن خاص طور پر سجدے سے اس کو زیادہ چڑھ تھی، اس لئے کہ نماز کے ارکان میں سجدہ ایسا رکن ہے جو تکبر وغرور کے منافی ہے اور اس ملعون میں انتہائی درجے کا غرور وتکبر تھا اسی لئے سجدہ اس کو بہت بُرا لگتا تھا، خود سجدہ کرنا تو کجا دوسروں کا سجدہ بھی اس سے برداشت نہیں ہوتا تھا، اسی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سجدے کا حکم ہوا تا کہ اس کے علی الرغم مخالفت ہو۔

اس مقام پر سجدے کا حکم دینے کی حکمت

جب اس سرکش کو تکبر کے بدلے میں چوٹی پکڑ کر گھسیٹنے کی دھمکی دی تو اس کے مقابلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا کہ آپؐ اس بات کے شکر میں کہ ہم نے آپؐ کے دشمن کی پیشانی کو خاک آلود کیا ہے ہمارے سامنے عاجزی کے ساتھ اپنی پیشانی زمین پر رکھ دیجئے۔

اور یہ وجہ بھی ہے (یہاں سجدے کا حکم دینے کی) کہ چونکہ سجدہ حق تعالیٰ کے قرب کا ذریعہ ہے اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا کہ آپؐ سجدے میں مشغول رہیئے تا کہ اللہ کی بارگاہ میں آپ کا قرب کمال کے انتہائی درجے تک پہنچ جائے۔ تب آپؐ کے دشمن خود بخود ذلیل وخوار ہو جائیں گے، اس لئے کہ جس قدر آپؐ کے قرب کے درجات بڑھتے جائیں گے اسی قدر آپؐ کے دشمنوں کی مقہوری بڑھتی جائے گی۔

سجدے میں تقرب کی زیادتی کی وجہ

سجدے کی حالت میں اللہ تعالیٰ کے تقرب کی زیادتی کی وجہ یہ ہے کہ اس حالت میں بندہ اپنی اصل یعنی مٹی کی طرف متوجہ ہوتا ہے، اور اپنی اصل کی طرف جتنی زیادہ توجہ ہوگی اسی قدر اللہ کے قرب میں اضافہ ہوگا اس لئے کہ اس کی بارگاہ سے وجود کا فیضان بھی اسی راستے سے پہنچا ہے (یعنی انسان کو سب سے پہلے جو

وجود اور زندگی عطا فرمائی گئی تو اس طرح کہ مٹی کا پتلا بنایا گیا پھر اس میں جان ڈالی گئی) تو جب انسان اپنے آپ کو پھر اسی دروازے پر لے آیا جہاں سے نکلا تھا اور اسی کو کھٹکھٹایا تو رجوع الی اللہ ثابت ہو گیا۔

چنانچہ حدیث میں ہے:

"اقرب ما یکون العبد من ربه وهو ساجد فاکثروا فيها من الدعاء" یعنی بندہ اپنے رب کے سب سے زیادہ قریب سجدے کی حالت میں ہوتا ہے سو تم سجدے میں خوب دعا کیا کرو۔

مسئلہ:۔ یہ آیت سجدۂ تلاوت کی آیات میں سے ہے، اس کے پڑھنے سے پڑھنے والے اور سننے والے دونوں پر سجدہ واجب ہو جاتا ہے۔

ابوجہل کا گستاخی کا ارادہ اور ناکامی

روایت ہے کہ ابوجہل نے لوگوں سے کہہ رکھا تھا بیت اللہ کے سامنے جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ کریں تو مجھے اطلاع دینا میں ان کی گردن پر پاؤں رکھ کر گردن توڑ ڈالوں گا، چنانچہ ایک دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیت اللہ کے سامنے نماز پڑھ رہے تھے کہ کسی نے اس کو خبر دی، وہ فوراً آیا، اور بے ادبی کی نیت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بڑھا مگر فوراً ہی اپنے ہاتھوں سے بچاؤ کرتا ہوا اُلٹے پاؤں پیچھے بھاگ گیا، لوگوں نے اس سے پوچھا کیا ماجرا ہے تو اس نے کہا جب میں اس کے قریب گیا تو میں نے دیکھا میرے اور اس کے درمیان آگ کی ایک بہت بڑی خندق ہے جس کے کناروں پر (فرشتوں کے پر)۔ معلوم ہو رہے تھے اور ایک بہت بڑا اژدھا تھا جو منہ کھولے میری طرف لپکا، اگر میں تھوڑی دیر وہاں ٹھہر جاتا تو یا جل ہی جاتا یا وہ اژدھا مجھے نگل لیتا، تو لوگوں نے پوچھا ایسا کیوں ہوا، اس نے کہا دراصل یہ شخص بہت بڑا جادوگر ہے، میں اس سے جیت نہیں سکتا۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات سنی تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا اگر وہ میرے نزدیک آتا تو فرشتے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتے۔

اس سورت سے متعلق عجیب وغریب نکات

(۱) اب اس سورت سے متعلق کچھ فوائد و نکات بیان کئے جاتے ہیں۔ ایک یہ ہے کہ اس سورت کی ابتدائی پانچ آیتیں سب سے پہلے نازل ہوئی تھیں باقی بہت دنوں کے بعد ابوجہل کے بارے میں نازل

مقدمہ سورۃ القدر

مشہور یہ ہے کہ یہ سورت مکی ہے، مگر اس کے شانِ نزول کے سلسلے میں جو اسباب بیان کئے جاتے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ مدنی ہے، اس لئے کہ بنی اسرائیل کے واقعات کا تذکرہ مدینہ میں ہوا کرتا تھا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ممبر بھی مدینہ میں بنوایا گیا۔

آیات، کلمات اور حروف کی تعداد:

اس سورت کی پانچ (۵) آیات، تیئس (۲۳) کلمات، اور ایک سو بارہ (۱۱۲) حروف ہیں۔

شانِ نزول

اس کے نازل ہونے کے کئی اسباب بیان کئے جاتے ہیں، ایک سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ تشریف فرما تھے، بنی اسرائیل کے حالات کا بیان چل رہا تھا، اسی سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی اسرائیل کے ایک زاہد و عبادت گذار آدمی جس کا نام شمعون یا سمنون تھا کا ذکر فرمایا کہ اس کی عبادت ضرب المثل تھی، اس نے ایک ہزار مہینے تک عبادت کی اس طرح کہ دن کو روزہ رکھ کر جہاد کرتا، اور رات کو نماز پڑھتا، صحابہؓ نے عرض کیا اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم اس شخص کی عبادت کے ثواب تک کیسے پہنچ سکتے ہیں جب کہ ہماری عمریں ہی ساٹھ، ستر سال سے زیادہ نہیں ہوتیں۔ اس میں سے بھی ایک تہائی کے برابر سونے میں گذر جاتی ہے، کچھ تلاش معاش میں، کچھ دوسری حاجات و ضروریات میں، کچھ بیماری میں اور کچھ سستی میں ضائع ہو جاتی ہے، پھر عبادت کے لئے کیا باقی رہا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کی باتوں سے دلگیر و غمگین ہو گئے، اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمائی کہ اگرچہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اُمت کی عمریں چھوٹی ہیں لیکن آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ہم نے ایک ایسی رات عطا فرمائی ہے کہ جس میں عبادت ایک ہزار مہینے کی عبادت سے بہتر ہے۔

دوسرا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اپنی امت کی عمریں دکھائی گئیں جو ساٹھ اور ستر کے درمیان تھیں تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) غمگین ہوئے کہ گذشتہ اُمتوں کے مقابلے میں

میری امت کی عمریں بہت کم ہیں ان سے کیا ہو سکے گا، ایسا نہ ہو کہ قیامت کے دن پہلی امتیں بڑی عمریں ہونے کی وجہ سے زیادہ ثواب حاصل کریں اور میری امت ان کے سامنے تھوڑی عبادت کی وجہ سے شرمندہ ہو، تب یہ سورت آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تسلی کے لئے نازل کی گئی۔

تیسرا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں دیکھا کہ بنوامیہ کے ظالم بندروں کی طرح کود کود کر ایک کے بعد دوسرا آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے منبر پر بیٹھ رہا ہے اور رعایا پر ظلم کر رہا ہے، یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بہت ہی گراں گذری، تب یہ سورت نازل ہوئی، اور ہزار مہینے سے مراد بنوامیہ کی سلطنت کی کل مدت ہے، چنانچہ ان کی سلطنت اتنا عرصہ ہی رہی۔ (۱)

سورت کی وجہ تسمیہ اور لیلۃ القدر کا معنی وفضیلت

سورت کا نام لیلۃ القدر اس لئے ہے کہ اس میں لیلۃ القدر کا ذکر کیا گیا ہے، اور لیلۃ القدر کو لیلۃ القدر کہنے کی دو وجہیں ہیں۔

پہلی وجہ:۔ یہ ہے کہ قدر مقدار اور رتبے کو کہتے ہیں، تو چونکہ اس رات بنی آدم کے صلحاء اور عبادت گذار لوگوں کا رتبہ (جو ان کا ہے) ظاہر ہوتا ہے اور جو مراتب قرب ومنزلت کے انہوں نے کسب و محنت سے حاصل کئے ہیں اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ ثابت ہو جاتے ہیں گویا پورے سال کی عبادت کا ثمرہ ظاہر ہو جاتا ہے، اور فرشتے اور دیگر ارواح ہر ایک کے مراتب کی مقدار (کہ کون کس درجے کے رتبے کا ہے) پر مطلع ہو جاتے ہیں۔

دوسری وجہ:۔ یہ ہے کہ "قدر" کا معنی شرف وبزرگی اور عظمت وبڑائی بھی آتا ہے، چنانچہ کہتے ہیں فلاں عالی قدر ہے، یا ذوالقدر ہے یعنی شرف وعزت والا ہے، اور یہ رات بھی کئی وجوہ سے دوسری راتوں پر فوقیت وفضیلت رکھتی ہے اس لئے اس کو "لیلۃ القدر" کہتے ہیں۔

---

(۱) اوّل تو یہ روایت ضعیف ہے جیسا کہ امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے، مزی کہتے ہیں یہ روایت غیر معروف ہے، یہ بھی غلط ہے کہ بنواُمیہ کی سلطنت پورے ایک ہزار مہینے رہی ہے، اس لئے کہ ان کی حکومت چالیس ہجری سے شروع ہوئی اور ۱۳۲ھ میں مروان الحمار پر ختم ہوئی یہ بانوے سال مدت بنتی ہے، جبکہ ہزار مہینے، تراسی سال سے کچھ اوپر کا زمانہ بنتا ہے۔۳،۸۳۔۱۲ (تفسیر حقانی بتصرف یسیر ج۵ ص ۲۴۵)

لیلۃ القدر کی دوسری راتوں پر فضیلت کی وجوہات

(۱) ایک وجہ اس رات کی دیگر راتوں پر فضیلت کی یہ ہے کہ اس رات کی شام سے لے کر صبح تک تجلی الٰہی بندوں کے حال کی طرف متوجہ رہتی ہے اور ان کو بارگاہِ الٰہی میں معنوی قرب حاصل ہوتا ہے۔

(۲) اس رات فرشتے اور دیگر ارواح نیک لوگوں اور عبادت کرنے والوں کے ساتھ ملاقات کرنے کیلئے آسمان سے زمین پر آتے ہیں، اور ان ارواح وفرشتوں کے قرب ونزدیکی کی وجہ سے اس رات کی عبادت کی کیفیت وحلاوت دوسری راتوں کی عبادت کی کیفیت وحلاوت سے ہزاروں درجے بڑھ جاتی ہے۔

(۳) قرآنِ مجید اسی رات میں نازل ہوا، یعنی لوحِ محفوظ سے آسمانِ دنیا کی طرف، سو یہ ایسی فضیلت ہے کہ جس کی کوئی حد نہیں۔

(۴) فرشتوں کی تخلیق اسی رات میں ہوئی ہے۔

(۵) جنت کی آراستگی اور سجاوٹ اسی رات کو ہوتی ہے۔

(۶) حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کا مادہ اسی رات کو جمع ہوا۔

(۸) صحیح سند سے یہ روایت ہے کہ حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ کا ایک غلام تھا جو سالہا سال سے سمندر میں جہاز رانی کا کام کرتا تھا، ایک دن اس نے اپنا مشاہدہ بیان کیا کہ سمندر کے عجائبات میں سے ایک ایسی بات میرے تجربے میں آئی ہے جس سے عقل حیران ہے وہ یہ کہ سال میں ایک رات ایسی آتی ہے کہ اس میں دریائے شور کا پانی میٹھا ہو جاتا ہے۔ حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ نے اس سے فرمایا اب جب وہ رات آئے تو مجھے بتانا تا کہ میں دیکھوں کہ وہ کون سی رات ہے اور اس کی کیا فضیلت ہے، چنانچہ اس غلام نے ستائیسویں رمضان المبارک کی رات آ کر عرض کیا کہ یہی وہ رات ہے۔

بعض اوقات وبعض مقامات میں خاص برکات رکھی گئی ہیں

اس سورت کے مضمون سے یہ بات معلوم ہوئی کہ طاعات وعبادت کے انوار وبرکات اور ثواب، متبرک اوقات، مقدس مقامات اور صالحین کے اجتماع کی وجہ سے بڑھ جاتے ہیں، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ہماری طاعات کا ثواب صرف ہماری مشقت کے بقدر اس وقت ملتا ہے جب اس طرح ثواب کے اضافے کا کوئی سبب درمیان میں نہ آ جائے، چنانچہ "اجرک علی قدر نصبک" جو فرمایا گیا ہے

وہ ایسے اوقات و مقامات کے علاوہ کے لئے ہے، ایسے متبرک اوقات یا مقدس مقامات کی وجہ سے عبادت کا ثواب بڑھ جاتا ہے، چنانچہ بہت دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ تھوڑی سی عبادت جمعیت خاطر کے ساتھ متبرک وقت یا جگہ میں ادا کی جاتی ہے تو وہ زیادہ عبادت سے بہتر اور نورو الی ہو جاتی ہے۔

لیلۃ القدر کو پوشیدہ رکھنے کی حکمتیں

(۱) لیلۃ القدر کو باوجود اس شرف و فضیلت کے لوگوں سے پوشیدہ رکھا ہے، جیسے جمعہ کے دن کی وہ ساعت جس میں دعاء قبول ہوتی ہے، پانچوں نمازوں میں صلوٰۃ وسطیٰ، اسماءِ باری تعالیٰ میں اسمِ اعظم، مقبول طاعت کو دوسری طاعتوں میں، اور اولیاء اللہ کو دوسرے لوگوں میں چھپا کر رکھا ہے، تا کہ لوگ ان چیزوں کی جستجو میں رہیں، اور تا کہ تمام راتوں کی، جمعہ کے دن کی تمام ساعتوں کی، تمام نمازوں کی، تمام اسماءِ الٰہی کی، تمام طاعتوں کی اور سارے نیک لوگوں کی رعایت کریں۔

(۲) جس طرح موت کے وقت کو اور قیامت کے دن کو پوشیدہ رکھا گیا ہے اسی طرح اس متبرک رات کے پوشیدہ رکھنے میں ایک حکمت یہ بھی ہے تا کہ لوگ صرف ایسی ایک رات پر تکیہ اور بھروسہ کر کے بیٹھ نہ جائیں اور اعمال سے غلفت و سستی اختیار نہ کر لیں۔

(۳) اس کے پوشیدہ رکھنے میں یہ بھی حکمت ہے کہ اگر شب قدر سب کو معلوم ہوتی تو بعض لوگ تو عبادت کر کے ہزار مہینے کی عبادت کا ثواب حاصل کرتے لیکن بعض ایسے بھی ہوتے جو اس رات کو جانتے ہوئے بھی اس میں گناہوں کا ارتکاب کرتے، اس طرح وہ ایک رات میں ہزار مہینوں کا عذاب حاصل کرتے، رحمتِ الٰہی نے چاہا کہ لوگوں سے یہ رات پوشیدہ رہے تا کہ یقینی طور پر معلوم ہونے کی صورت میں اس کے اندر گناہوں کا ارتکاب کر کے لوگ عذاب عظیم کو اپنے لئے تیار نہ کریں، اگر چہ بعض لوگ ہزار مہینے کا ثواب بھی کماتے مگر جلبِ منفعت سے دفعِ مضرت اولیٰ ہے، اس لئے اس کو پوشیدہ رکھا گیا۔

کیا تقدیر کے فیصلے لیلۃ القدر میں ہوتے ہیں

بعض مفسرین نے ''قدر'' کو تقدیر کے معنی میں لیا ہے اور کہا ہے کہ رزق کے فیصلے، اموات، بیماریاں اور دیگر حادثات جو سال بھر میں ہونے والے ہیں سب اسی رات کو مقدر ہوتے ہیں، فرشتوں کو لوحِ محفوظ سے وہ کام نقل کر کے دستاویز کی صورت میں دیئے جاتے ہیں جس کے مطابق وہ سارا سال عمل کرتے ہیں۔

لیکن صحیح بات یہ ہے کہ یہ تقدیر شعبان کی پندرھویں رات کو ہوتی ہے جس کو شب براءت کہتے ہیں، اگرچہ بعض تابعین نے فرمایا ہے کہ نقل نویسی کا کام شب براءت میں ہوتا ہے اور متعلقہ فرشتوں کے حوالے وہ دستاویزات اِس رمضان کی رات کو ہوتی ہیں، تو (سال بھر کی) تقدیر کی ابتداء شب براءت سے ہوئی اور انتہاء اس رات کو ہوئی، لیکن تحقیق وہی ہے جو پہلے ذکر کی گئی ہے۔

لیلۃ القدر کون سے مہینے میں کن ایام میں ہوتی ہے

لیلۃ القدر کی تعیین میں بہت اختلاف ہے، جتنی بات قرآن کریم سے ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ رات رمضان المبارک کے مہینے میں ہے اس لئے کہ اس سورت میں بیان کیا گیا ہے کہ قرآن کا نزول اسی رات کو ہوا ہے، اور سورۂ بقرہ میں فرمایا ہے کہ قرآن رمضان المبارک کے مہینے میں نازل کیا گیا ہے، ان دونوں فرمانوں کو جمع کرنے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ شب قدر رمضان المبارک میں ہے۔

اور یہ احتمال کہ شب قدر پورے سال کے اندر دائر ہو اور جس سال قرآن نازل ہوا اس سال رمضان کے مہینے میں ہوئی ہو، یہ قول بعید ہے۔ حدیث مشہور سے یہ بات ثابت ہے کہ لیلۃ القدر رمضان المبارک کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں ہوتی ہے، پس پورا سال یہ پانچ راتیں اس بات کا احتمال رکھتیں ہیں کہ وہ لیلۃ القدر ہوں (یعنی ان میں سے ہر ایک کے بارے میں یہ احتمال ہے کہ وہ شب قدر ہو) اور وہ یہ ہیں اکیسویں، تیسویں، پچیسویں، ستائیسویں، انتیسویں۔ اصح یہی ہے کہ ان میں سے بغیر تعیین کے کوئی ایک رات شب قدر ہوتی ہے، کسی سال اکیسویں ہوتی ہے، اور کسی سال تیسویں اسی طرح باقی۔

ستائیسویں رات شب قدر کے لئے جو مشہور ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اکثر وہ ستائیسویں کی رات کو واقع ہوئی ہے، اسی لئے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ "لیلۃ القدر" میں نو حروف ہیں، اور اِس سورت کے اندر لیلۃ القدر کا تین مرتبہ ذکر آیا ہے، تین کو نو سے ضرب دیں تو ستائیس ہوتے ہیں۔ (گویا اس سے اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ وہ رات ستائیسویں ہے)

بعض علماء نے فرمایا کہ اس سورت میں تیس کلمے ہیں اور ان میں ستائیسواں کلمہ "ہی" ہے جو لیلۃ القدر کی طرف راجع (لوٹ رہا) ہے اور اس سے اشارہ ستائیس کے عدد کی طرف ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

الحمدللہ تمت المقدمة بعونہ تعالیٰ وفضلہ

تفسیر سورۃ القدر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ ۝

ہم نے اُس کو اُتارا شب قدر میں

یعنی وہ رات کہ جس میں عبادت کرنے والے کے رتبے اور ان کی قدر ظاہر ہوتی ہے اور ان کی ولایت کا درجہ و مرتبہ عالم ملکوت و عالم ارواح پر ظاہر ہوتا ہے، اور اسی رات قطبیت، غوثیت، ابدالیت اور امامت کے مناصب و مرتبے ان کے مستحق و اہل لوگوں کے لئے مقرر کئے جاتے ہیں۔

یہ معاملات رات کے ساتھ مخصوص کئے گئے ہیں اس لئے کہ دن ظہور کا وقت ہے یہ عالم شہادت سے مشابہ ہے، اور رات پردہ پوشی کا وقت ہے لہٰذا یہ عالم غیب سے مشابہت رکھتی ہے۔

لیلۃ القدر کا راز

اس رات کا راز جو بعض عارفین کو معلوم ہوا ہے یہ ہے کہ یہ رات وصل کا وقت ہے اور وصل کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اس رات جمالِ الٰہی کی تجلّی اپنے مشتاق بندوں کے حال کی طرف متوجہ ہوتی ہے اور مدارک و اذہان میں فراخی پیدا ہو جاتی ہے، اور قوتِ خیالیہ قوتِ مدرکہ کی خدمت کرتی ہے (یعنی اس کے تابع ہو جاتی ہے) اور وہ تجلّی عالم قدس کے رہنے والے ارواح و ملائکہ کو اپنے ساتھ لاتی ہے۔

اس طرح عالم غیب کے عالم شہادت سے ملاقات کرنے، آسمان کے اہلِ کمال کا زمین کے اہلِ کمال سے ملنے، اور ایک کے انوار کا دوسرے میں انعکاس کرنے اور مستفید ہونے سے عالم روحانی میں ایک عجیب حالت پیدا ہوتی ہے جس کو شرح و ضاحت سے نہیں بیان کیا جا سکتا، البتہ ایک ناقص مثال کے ذریعہ اس کو بیان کیا جاتا ہے، جیسے موسم بہار کے آنے پر بارش کے برسنے اور سورج کی گرمی کی وجہ سے زمین کے ہر تخم اور جڑی بوٹی میں ایک نئی جان پڑ جاتی ہے، رنگ رنگ کے سبزے لہلانے لگتے اور فرحت و انبساط کی ایک کیفیت پیدا ہو جاتی ہے (اسی طرح اس رات کے آنے پر عالم بالا اور حق سبحانہ کی تجلی سے ارواحِ بشریہ بلکہ تمام عالمِ محسوس پر ایک نئی کیفیت بہار کی پیدا ہو جاتی ہے)

ایک شبہہ اوراس کا جواب

یہاں ایک شبہہ ہے وہ یہ کہ قرآن تیئیس (۲۳) سال کی مدت میں مکمل نازل ہوا جس کی ابتداء ربیع الاول کے مہینے میں ہوئی اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر کا چالیسواں سال شروع ہوا تھا، جبکہ خود قرآن کے اندر نزول کے تین متعین موقعوں کی طرف اشارے فرمائے گئے ہیں (ان میں ربیع الاول نہیں ہے) ایک رمضان المبارک کا مہینہ، دوسرے شب قدر جو رمضان المبارک کے آخری عشرے میں ہوتی ہے، تیسرے لیلۂ مبارکہ جو اکثر علماء کے نزدیک پندرہویں شعبان ہے جس کو شب براءت کہتے ہیں، تو اس امر واقعی (ربیع الاول میں نزول) اور ان تین مختلف تعبیروں کے درمیان تطبیق کیسے ہوگی؟

جواب اس کا یہ ہے کہ روایات میں اچھی طرح چھان پھٹک کے بعد جو بات معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کا نزول لوحِ محفوظ سے ''بیت العزت'' میں جو آسمانِ دنیا پر ایک مقام ہے جس کو اعلیٰ مرتبے کے فرشتوں نے گھیر رکھا ہے، شب قدر میں ہوا جو رمضان المبارک میں ہوتی ہے، اور اسی سال اس سے قبل ''بیت العزت'' میں نزول کی تقدیر اور اس کا حکم شب براءت میں ہوا تھا، اب تینوں تعبیریں درست ہوگئیں، یعنی حقیقی نزول رمضان المبارک کے مہینے میں شب قدر کو ہوا، تقدیری نزول اس سے پہلے شب براءت میں ہوا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر اس کا نزول ربیع الاول کے مہینے میں شروع ہوا، پھر آخر عمر تک اس کا نزول مکمل ہوا، اب کوئی تعارض نہیں رہا۔

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۝

اور تو نے کیا سمجھا کہ کیا ہے شب قدر

یعنی اگر چہ عارف وسیع المعرفت وجلیل المرتبہ ہو تب بھی اس تجلی الٰہی کی حقیقت جو کہ اپنے ساتھ تاثیرات ظاہر کرتی ہے جیسا کہ چاہئے ویسا اس کا بیان نہیں ہوسکتا، اس لئے کہ (اس کی پوری حقیقت) جاننے کے لئے شرط یہ ہے کہ ان تمام عوالم (جمع عالم) اور استعدادات پر آدمی کو احاطہ حاصل ہو اور یہ بات بشری طاقت سے باہر ہے، اس لئے اس رات کی عظمت کا بیان جتنا ممکن ہوسکتا ہے وہ بیان کیا جاتا ہے۔

لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۵ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ ۝

شب قدر بہتر ہے ہزار مہینے سے

اور مقصد یہ ہے کہ اگر چہ ہر مہینہ میں دن رات ہوتے ہیں اور اس ارشاد کے موافق:

"ان للہ فی أیام دھر کم نفحات ألا فتعر ضوا لھا" ہر دن رات میں تجلیات غیبیہ و شہودیہ ہوتی ہیں لیکن وہ تجلی جو اِس رات کو ہوتی ہے وہ عموم وشیوع کے اعتبار اور ان اسمائے الٰہی جو اس تجلی کا مادہ ہیں کی بلندی کی وجہ سے اس کی نسبت باقی دنوں کی تجلیات سے ایسی ہے جیسی دنیا کی نسبت قطرے کے ساتھ ہوتی ہے۔

ہزار کے عدد کی تخصیص کی وجہ

ہزار کے عدد کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ اہل عرب کے ہاں آخری عدد کا نام یہی ہے ہزار سے اوپر ان کے ہاں عدد کا نام نہیں ہے، تو گویا ہزار کے لفظ سے اشارہ ہے عدد کی انتہاء کی طرف (کہ جہاں تک انسان شمار کرسکتا ہے اس سے بھی بڑھ کر ثواب اس رات کا ہے)

مہینوں کی تخصیص کی وجہ

باقی رہی یہ بات کہ مہینے کے مقابلے میں سال میں زیادہ دن ہوتے ہیں تو سال کو کیوں نہ ذکر کیا؟ تو وجہ اس کی یہ ہے کہ اہل عرب قمری مہینوں سے سال کا شمار کرتے ہیں اس میں مہینوں کا تکرار ہوتا ہے، اور شمسی سال ایک پوشیدہ چیز ہے اور دن کے ساتھ مخصوص ہے، اس کے مقابلے میں چاند رات کے ساتھ مخصوص ہے، اس کے ساتھ ساتھ چاند کو اس موقع کے ساتھ ایک زائد مناسبت ہے اس لئے کہ چاند گویا ہلال کی صورت میں طلوع ہو کر بدر ہونے تک جاتا ہے یہ رات کو ہی ہوتا ہے (اس لئے شمسی حساب کے مقابلے میں چاند کا حساب ہی یہاں مناسب تھا) گویا وہ دنیا کے ظلمت کدے پر نور کی تجلی کے ظہور کی ایک مثال ہے۔

اور چونکہ تجلی الٰہی کی وجہ سے اس رات کو عظمت و بڑائی حاصل ہوئی اس لئے اس رات کی عبادت (چاند کے) ہزار مہینوں کی عبادت سے بہتر ہوئی۔

تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا

اُترتے ہیں فرشتے اور روح اُس میں

اس رات آسمان سے فرشتے اور علیین سے روحیں اترتیں ہیں، اہلِ کمال کے ساتھ ملنے اور ان کے اعمال کے انوار حاصل کرنے کے لئے اور ان کیفیات سے لذت اُٹھانے کے لئے جو زمین والوں کو

اپنے محبوب و معبود کی نسبت حاصل ہوئیں ہیں۔ ان کے نزول کی وجہ سے لوگوں کے نور حضوری میں اضافہ ہوتا ہے، اور یہ وجہ بھی ہے کہ اہل آسمان کو زمین والوں کی کیفیات انعکاس کے طور پر حاصل ہوں، پس کمالات علوی اور کمالاتِ سفلی دونوں فریقوں میں تعاکس کے طریق پر جلوہ افروز ہوتے ہیں اور دونوں نوعوں (کمالاتِ علوی، کمالات سفلی) سے مرکب ہو کر کمال کی ایک (تیسری شکل) جلوہ گر ہوتی ہے، ہر ہر فرد کے اندر جو کمالات انفرادی طور پر مندمج و مندرج تھے وہ سب مجتمع ہو جانے کی وجہ سے وحدانی (اکھیری) صورت اختیار کر کے معجون مرکب کی طرح اور ہی رنگ اپنا لیتے ہیں، جیسے معجون مرکب ایسے مختلف الکیفیات اجزاء سے مرکب ہوتی ہے جن کی اپنی اپنی تاثیر الگ الگ ہوتی ہے لیکن معجون مرکب ہو جانے کے بعد اس کا مزاج بالکل دوسرا ہو جاتا ہے (جو تنہا ان اجزاء میں نہیں تھا)

یہ طلسماتِ الٰہی میں سے ایک طلسم ہے جس کے ذریعہ ناقص کو بھی کاملین کے حساب میں شمار کر دیتے ہیں اور یہی راز ہے جماعت کی نماز کی فضیلت کا اکیلے نماز پڑھنے پر، اور جماعت جتنی زیادہ ہوگی دل کے روشن کرنے اور نماز کے عنداللہ مقبول ہونے میں اتنی زیادہ اس کی تاثیر ہوگی۔

اور چونکہ ملائکہ کا نزول کبھی ان امور کی تدبیر کے لئے بھی ہوتا ہے جو ملائکہ سے متعلق ہوتے ہیں، اسی طرح بعض اہل کمال کو ارواح علویہ کے ساتھ مناسبت ہوتی ہے اس وجہ سے کبھی ان ارواح کا نزول ہوتا ہے، اس لئے ایک اور جملے کا اضافہ فرما کر بتا دیا کہ یہ نزول اس طرح کا نہیں ہے، اور قسم کا ہے چنانچہ فرمایا:

بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ج

اپنے رب کے حکم سے

غرض یہ ہے کہ ایک ہی تجلی تمام فرشتوں اور ارواح کو اپنی تابعداری میں لیتے ہوئے ایک کام کے لئے نیچے آئی ہے اور وہ کام ہے کمالات مختلف المقدار کی ہیئت وحدانیہ کا حصول۔

اب (شب قدر کے علاوہ دوسرے وقت میں) ملائکہ و ارواح کے نزول کی مثال ایسی ہے جیسے بادشاہ کا کوئی ملازم یا اس کا کوئی گورنر کسی کے گھر ذاتی جان پہچان کی وجہ سے یا کسی اور تقریب سے آئے۔

اور اس وقت (شب قدر میں) ملائکہ و روح کے نزول کی مثال بلا تشبیہ یہ ہے کہ جیسے بادشاہ کا آدمی بادشاہ کے حکم سے یا اس کی ہمراہی میں کسی کے گھر آئے، اب ان دونوں حالتوں میں جو فرق ہے وہ ظاہر ہے۔

مِنْ كُلِّ اَمْرٍ ۝

ہر کام پر

یہ ''الملائکہ والروح'' سے بیان ہے، یعنی ہر اس امر کے ملائکہ اور ہر اس امر کی ارواح جس امر کا تعلق قرب وکمال کے ساتھ ہے وہ نزول فرماتے ہیں۔

اگرچہ جن پر یہ ملائکہ وارواح اترتے ہیں وہ سب لوگ قرب وکمال کی استعداد نہیں رکھتے، تاہم مقصود ہیئت وحدانیہ کا پیدا کرنا اور ناقصوں کے نقصان کو پورا کرنا ہے۔

جب اس شب کے فضائل کے بیان سے فارغ ہوئے تو اب اسکی ایک اور خاصیت بیان فرماتے ہیں:

سَلٰمٌ قف هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۝

امان ہے وہ رات صبح کے نکلنے تک

یعنی اس رات نفس وشیطان کے شر سے سلامتی ہے، کہ اکثر ان دونوں کے شر کی آمیزش کی وجہ سے طاعات مردود ہو جاتی ہیں، مگر اس رات تجلی کے نور اور ملائکہ وارواح کے حاضر ہونے کی وجہ سے حوادثِ نفسانی کی تاثیر اور شیطانی خطرات بالکلیہ زائل ہو جاتے ہیں، اور غروب آفتاب سے لے کر طلوع صبح صادق تک برابر ان آفات سے امن واطمینان حاصل ہو جاتا ہے۔

بخلاف دوسری راتوں کے کہ ہر رات کا پہلا تہائی حصہ شیطانوں کے پھیلنے کا وقت ہے، وہ وساوس وخطرات کے ذریعہ عبادت کرنے والوں کے دلوں کو مشوش وپریشان کر دیتے ہیں، اسی لئے پہلے ثُلث میں فرض نماز مقرر ہوئی ہے، اور دوسر ثُلث میں اکثر غفلت کی نیند ہوتی ہے، اور فاسد خیالات، پریشان خواب عادات اور ھواجسِ نفسانی کی وجہ سے ظاہر ہوتے ہیں اور دعاء ومناجات اور حضوری کی لذت سے غافل کر دیتے ہیں۔

اور رات کا آخری حصہ ان دونوں خرابیوں سے محفوظ ہوتا ہے اس لئے تہجد اور بارگاہِ الٰہی میں التجاو زاری اور دعا ومناجات کے لئے مقرر ہوا ہے۔

تمام ملائکہ وارواح کا نزول ہوتا ہے یا بعض کا

علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ ملائکہ وارواح سے مراد سب ہیں، جیسا کہ قرآن کے ظاہر سے یہی معلوم

ہوتا ہے یا صرف وہ مراد ہیں جو سدرۃ المنتہیٰ میں رہتے ہیں، چنانچہ بعض احادیث سے یہی معلوم ہوتا ہے۔

بہر صورت اس پر سب کا اتفاق ہے کہ جبرئیل علیہ السلام کا نزول ہوتا ہے، اور ان کا مقام سدرۃ المنتہیٰ کے اندر ہے، اور ان کے ساتھ تمام ملائکہ وارواح نازل ہوتی ہیں اور اس رات ہر عبادت کرنے والے کے ساتھ جبرئیل علیہ السلام مصافحہ کرتے ہیں۔

شب قدر کو جبرئیل علیہ السلام کا عبادت کرنے والے کے ساتھ مصافحہ کی علامت

اور جبرئیل علیہ السلام کے مصافحے کی علامت یہ ہے کہ عین عبادت کے دوران آدمی کے بدن کے بال کھڑے ہو جاتے ہیں دل میں رقت پیدا ہو جاتی ہے اور آنکھوں سے آنسو نکل آتے ہیں، اور اس عبادت میں انتہائی درجے کی لذت حاصل ہوتی ہے۔

شب قدر قبولیت دعاء کا وقت

اس رات کی خصوصیات میں سے یہ بھی ہے کہ اس رات دعاء قبول ہوتی ہے، اس لئے ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس رات ایسی دعا مانگے جو اس کی دنیا و آخرت کی تمام بھلائیوں کو شامل ہو، چنانچہ صحیح حدیث میں ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اگر میں لیلۃ القدر کو پاؤں تو کیا دعاء مانگوں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ دعاء مانگو "اللھم انک عفو تحب العفو فاعف عنی"

اور یہ بھی حدیث ہے "من قام لیلة القدر ایمانًا و احتسابًا غفرله ما تقدم من ذنبه" کہ جس نے شب قدر کو ایمان اور ثواب کے یقین کے ساتھ عبادت کی اسکے گذشتہ تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

"سَلٰمٌ" الخ کے متعلق بعض علماء کا قول

بعض علماء نے فرمایا کہ "سَلٰمٌ قف هِیَ حَتّٰی مَطْلَعِ الْفَجْرِ" کے معنی یہ ہیں کہ اس رات فرشتے اور روحیں تمام مسلمانوں کی سلام کہتی ہیں اور صاحب کمال لوگوں سے مصافحہ کرتے ہیں، پس یہ آیت ان کے نزولِ کے بیان کے بعد ملاقات کی کیفیت کے بیان میں ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

الحمدلله تم تفسير سورة القدر

مقدمہ سورۃ البینۃ

یہ سورت مکی ہے، اس میں آٹھ (۸) آیات، چورانوے (۹۴) کلمات اور تین سو چھیانوے (۳۹۶) حروف ہیں۔

بیّنہ کا معنی اور سورت کی وجہ تسمیہ

بیّنہ لغت میں ظاہر اور روشن چیز کو کہتے ہیں کہ جس کے دیکھنے کے بعد کام کی حقیقت ظاہر ہو جائے اور اس میں کچھ شک وشبہ باقی نہ رہے، جیسے دعویٰ میں معتبر گواہ ہوتا ہے۔

اس سورت کا نام بیّنہ اس لئے رکھا ہے کہ یہ سورت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود خود اپنی نبوت پر ایک روشن علامت ہے کہ کوئی اور دلیل لانے کی حاجت نہیں ہے۔

جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز وطریقہ، آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حالات، افعال، اقوال، اور اخلاق سے واقف ہوگا تو وہ یقیناً سمجھ لے گا کہ ایسی مقدس ہستی پیغمبری کے لائق ہے اور اس میں جھوٹ وملاوٹ کا کوئی دخل نہیں ہے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بچپن میں یتیم ہو گئے تھے، آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی قوم آپ کی حقیقت سے جاہل وناواقف تھی اور وہ لوگ پاکیزہ آداب واخلاق اور عمدہ طرز وطریقہ سے بالکل واقف نہ تھے، اس کے باوجود ایسے لوگوں کے درمیان آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذات بابرکات کمال حسن اخلاق اور اعلیٰ درجے کے آداب سے مزیّن ہو کر ابھری، اور باوجود اس بات کے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اُمّی محض تھے کبھی مکتب کو دیکھا بھی نہ تھا، مشکل مشکل علوم کی باریکیوں کو بیان فرمانا، اور کلام پر ایسی قدرت کہ الفاظ معجزانہ حد تک فصیح وبلیغ، اور کوئی بات عقل ومروّت کے خلاف ظاہر نہ ہونا پھر ملکی تدبیریں کرنا اور جنگ وصلح کے معاملات حکمت کے قاعدے کے مطابق نبھانا، یہ سب کچھ تعلیم وتعلم کا سلسلہ نہ ہونے کے باوجود پورے کمال کے ساتھ انجام دینا بغیر تائید غیبی، تعلیم الٰہی کے ممکن نہیں ہو سکتا یہی معنی ہیں پیغمبری کے۔

تفسیر سورۃ البینۃ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لَمْ يَكُنِ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِينَ مُنفَكِّينَ حَتّٰى تَأْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ٥

نہ تھے وہ لوگ جو منکر ہیں اہل کتاب اور مشرک باز آنے والے یہاں تک کہ پہنچے اُن کے پاس کھلی بات

بعث سے قبل کے لوگوں اور اس امت کے بعض فرقوں کی ایک جیسی حالت

اس آیت کا حاصل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعث سے پہلے عرب کے لوگ دو قسم کے تھے، ایک قسم تو ان لوگوں کی تھی جو مشرک تھے پھر ان میں بعض صائبین و مجوس کی طرح ستاروں اور آگ کی پوجا کرتے تھے، اور بعض بزرگوں اور نیک لوگوں کے نام کے بتوں کی پرستش کرتے تھے، قریش اور بعض دوسرے جاہل لوگوں کا یہی طریقہ تھا، اور دوسری قسم ان لوگوں کی تھی جو اپنے آپ کو اہلِ کتاب کہتے تھے، پھر ان میں بعض توریت و زبور کی پیروی کا دعویٰ کرتے اور بعض انجیل کو اپنا پیشوا مانتے تھے۔

یہ تمام مختلف فرقے بدترین قسم کی بدعات، فاسد رسومات اور باطل عقائد پر ایسے جمے ہوئے تھے کہ ان کی اصلاح کے لئے کوئی وعظ و نصیحت اثر نہیں کرتا تھا، وہ سب یہی کہتے تھے کہ ہم اپنے طرز عمل، اور آباء و اجداد کے موروثی دین کو اس وقت تک نہیں چھوڑیں گے جب تک ہمارے سامنے اس دین کے باطل ہونے کی کوئی کھلی اور واضح دلیل نہ آجائے، اور آسمانی کتابوں میں پیغمبر آخر الزمان کا ذکر پڑھتے رہتے تھے اس لئے کہتے تھے ہم اس وقت تک اس طریقہ کار پر کاربند رہیں گے جب تک پیغمبر آخر الزمان نہ آجائیں اور وہ ہمیں صحیح طریقہ بتلا نہ دیں۔

بعینہٖ یہی حالت آج اس امت کے بعض فرقوں کی ہوگئی ہے ایک گروہ اپنے آپ کو صوفیاء کہلاتا ہے اور تصوف کے نام پر بدعات میں پھنسا ہوا ہے، ایک گروہ آزاد قسم کے ملحد و بے دین لوگوں کا ہے جو اپنے آپ کو تارک الدنیا کہلاتے ہیں، حالانکہ وہ درجۂ انسانیت سے بھی باہر ہو چکے ہیں، اور انہی میں ایک فرقہ ہے جو اپنے آپ کو اہل بیت کا شیعہ کہلاتا ہے اور باطل عقائد میں گرفتار ہے، اسی طرح

بہت سے ایسے ہیں جنھوں نے علماء کے لبادے میں غلط قسم کے حیلے بتا کر لوگوں کو گمراہی پر ڈالا، ایسی من گھڑت روایتیں بیان کیں جن کی کوئی اصل نہیں اور اصول دین سے صراحتاً مخالف ہیں صرف دنیا کی لالچ میں وہ ایسا کرتے ہیں

پھر اگر ان سب فرقوں کو عقلی و نقلی دلائل سے قائل کیا جائے اور کہا جائے کہ سیدھے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے پر قائم ہو جاؤ اور ان موروثی بدعات کو چھوڑ دو تو وہ ہرگز سمجھنے اور ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتے، بلکہ ہر طرح کے وعظ و نصیحت کے جواب میں وہ آخری بات یہی کہتے ہیں کہ ہم اسی طریقے پر قائم رہیں گے جب تک مہدی علیہ السلام ظاہر ہوتے ہیں اور وہ جو طریقہ ہمیں بتائیں گے اسی پر قائم ہوں گے، اسی طرح بعثت سے قبل کے لوگ بھی کہا کرتے تھے، چنانچہ حکمت الٰہی نے چاہا ایک ایسا پیغمبر آئے جو بذات خود ایک حجت ہو اور اس کا بیان بھی شافی ہو جس کے ذریعہ تمام لوگ جہالت کے مرض سے نجات پا سکیں، چنانچہ اس کا بیان فرماتے ہیں:

رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۝

فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ۝

ایک رسول اللہ کا پڑھتا ہوا ورق پاک، اس میں لکھی ہیں کتابیں مضبوط

ارشاد و ہدایت کے لئے تین چیزیں

تین چیزیں ارشاد و نصیحت میں انتہائی اعلیٰ مقام رکھتی ہیں۔

(۱) ایک شخص خدا کا بھیجا ہوا ہو اور اس کی رسالت، معجزات کے ذریعہ اور اس کے اندر انسانی کمالات کے جمع ہو جانے کی وجہ سے ثابت و متحقق ہو چکی ہو، یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر کما حقہ موجود تھی اس لئے کہ رسالت کی شرائط اور انسانی کمالات کے آخری درجے تک آپ کا پہنچا ہوا ہونا، باوجود اُمّی ہونے کے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) میں مشاہدہ کیا جاتا تھا۔

(۲) دوسری چیز، ایسا کلام غیب سے نازل کیا گیا ہو جس میں اعجاز روشن ہو اور اذکیاء کو اس کی تلاوت میں انوار و برکات محسوس ہوتے ہوں، اور عام کلام کے عیوب مثلاً ٹھٹھہ مذاق، جھوٹ اور تناقض سے پاک ہو، سو یہ صفت قرآن کریم میں جس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم باوجود اُمّی ہونے کے تلاوت

فرماتے تھے واضح اور روشن ہے۔

(۳) تیسری چیز، ایسی کتاب ہو جس میں گذشتہ کتابوں کے مضامین بھی آ گئے ہوں، اس طرح کہ مختصر عبارت میں ان مضامین کو سمیٹ لیا گیا ہو، اور وہ مضامین معلومۃ الصدق ہوں (جن کی سچائی سب کے ہاں مسلّم ہے) اور اس کتاب میں واضح تقریریں دلنشین عبارتوں میں ادا کی گئی ہوں، سو یہ چیز قرآن مجید میں پورے طور پر موجود ہے بلکہ قرآن میں تمام اولین و آخرین کے علوم کا خلاصہ صراحتاً یا اشارۃً موجود ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن کے نزول کے وقت سے لے کر آج تک (مصنفؒ کے زمانے تک) بارہ سو سال سے زیادہ عرصہ گذر گیا ہے، علوم وفنون کے ماہر علماء اس کی عبارتوں اور معانی میں مسلسل غور وفکر کر رہے ہیں اور اپنی اپنی ہمت و استعداد کے مطابق اس سے نئے اور باریک نکات نکال رہے ہیں، (مگر پھر بھی اس کے عجائبات ختم نہیں ہوئے) اور کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

وکل العلم فی القرآن لکن
تقاصر عنہ أفہام الرجال

جب یہ تینوں چیزیں ایک جگہ جمع ہو جائیں تو ارشاد و ہدایت کا اعلیٰ مرتبہ حاصل ہوتا ہے، اب چاہئے یہ تھا کہ یہ سب مخالف گروہ ایسے پیغمبر کے مبعوث ہونے کے بعد اپنے سابقہ آئین اور طریقہائے زندگی کو چھوڑ کر اسی رسول کی اتباع کرتے اور تفرقہ پیدا نہ کرتے مگر نفس وشیطان سے مغلوب ہو کر وہ اسی اختلاف وتفرقہ میں گرفتار ہوئے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ ۝

اور وہ جو پھوٹ پڑی اہل کتاب میں سو جب کہ آ چکی اُن کے پاس کھلی بات

یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام (کی بعثت) کے وقت بھی یہودی بُری بُری بدعات وغلط اعتقادات میں گرفتار تھے، اپنی طرف سے جھوٹی باتیں بنانا اور اللہ کی کتاب میں تحریف جیسے بدترین افعال میں وہ لوگ گرفتار تھے، ایسے وقت میں اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت کے لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو روشن معجزات عطا فرما کر بھیجا، جیسے مُردوں کا زندہ کرنا، مادرزاد اندھوں کو بینا کر دینا وغیرہ لیکن ان لوگوں نے

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آنے کے بعد ایک بہت بڑا اختلاف ڈال دیا۔ کہ ایک گروہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا پیروکار ہونے کا دعویٰ کر کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مخالفت شروع کر دی اور ان کو تکلیف دینے اور قتل کے درپے ہو گئے۔

اور ایک دوسرے گروہ نے اپنا لقب نصاریٰ رکھ کر عیسیٰ علیہ السلام کی مددگاری کا دعویٰ کر دیا، اس طرح ان دونوں گروہوں میں لڑائی، قتل وغارت گری، لعن طعن شروع ہو گئی اور صدیوں تک ان کے درمیان خون خرابہ جاری رہا۔

اللہ کی توفیق وارادے کے بغیر کتاب ورسول ہدایت کا ذریعہ نہیں ہو سکتے

اس آیت کا مقصد یہ ہے کہ پیغمبر کا آنا، اور کتاب کا نازل ہونا اللہ کی توفیق اور ارادے کے بغیر ارشاد وہدایت کے لئے کافی نہیں ہیں۔ لہٰذا چاہئے یہ تھا کہ وہ لوگ (یہود ونصاریٰ) اس کو (رسول وکتاب کو) ہدایت کے اسبابِ مستقلہ گمان نہ کرتے، (یعنی جب عیسیٰ علیہ السلام کو مبعوث فرما دیا تو یہودیوں کو موسیٰ علیہ السلام اور توریت کی پیروی نہیں کرنی چاہئے تھی ان کا یہ سمجھنا کہ موسیٰ علیہ السلام اللہ کے رسول ہیں اور توریت اللہ کی نازل کردہ کتاب ہے لہٰذا یہ دونوں ہدایت کا سبب ہیں یہ غلط تھا، اس لئے کہ یہ ہدایت کے مستقل بالذات سبب نہیں ہیں یہ اسی وقت تک ہدایت کا سبب ہیں جب تک اللہ کا ارادہ ہے، اور جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھیج دیا تو معلوم ہوا کہ اب اللہ کا ارادہ ہدایت دینے میں اِن کے ساتھ ہے، اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد گذشتہ انبیاء وکتب کی یہی صورت ہے)

اسی لئے محققین نے کہا ہے کہ قرآن وپیغمبر کی مثال اچھی اور طاقتور غذاء کی سی ہے کہ وہ تندرست بدن کے لئے قوت کی ترقی وکمال کا ذریعہ بنتی ہے اور یہی غذاء بیمار بدن کو کھلائی جائے تو اس کے مرض کے اضافے کا باعث ہو جائے گی۔ لہٰذا قرآن وپیغمبر علیہ السلام سے مستفید ہونے سے پہلے روح کی صحت وتندرستی کے لئے کوشش کرنی چاہئے کہ تعصب کے فاسد اخلاط ومواد اور جہالت کی رسومات سے اس کو پاک کیا جائے اس کے بعد اس غذائے لطیف سے تقویت حاصل کی جائے۔

اہل کتاب کے تفرقے میں دوسرا احتمال

یہ بھی احتمال ہے کہ اس آیت میں اہل کتاب کے اختلاف وتفرقے سے مراد ان کا وہ تفرقہ ہو جو ان

کے اندر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد پیدا ہوا کہ یہود و نصاریٰ کا ایک گروہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انکار اور آپ کے ماننے والوں کے ساتھ قتال و جدال پر کھڑا ہوا اور ان میں سے ایک گروہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی اختیار کی اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دین کی مدد و نصرت کی۔

اہل کتاب کے تفرقے کا ذکر کرنے اور مشرکین کا نہ کرنے کی وجہ

یہاں صرف اہل کتاب کے تفرقے کے ذکر پر اکتفا کیا اور مشرکین کے تفرقے کو ذکر نہیں فرمایا وجہ اس کی یہ ہے کہ اہل کتاب جو کہ اپنے آپ کو اہلِ علم و دانش کہتے تھے ان سے اس بات کا ہونا بہت تعجب خیز ہے اس لئے اس کو ذکر فرمایا اور مشرکین چونکہ جاہل ہی تھے انبیاء کے طور طریقے سے واقف ہی نہ تھے اس لئے ان کا اختلاف کرنا کوئی خاص تعجب انگیز بات نہیں ہے۔

ایک شبہہ اور اس کا ازالہ

یہاں ایک شبہے کا احتمال تھا اس لئے آئندہ آیت میں اس کا ازالہ فرماتے ہیں، شبہہ یہ ہے کہ اگرچہ معجزات اور روشن و واضح علامات ایک شخص کی حقیقت پر گواہی دیں لیکن جب یہ شخص گذشتہ ان شریعتوں کے خلاف امر و نہی کرے جن پر انبیاء کا اجماع ہو چکا ہے اور ان شریعتوں کو معطل کر دے تو اس کی بات نہیں ماننی چاہئے اور اس کے معجزات و علامات کو محض دنیوی اقبال و سربلندی پر، یا اتفاق پر یا استدراج پر محمول کرنا چاہئے، اس شبہے کے ازالے کے لئے فرماتے ہیں:

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۵ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ ۵

اور اُن کو حکم یہی ہوا کہ بندگی کریں اللہ کی خالص کر کے اُس کے واسطے بندگی
ابراہیم کی راہ پر اور قائم رکھیں نماز اور دیں زکوٰۃ اور یہ ہے راہ مضبوط لوگوں کی

یعنی ان پیغمبروں کو ان کی شریعت میں یہی حکم ہوا تھا کہ وہ اللہ کی عبادت کریں دین کو اسی کے لئے

خاص کرتے ہوئے، اب ان عبادات کی جو خصوصیات و کیفیات یہ پیغمبر بیان کرتا ہے اگر چہ پہلی شریعتوں میں یہ خصوصیات و کیفیات نہ ہوں تاہم (یہ مقصود اصلی نہیں) یہ تو تمہید ہے اللہ کے قرب و وصول کے لئے، اخلاص کو پختہ کرنے اور اللہ تعالیٰ سے حجاب کو دور کرنے کے لئے، اور (ان انبیاء کو یہ حکم ہوا کہ) وہ حنفاء ہو جائیں۔

حنیف لغت میں اس شخص کو کہتے ہیں جو غیر اللہ کی طرف توجہ نہ کرے اور ہر کام میں صرف اللہ کی طرف توجہ کرے، اور یہ کہ وہ نماز قائم کریں، اور زکوٰۃ ادا کریں، اگر چہ اس پیغمبر کی شریعت اور ان کی شریعت میں نماز وزکوٰۃ کے ادا کرنے کی کیفیت مختلف ہو، تاہم یہی مضبوط دین ہے، جو حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر اب تک تمام انبیاء، حکماء اور علماء نے اس کی شرح و تفصیل میں اپنی عمریں صرف کر دی ہیں۔

حاصل کلام

شبہ کے ازالے کا حاصل یہ ہے کہ اس شریعت اور گذشتہ شریعتوں کے درمیان مقاصد اصلیہ میں مطابقت کلی پائی جاتی ہے اگر چہ خصوصیات و کیفیات میں وقت و حالات کے تقاضے کے مطابق فرق ہو، لیکن حقیقت میں مقاصد اصلی میں مطابقت کافی ہے، چنانچہ ہر علم وفن میں یہی ہوتا آیا ہے، جیسے طب یونانی بقراط اور جالینوس کے زمانے سے لے کر بوعلی سینا، محمد زکریا، اور مسیحی کے زمانے تک ایک ہی طرز پر رہی ہے، اس لحاظ سے کہ یونانی طبیبوں کے اُصول مقصودہ وہ ہر زمانے میں محفوظ رہے ہیں ان میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوا ہے۔ چنانچہ سب کہتے ہیں کہ مسہل فاسد مادہ پک جانے کے بعد دینا چاہئے، اور بحران کے دن مریض کو چھیڑنا نہیں چاہئے، اور مرض کا علاج اس کی ضد سے کرنا چاہئے، صحت کی حفاظت اس کی جنس کے ذریعہ کرنی چاہئے وغیرہ۔

اب اگر کوئی متاخرین اطباء کی کتب کو دیکھے اور ان کے اصول مقاصد کو متقدمین کے اصول مقاصد کے مطابق جان لے تو یقیناً وہ ان کی طبابت کو سمجھ لے گا کہ وہ خصوصیات کیفیات زائدہ کے متعلق جو فی الجملہ متقدمین کی طبابت سے فرق و تفاوت رکھتی ہیں وہ ان کی کتب میں پائی جاتی ہیں، بلکہ اگر غور و تامل کرے اور دیکھے کہ حکمت کی جن باریکیوں کی رعایت ان خصوصیات میں کی گئی ہے تو متاخرین کی فضیلت کا قائل ہو جائے گا، اسی لئے کہا گیا ہے "الصناعات تتکامل بتلاحق الأفکار"

یعنی افکار کے پے درپے ملنے سے فنون میں کمال پیدا ہوتا ہے۔

جب اہل کتاب میں سے اختلاف کرنے والوں کا حال بیان کیا گیا تو اب ان دونوں فرقوں کا اللہ کے ہاں ثواب وعذاب کے لحاظ سے جو مقام ہے اس کو بیان فرماتے ہیں:

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ فِىْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ط

اور جو منکر ہوئے اہل کتاب اور مشرک ہوں گے دوزخ کی آگ میں سدا رہیں اُس میں

اگر یہ لوگ کہیں کہ ہم انسان ہیں اور انسان اشرف المخلوقات ہے اور کسی بھی مخلوق کو دنیا و آخرت میں دائمی عذاب نہیں دیا جاتا تو پھر ہم کو (باوجود اشرف المخلوقات ہونے کے) کس لئے دائمی عذاب دیا جاتا ہے تو اس کے جواب میں فرماتے ہیں:۔

اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ ۝

وہ لوگ ہیں سب خلق سے بدتر

اس لئے کہ جب انہوں نے اللہ کے حکم کا انکار کیا رسولوں کی نفی کی، اپنی خواہشات نفسانیہ کو اللہ کے حکموں پر غالب ومقدم رکھا تو یہ ان کی ایسی برائیاں ہیں جو کسی مخلوق میں بھی نہیں پائی جاتی اس لئے یہ سب سے بدتر ہیں چنانچہ سورۂ فرقان میں فرمایا "اولٰئک کالانعام بل ھم اضل سبیلا" یہ کافر لوگ چوپایوں سے بھی گئے گذرے ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ۝

وہ لوگ جو یقین لائے اور کئے بھلے کام وہ لوگ ہیں سب خلق سے بہتر

یہ تمام مخلوق میں سب سے افضل ہیں یہاں تک کہ فرشتوں سے بھی بڑھ گئے ہیں، اس لئے کہ ہر زمانے میں انہوں نے اللہ کی حکمت کو سمجھا اور باوجود نفس کی کشمکش کے انہوں نے اللہ کے حکموں کو نفس کی خواہش پر غالب رکھا وہم کی مخالفت کے باوجود عقل کو اس پر مسلط کئے رکھا تاکہ شکوک وشبہات

درمیان میں نہ آجائیں، یہ بات فرشتوں کو حاصل نہیں ہے اس لئے کہ وہ جزئی احکام کو جانتے ہیں اور ان میں وہم اور نفس ہی نہیں کہ ان کے اعمال یا عقائد میں کوئی نقص واقع ہو۔

انسان اور فرشتے میں سے افضل کون ہے

لیکن یہ بات عام ملائکہ کے اعتبار سے ہے، لیکن ملائکہ میں سے جو خواص ہیں، جیسے حضرت جبرئیل و میکائیل علیہما السلام ان کا مقام و مرتبہ نہایت بلند ہے، ان کو کمالِ احتیاط (۱)، حکمت الٰہی کے اسرار پر غیر متناہی عالموں میں حاصل ہے اور وہ کامل عرفان رکھتے ہیں، اگرچہ ان میں وہم اور نفس کا نہ ہونا بظاہر ان کے ثواب میں نقصان کا سبب معلوم ہوتا ہے لیکن چونکہ انسانوں میں سے عمل کرنے والوں کا ثواب انہی کے فیوض کے شعبوں میں سے ایک شعبہ ہے اس لئے یہ زیادتی (بنی آدم کے ثواب کے نفس و وہم کی مخالفت کی وجہ سے) ان کے مرتبے کے برابر نہیں ہوسکتی۔

مولانا حافظ الدین نسفی کی ''کتاب العقائد'' میں ہے:

”وخواص بنی آدم و هم المرسلون افضل من جملة الملائكة. وعوام بنی ادم و هم الاولياء والزهاد افضل من عوام الملائكة، و خواص الملائكة افضل من عوام بنی آدم“

بنی آدم کے خواص یعنی انبیاء کرام تمام فرشتوں سے افضل ہیں۔ اور عوام بنی آدم جیسے اولیاء و زہاد وہ عام ملائکہ سے افضل ہیں اور ملائکہ کے خواص عوام بنی آدم سے افضل ہیں۔

اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے جو یہ منقول ہے کہ

”المؤمن اكرم على الله من بعض الملائكة عنده“

یہ خالص ملائکہ کے علاوہ دوسرے فرشتوں پر محمول ہے۔

جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ

بدلا اُن کا اُن کے رب کے یہاں باغ ہیں ہمیشہ رہنے کو

اس لئے کہ مختلف زمانوں اور شریعتوں میں اللہ کے امر و نہی اور اس کی حکمتوں کا لحاظ رکھتے ہوئے ہمیشہ اس پر قائم رہے تھے

---

(۱) احتیاط سے مراد حفظ و اتقان ہے یعنی اسرار الٰہی انہیں معلوم و محفوظ ہیں، واللہ اعلم۔ سفیر احمد

تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ

نیچے بہتی ہیں اُن کے نہریں

اس لئے کہ انہوں نے بھی اپنے معارف وحقائق سے اعمال کو اپنے اعضاء و جوارح پر جاری کیا تھا اوران کے اعمال کے انوار ان کے خاندانی سلسلوں میں اوران کے پیروکاروں میں جاری ہیں۔

خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَاۤ اَبَدًا ؕ

سدا رہیں اُن میں ہمیشہ

اس لئے کہ ان کے دل میں بھی حق پر قائم رہنے کی ہمیشہ کی نیت تھی اگرچہ عمر تھوڑی پائی۔

رَضِیَ اللّٰهُ عَنۡهُمۡ وَ رَضُوۡا عَنۡهُ ؕ

اللہ اُن سے راضی اور وہ اُس سے راضی

اس لئے کہ انہوں نے کسی طرح بھی اس کا انکار نہیں کیا، اور خود بھی اس سے راضی ہو گئے اس واسطے کہ مختلف شریعتوں پر ایمان کی وجہ سے ان سب کا ثواب انہوں نے پایا اوران کی طبیعت کا پیمانہ ایسا لبریز ہوا کہ اس میں طلب کرنے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہی،

ذٰلِکَ لِمَنۡ خَشِیَ رَبَّهٗ ۟

یہ ملتا ہے اُس کو جو ڈرا اپنے رب سے

اور یہ بیانِ واضح اس شخص کے لئے ہے جو اپنے پروردگار سے ڈرے، اور کسی لحاظ سے بھی اس کی حکمت یا اس کی شان کا انکار نہ کرے، اور اس کے خوف سے اس کے حکم کو نفس، خواہشوں اور رسومات کی پابندیوں پر مقدم رکھے۔

یہاں مؤمنین کی جزاء کے ساتھ کافروں کی جزاء کو بیان نہیں فرمایا اس لئے کہ "شر البریۃ" کے لفظ سے عقلمند کے لئے ان کے انجام کا حال خود بخود واضح ہو جاتا ہے، دوسرے جب مؤمنین کی جزاء بیان ہوئی تو ان کی ضد (کافر) کی جزاء خود بخود معلوم ہو گئی، "وللعاقل تکفیه الإشارة" عقلمند کے لئے اشارہ کافی ہوتا ہے۔

کفار و مؤمنین کے حال و جزاء کے بیان میں اسلوب کے تغیر میں نکتہ

اس سورت میں کفار کا حال بیان فرماتے ہوئے پہلے ان کی جزاء بیان فرمائی اس کے بعد فرمایا "اولٰئک هم شر البریة" اور مؤمنین کا حال بیان فرماتے ہوئے پہلے فرمایا "اولٰئک هم خیر البریة" اس کے بعد ان کی جزاء بیان فرمائی، اسلوب کے اس تغیر میں نکتہ یہ ہے کہ کفار بُری جزاء پانے کے بعد "شر البریة" کا منصب ان کو حاصل ہوا، ورنہ دنیا میں تو وہ بہت سے مخلوق سے اچھی زندگی بسر کر رہے تھے۔

اور مؤمنین نے تو معرفت کا دروازہ کھلتے ہی نیک کاموں سے اپنے آپ کو آراستہ کرنے کی وجہ سے خیریت کا مقام و مرتبہ حاصل کرلیا، اور ان کو جزائے خیر کا ملنا تو خیریت کے شعبوں میں سے ایک شعبہ ہے۔

ایک شبہہ اور اس کا جواب

یہاں ایک شبہہ ہوتا ہے کہ اسم تفضیل کی اضافت اس بات کو چاہتی ہے کہ مضاف الیہ کا بھی کچھ حصہ اصل صفت کے اندر ہو اگرچہ اسم تفضیل کا موصوف اس میں اس سے بڑھا ہوا ہو یہاں (خیر البریة کی ترکیب میں) نیک مؤمنین کو تمام مخلوق سے بہتر کہا ہے اب اس قاعدے کے مطابق یہ ثابت ہوتا ہے کہ تمام مخلوق میں فی الجملہ خیریت (بہتری) ہے حالآنکہ کافروں اور شیاطین میں تو کوئی خیر نہیں ہے۔

جواب اس شبہے کا یہ ہے کہ یہ تقاضا اس وقت ہوتا ہے جب اسم تفضیل کی اضافت (خاص) مضاف الیہ پر فضیلت و زیادتی کے لئے ہو، لیکن یہاں (اضافت اس لئے نہیں ہے بلکہ) مطلق زیادتی و فضیلت مراد ہے اضافت محض توضیح کے لئے ہے، جیسے یوسف اَحسن اِخوتہ میں ہے۔ اس صورت میں مضاف الیہ کے اندر اصل صفت کے فی الجملہ پائے جانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ واللہ اعلم بالصواب

مقدمہ سورۂ زلزلت

یہ سورت مکی ہے، اس میں آٹھ (۸) آیات، ترپن (۵۳) کلمات اور ایک سو انچاس (۱۴۹) حروف ہیں۔ اس سورت کا نزول منکرین قیامت کے جواب میں ہوا جو پوچھا کرتے تھے کہ قیامت کب ہوگی؟

تفاسیر میں ہے کہ یہ سورت رات کا ایک حصہ گذر چکا تھا کہ نازل ہوئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح کا انتظار بھی نہیں فرمایا اسی وقت گھر سے باہر تشریف لائے اور صحابۂ کرامؓ کو اس کی تلاوت سنائی۔

اس سورت کی اہمیت

اس سورت میں ایک آیت ایسی ہے گویا وہ تمام قرآن کا خلاصہ ہے اور شریعت کے تمام احکام کو جامع ہے، وہ اس کی آخری آیت ہے، ہر اچھے یا برے عمل کی جزاء پر دلالت کرتی ہے۔

صحیح حدیث میں ہے کہ یہ سورت چوتھائی قرآن کے برابر ہے۔

وجہ تسمیہ

اس سورت کا نام زلزلت اس لئے رکھا ہے کہ یہ قیامت کے دن ایک حادثۂ عظیم کے واقع ہونے پر دلالت کرتی ہے۔

قیامت کے زلزلے کا سبب

اور اس زلزلے کا سبب تین چیزیں ہیں، پہلی اس تجلی الٰہی کی عظمت ہے جو زمین پر واقع ہوگی اس تجلی کی وجہ سے زمین کے اجزاء ٹوٹ پھوٹ کر بکھر جائیں گے، جیسا کہ اس کا نمونہ کوہ طور پر ظاہر ہو چکا ہے۔

قال تعالیٰ "واشرقت الأرض بنور ربّها" وقال " فلمّا تجلی ربّه للجبل جعله دکا"

دوسری چیز گنہگاروں پر غضب الٰہی کا جوش اور مُردوں کو قبروں سے اُٹھانے کی صورت میں اس کے شانِ انتقام کا ظہور ہے، اور یہ بات زمین کو ہلا ہلا دینے کے بغیر ممکن نہیں تاکہ ہر مُردے کے اجزاء جُدا جُدا معلوم ہو جائیں۔

تیسری چیز، نفخۂ ثانیہ کی تند و تیز آواز ہے جو ہوا میں تموّج پیدا کر کے شدید جھونکوں کا سبب ہوگی اور ہوا پوری شدت سے زمین کے مسامات و مخارج میں داخل ہوگی جس سے زمین کے اندر زلزلہ پیدا ہوگا۔

اور چونکہ یہ زلزلہ قیامت کے واقعات میں سے ایک عظیم واقعہ ہے اس لئے اسی کے نام پر اس سورت کا نام رکھ دیا، (زلزلت/ زلزال)

تفسیر سورۂ زلزال

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ۝

جب ہلا ڈالے زمین کو اُس کے بھونچال سے

زمین کے ہلانے میں مبالغہ کیا جائے گا، اور اتنی ہلائی جائے گی کہ جتنی وہ ہلنے کا تحمل کر سکے، یہاں تک کہ زمین پر کوئی عمارت، پہاڑ، اور درخت باقی نہیں رہے گا اس کی تمام بلندیاں اور پستیاں برابر ہو جائیں گی، اور زمین کی موجودہ صورت بدل جائے گی، اور یہ واقعہ نفخۂ ثانیہ کے قریب ہوگا۔

وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ۝

اور نکال باہر کرے زمین اپنے اندر سے بوجھ

یعنی اس بڑے زلزلے کی وجہ سے زمین اپنے پیٹ میں جو کچھ ہے وہ باہر نکال دے گی، جیسے مُردے، خزانے، دانے، گٹھلیاں وغیرہ سب باہر پھینک دے گی، اور مُردوں کے باہر نکل آنے کی وجہ سے ارواح کا جو تعلق زمین کے اندرون کے ساتھ تھا اس لئے کہ وہ ان کے اجسام کا ٹھکانا تھا وہ تعلق ٹوٹ جائے گا۔

وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَالَهَا ۝

اور کہے آدمی اُس کو کیا ہو گیا

انسان سے مراد یا ان کی روحیں ہیں، یا پھر انسان زندہ ہونے کے بعد اس زلزلے کے آثار جب دیکھے گا تو کہے گا:

یَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ○

اُس دن کہہ ڈالے گی وہ اپنی باتیں

یعنی انسانوں کے افعال کو ظاہر کرے گی، یوں کہے گی کہ فلاں شخص نے مجھ پر نماز پڑھی تھی، فلاں نے روزہ رکھا تھا، اور فلاں نے فلاں نیک کام کیا تھا، اسی طرح فلاں نے ناحق خون کیا تھا، فلاں نے زنا کیا تھا، اور فلاں نے چوری کی تھی اور فلاں نے فلاں بُرا کام کیا تھا۔

اس دن زمین کے بولنے میں حکمت

زمین کے اس کہنے میں دو حکمتیں ہیں، ایک تو یہ کہ لوگوں پر اس کی گواہی ہو جائے، تاکہ انکار کرنے کی گنجائش کسی کو نہ رہے، اسی لئے آسمان، دن، رات اور آدمی کے اپنے ہاتھ پاؤں یہ سب اس دن انسان کے اچھے بُرے اعمال پر گواہی دیں گے۔

دوسرے تاکہ زمین کی اس گواہی سے بدکاروں کی رسوائی ہو، نیک لوگوں کی تعریف واچھائی ثابت ہو جائے۔

اس بات کی تحقیق کہ تمام جمادات میں بھی روح ہے

یہاں بعض لوگوں کو شبہ ہوتا ہے کہ زمین تو ایک جامد اور بے عقل چیز ہے یہ گواہی کیسے دے گی اور باتیں کس طرح کرے گی؟

تو تحقیق یہ ہے کہ مخلوقات میں سے ہر چیز کے اندر روح ہے، البتہ (حیوانات کی ارواح اور دیگر مخلوقات کی ارواح میں فرق یہ ہے کہ) حیوانات کی روح اپنے بدن کے ساتھ تدبیر وتصرف کا تعلق رکھتی ہے، اس وجہ سے وہ ہر وقت کھانے، بڑھنے، اور حرکات کرنے میں مشغول رہتے ہیں، اور دوسری مخلوقات کی ارواح تدبیر وتصرف کا تعلق ان کے ساتھ نہیں رکھتی، اس وجہ سے ان چیزوں میں احساس اور اختیاری حرکت دائمی نہیں ہوتی، اسی وجہ سے ان چیزوں کے ساتھ روح کا تعلق عام لوگوں کی نظر سے پوشیدہ رہتا ہے، اس کے باوجود خرقِ عادت کے طور پر ان سے یہ باتیں کبھی کبھی ظاہر ہو جاتی ہیں، چنانچہ ایسے واقعات احادیث میں تواتر کے ساتھ ثابت ہیں، جیسے درختوں اور کنکریوں کا بولنا، استوانہ حنّانہ کا بلند آواز سے رونا، اور ایک پہاڑ کا دوسرے پہاڑ سے پکار کر پوچھنا:

"هل مرّبک احد یذکر الله" کیا تجھ پر سے اللہ کا ذکر کرنے والا کوئی گذرا ہے۔

اور تمام مخلوقات کے لئے ارواح کا ہونا قرآن مجید میں سورۂ یٰسین میں ذکر کیا گیا ہے:

"فسبحان الذی بیده ملکوت کل شیٔ"

اور سورۂ اسراء میں بھی ذکر کیا گیا ہے، چنانچہ فرمایا:

"وإن من شیٔ الا یسبح بحمده ولکن لا تفقهون تسبیحهم"

اسی طرح مؤمن کی موت پر زمین وآسمان کا رونا حدیث سے ثابت ہے، اسی طرح اذان دینے والے کے حق میں زمین، پتھروں اور درختوں کا گواہی دینا بھی حدیث سے ثابت ہے، چنانچہ مولانا رومی رحمہ اللہ مثنوی میں فرماتے ہیں

بادر اگر چشم در بینش نداد — فرق چوں میکرد اندر قوم عاد
آتشِ نمرود را اگر چشم نیست — ما خلیلش چوں ترحم کرد دیست
گرنبودی نیل را آن نور دید — ازچہ کافر راز مومن میگزید
گر نہ کوہ و سنگ بادیدار شد — پس چرا داؤد را او یار شد
ایں زمین را اگر نبودے چشم جان — از چہ قاروں را فرد خورد آنچناں
گر نبودی چشمِ دل حنّانہ را — چوں بدیدی ہجر آں فرزانہ را
در قیامت ایں زمین از نیک و بد — کہ زمادیدہ گواہی ہا دہد

جب یہ بیان فرمایا کہ زمین اس دن لوگوں کے اعمال کو ظاہر کرے گی اور ان کے اچھے بُرے اعمال پر گواہی دے گی تو گواہی دینے میں جھوٹ کا بھی احتمال ہوتا ہے اس لئے اس احتمال کو رفع کرنے کے لئے آگے ارشاد فرماتے ہیں:

بِاَنَّ رَبَّکَ اَوْحٰی لَهَا ؕ

اس واسطے کہ تیرے رب نے حکم بھیجا اُس کو

یعنی زمین کا یہ اظہار انسانوں کے ساتھ عداوت ودشمنی کی وجہ سے نہیں ہے، کہ اس میں جھوٹ کا احتمال ہو، اس لئے کہ تمام انسان گویا زمین کے بچے ہیں، اور اپنے بچوں سے عداوت نہیں ہوتی، اور نہ ہی نفس کی خواہش کا اس میں دخل ہے، اس لئے کہ زمین میں نفس ہی نہیں ہے، بلکہ اس کا یہ عمل صرف اللہ

کے حکم کی وجہ سے ہے، اور جو بات مالک کے حکم سے ہوا کرتی ہے اس میں جھوٹ کا دخل نہیں ہوتا۔

جب اس قدر ظاہر ہو چکا کہ انسان اپنے جن اعمال کو ایک دوسرے سے چھپاتے ہیں وہ قیامت کے دن زمین کے ظاہر کرنے سے سب پر ظاہر ہو جائیں گے، جس کے نتیجے میں بدکار رسوا اور نیکوکار سرخرو ہوں گے تو اب یہ بیان فرماتے ہیں کہ اسی پر اکتفا نہ ہوگا بلکہ:

يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا ۵

اُس دن ہو پڑیں گے لوگ طرح طرح پر

یعنی الگ الگ گروہ ہوں گے جیسے ایک گروہ شرابیوں کا، ایک زانیوں کا اور ایک گروہ چوروں کا، وعلیٰ ھذا القیاس

لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ ۵

کہ اُن کو دکھا دیئے جائیں اُن کے عمل

تا کہ میدان حشر میں بدکاروں کو ایک رسوائی اور نیکوکاروں کو سرخروئی حاصل ہو، اس طرح سے یہ معاملہ ہوگا کہ ان کے اعمال نامے کھولیں گے، اور ان کے اعمال کو تولا جائے گا، پس اس وقت انتہائی کمال درجے کا ظہور ہوگا (لوگوں کے اعمال کا) چنانچہ اس کی تفصیل ان دو آیتوں میں ہے:

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۵

سو جس نے کی ذرّہ بھر بھلائی وہ دیکھ لے گا اُسے

ذرہ برابر بھی جس نے نیکی کی ہوگی اس کو اعمالنامے میں اور میزان میں دیکھے گا۔ ''ذرہ'' کا لفظ دو معنوں کے لئے آتا ہے، ایک چھوٹی سرخ چیونٹی کو بھی ذرہ کہتے ہیں دوسرے ریت میں جو چمکتا ہے۔

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۵

اور جس نے کی ذرّہ بھر بُرائی وہ دیکھ لے گا اُسے

ایک شبہے کا جواب

یہاں ایک شبہہ ہوتا ہے کہ کافروں کی نیکی جزا کے قابل تو نہیں ہوگی پھر دیکھنے سے کیا فائدہ ہوگا؟

تو جواب اس کا یہ ہے کہ کافر کی نیکی اگر چہ اس کو مکمل عذاب سے رہائی کا ذریعہ تو نہ ہوگی تاہم اس کی تاثیر سے عذاب میں کچھ تخفیف ہو جائے گی، لہٰذا اس کا دیکھنا مفید ہوا۔

اسی طرح مؤمن کی بدی اور گناہ اگر چہ معاف کر دیا گیا ہو پھر بھی وہ تاثیر سے خالی نہیں چاہے صرف درجے میں کمی ونقصان اس سے واقع ہو۔

ہاں البتہ صرف وہ بدی اور گناہ جس سے ندامت وتوبہ کر چکا ہے وہ اعمال کے صحیفے سے نکل جاتی ہے، اور کراماً کاتبین اور گواہوں سے بھی بھلا دی جاتی ہے۔ لہٰذا "من یعمل" کے الفاظ اس گناہ کے علاوہ باقیوں کے لئے مخصوص ہوں گے۔ یا یوں کہا جاسکتا ہے کہ جس گناہ پر ندامت وتوبہ ہو چکی ہے تو چونکہ توبہ وندامت خود ایک بہت بڑا نیک عمل ہے اس لئے توبہ وندامت کو دیکھنا یا اس بدی کو دیکھنا کسی نقصان کا موجب نہ ہوگا، اسی لئے توبہ کرنے والوں کے حق میں فرمایا ہے:

"فاولئک یبدل الله سیئا تھم حسنات" یعنی توبہ کرنے والوں کو ان کے گناہ توبہ کے ضمن میں دکھائے جائیں گے تو وہ گناہ نیکیوں کی صورت میں ہوں گے۔ واللہ اعلم

حدیث میں آتا ہے ایک آدمی نے آکر عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے قرآن سکھایئے تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا اس کو قرآن سکھاؤ، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کو سورۂ زلزلت سکھائی جب اس آیت پر پہنچے تو وہ کہنے لگا:

"حسبی حسبی لا أبالی أن لا أسمع غیرھا"

بس میرے لئے کافی، مجھے کوئی پرواہ نہیں اگر میں اس کے سوا اور کچھ نہ سنوں،

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ واقعہ بیان کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "دعه فقد فقه الرجل" اس کو چھوڑ دو، یہ فقیہ اور دانا آدمی ہے۔

یہ بھی حدیث میں آتا ہے کہ مدینے کے دو آدمیوں نے اس آیت سے عبرت پکڑی تھی، ایک تو وہ تھا جو صدقہ نہیں کیا کرتا تھا، کہتا تھا میں صدقہ دینے کے قابل نہیں ہوں، اور تھوڑی چیز دیتے ہوئے بے ادبی معلوم ہوتی ہے، اور دوسرا وہ تھا جو چھوٹے چھوٹے گناہوں کی پرواہ نہیں کیا کرتا تھا، جیسے بے ہودہ اور فضول باتیں، فضول نظر، وغیرہ اور یہ سمجھتا تھا کہ ایسی باتوں پر پکڑ نہ ہوگی۔

ان دونوں کے خیال کی تردید کے لئے یہ دو آیتیں کافی ہو گئیں۔

مقدمہ سورۃ العادیات

یہ سورت مکی ہے، اس میں گیارہ (۱۱) آیات، چالیس (۴۰) کلمات، اور ایک سو تریسٹھ (۱۶۳) حروف ہیں۔

''عادیات'' دوڑتے ہوئے گھوڑوں کو کہتے ہیں، یہ ''عَدْوٌ'' سے مشتق ہے جو دوڑنے کے معنی میں آتا ہے۔

وجہ تسمیہ

اس سورت کا نام ''عادیات'' اس لئے رکھا کہ مجاہدین کے گھوڑے کافروں کی ناشکری پر غضب الٰہی کی سرعت کی ایک شکل ہے، اور دنیا میں نافرمانوں پر اللہ کے انتقام کا ظہور دوڑتے ہوئے گھوڑوں کی صورت میں ہوتا ہے، پس گویا یہ حشر ونشر کا نمونہ ہے۔

چنانچہ دشمن کی فوج کے حملہ کرنے اور اپنی فوج کی شکست کے نتیجے میں جو کچھ انقلاب ملک وشہر میں ہوتا ہے، کہ عزت والے ذلیل ہو جاتے ہیں، پردہ نشین بے پردہ ہو جاتی ہیں اور سالہا سال کا جمع کیا ہوا مال واسباب ایک لمحے میں برباد ہو کر رہ جاتا ہے تب قیامت کا منظر ہوتا ہے، تو چونکہ یہ حالت قیامت کو یاد دلانے والی ہے اس لئے اس کی قَسم کھائی اور اسی پر سورت کا نام رکھ دیا۔

شان نزول

اس کے نزول کے سبب کے بارے میں مفسرین نے کہا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منذر بن عمر انصاری رضی اللہ عنہ کو سواروں کا ایک دستہ دے کر بنو کنانہ کے قبیلے کی سرکوبی کے لئے بھیجا جو بڑے شدید کافر تھے، اور حکم دیا کہ فلاں دن صبح کے وقت ان پر شب خون مارنا اور قرار واقعی سزا دینا۔

اتفاق سے اسلامی لشکر کے راستے میں ایک ندی تھی جو چڑھی ہوئی تھی اس کے اترنے کے انتظار میں ان کو ایک دن کی تاخیر ہوئی اور وہ مقررہ دن میں وہاں نہ پہنچ سکے، ندی کے اترنے کے بعد علی الصبح اسلامی لشکر نے بنو کنانہ کے اس قبیلے پر چڑھائی کردی، اور ان کی اچھی طرح سرکوبی کرنے کے بعد غنیمت کے ساتھ صحیح سالم واپس لوٹ آیا، لیکن چونکہ ایک دن کی درمیان میں تاخیر ہوگئی تھی اسی لئے

واپسی میں بھی ایک دن تاخیر ہوگئی تو منافقین نے یہ افواہ اُڑادی کہ تمام لشکر تباہ ہوگیا ہے اور ایک آدمی بھی ان میں زندہ نہیں بچ سکا جو واپس آکر خبر دیتا۔ مسلمانوں کو اس خبر سے بہت ہی صدمہ ہوا، تو اس موقعہ پر اللہ تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمائی اور مجاہدین کے گھوڑوں کا اور دشمن کی صفوں میں ان کے گھس جانے کا تذکرہ کیا گیا تاکہ مسلمانوں کو تسلی ہو۔

لیکن اس واقعے کو شانِ نزول قرار دینا مخدوش ہے، اس لئے کہ یہ سورت مکی ہے، اور یہ واقعہ مدینہ کا ہے، لہٰذا یہ اس کا شانِ نزول نہیں ہوسکتا، اس لئے اصح بات یہ ہے کہ باری تعالیٰ نے جب یہ چاہا کہ اس دین میں ''جہاد'' کا عمل بھی رکھا جائے تو (مکی زندگی میں ہی) اس سورت میں اس کی طرف اشارہ کردیا، تاکہ مسلمانوں کو خوشخبری ہو کہ عنقریب ان کو جہاد کی اجازت عطا ہوگی اور ان کو گھوڑوں، فوج اور لشکروں کی قوت عنایت ہوگی، تاکہ وہ اللہ کے دشمنوں سے پورا پورا بدلہ اتاریں، ان کی جمعیت واتحاد کو بکھیر دیں اور ان کے ملک و مال کو اپنے تصرف میں لاسکیں۔

تفسیر سورۃ العادیات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا ۝

قسم ہے دوڑنے والے گھوڑوں کی ہانپ کر

جانوروں کی عادت ہے کہ وہ دوڑتے ہوئے پیٹ سے آواز نکالتے ہیں جس کو اردو میں ''ہانپنا'' کہتے ہیں۔

فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا ۝

پھر آگ سلگانے والے جھاڑ کر

یعنی پہاڑوں اور پتھریلی زمین میں جب ان کے نعل پتھروں پر رگڑ کھاتے ہیں تو شعلے نکلتے ہیں، جیسے چقماق پتھر پر رگڑنے سے شعلے نکلتے ہیں، اور آگ کی چمک رات کو زیادہ ہوتی ہے دن کو روشنی

میں اس کی چمک نظر نہیں آتی اسلئے اس قسم میں اشارہ ہوگا اس بات کی طرف کہ مجاہدین کے گھوڑے رات کو دوڑیں گے۔

فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا ۝

پھر غارت ڈالنے والے صبح کو

یعنی رات کو دوڑتے ہیں اور صبح کے وقت جو غفلت کا وقت ہے دشمن پر چڑھائی کر دیتے ہیں اور اس کو شکست دے کر غنیمت و فتح سے کامیاب ہوتے ہیں۔

فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا ۝

پھر اُٹھانے والے اُس میں گرد

یہ فعل اس فعل پر معطوف ہے جو "المغیرات" سے مفہوم ہوتا ہے یعنی "اغرن صبحًا" اور اسم سے فعل کی طرف عدول کی وجہ یہ ہے کہ غبار کا اُٹھنا دشمن کے نزدیک ہونے کے وقت ہوتا ہے اور تھوڑی سی دیر کے لئے اُٹھا پھر ختم ہو جاتا ہے (اس میں دوام نہیں ہوتا اس لئے فعل کو لائے کہ وہ حدوث پر دلالت کرتا ہے، دوام پر نہیں جبکہ اسم دوام واستمرار پر دلالت کرتا ہے) لیکن دشمنوں کے خلاف لوٹ مار وہ ایک گھڑی کا کام نہیں اس میں استمرار اور دوام ہوتا ہے، (اس لئے وہاں اسم المغیرات لائے)

صبحًا کی قید کا فائدہ

غبار اُٹھانے کو صبح کے وقت کے ساتھ خاص طور پر اس لئے مقید کیا کہ گھوڑوں کے ٹاپ مارنے کی قوت ظاہر کرنا مقصد ہے، اس لئے کہ رات کے آخری حصے کی سردی اور شبنم گرنے کی وجہ سے گرد بیٹھ جاتی ہے اور زمین میں نمی پیدا ہو جاتی ہے، جس کی وجہ سے صبح کے وقت اس سے غبار اُٹھانے کے لئے معمولی ضرب کافی نہیں ہوتی، گرد وغبار ایسی ضرب سے اُٹھے گا جو بہت زوردار ہو، اس کے مقابلے میں دن کے آخری حصے میں سورج کی گرمی وحرارت کی وجہ سے زمین میں خشکی پیدا ہو کر اس کے اجزاء ڈھیلے پڑ جاتے اس لئے تھوڑی سی حرکت سے بھی گرد وغبار اُٹھ جاتا ہے اسی لئے آندھیاں دن کے آخری حصے میں زیادہ آتی ہیں۔

فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا ۝

پھر گھس جانے والے اُس وقت فوج میں

گھوڑوں کی یہ حرکات قہرِ الٰہی کے مشابہ اور اس کا نمونہ ہیں

اب یہاں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ گناہوں پر قہرِ الٰہی کی جو صورت ہوتی ہے وہ گھوڑوں کی ان حرکات کے بہت مشابہ ہے، اور یہ گویا اس کا نمونہ ہیں، اس لئے اس قہر کی ابتداء غضب کا متوجہ ہونا ہے، جس کا نمونہ یہاں پر ہانپتے ہوئے گھوڑوں کا دوڑنا ہے جیسے غصّے کے وقت ہوتا ہے اور سموں سے آگ کے شعلے نکالنا یہ دوزخ کے شعلوں کا نمونہ ہے جو دوزخیوں کے لئے تیار کئے گئے ہیں اور لوٹ مار جہنم کے داروغوں کی مار پیٹ، سانپ بچھوؤں کے کاٹنے اور جسم، گوشت کے جلنے کا نمونہ ہے، اور غبار کا اُٹھانا نمونہ ہے ناشکروں کی آنکھوں پر پردہ ڈالنے کا کہ اس پردے کی وجہ سے ان سے رحمتِ الٰہی پوشیدہ ہو جائے گی، اور دشمن کے ہجوم میں گھس جانا نمونہ ہے غضب کی آگ کے دل وجگر کے اندر گھس جانے کا، سو اس قہرِ الٰہی کے نمونے کی قسم اس بات پر کھائی ہے کہ:

اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ ۝

بیشک آدمی اپنے رب کا ناشکرا ہے

کفرانِ نعمت کی صورتیں

یعنی انسان اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کرتا ہے، اور یہ کفرانِ نعمت کئی طرح سے ہوتا ہے، ایک صورت یہ ہے کہ نعمت کو نعمت دینے والے کی طرف سے سمجھے ہی نہیں بلکہ نعمت کی نسبت دوسرے کی طرف کرے، جیسے اس زمانے کے اکثر لوگ کہتے ہیں کہ ہم کو بیٹا فلاں پیر نے دیا ہے، یا ہماری مصیبت فلاں بزرگ نے دور کی ہے، دوسری صورت کفرانِ نعمت کی یہ ہے کہ جس مقصد کے لئے وہ نعمت دی گئی ہے اس سے وہ فائدہ نہ اُٹھائے بلکہ اس کی ضد میں اس کو استعمال کرے یعنی نعمت کو گناہ کا ذریعہ بنائے، تیسری صورت کفرانِ نعمت کی یہ ہوتی ہے کہ آدمی کے دل میں نعمت کی محبت اس قدر غالب ہو جائے کہ وہ اسی میں غرق ہو جائے اور نعمت عطا کرنے والے کو بھول جائے جیسے دنیا دار لوگوں کے دلوں میں دنیا کی محبت

ایسی غالب ہو جاتی ہے کہ وہ دن رات اسی کی فکر میں اُلجھے رہتے ہیں یہاں تک کہ اللہ کے احکام کو بھی بھول جاتے ہیں۔

وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ ۝

اور وہ آدمی اُس کام کو سامنے دیکھتا ہے

یعنی انسان اپنے ناشکرا ہونے کا خود اقرار کرتا ہے، اور دنیا میں اس اقرار کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ایک دوسرے کو کہتا ہے فلاں ناشکرا ہے، حالآنکہ وہ خود بھی نعمتوں کا شکرادا نہیں کر رہا ہوتا تو دوسروں پر طعنہ کرنا بعینہٖ اپنی ذات پر بھی ہے۔

وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ۝

اور آدمی محبت پر مال کی بہت پکا ہے

یعنی اس کے دل میں مال کی اتنی محبت گھس گئی ہے کہ منعم کی محبت کی گنجائش ہی اس میں نہیں رہی۔

اور اگر کوئی کہے کہ میں ناشکرا نہیں ہوں اور میرے دل میں مال کی محبت نہیں ہے، تو اس کا یہ انکار اللہ کے سامنے نہیں چل سکتا اس لئے کہ:

اَفَلَا يَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِى الْقُبُوْرِ ۝

کیا نہیں جانتا وہ وقت کہ کُریدا جائے جو کچھ قبروں میں ہے

یعنی جب مُردے زندہ کئے جائیں گے اور جو کچھ زمین کے اندر ہے وہ اوپر آ جائے گا، اس طرح پوشیدہ اور مخفی چیزوں کا ظہور و رونمائی شروع ہو جائے گی جس کی انتہا بالآخر اندر کے اخلاق، دل کی نیتوں، اور پوشیدہ عقیدوں کے ظہور پر ہوگی، چنانچہ فرماتے ہیں:

وَحُصِّلَ مَا فِى الصُّدُوْرِ ۝

اور تحقیق ہووے جو کچھ کہ جیوں میں ہے

پھر ان اخلاق و اعمال کو حسّی صورتیں عطا فرما کر سامنے لائیں گے تا کہ سب لوگ ایک دوسرے کے چھپے ہوئے رازوں سے واقف ہو سکیں اور اس وقت ہر شخص یہ جان لے گا کہ:

اِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيْرٌ ○

بیشک اُن کے رب کو اُن کی اُس دن سب خبر ہے

یعنی اس کا رب آج اس کے حال سے باخبر ہے اس کے سامنے انکار کی گنجائش نہیں ہے، اگرچہ اللہ تعالیٰ کا علم ہر وقت بندے کے ظاہر و باطن پر محیط ہے لیکن اس دن بندے پر اس بات کا علم ظاہر ہو جائے گا اور انکار کی گنجائش نہیں رہے گی۔

فائدہ:۔

"انّ ربھم" کا جملہ "افلا یعلم" کے مفعول کے محل میں واقع ہے لیکن "لخبیر" کے لام کی وجہ سے لفظوں میں عمل ظاہر نہیں ہوا ورنہ "انّ" کے ہمزہ کو مفتوح پڑھتے، نحویین اس بات کو تعلیق باللام کہتے ہیں، اور یہ افعال قلوب کے خصائص میں سے ہے۔

کنود کا معنی

حدیث میں آتا ہے لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے "کنود" کا معنی پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کنود وہ شخص ہے جو اکیلا کھائے، غلام کو مارے اور عیال کو بھوکا رکھے۔

الحمدللہ

مقدمہ سورۃ القارعۃ

یہ سورت مکی ہے، اس میں آٹھ (۸) آیات، چھتیس (۳۶) کلمات، اور ڈیڑھ سو (۱۵۰) حروف ہیں۔

وجہ تسمیہ

اس سورت کا نام قارعۃ اس لئے رکھا کہ یہ قیامت کے دن واقع ہونے والے ایک شدید حادثے پر دلالت کرتی ہے جس سے دلوں کو بہت دہشت پہنچے گی، اس حادثے کے اثر سے بھاری جسم ہلکے پڑ جائیں گے اور سخت جسم ریزہ ریزہ ہو جائیں گے، اجزاء کے اندر سے اتصال وتماسک ختم ہو جائے گا، اور کسی بھی چیز کا ثقل جو اس چیز کے اپنی جگہ قائم ومحفوظ رہنے کا سبب تھا باقی نہیں رہے گا اور نہ ہی اس کے اجزاء کی صلابت وسختی ہی رہے گی جو ان کے مجتمع رہنے کا موجب تھی۔

پھر جب دنیا کے قاعدے کے مطابق جو ثقل وخفت اور جمع وتفرق تھا وہ درہم برہم ہو گیا تو اب اس جہاں میں ایک اور طرح کا ثقل وخفت اور جمع وتفرق دوسرے ہی رنگ وخصوصیات کے ساتھ ظاہر ہوگا، چنانچہ وہاں کا ثقل جنت کے درجات میں اوپر چڑھنے اور بلند ہونے کا باعث ہوگا، اور خفت وہلکا پن دوزخ کی گہرائیوں میں نیچے گرنے کا سبب ہوگا، جبکہ دنیا کا قاعدہ یہ تھا کہ بوجھ وثقل نیچے ہونے کا سبب ہوتا اور خفت وہلکا پن بلندی کا سبب ہوتا تھا اس قسم کے انقلابِ عظیم سے ڈرانا قرآن کے مقاصد میں سے ایک بڑا مقصد ہے۔

تمت المقدمہ والحمدللہ

تفسیر سورۃ القارعۃ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْقَارِعَةُ ۝ مَا الْقَارِعَةُ ۝

وہ کھڑکھڑا ڈالنے والی، کیا ہے وہ کھڑکھڑا ڈالنے والی

یعنی قیامت جو دلوں کو بہت بڑا صدمہ پہنچائے گی اور بلند کو پست اور پست کو بلند کر دے گی، اس کی

حقیقت کیا ہے، یہ انقلاب اس میں کس سبب سے ہوگا؟

وَمَآ اَدۡرٰکَ مَاالۡقَارِعَةُ ۝

اور تو کیا سمجھا کیا ہے وہ کھڑکھڑا ڈالنے والی

ہر چیز کی پہچان اسکے اسباب کے جاننے سے ہوتی ہے اور قیامت قائم ہونے کا بڑا سبب قہر الٰہی کی تجلی ہے جو کسی بشر کو معلوم نہیں اس واسطے اس کے بیان کے موقعے پر اس کی بعض تاثیروں پر اکتفا فرماتے ہیں۔

یَوۡمَ یَکُوۡنُ النَّاسُ کَالۡفَرَاشِ الۡمَبۡثُوۡثِ ۝

جس دن ہوویں لوگ جیسے پتنگے بکھرے ہوئے

یعنی لوگ پتنگوں اور پروانوں کی طرح ادھر ادھر بکھرے ہوئے ہوں گے۔

انسانوں کو پتنگوں سے تشبیہ دینے کی وجہ

یہ تشبیہ چار وجہوں سے مرکب ہے۔

(۱) ذلّت (پروانوں کی طرح ذلیل ہوں گے)

(۲) ضعفِ حرکت۔

(۳) حرکت میں بے انتظامی کہ کبھی تیز اور کبھی دھیمی ہوتی ہے۔

(۴) حرکت کی سمت کا متعین نہ ہونا، کہ پتنگوں کی حرکت کبھی دائیں کبھی بائیں کبھی آگے کبھی پیچھے ہوتی ہے (یہ حال اس دن لوگوں کا ہوگا)

ثقل کی دو قسمیں

یہاں پر یہ سمجھ لینا چاہئے کہ جسم میں ثقل دو قسم کا ہوتا ہے۔

(۱) پہلی قسم اعلیٰ اور افضل ہے، یہ ثقل وہ ہوتا ہے جو وقار و تمکین کی وجہ سے مضبوطی کا سبب ہوتا ہے، اس طرح کا ثقل ان جسموں کے ساتھ خاص ہے جن کے ساتھ کامل روح کا تعلق قائم ہوا ہے، اسی لئے جن و انسانوں کو ثقلین کہا گیا ہے۔

جب کوئی عظیم حادثہ روح میں زبردست اثرانداز ہوجاتا ہے تو اس کو حیران کردیتا ہے اور اس سے ثقل دور کردیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے پُروقار و تمکین والے خوف و اضطراب کے وقت غیر اختیاری طور پر بہت ہلکی حرکتیں کرجاتے ہیں، اس لئے کہ حادثے کی دہشت کی وجہ سے ان کی روح کا قابو جسم پر نہیں رہتا اور طرح طرح کے خیالات واندیشے اس کی حرکتوں کی بدنظمی کا سبب بن جاتے ہیں، اس آیت میں اسی ثقل کے انقلاب کا بیان ہے (کہ انسانوں میں پایا جانے والا یہ معنوی ثقل خفت و ہلکے پن سے بدل جائے گا اور پتنگوں کی طرح ہلکے پھلکے بے ترتیبی حرکتیں کررہے ہوں گے)

(۲) ثقل کی دوسری قسم ثقلِ طبعی ہے، اس کو عوام الناس بھی جانتے ہیں، یہ ثقل جسموں میں ٹھوس اجزاء کے اجتماع کی وجہ سے ہوتا ہے، اس میں پہاڑ ضرب المثل ہیں، (اس ثقل میں بھی انقلاب پیدا ہوجائے گا اور یہ ثقل ہلکے پن سے تبدیل ہوجائے گی) اس ثقل کے انقلاب کو دوسری آیت میں بیان کیا ہے:

وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنفُوشِ ۝

اور ہوویں پہاڑ جیسے رنگی ہوئی اُون دُھنی ہوئی

یعنی پہاڑ اس رنگی ہوئی اون کی طرح ہوجائیں گے جس کو روئی دھننے والا دھنک کر اس کا پھاہا پھاہا اُڑادے، وہ کئی رنگوں میں اُڑتی ہوئی نظر آئے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ پہاڑوں جیسے سخت جسموں میں بھی اس حادثے کا ایسا اثر ہوگا کہ ان کے اجزاء الگ الگ ہوکر ہوا میں منتشر اور بکھر جائیں گے۔

رنگین اُون سے تشبیہ دینے کی وجہ

ان کو رنگین اون کی طرح اس لئے کہا کہ رنگین اُون، دوسری بے رنگی اُون کے مقابلے میں کمزور بھی ہوتی ہے اور ہلکی بھی ہوتی ہے (تو گویا پہاڑوں کے بہت ہلکا ہوجانے اور کمزوری کے زیادہ ہونے کو بتلانے کے لئے رنگین اُون سے تشبیہ دی)

دوسرے رنگین اون سے تشبیہ دینے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ پہاڑوں کے رنگ بھی مختلف ہیں، بعض سُرخ ہیں، بعض سیاہ ہیں اور بعض سفید ہیں اسی طرح دیگر مختلف رنگ ہیں، جب یہ مختلف رنگوں کے پہاڑ

ہوا میں اُڑیں گے تو ایک رنگ برنگی چیز نظر آنے لگے گی۔

اس حادثے کی تاثیر کو اجمالاً بیان کرنے کے بعد اب اس کی تفصیل ارشاد فرماتے ہیں:

فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ○

سو جس کی بھاری ہوئیں تولیں

اعمال کے ثقل کی حقیقت

یہ وہ پوشیدہ اور مخفی بوجھ ہے جو اعمال کے اندر موجود تھا، لیکن دنیا میں ظاہر نہیں ہوا تھا، اس دن اس کا ظہور ہوگا، درحقیقت ان اعمال کی اللہ کے ہاں قبولیت و رجحان ان کا ثقل ہے اور اسی ثقل کی وجہ سے بندے کے اعمال، اعمالناموں میں محفوظ کیے جاتے ہیں۔

نیز ہر نیک عمل دنیا میں بندے پر ثقیل اور مشکل ہوتا ہے اور بندہ اللہ کے حکم کی فرماں برداری میں اس ثقل اور مشقت کا تحمل کر کے اس عمل کو کرتا ہے، اس دن یہ ثقل بھی ظاہر ہوگا، اور اس کی وجہ سے بندے کو ترقی نصیب ہوگی چنانچہ فرماتے ہیں:

فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ○

تو وہ رہے گا من مانتے گذران میں

وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ○

اور جس کی ہلکی ہوئیں تولیں

اور اعمال کا یہ ہلکا پن اس وجہ سے ہوگا کہ اللہ کے ہاں ان کی کوئی قدر نہ ہوگی، اور جب نفس کی خواہش کے موافق ہوئے ہوں گے تو نفس پر شاق اور گراں بھی نہیں ہوئے (اس لئے کسی طرح کا ثقل اور بوجھ ان میں نہ ہوا)

اعمال کی سبکی اور ہلکا پن کا نتیجہ یہ ہوگا کہ قیامت کے دن وہ اعمال ضائع کر دیئے جائیں گے ان کی حفاظت کا کوئی بندوبست نہ ہوگا، اور پھر یہ اعمال اس آدمی کی ذلت کے گڑھے میں گر جانے کا سبب ہوں گے، چنانچہ فرماتے ہیں:

فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ○

تو اُس کا ٹھکانا گڑھا ہے

فرمایا اس کی ماں جہنم کے نیچے کا طبقہ ہے، (اُمّ ماں کو کہتے ہیں) جہنم کو اس کی ماں اس لئے کہا کہ بچے کو ماں سے بے تکلفی ہوتی ہے، اور جب بھی بے تکلف اس کی طبیعت کسی چیز کو چاہتی ہے تو وہ ماں کی طرف رجوع کرتا ہے، تو اُس دن بھی وہ تکلف و بناوٹ جو دنیا میں بے ایمان قسم کے لوگ کرتے ہیں وہ نہیں رہے گا اس وجہ سے بے اختیار وہ لوگ جہنم کے نچلے طبقے کی طرف رجوع کریں گے گویا اس کے ساتھ دلی محبت رکھتے ہیں، اور وہ طبقہ بھی ماں کی طرح ان کو اپنی طرف کھینچ لے گا۔

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَاهِيَهْ ○

اور تو کیا سمجھا وہ کیا ہے

یعنی اس طبقے میں جو عذاب ہے اس کو آدمی نہیں سمجھ سکتا۔

"ماهية" کی تحقیق

"هية" کے آخر میں گول ھا وقف کے لئے ہے، سکتے کے وقت اس کے آخر میں یہ "ھا" بڑھا دیتے ہیں، ورنہ اصل کلمہ صرف "ھی" ہے

نَارٌ حَامِيَةٌ ○

آگ ہے دہکتی ہوئی

یعنی جس طبقے کا نام "ہاویۃ" ہے اس کی گرمی بیان کرنے کے لئے اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ وہ نہایت گرم آگ ہے اس کی گرمی کا یہ حال ہے کہ گویا اس کے مقابلے میں دوسری کسی آگ کو گرم کہنا ہی نہیں چاہئے۔

مقدمہ سورۃ التکاثر

یہ سورت مکی ہے، اس میں آٹھ (۸) آیات، اٹھائیس (۲۸) کلمات، اور ایک سو تیس (۱۳۰) حروف ہیں۔

شانِ نزول

اس سورت کے نازل ہونے کا سبب یہ ہوا کہ قریش کے دو خاندانوں بنو عبد مناف جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی تھے، اور بنو سہم جن کا سردار عاص بن وائل سہمی تھا، کے درمیان ایک دن اپنی اپنی برتری وفضیلت ثابت کرنے کے لئے بحث ہوگئی، ہر ایک اپنی بڑائیاں اور مفاخر بیان کرنے لگا، ایک کہتا کہ ہمارے پاس اتنا مال و دولت ہے، فلاں فلاں ہمارے کارنامے ہیں، اتنی ہم نے شادیاں کیں، ایسی ایسی مہمان نوازیاں ہماری ہیں، یہاں تک کہ بات اس پر پہنچی کہ افراد کس کے زیادہ ہیں، جب شمار کئے گئے تو بنو عبد مناف کے افراد زیادہ ہوگئے، اس پر بنو سہم نے کہا کہ ہمارے لوگ بہادر ہیں اس لئے وہ جنگوں میں مارے گئے ہیں، لہٰذا زندہ مردہ سب شمار کریں، چنانچہ قبرستان پہنچ گئے، اور قبریں شمار کر ڈالیں۔

اس موقعہ پر اللہ تعالیٰ نے ان کی اس جہالت کو بیان کرنے اور ان کی اس غفلت کی مذمت کرنے کے لئے یہ سورت نازل فرمائی۔

وجہ تسمیہ

اس سورت کا نام تکاثر اس لئے رکھا ہے کہ اس سورت میں تکاثر کی برائی بیان کی گئی ہے اور مقصد یہ ہے کہ تکاثر سے ایسے ڈرنا چاہئے جیسا قیامت سے ڈرہوتا ہے، اس لئے کہ تکاثر بندے اور اس کے مطلوب کے درمیان بہت بڑا حجاب ہے، اور جو بھی حجاب ہوتا ہے اس کے پیچھے عذاب ہوتا ہے۔

تفسیر سورۃ التکاثر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ○

غفلت میں رکھا تم کو بہتات کی حرص نے

تکاثر کا معنی اور اس کے نقصانات

تکاثر کا معنی ہے زیادتی طلب کرنا، اور انسان کی عادت ہے کہ آخری عمر میں اس کو اس بات کی حرص ہو جاتی ہے کہ اس کا مال، اولاد، نوکر چاکر زیادہ ہو جائیں تاکہ ان کی وجہ سے اس کا نام چلتا رہے، اور یہ چیز اس کو اللہ کی معرفت حاصل کرنے، اس کے اسماء، صفات اور افعال میں غور و فکر کرنے اور حقوق اللہ اور حقوق العباد کے ادا کرنے سے غافل کر دیتی ہے، پھر اس غفلت کی وجہ سے وہ نعمتیں جس مقصد کے لئے عطا کی گئی ہیں اس کے خلاف میں استعمال کرنے لگتا ہے۔

الغرض ''تکاثر'' ایسی بیماری ہے جو انسان کو انسانیت سے نکال کر حیوانات کے درجے میں داخل کر دیتی ہے۔

پھر اگر کسی مرشد یا بزرگ کی نصیحت و راہنمائی سے اس کی یہ غفلت جلد دور ہو گئی اور راہِ حق پر چلنے کی استعداد پیدا کر لی تو دوبارہ انسانیت کی حدود میں داخل ہو جاتا ہے، اور اگر اسی غفلت میں ہمیشہ رہا یہاں تک کہ اسی حال میں مر گیا تو وہ بہت بڑے خسارے میں چلا گیا، اس وقت اس کی مثال اس آدمی کی طرح ہے جس کو کسی نے کچھ دے کر بازار میں بھیجا کہ تجارت کر کے نفع کما لائے، وہ شخص جا کر شراب پی کر بیہوش ہو گیا، اور پونجی ہی کھو بیٹھا، شام کو اٹھا کر اسے گھر لایا گیا تو یہ حال تھا کہ نہ پونجی ہاتھ میں تھی اور نہ کسی قسم کا نفع۔ معاذ اللہ من ذلک۔ اسی حالت کی طرف اشارہ کرنے کے لئے فرماتے ہیں:

حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ○

یہاں تک کہ جا دیکھیں قبریں

یعنی اس مشغلے میں رہے، اور کوئی بیداری پیدا نہ ہوئی جب تک کہ قبرستان نہ پہنچ گئے۔

كَلَّا

کوئی نہیں

یعنی یہ گمان کرنا کہ موت کے بعد اگر کوئی کمال ہے تو یہی ہے کہ بہت سی دولت، کاروباری بیٹے اور جاں نثار رشتہ دار ہوں جو مرنے کے بعد نام کو زندہ رکھیں، حالانکہ موت کے بعد کچھ اور ہی پیش آنے والا ہے، اس کے مقابلے میں یہ سب کچھ بے حقیقت ہے۔

حاصل دنیاز کہن تا بنو
چوں گز رندہ است نیز زد بجو

اور ہر عقلمند جانتا ہے کہ مال و اولاد، عزت و مرتبے اور رشتہ دار اور احباب سب فانی ہیں اور جو چیز فانی ہو وہ فخر کے قابل نہیں ہوتی۔

سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝

آگے جان لوگے

یعنی مرنے کے بعد تم کو معلوم ہو جائے گا وہ سب چیزیں جن میں تم نے عمریں گزاریں سب نقصان دہ تھیں اس لئے کہ ان کی وجہ سے ابدی نعمت تم سے فوت ہوگئی، اور یہ چیزیں اللہ کے قہر کو کھینچ لینے کا باعث ہوگئیں۔

ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝

پھر بھی کوئی نہیں آگے جان لوگے

ہم پھر کہتے ہیں بات یوں نہیں جیسے تم اعتقاد رکھتے ہو، آخر جب بعث، حشر و نشر، دوزخ اور اسکی سختیوں کو دیکھ لوگے تو تمہیں معلوم ہو جائے گا جو کچھ تم نے کیا وہ سب نقصان دہ اور مقصد میں خلل ڈالنے والا تھا۔

(دو مرتبہ فرمایا تم جان لوگے) پہلا جاننا برزخ میں ہوگا، اور دوسری مرتبہ جاننا قیامت کے دن ہوگا۔

كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ۝

کوئی نہیں اگر جانو تم یقین کر کے

یعنی فخر نہ کرو بات یوں نہیں ہے اگر تم اس طرح جان سکو کہ جس میں کوئی شک وشبہ نہ ہو اور بعض ظلمانی حجاب تم سے ہٹ جائیں تو البتہ جان لو گے۔

لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ۝

بیشک تم کو دیکھنا ہے دوزخ

یعنی موت کے بعد تم برزخ کو ضرور دیکھو گے، اور اس میں گرم ہواؤں کی آمد و رفت عذاب کی مختلف صورتیں اور آگ کے گرزوں کی ضربوں کو دیکھنے کے بعد:

ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ ۝

پھر دیکھنا ہے اُس کو یقین کی آنکھ سے

پھر تم جہنم کو ایسے یقین سے دیکھو گے جس میں کسی قسم کے شک وشبہ یا غلبہ خیال، یا پہچاننے میں غلطی کا احتمال بالکل نہ ہوگا، یہ دیکھنا قیامت کے دن ہوگا کہ جہنمیوں کو جہنم کے کنارے پر لا کھڑا کیا جائے گا وہ اپنی آنکھوں سے اس کی ہولناکیاں دیکھیں گے۔

ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ ۝

پھر پوچھیں گے تم سے اُس دن آرام کی حقیقت

یعنی تم کو جو نعمتیں دنیا میں دی گئی تھیں ان کے بارے میں تم سے سوال ہوگا۔

(۱) سب سے پہلے یہ کہ تم نے یہ نعمت کس طریقے سے حاصل کی، حلال طریقے سے یا حرام طریقے سے؟

(۲) دوسرے یہ کہ ان نعمتوں کو کہاں استعمال کیا، اللہ کی رضامندی کے کاموں میں یا ناراضگی کے کاموں میں؟

(۳) تیسرے یہ کہ اس نعمت کے بدلے شکر کے طور پر تم نے کیا کیا؟

کون سی نعمت کے متعلق سوال ہوگا

یہاں یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے بندے کو جو کچھ بھی ضرورت سے زائد دیا ہے جس پر بندے کی زندگی موقوف نہیں، اس سب کے بارے میں سوال ہوگا، اور ایسی نعمتوں سے کوئی بھی بندہ خالی نہیں ہے، چاہئے وہ مفلس وفقیر ہی کیوں نہ ہو، اسی لئے کہا گیا ہے کہ ٹھنڈا پانی، گرم روٹی، ٹھنڈی چھاؤں، نیند کی لذت، اسلام، قرآن، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک اور شریعت کی آسانی، یہ سب وہ نعمتیں ہیں جن میں بے شمار مسلمان مالدار سے لے کر فقیر تک ان میں شریک ہیں، لیکن ان کی قدر نہیں کرتے۔

بعض نے کہا ہے کہ جن نعمتوں کے بارے میں سوال ہوگا وہ تین چیزیں ہیں:

(۱) صحت

(۲) جوانی

(۳) امن

اور کوئی بھی انسان اپنی زندگی میں ان تین نعمتوں سے خالی نہیں رہتا اگر چہ یہ نعمتیں ہمیشہ نہ رہیں۔

حدیث میں آتا ہے ایک فقیر آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے دنیا میں کون سی نعمت ملی ہے کہ جس کے بارے میں مجھ سے سوال ہوگا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، روٹی، ٹھنڈا پانی اور سایہ۔

یہ بھی حدیث میں آیا ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، صدیق اکبر، عمر فاروق، اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ابوالہیثم کے گھر مہمان تھے ان کے ہاں کھجوروں کے ساتھ روٹی تناول فرمائی اور ٹھنڈا پانی پیا، اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ وہ نعمتیں ہیں جن کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔

مقدمہ سورۃ العصر

یہ سورت مکی ہے، اس میں تین (۳) آیتیں، چودہ (۱۴) کلمات اور اڑسٹھ (۶۸) حروف ہیں۔

شانِ نزول

اس سورت کے نازل ہونے کا سبب یہ ہوا کہ کلدہ بن اسید، جس کو ابولأسدین بھی کہتے تھے، ایک کافر تھا، زمانۂ جاہلیت میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا دوست ہوتا تھا، حضرت ابوبکرؓ کے اسلام قبول کرنے کے بعد ایک دن اُن سے ملا، اور کہنے لگا ابوبکر تم بڑے عقلمند آدمی تھے، ہمیشہ تجارت میں اپنی دانائی اور عقلمندی سے تم نے بہت نفع کمایا، مگر یہ کیا کیا کہ ایک دم ہی تم خسارے میں چلے گئے، اپنے باپ دادا کا دین چھوڑ دیا، لات وعزیٰ کی عبادت اور ان کی شفاعت سے محروم ہو گئے۔

اس کے جواب میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا جو آدمی حق قبول کرتا ہے وہ خسارے میں نہیں پڑتا، اللہ تعالیٰ نے ان کی اس گفتگو کے متعلق اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بات کی خوبی کے بیان میں یہ سورت نازل فرمائی۔

وجہ تسمیہ، عصر کا معنی، عمر کی قدر اور وجہ قَسم

اس سورت کا نام عصر اس لئے رکھا کہ اس کے شروع میں عصر کی قَسم کھائی گئی ہے۔

عصر کے دو معنی ہیں (۱) زمانہ، اسی میں انسان کی عمر بھی داخل ہے، عمر ایک نہایت ہی نفیس چیز اور عزیز ترین پونجی ہے، اسی کی بدولت دینی اور دنیوی کمالات حاصل ہوتے ہیں، یہ رأس المال اور پونجی ہے، لیکن اس کی خامی یہ ہے کہ یہ خود بخود ہی کم ہوتی چلی جاتی ہے، سو اگر اعتقاداتِ حقہ، اعمالِ صالحہ اور نیک احوال کے حاصل کرنے میں عمر گذری ہے تو ہمیشہ کی اور دائمی زندگی اور سرمدی لذت حاصل کر لی، اور اگر اس کے برعکس گذری تو ظاہر ہے پھر نقصان وخسارہ اور ذلت ہی کا سامنا ہوگا۔

الغرض انسان کو اس جہان میں بھیجا اور رأس المال کی جگہ اس کو عمر دی، اس کی مثال برف بیچنے والے کی ہے کہ جس کی پونجی یعنی برف خود بخود پگھلتی جارہی ہے، اگر اس نے اس کے بدلے میں کوئی عمدہ چیز خرید لی تو بہتر ورنہ خسارہ سر دست موجود۔ اور چونکہ یہ تجارت عجیب وغریب نوعیت کی ہے اس

لئے اس کی قسم کھائی ہے۔

عصر کے وقت کی اہمیت، نیز قسم کھانے کی وجہ

(۲) دوسرا معنی ''عصر'' کا نماز عصر کا وقت ہے، یہ وقت نفع ونقصان کے ظاہر ہونے کا وقت ہے، اس لئے کہ ہر آدمی صبح سے اپنی معاش اور روزی کے دھندوں میں مشغول ہوتا ہے، اور روزی کے کمانے میں طرح طرح کی تدبیریں، حیلے اور فریب کرتا ہے پھر جب دن پورا ہوگیا تو سب کام کاج اور کوششیں اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہیں، ہر شخص اپنے کام سے فارغ ہو جاتا ہے اب اگر اس نے دن بھر کچھ کمایا تو بہت خوب ورنہ نقصان وخسارہ ہے، تو چونکہ یہ وقت خسارہ وٹوٹا کے ظاہر ہونے کا وقت ہے اس لئے اس کی قسم کھائی۔

بلکہ غور کیا جائے تو یہ وقت دینی اور دنیوی دونوں قسم کے نفع ونقصان کے ظاہر ہونے کا وقت ہے، اس لئے کہ دن کے اعمال کے خاتمے کا وقت ہے جو کچھ دن بھر کمانا تھا سو کما چکے اب روزنامچہ دیکھنے کا وقت ہے کہ کیا کھویا اور کیا پایا، تو یہ وقت دنیا کے طالب اور آخرت کے طالب دونوں کے نزدیک بہت اہمیت وفضیلت رکھتا ہے اس لئے اس قابل ہے کہ اس کی قسم کھائی جائے۔

حدیث میں آتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس کی عصر کی نماز فوت ہوگئی گویا اس کا سب گھر بار تباہ ہوگیا۔

عصر کی مراد میں ایک اور قول

بعض نے کہا ہے کہ ''عصر'' سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ ہے، اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت کی وجہ سے اس وقت بازار سود وزیاں گرم ہوگیا، جس نے آپ کی اطاعت و فرمانبرداری کی اس نے ابدی نفع حاصل کرلیا اور جس نے آپ کی نافرمانی کی وہ ایسے خسارے میں پڑا جس کو بیان ہی نہیں کیا جاسکتا۔

پس وہ زمانہ انوار الٰہی کی کثرت، لامتناہی علوم کے فیضان اور گنہگاروں کے بخش دینے کی وجہ سے ایسی عظمت وبڑائی رکھتا ہے کہ آدم سے لے کر اب تک کوئی زمانہ اس کے برابر نہیں ہے، اور کسی نے کیا خوب کہا

خوشا وقتے کہ مردم آدم بے سایہ را دیدند

غریب است ایں زمان گر سایہ آدم شود پیدا

تفسیر سورۃ العصر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَالْعَصْرِ ۝

قسم ہے عصر کی

قسم ہے زمانے کی، کہ جس میں انسان کی عمر بھی داخل ہے، جو اعتقادات حقہ، اعمالِ صالحہ اور نیک احوال کے حاصل کرنے میں سرمایہ اور پونجی کی طرح ہے۔

یا قسم ہے نمازِ عصر کے وقت کی جو دن رات کے اعمال میں نفع ونقصان کے ظاہر ہونے کا وقت ہے۔

یا قسم ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کی، کہ وہ نورِ نبوّت کے ظہور اور ولایات کی شاخیں پھوٹنے کا وقت ہے، اس وقت جو اس نور سے منوّر ومستفید ہوا اس نے سرمدی نفع کما لیا، اور جو محروم رہا وہ دائمی بدنصیب ہوگیا۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝

مقرر انسان ٹوٹے میں ہے

یعنی آدمی ایک طرح کے گھاٹے میں ہے اس لئے کہ عمر جو انسان کا سرمایہ ہے وہ مسلسل کم ہوتی جارہی ہے، تو اللہ کا قرب حاصل کرنے اس کی رضامندی اور ثواب کمانے کا سبب اس کے ہاتھ سے نکلا جارہا ہے، اور اگر انسان نے اپنی عمر گناہوں میں اور فانی لذّتوں میں گذاری جو اللہ کے غضب کو کھینچنے والی چیزیں ہیں پھر تو اس نے گھاٹے پر گھاٹا کمایا ہے۔

اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا

مگر جو لوگ کہ یقین لائے

یعنی سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے، اور اپنی عمر سے فائدہ کمایا، اس لئے کہ ایمان بھی ایک طرح کی معرفت ہے اور وہ سعادتِ ابدی دینے والا، قربِ الٰہی کا موجب اور فرشتوں کے ملنے کا سبب ہے۔

وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

اور کئے بھلے کام

اس لئے کہ نیک اعمال کی وجہ سے ان کو دنیا میں اخلاق حمیدہ اور مقاماتِ عالیہ حاصل ہوئے اور آخرت میں بلند درجات نصیب ہوئے پس ان کو فائدہ در فائدہ ہوا، اور یہ سب کمال کے مراتب ہیں، اس کے ساتھ اگر انہوں نے تکمیل اور ارشاد و تعلیم کا رتبہ بھی حاصل کیا تو انہوں نے دُگنا نفع کمایا، چنانچہ آگے تکمیل کے مرتبے کی طرف اشارہ فرماتے ہیں:

وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۵ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝

اور آپس میں تاکید کرتے رہے سچے دین کی اور آپس میں تاکید کرتے رہے تحمل کی

تواصی بالحق کا معنی یہ ہے کہ آپس میں ایک دوسرے کو صحیح عقائد، نیک اعمال اور اچھے اخلاق کی تاکید کرتے رہے۔

تواصی بالصبر: کا معنی یہ ہے کہ اس بات کی تاکید کرتے ہیں ایک دوسرے کو کہ اپنے نفس کو خواہشات سے روکو، اور طاعات بجالانے کی مشقت پر نفس کو لگائے رکھو، اور تکلیف و مصیبت کے وقت نفس کو رضا و تسلیم پر مجبور کئے رکھو، صبر کی یہ تینوں قسمیں یعنی نفس کو خواہشات سے روکنا، طاعات بجالانے کی مشقت پر روک رکھنا، اور مصیبت کے وقت تسلیم و رضا پر پابند رکھنا، تمام طاعات کو گھیرے ہوئے ہیں اور تمام معاصی سے روکنے والی ہیں۔

ارشاد و تکمیل کے مرتبے کی فضیلت

حق اور صبر ان دو لفظوں سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ارشاد و تکمیل کا مرتبہ روحانی طبابت کے بمنزلہ ہے، اور طبابت و علاج میں دو چیزیں ضروری ہوتی ہیں:

(۱) دواء کی تجویز (۲) پرہیز

تو "تواصوا بالحق" سے دواء کی تجویز کی طرف اشارہ فرمایا اور "تواصوا بالصبر" سے پرہیز کی طرف اشارہ فرمایا، سوان دو عظیم ترین باتوں کے بغیر روحانی صحت و تندرستی محال ہے، اور جب

یہ دونوں باتیں سرانجام دی گئیں تو روحانی علاج درست ہوگیا اور ارشاد و تکمیل کا کام انتظام پذیر ہوگیا۔

اور یہ ارشاد و تکمیل کا کام اتنا منافع بخش ہے کہ اس کے منافع اور فوائد کا شمار حد و حساب سے باہر ہے اس لئے کہ جو بھی آدمی مرشد کی ہدایت کے مطابق عمل کرے گا تو اس کے عمل کا ثواب مرشد کو بھی ملے گا، اسی طرح آگے جتنے لوگ عمل کرتے رہیں گے مرشد کے اعمال نامے میں ان سب کے عمل کا ثواب لکھا جاتا رہے گا یہاں تک کہ یہ سلسلہ قیامت تک چلا جائے گا، یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جن کے ارشاد و تکمیل کی بدولت پوری امت کی اصلاح ہوئی اور ائمہ مجتہدین جن کے مذاہب پر قیامت تک لوگ عمل پیرا رہیں گے اور طریقت کے خانوادے والے کہ جن کی تربیت کے مطابق ان کے مریدین و متعلقین زندگی بھر نیک اعمال کئے جاتے اور مراتب قرب طے کرتے رہتے ہیں، ان سب کے برابر کسی کا ثواب نہیں ہوسکتا۔

اندازہ کرلیا جائے کہ یہ مرتبہ کتنا نفع بخش ہے کہ اس تھوڑی سی عمر میں انسان صدیوں کا ثواب کما لیتا ہے۔

وصیّت کا معنی اور ایک خاص نکتہ

اگرچہ وصیت کا لفظ عرف میں مخصوص اس بات کے لئے جو کوئی اپنے مرنے کے بعد کرنے کے لئے کہے، لیکن قرآن میں جابجا کسی تاکیدی بات کو بھی وصیّت سے تعبیر فرمایا ہے، جیسا کہ اس آیت میں ہے:

"ووصینا لانسان بوالدیہ احسانا"

اس مقام پر اس لفظ کے لانے میں ایک خاص نکتہ ہے وہ یہ کہ ارشاد و تکمیل کا مرتبہ حاصل ہوتا ہے نفس اور دیگر لطائف کے فنا ہوجانے کے بعد اور فانی میت کے حکم میں ہوتا ہے تو جو کچھ وہ فرمائے گا گویا وہ وصیّت ہے جو مرنے کے بعد وہ فرمارہا ہے۔

الحمدللہ، و بفضلہ تم نقل تفسیر سورۃ العصر

مقدمہ سورۃ الھمزۃ

یہ سورت مکی ہے اس میں نو (۹) آیات، تیئیس (۲۳) کلمات اور چھیانوے (۹۶) حروف ہیں۔

شانِ نزول

اس سورت کے نازل ہونے کا سبب یہ ہوا کہ کافروں میں سے تین آدمی، عاص بن وائل سہمی، ولید بن مغیرہ مخزومی اور اخنس بن شریق ثقفی مسلمانوں کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت زیادہ بدگوئی کیا کرتے تھے، اور ہر وقت طعن وتشنیع بھی کرتے، اخنس بن شریق تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی بیہودہ گفتگو کرلیا کرتا تھا، ان کے بارے میں یہ سورت نازل ہوئی۔

وجہ تسمیہ

اس سورت کا نام ہمزہ اس لئے رکھا ہے کہ یہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جو آدمی کسی کی آبرو ریزی کرے اور دوسروں کے عیوب تلاش کرے وہ خرابی اور عذاب کے قابل ہو جاتا ہے، لہٰذا جو آدمی اللہ تعالیٰ کی ہتکِ حرمت کرے اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کی تکذیب کرے اس کا کیا حال ہوگا خود ہی قیاس کرلینا چاہئے۔

تفسیر سورۃ الھمزۃ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ ۝

خرابی ہے ہر طعنہ دینے والے عیب چننے والے کی

ہمزۃ و لمزۃ کی تحقیق

ان دو لفظوں کی تفسیر میں کئی اقوال ہیں، ایک قول یہ ہے کہ ان دونوں کا معنی ایک ہے، تکرار تاکید کے لئے ہے، اور اس بات کی طرف اشارہ کرنے کے لئے کہ وہ شخص اس برے فعل کا عادی ہے اور یہ

فعل اس سے بار بار سرزد ہوتا ہے اس کو مکرر لائے ہیں چنانچہ "فعلة" کا صیغہ اسی بات پر دلالت کرتا ہے (اس لئے کہ مبالغے کا صیغہ ہے)

دوسرا قول یہ ہے کہ "همزة" اس شخص کو کہتے ہیں جو منہ پر کسی کو بُرا کہے اور "لمزة" اس کو کہتے ہیں جو پیٹھ پیچھے بُرائی کرے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ "همزة" وہ ہے جو ہاتھ، سر، آنکھ، اور بھوؤں سے لوگوں کی طرف تحقیر آمیز اشارے کرے، اور "لمزة" وہ شخص ہے کہ زبان سے ایسی باتیں کہے۔

بہر حال یہ دونوں لفظ معنی کے لحاظ سے قریب قریب ہیں، اور دونوں کے تکرار سے مقصد اس بات کی تاکید کرنا ہے کہ لوگوں کی آبرو ریزی نہ کی جائے، اور اکثر یہ بُرا عمل کسی کے نسب میں، یا شکل و صورت میں یا اس کے افعال میں طعن کے طور پر کیا جاتا ہے۔

جو لوگ اس طرح کے ہوں کہ اللہ کی مخلوق کی عیب جوئی کریں اور ان کو ایذا پہنچائیں تو ایسوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے بھی دائمی عذاب کا وعدہ کیا ہوا ہے چنانچہ "ویل" کا لفظ اسی کی طرف مشعر ہے، اس لئے کہ "ویل" لغتِ عرب میں اس شدید مصیبت کو کہتے ہیں جو دائمی ہو۔

اس بُرے عمل کی بنیاد لوگوں پر فخر و بڑائی حاصل کرنا ہوتا ہے جس کا منشاء اکثر مال و دولت کی فراوانی ہوتی ہے اس لئے کہ بہت سے لوگوں کو بغیر کسی قابلیت و لیاقت کے مال ہاتھ آجاتا ہے، اس وجہ سے وہ چاہتے ہیں کہ اس مال کی وجہ سے وہ دوسروں سے اونچے اور بڑے بن کے بیٹھیں۔

اور صرف مال کی کثرت ہی فخر و بڑائی کی وجہ نہیں ہوتی بلکہ عمدہ نسب، حسن و جمال، نیک اعمال اور اچھے اخلاق بھی عزت و فخر کی چیز ہوتی ہے، اس لئے دنیادار اپنی بڑائی ثابت کرنے کے لئے اپنے ہم چشموں پر طعن شروع کر دیتے ہیں، اسی لئے ہمزہ اور لمزہ کی آگے یہ صفت بیان فرمائی ہے:

الَّذِىْ جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَهٗ ٥

جس نے سمیٹا مال اور گن گن کر رکھا

گن گن کر رکھنے کو بیان کرنے میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ وہ مال کو خرچ کرنے کے لئے جمع نہیں کرتا بلکہ بخل کرتا ہے اور بار بار شمار کر کے رکھتا ہے کہ کچھ کم نہ ہو جائے، تو حرص اور بخل دونوں بُری

صفات اس کے اندر ہیں، اس قسم کے لوگوں سے اگر پوچھا جائے کہ بخل کیوں کرتے ہیں تو وہ کہتے ہیں ہم نے مال زمانے کے نشیب وفراز کے لئے تیار کر رکھا ہے اسی لئے ان لوگوں کے بارے میں آگے یہ ارشاد فرمایا:

يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗ اَخْلَدَهٗ ○

خیال رکھتا ہے کہ اُس کا مال سدا رہے گا اُس کے ساتھ

یعنی کیا مال اس سے موت کے اسباب دور کر سکتا ہے، ہرگز نہیں چنانچہ فرمایا:

كَلَّا لَيُنْبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ○

کوئی نہیں وہ پھینکا جائے گا اُس روندنے والی میں

یوں نہیں ہے جیسا وہ سمجھتا ہے اس لئے کہ اس طرح تو روزِ اوّل سے مالدار لوگ اس دنیا میں آتے رہے ہیں مگر کوئی بھی مال کے ذریعہ موت کے اسباب کو اپنے سے ہٹا نہ سکا، بلکہ بخل کے ساتھ مال کی کثرت تو قیامت کے دن عذاب کے زیادہ سخت ہونے کا سبب ہے، چنانچہ فرمایا "لَيُنْبَذَنَّ" ضرور پھینکا جائے گا ایسے کو جس کے اندر بد خُلقی، بدزبانی اور بخل جیسی مذموم صفات ہیں "فِي الْحُطَمَةِ" توڑ دینے والی آگ کے اندر، یعنی اس آگ کی خاصیت یہ ہے کہ وہ روند کر اور توڑ کر رکھ دیتی ہے۔

اور یہ توڑ دینے والی آگ اس شخص کی پوری پوری سزا ہے، اس لئے پہلے آگ اس کی ظاہری صورت پر غلبہ کر کے جلا کر انتہائی خراب کر دیتی ہے اس کے بعد گوشت پوست تک پہنچتی ہے پھر ہڈیاں ٹوٹنے کی نوبت آتی ہے اس طرح نہ اس کی ذات باقی رہے گی اور نہ حسن و جمال تو جس مال کا نتیجہ یہ ہو اس کو سامانِ جاویدانی سمجھنا کمال درجے کی حماقت ہے۔

"حطمہ" کے لفظ میں آگ کی جو تاثیر بیان کی گئی ہے وہ تاثیر آتش کو بھی، آتش عنصری اور آتش مزاجی جو تپ دق میں ہوتی ہے کے اندر بھی مشترک ہے جبکہ وعدہ کی گئی آگ کی تاثیر ان سب سے کئی گنا زیادہ بڑھی ہوئی ہے اس لئے اس حقیقت کو کھولنے کیلئے سوال و جواب کی صورت میں ارشاد فرماتے ہیں:

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحُطَمَةُ ۝

اور تو کیا سمجھا کون ہے وہ روندنے والی

یعنی باوجود اس کے کہ آپ علم کی انتہا تک پہنچے ہوئے ہیں آپ کو کیا معلوم کہ وہ توڑنے والی کیا ہے، یعنی وہ آگ عقلاء اور حکماء کی سمجھ سے بالاتر ہے، اس لئے کہ ان کے نزدیک حرارت تین ہی قسم کی ہوتی ہے۔

(۱) عنصری جیسے آگ کی گرمی ہے۔

(۲) کوکبی جیسے سورج کی گرمی ہے۔

(۳) مزاجی جیسے تپ یا حرکت کی گرمی ہوتی ہے، لیکن وہ آگ ایسی نہیں کہ کسی کے قیاس میں آجائے، بلکہ وہ تو:

نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۝ الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْئِدَةِ ۝

ایک آگ ہے اللہ کی سلگائی ہوئی، وہ جھانک لیتی ہے دل کو

وہ خدائی آگ ہے یعنی اس کے قہر و غضب کی آگ ہے جس کو لوگوں کی نافرمانیوں اور گناہوں نے سلگایا ہے، اور وہ دلوں کو جھانک لیتی ہے۔

حقیقت اس کلام کی یہ ہے کہ دنیا کی آگ پہلے ظاہر بدن پر اثر کرتی ہے پھر بدن کے اندر جو چیزیں ہیں درجہ بدرجہ ان کو جلاتی ہے حتی کہ آخر میں اخلاط، ارواح اور اعضاء اصلیہ تک پہنچتی ہے، لیکن وہ قہرِ الٰہی کی آگ سب سے پہلے نفس ناطقہ کو صدمہ پہنچاتی ہے پھر وہاں سے دل کو جو کہ اعضاء میں سب سے زیادہ تکلیف کے احساس میں نازک ہے، معمولی سا درد اسے بے چین کر دیتا ہے، تو جب اس آگ کا غلبہ سب سے پہلے دل پر ہوگا تو تکلیف واذیت بھی انتہائی درجے کی ہوگی۔

اس دنیا میں اُس آگ کے مشابہ تپ کی آگ ہے، اگرچہ اس کی گرمی پہلے دوسرے اخلاط کو پہنچتی ہے لیکن تکلیف سب سے پہلے دل کو ہی ہوتی ہے پھر دل سے باقی تمام اعضاء تک وہ درد منتقل ہوتا ہے، اسی لئے حدیث میں آتا ہے "الحمیٰ من فیح جهنم" کہ تپ دوزخ کی بھاپ ہے، اور یہ بھی آیا ہے "الحمی حظ المؤمن من النار"

لیکن تپ کی آگ دو وجہ سے اس آگ سے کم ہے، ایک تو اس وجہ سے کہ تپ نفس ناطقہ میں جو مجردات میں سے ہے اثر انداز نہیں ہوتی، دوسرے اس وجہ سے کہ تپ کی آگ کے بخارات بدن کے مسامات سے پسینے کی صورت میں نکل جاتے ہیں جس سے تخفیف ہو جاتی ہے، بخلاف اس خدائی آگ کے کہ اس کے بارے میں ارشاد ہے:

اِنَّهَا عَلَيۡهِمۡ مُّؤۡصَدَةٌ ۝

اُن کو اُس میں موند دیا ہے

یعنی وہ آگ ان کے اعضاء کے اندر بند کر دی گئی ہے تا کہ نہ گرم سانس اندر سے باہر آئے اور نہ ٹھنڈی سانس باہر سے اندر جائے، اس لئے کہ اس سے بھی تسکین ہوتی ہے۔

اور جو بعض اوقات ہاتھ پاؤں مارنے اور بدن کو زمین یا دیواروں کے ساتھ ٹکرانے سے کچھ مسامات کھل جایا کرتے ہیں جس سے کچھ تخفیف ہو جاتی ہے اس امکان کو بھی یہاں ختم کر دیا ہے چنانچہ فرمایا:

فِيۡ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ۝

لمبے لمبے ستونوں میں

لمبے ستونوں کے اندر یہ رسیوں سے جکڑ دیئے گئے ہوں گے تا کہ ہاتھ پاؤں نہ ہلا سکیں، اور ان کی اندر کی گرمی کسی طرح کم نہ ہو سکے۔

بعض مفسرین نے یوں نقل کیا ہے کہ دوزخ کی آگ کو ڈھکن سے ڈھانک لیا جائے گا پھر اس ڈھکن و سرپوش پر آگ کے لمبے لمبے ستون رکھ دیئے جائیں گے تا کہ ہوا کا اندر داخل ہونا ممکن ہی نہ رہے۔ واللہ اعلم بالصواب

مقدمہ سورۂ فیل

یہ سورت مکی ہے، اس میں پانچ (۵) آیات، تیئس (۲۳) کلمات، اور ننانوے (۹۹) حروف ہیں۔

وجہ تسمیہ

اس سورت کا نام سورۂ فیل اس لئے رکھا ہے کہ اس میں اصحاب فیل کا قصہ مذکور ہے۔

اصحابِ فیل کے واقعے میں عبرتیں اور فوائد

یہ قصہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے اور یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اللہ کے قہر کے چھوٹے سے چھوٹے اسباب کا تحمل جانوروں میں سب سے بڑا جانور ہاتھی نہیں کر سکتا، تو اس کے قہر کے بڑے اسباب کا تحمل کون کر سکتا ہے۔

یہ قصہ اس بات پر بھی دلالت کرتا ہے کہ جب اللہ کے گھر کی بے حرمتی ایسے قہر کا سبب ہو سکتی ہے تو اس کے دین و پیغمبر کی بے حرمتی کس قدر اس کے قہر و غضب کا سبب ہوگی۔

یہ واقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے قریب ہوا تھا گویا یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارہاصات (علامات) میں سے تھا۔ اس سورت میں اس قصے کو یاد فرما کر تنبیہ کرنا چاہتے ہیں کہ اس قصے سے عبرت پکڑیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بے حرمتی نہ کریں، انہی کی برکت سے اللہ کی یہ مدد غیبی مکہ والوں کے لئے ظاہر ہوئی تھی۔

اصحابِ فیل کا قصہ

اس قصے کا سبب یہ ہوا تھا کہ نجاشی بادشاہ کی طرف سے ابرہہ نامی ایک حبشی یمن کا گورنر بن کر آیا تو اس نے دیکھا کہ حج کے موسم میں ہر طرف سے لوگ نذر و نیاز لے کر مکہ معظمہ جاتے ہیں، اس نے پوچھا یہ لوگ کہاں جاتے ہیں، تو ساری صورت حال اس کو بتائی گئی، کفر کی سرکشی اور نخوت و غرور نے اس کے دل میں جوش مارا تو اس نے حکم دیا کہ اس گھر کے مقابلے میں اس شہر میں ایک گھر تعمیر کرو، چنانچہ اپنے پایۂ تخت صنعاء میں خوبصورت پتھروں سے ایک کلیسا تعمیر کروا دیا، اور اس کا نام ''فلیس'' رکھا، اس

کے در و دیوار کو زر و جواہر سے مرصّع کیا، بتوں کو عمدہ عمدہ لباس پہنا کر اور زیورات سے آراستہ کر کے اس کے اندر رکھ دیا، عطر و گلاب کا چھڑکاؤ کروایا اور عود و عنبر کی انگیٹھیاں روشن کروائیں، اور اس کے اردگرد مسافروں کے لئے بہترین مکانات بنوائے، اس کے بعد پورے علاقے میں یہ حکم جاری کر دیا کہ سب لوگ اسی گھر کے طواف کے لئے آیا کریں، یہ بات قریش کو اور عام اہل مکہ کو ناگوار گذری۔

اسی عرصے میں مکہ سے بنو کنانہ کا ایک آدمی یمن گیا، بادشاہ سے مل کر اس گھر کی خدمت، صفائی وغیرہ پر مقرر ہوا، چند دنوں کے بعد جب بے تکلف وہ اس گھر میں آنے جانے لگا تو ایک رات اس کے اندر جگہ جگہ پاخانہ پھیر کر بھاگ گیا، صبح جب لوگ آئے تو یہ حالت دیکھ کر واپس ہوئے اور بادشاہ کو خبر پہنچائی، اس نے حکم دیا کہ تحقیق کی جائے یہ کس کی حرکت ہے، معلوم ہوا یہ اسی حجازی خادم کی ہے، ابرہہ بہت غضب ناک ہوا اور بیت اللہ کے خلاف اس کے دل میں نفرت اور زیادہ ہو گئی۔

ابھی یہ قصہ تازہ ہی تھا کہ ایک نیا شگوفہ کھلا، ہوا یہ کہ مکہ کے کچھ لوگوں کا قافلہ ایک رات اسی کلیسا کے متصل آ کر ٹھہرا، رات کے آخری حصہ میں کوچ و روانگی کے وقت انہوں نے آگ جلائی تا کہ اگر کوئی چیز گر گئی ہو تو نظر آ جائے، اتفاق سے ہوا تیز ہوئی تو آگ کلیسا تک اُڑ کر پہنچ گئی، اس کا سب ساز و سامان جل کر راکھ ہو گیا، دھوئیں سے اس کے مزیّن در و دیوار سیاہ ہو گئے، الغرض اس کا حلیہ بگڑ گیا، قافلے والوں نے جب یہ حال دیکھا تو ڈر کر جلدی سے بھاگ گئے۔

صبح کو سارے لوگ حیران تھے یہ کیا ہوا، بادشاہ نے پھر حکم دیا کہ تحقیق کی جائے یہ کس کی حرکت ہے، چنانچہ معلوم ہوا کہ یہ حرکت بھی مکہ والوں کی ہے، اب تو وہ آپے سے باہر ہو گیا، اور فوراً لشکر کو تیاری کا حکم دیا، اور بارہ ہاتھی جن میں ایک سب سے بڑا ہاتھی بھی تھا جس کا نام محمود تھا سب سے آگے ہوتا تھا، اس سارے لشکر کو لے کر وہ خانۂ خدا کو ڈھانے چلا، راستہ میں جو شہر اور بستیاں آتی ان کے رہنے والوں کو جب اس کے ارادے کا علم ہوتا تو وہ سب منت زاری کرتے کہ ایسا ہرگز نہ کریں، اس کے بدلے میں ہم سے جو خدمت لینا چاہیں ہم تیار ہیں، لیکن اس نے ایک نہ سنی اور آگے چلتا گیا۔

مکہ والوں نے جب یہ خبر سُنی تو تمام اپنا مال و اسباب لے کر پہاڑوں پر چلے گئے، صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبدالمطلب تنہا مکہ میں رہ گئے اور اللہ کی مدد کا انتظار کرنے لگے۔

ابرہہ کا لشکر وادیٔ محسر میں پہنچا تو اس کا بڑا ہاتھی محمود ٹھٹھک کر رُک گیا، باقی ہاتھی بھی اسی طرح رُک

گئے، آگے نہیں بڑھ رہے تھے، واپس یمن کی طرف ان کو موڑتے تو چلنے لگتے، مگر مکہ کی طرف بڑھنے کی بجائے گھٹنوں کے بل بیٹھ جاتے، ابرہہ کو غصہ آگیا اس نے فیلبانوں کو دھمکی دی کہ سب تمہاری شرارت ہے کیوں نہیں ہاتھیوں کو چلا رہے، تم چاہتے ہو کہ میں اس طرح اس گھر کا معتقد ہو جاؤں گا ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔

وہ اسی گرمی میں تھا کہ اچانک جدّہ ساحل سمندر کی طرف سے سبز چڑیوں کے غول ابرہہ کے لشکر کی طرف آئے، ان چڑیوں نے تین تین کنکریاں اُٹھا رکھی تھیں جو مسور کے دانے سے بڑی اور چنے کے دانے سے چھوٹی تھیں، ایک چونچ میں پکڑ رکھی تھی اور دو پنجوں میں پکڑ رکھیں تھیں، جب اس لشکر کے برابر پہنچی تو اُنہوں نے لشکر پر وہ کنکریاں ڈالنا شروع کر دیں، اور ان کنکریوں کی خاصیت یہ تھی کہ جس کے سر پر لگتی تھیں اس کے پاخانے کی جگہ سے باہر نکل جاتی تھی اور اندر سے جلا دیتی تھیں۔

اس طرح وہ لشکر ہاتھیوں سمیت غضب الٰہی سے پائمال ہوا اور ان کا تمام مال و اسباب وہیں جنگل میں پڑا رہ گیا۔ مکہ کے جو لوگ پہاڑوں کی طرف بھاگ گئے تھے، انہوں نے جب یہ صورتحال دیکھی تو سب بھاگتے ہوئے آئے اور سامان و مال لوٹ کر لے گئے، چنانچہ قریش کے پاس جو دولت تھی یہ وہیں سے لوٹی ہوئی تھی۔

اور وہ کنکریاں بعد تک لوگوں کے پاس محفوظ رہیں، چنانچہ بعض صحابہؓ نے بھی وہ دیکھیں تھیں۔

اس واقعے کے پچپن دن بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت مبارکہ ہوئی۔

تفسیر سورۃ الفیل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلَمۡ تَرَ کَیۡفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِاَصۡحٰبِ الۡفِیۡلِ ۝

کیا تو نے نہ دیکھا کیسا کیا تیرے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ

یعنی اس لشکر کے ساتھ جو کعبۃ اللہ کو ڈھانے کے لئے ہاتھیوں کو آگے آگے لایا تھا۔

"اَلَمْ تَرَ"

دیکھنے کا لفظ اس لئے فرمایا کہ جو چیز تواتر سے ثابت ہو وہ دیکھ لینے کا حکم رکھتی ہے اس لئے کہ اس میں کوئی شک وشبہ نہیں رہتا۔

"رَبُّکَ" کے لفظ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ واقعۂ عظیمہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا ستون ہے، اس کرشمے کے ظاہر کرنے سے آپ کی نبوّت کا اثبات منظور ہے، گویا جو ربوبیت الٰہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف مصروف ہے وہی اس غیبی مدد کو آسمان سے لائی ہے، یہی وجہ ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم لشکر لے کر مکہ پر حملہ آور ہوئے تو کوئی مزاحم اور رکاوٹ غیب سے پیش نہیں آئی۔

اَلَمْ یَجْعَلْ کَیْدَھُمْ فِیْ تَضْلِیْلٍ ۝

کیا نہیں کر دیا اُن کا داؤ غلط

یعنی بیت اللہ کے مقابلے میں انہوں نے جو دوسرا گھر بنایا تھا اور رعایا کو حکم دیا تھا کہ اس کا طواف کریں، تو یہ بیت اللہ کی حرمت کو ختم کرنے کی ایک بہت بڑی تدبیر تھی مگر وہ تدبیر بیکار چلی گئی، اور اس گھر کے خراب وذلیل ہونے سے ان کی بہت ذلت ہوئی۔

اگرچہ عقل مندوں کو طویل محنت کے ضائع ہو جانے سے کافی عبرت ونصیحت حاصل ہو جاتی ہے لیکن اس گروہ کے لئے اسی پر اکتفاء نہ فرمایا بلکہ ایک اور آسمانی عذاب ان پر مسلط ہوا چنانچہ فرماتے ہیں:

وَّاَرْسَلَ عَلَیْھِمْ طَیْرًا اَبَابِیْلَ ۝

اور بھیجے اُن پر اُڑتے جانور ٹکڑیاں ٹکڑیاں

ابابیل کی تحقیق

ابابیل کا لفظ لغت میں جوق در جوق کے معنی میں آتا ہے، اور اس کا واحد مستعمل نہیں ہے، قیاس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا واحد "ابیل" "ابول" یا "ابالہ" ہے، عرف میں "ابابیل" ان پرندوں کو کہتے

ہیں جن کی شکل میں وہ غیبی پرندے سنگریزے لے کر آئے تھے۔

ابابیل جیسے کمزور جانور کے انتخاب میں حکمت

ابرہہ کعبہ کو گرانے کے لئے بڑے بڑے جانوروں یعنی ہاتھیوں کو لایا تھا اس کے مقابلے میں ابابیل جیسے کمزور جانوروں کو کنکریاں دے کر بھیجا گیا، تاکہ معلوم ہو جائے کہ اللہ کی تائید حاصل ہو تو ایک کمزور مخلوق بھی بڑی طاقتور مخلوق کو زیر کر سکتی ہے اور اگر اللہ کی تائید شامل نہ ہو تو بڑی سے بڑی طاقتور مخلوق بھی کچھ نہیں کر سکتی۔

تَرْمِيهِم بِحِجَارَةٍ مِّن سِجِّيلٍ ۝

پھینکتے تھے اُن پر پتھریاں کنکر کی

"سِجِّيلٍ" کی تحقیق

"سِجِّيلٍ" معرب ہے "سنگ گل" کا یعنی وہ مٹی جو پک کر پتھر کی طرح ہو جائے، جس کو ہندی زبان میں کھنگر کہتے ہیں۔

ان پرندوں کے غول کے غول لانے میں حکمت یہ تھی کہ جب ان پر کنکر برسیں گے تو وہ لوگ ادھر ادھر بھاگیں گے، اس لئے غول کی ضرورت تھی جو ہر طرف بھاگنے والوں پر کنکر برسائے، اور ان کا کام تمام کرے۔ اور ان کنکریوں کا جو کچھ اثر ان لوگوں کے جسموں پر ظاہر ہوا تھا اس کو بیان فرماتے ہیں

فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّأْكُولٍ ۝

پھر کر ڈالا اُن کو جیسے بُھس کھایا ہوا

یہ اشارہ ہے ان کے اعضاء کے ٹوٹ پھوٹ جانے کی طرف، یعنی ان کی شکل وصورت اور بدن سب کچھ بگڑ گیا، اور ان کنکریوں میں یہ اثر خرقِ عادت کے طور پر تھا، گویا ان پتھروں میں کچھ اس قسم کا زہر تھا کہ بدن پر لگتے ہی سارا بدن چکنا چور ہو جاتا تھا، اس میں خشکی سرایت کر جاتی تھی اور سارے جوڑ بند اُکھڑ پکھڑ جاتے تھے۔

اس واقعے کی خرقِ عادت باتیں

یہ واقعہ اللہ کے عذاب کا ایک نمونہ تھا، اور اس میں کئی خرقِ عادت باتیں تھیں۔

(۱) ایک یہ کہ ہاتھیوں کا ٹھٹھک کر رہ جانا، اور ان کا بیٹھ بیٹھ جانا لیکن ایک قدم آگے نہ بڑھانا۔

(۲) دوسرے چڑیوں کا اتنی کثرت سے دریائے شور کی طرف سے آنا کہ جو پرندوں کی بود و باش کی جگہ نہیں ہے، اور اس واقعے کے بعد بھی پھر کسی نے ان چڑیوں کو نہیں دیکھا۔

(۳) تیسرے ان کنکریوں کا ایسی جگہ سے لانا کہ جس ٹھکانے کا کسی کو علم نہیں ہے۔

(۴) چوتھا یہ ہے کہ ان معمولی کنکریوں کی غیر معمولی تاثیر۔ واللہ اعلم بالصواب

مقدمہ سورۃ القریش

یہ سورت مکی ہے، اس میں چار (۴) آیات، سترہ (۱۷) کلمات، اور تہتر (۷۳) حروف ہیں۔

کچھ قریش کے متعلق

قریش ایک قبیلے کا نام ہے جو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اکثر کبار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اسی قبیلے سے تھے، یہ قبیلہ مکہ کا رہنے والا ہے، بیت اللہ اور زمزم کے کنویں کی خدمت ہمیشہ سے ان کے پاس رہی ہے، اسی وجہ سے شام و یمن کے رہنے والے سردار بھی بیت اللہ کے احترام میں اس قبیلے کا بھی احترام کرتے تھے، عرب کے دوسرے علاقوں کے لوگ بھی اس وجہ سے ان کا احترام کرتے تھے، یہ لوگ جہاں بھی جاتے تھے ان کو نذر و نیاز ملتی تھی، ان کے تجارتی مال سے محصول نہیں لیا جاتا تھا، یہاں تک کہ ڈاکو بھی خانہ کعبہ کے ادب میں ان سے چھیڑتے نہیں تھے۔

اس قبیلے کی عادت تھی کہ گرمیوں میں یہ لوگ تجارتی سفر کے لئے شام جاتے تھے اور سردیوں میں یمن کا سفر کیا کرتے تھے اور ان سفروں میں وہ بہت مال و دولت کما کر لاتے تھے، بلکہ نذر و نیاز بھی لاتے تھے، اسی ذریعے سے مکہ میں ان کی بہت اچھی گذر اوقات ہو رہی تھی، حالانکہ مکہ کی سرزمین بالکل خشک ہے نہ زراعت اس میں ہو سکتی تھی اور نہ درخت سرسبز رہ سکتے تھے، ہر طرف خشک پہاڑ کھڑے ہیں۔

اللہ تعالیٰ اس سورت میں قریش کو ان نعمتوں کی یاد دلاتے ہیں، کہ اگر تم اللہ تعالیٰ کی باقی نعمتوں جو عرش سے فرش تک بھری ہوئی ہیں، ان سے کوتاہ نظری کرتے ہو تو سب سے بڑی نعمت کہ خانۂ کعبہ کی برکت سے تمہاری مدد کی ہے اس سے صرف نظر کیسے کر سکتے ہو؟ اس نعمت کے شکر کے طور پر ضروری ہے کہ تم اسی کی عبادت کرو، اسی لئے اس سورت کا نام سورۂ قریش رکھا ہے کہ اس سورت میں خاص قریش پر کئے جانے والے احسانات کا ذکر ہے۔

قریش متبوع ہیں اور باقی لوگ ان کے تابع

حقیقت میں قریش پر احسان کرنا سارے عالم پر احسان کرنا ہے، اور ان سے عبادت کا مطالبہ کرنا گویا سارے عالم سے عبادت کا مطالبہ کرنا ہوا، اس لئے کہ متبوعیت میں ان کا مرتبہ ایسا ہی ہے جیسا

قرآن کا مرتبہ دوسری کتابوں کی بنسبت ہے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ جب عالم سے کفروشرک کو دفع کرنے اور اس کی اصلاح کی طرف باری تعالیٰ کا ارادہ ہوا اور اس کام کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو منتخب فرمایا تو پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں اس عظیم کام کے متعلقات ولوازمات اور علوم ومعارف کا القاء ہوا تو ضروری ہوا کہ اس مہم کے شروع کرنے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے قبیلے سے مدد حاصل کریں، اس لئے کہ قبیلہ آدمی کے اخلاق وعادات اور جملہ احوال سے واقف ہوتا ہے ایسی واقفیت دوسرے لوگوں کو نہیں ہوتی۔

دوسری وجہ (قبیلے سے اس کام کی ابتداء کرنے کی) یہ بھی ہے کہ آدمی کا قبیلہ،قوتِ فکر، صفائی ذہن، اور استعداد میں دوسرے لوگوں کی بنسبت آدمی کے زیادہ قریب ہوتا ہے نیز حمیّتِ داعیہ اس میں زیادہ ہوتی ہے، (یعنی غیرت) گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قبیلہ اسلام لانے کے بعد باقی امت کی نسبت سے پیغمبر کا حکم رکھتا ہے، اسی لئے حدیث شریف میں آتا ہے "تعلموا من قریش ولا تعلموھم" یعنی قریش سے سیکھو ان کو سکھاؤ نہیں۔ اور یہ بھی فرمایا "الناس تبع فی ھذا الشان بقریش" یعنی اس بات میں سب لوگ قریش کے تابع ہیں۔

اسی لئے قرآن قریش کی زبان میں نازل ہوا، تاکہ وہ اس کی باریکیوں کو سمجھیں اور دوسروں کو سمجھائیں، یعنی نبوت کے معنی تمام قریش میں پھیلے ہوئے تھے اور ازل سے یہ بات مقدر ہو چکی تھی کہ دین کی ریاست اور اسلام کی سلطنت ہجرت کی ابتداء سے لے کر چھ سو چھپن (۶۵۶) ھ کے اختتام تک قریش کے اندر رہے گی، اس کے بعد تاتاریوں کے ہاتھوں یہ سلطنت ختم ہوگی اور ترکوں کے ہاتھ آجائے گی، چنانچہ "خوف" کا لفظ اسی پر دلالت کرتا ہے یعنی اس لفظ سے تاریخ نکلتی ہے۔

اور انسانوں کی فطرت میں یہ بات داخل ہے کہ وہ بڑے، اور عزت والے لوگوں کا طریقہ اور دین اختیار کرتے ہیں، اس لئے حکمت کا تقاضا یہی تھا کہ قریش (جو کہ عربوں میں عزت والے لوگ تھے) کی اصلاح کی کوشش کی جائے، دوسرے لوگ ان سے متاثر ہو کر وہ بھی ٹھیک ہو جائیں گے۔

اس سورت کے نازل ہونے کا سبب اسی تقریر سے واضح ہو جاتا ہے۔

تمت المقدمة والحمدلله

تفسیر سورۃ القریش

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لِإِيلَافِ قُرَيْشٍ ۝

اس واسطے کہ مانوس رکھا قریش کو

یہاں پر لام قسمیہ ہے جیسے "للّٰہ لا یؤخر الأجل" میں ہے،

قریش کا تعارف اور وجہ تسمیہ

قریش نضر بن کنانہ کی اولاد کو کہتے ہیں، اور نضر بن کنانہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تیرہویں دادا ہیں، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب مبارک اس طرح ہے، محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قصی بن کلاب بن مرّہ بن کعب بن لوئ بن غالب بن فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ جو نضر بن کنانہ کی اولاد میں ہے وہ قریشی ہے۔

گردشِ زمانہ سے نضر بن کنانہ کی اولاد مکّے سے نکل کر ادھر ادھر منتشر ہو گئی تھی، پھر "قصی" جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پانچویں دادا ہیں، انہوں نے ان سب کو ادھر ادھر سے جمع کر کے دوبارہ مکہ میں آباد کیا اسی لئے قصی کو "مجمع" بھی کہتے ہیں اور اس قبیلے کو قریش اس لئے کہتے ہیں کہ قریش اصل میں ایک سمندری جانور کا نام ہے جو تمام جانوروں پر غالب ہوتا ہے اور سب کو کھا جاتا ہے، تو یہ قبیلہ بھی فصاحت و بلاغت اور سخاوت و شجاعت میں تمام قبائل پر غالب تھا اس لئے اس کا نام "قریش" پڑ گیا۔

إِيلَافِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَاءِ وَالصَّيْفِ ۝

مانوس رکھنا اُن کو سفر سے جاڑے کے اور گرمی کے

قریش کے اسفار میں حکمتیں اور فوائد

اس قَسم کے کھانے میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ اس ضمن میں ان لوگوں کی معاش اور رزق کی فراخی کے لئے جو تدبیر اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرمائی گئی وہ نہایت ہی عجیب ہے، اور اس مسبب

الاسباب کی کمال حکمت پر دلالت کرتی ہے۔

اس لئے کہ جس شہر کے لوگ اسی شہر اور اس کے گرد و نواح سے اپنے معاش کے اسباب پیدا نہ کرسکیں وہ شہر خشک، اور سنگلاخ پہاڑوں اور بنجر زمینوں پر مشتمل ہو جن میں کوئی پیداوار نہ ہوتی ہو، تو اس شہر کے ویران ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی، لوگ تلاش معاش کے سلسلے میں دوسرے ملکوں اور علاقوں کی طرف چلے جائیں گے مکہ کی یہی صورتحال تھی لیکن اس شہر کو آباد رکھنے اور ویران ہونے سے بچانے کی تدبیر اللہ تعالیٰ نے یہ فرمائی کہ اس شہر میں اپنا گھر تعمیر فرمایا، لوگوں کے دلوں میں اس کی عظمت و محبت ڈال دی اور اس گھر کے جوار میں رہنے والوں کے دل میں گرمیوں اور سردیوں میں تجارتی سفر کا شوق ڈال دیا، تاکہ وہ دور دراز سے مال و اسباب کما کر اس شہر میں لائیں، اور اس مقدس مقام میں رہنا ان کے لئے ممکن ہو سکے۔

قریش کے سفر کی قَسم کھانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ عام طور پر ہمیشہ سفر کرنا اور بالخصوص شدید سردی یا گرمی میں نہایت مشکل ہوتا ہے لیکن قریش اپنے ان سفروں کے ایسے عادی ہو گئے تھے کہ ان کو کچھ بھی گرانی نہیں ہوتی تھی، تو گویا یہ ایک خرقِ عادت واقعہ تھا اس لئے قَسم کھانے کے قابل ہوا۔

قریش کا گرمی و سردی میں سفر کرنے کا اس طرح عادی بن جانے کا ایک عظیم فائدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے بعد ظاہر ہوا، وہ یہ کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم دین کی ترقی کے لئے اور جہاد کے لئے مشکل ترین سفروں سے گھبراتے نہیں تھے، چنانچہ انہوں نے مدینہ سے لے کر قسطنطنیہ تک اور کابل و اندلس تک دین کو پھیلایا اور دنیا کے طویل و عریض رقبے پر انہوں نے سفر کئے، اور یہی سفر کی عادت ان کے لئے بہت بڑی دولت ثابت ہوئی۔

فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ ۝

تو چاہئے کہ بندگی کریں اس گھر کے رب کی

اس لئے کہ لوگوں کے درمیان قریش کی عزت و احترام اور ان کے معاش کی فراخی یہ سب اسی گھر کی بدولت ہے، تو جب لوگوں کے دلوں میں اس گھر کے خادموں کی اتنی تعظیم ہے تو اس گھر کے خادموں کے لئے ضروری ہے کہ اس گھر کے مالک کی کماحقہ تعظیم کریں، اسی لئے "رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ" کا لفظ

یہاں لائے ہیں، گویا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگرچہ تمہاری کوتاہ نظری کی وجہ سے تمہیں اس کی ربوبیت نظر نہیں آتی مگر اس گھر کی عظمت تو کھلی آنکھوں تم دیکھتے ہو، لہٰذا اگر اس گھر کا مالک ہی سمجھ کر اس کی عبادت کرو تو وہ اس کا مستحق ہے۔

الَّذِیٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۵

جس نے اُن کو کھانا دیا بھوک میں

یعنی جس علاقے سے ان کا تعلق ہے وہ تو بے آب و گیاہ خشک وادی ہے، اگر اللہ تعالیٰ اپنے گھر کی آبادی کے لئے ان کی روزی کی تدبیر نہ فرماتے تو یہ یہاں بھوکوں مرجاتے۔

وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ۵

اور امن دیا ڈر میں

یعنی باوجود اس کے کہ عرب کے قبائل میں قتل و غارت گری اور لوٹ مار روزمرہ کا معمول تھا لیکن قریش کو حدود حرم کے اندر ایسا امن و اطمینان عطا فرمایا کہ اگر کوئی کسی کو قتل بھی کر کے حدود حرم کے اندر آجاتا تو اس سے کوئی تعرض نہیں کرتا تھا، یہ بات لوگوں کے دلوں میں اللہ نے ہی ڈالی تھی، کہ اس قدر بیت اللہ کا وہ احترام کریں۔

حرم کی حدود بعض اطراف سے دس کوس (بیس میل) بعض اطراف سے چھ کوس (بارہ میل) اور کسی طرف سے تین کوس (چھ میل) ہے۔

بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہاں خاص قسم کے خوف سے امن مراد ہے اور وہ خاص خوف جذام کے مرض کا خوف ہے کہ حرم میں یہ بیماری لاحق نہیں ہوتی، چنانچہ مدت دراز سے اس کا تجربہ ہو رہا ہے کہ حرم کے اندر کسی کو جذام نہیں ہوا۔ واللہ اعلم بالصواب

تم تفسیر سورۃ القریش والحمدللہ

مقدمہ سورۃ الماعون

یہ سورت مکی ہے، اس میں چھ (۶) آیات، پچیس (۲۵) کلمات اور ایک سو پچیس (۱۲۵) حروف ہیں۔

وجہ تسمیہ

اس سورت کا نام ''ماعون'' اس لئے ہے کہ ''ماعون'' (برتنے کی چیز) دینا احسان کا ادنیٰ درجہ ہے اس سے منع کرنا اللہ سے دوری، حجاب اور عتاب وسزا کا سبب ہے، جب اس ادنیٰ درجے کے احسان میں کوتاہی ایسے وبال کا باعث ہے تو پھر اللہ کے اور بندوں کے وہ حقوق جو واجب ہیں ان سے تو بہت ڈرنا چاہئے، اوران امور سے ڈرانا ہی قرآن کا اہم مقصد ہے۔

(تو گویا ''ماعون'' نام رکھ کر اس طرف اشارہ کردیا گیا)

سورۂ ماعون کے دو حصّے

یہ سورت دو حصوں پر مشتمل ہے، پہلا نصف کافروں کے بارے میں ہے اور دوسرا نصف منافقین کے بارے میں ہے۔

شان نزول

اس کے نازل ہونے کا سبب یہ ہوا تھا کہ ابوجہل کی یہ عادت تھی جب کوئی مالدار آدمی بیمار ہوتا اور قریب الموت ہو جاتا تو یہ اس کے پاس جاتا اور کہتا کہ تم اپنے یتیموں کو میرے سپرد کردو، میں ان کی دیکھ بھال اور خبر گیری کروں گا، دوسرے ورثاء ان پر ظلم کریں گے، چنانچہ اس طرح وہ یتیموں کی کفالت کے نام پر ان کے مال پر قبضہ کر لیتا، پھر ان کو اپنے دروازے سے دھتکار دیتا، وہ بے چارے بھوکے ننگے مارے مارے پھرتے رہتے۔ چنانچہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس کا ستایا ہوا ایک یتیم حاضر ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے فریاد کی کہ مجھ پر ابوجہل نے ظلم کیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس یتیم کو لے کر ابوجہل کے پاس تشریف لے گئے، اور ابوجہل کو قیامت کی باز پُرس سے خوف

دلایا، کہ ایسا نہ کرو، تو ابو جہل نے آپ کی نصیحت کے جواب میں قیامت کا انکار کیا اور کہا کہ قیامت وغیرہ کچھ نہیں، آپ وہاں سے رنجیدہ ہو کر واپس تشریف لائے، اس موقعہ پر یہ سورت نازل ہوئی۔
واللہ اعلم بالصواب

تفسیر سورۃ الماعون

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ ○

تُو نے دیکھا اُس کو جو جھٹلاتا ہے انصاف ہونے کو

دین کا معنی

یہاں دین کے دو معنی ہو سکتے ہیں، ایک ''ملت'' دوسرا ''جزاء'' اس لئے کہ یتیموں اور بے کسوں پر ظلم کرنا، فقراء اور محتاجوں کے ساتھ رحم کا معاملہ نہ کرنا ملت کو جھٹلانے کی علامت ہے، چنانچہ دین میں بار بار اسی بات کی تاکید آئی ہے، اسی کے ساتھ ساتھ یہ جزاء کے جھٹلانے کی بھی علامت ہے اس لئے کہ جو آدمی جزاء کا اعتقاد رکھتا ہو، وہ اللہ سے ڈرتا ہے اور جو اللہ سے ڈرتا ہے وہ اس طرح کے کام نہیں کرتا، کہ اس کو باز پُرس کا خوف ہوتا ہے۔

آگے دین کی تکذیب کرنے والوں کی علامات بیان فرما رہے ہیں تا کہ اگر کوئی علامات سے ان کو پہچاننے چاہے تو پہچان سکے، چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں:

فَذٰلِکَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ ○

سو یہ وہی ہے جو دھکے دیتا ہے یتیم کو

یعنی جبر اور سینہ زوری سے وہ یتیموں کا حق کھاتا ہے، حالانکہ یتیم تو انتہائی کمزور ضعیف ہوتا ہے جو آدمی جزاء کا اعتقاد رکھتا ہے وہ تو اپنے خاص مال سے ان لوگوں کے ساتھ احسان کرتا ہے، اور یتیم پر اس کی خاص عنایت ہوتی ہے اس لئے کہ یتیم تمام کمزوروں اور محتاجوں میں سب سے زیادہ کمزور و محتاج ہوتا

ہے، اس لئے کہ عمر بھی بہت کم ہوتی ہے خود کمائی کے قابل نہیں ہوتا نہ اس قابل کہ معاش کے سلسلے میں کوئی اور حیلہ یا تدبیر کر سکے، پھر کوئی والی وارث بھی نہیں جو اس کی خبر گیری کر سکے تو ایسے قابلِ رحم پر اگر کوئی احسان نہ کر سکے تو حق تلفی تو نہ کرے مگر اس کے باوجود جو ایسے مسکین و کمزور پر بے دھڑک ظلم کرتا ہے یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ وہ اعمال کی جزاء و سزا کا عقیدہ و یقین ہی نہیں رکھتا۔

علامت بیان کرنے کے بعد اب اس بات کو بیان فرماتے ہیں کہ یتیم کو دھتکارنے کی علت اس ظالم میں انتہائی درجے کا بخل اور مال کی محبت ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝

اور نہیں تاکید کرتا محتاج کے کھانے پر

اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ یہ خود تو اپنے مال سے فقیروں کو کیا دیتا یہ دوسروں کو بھی اس بات پر آمادہ نہیں کرتا، اس کا بخل تو حد سے گذرا ہوا ہے، معلوم ہوا کہ یتیموں کو اپنے دروازے سے اس لئے نہیں ہانکتا کہ اس میں یتیم کی کوئی مصلحت ہے بلکہ اس کا یہ عمل بخل اور مال کی شدید محبت کی وجہ سے ہے۔

جب یہ دو عمل یتیم کو دھتکارنا اور فقیروں کو کھانا نہ کھلانا دین کی تکذیب کے علامت ٹھہرے حالانکہ مسکینوں کو کھانا کھلانا اور یتیم کے ساتھ حسن سلوک کرنا دین کے بہت بڑے عمل بھی نہیں ہیں تو اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ دین کے ان سے بڑے اعمال میں کوتاہی کرتے ہیں ان کا حال تو اور زیادہ خراب ہوگا جیسے نماز میں کوتاہی کرنا، زکوٰۃ دینے میں بخل کرنا وغیرہ ہے، اسی لئے فرمایا:

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝

پھر خرابی ہے اُن نمازیوں کی

الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۝

جو اپنی نماز سے بے خبر ہیں

یعنی خرابی ہے ان کی جو نماز کے مکلف ہیں، اور نماز ایک ایسا عمل ہے جو کفر و اسلام کے درمیان

فرق ظاہر کرنے والا ہے، جو اس کی حقیقت سے غافل ہیں اور نہیں سمجھتے کہ نماز کس کے ساتھ مناجات کرنے کا نام ہے، اور اس سے مقصود کیا ہے، ان کے لئے ہلاکت وخرابی ہے۔

نماز کی حقیقت اور اس پر غفلت کی صورتیں

یہ لوگ نماز کی حقیقت سے غافل ہیں جبھی تو لوگوں کے سامنے پڑھ لیتے ہیں اور کوئی نہ ہو تو نہیں پڑھتے، یا فراغت میں پڑھ لی، اور ذرا کوئی دنیاوی کام میں مصروفیت ہوئی تو نماز کی پرواہ ہی نہ کی، یا بعض ارکان حضورِ قلب سے ادا کئے اور بعض ارکان خیالات ووساوس میں گم ہوئے ادا کئے، یہ ساری بے ادبیاں ہیں اگر نماز کی حقیقت سے آگاہ ہوتے تو ان سے یہ سرزد نہ ہوتیں، نماز کی حقیقت یہ ہے کہ دل کی تعظیم کے ساتھ حق کا مراقبہ کرنا، اور تمام اعضاء سے عاجزی وانکساری کا اظہار کرتے ہوئے دل وجان سے اللہ تعالیٰ کی طرف دھیان کرنا، اور یہ مراقبہ ودھیان مذکورہ کوتاہیوں کے ساتھ حاصل نہیں ہوسکتا۔

الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ۝

وہ جو دکھلاوا کرتے ہیں

یعنی صرف نماز ہی نہیں اپنی تمام عبادات وطاعات کو یہ لوگ دکھلاوے اور شہرت کی نیت سے کرنے کی وجہ سے برباد کرڈالتے ہیں۔

ریاء شرک سے بھی بدتر ہے

ریاء اور دکھاوا شرک کا ہی ایک چھپا ہوا شعبہ ہے، بلکہ شرک سے بھی بدتر ہے، اور اس کی دو وجہیں ہیں:

(۱) ریاکار لوگوں کو اللہ پر ترجیح دیتا، ان کو اللہ سے زیادہ عزیز رکھتا اور چاہتا ہے۔

(۲) دوسرے یہ ایسا شرک ہے جو کسی دنیوی کام میں استعانت ومدد کے اندر نہیں ہورہا بلکہ خالص عبادت وطاعت کے اندر ہورہا ہے جو اخلاص وتوحید کا مقام ہے، لہٰذا یہ کفر کی بدترین قسموں میں سے ہے، اعاذنا اللہ منہ

وَ يَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ٥

اور مانگی نہ دیویں برتنے کی چیز

ماعون کی تفسیر میں مختلف اقوال

''ماعون'' کی تفسیر میں مختلف اقوال ہیں۔

(۱) اکثر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعینؒ سے منقول ہے کہ اس سے مراد زکوٰۃ ہے، کہ ریاء کار زکوٰۃ نہیں دیتا، باقی جو ضروری نفقات اس کے ذمّے واجب ہیں جیسے اہل وعیال کا خرچ وغیرہ تو وہ محض رسوائی کے ڈر سے دیتا ہے کہ نہ دینے کی صورت میں وہ مطالبہ کریں گے اور حاکم تک نالش کر سکتے ہیں، زکوٰۃ میں ایسا نہیں ہے اس لئے کہ وہ اللہ کا حق ہے، اور یہ اللہ سے ڈرتا ہی نہیں تو ادا کاہے کو کرے گا۔

(۲) بعض نے کہا کہ ''ماعون'' سے مراد گھر کے استعمال کا وہ سامان ہے جو عاریتاً ایک دوسرے کو دیا جاتا ہے جیسے ہانڈی، دیگچہ، پیالہ، سوئی دھاگہ، ڈول، کلہاڑا، پھاوڑا وغیرہ۔

(۳) حدیث میں آتا ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ ''ماعون'' کیا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، آگ، پانی اور نمک، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ جو کوئی کسی کو آگ دیتا ہے پھر اس آگ سے جو کچھ پکتا ہے گویا وہ اسی نے دیا ہے (یعنی اس کے دینے کا ثواب ملتا ہے) نمک دینے کی بھی یہی فضیلت ہے۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو آدمی کسی کو ایسی جگہ پانی دیتا ہے جہاں پانی کا قحط نہیں ہے گویا اس نے ایک غلام آزاد کیا، اور جو ایسی جگہ یا زمانے میں پانی دیتا ہے کہ پانی کا قحط ہے تو گویا اس نے مُردے کو زندہ کر دیا۔

مقدمہ سورۃ الکوثر

یہ سورت مکی ہے، اس میں تین (۳) آیات، بارہ (۱۲) کلمات اور بیالیس (۴۲) حروف ہیں۔

شانِ نزول

اس سورت کا شانِ نزول یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے دو صاحبزادے پیدا ہوئے، ''قاسم اور عبداللہ'' جن کا لقب ''طاہر اور طیب'' تھا۔ یہ دونوں پھول بچپن میں ہی دنیا سے رحلت فرما گئے، تو کافروں نے طعنہ کے طور پر کہنا شروع کر دیا کہ اس پیغمبر کی نسل منقطع ہوگئی، اب اس کے بعد اس کے دین کو کوئی قائم نہیں رکھے گا اس کے ساتھ ہی اس کا دین بھی ختم ہو جائے گا، اس موقعہ پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لئے یہ سورت نازل ہوئی۔

وجہ تسمیہ

اس سورت کا نام کوثر اس لئے رکھا ہے کہ اس میں کوثر کا ذکر آیا ہے اور کوثر کا ذکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات کی بلندی اور مقام و مرتبے کی عظمت پر دلالت کرتا ہے، اس لئے کہ قیامت کے دن تمام انبیاء کرام علیہم السلام بھی پیاس کی حالت میں اس حوضِ کوثر کے محتاج ہوں گے جس کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ساقی ہوں گے۔

''کوثر'' ایک وسیع المعنی لفظ

(۱) ''کوثر'' لغت میں بہتی چیز کو کہتے ہیں، یہ مشتق ہے کثرت سے، اور یہ بہت زیادہ اولاد کو بھی شامل ہے (یعنی کوثر عطا کرنے کے یہ معنی بھی ہیں کہ ہم نے آپ کو بہت زیادہ اولاد عطا فرمائی ہے) اور اولاد دو قسم کی ہوتی ہے ایک حقیقی (صلبی) دوسری مجازی (روحانی) چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دونوں قسم کی اولاد اتنی زیادہ عطا فرمائی گئی کہ کسی اور پیغمبر کو اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں دی گئی۔

(۲) اور یہ لفظ علم کثیر کو بھی شامل ہے (یعنی ہم نے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو علمِ کثیر عطا کیا) تو علم کی جو کثرت و فراوانی اس امت میں ہے وہ بھی ظاہر ہے اس لئے کہ اس امت تک پہلے لوگوں مثلاً

یونانیوں، فارسیوں، اور ہندوؤں کے علوم بھی پہنچے، پر ان علوم میں اس امت کے افراد نے جو کچھ تحقیق و تنقیح کی ہے اتنی وہ لوگ خود بھی نہیں کر سکے تھے، اس کے علاوہ نئے علوم مثلاً نحو، صرف، معانی، بیان، تفسیر، حدیث، اصول، فقہ اور علم الحقائق جتنے اس امت کو عطاء کئے گئے ہیں، پہلے لوگوں کو ان کی ہوا بھی نہیں لگی تھی۔

(۳) لیکن عرف میں ''کوثر'' کا لفظ مخصوص ہے اس حوض کے لئے جو قیامت کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کیا جائے گا، اور حقیقت میں وہ حوضِ کوثر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کی گئی اس خیر کثیر اور آپ کے اُن کمالات کی وسعت وکشادگی کا نمونہ ہے (صورتِ مثالیہ) جو آپ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہیں چنانچہ اسی وجہ سے قرآن، نماز پنجگانہ، اور کلمہ طیبہ کو کوثر کہا گیا ہے اور حقیقت وہی ہے جو پہلے ذکر کر دی گئی ہے۔

کچھ حوضِ کوثر کی صفات

حوضِ کوثر میں جنت کی ایک مخصوص نہر سے پانی آتا ہے اس نہر کا نام بھی کوثر ہے معراج کی رات جنت کی تمام نہریں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھی تھیں، اس نہر کا چوڑاؤ (عرض) ایک مہینے کی مسافت کے برابر ہے، اس کے کنارے پر ایسے موتیوں کے خیمے ہیں جو اندر سے خالی ہیں، اس کے کناروں پر سونے چاندی کے جام آسمان کے تاروں کی طرح رکھ دیئے گئے ہیں، اس نہر کے اردگرد ایسے درخت ہیں جن کے تنے سنہری، اور شاخ زمرّدی ہیں، اس نہر کے کنکر پتھر موتی اور یاقوت ہیں، اور مٹی مشک سے زیادہ خوشبودار ہے، اس کا پانی شہد سے زیادہ میٹھا، دودھ سے زیادہ سفید اور برف سے زیادہ ٹھنڈا ہے، جو ایک بار اس کا ایک گھونٹ بھی پی لے اس کی لذت اور مزے کو کبھی نہیں بھولے گا اور نہ اس کو پیاس لگے گی۔

سورۃ الکوثر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِنَّآ اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ ○

بیشک ہم نے دی تجھ کو کوثر

"انا" کہہ کر "کوثر" کے عطا کرنے کی نسبت ابتداء ہی اپنی طرف فرمائی اس لئے کہ مخاطب وہ عظیم المرتبت وجلیل القدر پیغمبر ہیں جن کی نظر نعمت وبخشش کی بجائے ہر وقت صرف نعمت عطا کرنے والے کی ذات پر رہتی ہے، پھر دوبارہ تاکید کے لئے "اعطینک" فرمایا گویا اس بات کی طرف اشارہ فرمایا کہ اگرچہ آپ کی بلند نظر نعمتوں کی بجائے منعم پر ہے تاہم جو ہماری عطا کردہ نعمتیں ہیں سوانکی تعظیم ضروری ہے۔

فَصَلِّ لِرَبِّکَ

سو نماز پڑھ اپنے رب کے آگے

شکر کے طور پر نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا، اگرچہ اس موقعہ پر جو بھی عبادت ہوتی مقبول ہوتی، لیکن نماز دنیا میں ایسی عبادت ہے جو "کوثر" کا نمونہ ہے، کہ اس میں پروردگار سے مناجات شہد سے زیادہ میٹھی ہے، جو انوارِ غیبیہ اس میں چمکتے ہیں وہ دودھ سے زیادہ سفید ہیں، وہ یقین جو اس سے حاصل ہوتا ہے وہ برف سے زیادہ ٹھنڈا اور لطف اندوز ہے، اور وہ لطف وسکینہ جو نماز پڑھنے والے کے دل پر نازل ہوتا ہے وہ مکھن سے زیادہ نرم وملائم ہے، پھر وہ آداب وسنن جو اسے گھیرے ہوئے ہیں وہ اس کی معنوی زندگی کی شادابی کے نشان ہیں جو زمرّد کے درختوں کی مانند ہیں، وہ اذکار وتسبیحات جو اس کے ہر رکن میں مقرر ہیں سونے چاندی کے پیالوں کے مانند ہیں کہ محبت الٰہیہ کی شراب کا ایک ایک گھونٹ ان کے ذریعہ باطن میں جاتا اور شوق کی پیاس کو تسکین بخشتا ہے۔

اس جگہ "ربک" فرمایا "لنا" نہیں فرمایا، اس بات کی طرف اشارہ کرنے کے لئے کہ اللہ رب العزت کی بڑائی کے مناسب شکر ادا کرنا تو کسی فردِ بشر کے بس کا کام نہیں ہے۔

اولاد کی نعمت کے شکر میں قربانی کرنا

جب فرزندوں کے بدلے میں کوثر کی نعمت عطا فرمائی گئی تو ضروری ہوا کہ ایسا شکر طلب کریں جیسا شکر فرزند دینے کی صورت میں ہوتا ہے اس لئے فرمایا:

وَانْحَرْ ۝

اور قربانی کر

یعنی قربانی کیجئے جس طرح بیٹا عطا ہونے کی صورت میں لوگ عقیقہ کرتے ہیں۔

قربانی کی حقیقت

اللہ کا شکر ادا کرنے کے موقعہ پر مال و جاہ، اور دوسری پسندیدہ چیزوں کو قربان کرنے کا معمول تو تمام لوگوں میں ہے لیکن شکر کے طور پر جان دینے کا رواج و دستور نہیں ہے، اسی لئے شریعت نے جان دینے کے بدلے میں جانور کو ذبح کرنے کا عمل مقرر فرمایا، تو قربانی کی حقیقت یہ ہوئی کہ یہ صورتاً اگرچہ اللہ کی رضا میں مال ہی دینا ہے لیکن معناً جان کی قربانی ہے (کہ جان کو قربان کرنے کے بدلے میں جانور کو ذبح کرنا مقرر ہوا ہے)

انسان کی قربانی جائز نہ ہونے کی وجہ

کسی انسان کے لئے شرعاً جائز نہیں کہ وہ اپنی جان کو قربانی کے طور پر ذبح کر ڈالے یا اپنے اولاد میں سے یا غلام باندی میں سے کسی کو ذبح کرے، اس لئے کہ انسان انسانی جان کا مالک نہیں، انسانی جان کا مالک صرف اللہ تعالیٰ ہے، اسی لئے غلام باندی کا قتل جائز نہیں ہے، غلام باندی کی مِلک، ان کے منافع اور کمائی کا انسان مالک ہوتا ہے جان کا مالک نہیں ہوتا۔

صرف چار قسم کے جانوروں میں قربانی مخصوص ہونے کا راز

اگر اللہ تعالیٰ کسی سے اس کے غلام یا باندی کی جان طلب کرے تو اس پر عمل کی اس کے سوائے اور کوئی صورت نہیں کہ آدمی کسی ایسے جانور کی قربانی کرے جو اس کا اپنا پالتو ہو یا کسی دوسرے کا پالتو ہو۔

اور یہی نکتہ اور راز ہے اس بات کا کہ قربانی چار قسم کے جانور یعنی اونٹ، گائے، اور بھیڑ، بکری کے

علاوہ باقی جنگلی جانوروں یا درندوں کی کرنا جائز نہیں، اس لئے کہ حقیقت میں انسان انہی چار قسم کے جانوروں سے نفع اُٹھاتا ہے، مثلاً دودھ، گھی، سواری کے لئے اور باربرداری کے لئے استعمال کرنا، کھیتی باڑی کرنا اور نسل کو پالنا وغیرہ ہے۔

اِنَّ شَانِئَکَ هُوَ الْاَبْتَرُ ۝

بیشک جو دشمن ہے تیرا وہی رہ گیا پیچھا کٹا

"ابتـــر" لغت میں دُم کٹے کے معنی میں آتا ہے، لیکن عرب کے محاورے میں یہ لفظ اس آدمی کے لئے بھی بول لیتے ہیں جس کی اولاد باقی نہ رہے اور اس کا نام لیوا نہ رہے، تو اس آیت میں اشارہ اس بات کا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقی اور روحانی نسل قیامت تک رہے گی، جو منبر و محراب میں، اور مسجد کے میناروں پر چڑھ کر اللہ کے نام کے ساتھ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نام کو پکاریں گے، پھر نمازوں میں، اور آپؐ پر درود بھیجنے کی صورت میں آپؐ کے نام سے رطب اللسان رہیں گے، آپ کی محبت میں جان کی بازیاں لگا دیا کریں گے، اور آپ کے ہزاروں عاشق آپ کی قبر کی زیارت کے لئے ہر سال پروانہ وار حاضر ہوا کریں گے، پس آپ کا ذکر خیر تو جاری رہے گا، البتہ آپ کا نامراد دشمن ایسا گمنام ہوگا کہ سوائے لعنت کرنے اس کا ذکر بھی کوئی نہیں کرے گا، تو حقیقت میں "ابتـــر" تو آپ کا دشمن ہوا۔ الحمدللہ

مقدمہ سورۃ الکافرون

یہ سورت مکی ہے، اس میں چھ (۶) آیات، چھتیس (۳۶) کلمات اور ننانوے (۹۹) حروف ہیں

شانِ نزول

کفارِ قریش کی ایک جماعت جن میں ابو جہل، عاص بن وائل، ولید بن مغیرہ، اسود بن عبد یغوث اور اسود بن عبد المطلب تھے نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی زبانی یہ پیغام بھیجا کہ تم ہمارے معبودوں کی فرمانبرداری قبول کرو، ان کو بُرا نہ کہو، اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ان کی شفاعت کو تسلیم کرو، تو ہم بھی تمہارے معبود کی عظمت و بڑائی کو تسلیم کریں گے اور اس کی عبادت کریں گے، ان کے جواب میں یہ سورت نازل ہوئی۔

وجہ تسمیہ

سورۂ کافرون اس کا نام اس لئے رکھا کہ اس کے مضمون نے کافروں اور مسلمانوں کے درمیان عبادت کے معاملے میں دوٹوک فرق واضح کیا ہے جس کے لئے سارے انسان پیدا کئے گئے ہیں۔

تفسیر سورۃ الکافرون

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قُلْ يَآ اَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۝

تو کہہ اے منکرو

کفار سے مراد وہ ہیں جن کی حالتِ کفر میں ہی موت آئی ہو، اس لئے کہ آخر میں مرنے سے پہلے جو ایمان لے آیا وہ عند اللہ کافر نہیں ہے اگر چہ بظاہر لوگوں کی نظر میں کافر معلوم ہوتا ہے۔

لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ o

میں نہیں پوجتا جس کو تم پوجتے ہو

اس لئے کہ تمہارا معبود پتھر، درخت، پانی، آگ، کوئی ستارہ، شیطان، یا کسی بزرگ کی روح ہے، سوان سب چیزوں کو میں عبادت کے لائق نہیں سمجھتا، اگر تم ان چیزوں کے بارے میں یہ اعتقاد رکھتے ہو کہ یہ چیزیں معبود حقیقی کے مشابہ ہیں یا معبود حقیقی ان میں سما گیا ہے یا ان کے ساتھ متحد اور ایک ہوگیا ہے تو تمہاری عبادت صرف غیر معبود کے لئے ہوئی (سو میں کیسے غیر معبود کی عبادت کرسکتا ہوں)

وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ o

اور نہ تم پوجو جس کو میں پوجوں

یعنی اگرچہ تم اپنے معبودوں کو صفاتِ الٰہی کا مظہر جان کر ان کی عبادت کرتے ہو لیکن مخلوقات میں صفاتِ الٰہی کا ظہور مخلوق کی استعداد کی وسعت کے بقدر ہے کسی مخلوق میں یہ صلاحیت نہیں کہ اس میں صفاتِ الٰہیہ علی وجہ الکمال ظہور پذیر ہوں، ورنہ وہ مخلوق، مخلوق نہ ہوگی، اور اگر تم کمالِ ظہور کا اعتقاد رکھتے ہو تو اس طرح تو صفاتِ الٰہی میں نقص لازم آتا ہے، لہٰذا کسی لحاظ سے بھی ذاتِ الٰہی تمہاری معبود نہیں ہے۔

وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ o

اور نہ مجھ کو پوجنا ہے اُس کا جس کو تم نے پوجا

یعنی میں اگر اسمائے الٰہیہ کی عبادت کرتا ہوں اور تم ان اسماء کی صورتوں کی عبادت کرتے ہو تو اعلیٰ (اسمائے الٰہیہ) کی عبادت سے ادنیٰ (صورتوں) کی عبادت لازم نہیں آتی، (کہ کوئی کہنے لگے کہ دونوں کا معبود ایک ہی ہے)

وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ o

اور نہ تم کو پوجنا ہے اُس کا جس کو میں پوجوں

اس لئے کہ تم اسماء کی صورتوں (اور مظاہر) کی عبادت کرنے والے ہو جبکہ میری عبادت کا رُخ

اُن اسماء کی حقیقت کی طرف ہے۔

لَكُمْ دِيْنُكُمْ

تم کو تمہاری راہ

جس میں مظہر ظاہر کے ساتھ اور حقیقت صورت کے ساتھ مشتبہ ہوگئی ہے۔

وَلِيَ دِيْنِ ۝

اور مجھ کو میری راہ

جس میں کوئی التباس واشتباہ نہیں ہے، لہٰذا یہ دونوں دین (تمہارا اور میرا) نہ اصول میں شریک ہیں نہ فروع میں۔

ولا انتم عابدون الخ کو مکرر لانے کی وجہ

اس مضمون کو دو جگہ مکرر لانے کی وجہ یہ ہے کہ مشرکین دو قسم کے ہیں ایک قسم تو وہ ہے جو اپنے معبودوں کو صفاتِ الٰہیہ کے کمال کا مظہر سمجھتے ہیں اور ان کی عبادت کو خُدا کی عبادت تصور کرتے ہیں، اور دوسری قسم وہ لوگ ہیں کہ جن کی غرض اسمائے الٰہیہ کی عبادت ہے لیکن صورت کے پردے میں، اہلِ حق کے نزدیک یہ دونوں مرْدود ہیں، تو ان دونوں کی نفی کے لئے اس عبارت کو مکرر لائے ہیں۔

بعض نے اس تکرار کو حال واستقبال کے معنی پر محمول کیا ہے جو "لا اعبد" "ولا انا عابد" سے مفہوم ہوتا ہے۔

اور بعض نے حال اور ماضی کی نفی پر محمول کیا ہے جو "ما تعبدون" "ما عبدتم" سے مفہوم ہوتا ہے۔ والکل محتملٌ

حدیث میں آتا ہے جس نے یہ سورت پڑھی اس نے گویا چوتھائی قرآن پڑھا، تفسیر "کواشی" میں ہے کہ یہ سورت اور سورۂ اخلاص شقیقتین (حقیقی بہنیں) ہیں جو کوئی ان دونوں سورتوں کو پڑھتا رہے گا وہ کفر ونفاق سے پاک رہے گا۔

مسنون ہے کہ فجر کی سنتوں کی پہلی رکعت میں یہ سورۂ اور دوسری میں سورۂ اخلاص پڑھی جائے۔

یہ سورت آیتِ قتال سے منسوخ نہیں ہے

مشہور یہ ہے کہ یہ سورت آیتِ قتال سے منسوخ ہے، لیکن تحقیق یہ ہے یہ منسوخ نہیں ہے، اس لئے کہ اس سورت کا مضمون مسلمانوں اور کافروں کے دین میں مکمل فرق اور دو بالکل الگ الگ چیزیں ہونے کے بیان میں ہے، اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ کافروں سے بالکل تعرض ہی نہ کیا جائے، بلکہ دین کے جُدا ہونے کے بیان میں ہے اور مسلمانوں کے دین میں جہاد و قتال بھی ہے، لہٰذا آیتِ قتال سے اس کا منسوخ ہونا کسی طرح ثابت نہیں ہوتا۔ الحمدللہ

مقدمہ سورۃ النصر

یہ سورت مدنی ہے، اس کو سورۂ فتح بھی کہتے ہیں، اس میں تین (۳) آیات، انیس (۱۹) کلمات اور اناسی (۷۹) حروف ہیں۔ اس سورت کو سورۂ تودیع بھی کہتے ہیں، کہ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے قریب ہونے کی خبر اور امّت کو الوداع کرنے کا حکم ہے۔

اس سورت کا مضمون یہ ہے کہ انبیاء کرام کے ذمہ جو کام ہوتا ہے جب وہ انجام پا جاتا ہے تو پھر ان کو ضرور اللہ کی طرف واپس ہونا پڑتا ہے۔ کہ یہ دنیا دُکھوں اور نقائص سے بھری ہوئی ہے، یہ رہنے کی جگہ نہیں ہے۔ انبیاء کی مقدس ارواح یہاں صرف ضروری کاموں کی تدبیر کے لئے آتی ہیں، جب وہ ضرورت پوری ہو جاتی ہے تو واپس بلالی جاتی ہیں۔

اب رہی یہ بات کہ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں کون کون سے ضروری کاموں کی تدبیر کے لئے لائے گئے، اور وہ کام کب انجام کو پہنچے۔

راہِ حق سے ہٹانے والی چار چیزیں

تو جاننا چاہئے کہ راہِ حق سے بہکانے والی چار چیزیں ہیں۔

(۱) نفس

(۲) شیطان

(۳) وہ کفار جو شوکت و حکومت رکھتے ہوں۔

(۴) منافق جو پوشیدہ طریقے سے لوگوں کے دلوں میں شبہے ڈالتے ہیں۔

پہلے انبیاء کرام نفس و شیطان کے شرور سے بچانے کے لئے اور ان کے وساوس و شرور کو دور کرنے (کے طریقے بتانے) کے لئے مبعوث فرمائے جاتے تھے، اس لئے کہ ان دو چیزوں کا شر ہر شر کی جڑ اور بنیاد ہے، کفار و منافق ان دونوں کے فرمانبردار ہیں۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد ان چاروں چیزوں کی سرکوبی تھا، اسی لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین میں جہاد، فوج کشی، مفسدین کے لئے حدود و تعزیر کا طریقہ جاری ہوا، اور آپ کی شریعت بادشاہت کی صورت میں ہوئی، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتدائے بعثت سے نبوت کو

درجہ بدرجہ ترقی دیتے ہوئے خلافتِ کبریٰ کی انتہاء تک پہنچایا جب اس کام سے فارغ ہو چکے تو آپ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے پاس بلوالیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے صحابہؓ نے آپ کی خلافت تیس برس تک قائم رکھی اور خلافت کے ایسے اصول وقواعد جاری کئے کہ پچھلے لوگوں کے لئے دستور العمل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

تفسیر سورۃ النصر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ٥

جب پہنچ چکے مدد اللہ کی اور فیصلہ

اللہ کی مدد کی صورتیں اور فتح کی نوعیتیں اور درجات

کفار کے خلاف مدد و نصرت جہاد کا حکم نازل ہونے کے بعد شمشیر وسنان اُٹھانے سے حاصل ہوئی، منافقین واہلِ بدعت کے خلاف دلیل وحجت قائم کرنے سے، نفس کے خلاف ذکر کی کثرت و غلبے سے، اور شیطان کے خلاف تقویٰ لازم پکڑنے سے اللہ کی مدد شامل حال ہوئی۔

فتح سے مراد مکہ اور کفار کے دیگر علاقوں کی فتح، اور بتخانوں کا مسمار ہونا، علوم کی مشکلات کا حل ہونا اور باطنی احوال کی گرہ کشائی ہے۔

فتح کا ذکر نصرت کے بعد کرنے کی وجہ

فتح کو نصرت کے بعد ذکر کرنے سے اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ فتح کی ہر نوعیت اور اس کا ہر مرتبہ نصرت کے تابع اور اس کی فرع ہے، چنانچہ شہروں، علاقوں اور بتخانوں کی فتح کفار پر نصرت پانے کے تابع ہے، علوم میں شبہات کے ازالے کی فتح منافقین اور گمراہوں پر مدد کے تابع ہے، اور بلند مقامات واحوال کی فتح نفس وشیطان کے خلاف مدد و نصرت حاصل ہونے کے تابع ہے، پس نصرت سے اشارہ ہے ابتدائی اور متوسط مراتب کی طرف اور ''فتح'' سے اشارہ کمال کے انتہائی مراتب کی طرف ہے گویا وہ حرکت جو نقصان سے کمال کی طرف شروع ہوئی تھی وہ انتہا کو پہنچی اسی لئے فرمایا:

وَرَاَیۡتَ النَّاسَ

اور تو دیکھے لوگوں کو

یہاں لوگوں سے مراد عرب کے لوگ ہیں اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اوّلاً بعثت انہی کی طرف ہوئی تھی (اور وہی اولین مخاطب تھے) جب وہ اس دین میں داخل ہو گئے تو دوسروں کو قوتِ شمشیر کے رعب اور قوتِ برہان و دلیل سے اور نفس و شیطان کے فریب و مکائد کے ازالے سے داخل کریں گے، ورنہ ان کا دین میں دخول ناقص ہوگا۔

یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا ۝

داخل ہوتے دین میں غول کے غول

یعنی ایسے دین میں گروہ در گروہ داخل ہوں گے جس میں، شرک، بدعت، نفاق اور فجور کا دخل نہیں ہے، بلکہ داخل ہونے کے بعد حق سے باطل کی طرف میلان بھی نہ ہوگا۔

ان تینوں باتوں (نصرت، فتح اور اسلام میں فوج درفوج داخل ہونے) کی تفصیل یہ ہے کہ ہجرت سے ایک برس بعد مسلمانوں میں جنگ کی قوت پیدا ہوگئی، انصار کی جانبازیوں نے تہلکہ مچا دیا، یہ زمانہ نصرت کے ظہور و جوش کا تھا، پھر فتح مکہ کے بعد کفار کے بہت سے علاقے اور مکہ فتح ہونا شروع ہو گئے، اور نویں دسویں ہجری کو جا کر لوگوں کا بہت زیادہ رجوع ہو گیا، بہت سے قبیلے پورے اکٹھے اسلام میں داخل ہوئے۔ جیسے بنو اسد، بنی فزارہ، بنی کنانہ، بنی مرّہ، بنی ہلال، بنی عامر نجیب، دارم وغیرہ

شام، یمن اور عراق سے لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے اور اسلام قبول کیا۔ بعض نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت بابرکت میں رہ کر نفس و شیطان کے خلاف جہاد کرنے پر کمر باندھی اور بہت سے دین کی سربلندی کے لئے کفار کے خلاف میدانِ جہاد کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چار بڑے صحابہ (ابو بکر، عمر، عثمان، علی رضی اللہ عنہم) جو ابتدائے بعثت سے ہی آپ کے ہر کام میں خاص مشیر، اور معاون و مددگار تھے انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر طور طریقہ اور مزاج و مذاق اچھی طرح سے سمجھ لیا تھا، آپ کی خلافت و نیابت کی اہلیت ان میں پیدا ہو گئی تھی، اس لئے اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وجودِ مقدس ضروری نہ رہا تھا لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا

وقت مقرر قریب آ پہنچا تو آپ کو ایک اور کام پر مامور فرمایا گیا، جس کو آگے بیان فرماتے ہیں:

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ

تو پاکی بول اپنے رب کی

اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ عارف کو سلوک تنزیہی اور تحمیدی کی سیر کی انتہاء کے بعد ایک اور راہ کھولتے ہیں جس کی حقیقت یہ ہے کہ عارف اس کمال میں منفرد دیکھتا ہو جاتا ہے جو اس کو عطا کیا گیا ہے اور کوئی دوسرا اس میں شریک نہیں ہوتا۔

وَاسْتَغْفِرْهُ ط

خامیاں اور گناہ بخشوا اس سے

اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جب عارف مرتبۂ تکمیل تک پہنچ گیا، ہر طرح کے لوگ اس کے تابع ہو گئے، اور متبعین کی استعدادیں کمال ونقصان کے اعتبار سے مختلف ہیں اس لئے اس کو چاہئے کہ ناقصین کی تکمیل کے لئے ان کے واسطے مغفرت طلب کرے تا کہ ان کی استعداد کا نقصِ اصلی (وجبلی) اس کی اتباع کے سبب قیامت کے دن اس کے کمال کی طرف کھینچ جائے یہی حقیقت ہے شفاعت کی۔

اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۝

بیشک وہ معاف کرنے والا ہے

یعنی ناقصوں کی مغفرت اور اپنی رحمت سے ان کی تکمیل فرماتا ہے، سو اس سے بعید نہیں کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرنے والوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل کامل سے کامل کر دے۔

یہ سورت تمام سورتوں میں سب سے آخر میں نازل ہوئی اس کے بعد کوئی سورت نازل نہیں ہوئی، اور اس کے نزول کے بعد ہمیشہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر یہ دعاء جاری رہتی تھی:

"سبحانک اللھم وبحمدک اللھم اغفرلی"

نقل کیا جاتا ہے کہ جب یہ سورت نازل ہوئی تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ روئے لوگوں نے پوچھا آپ کیوں روئے تو اُنہوں نے کہا مجھے اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موت کی خبر معلوم ہو رہی ہے۔

مقدمہ سورۃ تبت

یہ سورت مکی ہے، اس میں پانچ (۵) آیات، بیس (۲۰) کلمات اور اکیاسی (۸۱) حروف ہیں۔

شانِ نزول

جب یہ آیت "وانذر عشیرتک الأقربین" نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوہِ صفا پر چڑھ گئے اور لوگوں کو آواز دی جب سب لوگ جمع ہو گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا اگر کوئی ایسی بات تم سے کہوں جو عقل میں نہ آتی ہو تو کیا تم یقین کر لو گے، مثلاً میں کہوں کہ ایک بہت بڑا لشکر اس پہاڑ کے پیچھے کھڑا ہے جو تم پر حملہ آور ہونا چاہتا ہے تو تم یقین کر لو گے، سب نے بیک زبان ہو کر کہا ہاں ہم آپ کی بات پر یقین کر لیں گے، تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں تم کو ایک سخت عذاب سے ڈراتا ہوں اگر تم مجھ پر اور قرآن پر ایمان نہیں لاؤ گے تو وہ عذاب تم کو ہوگا، اس پر ابولہب جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سوتیلا چچا تھا اس نے کہا "تباً لک" تیرے لئے ہلاکت ہو کیا اسی لئے تم نے سب کو جمع کیا ہے، اور بہت سی سخت باتیں کیں، اس کے جواب میں یہ سورت نازل ہوئی۔

ابولہب کو کنیت سے یاد کرنے کی وجہ

ابولہب کو اس سورت میں کنیت سے یاد کیا ہے، حالانکہ کنیت عرب والوں کے ہاں ادب و تعظیم کا لفظ ہے، مگر یہاں تعظیم کے لئے نہیں دو اور وجہ سے اس کی کنیت ذکر کی ہے، ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس کا نام تھا "عبدالعزیٰ" (عزیٰ بت کا بندہ) یہ شرکیہ نام ہے اس لئے اس نام کو ذکر کرنا پسند نہیں فرمایا گیا، دوسری وجہ یہ ہے کہ اس کی یہ کنیت اس کے دوزخی ہونے پر دلالت کرتی ہے، اس لئے کہ "لہب" آگ کے شعلے کو کہتے ہیں (تو ابولہب کے معنی ہوئے شعلے والا) اگرچہ اس کے والد نے اس کے چہرے کی چمک کی وجہ سے اس کی یہ کنیت رکھی تھی۔

اور ابولہب کی بیوی جس کا نام جمیلہ تھا ابوسفیانؓ کی بہن تھی، وہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عداوت و دشمنی میں بہت کوشاں رہتی تھی، وہ ببول کے درخت کی کانٹے دار جھاڑیاں کاٹ کر آپ صلی

اللہ علیہ وسلم کے راستے میں ڈال دیا کرتی تھی تاکہ صبح کی نماز کے لئے جب آپ مسجد حرام میں تشریف لے جائیں تو آپ کے پاؤں میں چبھیں بالآخر اسی کام میں اس کی موت واقع ہوئی، ہوا یوں کہ اس نے کانٹے دار جھاڑیوں کا گٹھا رسی سے باندھ کر سر پر رکھا اور رسی کا ایک بَل پیشانی سے پھنسایا (بوجھ اُٹھانے والوں کا یہ طریقہ ہے) وہ بَل پھسل کر اس کے گلے میں پھنس گیا اسی سے دم گھٹ کر وہ مرگئی۔

ابولہب نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اور بھی بہت سے ظلم کئے، یہ بھی کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو بیٹیوں حضرت امّ کلثوم اور حضرت رقیہ رضی اللہ عنہما کی نسبت ابولہب کے دو بیٹوں عتبہ اور عتیبہ کے ساتھ طے ہوئی تھی، اس نے اپنے بیٹوں سے کہا اگر تم میری رضامندی چاہتے ہو تو اس نسبت کو توڑ دو، ورنہ ساری زندگی تمہارا منہ نہیں دیکھوں گا، عتبہ تو خاموش رہا، عتیبہ اس کی مجلس سے اُٹھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور بہت گستاخی کے ساتھ اس نسبت کو ختم کرنے کا اعلان کیا اور دیگر بہت سے بکواسات کئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اذیّت ناک معاملے پر صرف یہ کہا اے اللہ اس پر اپنے کتوں میں سے کوئی کتا مسلّط فرما، چنانچہ شام کے سفر کے دوران ایک شیر نے اس بدبخت کو پھاڑ ڈالا۔

سورۃ کا مضمون

اس سورت کا مضمون یہ ہے کہ ابولہب، حسب ونسب، دنیاوی مال وجاہ کے لحاظ سے بڑا مقام رکھتا تھا مگر اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دشمنی کی، دینِ حق کا انکار کیا تو دائمی ابدی ہلاکت وتباہی اس کو نصیب ہوئی، اس لئے ہر شخص کو چاہئے کہ وہ حسب ونسب، مال ودولت اور دنیاوی عزت وسرداری پر مغرور نہ ہو، اللہ والوں کے ساتھ تعلق پیدا کرے، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پھوپھی حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا اور اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے اس سورت کے نازل ہونے کے بعد فرمایا تھا۔ "لا أملک لکم من اللہ شیئاً"

تمت المقدمة

تفسیر سورہ تبت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تَبَّتْ يَدَآ اَبِىْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ۝

ٹوٹ گئے ہاتھ ابی لہب کے اور ٹوٹ گیا وہ آپ

ابولہب کے دو ہاتھوں سے مراد

انسان کے اندر دو قوتیں رکھی گئی ہیں، ایک قوتِ علمی ہے جس کے ذریعے آدمی جانتا بوجھتا ہے، دوسری قوت عملی ہوتی ہے جس کے ذریعے انسان سے اعمال سرزد ہوتے ہیں، تو دونوں ہاتھوں سے انہی دونوں قوتوں کی طرف اشارہ ہے، یعنی اس کا عمل اور اعتقاد دونوں ہلاک و برباد ہو گئے۔

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دونوں ہاتھوں سے مراد نیک اور بُرا عمل ہو، بُرے عمل کی بربادی تو ظاہر ہے کہ ان کا ثمرہ ونتیجہ بُرا ہوتا ہے، اور نیک عمل کی بربادی کا مطلب یہ ہے کہ کفر کی وجہ سے اس کا اچھا پھل ظاہر نہ ہوسکا محض بے کار گیا۔

بعض نے دونوں ہاتھوں سے مراد ظاہری عمل اور باطنی عمل مراد لیا ہے۔

بعض نے دو ہاتھوں سے دو عمل قوی اور ضعیف مراد لئے ہیں، اور یہ سارے ہی احتمالات ہوسکتے ہیں۔

مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ۝

کام نہ آیا اُس کو مال اُس کا اور نہ جو اُس نے کمایا

"مَا كَسَبَ" سے کیا مراد ہے

"جو کچھ اس نے کمایا" جیسے نام وشہرت، عزت ومرتبہ، اولاد، دوست احباب اور نوکر چاکر ہیں۔

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ "مالہ" سے موروثی مال مراد لیا جائے اور "ما کسب" سے اس کا اپنا کمایا ہوا مال مراد لیا جائے جیسا کہ بعض نے کہا ہے۔

بعض نے "مَا كَسَبَ" سے فرزند مراد لئے ہیں۔

اب اس کے مال اور جملہ مکسوبات (کمائی) کے بارے میں بیان فرماتے ہیں کہ دنیا میں تو اس کو یہ

چیزیں کچھ کام آسکتی ہیں لیکن آخرت میں جو ہمیشہ رہنے کی اور بہت زیادہ احتیاج کی جگہ ہے وہاں اس کے کچھ کام نہ آئیں گی اس لئے کہ:

سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ۝

اب پڑے گا ڈیگ مارتی آگ میں

یعنی مرتے ہی اس کو آگ میں ڈالا جائے گا، اور دوسرے کافروں کی طرح اس کے لئے قیامت کا انتظار نہیں کیا جائے گا۔ اس لئے کہ اس کا کفر دوسروں کے مقابلے میں زیادہ سخت ہے، چونکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سوتیلا چچا تھا اتنا قریبی رشتہ دار ہونے کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمدہ اخلاق وصفات، آپ کی سچائی اور دیانتداری کو بچپن سے وہ جانتا تھا مگر اس کے باوجود اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے شدید دشمنی وعداوت رکھی۔

اور اسکے عذاب کے شدید ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہوگی کہ اس کے سامنے اس کی بیوی کو جلایا جائے گا۔

وَّامْرَاَتُهٗ ؕ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ۝

اور اُس کی جورُو جو سر پر لئے پھرتی ہے ایندھن

یعنی جس طرح ابولہب نے بیوی کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ زیادہ عداوت کی تھی اسی طرح اس کی بیوی کو اس کے سامنے عذاب دے کر اس کے دکھوں میں اضافہ کریں گے۔

فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ۝

اُس کی گردن میں رسّی ہے مونجھ کی

اس رسّی کی خاصیت یہ ہے کہ پسینے سے بھیگ کر اینٹھ جاتی ہے اور گلہ گھونٹ ڈالتی ہے، اور اسی طرح وہ عورت مری تھی۔ واللہ اعلم

فائدہ:۔ اس سورت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مال کمانا مرد کے فرائض میں داخل ہے اور گھر کی خدمت یہاں تک کہ کھانے پکانے کے لئے ایندھن لانا یہ عورت کے ذمہ ہے۔

الحمدلله تم تفسير سورة تبت

مقدمہ سورۂ اخلاص

یہ سورت مکی ہے، اس میں چار (۴) آیات، پندرہ (۱۵) کلمات اور سینتالیس (۴۷) حروف ہیں۔

شانِ نزول

کفار کے کچھ سردار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے، کہنے لگے آپ ہمارے خداؤں (بتوں) کو برا کہتے ہیں، ان کا عاجز و بے بس ہونا اور بہت سے عیوب بیان فرماتے ہیں، بتایئے آپ کے خدا کی کیا صفات ہیں، وہ کس سے پیدا ہوا اس سے کیا چیز پیدا ہوئی، اس کی اصل و فرع کیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سکوت فرمایا، تب جبرئیل علیہ السلام یہ سورت لے کر نازل ہوئے۔

بعض روایات میں یوں بھی آتا ہے کہ ان لوگوں نے یہ بھی پوچھا تھا کہ آپ کا خدا کیا کھاتا، کیا پہنتا ہے، اس کو خدائی کس کی میراث میں ملی اور اس کی میراث کون پائے گا، نیز اس کے مشیر و مددگار کون ہیں۔

وجہ تسمیہ

اس سورت کو سورۂ اخلاص اس لئے کہتے ہیں کہ یہ سورت مسلمانوں کے دلوں کو اللہ کی معرفت کے لئے خالص کرتی ہے (یعنی پوری صفائی کے ساتھ مسلمانوں کے دلوں میں اللہ کی پہچان پیدا کرتی ہے) اس کی ذات وصفات کی پہچان میں یہ مددگار رہوتی ہے۔

کسی بھی چیز کی معرفت پہچان کے طریقے اور معرفتِ الٰہیہ کی حقیقت

جاننا چاہئے کہ انسان کے لئے اللہ کی کنہ وحقیقت معلوم کرنے کی انتہاء یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفاتِ لازمہ کا ادراک کرلے اور بس، اس لئے کہ اللہ کی ذات بسیط ہے نہ تجزی و ابعاض کو قبول کرتی ہے اور نہ ہی کسی علت کی معلول ہے۔

دنیا میں کسی چیز کی حقیقت معلوم کرنے اس کو پہچاننے کے لئے اس کے متعلق چار باتوں کا جاننا ضروری ہوتا ہے۔

(۱) اس کے مادے کا جاننا کہ اسکی اصل کیا ہے۔

(۲) اسکی صورت معلوم کرنا کہ کیسی ہے۔

(۳) اسکی علت کا معلوم کرنا۔

(۴) اسکی غرض کا معلوم کرنا کہ کس کام کیلیئے ہے۔

جیسے مثلاً کسی نے ایک تخت کی حقیقت کے بارے میں سوال کیا تو اس کے جواب میں چار چیزیں بیان کی جائیں گی، اوّل اس کا مادّہ بیان کریں گے کہ یہ لکڑی کے تختوں اور لوہے کی میخوں سے بنا ہے، اس کو علتِ مادی کہتے ہیں۔ دوسرے اس کی صورت بیان کریں گے کہ یہ چوکور ہے یا لمبا ہے، اس کو علتِ صوری کہتے ہیں، تیسرے اس کا بنانے والا بتائیں گے کہ بڑھئی نے یہ بنایا ہے اس کو علتِ فاعلی کہتے ہیں، چوتھے اس کی غرض بیان کریں گے کہ یہ بیٹھنے کے لئے بنایا گیا ہے، اس کو علتِ غائی کہتے ہیں۔

سو اللہ تعالیٰ کی نسبت سے (یعنی اللہ تعالیٰ کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے) پہلی تینوں باتیں ناممکن ہیں اس لئے صرف چوتھی بات پر اکتفا کیا جائے گا، (یعنی غرض) البتہ تنزیہات باری تعالیٰ (جن باتوں سے اللہ تبارک وتعالیٰ پاک ہیں) کا بیان ضروری ہے تاکہ جملہ مخلوق سے باری تعالیٰ کا امتیاز ہو جائے۔

چنانچہ لفظ ''اللہ'' ان تمام اغراض کو شامل ہے جو عالم کے اندر اللہ تعالیٰ کی ذات سے متعلق سمجھی جاتی ہیں، مثلاً خالقیت، رازقیت، اور معبود ہونا وغیرہ، اسی وجہ سے لفظ ''اللہ'' اس سورت کا سرنامہ کے طور پر لایا گیا، گویا یوں فرمایا (یہ کہہ کر کہ وہ اللہ ہے) کہ وہ ایسی ذات ہے جو معبود ہے، پیدا کرنے والا، بنانے والا، رزق دینے والا، زندہ کرنے والا، مارنے والا ہے اور عالم کی جملہ ضروریات اسی سے متعلق رہی ہیں اور ہمیشہ رہیں گی، اور چونکہ یہ صفات عوام کے خیال میں علیحدہ علیحدہ (غیر اللہ میں بھی) مشترک تھیں اس لئے صفاتِ سلبیہ کو بھی ذکر فرمایا تاکہ اشتراک کا وہمِ باطل دور ہو جائے، اور توحیدِ خالص حاصل ہو جائے۔

تمت المقدمہ والحمدللہ

تفسیر سورۃ الاخلاص

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ○

تو کہہ وہ اللہ ایک ہے

"قُل" کہہ دیجئے اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم "هُوَ اللّٰهُ" جس کے بارے میں پوچھتے ہو وہ اللہ کی ذات ہے جو تمام صفاتِ کمال کی جامع ہے کہ کائنات میں جو کچھ دیکھا یا سُنا جاتا ہے مثلاً حیات (کائنات میں زندگی جہاں اور جس چیز میں پائی جاتی ہے) علم، ارادہ، قدرت، کلام، سننا، دیکھنا (یہ صفات بھی دنیا میں جہاں اور جس چیز میں بھی پائی جاتی ہیں) اسی طرح دیگر جواہر و اعراض یہ سب اسی (کی صفاتِ کاملہ) کے آثار ہیں۔

"اَحَدٌ" یگانہ ہے اس کا کوئی شریک ہے نہ جزء، یعنی ذہنی، خارجی، بالفعل اور بالقوۃ کسی لحاظ سے بھی اس کا کوئی جزء نہیں ہے۔

اُحد اور واحد میں فرق اور اُحد لانے کی وجہ

"اُحد" کے لفظ سے باری تعالیٰ کے بسیط ہونے کی طرف اشارہ ہے، اسی لئے واحد کی بجائے اُحد کا لفظ لائے ہیں، کیونکہ "واحد" عدد کی شرکت کی نفی کے لئے آتا ہے، اجزاء کی نفی کے لئے نہیں آتا، چنانچہ کہا جاتا ہے "زیدٌ انسانٌ واحدٌ" حالانکہ اس کے ہاتھ، پاؤں، آنکھ، کان، وغیرہ اجزاء ہوتے ہیں، اسی لئے اس کو "احد" نہیں کہتے، پس احد وہ ہے جس میں کسی طرح کی بانٹ اور تقسیم نہ ہوسکے، اور یہ بات خاص اسی ذات میں پائی جاتی ہے کسی اور میں نہیں پائی جاتی۔

اَللّٰهُ الصَّمَدُ ○

اللہ بے نیاز ہے

لفظ "اللہ" پھر مکرر لائے تاکہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ باوجود اس بساطتِ محضہ اور اُحدیتِ

مجردہ کے ہم اس ذات کے لئے صفات کمال ثابت کرتے ہیں، اس لئے کہ اس کا صمد ہونا ہی ان صفات کا تقاضا کرتا ہے۔

"صمد" کا معنی

حضرت امام جعفر صادق رحمہ اللہ تعالیٰ نے " صمد " کا معنی یہ بیان فرمایا ہے کہ جو کسی کا محتاج نہ ہو اور سب اس کے محتاج ہوں، اور وجود کا سلسلہ قائم ہی نہیں رہ سکتا جب تک ایک ایسی ذات نہ ہو جس میں "صمد" کی صفت پائی جاتی ہو۔(۱) اور اس بات کا تو مشاہدہ ہے کہ اس جہاں میں احتیاج ہی احتیاج ہے، جب ہر چیز دوسرے کی محتاج ہوئی تو ضروری ہے کہ ایک ذات ایسی ہو جس پر سب کی احتیاج ختم ہوتی ہو اور وہ خود کسی چیز میں کسی کی محتاج نہ ہو اگر ایسا نہ ہو تو احتیاج کا سلسلہ منقطع ہی نہ ہو۔

پس درحقیقت اس سورت میں اس ذات کے خواص میں سے دو چیزیں ذکر کی گئی ہیں، ایک اس کی اُحدیت (اُحد ہونا) دوسرے اسکی صمدیت (صمد ہونا) باقی صفات انہی دو پر متفرع ہیں (انہی سے نکلی ہیں)

لَمۡ يَلِدۡ ۝

نہ کسی کو جنا

اگر وہ کسی چیز کو جنے تو وہ چیز اس کی شریک ہو جائے، سو جب شریک ہوئی تو اللہ کی محتاج نہ رہی، جب محتاج نہ رہی تو وہ صمد نہ رہا (حالانکہ وہ صمد ہے لہٰذا کسی چیز کی اس سے ولادت محال ہوئی)

وَلَمۡ يُوۡلَدۡ ۝

نہ کسی سے جنا

اس لئے کہ اگر وہ کسی سے جنا گیا ہوتا تو وہ محتاج ہوتا اور محتاج صمد نہیں ہوسکتا (حالانکہ ثابت ہو چکا کہ وہ صمد ہے)

(۱) اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی توحید پر عقلی دلیل بیان فرما رہے ہیں، کہ یہ عالم گویا خود اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہے، اور وہ اپنی خدائی میں لاشریک ہے۔۱۲ سفیر احمد

وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ○

اور نہیں اُس کے جوڑ کا کوئی

جب اس کی صفت اُحدیت بیان ہوگئی تو اس کا لازمی نتیجہ یہی ہے کہ کوئی اس کا ہمسر نہیں ہوسکتا، اس لئے کہ اگر دوسرا کوئی اس کا ہمسر ہوتا تو دونوں کسی ایک چیز میں شریک ہوتے اور کوئی دوسری چیز دونوں کے لئے علیحدہ علیحدہ مختص ہوتی، تو اس صورت میں اس کی احدیّت اور یکتائیت باقی نہ رہتی (جبکہ پہلے بیان فرما چکے ہیں کہ وہ اُحد ہے)

سورۂ اخلاص کے اسرار ولطائف کے بارے میں علماء کے اقوال

پہلا قول ہر قسم کی شرکت کی نفی:۔

بعض علماء نے فرمایا ہے کہ شرکت کبھی عدد میں ہوتی ہے تو اس کی نفی لفظ " احد " سے فرمائی (ثابت ہوا کہ اللہ دو نہیں ایک ہی ہے)

اور کبھی شرکت مرتبے ومنصب میں ہوتی ہے اس کی نفی لفظ " صمد " سے فرمادی (کہ اس جیسا منصب کسی کو حاصل نہیں سب ہی اس کے محتاج ہیں وہ کسی کا محتاج نہیں) اور کبھی شرکت نسب میں ہوتی (کہ دو شخصوں کا نسب ایک ہو چاہے مرتبہ ومقام ایک نہ ہو) اس کی نفی "لم یلد ولم یولد" سے فرمادی۔

اور کبھی شرکت کام اور تاثیر میں ہوتی ہے (کہ مرتبہ تو ایک نہیں مگر کام ایسا کردیا، یا ایسی تاثیر بھی ظاہر کردی، جو اعلیٰ مرتبے والے کا حصہ تھا) اس کی نفی "لم یکن لہ کفوا احد" سے فرمادی (کوئی اس کا ہمسر تاثیر کے درجے میں بھی نہیں ہوسکتا)

اسی وجہ سے (کہ ہر طرح کی شرکت کی نفی ہوتی ہے) اس سورہ کو سورۂ اخلاص کہتے ہیں۔

دوسرا قول فرق باطلہ سے براءت

یہ بھی علماء نے فرمایا ہے کہ اہل باطل کے دنیا میں پانچ فرقے ہیں (اس سورہ میں ان پانچوں سے براءت کا اظہار ہے)

پہلا فرقہ دہریہ ہے:۔

یہ کہتے ہیں کہ اس دنیا جہاں کو پیدا کرنے والا کوئی نہیں یہ سارا کارخانہ خود بخود وجود میں آ گیا، سو جب بندۂ مسلم زبان سے اس سورت کا پہلا ہی لفظ "ھــو" نکالتا ہے تو اس فرقے سے گویا براءت کا اعلان کرتا ہے (کہ اس عالم کا بنانے والا وہ ہے)

دوسرا فرقہ فلاسفہ کا ہے:۔

یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس عالم کو پیدا کرنے والا تو ہے، مگر وہ کوئی صفت نہیں رکھتا یعنی پیدا کرنے کے بعد عالم میں جو کچھ رونما ہوتا ہے یہ سب اسباب سے متعلق ہے اس میں اس کی کچھ تاثیر و دخل اندازی نہیں ہے اور حقیقت میں ہندوؤں کا مذہب بھی یہی ہے۔

سو جب مسلمان نے لفظ "اللہ" منہ سے نکالا جو تمام صفاتِ کمال کی جامعیت پر دلالت کرتا ہے تو اس فرقے کے عقیدے سے خلاصی حاصل کرلی۔ (گویا اس نے یہ اظہار کردیا کہ وہ جو اس عالم کو بنانے والا ہے وہ اللہ ہے یعنی وہ ہے جس میں تمام صفاتِ کمال ہیں وہ پیدا کرتا ہے، رزق دیتا ہے، مارتا ہے، زندہ کرتا ہے، انعام دیتا ہے، عذاب دیتا ہے وغیرہ تو جو کچھ اس عالم میں رونما ہو رہا ہے وہ سب براہِ راست اسی کے حکم سے ہو رہا ہے، اسباب کا مسبب وہی ہے، وہ بے کار و معطل نہیں ہے۔

چوتھا فرقہ گمراہ اہلِ کتاب یعنی یہود و نصاریٰ کا ہے:۔

ان کا عقیدہ یہ ہے کہ اس عالم کے بنانے والے کی اولاد و بیوی ہے، چنانچہ یہودیوں نے حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دیا، اور عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا اور حضرت مریم علیہ السلام کو اللہ کی بیوی ٹھہرایا (والعیاذ باللہ)، سو جب مسلمان نے کہا "لم یلد و لم یولد" تو وہ اس عقیدے سے پاک ہوا اور براءت کا اظہار کیا۔ (اور اس باطل عقیدے کی تردید ہوئی)

اسی طرح یہود و نصاریٰ نے اس ذاتِ منزہ کے لئے بعض مخلوقات کی جو تشبیہات اختیار کی ہیں جن سے اس کی احتیاج بعض چیزوں کی طرف ہوتی ہے، ان کی نفی اور ان سے براءت لفظ "صمد" سے ہوگئی۔

پانچواں فرقہ مجوسیوں کا ہے:۔

ان کا عقیدہ ہے کہ اس جہاں کے دو خالق ہیں ایک کا نام یزداں ہے اس جہاں میں جتنی اچھی چیزیں، بھلائیاں اور خوبیاں ہیں وہ سب یزدان کی پیدا کردہ ہیں، دوسرا اھرمن ہے، اور جتنی تاریک چیزیں، ایذا دینے والی اور جو بھی برائیاں ہیں وہ سب اس کی پیدا کردہ ہیں، اور یزداں واھرمن کے لشکر کے درمیان ہمیشہ ٹکر و آویزش چلتی رہتی ہے، کبھی یزداں غالب آجاتا ہے تو جہاں میں بھلائیاں عام ہو جاتی ہیں اور کبھی اھرمن کا لشکر غالب آجاتا ہے تب سارے جہاں میں برائیاں پھیل جاتی ہیں۔

اس عقیدے کی تردید کے لئے سورۃ کے آخر میں فرمایا:

"ولم یکن له کفوا أحد" سو جب بندۂ مومن یہ آخری جملہ پڑھتا ہے اس باطل عقیدے سے بھی براءت کا اظہار کر جاتا ہے۔

تیسرا قول:۔

اس سورت میں تمام لطائف انسانی کی معرفت کا بیان ہے

یہ بھی کہا گیا ہے کہ انسان اِن لطائف سے مرکب ہے، نفس، عقل، قلب، روح اور سرّ (اور اس سورہ میں ہر لطیفہ کو اللہ کی جو معرفت حاصل ہوسکتی ہے اس کو بیان کیا گیا ہے، جس کی تفصیل حسب ذیل ہے)

نفس کی معرفت:۔

نفس کی معرفت کی انتہاء یہ ہے کہ وہ "لم یلد، ولم یولد ولم یکن له کفوا أحد" کا مضمون سمجھ لے، اس لئے کہ نفس دنیا میں قوت شہویہ یا غضبیہ کی مدد سے جس چیز کی طرف مائل ہوتا ہے وہ یا تو کسی سے پیدا ہوئی ہوتی ہے یا اس سے کوئی پیدا ہوتا ہے یا دنیا میں اس کے برابر کوئی دوسری چیز موجود ہوتی ہے (نفس کی دوڑ بس اتنی ہی ہوتی ہے وہ اسی حد تک چیزوں کو جانتا ہے اس سے آگے اس کی رسائی نہیں ہوتی) تو جب اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ مانا کہ وہ ساری موجودات سے برتر و بالا ہستی ہے تو لازماً مذکورہ صفات کی اس سے نفی کرتے ہیں (تو گویا اس جملے میں نفس کے ذریعہ اللہ کی معرفت جو

ہو سکتی ہے وہ بیان ہوئی کہ اللہ وہ ذات ہے جو نہ کسی نے جنا نہ اس سے کوئی جنا گیا اور نہ ہی اس کے برابر وہمسر کوئی ہستی ہے)

عقل کی معرفت:۔

اس سے اوپر کا درجہ عقل کا ہے، اور اس کی معرفت کی انتہاء کا بیان "الله الصمد" کے اندر ہے، یعنی اللہ وہ ذات ہے جس پر احتیاج کا سلسلہ منقطع ہوتا ہے اور وہ خود کسی کا محتاج نہیں ہے۔ اس واسطے کہ عقل کو اسباب ومسببات کا علم دیا گیا ہے، عقل ہر چیز کو ایک سبب کا محتاج سمجھتی ہے پھر اس سبب کے بارے میں جانتی ہے کہ وہ ایک اور سبب کا محتاج ہے، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ دین و دنیا کی تدبیر کرنا جو کہ عقل کا کام ہے یہ اسباب کے ملاحظے پر موقوف ہے۔

پس اس ذات پاک کی حقیقت جاننے کے لئے انسانی عقل کی رسائی کی انتہاء بس اتنی ہے کہ وہ ذات عالم اسباب ومسببات سے بلند وبرتر ہے۔

قلب کی معرفت:۔

قلب کی شان یہ ہے کہ وہ اپنے مشہور احوال جیسے محبت، خوف، امید اور اعتماد وغیرہ میں سے کسی میں مستغرق رہے، اور اس کی معرفت کی انتہاء ''احدیت'' کا مرتبہ ہے۔

روح کی معرفت:۔

روح جو کہ عالم امر سے آئی اور "نفخت فيه من روحی" کی خلعت سے سرفراز ہوئی اس کی معرفت کی انتہاء اپنی اصل کی طرف انجذاب یعنی کھنچ جانا، اور اسم ذات یعنی لفظ ''اللہ'' کے ذکر سے انس وراحت پانا ہے۔

سرّ کی معرفت:۔

سرّ جو کہ روح سے اوپر کا مرتبہ ہے اس کی معرفت ہویت مستقلہ ہے، اس کا علم صرف وجود کی خصوصیات دریافت ہونے پر منحصر ہے، اس کے سوا نہیں۔

اس سورت میں تمام لطائف انسانی سے متعلق معرفت کا بیان ہوا تاکہ ہر لطیفہ اس معرفت سے بہرہ یاب ہو سکے۔

چوتھا قول، توحید کے چار مراتب کا بیان

یہ بھی کہا گیا ہے کہ "ھو" عاشقین ووالہین (حیران وسرگرداں لوگ) کے لئے ہے، کہ وہ لوگ اللہ کی ذات کے ملاحظے میں اس درجہ مستغرق ہوئے کہ سوائے اس کے کہ "ھو" کہیں ان کے سامنے کچھ نہیں رہا۔

اور "اللہ" یہ کلمہ عارفین کا حصہ ہے کہ وہ اس اسم باری تعالیٰ کو تمام اسماء وصفات میں پہچانتے ہیں اور ہر مرتبہ کے احکام کو الگ الگ جانتے ہیں۔

"احد" کا لفظ عام اولیاء اللہ کا ہے جو ہر کثرت میں اس ذاتِ واحد کو وصفِ وحدت کے ساتھ ملاحظہ کرتے ہیں۔

اور "لم یلد و لم یولد و لم یکن له کفوا احد" کا معنی عام مسلمانوں کا حصہ ہے کہ وہ عقلی ونقلی دلائل کے ذریعہ اس مرتبے تک پہنچتے ہیں۔

جب ان سب معنوں کو کوئی جامع ہو تب وہ پورا موحد کہلاتا ہے۔

سورۂ اخلاص کو "ثلثِ قرآن" کہنے کی وجہ

جاننا چاہئے کہ حدیث میں اس سورت کو "ثلثِ قرآن" کہا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ پورے قرآن کا مقصد تین چیزوں میں منحصر ہے۔

(۱) اللہ تعالیٰ کی معرفت کا بیان ہے۔

(۲) وصول کے طریق کی معرفت کا بیان ہے۔

(۳) اس حالت کا بیان ہے جو جنت یا دوزخ میں پہنچنے کے بعد حاصل ہوگی۔

سو ان تینوں چیزوں میں سے جو اشرف ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی معرفت اس سورہ میں اس کا بیان ہے۔ (اس لئے یہ ثلث قرآن ہوئی)

تم تفسیرها والحمدلله

مقدمہ سورۂ فلق

یہ سورت مدنی ہے، اس میں پانچ (۵) آیات، تیئس (۲۳) کلمات، اور تہتر (۷۳) حروف ہیں۔

''فلق'' لغت میں صبح کی سفیدی کو کہتے ہیں جو رات کی تاریکی کو پھاڑ کر ظاہر ہوتی ہے۔

رات کی تاریکی سے صبح کا ظاہر ہونا نمونہ ہے پردۂ عدم سے وجود کے ظاہر ہونے کا، حالت عدم میں کچھ تمیز و تشخیص نہیں سارا عالم پوشیدہ ہے جیسے ہی نورِ وجود ظاہر ہوا ہر چیز متشخص و معین ہوگئی اور ہر چیز کے آثار و احکام اس پر مرتب ہونے لگے، یہ حالت بعینہٖ صبح کی روشنی کی ہے، جیسے ہی ظاہر ہوتی ہے ہر چیز واضح اور ممتاز ہو جاتی ہے، عالم میں مخلوق کی حس و حرکت نظر آنے لگتی ہے، اور رات کی تاریکی پردۂ عدم کا نمونہ ہے۔

اور جو بھی شر اور برائی عالم میں پائی جاتی ہے درحقیقت وہ وجود و عدم کے اختلاط کے سبب سے ہوتی ہے، سو تمام برائیوں کا استناد عدم پر ہے اور وجود کا نور ان برائیوں کو دفع کرنے والا ہے۔

وجہ تسمیہ

اور اسی مناسبت سے کہ یہ سورت تمام برائیوں سے پناہ مانگنے کے لئے نازل ہوئی ہے اس کی ابتداء میں نور و روشنی کے ظہور کی طرف اشارہ ہوا۔ اور پھر اسی نور کی طرف اضافت کر کے اس کا نام ہی سورۃ الفلق رکھ دیا گیا۔

ایک لطیف نکتہ

اس سورت میں اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ''رب الفلق'' کے ذریعہ تین چیزوں تاریکی، سحر اور حسد سے پناہ مانگی گئی ہے، اس کے مقابلے میں سورۂ ''ناس'' میں ایک ہی برائی ''وساوس شیطان'' سے تعوّذ اللہ تعالیٰ کی تین صفات کے ذریعہ واقع ہوا ہے۔ سو یہ اس لئے ہے تاکہ اشارہ اس بات کی طرف ہو کہ دین کی حفاظت جان و بدن کی حفاظت سے مقدم ہے، اس لئے کہ وساوس شیطانی دین کو نقصان پہنچانے والے ہیں، جبکہ تاریکی، سحر اور حسد جان و بدن کے لئے ضرر رساں ہیں۔ (تو جس چیز کی حفاظت کے لئے تین صفات باری تعالیٰ سے تعوّذ ہوا ہے اس کی اہمیت معلوم ہوئی، اور معلوم ہوا کہ جان و بدن کی حفاظت سے اس کی حفاظت زیادہ اہم اور مقدم ہے)

تمت المقدمہ الحمدللہ

تفسیر سورۃ الفلق

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۝

تو کہہ میں پناہ میں آیا صبح کے رب کی

"فلق" کا معنی

فلق لغت میں صبح کو کہتے ہیں، اور حقیقت میں ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو پھٹے اور اس سے دوسری چیز نکلے، نظامِ قدرت میں یہ سلسلہ اس لئے ہے تا کہ عجیب وغریب نشانیاں ظاہر ہوں، جیسے غلّے کا دانہ پھلوں کی گٹھلیاں، اور ہر درخت کا بیج ہے، اسی طرح پتھر وزمین کے ان سے پانی نکلتا ہے اور باپ کی پیٹھ اور ماں کا پیٹ ان سب چیزوں کو "فلق" کا لفظ شامل ہے۔

فلق کی تخصیص کی وجہ

فلق کی تخصیص اس موقع پر اس لئے ہوئی کہ مخلوق میں شر کا سبب اکثر اصل کی خباثت ہوتی ہے، اور چونکہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اصل وفرع دونوں کو محیط ہے اس لئے ضروری ہوا کہ اللہ تعالیٰ سے (ہر شر کی) اصل کی پناہ چاہی جائے، چنانچہ معمول بھی یہی ہے کہ اگر کسی کو کسی کے غلام سے ایذا رسانی کا ڈر ہو تو وہ اس کے آقا کی طرف رجوع کرتا ہے، اور اگر اس سے بھی کھٹکا ہو تو اس کے آقا کی طرف رجوع کرتا ہے یہاں تک کہ آقائی سلسلہ ختم ہو جائے اور یہ سلسلہ بالآخر رب تعالیٰ جلّ وعلا پر جا کر ہی منتہی ہوتا ہے اس لئے پہلے سے ہی اسی سے التجا کرنے کی تعلیم دے دی تا کہ یہ سلسلہ ہی ختم ہو جائے۔

مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ۝

ہر چیز کی بدی سے جو اُس نے بنائی

خیر وشر کے اعتبار سے مخلوق کی تین قسمیں

جاننا چاہئے کہ مخلوقات کی تین قسمیں ہیں۔ ایک قسم تو وہ ہے جس میں خیر غالب ہے اور شر مغلوب یا

بالکل معدوم ہے جیسے انبیاء کرام، فرشتے اور اولیاء کرام۔

دوسری قسم وہ ہے جس میں شر و برائی غالب ہے اور خیر و بھلائی مغلوب یا بالکل معدوم ہے، جیسے شیطان اور دیگر موذی چیزیں خواہ وہ انسان ہوں یا جنوں میں سے ہوں، اسی میں درندے، جانور اور وہ حشرات الارض ہیں جو موذی ہیں۔

تیسری قسم جن میں خیر و شر دونوں موجود ہیں، لیکن کبھی وہ کسی کے لئے شر ہو جاتے ہیں اور کبھی کسی کے حق میں خیر ہوتے ہیں، جیسے مال و دولت، بیوی بچے، بلکہ اخلاق، علوم، حسب و نسب اور دیگر صفات و نسبتیں بھی یہی حکم رکھتی ہیں (کہ بعض اوقات کسی کے لئے شر بن جاتے ہیں یعنی اللہ سے دوری کا سبب بن جاتے ہیں اور کسی کے حق میں ایسے نہیں ہوتے)

(''شرّ ما خلق'' میں تمام مخلوقات کے شر سے پناہ مانگی گئی ہے ان میں) مخلوق کی آخری دو قسموں کے شر سے پناہ تو واضح ہے کہ وہ شر جو ان کے اندر موجود ہے اس سے پناہ ہے، لیکن پہلی قسم جس میں شر ہے ہی نہیں، اس کی نسبت سے ''شر ما خلق'' کی مراد کیا ہوگی؟ تو اس کی نسبت سے ''شر ما خلق'' کی مراد یا یوں کہئے کہ اس کا شر یہ ہے کہ بعض اوقات دوسری چیزیں اس کی مقاربت و مجاورت اختیار کرتی ہیں اس مجاورت و مقاربت کی وجہ سے شر کی کوئی صورت پیدا ہو جاتی ہے ورنہ فی نفسہٖ اس میں شر نہیں ہوتا جیسے عبادت کا شر ریاء و سمعہ ہے، ایمان کا شر نفاق وارتداد ہے، انبیاء علیہم السلام کا شر ان کی تکذیب و نافرمانی ہے، اور اولیاء کرام کا شر ان کے انوار صحبت سے محروم ہونا ہے۔ وعلی ھذا القیاس۔

اسی لئے کہا جاتا ہے ''شر الخیر تاخیرہ، و شر العمل الصالح تقصیرہ'' کہ خیر کی برائی یہ ہے کہ اس میں تاخیر کی جائے اور نیک عمل کا شر یہ ہے کہ اس میں کوتاہی کی جائے۔

اس نوعیت کے شر کی نسبت کسی نیک کام کی طرف کرنا جائز ہے، چنانچہ عرف میں مشہور ہے ''پھول کا شر کانٹا ہے'' ''خزانے کا شر سانپ ہے'' اور ''حسن کا شر بدخوئی (بری عادت) ہے''

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ''شر ما خلق'' سے مخلوقات میں سے بدترین مخلوق کا شر مراد ہے، یعنی شیطان کا شر، اس لئے کہ تمام شرور کا منشا وہی ہے اس سے خاص طور پر پناہ مانگی ہے۔

وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ○

اور بدی سے اندھیرے کی جب سمٹ آئے

اندھیری کی قسمیں اور اس کے شرور

اندھیری، تاریکی کبھی حسی ہوتی ہے یعنی نظر آتی ہے، اور کبھی معنوی ہوتی ہے کہ آنکھوں سے نظر نہیں آتی، سو ظاہری تاریکی تو رات کی ہے، بہت سی برائیاں اور شرور ہیں جو اس تاریکی میں ظاہر ہوتے ہیں۔

(۱) جیسے شیطان و جنات ہیں کہ تاریکی کی وجہ سے اپنی خفیہ جگہوں سے نکل کر چمگادڑوں کی طرح زمین میں پھیل جاتے ہیں، اسی لئے حدیث میں آیا ہے کہ جب رات کی تاریکی پھیلنے لگے تو بچوں کو باہر نہ آنے دو کہ یہ شیاطین کے منتشر ہونے کا وقت ہے۔

(۲) اسی طرح درندوں اور موذی حشرات الارض جیسے سانپ بچھو وغیرہ ہیں ان کے نکلنے کا وقت ہے (اس تاریکی میں ان کا شر بھی ہے)

(۳) تاریکی کے شرور میں سے یہ بھی ہے کہ چور و بدکار لوگ ایذاء رسانی کیلئے اس وقت پھیل پڑتے ہیں۔

(۴) رات کی تاریکی کے شرور میں سے یہ بھی ہے کہ یہ وقت طلسم گروں اور جادو ٹونے والوں کی قوت کا وقت ہے کہ دن کے وقت سورج کی بے پناہ غالب روشنی کی وجہ سے ان کے سیاہ عمل کی تاثیر کم ہو جاتی ہے۔

(۵) فسق و فجور کے دلدادوں کا گناہوں میں مشغولیت کا وقت بھی یہی ہے یہ بھی اس تاریکی کا ایک شر ہے۔

اور معنوی تاریکی کی کئی قسمیں ہیں (اور اس کے شر و برائی کی بھی مختلف صورتیں ہیں) معنوی تاریکیوں میں سب سے بڑھ کر ''وہم'' کی تاریکی ہے، جو عقل کے نور پر غالب آجاتی ہے اور اشیاء کے اصل حقائق کو نظروں سے چھپا دیتی ہے، سو کفر کی تاریکی، گناہوں، برے اخلاق اور بری صحبتوں کی تاریکیاں یہ سب اسی وہم کی تاریکی کی شاخیں ہیں۔ ان تمام حسی و معنوی تاریکیوں سے پناہ ''غاسق'' کے لفظ سے ہوگئی۔

وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ ۝

اور بدی سے عورتوں کی جو گرہوں میں پھونک ماریں

یعنی ان نفوس خبیثہ کے شر سے پناہ ہے جو شیاطین کے ناموں کو جپنے اور ان کے کلمات کے توسل سے اجسام وابدان میں تاثیر کرتے ہیں، اور سحر کے یہی معنی ہیں۔

وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ۝

اور بدی سے بُرا چاہنے والے کی جب لگے ٹوک لگانے

یعنی حاسد کے شر سے پناہ ہے جب وہ اپنے حسد کے مطابق عمل کرے یہ قید اس لئے کہ حاسد جب تک حسد کو چھپاتا ہے اور اس کے مقتضا پر عمل نہیں کرتا اس کا ضرر دوسرے تک (محسود تک) نہیں پہنچتا۔

زمین وآسمان میں واقع ہونے والی سب سے پہلی برائی

حسد تمام برائیوں میں سب سے زیادہ قبیح برائی ہے، اس لئے کہ عالم میں جو بھی برائیاں وجود میں آتی ہیں وہ دو قسم سے خارج نہیں ہیں یا تو وہ ایسی برائیاں ہیں جو ارادہ واختیار والوں سے سرزد ہوتی ہیں جیسے ظلم، قتل، لوٹ وغیرہ، یا ایسی جو غیر ذوی الاختیار مخلوق کے طبائع سے وجود میں آتی ہیں جیسے غرق ہونا پانی میں، اور جلنا آگ میں وغیرہ (غرق اور جلانا یہ پانی وآگ کی فطرت ہے اس کا ظہور ان سے خود بخود ہو جاتا ہے ارادہ یا اختیار پانی وآگ میں نہیں ہے۔)

ان دونوں قسموں میں سے ارادہ واختیار والوں کی برائی زیادہ شنیع وقبیح ہے، اور اس کی تمام برائیوں کی جڑ حسد۔ ہے، لہٰذا ثابت ہوا کہ حسد تمام برائیوں میں سب سے بدتر ہے، چنانچہ اسی واسطے کہا گیا ہے کہ آسمان پر سب سے پہلا جو گناہ واقع ہوا وہ ابلیس کا حسد تھا۔ جو حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ کیا تھا۔ اور زمین پر سب سے پہلا جو گناہ ہوا وہ بھی حسد ہی تھا کہ قابیل نے ہابیل کے ساتھ کیا تھا۔

دو اشکال مع جواب

یہاں دو اشکال ہوتے ہیں۔ پہلا یہ کہ جب پہلے "شر ما خلق" میں تمام مخلوقات کے شر سے پناہ مانگ لی گئی تو اس کے بعد تاریکیوں، جادوگروں اور حاسدین کے شر کی تفصیل کی حاجت نہیں تھی پھر کس

لئے خاص طور پر ان تین چیزوں کے شر سے پناہ مانگی گئی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ان تینوں چیزوں کا شر چھپا ہوتا ہے جبکہ دیگر مخلوقات کا شر سامنے اور ظاہر ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ پوشیدہ شر ظاہر اور کھلے شر کے مقابلے میں زیادہ خطرناک ہوتا ہے اس لئے ضروری ہوا کہ خاص ان کے شر سے مستقلاً پناہ مانگی جائے۔

دوسرا اشکال یہ ہوتا ہے کہ ''غاسق اور حاسد'' کو نکرہ ذکر کیا گیا ہے اور ''نفاثات'' کو معرف باللام ذکر کیا گیا ہے اس فرق کی کیا وجہ ہے؟

جواب یہ ہے کہ ''لام'' استغراق کے لئے ہے اور تمام کے تمام جادوگر شر ہی ہیں اس لئے کہ جادو فی نفسہٖ گناہ کبیرہ ہے (وہ قبیح لعینہ ہے) خواہ جادو کے ذریعہ دفع شر یا کسی خیر کا حاصل کرنا ہی مقصود ہو یہی وجہ ہے کہ حربی کافروں کو بھی جادو کے ذریعہ ہلاک کرنا درست نہیں۔ اس لئے یہاں استغراق پیدا کرنے کے لئے نفاثات کو معرف باللام لائے۔

اور غاسق، وحاسد، کا ہر ہر فرد چونکہ شر نہیں اس لئے کہ بہت سی راتیں خیر سے گذرتی ہیں، اسی طرح کافروں، ظالموں سے حسد بُرا نہیں تو حاسد و غاسق محل استغراق نہ تھا، اس وجہ سے ان میں تنکیر مناسب معلوم ہوئی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

الحمدللہ

مقدمہ سورۃ الناس

یہ سورت مدنی ہے، اس میں چھ (۶) آیات، بیس (۲۰) کلمات اور اسّی (۸۰) حروف ہیں۔

وجہ تسمیہ

اس سورت کو سورۂ ناس اس لئے کہتے ہیں کہ حقائق کونیہ والٰہیہ جو ''ناس'' سے متعلق ہیں وہ اس میں بیان کی گئی ہیں۔

معوّذتین کا شانِ نزول

لبید بن عاصم یہودی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیا تھا، جس کا اثر آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام پر یہ ظاہر ہوا تھا کہ جو کام آپ نے نہیں کیا ہوتا تھا آپ کو ایسا گمان ہونے لگتا تھا کہ شاید کرلیا ہے، جب یہ عارضہ لاحق ہوئے چھ ماہ ہوگئے تو ایک رات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں دیکھا، دو فرشتے آئے، ایک آپ کی پائنتی کی طرف کھڑا ہوگیا دوسرا آپ کے سرہانے کی طرف کھڑا ہوگیا، دونوں ایک دوسرے سے پوچھنے لگے، ایک نے پوچھا کہ ان کو کیا ہوا ہے؟ دوسرے نے جواب دیا ان پر جادو ہوا ہے، پہلے نے پوچھا کس نے کیا ہے؟ دوسرے نے جواب دیا، لبید بن عاصم یہودی نے ان کا بال کنگھی سے لیا ہے اور ان کی کنگھی کے دندانوں میں کمان کے چلّے سے گیارہ گرہیں لگائی ہیں اور اس کو کھجور کے پھول کے غلاف میں لپیٹ کر فلاں اندھے کنویں میں پتھر کے نیچے دبا دیا ہے۔

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب صبح بیدار ہوئے تو صحابہ کرامؓ کے ساتھ اس کنویں پر گئے، دو آدمی کنویں کے اندر اتارے وہ پتھر کے نیچے سے نکال لائے، تب حضرت جبرئیل علیہ السلام معوّذتین لے کر اترے، ان دونوں سورتوں میں گیارہ آیتیں ہیں، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک آیت پڑھ کر پھونکتے تو ایک گرہ کھل جاتی، اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب گیارہ آیتیں پڑھیں اور اس پر دم کرتے رہے تو وہ سب گرہیں کھل گئیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکمل صحت یابی حاصل ہوئی۔

معوّذتین پر قرآن کے اختتام میں نکتہ

قرآن کریم کے اختتام و آخر میں ان سورتوں کے رکھنے میں نکتہ یہ ہے کہ جب نعمت مکمل ہوجاتی ہے، تو

دشمن کے حسد وفریب کے سوا کوئی خوف باقی نہیں رہتا، اس واسطے یہ موقعہ استعاذے کا ہے، کہ اللہ تعالیٰ سے دشمن کے ایسے تمام شرور سے پناہ مانگی جائے۔

رب، ملِک، الٰہ، ان اسماء سے استعاذہ میں نکتہ

اس سورت میں شیطان کے شر سے اللہ تعالیٰ کے مذکورہ تین ناموں سے استعاذہ میں نکتہ یہ ہے کہ شیطان انسان کے دل میں تین راستوں سے داخل ہوتا ہے۔

(۱) شہوت کے راستے سے

(۲) غضب کے راستے سے

(۳) ہوا کے راستے سے۔ جس کو باطل عقیدہ بھی کہتے ہیں۔

سو ''رب'' کا اسم شہوت کے شر کو دفع کرنے کے لئے ہے۔ اور ''ملِک'' غضب کے شر کے دفعیہ کے لئے ہے، اور ''الٰہ'' ہوا کا شر دفع کرنے کے لئے ہے۔

گویا یہ تعلیم دی ہے کہ اگر شیطان تمہیں شہوت کے راستے سے وسوسہ ڈالے تو تم اللہ تعالیٰ کی ربوبیت پر نظر کرو، اور اگر غضب کے راستے سے وسوسہ ڈالے، تو اللہ تعالیٰ کی بادشاہت، اس کا عدل، اور بدلہ لینے کی قدرت کو یاد کرو، (کہ اگر تم بے جا کسی پر زیادتی کروگے تو اللہ تعالیٰ تم سے بدلہ لے گا) اور اگر ہَوا کے راستے سے وسوسہ ڈالے تو الوہیت کے مرتبے کی طرف التجا کرو۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

تفسیر سورۃ الناس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝

تو کہہ میں پناہ میں آیا لوگوں کے رب کی

''رب الناس'' کے معارف

فرمایا کہ انسانوں کے رب کی پناہ مانگتا ہوں، یوں تو اس کی ربوبیت، پرورش ساری مخلوق کو شامل ہے، ہر چیز کا رب وہی ہے، لیکن انسانوں کی پرورش میں اس کی جو نوازشات ہیں ویسی کسی دوسری

مخلوق پر نہیں۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے ایسا بنایا ہے کہ گویا وہ پورے عالم کا نمونہ اور خلاصہ ہے۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ انسان کا وجود عناصر اربع سے مرکب ہے، اس جہت سے دیکھیں تو انسان معادِن (کانوں) کے مشابہ ہے، غذاء حاصل کرنے، اور پلنے بڑھنے میں نباتات و درختوں کی مانند ہے، حرکت کرنے، رنج ولذت اُٹھانے اور وہم وخیال کا حامل ہونے میں حیوان کے مشابہ ہے، پھر حیوان کی ہر قسم کی مشابہت اسکے اندر موجود ہے، غصہ وجراءت کے وقت پھاڑنے والے درندے کی مانند ہو جاتا ہے، شہوت وحرص کے وقت چرنے والے چوپایوں کی طرح ہو جاتا ہے، مکروحیلہ، فساد و خرابی پیدا کرنے میں شیطان کی مثل ہے، اور معرفتِ حق، اطاعت و بندگی، طہارت و پاکیزگی میں مقرب فرشتوں کی مانند ہے۔

علوم وحکمتوں کا جامع ہونے کے اعتبار سے لوح محفوظ کی مانند ہے، اور اپنی تاثیر وتصرف سے مریدوں و شاگردوں کے قلوب میں اشیاء کی صورتوں کو بٹھانے ثابت کرنے میں قلمِ اصلی کے مشابہ ہے۔

حاصل یہ ہے کہ انسان کی ابتداء وانتہاء کے عظیم فرق وتفاوت پر غور کیا جائے کہ ابتداء میں وہ ایک نطفہ تھا جو ایک نکمی چیز ہوتی ہے، پھر اس کی ایسی اللہ تعالیٰ نے پرورش فرمائی کہ ولایت ونبوت کے مقامات تک پہنچا دیا، اس پر غور کرو اور رب تعالیٰ کی ربوبیت و پرورش کی کرشمہ سازیوں کو ملاحظہ کرو، کہ کیا سے کیا کر دیا۔

مَلِكِ النَّاسِ ۝

لوگوں کے بادشاہ کی

اس صفت کے بیان کرنے سے اس طرف اشارہ ہے کہ انسانوں کو روحِ مدبّر (تدبیر کرنے والی روح) عطا ہوئی ہے، اور انسان کی قوائے مدرکہ (ادراک ودریافت کرنے والی قوتیں) اور قوائے محرکہ (حرکت کرنے والی قوتیں) میں روح کو دخل وتصرف ہے، سو روح انسان کے عالمِ بدن میں بادشاہ مطلق کی طرح ہے، اور پورا بدن گویا اس کی مملکت ہے، اور قوائے مدرکہ ومحرکہ اس کی فوج وسرکاری کارندے ہیں۔ لہٰذا کارخانۂ قدرت میں سے یہ ایک کارخانہ ہے۔

اِلٰهِ النَّاسِ ۝

لوگوں کے معبود کی

اس صفت سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان کے اندر اللہ تعالیٰ کی معرفت، اس کی عبادت اور قرب کا شوق اصلِ خلقت میں (پیدائشی طور پر) رکھا گیا ہے۔

اسی پیدائشی شوق کی وجہ سے انسانوں کے گروہ کے گروہ اس کام کی تلاش وجستجو میں سرگرداں رہتے ہیں، انسانوں کا یہ شوق ودل گرفتگی اس کی معبودیت کے کرشموں میں سے ایک کرشمہ ہے۔

رب، ملک، اِلٰہ، ان تین صفات کے بارے میں ایک اور نکتہ

بعض مفسرین نے فرمایا کہ ان صفات میں مذکورہ ترتیب سے لانے میں نکتہ یہ ہے کہ انسان پر تین حالتیں گذرتی ہیں، ایک بچپن، اس حالت میں انسان اپنے پرورش کرنے والے والدین کے علاوہ اور کسی کو نہیں جانتا، بھوک پیاس میں انہی کی طرف التجا کرتا، اور کسی چیز سے خوف کھانے کے وقت انہی کی طرف بھاگتا اور پناہ پکڑتا ہے، یعنی ماں باپ کو پکارتا ہے۔

دوسری حالت، جب جوان وعاقل ہو جاتا ہے اور یہ دیکھتا ہے کہ ماں باپ بھی میری طرح محتاج ہیں، اور امیر وبادشاہ کی طرف روزی رزق کے لئے اور مصیبت کے وقت التجا کرتے ہیں، تو اس کے دل میں یہ بات بیٹھ جاتی ہے، کہ اس کارخانہ کا انتظام بادشاہِ وقت کے پاس ہے، سوتب اس کا اعتماد ویقین بادشاہ کے ساتھ قائم ہو جاتا ہے۔

تیسری حالت، لیکن جب مزید بڑا ہوتا ہے، عقل وفہم وتجربہ ترقی کرتا ہے تو دیکھتا ہے بادشاہ کے قبضہ واختیار میں بھی کچھ نہیں وہ عالم الغیب کا محتاج ہے، وہیں سے اپنی حاجات، مقاصد اور مرادوں کے پورا ہونے کی التجا کرتے ہیں۔ تب اسے یقین ہو جاتا ہے کہ بادشاہ وامیر بھی میری طرح محتاج ہیں، اور اس کارخانے کا اصل انتظام عالم الغیب کے پاس ہے، جسے اِلٰہ کہتے ہیں۔

لہٰذا ان تین صفات کو یہاں لانے کا مقصد یہ ہے کہ اگر انسان کا مزاج بچے کا سا ہے کہ وہ پرورش کے سوا کچھ نہیں جانتا تب بھی اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف التجا کرنی چاہئے اسی سے تعلق قائم کرنا چاہئے، کہ وہ سارے جہاں کا پرورش کرنے والا ہے، ماں باپ تو صرف اپنی ہی اولاد کی پرورش کرتے ہیں، مگر وہ

ساری مخلوق کو پالتا ہے۔

اور اگر انسان کی عقل بلوغ کو پہنچی ہوئی ہے، کہ بادشاہ و حاکم وقت کو کارخانۂ عالم کا منتظم سمجھتا ہے تب بھی اس کو اللہ تعالیٰ ہی کی طرف رجوع کرنا چاہئے، کہ اس کی بادشاہت سارے جہاں پر ہے، اور حقیقی انتظام اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے، اور اگر تجربے سے معلوم کرلیا ہے کہ بادشاہ و حاکم بھی دوسرے کے محتاج ہیں جس کو اِلٰہ کہتے ہیں، سو وہ میں ہی ہوں الغرض انسان کو ہر وقت، ہر حال میں صرف اللہ تعالیٰ ہی کی طرف رجوع، اسی پر اعتماد و یقین کرنا چاہئے، درمیان کے اسباب و وسائل پر اعتماد نہیں کرنا چاہئے۔

مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۵ الْخَنَّاسِ ۝

بدی سے اُس کی جو پھسلائے اور چھپ جائے

"من شر الوسواس" یہ "أعوذ" سے متعلق ہے، یعنی میں پناہ مانگتا ہوں فاسد خیالات کی برائی سے۔

بُرے وساوس کے پانچ نقصانات

فاسد خیال کئی طرح سے نقصان پہنچاتا ہے۔

(۱) مزاج میں فساد پیدا کردیتا ہے۔

(۲) نفس کی تدبیر میں نقصان پہنچاتا ہے۔

(۳) عبادت میں نقصان پہنچاتا ہے۔

(۴) معرفت میں نقصان پہنچاتا ہے۔

(۵) اور حق تعالیٰ کے تقرب کے اسباب میں نقصان دیتا ہے۔

اور انسان کو ابتدائے عمر سے انتہا تک انہی کاموں سے واسطہ پڑتا ہے جب ان میں خلل واقع ہوگیا تو گویا ساری زندگی ہی برباد ہوگئی۔

"الخناس" یہ "وسواس" کی صفت ہے "صاحب" کے اعتبار سے اَی "الخناس صاحب الوسواس" یعنی وسوسے ڈالنے والا اختاس۔

ذکر وتلاوت کے نور سے شیطان بھاگتا ہے

شیطان کی فطرت میں یہ بات داخل ہے کہ وہ ذکر، تلاوت اور فرشتوں کا سامنا کرنے سے بھاگتا ہے۔

یہاں اس کو خاص اس صفت کے ساتھ ذکر کر کے اس سے پناہ اس لئے مانگی گئی ہے کہ اس مردود سے بچنا بہت مشکل ہے، اللہ تعالیٰ کی مدد کے بغیر اس سے محفوظ رہنا کسی کے بس کی بات نہیں، اس لئے کہ وہ چھپا ہوا دشمن ہے، سامنے کے دشمن سے بچنا آسان ہوتا ہے مگر چھپے دشمن سے حفاظت مشکل ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ حکمران کے لئے بھی برسرِ پیکار کھلے دشمنوں سے جنگ آسان ہوتی ہے، حالآنکہ وہ قوت میں کمزور نہیں ہوتے، لیکن چوروں، ڈاکوؤں سے نبرد آزما ہونا حکومت کے لئے زیادہ پریشانی کا باعث ہوتا ہے کہ یہ چھپے ہوتے ہیں، اور اپنا کام کر کے بھاگ جاتے ہیں، لیکن جو کھلے اور پوشدہ یہ سب کو جاننے والا ہے اس کے لئے اس سے اپنے بندوں کو بچانا کچھ مشکل نہیں، اس لئے اسی سے التجا کی گئی ہے۔

الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ ○

وہ جو خیال ڈالتا ہے لوگوں کے دل میں

"الذی یوسوس" یہ "وسواس" کی دوسری صفت ہے، یعنی جو بُرے وساوس لوگوں کے سینوں میں ڈالتا ہے۔

صدور کی تخصیص کی وجہ

''صدر'' کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ اس جگہ نفس ناطقہ کے آثار، حیوانیت سے مخلوط ہو کر بہت جلد فساد کا رنگ قبول کر لیتے ہیں، بخلاف دوسرے اعضاء کے، کہ ان میں ایسا نہیں، مثلاً جگر میں بُرے خطرات کی جگہ ہی نہیں ہے، اور نفسِ ناطقہ نفسِ نباتی سے اپنا کام لیتا ہے، اسی طرح دماغ میں اگرچہ فساد پیدا ہوسکتا ہے کہ قوتِ وہمیہ قوتِ عقلیہ کو تشویش میں ڈال دیتی ہے، لیکن اکثر اس کا فساد نفسِ حیوانیہ کے آثار بلند ہونے سے ہوتا ہے، چنانچہ اس حکمت کو جاننے والوں سے یہ بات مخفی نہیں ہے۔

مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ۝

جنوں میں اور آدمیوں میں

''وسواس'' کا بیان ہے، یعنی فاسد خیالات ڈالنے والا خواہ جنوں میں سے ہو جیسے شیاطین ہیں، کہ دخانیت (دُخان سے ہے دخان کا معنی دھواں ہے) کے غلبے کی وجہ سے پیدائشی طور پر ان میں تاریکی گھسی ہوئی ہے، اسی وجہ سے غلط مشورے، انتظامِ امور بگاڑنے والے خیالات ان کی طبیعت کے ساتھ لازم ہیں، گویا برائی اور شرارت ان کی طبیعت کا خاصہ ہے، اس لئے وہ ایسے ہی وساوس القاء کرتے ہیں۔

پھر آتشیں مزاج ہونے، اور لطافت کی وجہ سے انسان کی روحِ حیوانی کے اندر ان کا گھسنا آسان ہوتا ہے، اور چونکہ ان کے مزاج میں فاسد خیالات وتدابیر داخل ہیں اس لئے روحِ حیوانی کا جب ان سے اختلاط ہوتا ہے تو وہ آثار اس پر بھی منتقل ہوتے ہیں، اسی کے نتیجے میں ان سے گناہ سرزد ہوتے ہیں، چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''ان الشیطان یجری من الانسان مجری الدم''

شیطانی وساوس کا تفصیلی جائزہ

شیطانی وساوس کی کوئی حد وانتہاء نہیں ہے، کبھی تو بالکل فسق وفجور کی طرف بلاتا ہے، اور کبھی کسی نیکی وطاعت کی طرف بھی بلاتا ہے، لیکن اس کا نیکی کی طرف بلانا دو حال سے خالی نہیں، یا وہ کسی بڑی نیکی سے پھیر کر چھوٹی نیکی کی طرف رغبت دلاتا ہے جیسے بیمار کی عیادت سے نماز چھوڑنا، یا جس نیکی کی طرف دعوت دے رہا ہوتا ہے، اس تھوڑی سی نیکی کو کسی گناہ کا سبب بنانا چاہتا ہے جیسے ایک ٹکڑا فقیر کو دینا، پھر اس پر احسان جتلانا، اس کا مذاق اڑانا، شیطانی وساوس میں سے یہ بھی ہے کہ عوام کے دلوں میں ایسی باتیں ڈالتا ہے جو ان کی سمجھ سے بالاتر ہوں، جیسے ذات وصفاتِ الٰہی کی تحقیق، نبوت کے اسرار کی تحقیق، آخرت کے امور کے بارے میں سوچ، جبر واختیار، قضاء وقدر کے مسئلے کی تحقیق، اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اختلافات میں حق بات کی تفتیش وجستجو کرنا، کہ حق کس طرف تھا، یہ سب شیطانی وساوس ہیں تاکہ رفتہ رفتہ تحقیق کے دوران ہی ان حقائق کا انکار کر بیٹھیں، اس لئے کہ عام لوگ ان حقائق کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔

بعض کے دلوں میں اور قسم کے باطل وسوسے ڈالتا ہے، مثلاً بزرگوں، پیروں کی شفاعت کی اُمید رکھنا، تھوڑی سی طاعت پر بہت زیادہ ثواب کی امید رکھنا، اور اللہ تعالیٰ کی بخشش عام سے دھوکہ کھا کر اس کے عذاب سے نڈر رہونا، اور بعض کے دلوں میں اس کا عکس ڈالتا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی بخشش و رحمت سے بالکل ناامید ہونا وغیرہ۔

بت پرستوں کے دل میں یہ وسوسہ ڈالتا ہے کہ یہ بت اللہ تعالیٰ کے تقرب کا ذریعہ ہیں، نیز اگر تم ان کے آگے نہیں جھکو گے، ان سے اپنی حاجتیں نہیں مانگو گے تو تمہاری اولاد مر جائے گی، مال میں نقصان ہوگا، ایسے ہی فریب جنوں پریوں کے متعلق لوگوں کے دلوں میں ڈالتا ہے۔

نماز پڑھنے والوں کے دلوں میں ریاء و دکھلاوا ڈالتا ہے، پھر ارکان و رکعات کے شمار میں گڑبڑ ڈالتا ہے، بعض کو قراءت بنا بنا کر کرنے میں مبتلاء کر دیتا ہے، ان کا دھیان اسی طرف ہو جاتا، حروف کو مخارج سے ادا کرنے میں غلو کرنے لگتے ہیں۔

زکوٰۃ کے باب میں وہ بخل پر آمادہ کرتا ہے، یہ دل میں ڈالتا ہے کہ اس طرح مال کم ہو جائے گا، کہیں خود ہی فقیر نہ بن جاؤں، اگر ہمت کر کے کسی نے ادا کر لی تو نئی آفات میں گرفتار کرنے کی کوشش کرتا ہے، تکبّر، شہرت اور فقیر پر احسان جتلانے جیسے بُرے افعال پر آمادہ کر دیتا ہے، اس طرح اس عبادت کا ثواب تباہ کرا دیتا ہے۔

حرام، ناجائز اور شہرت کے مواقع پر مال خرچ کرانے پر اُبھارتا ہے، اور یہ دل میں ڈالتا ہے کہ اس طرح عزت و شہرت ملے گی، اور شہرت و شہوت میں جو لذت ہے وہ کسی چیز میں نہیں۔

غصے کے وقت یہ فاسد خیال دل میں ڈالتا ہے کہ اگر تم غصہ نہیں کرو گے تو عاجز و ذلیل ہو جاؤ گے۔

اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کے دین کے راستے میں اگر کچھ محنت و مشقت کسی نے کی تو اس کو دُگنا چگنا کر کے دکھلاتا ہے، لیکن کافروں کو بتوں کی پرستش میں یا فساق و فجار کو گناہوں کے کاموں پر جو مشقت ہوتی ہے اسے بالکل سہل اور معمولی کارنامہ کر کے دکھلاتا ہے۔

اللہ کے راستے میں مرنے، جان دینے کو حرام بنا کر پیش کرتا ہے، اس کی بُرائی اور بے شمار فاسد تاویلیں اس کے خلاف دل میں ڈالتا ہے، جان کی حفاظت کی اہمیت دل میں ڈالتا ہے، لیکن دوسری طرف کافروں کو ان کے باطل دین و مذہب کے حق میں جان دینے اور لینے کو آسانی اور رغبت والی چیز

بنا کر پیش کرتا ہے۔

کسی کو اس کی حلال بیوی سے دل پھیر کر گندی ناپاک عورتوں سے زنا کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔

امیروں کو لوگوں کے اموال پر زبردستی قبضہ جمانے کی حرص دلاتا ہے، باوجودیکہ ان کے پاس مال و دولت بہت ہے مگر ان کو ناجائز ذرائع سے اور زیادہ مال جمع کرنے اور معمولی سی بات پر لوگوں کو قتل کرانے کی رغبت دلاتا اور یہ ظلم ان سے کراتا ہے۔

یہ شیطان کی فریب کاریوں کا ایک نمونہ ہے، اگر اس کی دغہ بازیوں کی تفصیل بیان کی جائے کہ وہ کس کس طرح لوگوں کو گمراہ کرتا ہے تو اس کے لئے ایک ضخیم تصنیف چاہئے۔

شیطانی وساوس و مکاریوں سے بچنے کے لئے تین اُمور

اس کی تمام حیلہ سازیوں اور وساوس کا علاج تین چیزیں ہیں:۔

(۱) اس کے مکر اور حیلوں کو پہچاننا، اس لئے کہ جب کسی کو معلوم ہو جائے کہ یہ شیطانی عمل ہے تو شیطان کا زور کم ہو جاتا ہے، انسان کی طبیعت میں اس کی طرف وہ جذبہ وشوق نہیں رہے گا جو اس سے بے خبری میں ہو سکتا تھا، سو اب اس کا شرّ کم ہو جائے گا، جیسے چور جب گھر والوں کو جاگتا ہوا پاتا ہے تو بھاگ جاتا ہے۔ اسی طرح کوئی مکار، فریبی آدمی جب کسی آدمی کے بارے میں جان لیتا ہے کہ یہ مجھ سے واقف ہے تو اس سے نا اُمید ہو جاتا ہے اور اس میں حوصلہ نہیں رہتا کہ اس کو فریب دینے کی کوشش کرے۔

(۲) دوسرے اس کے وساوس کو اہمیت ہی نہ دے، ان کی طرف توجہ ہی نہ کرے، یہ نہ ہو کہ کوئی وسوسہ آیا تو دماغ میں سوار کر دیا، جب اس کے وساوس کی طرف توجہ ہی نہ دی جائے تو اس کا شر کم ہو جائے گا، جیسے کتا بھونکتا ہے، اگر اس کی طرف توجہ کی جائے چاہئے خاموش کرنے کے لئے ہی تو وہ اور زیادہ بھونکنا شروع کر دے گا، اگر اس کی طرف توجہ ہی نہ کی جائے تو اس کے بھونکنے میں وہ تیزی نہ رہے گی۔

(۳) تیسرے ذکر قلبی ولسانی پر دوام وہمیشگی اختیار کی جائے، نیز اس کے ساتھ دل کو بُری صفات جیسے غضب وشہوت ہے اس سے پاک رکھا جائے، اس لئے کہ شہوت وغضب کے غلبے کے وقت ذکر کا

اثر دل کے کناروں کی طرف سمٹ جاتا ہے اور دل کا وسط اور بیچ خالی ہو جاتا ہے جس میں شیطان کو وسوسہ ڈالنے کی گنجائش مل جاتی ہے، تب وہ اپنا کام کر جاتا ہے۔

''والناس''

یعنی خواہ وہ وسوسے ڈالنے والا انسانوں کی قوت متخیلہ ہو، جو فاسد اعتقاد اور شہوت وغضب کے غلبے سے باطل خیالات تمام قوائی میں بکھیر کے، طبیعت میں بگاڑ پیدا کرتی یا نفس کی تدبیر میں خلل ڈالتی ہے، یا عبادت وتقرب الی اللہ میں سستی کا سبب بنتی ہے، یا معرفت میں خطاء کا سبب واقع ہوتی ہے۔

لفظ ''ناس'' کے تکرار کی وجہ

''ناس'' کا لفظ اس سورت میں پانچ جگہ پر آیا ہے، لیکن صاحب لباب نے اپنی تفسیر میں کہا ہے کہ حقیقت میں یہ تکرار نہیں ہے، پہلی جگہ ناس سے مراد لڑکے ہیں وہاں تو پرورش کا ذکر ہے جو ان کے حال کے مناسب ہے، دوسری جگہ پر جوان مرد ہیں وہاں مِلک کا لفظ آیا ہے جو قہر وسیاست پر دلالت کرتا ہے اور یہ ان کے حال کے زیادہ مناسب ہے، اس لئے کہ قوتِ غضبیہ وشہویہ ان میں درجۂ کمال پر ہوتی ہے۔ تیسری جگہ ناس سے مراد بوڑھے ہیں، کہ وہاں اِلٰہ کا لفظ آیا ہے جو طاعت وعبادت پر مبنی ہے اور یہ ان کے حال کے مناسب ہے، چوتھے مقام پر صلحاء مراد ہیں، اس لئے کہ شیطان اکثر صالحین کو گمراہ کرنے پر ہی کمربستہ ہوتا ہے، اور ان کے دلوں میں وساوس ڈالنے کی بہت کوشش کرتا ہے، پانچویں مقام پر مفسد وشیاطین مراد ہیں جن کا کام ہی وسوسہ ڈالنا اور بہکانا ہے۔

لفظ ''ناس'' کے پانچ مرتبہ تکرار میں ایک اور نکتۂ عجیبہ

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ''ناس'' کو اس سورۃ میں پانچ مرتبہ اس لئے لائے ہیں کہ پانچ کا عدد، عددی اعتبار سے اور اپنے معدود کے لحاظ سے بھی ایک خاص شرافت کا حامل ہے۔

عددی اعتبار سے اس کی شرافت اس وجہ سے ہے کہ یہ عدد دائر ہے، اور عددِ دائر کا معنی یہ ہے کہ اگر اس کو اپنی ذات میں ضرب دیں، پھر حاصل ضرب میں اس کو ضرب کریں اسی طرح جہاں تک اس کو ضرب کرتے ہوئے لے جائیں ہر صورت میں پانچ اصلی موجود رہے گا، جیسے ۵ سے ۲۵، ۱۲۵ وعلی ھذا القیاس

AF-239

اورمعدود کے اعتبار سے اس میں شرافت یہ ہے کہ مراتب کلیہ جن کو حضرات خمس کہتے ہیں ان میں ظہورحق پانچ میں ہے، تخلیق کائنات کا خلاصہ انسان ہے اور انسان کا ڈھانچہ پانچ اعضاء سے مرکب ہے، دو پاؤں، دو ہاتھ، ایک سر، اور ہر ہاتھ اور ہر پاؤں کی پانچ پانچ انگلیاں ہیں۔ انسان کے جسم کا اوپر کا حصہ سر ہے، اور اس میں پانچ حواسِ ظاہرہ ہیں اور پانچ حواس باطنہ۔

قرآن دونوں جہاں میں بس ہے

بعض محققین نے یہ بھی لکھا ہے کہ قرآن کی ابتداء (بسم اللہ کی) باء سے ہے اور انتہا سین کے لفظ پر ہے مجموعہ "بس" ہوا، اس سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ قرآن دونوں جہانوں کے لئے بس ہے، چنانچہ حکیم سناء نے کہا

اول و آخر قرآن زچہ با آمد وسین
یعنی اندر رہِ دین رہبر تو قرآن بس

الحمدلله الذی به تتم الصالحات ولاحول ولا قوة الا بالله

وصلی الله تعالیٰ علی خیر خلقه محمد و اله وصحبه اجمعین

مؤرخہ ۲۲ ربیع الاول ۱۴۲۲ھ شب جمعہ دس بجکر پچاس منٹ پر یہ تحریر اختتام پذیر ہوئی۔
جس کی ابتداء رجب/شعبان ۱۴۲۱ھ کو آزاد کشمیر میں ہوئی تھی۔

الحمدلله ثم الحمدلله

ربنا تقبل منا انک أنت السمیع العلیم

بندہ سفیر احمد ثاقب مقیم دارالافتاء والارشاد ناظم آباد
کراچی